جلد ۳۰ — نمبر ۱ر۲

فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

الحمد للہ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۹ء ہماری توقعات سے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ جون ۱۹۳۹ء میں شایع ہونے والا سالنامہ انشاء اللہ العزیز اس سے بھی زیادہ روح پرور اور ہنگامہ خیز ہوگا۔ ہم نے اس کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دی ہیں۔

زیر نظر شمارہ کے مضامین حسب معمول نہایت ارفع و اعلیٰ اور اس قابل ہیں کہ ان کا شروع سے لیکر آخر تک مطالعہ کیا جائے۔ مسئلہ الہٰیہ آزردہ۔ جناب پروفیسر علم الدین صاحب سالک کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر آپ نے کافی عرقریزی کی ہے "حیات نو" جناب احسان علی شاہ صاحب بی۔ اے کا ایک دلچسپ افسانہ ہے جو دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ جناب پروفیسر عشرت رحمانی صاحب نے دست انسانی پر ایک دلچسپ تنقید کی ہے۔ یہ ڈرامہ دہلی سے براڈ کاسٹ ہو کر مقبول علم ہو چکا ہے۔ جناب فضل حق صاحب قریشی نے تاریخ کے بعض نوادرات جمع کئے ہیں جو عام آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ حافظ رشید احمد صاحب کا مقالہ "امریکہ میں علوم مشرقی کی اشاعت" بھی بیحد معلومات افزا اور قابل قدر ہے۔ نظمیں اور باقی مضامین آپ سے خود داد حاصل کریں گے۔

"عالمگیر" خدا کے فضل سے ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ ہے لیکن جیسا کہ قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں ساتھ ہی بیحد کثیر المصارف بھی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا حلقہ اشاعت نہایت وسیع ہو۔ ہم اپنے قلمی معاونین اور خریدار صاحبان سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو اس کی خریداری کی تحریک کریں۔ آپ پرچہ انھیں دکھلا دیں اور اس کے بلند پایہ معلومات افروز اور کیف انگیز مضامین نظم و نثر کی طرف توجہ دلا دیجیئے۔ پھر ناممکن ہے کہ کوئی باذوق شخص اس کا خریدار بننے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اس طرح آپ کی تھوڑی سی توجہ سے آپ کے عالمگیر کو کافی خریدار مل سکتے ہیں۔

(ادارہ)

عالمگیر ماہ فروری ۱۹۳۹ء

کے بعض خاص مضامین

"افسانۂ محبت آؤ تمھیں سنائیں!"

افسانہ جس میں حسرت و ارمان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں؟

جرمنی و اطالیہ میں عورت کی حیثیت

صنف نازک پر ڈکٹیٹروں کی ستم آرائیاں۔ ہر ہر لفظ میں تحقیق و تدقیق کا ایک دریا موجزن ہے۔

فریب تخیل

ایک نہایت دلچسپ تحیر زا، تحیر آفریں اور قابل مطالعہ رومان

ابومسلم خراسانی کی موت

دولت بنی امیہ کے مخرب اور سلطنت بنی عباس کے موسس ابو مسلم خراسانی کی موت کا دردناک قصہ۔

بیمار محبت

عنوان سے ہی افسانے کی دلچسپی کا اندازہ لگائیے!

چیکوسلوواکیہ

وہ علاقہ جس کو جرمنی نے حال ہی میں زبردستی اپنے ساتھ ملا لیا

سوتیلا باپ

ایک ایکٹ کا نہایت دلکش، دلاویز اور تلطف انگیز ڈرامہ

مفتی صدر الدین خاں آزردہ مرحوم

ایک دلچسپ ادبی مضمون

از جناب مولانا علم الدین صاحب سالک ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج

[عالمگیر کی کسی گذشتہ اشاعت میں مولانا آزردہ مرحوم کے متعلق ایک مضمون چھپ چکا ہے زیر نظر مضمون میں چونکہ حضرت سالک نے کافی وضاحت اور تفصیل سے کام لیا ہے اور بعض قدیم فارسی دستاویزات سے بھی استفادہ کیا ہے اس لئے ناظرین عالمگیر کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے مدیر]

صدر العلماء مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی ہندوستان کے وہ جلیل القدر فرزند ہیں جن کی ذات پر زمانہ ہمیشہ ناز کریگا۔ آپ کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ترک وطن کر کے ہندوستان آئے دہلی میں سکونت اختیار کی تھوڑے ہی عرصہ میں دربار اور عوام میں عزت حاصل کرلی۔ آپ کے والد مولانا لطف اللہ شہر کے مشہور اور باعزت آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔

مفتی صاحب ۱۲۰۴ھ میں بعہد اکبر شاہ ثانی دہلی میں پیدا ہوئے لفظ "چراغ" سے آپ کی تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ آپ کے والد نے آپ کو بہترین اُستادوں کے سپرد کیا اور نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی چنانچہ آپ نے علوم منقول مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ مولانا عبدالقادرؒ اور مولانا محمد اسحاقؒ سے اور علوم معقول مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی سے حاصل کئے آپ کے اساتذہ آپ کے متعلق بہت بلند رائے رکھتے تھے چنانچہ جب آپ تعلیم سے فارغ ہو کر کلکتہ جانے لگے تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے کلکتہ کے ایک مدرسہ کے مہتمم مولانا امین اللہ کے نام ایک خط دیا جس میں اپنے شاگرد کا تعارف اس طرح کرایا۔

"دریں ولا مولوی صدر الدین صاحب کہ از فضلائے نامدار ایں بلدہ ماہولہ اند و در اکثر فنون عقلی و نقلی از عربیت و ادب و اصول و فقہ و کلام و ہم فنون فارسی مہارت تام دارند و اکثر مراجعت تحقیقات نفیسہ علوم در فقیر خانہ نمودہ اند و معہذا نسبت ارادت و اتحاد با فقیر موروثی دارند و جد امجد ایشاں از فضلائے معتبر و خلص اصحاب و تلامذہ در جناب حضرت والد ماجد فقیر بودہ اند

القوم اخوان صدق بینہم سبب!
من المودۃ لم یعدل بہ النسب!

عازم دار الامارت کلکتہ بتقریبات چند در چند انشاء اللہ تعالیٰ ملاقات سامی خواہند نمود مراعات جہات مذکورہ در حسن تلقی و اعزاز و اکرام ایشاں مہما امکن منظر سامی باشد"

جب آپ کی شہرت علمی کا سکہ دُور دُور پھیل گیا تو آپ کو دہلی کا صدر الصدور مقرر کر دیا گیا۔ یہ عہدہ جیسا کہ لالہ سری رام آنجہانی اپنی

مشہور کتاب "خمخانہ جاوید" میں لکھتے ہیں ؎

"اس زمانہ میں اہل ہند کے لئے اعلیٰ ترین عہدہ سمجھا جاتا
تھا اور قبل از غدر حکام وقت کی طرف سے آپ اسی
عہدے پر سرفراز رہے"

یہ زمانہ اپنی علمی سرگرمیوں کی وجہ سے دہلی کی تاریخ میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ اکثر ارباب دول کے یہاں مشاعرے ہوتے تھے جن میں شائقین سخن کثیر تعداد میں شامل ہوکر داد سخن دیتے تھے مفتی صاحب کا عنفوان شباب تھا کہ آپ کے دل میں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ شروع شروع میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں۔ پھر میاں محرم اکبرآبادی سے اصلاح لینی شروع کی اور آخر میں میر ممنون کے تلامذہ میں شامل ہو گئے آپ نے آزردہ تخلص اختیار کیا اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہے طبیعت بیحد موزوں اور رواں تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصہ میں قادر الکلام بلکہ یگانۂ روزگار بن گئے اور لوگ آپ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے آپ کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا موثر اور درد انگیز ہوتا تھا۔

مفتی صاحب نہایت خلیق تھے آپ کی طبیعت نمود و نمائش سے پاک تھی۔ ہمیشہ سادہ وضع میں رہتے۔ عدالتی کاروبار سے فارغ ہو لینے کے بعد طالب علموں کو درس دیتے اور یہی آپ کا دلپسند مشغلہ تھا جس کی پابندی آپ نے اخیر عمر تک کی۔ صاحب ندوۃ العلما لکھتے ہیں کہ۔

"جامع مسجد کے پاس ایک مدرسہ تھا جسے مدرسہ دار البقا
کہتے تھے اس مدرسہ کے طالب علموں کے طعام اور لباس
کا خرچ مفتی صاحب اپنی جیب سے ادا کیا کرتے تھے"۔

مروت کا یہ حال تھا کہ کوئی ضرورت مند آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا طبیعت میں نفاست پسندی۔ نیک نفسی، خوش مزاجی اور انصاف کوشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس زمانہ کے اکثر ارباب ذوق آپ کے دوست اور عقیدت مند تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی قرضخواہ نے مرزا غالب پر دعویٰ دائر کر دیا اور مقدمہ مفتی صاحب کی عدالت میں پیش ہوا۔ مرزا غالب مرحوم نے جواب دعویٰ میں اپنا یہ شعر پڑھ دیا ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب یہ سن کر مسکرائے۔ غالب کے خلاف ڈگری دیدی لیکن ڈگری کا تمام روپیہ اپنی جیب سے ادا کر دیا۔

اسی طرح مشہور ہے کہ مرزا غالب کی ہمشیرہ سخت بیمار تھیں۔ میرزا عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ بیمار پرسی کرتے ہوئے آپ نے ہمشیرہ سے پوچھا "بوا کیا حال ہے؟" انھوں نے جواب دیا "بھیا مر رہی ہوں ایک بات کا غم ہے کہ قرض کا بوجھ سر پہ لئے جا رہی ہوں"۔ مرزا نے بلا تامل کہا "تو کیا ڈر ہے، تم اللہ میاں کی بارگاہ میں جا رہی ہو نہ کہ مفتی صدر الدین کی عدالت میں جو جاتے ہی ڈگری دیدینگے"۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان بھر میں شورش برپا ہوئی۔ تو مفسدہ پرداز لوگوں کے ایک گروہ نے مفتی صاحب کے مکان پر جمع ہو کر جہاد کا فتویٰ طلب کیا۔ مفتی صاحب چونکہ کمپنی بہادر کے ملازم تھے اس لئے ٹال مٹول کرتے رہے مگر وہ گروہ کہاں ٹلتے تھے آخر انھوں نے جہاد کے فتوے پر زبردستی مہر کرا ہی لی۔ مفتی صاحب نے اپنی مہر کے ساتھ قلم سے یہ لفظ زیادہ کر دیا "فتویٰ بالجبر" مفسدہ پردازوں نے سمجھا کہ آپ نے "فتویٰ بالخیر" لکھا ہے وہ چپ چاپ چلے گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن جب دہلی فتح ہوئی اور ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ تو جن جن لوگوں پر شک کیا گیا تھا انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مفتی صاحب بھی اس الزام میں دھر لئے گئے کہ آپ نے جہاد کے فتوے پر دستخط کئے ہیں چنانچہ آپ کی منقولہ اور غیر منقولہ تمام جائداد ضبط کر لی گئی اور آپ کو قیدخانہ میں بند کر دیا گیا جہاں پڑے پڑے آپ نے ایک ترجیع بند لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

آپھنسے بے ڈھب الٰہی دیکھئے کیسی بنے
مر رہے ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسی بنے

مفتی صاحب نے اپنی صفائی میں اصل فتویٰ طلب کرایا۔ اور ثابت کیا کہ ان سے زبردستی اس فتوے پر دستخط لئے گئے ہیں اور "فتویٰ بالجبر" کے الفاظ اس کی دلیل ہیں چنانچہ آپ رہا کر دیئے گئے اور اس کے بعد عرضی پرچہ کرنے سے نصف جائداد بھی واپس مل گئی جس کا کرایہ تین چالیس روپیہ ماہانہ آتا تھا۔ غالب مرحوم اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دن
حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا روبکاریاں
ہوئیں آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری
موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے
فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف
جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں
اپنی حویلی میں رہتے ہیں اگرچہ یہ امداد (واگذاشت شدہ
جائداد کا کرایہ) ان کے گذارے کو کافی ہے کس واسطے
کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس مہینے کی آمد
لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ
دس بارہ آدمی ہیں لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔
ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے عشرہ ثامنہ کے اواخر
میں ہیں (یعنی ۸۰ برس کے قریب عمر ہے) خدا سلامت
رکھے بہت غنیمت ہیں۔"

اسی زمانے میں مفتی صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو خط لکھا جس
میں زمانے کی سرد مہری۔ ناقدر دانی اور اپنے ناکردہ گناہوں کی
شکایت اس طرح کی ہے۔

"الحمد للہ تا حال سررشتہ آمد و شد انفاس درست دارم
و اوقات عمر باقی ماندہ (چنانکہ دل میخواست) در گذر است ؎

بے غم عشق تو صد حیف ز عمرے کہ گذشت!
پیش ازیں کاش گرفتار غمت بے بودم

للہ تعالیٰ توفیق طاعت و امتثال احکام تشریعی از
اوامر و نواہی و تسلیم احکام ارادی از صبر و رضا و موافقت
وفا ارزانی فرماید۔ و ثبت و استقامت برآں عطا
نماید و پائے ہمت ازیں جادہ ثواب و طریق مستقیم نہ
لغزاند۔ در اوقات خاصہ از دعائے حسن خاتمت و
نکوئی عاقبت مبالہ نہ رود ؎

ہمت نگر کہ ہر ورق دفتر امید
صد پارہ کردہ ایم و بہ خوناب شستہ ایم۔

شکر و سپاس ایزد بیہمتا ہر آں و ہر لحظہ مودی میکنم کہ تلیفے
و تاسفے بر زوال زخارف دنیا کہ عبارت از اسباب
سامان تعیش و ساز و برگ زینت حیات دنیوی بود
اصلا بخاطرم خطور نمی کند مگر بمقتضائے بشریت دو ا
پیرامون دل پیر ماست یکے سرانجام زاد و راحلہ کہ برائے
سفر حجاز و اقامت آنجا در اوقات باقی حیات مستعار کہ
ساعتے بیش نیست کافی و لبند باشد دوم دست بہم دادن
بعضے کتب دینیہ از تفسیر و حدیث و غیرہ کہ نافع در
دین است نہ لغو بوعلی و تراتر انوری۔"

آپ کی زندگی کے بقیہ ایام جو شدید مصیبتوں کے دن تھے
نہایت صبر و استقلال کے ساتھ درس و تدریس میں گذارے لیکن
۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء کو آپ پر فالج گرا اور کچھ عرصہ اسی حالت میں
رہکر آخر ۸۰ برس کی عمر پاکر پنجشنبہ کے دن ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو
یہ چراغ علم و فضل ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ شمس الشعرا مولوی ظہور علی ظہور
نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے ؎

چہ مولانائے صدرالدیں کہ در عصر	امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر	بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم	وداع او سوئے دار الجناں بود
ظہورا افسوس آں استاذ ذیقدر	پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت	کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود
۱۲۰۴ھ	۱۲۸۵ھ

لفظ "چراغ ام" سے بھی آپ کا سن وفات نکلتا ہے۔ آپ
کی قبر شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی درگاہ میں ہے۔

آپ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اپنی بیوی کے بھانجے مولوی
عنایت الرحمن خاں سابق ڈپٹی کمشنر محکمہ دریافت انعامات گورنمنٹ نظام
کو متبنیٰ کیا تھا۔

مفتی صدرالدین کے حلقہ تلامذہ میں بعض ایسے ایسے باکمال شاگرد
شامل تھے جنہوں نے مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا پانسہ پلٹنے میں نمایاں
حصہ لیا ہے آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر بانی دار العلوم علی گڈھ

پر آپ خاص شفقت فرماتے تھے۔ نواب صدیق الحسن مرحوم جو متعدد کتابوں
کے مصنف اور رئیسہ بھوپال کے شوہر تھے آپ کے خاص الخاص شاگرد
تھے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والئے ریاست رامپور بھی ایک مدت
تک آپ کے درس میں شامل ہوتے رہے۔ ذوق۔ غالب۔ مومن صہبائی
شیفتہ۔ تیر۔ رخشاں وغیرہم سے آپ کو دلی لگاؤ تھا۔ میرزا غالبؔ کے
آپ بیحد مداح تھے۔ لیکن ان کی مشکل پسندی کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔

ایک روز منشی بہاری لال مشتاق اور ان کے دوست لالہ
رام چند قمر مفتی صاحب کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ شعر و شاعری کا ذکر چلا۔
قمر نے مرزا غالب کی نکتہ سنجی۔ نازک خیالی۔ بلند پروازی اور شگفتہ بیانی
کی تعریف شروع کر دی۔ مفتی صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے "یہ ہے
تو درست مگر کہنا نہایت مشکل ہے۔ پھر یکایک زانو پر ہاتھ مارا اور جھومتے
ہوئے کہا کہ ہائے جب اچھا کہتا ہے تو ایسا کہتا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مولانا حالی مرحوم یادگار غالب میں فرماتے ہیں۔
" ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے مرزا
غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار پسند کرتے تھے
اس لئے مرزا کا نام سن کر الجھتے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ
نام رکھتے تھے مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے
اور متعجب ہو کر پوچھا یہ کس کا شعر ہے کہا گیا کہ مرزا غالب کا
چونکہ وہ مرزا کے کسی شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے
اس روز لاعلمی میں بیساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل
گئی۔ غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت
تھی فرمایا اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری
طرز کا شعر ہے۔ ؎۱

؎۱ یادگار غالب صفحہ ۳۳۔۳۴،

مولانا حالی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔
"مرزا کی وفات سے چھ برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب
حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی وہاں موجود تھا آزردہ
اور غالب اور بعض دیگر مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی
فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے مرزا کی نظر پڑے
ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی
طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

نشاط معنویاں از شرابخانۂ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لئے اور مولانا آزردہ سے مزاح
کے طور پر کہا دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل
لکھی ہے۔ یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین
شعروں کی مولانا نے تعریف کی مگر پھر قرائن سے سمجھ گئے
کہ مرزا ہی کا کلام ہے مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی
کہنے لگے۔ کلام مربوط ہے مگر کسی نو آموز کا کلام معلوم
ہوتا ہے سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت
آئی تو مرزا نے نہایت دردناک الفاظ میں یہ مقطع پڑھا

توائے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا
آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے"۔ ؎۱

مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ ۔
"میر کے دیوان میں ایک غزل ہے "خاک میں" "پاک
میں" "چاک میں" "ہلاک میں"۔ مولانا آزردہ کے
مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی
تھے ایک روز جمع تھے۔ میر کی اس غزل کا یہ شعر پڑھا گیا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

؎۱ یادگار غالب صفحہ ۸۱ - ۸۲

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے۔ اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا نے کہا "قل ہو اللہ" کا جواب لکھ رہا ہوں"۔ ؎[1]

مفتی صاحب کا حلقہ درس بےحد وسیع تھا۔ دور دور سے لوگ اس میں شامل ہونے کے لئے آتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمہ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دنوں تک درس بند رہا۔ طلبا سخت پریشان ہوئے آخر ایک منچلے شاگرد نے جرأت کر کے ایک نظم لکھی جس کے اس شعر سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے ؎

ہاتف بدست چپ سر مینی فشردہ گفت
بیماری نزول بہ صدر الصدور شد

اس نظم کا اثر یہ ہوا کہ مفتی صاحب نے درس کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔

مولانا آزردہ صرف نحو۔ منطق۔ معانی و بیان۔ ادب و انشاء فقہ و حدیث۔ تفسیر۔ علوم حکمت و ریاضیات میں ماہر تھے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف اس زمانہ کے تمام فضلا نے کیا ہے۔ مرزا غالب نے آپ کی مدح میں ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

اس قصیدے میں مرزا نے آپ کے فضل و کمال کی دل کھول کر داد دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مصائب و آلام اور ناقدری کی شکایت کرتے ہوئے ایک لطیف پیرایہ میں اس امر کا اشارہ بھی کیا ہے کہ آپ مرزا کی روش شعرگوئی کو پسند نہیں کرتے چنانچہ مرزا فرماتے ہیں ؎

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۱۷۔

باچنیں اندہ کہ بر گفتیم و دل خالی نشد   خواجہ گر اندہ گسار من نبودے وائے من
آں کہ در یکتائے وے در فن فرزانگی   متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آں کہ چوں خواہد ستایش نام نامی ساختن   بر نگارد عقل فعالش کرم فرمائے من
دل بدیں وہم نیاساید سخن کوتہ کند   آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من
صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار   میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائے من

یعنی میرا ممدوح یگانہ روزگار ہے اور اس کی یکتائی پر بو علی سینا بھی متفق ہے عقل فعال اس کو کرم فرمائے من کہتی ہے مگر یہ باتیں اس کی مدح کے لئے کافی نہیں مختصر یہ کہ وہ ایسی بلند مرتبہ شخصیت ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شاعر کا اس کی ہمسری کا دعویٰ کرنا اس کے لئے موجب ننگ و عار ہے۔

عربی میں مفتی صاحب کے چند اشعار ملتے ہیں جو آپ نے اپنی بیوی کی وفات پر لکھے تھے۔ آپ کا فارسی کلام اکثر تذکروں میں ملتا ہے ایک غزل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

خواہم دم دعا بدعا نا گریستن   شد بس کہ بے اثر بدعا ہا گریستن
از اشک ریزی مژہ خالی نشد دلم   خواہم چو زخم از ہمہ اجزا گریستن
واعظ اگر بیاد قدے گریہ ناروا ست   باز از چہ اوست زپے طوبیٰ گریستن
زشور شدن چو برق بود با طپید نم   اے ابر با گریستن و با ما گریستن
در عیش بے قرارم و در غم بہ پیچ و تاب   خندیدنم شبیہ بود با گریستن
دل را ہمیشہ خندۂ من خوں کند چو چشم   لب تا قدم جگر قلم آسا گریستن
موجے بزن کہ ترکنم ابر بہار را   اے دیدہ تا یکے بمدارا گریستن
اے دل بیا کہ خاک کنم ابر و برق را   از تو بخوں طپیدن و از ما گریستن

یہ غزل دراصل عرفی کی اس مشہور غزل کے جواب میں ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

مفتی صاحب کے وقت کا بیشتر حصہ چونکہ درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا اس لئے آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف بہت کم توجہ کی پھر بھی شعرائے اردو کا ایک تذکرہ آپ کی تصنیف ہے جو بہت نایاب ہے، اس کے علاوہ رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال اور در المنضود فی حکم امراۃ المفقود بھی آپ کی مشہور یادگاریں ہیں۔

مفتی صاحب وضعداری کے بھی بڑے پابند تھے۔ منشی محمد الدین صاحب فوق مشاہیر کشمیر میں لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ قلعہ ترپولئے میں حضرت بہادر شاہ کی سواری قریب سے گذر گئی۔ نہیں معلوم آپ اس وقت کس دھن میں تھے سلام نہ کر سکے۔ جب رزیڈنٹ کو یہ خبر ہوئی تو انھوں نے بلا کر دو روپے جرمانہ کر دیا آپنے اس دن سے مرتے دم تک کسی کے ساتھ سلام کرنے میں سبقت نہیں کی گویا خود سلام کرنے کی عادت ہی اڑا دی"

مولانا آزردہ کے اردو اشعار ہر قسم کے اغلاق و تنافر سے پاک ہوتے تھے ان کے کلام کے نمایاں جوہر شوخی بیان اور سلاست زبان ہیں دیوان مرتب نہیں ہوا۔ کلام کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا اس کے بعد مرزا غالب اور شیفتہ کے اصرار پر کبھی کبھی کہتے تھے۔ اکثر تذکروں میں آپ کے شعر ملتے ہیں چنانچہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں ۔ کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

یہ شعر درحقیقت نظیری کے مندرجہ ذیل مطلع کا چربہ ہے

عشق عصیانست اگر مستور نیست ۔ کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

مر کر بھی ہمارا دل بیتاب نہ ٹھہرا ۔ کشتہ بھی ہوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھہرا

اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے ۔ آزردہ مرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

ہو نہ دامنگیر کوئی جان کر قاتل تجھے ۔ تو بھی رونا چل جنازے کو ہمارے دیکھ کر

برگشتہ بخت جذبۂ دل تم کو آفریں! ۔ آزردہ پھر گیا مرے بیت الحزن کے پاس

آمد آمد ہوئی پھر موسم گل کی شاید ۔ ان دنوں چاک کو پاتے ہیں گریباں سے انس

ناصح یہاں فکر ہے سینہ بھی چاک ہو ۔ ہے فکر بخیہ تجھکو گریباں کے چاک میں

گیا کون سا صید افگن ادھر سے ۔ کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

گو اسیری میں ہوں پر مثل اسیر تصویر ۔ نہ غم قید نہ پروائے رہائی مجھکو

الجھنے کو ملا ہیں آپ بھی کچھ خیر ہے صاحب ۔ گیا ہاتھ کس لئے آپکی زلف پریشاں کو
ترے مجروح کے سینے میں کچھ گرمی سی باقی تھی ۔ وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تیر پیکاں کو

باہم ملاپ تھا یہ ترے دور حسن میں ۔ یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے
دل نے ملا دیں خاک میں سب وضعداریاں ۔ جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

کھڑا وہ عنبر زلف سیہ فام یہ کافر ۔ کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی
بالیں پہ کھڑا روتا ہے راتوں کو مسیحا ۔ کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

یہ لپکے رخنے ڈالئے اُن کی نقاب میں ۔ اچھے برے کا حال کھلے کیا نقاب میں
کیا جانوں کیا اثر ہے دل شعلہ تاب میں ۔ یہ وہ ہے برق آگ لگا دے نقاب میں
قسمت تو دیکھ کھول گرہ کچھ تو رہ گئی ۔ ناخن ہمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں
یارب وہ خواب حق میں مرے خواب مرگ ہو ۔ آئے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں
یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب ہے ۔ سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں
خورشید زار ہو کے زمیں پہ جھمک ذرا ۔ سو آفتاب ہیں ترے گرد نقاب میں
اٹھنے میں صبح کے یہ کہاں سرگرانیاں ۔ ناہید نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں
تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں تمہیں کیا ۔ لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے ۔ یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
ہیں دونوں مثل شیشہ یہ سامان صد شکست ۔ جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں
امداد چشم کیا ہو گی دل کو آگ جو ۔ جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں
کیا عقل محتسب ہے کہ لایا ہے کھینچ کر ۔ سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

جمع طوفان دو چشم تر مسرف ۔ اب مصارف کا کچھ حساب نہیں

دھو دیا سب کو دیدۂ تر نے — وہ درس اور وہ کتاب نہیں
مختصر حال چشم و دل یہ ہے — اس کو آرام اس کو خواب نہیں

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں — کب آسماں زمیں و زمیں آسماں نہیں
لب بند ہوں تو روزن سینہ کو کیا کروں — تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش فشاں نہیں
ملنا ترا یہ غیر سے ہو بہر مصلحت — ہم کو تو سادگی سے ترے یہ گماں نہیں
اے بلبلان شعلہ دم اک نالہ اور بھی — گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

دلی کی بربادی کا مرثیہ یوں تو ہر شاعر نے لکھا ہے مگر مفتی صاحب نے آپ بیتی کا رنگ دیکر اسے اور بھی زیادہ موثر بنا دیا ہے ؎

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی — واں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی — کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا — اہل دنیا سے خلط ان کو کبھی زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقف اسرار نہ تھا — آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا — بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گجگا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا — لاکھ حکمت سے اڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی — مہندی ہاتھوں میں لگاتے تو کیا گھبراتی
صبح سے شام تلک نیند نہ ان کو آتی — ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد — لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد — پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد
کب تلک داغ دل اک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے — صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھی لڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے — آنچلوں سے نئے نقش جھڑے پڑتے تھے
ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا تھا،
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا تھا

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے — کنٹھی موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے — یہ سنگار آئینہ کو بھی نہ دکھایا کرتے
اب نہیں کچھ بھی انھیں زلف پریشاں کی خبر
نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں — بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دکانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے پٹوں کے وہ تانوں کا کہاں — لطف ساقی کا مزا اور دوگانوں کا کہاں
اب وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اس کو نہ پھر دکھلائے — ان کی پوشاک کو گر دیکھیں تو پھرتے آئے
نظر آ جائیں اگر وہ سر راہے گاہے — خون اپنا کریں یا ان کا یہی جی چاہے
جن کے ہاتھوں سے نہ لیں ہم بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ اہلے گہلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے — مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دلؔ مدظلہ شاہجہانپوری

نیازِ عشق ہو سعیٔ طلب میں رائگاں کب تک
زمینِ کوچۂ دلکش رہے گی آسماں کب تک

نشاطِ زندگی کب تک بہارِ آشیاں کب تک
بیاضِ دہر پر قائم رہینگے یہ نشاں کب تک

کدھر ہے برقِ سوزاں کاش یہ حسرت بھی مٹ جاتی
بنائیں تنکے چُن چُن کر ہم اپنا آشیاں کب تک

ہمیشہ انقلابِ دہر دیکھا اب یہ دیکھیں گے
کوئی نامہرباں ہوتا ہے ہم پر مہرباں کب تک

مرا یہ گریۂ خاموش ہے اک شرحِ طولانی
کہوں رودادِ دل کب تک سناؤں داستاں کب تک

کوئی مشتاق ہے حیرت زدہ پیہم کرشموں سے
حریمِ ناز میں ہوگا نظر کا امتحاں کب تک

ہزاروں حسرتیں لیکر چلے ہیں جانبِ منزل ؟
مگر یہ کیا خبر پہنچے گا اپنا کارواں کب تک

اجل ہی کاش آجاتی سکونِ مستقل بن کر
شبِ غم کروٹیں بدلے مریضِ ناتواں کب تک

مجھے تسلیم۔ پھر بھی دید کا وعدہ وفا ہوگا
مگر یہ تو بتاتے جائیے کیونکر کہاں ۔ کب تک

بہار آئی اسیرانِ بلاکش اب ہیں کس دُھن میں
یہ سر ٹکرا کے توڑینگے قفس کی تیلیاں کب تک

وہی سوزش وہی شورش ہے دل کے خاک ہونے پر
شرر تو بجھ گیا اُمڈے گا آخر یہ دھواں کب تک

کوئی سمجھے تو ہیں مفہوم صدہا اک خموشی کے
کہے یُوں داستانِ دل نگاہِ بے زباں کب تک

فضا میکش صبا میکش نگہ ساقی کی خود میکش
رہینگی تشنۂ بادہ مری انگڑائیاں کب تک

کوئی حد بھی ہے آخر اے فلک آفاتِ پیہم کی ؟
رہے گا نذرِ بربادی ہمارا آشیاں کب تک

خدا کی شان وہ بُت کہہ رہا ہے پونچھکر آنسو
رہینگے حضرتِ دلؔ آپ سرگرمِ فغاں کب تک

بوٹا

ایک سادہ مگر موثر اور سچی کہانی

از جناب احسان علی شاہ صاحب بی۔ اے

بوٹا ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابھی عمر کی چار بہاریں بھی نہ گزری تھیں کہ بیرحم اجل نے ماں کا سایۂ عاطفت اس کے سر پر سے اٹھا لیا۔ باپ بیچارہ سارا دن سخت زمین کے سینے پر ہل چلاتا اور سال کے آخر میں اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے مہاجن کا گھر بھر آتا لیکن بوٹے پر طفلی کی معصومیں سایہ افگن تھیں اور زمانہ کی تلخی ابھی تک شیرینی کے لطیف رنگوں میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب وقت کی پے بہ پے گردشوں نے بوٹے کے اعضاء کو محنت برداشت کرنے کے قابل بنا دیا تو اس کے باپ نے اسے لاہور کے ایک گھرانے میں نوکر کرا دیا۔ بوٹے کو چار روپیہ ماہوار اور روٹی کپڑا ملتا تھا۔

اس طرح دیہات کا یہ بھولا بھالا فرزند شہر کی تہذیب آلود فضا میں گھسیٹ لیا گیا۔ چند مہینے تک تو اس کا دل گاؤں کے حسین مناظر کے لئے بیتاب رہا لیکن آہستہ آہستہ شہر کی ہنگامہ پرور زندگی کی نیرنگیوں نے بوٹے کے قلب و دماغ کو اپنے اندر جذب کر لیا اور وہ ان تمام رنگین معصومیتوں کو بھول گیا جن کی گود میں اس نے اپنی عمر کا زریں حصہ بسر کیا تھا۔

آج بوٹا پورے چودہ برس کے بعد اپنے گاؤں واپس گیا تھا۔ گاؤں کی فضا ویسی ہی رنگین اور دلکش تھی۔ ندی اپنی پرانی روش پر بل کھاتی ہوئی بہ رہی تھی۔ ہرے بھرے درخت ہوا کے ترنم سے مست ہو ہو کر اسی طرح جھوم رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کچے مکان اپنی پست چہار دیواری میں ویسے ہی دامان اور شعریت لئے ہوئے تھے۔ بوٹے کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا زمانے کی چیرہ دستیوں نے اسے بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا لیکن وہ اب بھی اسی چوپال پر بیٹھا حقے کے کش لگاتا نظر آتا تھا۔ سب کچھ وہی تھا لیکن بوٹے کی نظر بدل چکی تھی۔ اس کی ذہنیت میں ایک حشر خیز انقلاب آ چکا تھا اب گاڑھے کی دوئی چادر اور گاڑھے کی قمیص اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ بلکہ آج وہ خاکی نیکر اور کھدر کریپ کی سفید کالردار قمیص میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں بلند اور مضبوط لاٹھی کے بجائے بیت کی پتلی سی چھڑی تھی جس کو وہ بار بار اپنی پنڈلی پر مار رہا تھا۔

بوٹے کے گھر لوٹ آنے سے گاؤں میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی گاؤں کے تمام بوڑھے اور بچے اس سے ملنے کے لئے آئے لیکن بوٹا اب ان لوگوں سے ملنا کب گوارا کرتا تھا۔ اسے خیال تھا کہ یہ لوگ اُجڈ اور جاہل ہیں اور وہ لاہور کے ڈپٹی صاحب کا بہرہ ہے لہذا ان سے میل جول بڑھانا کسر شان ہے۔ اس زہر آلود ذہنیت کے زیر اثر اس نے کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اس فرعونیت سے بوٹے کا باپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ اب وہ ہرگز بوٹے کو شہر میں جانے کی اجازت نہ دیگا۔

چند دن تو خاطر داریوں اور ناز برداریوں میں گزر گئے اور بوٹا یہ سمجھتا رہا کہ اس کی نیکر اور قمیص نے جاہل دیہاتیوں کو یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن جب چند دنوں کے بعد شام کے وقت بوٹے کے باپ نے اسے نرم لیکن تحکمانہ لہجہ میں نیکر وغیرہ چھوڑ کر ہل سنبھالنے کو کہا تو بوٹا

محنت پریشان ہوا۔ کامل چودہ برس اُس نے ہل کی صورت نہ دیکھی تھی پلیٹیں صاف کرکے صاحب کے سامنے رکھ دینے اور ملاقاتی کارڈ صاحب کے سامنے پیش کر دینے کے سوا وہ اور کسی کام کاج کا عادی نہ تھا تو پھر ایکا ایکی ہل جوتنے کی جانکاہ محنت کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اُس نے صاف انکار کردیا بوٹے کے باپ نے بہت کچھ زور مارا گالیاں دیں۔ دھمکیاں دیں۔ گاؤں کے بڈھے بوڑھوں نے سمجھایا بجھایا لیکن بوٹا اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر تنگ آکر اس کے باپ نے کہہ دیا۔

"میں دیکھونگا۔ تو کیسے نہیں جاتا کھیت کو صبح! مارے جوتوں کے کھال نہ اُتار دی تو نام نہیں۔"

اس چیلنج کو سن کر بوٹے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"یہ جنگلی لوگ ہیں۔" اس نے سوچا۔ "اگر زیادہ ہٹ کی تو کہیں لاتوں گھونسوں تک نوبت نہ آجائے۔" یہ سوچ کر اُس نے آہستہ سے کہدیا "صبح دیکھا جائیگا۔"

اس جواب نے سب کو مطمئن کردیا۔ بوٹے کے باپ نے دوسرے لوگوں کو فاتحانہ انداز سے دیکھا اور پھر کر بولا۔ "ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں نوجوانوں کا سر جھکا دینے کی طاقت ہے۔"

بوٹا چپکا ہو رہا۔ آدھی رات کے وقت جب دنیا سکوت کامل کے گہوارے میں پڑی خواب نوشیں کے مزے لوٹ رہی تھی بوٹا اپنے کپڑوں کی گٹھری بغل میں دبا کر چپکے سے گھر سے نکلا اور اسٹیشن کی طرف ہولیا اس کا خیال تھا کہ لاہور پہنچتے ہی وہ اپنی پرانی جگہ حاصل کرلے گا۔ لیکن لاہور پہنچکر اُسے معلوم ہوا کہ اس کی جگہ ایک اور نوجوان نے لے لی ہے جو اس سے کہیں زیادہ سمجھدار اور محنتی ہے اس نے اپنی پُرانی خدمات جتا کر نوکری کی درخواست کی لیکن جواب یہی ملا۔ "اس وقت نہیں، اگر ضرورت ہوئی تو بلا لیا جائیگا۔"

بوٹے کو بیکار پھرتے پندرہ بیس دن گزر گئے تھے اس نے ہر اُونچے گھرانے میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بدنصیبی ہر بار پیش پیش رہتی اور اُسے کہیں دو روٹیوں کا آسرا نہ مل سکا۔ جو کچھ وہ گاؤں سے اپنے ساتھ لایا تھا ختم ہوگیا۔ جان پہچان والے بھی اُسے کھانا کھلاتے کھلاتے تنگ آگئے تھے۔ بعض نے تو صاف ہی کہدیا۔ "بھیّا! ہم خود غریب آدمی ہیں اپنا پیٹ مشکل سے بھرا جاتا ہے تمہیں کہاں سے کھلائیں۔ اوروں نے مالکوں کی ناراضگی کا بہانہ کرکے ٹال دیا اب بوٹے کے پاس کھانے کو ایک لقمہ نہ تھا اور سر چھپا کر بیٹھ جانے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ آخر اس نے مجبور ہو کر گاؤں لوٹ جانے کی ٹھانی لیکن ہل جوتنے اور تاروں کی چھاؤں سے لیکر گہری رات تک کدال چلانے کی جانسوز محنت کے تصور نے ہی اسے پریشان کردیا اور وہ پھر ملازمت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔

آخر سوچتے سوچتے اُسے اپنے ایک پرانے رفیق کا خیال آیا۔ جو ایک رئیس کے یہاں ملازم تھا اس کا نام خیرا تھا۔ خیرا بڑا چرب زبان اور باتونی آدمی تھا اور اسی چرب زبانی کے صدقے میں اپنے مالک کے مُنہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ دیتا اور بعض دفعہ ادھر اُدھر کی باتیں ملا کر نوکروں کو برطرف بھی کرا دیتا۔

خیرا کا خیال آتے ہی بوٹے کو نوکری مل جانے کی امید سی بندھ گئی اور وہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں سر پر نیکار رکھے خیرا کی طرف چلدیا۔ خیرا اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چٹائی پر پڑا سو رہا تھا کہ بوٹے نے اپنی بلند آہنگ "السلام علیکم" سے اسے جگا دیا اور دھپ سے فرش پر بیٹھ گیا۔

"کیا حال چال ہیں بوٹے خاں؟" خیرا نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا ——،

"بہت بُرے۔" بوٹے نے اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فاقوں نے کمر توڑ دی۔"

"کیوں؟" خیرا نے جماہی لیتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ "فاقے کیوں کرنے لگے تم؟"

"ارے بھئی نوکری کی کھوج میں جوتیاں گھس گئی ہیں لیکن نوکری کا کوسوں پتہ نہیں۔"

"ارے کیا کہہ رہے ہو تم، تم تو ان ڈپٹی صاحب کے یہاں نوکر تھے۔"

"ہاں تھا تو لیکن حماقت یہ ہوئی کہ دو چار روز کے لئے گاؤں چلا گیا۔ بُری قسمت، اور کیا؟ جب واپس آیا ہوں تو میری جگہ ایک اور منحوس ڈٹا بیٹھا تھا۔"

"تو تم نے صاحب کو کہا ہوتا؟"

"ایک دفعہ کہا ہے۔ ہاتھ جوڑے پاؤں میں پڑا لیکن غریب کی

سنتا کون ہے۔ ٹکے سا جواب دیدیا۔"

"ہوں!" خیرا نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "آج کل کے نوجوان ہوتے ہیں بڑے کام چور۔ ارے بھئی تم ذرا محنت اور عقلمندی کر کام لیتے تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ مالک لوگ باولے نہیں ہوتے۔ وہ کام چاہتے ہیں کام اور بس۔ اگر ان کی مرضی کے مطابق کام ہوگیا تو واہ وا تم جانو پھر ایک کو کام ہی پیارا ہوتا ہے۔ جام کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے یار کام تو بڑی محنت سے کیا تھا۔ لیکن کیا کروں تقدیر ہی بُری ہے کمبخت۔"

"ہاں کام کیا تھا تم نے؟" تمام دن بیٹھے مکھیاں مارتے رہے اور جب اس کی سزا ملی تو لگے تقدیر کو کوسنے۔ ہماری تقدیر میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ دیکھ لو خدا کے فضل سے چودہ سال گذر گئے ہیں نوکری بجاتے مجال کیا جو ایک دن بھی صاحب کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ گھر کے سارے کرتا دھرتا ہمیں بنے ہوئے ہیں۔ کسی نوکر کو نکالیں تو ہم۔ کسی کو رکھیں تو ہم۔ پھر یہ کہ مہینہ مہینہ بھر کی چھٹی مناتے ہیں۔ جب واپس آئے صاحب نے بڑی خوشی سے رکھ لیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ صاحب بڑے کڑوے مزاج کے آدمی ہیں۔ اگر تمہاری طرح کرتے تو شاید ایک منٹ کو بھی نہ ٹکنے پاتا۔۔۔۔"

بوٹا اس ڈانٹ ڈپٹ کو خاموشی سے برداشت کرتا رہا اور جب خیرا کے لفظوں کا طوفان ذرا کم ہوا تو بولا۔

"اب ساری دنیا تم جیسی کیسے ہو جائے۔ ہم نے تو اپنی بساط بھر بہتیری محنت کی تھی۔"

"بکتے ہو"۔ خیرا نے ذرا تاؤ میں آتے ہوئے کہا "محنت کرتے تو جناب آپ کا صاحب دوسرے آدمی کو نکال کر بھی آپ کو جگہ دیتا لیکن یہ تمہاری سُستی تمہیں کسی طرح جینے بھی دے۔"

"ہاں ٹھیک ہے لیکن اب تو سُستی کی کافی سزا مل گئی ہے اب تو نوکری مل جائے کہیں۔ خیرا! تم بڑے بھائی کے برابر ہو۔ تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بولونگا۔ کئی دن تو بھوکے ہی سو رہنا پڑتا ہے اب اگر تم ذرا مہربانی کرو تو یہ دلدّر دور ہو سکتے ہیں۔"

"بھئی بات یہ ہے کہ ہمارے صاحب ہیں بڑے سخت اور چونکہ خود بڑے محنتی ہیں اس لئے بڑی سختی سے کام لیتے ہیں اگر تم چاہو تو نوکری مل تو جائیگی لیکن آرام ایک منٹ کو نہیں ملیگا۔"

"تمہارے صاحب کو ضرورت ہے کسی آدمی کی؟" بوٹے کے چہرے پر مسرت کی ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔

"ضرورت تو نہیں ہے۔ لیکن میں اس بوڑھے ہندو سے سخت پریشان ہوں۔ اُسے نکلوا دونگا۔ لیکن کام تمہیں محنت اور دیانتداری سے کرنا ہوگا۔"

"میں ہر طرح تمہارے حکم کی تعمیل کرونگا۔ تم ایک دفعہ مجھے نوکر رکھوا دو۔"

"ہاں دیکھو، میں کوشش تو کرونگا اُمید تو ہے تمہیں جگہ مل جائے۔"

"تمہاری یہ مہربانی ساری عمر نہیں بھولوں گا۔"

"اجی خیر مہربانی کا تو کوئی سوال نہیں۔ بات یہ ہے کہ ذرا محنت سے کام کرنا۔ کیونکہ تم جانو اس کام میں میرا ہاتھ ہوگا۔ کہیں میری بھی ناک کٹوا دو۔"

"نہیں نہیں، اس بات کی تو فکر ہی مت کرو۔ مجھے بہت بڑا تجربہ ہوا ہے انشاء اللہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

اتنے میں ماما نے خیرا کو اطلاع دی کہ صاحب اُسے بلاتے ہیں۔

"تم اب جاؤ۔ اچھا کل آنا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔"

خیرا جب اپنے صاحب کے پاس پہنچا تو صاحب آرام کرسی پر لیٹے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"دیکھو خیرا!" اُنھوں نے اخبار پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "ذرا گاڑی جوت لو اور انارکلی سے کچھ کپڑا لا دو ان لوگوں کو ضرورت ہے اور ہندو کہاں ہے اُسے میرے پاس بھیجدو۔"

"جی بہت بہتر سرکار" خیرا نے وفاداری سے سر ہلاتے ہوئے کہا "سرکار ہندو تو افیم کھا کر سو رہا ہوگا آپ وہ کام بھی مجھے ہی بتا دیجئے۔"

"افیم کھا کر" صاحب نے ایک منٹ کیلئے آنکھیں نکال کر خیرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ افیم بھی کھاتا ہے؟"

"اگر افیم نہیں سرکار تو کوئی نہ کوئی نشہ تو ضرور کرتا ہے تبھی دیکھئے نا

دن رات سوتا ہے۔ اگر کسی روز پہرے کی باری آجائے تو رات میں پندرہ پندرہ بیس مرتبہ غائب ہو جاتا ہے۔ سرکار اب تو وہ بڑا ہی بوڑھا ہو گیا اب تو اسے چھٹی دیجئے۔"

"نہیں نہیں اس نے ہماری بڑی خدمت کی ہے۔ اچھا تمہیں ہمارے پاؤں دبا دو۔" خیرا پاؤں دبانے لگا اور صاحب پھر اخبار دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

"سرکار۔" خیرا نے چند منٹوں کے توقف کے بعد کہا "خدمت تو اس نے سرکار کی بڑی کی ہو گی لیکن اب تو روٹیاں چیرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے۔ دوپہر کو تو سرکار یہ حالت ہوتی ہے اس کی کہ اگر بدن پر مکھی بیٹھ جائے تو ہاتھ ہلا کر اسے اڑا دینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ بھلا ایسے لوگ میری سمجھ میں نہیں آتا سرکار نے کیوں رکھ چھوڑے ہیں؟"

"ہاں" صاحب نے لاپروائی سے کہہ دیا۔

"اب اس کے آرام کرنے کے دن ہیں اصل میں" خیرا نے کہا "اب تو اسے چھٹی دیدیں تو اس کے لئے بڑا ہی اچھا ہو۔"

"ارے بھوکوں مر جائیگا بیچارہ! ساری عمر ہماری نوکری کرتا رہا ہے اب بڑھاپے میں یوں دھتکار دینا ٹھیک نہیں۔"

"سرکار مفت تھوڑا ہی کام کرتا رہا ہے۔ مٹھیاں بھر بھر روپے لیتا رہا ہے سرکار سے۔ دس روپے ماہوار تنخواہ اور پھر سرکار کی سخاوت کی تو کوئی انتہا نہیں۔ ہر دن دہار کپڑے، یہ دہ، بڑھاپے کے لئے تو کافی جمع کر لیا ہو گا۔"

"کہاں سے جمع کر لیا ہو گا۔ ایک آپ ہے کھانے والا۔ پھر بیوی ہے ایک لڑکی ہے۔ سب بھوکوں مر جائینگے۔"

"ارے سرکار چھوڑیئے بھی نا؟ وہ اس کی جو لونڈیا ہے تمام محلے والوں کے کپڑے سیتی ہے۔ اور پھر وہ جو اس کی بیوی ہے وہ سارا دن چرخا کاتتی ہے بھلا ایسے میں بھوکوں کیا مرینگے۔ اصل بات تو یہ ہے سرکار کہ اب اس سے کام ہوتا ہی نہیں۔ بیکار کو ایک ہاتھی دروازے پر باندھ رکھنا مجھے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا آیا ہوا ہے آج کل۔ بڑا محنتی ہے اسے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر نوکری کرنے پر تیار کر لونگا۔ وہ راضی تو مشکل ہی سے ہو گا کیونکہ اس کی اپنی زمینیں ہیں اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہ جو ڈپٹی صاحب ہیں وہ اسے چھوڑتے نہیں اگر وہ نوکری پر راضی ہو گیا تو سمجھ لیجئے گھر بھر کا کام سنبھال لیگا۔"

"اچھا خیر! اگر تم چاہتے ہو تو بلا لینا اسے شام کو۔ اب تم جا کر کپڑے لے آؤ۔"

دوسرے دن دو ایک باتیں پوچھنے کے بعد بوٹے کو نوکر رکھ لیا گیا اور اسے کہدیا گیا کہ اپنا سامان لیکر ہندو کی کوٹھری میں آجائے۔

شام کے وقت بوٹا اپنے کپڑوں کی گٹھری بغل میں دبائے خوشی سے ناچتا اور چٹکیاں بجاتا اپنے صاحب کے گھر کی طرف آیا۔ آج اس کی نگاہیں دنیا کی ہر چیز کو فردوس بداماں پاتی تھیں۔ آج کئی دنوں کے بعد اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ چڑیوں کی بے تکی چوں چوں میں بھی ایسا نغمہ پنہاں ہے جو دل اور دماغ کو وجد میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب بوٹا ہندو کی کوٹھری کے قریب پہنچا اس وقت آسمان پہ ستاروں کی افشاں چنی جا چکی تھی اور رات کی فسوں کاریاں آہستہ آہستہ اپنا جادو چلا رہی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا اور اندر مٹی کے چھوٹے سے دیئے کی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بوٹے نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی اعصابی قوتیں ایکدم سلب کر لی گئی ہیں۔ رونے کی دبی گھٹی آوازوں نے اس کے قلب کی حرکت کو ایکدم تیز کر دیا۔ اور وہ دستک دینے کی بجائے دروازے پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے ہندو کی غم و غصہ سے لرزتی ہوئی آواز نشتر بن کر اس کے قلب و جگر میں اتر گئی۔

"اب رونے سے کیا ہو گا۔ اٹھو سامان وغیرہ باندھو اور چلدو نیا نوکر آتا ہو گا۔"

"میں تو یہاں سے مر کر ہی نکلونگی۔" ہندو کی بوڑھی بیوی کی آواز سنائی دی۔ "عمر کے بیس سال اس چھت کے نیچے گذارے ہیں۔ میں جا کر خود صاحب کو کہونگی۔"

"جب تک وہ سانپ کا بچہ خیرا زندہ ہے صاحب ایک حرف نہیں سنینگے۔"

"ہائے میرے اللہ اس اخیر وقت میں کس کے دروازے پہ جائیں تم نے ساری عمر صاحب کی خدمت کی ہے کہو ان سے کہو سنو۔"

"بوڑھے بیل کو کون بھُس دیتا ہے؟" ہندو نے سرد آہ بھر کر کہا۔"اب ایک نوجوان آدمی آگیا ہے وہ سارے گھر کا کام سنبھال لیگا۔ سبھی، مجھے کون رکھتا ہے؟"

"تم اپنا کام تو کر دیتے تھے؟"

"لیکن یہ کام خیرا کو پسند نہیں نا؟ اس کے گاؤں کا ایک جوان لڑکا آگیا ہے وہ ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹائیگا۔ صاحب کا کام تو میں کر دیتا تھا لیکن خیرا کی نوکری نہیں ہوتی تھی مجھ سے۔ بس قصہ ختم ہوا؟"

"الٰہی خیرے کا بیڑا غرق۔ منحوس آستین کا سانپ نکلا۔ یا اللہ تو ہی انصاف کیجیو۔ اس سانپ نے ہمارا بنا بنایا گھر اُجاڑا ہے۔ یہ بھی سُکھی نہ بیٹھے؟"

"اب کوسنوں سے کیا ہو گا۔ چلو اب چلدو یہاں سے۔ اللہ تو ہے جس نے پیدا کیا ہے وہ کھانے کو بھی دیگا؟"

"اس بڑھاپے میں کہاں سے آجائیگی نوکری تمہارے لئے۔ وہ مسٹنڈا تو پھر بھی نوکری اُٹھالے گا۔ تم کہاں سے کھاؤ گے اور ہمیں کیا کر کے کھلاؤ گے؟ یہ لڑکی ابھی تک ہاتھی کی طرح دروازے پر جھول رہی ہے اسے بھی کہیں ٹھکانے لگانا ہے نہیں؟"

"بھیک تو کہیں نہیں گئی۔ اس سفید ڈاڑھی کو سڑکوں پر ملونگا۔ کسی اللہ کے بندے کو تو رحم آئیگا؟"

یہ الفاظ نہ تھے دہکتے ہوئے خنجر تھے جنھوں نے بوٹے کی روح کو زخمی کر دیا۔ وہ کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی وجہ سے ایک ضعیف آدمی اس طرح گلی گلی مارا مارا پھرے۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" بوڑھے ہندو کی آواز سنائی دی۔

"میں ہوں بڑے چاچا بوٹا؟"

"ٹھہرو؟" ہندو نے اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑا سا سامان رہ گیا ہے۔ ابھی خالی کئے دیتے ہیں؟"

"نہیں نہیں بڑے چاچا؟" بوٹے نے گلوگیر آواز سے کہا۔ "کوٹھری خالی کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو گاؤں کو جا رہا ہوں۔ اپنی زمینوں کی کھیتی باڑی کرونگا۔ آپ یہیں رہئے۔ میں نوکری نہیں کرونگا۔ اچھا چاچا میں جاتا ہوں۔ چاچی کو کہہ دیجئے گا بوٹا اور بہت سے کام کر سکتا ہے اگر میں کھلا نہیں سکتا آپ کو تو آپ کا پیٹ کیوں کاٹوں۔ سلام علیکم؟"

بوٹا اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ ہندو چند سیکنڈ تک حیرت واستعجاب میں غرق رہا۔ آخر دروازہ کھول کر پکارا۔

"بوٹا، ارے بوٹا، ادھر آؤ بیٹا؟"

"نہیں چاچا" بوٹے نے دور سے پکار کر کہا۔ "میں اپنے گاؤں کو جا رہا ہوں، تم یہیں رہو؟"

یہاں سے بوٹا خیرا کی کوٹھری میں پہنچا۔ خیرا اس وقت بیٹھا چاول پکا رہا تھا۔ بوٹے کو آتا دیکھ کر بولا۔ "بڑی دیر سے آئے۔ اگر یونہی سستی کی تم نے تو کام کیسے چلے گا۔ جاؤ ہندو کی کوٹھری میں سب سامان وغیرہ رکھ آؤ؟"

"لیکن میں نوکری نہیں کرونگا۔ میں اپنے گاؤں کو جا رہا ہوں؟"

"ہائیں ——!" خیرا نے یکسر حیرت بنتے ہوئے کہا۔ "کیا بک رہے ہو؟ اگر یہی کرنا تھا تو مجھے صاحب کی نظروں میں کیوں ذلیل کیا؟"

"بھائی خیرا! —— میں دوسروں کے بال بچوں کو مار کر خود زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمہاری بڑی مہربانی ہے تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا۔ اب میں جاتا ہوں؟"

"ذلیل کہیں کے۔ ابے اُلو کے پٹھے تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جا دور ہو یہاں سے کتا کہیں کا۔ اُٹھائی گیرا؟"

خیرا گالیاں دیتا رہا اور بوٹا چپکے سے گٹھری اُٹھا کر چلدیا۔

رباعی

دنیا کسی دولت کا خزینہ ہے میاں

حاصل کسی مسعود کو سفینہ ہے میاں

کچھ خوف نہیں [illegible]

[illegible] سفینہ ہے میاں

[illegible] بخاری

وجدانیات!

حضرت علامہ محوی مدظلہٗ لکھنوی

یہاں نہیں ہے، وہاں نہیں ہے، جمال تیرا کہاں نہیں ہے
یہ دونوں ہیں تیری جلوہ گاہیں، زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

وہ عرش بھی فرش کے برابر، وہ خلد بھی ہے ہمیں جہنم
میسّر اے دوست تیرا جلوہ ہم اہلِ دل کو جہاں نہیں ہے

ہنوز ٹوٹی نہیں ہے ہمّت، یہ کہکے بہلا رہا ہوں دل کو
گذر رہی ہو جو اُن کے غم میں وہ زندگی رائگاں نہیں ہے

اُدھر کوئی مُسکرا رہا ہے اِدھر کوئی تلملا رہا ہے
دو رنگیٔ حُسنِ عالم آراء کسی نظر سے نہاں نہیں ہے

بنے ہے جو جان مبتلا پر، اُنھیں سُنا دیتے کاش محوی
مگر کریں کیا کہ دل کے ہاتھوں زباں کو تابِ بیاں نہیں ہے

باقیاتِ مُطالعہ

چند علمی۔ ادبی۔ اور تاریخی حقائق

از جناب فضل حق صاحب قریشی۔ دہلوی

پابندِ اُصول

جناتھن سوئفٹ اپنے زمانہ کا مشہور سیاستدان اور ظرافت نگار گذرا ہے جو اپنی تصنیف "گلیور کے سفرنامے" کے باعث ادب انگریزی میں غیر فانی شہرت رکھتا ہے۔

اُس نے اپنے تمام ملازموں اور خادماؤں کو حکم دے رکھا تھا کہ دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا کریں۔ اول یہ کہ جب کبھی وہ کمرے میں داخل ہوں تو فوراً دروازہ بند کر دیں اور دوسرے یہ کہ جب ضروری کام سے فارغ ہو کر واپس جائیں تو فوراً دروازہ بند کر دیں۔ دروازے کا ایک لمحہ کیلئے بھی کھلا رہنا اُس کے لئے بارِ خاطر تھا۔

ایک مرتبہ اُس کی ایک خادمہ نے چند یوم کی رخصت طلب کی، کیونکہ وہ اپنے ایک قریبی رشتہ دار کی شادی میں شرکت کی غرض سے وطن جانا چاہتی تھی۔ سوئفٹ نے نہ صرف رخصت کی اجازت بلکہ عارضی طور پر ایک گھوڑا لے جانے کی منظوری بھی دیدی تاکہ سفر آسانی سے طے ہو جائے خادمہ کی خوشی کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ فرطِ مسرت میں کمرے سے جاتے وقت دروازہ بند کرنا بھول گئی۔

اُس کو گئے ہوئے تقریباً پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ سوئفٹ نے اُس کی غفلت کو محسوس کیا۔ غصے کے مارے اس کا بُرا حال ہو گیا فوراً ایک ملازم کو حکم دیا کہ ایک تیز رفتار گھوڑا لیکر خادمہ کا تعاقب کیا جائے اور اُس کو منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل لے آئے۔

نصف گھنٹے بعد وہ اپنے آقا کے حضور میں کھڑی ہوئی کپکپا رہی تھی کہ نہ جانے اس غلطی کی کیا سزا ملتی ہے۔ سوئفٹ نے معمولی طور پر حکم دیا کہ دروازہ بند کردو اور چلی جاؤ۔

کج فہمی

ایک مرتبہ لوئیس چہاردہم شہنشاہ فرانس نے اپنے ایک درباری سے جو اپنی سادگی اور سادہ لوحی کے باعث مشہور تھا' دریافت کیا کہ کیا تم ہسپانوی زبان جانتے ہو؟ اُس نے اظہار تاسف کرتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔ لیکن ساتھ ہی یقین دلایا کہ اگر شہنشاہ کا حکم ہو تو وہ بہت جلد اُسے سیکھ سکتا ہے کیونکہ اُس نے قیاس لگایا کہ شاید شہنشاہ اسے سفیر بنا کر سپین بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے جواب پر کوئی توجہ نہ دی گئی اور نہ ہی اُس نے مزید استفسار کیا۔

تقریباً ایک سال بعد اس شخص نے شہنشاہ کے حضور میں آداب بجالا کر عرض کیا کہ میں نے شب و روز کی محنت کے بعد ہسپانوی زبان بہت اچھی طرح سیکھ لی ہے اور نوشت و خواند میں پورا ملکہ حاصل ہو گیا ہے۔ شہنشاہ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے اُس کی قابلیت کی داد دی اور کہا "اب تم ڈون کونگزوٹ" (Don Quixote) کا مطالعہ اصل زبان میں کر کے اس کا صحیح لطف اُٹھا سکتے ہو۔"

ڈون کونگزوٹ ہسپانوی زبان میں مشہور ظرافت نگار سروینٹیز (Cervantes) کی ایک مزاحیہ تصنیف ہے جس میں ایک ایسے

شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جو عملی دنیا سے بالکل الگ محض تخیل پرست تھا۔

قانون

روز ڈیکی ایک روسی فوج کا کپتان تھا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ جسے لڑکی کے باپ نے بہ نظر تحقیر دیکھا۔ اور چونکہ وہ زار روس کے مخصوص حلقۂ احباب میں شامل تھا اس لئے اس امر کی شکایت شہنشاہ کے سامنے پیش کر کے درخواست کی کہ اس ناروا جرأت کی سزا کپتان کو ضرور ملنی چاہئے۔

زار نے فوراً کپتان کو دربار میں طلب کر کے ساتھ ہی ایک پادری کو بھی بلا بھیجا۔ دونوں کے آجانے پر حکم دیا کہ کپتان کے ساتھ لڑکی کا عقد کر دیا جائے۔ باقاعدہ رسم کے ادا ہوتے ہی دوسرا حکم پادری کو دیا کہ طلاق نامہ تحریر کرے جس پر کپتان کے دستخط جبریہ کرا لئے گئے۔

پھر کورٹ مارشل کر کے کپتان کو سزائے موت دی جس کے مرتے ہی اس کی تمام جائداد وغیرہ کا وارث اس لڑکی کو قرار دیا گیا۔ اس تمام کارروائی میں بمشکل ایک گھنٹہ صرف ہوا۔

ایک ہسپانوی گیت

میرا باپ ایک ملاح تھا۔

میرا بھائی — وہ بھی ملاح تھا۔

اور وہ شخص جو مجھ سے محبت کریگا۔

لازمی طور پر ایک ملاح ہوگا۔

. . . .

ہاں! موتی بہت زیادہ قیمت کی چیز ہے۔

اور جواہرات ان سے بھی زیادہ قیمتی۔

لیکن میں جانتی ہوں میری نگاہ میں سب سے زیادہ قیمتی۔

میرے محبوب کا لطیف بوسہ ہے۔

. . . .

میرا محبوب ایک پستہ قد انسان ہے

پس میں ضرور اُسے اپنا بنا لوں گی۔

گنتی کے پتے اور بیشمار پھل ہمیشہ
چھوٹے درختوں ہی پر لگتے ہیں۔

. . . .

میرے چہرے پر نظر مت ڈالو۔

میرا رنگ گندمی ہے۔ میں حسین نہیں۔

جب تم دیکھو تو میری کمر سے نچلے حصہ پر نظر ڈالو۔

اس جگہ میں کیسر مجسّم لذت ہوں

. . . .

دروغ مصلحت آمیز

فرا رو کو ایک زبردست اطالوی واعظ گذرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی زبان میں بہت زیادہ مقناطیسی قوت تھی۔ جس سے وہ اپنے سامعین کو مسحور کر دیتا تھا۔ اکثر زندگی کے معاشرتی پہلوؤں کو اس طرح مذہبی رنگ دیکر اور کسی قدر دروغ مصلحت آمیز روا رکھ کر تقریر کرتا کہ عادی مجرم بھی جرم و خطا سے تائب ہونے کیلئے مجبور ہو جاتے۔

اسے تمباکو نوشی سے سخت نفرت تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ صحت کے نقطۂ نظر سے وہ بہت نقصان دہ ہے ایک مرتبہ وہ ایک ہسپانوی مجمع کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔ اُس نے سامعین کو مخاطب کر کے کہا۔

"مجھے جبرئیل کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ فردوس میں ایک بھی ہسپانوی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا وہاں معدودے چند کو داخل ہونے کی اجازت ملی تھی لیکن انہوں نے اس قدر سگار پیئے کہ فردوس کی تمام فضا دھوئیں سے کالی ہو گئی جس کا بہت ناگوار اثر حضرت مریم کی صحت پر پڑا اور وہ بیمار ہو گئیں آخر سینٹ پیٹر نے ایک ترکیب سوچی۔ انہوں نے جنت کے صدر دروازے کے سامنے دو بیلوں کی کشتی کرائی۔ تمام ہسپانوی جو اس تماشے کے بہت شوقین تھے۔ دوڑ کر باہر نکل گئے۔ سینٹ پیٹر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ فوراً دروازہ بند کر لیا۔ اور آئندہ احتیاط رکھی کہ پھر کسی ہسپانوی کو جنت میں داخل نہ کیا جائے"!

سامعین پر عجیب اثر ہوا اور بیشتر نے عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی تمباکو استعمال نہیں کرینگے۔

سیفو سے خطاب

ایک دیوتا کی مانند وہ مجھے معلوم ہوتا ہے۔
بلکہ دیوتا سے بھی زیادہ اگر یہ ممکن ہو سکے۔
وہ شخص جو تیرے پہلو میں بیٹھ کر
نظر ملاتا اور گفتگو کا لطف لیتا ہے۔

....

اُف! تیرا محبت نواز تبسم۔ جس نے چھین لی
مجھ سے میری روح اور قوت تفہیم کیونکہ اس روز
میں نے تجھے دیکھا۔ جان آرزو میں بیان نہیں کر سکتا۔
موزوں الفاظ میں۔

....

قوت گویائی سلب ہو گئی اور میرے جسد خاکی سے
غیر مرئی گر رقیق شعلے بھڑک اُٹھے۔
میرے کان گونجنے لگے اور میری آنکھوں کے نیچے
اندھیرا چھا گیا۔ گویا رات کا سماں ہے۔

عقل کی گمراہیاں

سر اسحاق نیوٹن (۱۶۴۳ء - ۱۷۲۷ء) انگلستان کا مشہور فلسفی، سائنسداں اور منجم گزرا ہے جس کے بعض نظریئے حیرت انگیز انکشافات کا باعث بنے۔ آخر عمر میں اسے مذہب سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی چنانچہ اس کی دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "حضرت دانیال کی سیرت" اور "الہامات"۔

موخر الذکر میں اُس نے بطور پیشین گوئی لکھا ہے کہ مستقبل قریب میں ایک وقت آنے والا ہے جبکہ انسان پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے لگے گا۔ بظاہر یہ بات ناممکن العمل تھی کیونکہ اُس وقت تک بھاپ یا بجلی کی قوتوں سے انسان ناواقف تھا۔ لہذا نیوٹن کا بہت مزاق اُڑایا گیا۔

والٹیئر (۱۶۹۴ء - ۱۷۷۸ء) فرانس کا زبردست فلسفی شاعر مورخ اور ناول نویس گزرا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"غور کیجئے نیوٹن جس کی دماغی کاوشوں نے کشش ثقل کے مسئلے اور دیگر مفید معلومات سے دنیا کے سامنے غور و فکر کی نئی راہیں کھولیں عہد پیری میں یکسر فاتر العقل اور خبط الحواس ہو گیا۔ انجیل جیسی ناقص کتاب نے ــــ جس کی جہالت آمیز روایتیں کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اُسے نیم العقل بنا دیا اور وہ کہنے لگا کہ انسان پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے لگے گا۔ غیر ممکن، ناقابل یقین"۔

کاش! آج والٹیئر زندہ ہوتا تو اُس سے دریافت کیا جاتا کہ حقیقتہً فاتر العقل اور خبط الحواس کون ہے؟

فیشن

شاہ ایڈورڈ ہفتم ایک دفعہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار جا رہے تھے کہ اچانک وہ مُنہ زوری کرنے لگا۔ اور بادشاہ کیچڑ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں جا پڑے۔ فوراً شاہی درزی کو حکم دیا گیا کہ نئی پوشاک جلد از جلد فراہم کی جائے۔

انتہائی گھبراہٹ میں کچھ تو خود درزی سے استری ٹھیک طور پر نہ ہو سکی اور کچھ گتّے کے بکس میں دب دبا کر پتلون کی شکنیں بجائے سامنے رہنے کے دونوں اطراف میں پڑ گئیں۔ بادشاہ نے اس اتفاقیہ اثر کو بہت پسند کیا۔ اور اس نئی طرز کو رواج دینے کی کوشش کی چنانچہ فیشن کے دلدادہ لوگ پتلون پر اُسی طرح استری کر کے پہننے لگے۔

یہ رواج عرصہ دراز تک قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ متروک ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ آج تمام انگلستان میں ارل بالڈون کی واحد ہستی اپنے بادشاہ کی پسندیدہ وضعداری کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔

تخیلات

از جناب اسمعیل احمد صاحب مینائی تسنیم

جوشِ جنوں نے مشغلۂ دل بدل دیا
دریا کے اضطراب نے ساحل بدل دیا

تدبیر کے بنائے ہوئے ہر طلسم کو
قسمت نے ہو کے بیچ میں حائل بدل دیا

اتنی اُڑائی نجد میں تیا بگولے خاک
مجنوں نے رنگِ پردۂ محمل بدل دیا

آئی بھنور میں ناؤ تو ساحل کے پاس بھی
طوفاں نے اُٹھ کے نقشۂ ساحل بدل دیا

ناکامیوں نے رہ کے مرے ساتھ عمر بھر
سب کچھ سوائے حسرتِ حاصل بدل دیا

پروانہ بن کے گردِ رُخِ یار شمع نے
عنوانِ جاں فروشیٔ محفل بدل دیا

تسنیم اس سے بڑھ کے ستم کیا کہ حسن نے
دل جو تھا اعتبار کے قابل بدل دیا

دست انسانی اور کردار کی ایک دلچسپ تمثیل!

ایک حیرت انگیز ڈرامہ

"یہ لکیریں ہاتھ کی ...."

از جناب پروفیسر عشرت رحمانی صاحب ایم-او-ایل

[آل انڈیا ریڈیو سٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ ہو کر ہر طبقہ و حلقہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور سننے والوں کے بیحد اصرار پر مجلہ عالمگیر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

افراد ڈرامہ

۱- نواب سرور- ایک شوقین نواب صاحب
۲- تنویر مرزا- ایک نوجوان شریف خاندان
۳- باقر حسین- ایک ماہر علم فراست الید (پامسٹ)
۴- بہن- تنویر مرزا کی بہن،
۵- کیمسٹ- ایک انگریزی دوا فروش
۶- پروفیسر سعید- تنویر کا دوست
۷- نوکر-
۸- ایک ٹانگے والا-
۹- ایک موٹر ٹیکسی والا-
۱۰- ایک چوکیدار
۱۱- ڈاکٹر کی آواز
اور چند احباب اور اخبار فروش
وغیرہ

پہلا حصہ (۱)

(ایک کلب میں چند دوست جمع ہیں برج (تاش کا کھیل) کھیل رہے ہیں- بات ختم ہونے پر گفتگو آگے بڑھتی ہے اور بات میں بات نکلتی ہے- ہنسی دلگی-)

نواب سرور- دیکھا تنویر صاحب! کھیل اسے کہتے ہیں-

تنویر- نواب صاحب! یہ کھیل نہیں اسے قسمت کہتے ہیں-

تنویر کا ساتھی- (دوست) اس میں شک نہیں قبلہ لک کا سکہ ہے لک! بازی کیا بازی تھی؟ غضب ہے-

نواب- اماں کھیلنے والوں کو بازی پہچانتی ہے-

تنویر- جی ہاں، جب پتّے اچھے آتے ہیں تو اسی طرح باتیں بناتے ہیں

نواب- تو گویا ہم کھیل جانتے ہی نہیں-

ساتھی دوست- جی! یہ مطلب نہیں مگر آپ کے ہاتھ پر تاش واقعی بیٹھ پڑتا ہے-

نواب- یہ بھی ہمارے کھیل کی خوبی ہے-

تنویر۔ کیوں نہیں۔ غضب خدا کا۔ ڈائمنڈ کے نو کارڈ (پتے) ایک ہی ہاتھ میں۔

ساتھی۔ اور اُن میں بھی چار آنرز۔

تنویر۔ جی........ اور پھر بھی نواب سرور صاحب کے کھیل کی تعریف ہے

نواب کا ساتھی۔ جناب اچھے پتوں سے بھی بُرے کھلاڑی کچھ نہیں بنا سکتے

نواب۔ ہونہہ (خدا کیلئے۔ بھلا انھیں سمجھائے کون ؟

تنویر۔ نواب صاحب! آپ کے پاس جو آتی ہے صرف قسمت سے، آپ کے ہاتھ کی خوبی ——،

نواب۔ شکریہ —— آخر کسی نہ کسی بات کی تعریف تو ہوئی۔

تنویر۔ قبلہ ہٹ دھرمی ہمارا شیوہ نہیں۔ ع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

نواب۔ بھئی ایمان کی پوچھتے ہو تو اپنے ہاتھ کی خوبی کے ہم بھی قایل ہیں ہمارے دوست باقر حسین نے کئی مرتبہ ہاتھ دیکھا اور حساب بتایا ہے انھوں نے جو باتیں بتائیں سب سچ ثابت ہوئیں۔

تنویر۔ ہاں صاحب باقر حسین کی قیافہ شناسی وغیرہ کی تو بہت تعریف سُنی ہے۔

نواب۔ نہیں تنویر صاحب! صرف سُنی نہیں ہم نے خود آزمائی ہے۔

تنویر۔ ہوگا! —— (معترضہ طور پر)

نواب۔ کیا آپ قائل نہیں؟ بلاؤں باقر کو۔ وہ ادھر شطرنج میں ہیں۔

تنویر۔ آپ ہی کو مبارک ہو۔ کیوں انھیں تکلیف دیں۔

نواب۔ نہیں، وہ تو بڑے مخلص آدمی ہیں۔

تنویر۔ ٹھیک ہے۔

نواب۔ بیچارے دلی میں نو وارد ہیں۔

تنویر۔ کہیں باہر کے رہنے والے ؟

نواب۔ ہاں —— اصلی باشندے تو دلی کے ہیں۔ کہتے ہیں عرصہ سے سکونت کر کے کلکتہ چلے گئے تھے۔ شہروں شہروں نجوم کی مہارت کے لئے پھرتے رہے۔ بڑے ماہر ہیں۔ آپ ضرور اپنا ہاتھ دکھائیے لیجئے وہ اس کمرہ سے ادھر ہی آرہے ہیں۔

تنویر۔ گر میرے حال پر تو مہربانی کیجئے۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ اور ایسے ہاتھ دیکھنے والے لوگ بُری طرح چپک جاتے ہیں۔

باقر۔ آداب عرض! نواب صاحب۔

نواب۔ تسلیمات باقر صاحب، یادش بخیر، تشریف لائیے۔

باقر۔ خیریت، یہ ہم جیسے ناکارہ لوگوں کو آپ کیوں یاد فرما رہے تھے

نواب۔ آپ اور ناکارہ —— پھر تو دنیا کی ہر چیز بیکار ہوگئی۔

باقر۔ ذرہ نوازی ہے۔ اچھا ارشاد —— کوئی خدمت ؟

نواب۔ وہی آپ کے ہاتھ دیکھنے کے کمال کا تذکرہ ہو رہا تھا۔

باقر۔ لاحول ولا، بیکار باتیں ہیں صاحب، کوئی کام کی بات کیجئے۔

نواب۔ اب تکلف تو چھوڑیئے۔ ذرا ہمارے دوست تنویر مرزا کو قائل کر دیجئے۔

باقر۔ نہیں بندہ نواز۔ میں کسی بزرگ کو قائل نہیں کر سکتا۔

تنویر۔ مرزا صاحب میری نیت بھی آپ کے امتحان کی نہیں نواب صاحب تو محض دل لگی کر رہے ہیں۔

باقر۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اگرچہ میری اور آپ کی ملاقات پہلے سے نہیں تاہم آپ نواب صاحب کے دوست ہیں۔

نواب۔ باقر صاحب! اب ذرا بسم اللہ کیجئے۔

باقر۔ بڑی خوشی سے، تو مرزا صاحب ذرا اپنا دست نازنیں آمائیے گا۔

تنویر۔ قبلہ مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ مجھے کچھ دلچسپی نہیں —— اچھا خاصہ روگ ہے۔

باقر۔ بات معقول ہے، نواب صاحب کا ارشاد تھا.... ورنہ ....“

نواب۔ باقر صاحب ہمارے تنویر صاحب بہت پکے ہیں۔ اس طرح ایمان لانا دشوار ہے۔ آپ ذرا ان کے سامنے کوئی دوسرا ہاتھ دیکھئے۔

باقر۔ آخر ایسی ضرورت بھی کیا ہے نواب صاحب؟

نواب۔ نہیں نہیں تکلف نہ کیجئے۔ ہمارے ساتھی کا ہاتھ دیکھئے۔

باقر۔ بہتر ہے۔ لائیے جناب ہاتھ سامنے کیجئے۔

نواب کا ساتھی۔ (آواز) یہ حاضر ہے۔

باقر۔ اوہو، آپ کے ہاتھ میں سفر کی لکیریں بہت نمایاں ہیں۔ سمندر پار کے سفر بہت ہیں۔ پہلے آپ نے یورپ کے دو سفر کئے ہیں

دور جانے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔

نواب کا ساتھی۔(آواز) کمال کر دیا آپ نے آئندہ مہینہ ایران کا ارادہ ہے،

نواب۔ واقعی۔؟ واللہ کمال ہے — دیکھا تنویر صاحب؛

تنویر۔ جی ہاں، مجھے کمال سے کب انکار ہے۔

باقر۔ اور جناب والا — آپ کے مزاج میں ——

نواب کا ساتھی۔(آواز) آپ بے تکلف فرمایئے۔

باقر۔ معاف کیجیئے گا۔ میں صاف صاف کہنے کا عادی ہوں۔ تلون زیادہ ہے کبھی آپ ایک کام کا ارادہ فوراً مصمم کر لیتے ہیں۔ مگر جلدی بدل ڈالتے ہیں۔

نواب کا ساتھی (آواز) بالکل صحیح مجھے اپنی اس کمزوری کا احساس ہے۔

نواب۔ تنویر صاحب! اب بھی کچھ اعتراض ہے۔

تنویر۔ قبلہ! آپ زبردستی مجھے معترض سمجھ رہے ہیں۔ مجھے نہ اعتراض ہے نہ اعتقاد۔ آخر جبر کیا ہے؟

نواب۔ بھئی یہ بات ٹھیک نہیں، یا انکار کر دیا ایمان لاؤ۔ یہ دورخی کیسی۔ ہاں باقر صاحب اب دوسرے صاحب کو کہیئے۔

باقر۔ آپ — اچھا آپ — لایئے شرمایئے نہیں صاحب! ہاتھ بڑھایئے — !

تنویر کا ساتھی۔(آواز) ملاحظہ کیجیئے، حاضر ہے۔

باقر۔ ماشاء اللہ — آپ کی عمر کی لکیر تو بہت ہی لمبی ہے۔

نواب۔ گویا آپ عمر دراز خاں ہیں۔ (ہنسنا)

(دوستوں کے قہقہے۔ خوب خوب)

باقر۔ اور صنعت شکار کا شوق تو حد سے بڑھا ہوا ہے۔

تنویر کا ساتھی۔(آواز) بیشک دنیا میں اگر کسی چیز سے عشق ہے تو شکار سے

نواب۔ کیا خوب۔ داد دیتا ہوں، باقر صاحب! کیا نظر ہے واللہ!

باقر۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ اور جناب گستاخی معاف!

تنویر کا ساتھی۔(آواز) فرمایئے — فرمایئے!

باقر۔ آپ وقت کی پابندی نہیں کر سکتے اور — یہ کمزوری آپ کی کامیابی میں بہت حارج ہے۔

نواب۔ بھئی واللہ اس کا تو ہم سب کو تجربہ ہے۔ چار بجے کلب آنے کا وعدہ کریں تو چھ بجے پہنچیں۔

تنویر۔ اور دو تین گھنٹے کی دیر کو آپ دیر کب سمجھتے ہیں۔

باقر۔ خیر یہ تو معمولی بات ہے۔ لیکن ترقی اور کامیابی کے بہت سے راستے آپ کی اس پابندی نہ کرنے سے رُکے ہوئے ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنی چاہیئے۔

تنویر کا ساتھی۔(آواز) شکریہ —!

نواب۔ بس تنویر صاحب! تامل نہ کیجیئے۔ لایئے ہاتھ نکالئے۔ ع
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی،

آوازیں۔ ہاں ہاں تنویر صاحب! آخر حرج ہی کیا ہے۔ کچھ تکلف نہیں۔

نواب۔ شاید ڈرتے ہیں۔ کوئی کمزوری نہ ظاہر ہو جائے۔

تنویر کا ساتھی۔(آواز) مگر یہاں تو سب آپس کے لوگ ہیں۔ غیر کون ہے۔ ڈر کیا ہے۔ (سب کا ہنسنا)

تنویر۔ اچھا قبلہ! — جو آپ کی مرضی۔ یہاں کوئی کمزوری ہی نہیں ہے ع
میں دامن ہی نہیں رکھتا جو الجھے خار دامن میں
لیجیئے مرزا صاحب! ملاحظہ فرمایئے میرا ہاتھ۔

باقر۔ بہت خوب —— (دیکھنا)۔

نواب۔ باقر صاحب! ذرا غور سے دیکھیئے۔ ہمارے تنویر صاحب عقل کے پتلے ہیں۔ کوئی کمی رہ گئی تو ہمارا مذاق،

باقر۔ آپ کا مذاق کیوں جناب قصور میرا ہوگا تو میرا مذاق اُڑائینگے۔

تنویر۔ آپ فکر نہ کیجیئے۔ نواب صاحب کو خواہ مخواہ بدگمانی ہے۔ آپ اطمینان سے دیکھیئے۔

باقر۔ جی ہاں — بالکل اطمینان سے — اچھا اب آپ ذرا دوسرا ہاتھ بھی ادھر —— !

نواب۔ ہاں دونوں ہاتھ دیکھ ڈالیئے۔

تنویر کا ساتھی۔(آواز) ممکن ہو تو دونوں پاؤں بھی۔ (سب کا ہنسنا)

نواب۔ بھئی ہنسیئے نہیں، دھیان بٹتا ہے۔

تنویر۔ کیوں باقر صاحب! آپ میرا ہاتھ دیکھ کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

باقر۔ جی کچھ نہیں — کچھ — میں دیکھ رہا تھا۔

تنویر۔ تو فرمایئے! میری تقدیر کا لکھا آپ نے کیا پڑھا؟ (ہنسنا)

باقر۔ آپ کے ہاتھ کی لکیریں ۔۔ ہاں ذرا دہ بایاں ہاتھ پھر دکھائیے گا۔
تنویر۔ فرمائیے ۔۔ آپ نے کیا دیکھا ۔۔ آپ تو کسی گہری سوچ میں.....
باقر۔ جی ۔۔۔ میں سوچ رہا تھا۔
تنویر۔ تو کہہ ڈالئے ۔۔۔ یہی تو معلوم کرنا ہے کہ آپنے کیا سوچا۔
باقر۔ آپ کا ہاتھ ۔۔۔
تنویر۔ سب سے بدتر اور بدقسمت ہے۔ یہ آپ کو نہیں کہنا چاہئے
یہی سوچ رہے ہیں نا ؟
باقر۔ جی نہیں ۔۔ سب سے اچھا اور خوش قسمت !
نواب۔ اچھا، بہت خوبصورت بیوی ملنے والی ہے کیا ؟
تنویر۔ باقر صاحب، آخر تکلف کیا ہے ۔۔ کچھ تو کہئے۔
تنویر کا ساتھی۔ (آواز) ہاں صاحب جلدی فرما دیجئے آپ نے تو
ہم سب کو مشتاق بنا دیا۔
باقر۔ دو چار مہینے کے اندر آپ سمندر پار کا سفر کرنے والے ہیں اور
کسی عزیز کی جدائی کا صدمہ ۔۔
نواب۔ صدمہ ۔۔ ؟
باقر۔ جی ہاں ۔۔ موت ۔۔ !
تنویر۔ موت، میرے عزیز کی۔ دنیا میں سب سے عزیز میری ایک بہن رہ گئی ہے۔
باقر۔ خدا نہ کرے۔
تنویر۔ تو یہ جدائی بہن کی تو نہیں۔
باقر۔ ہرگز نہیں ۔۔ کوئی دوسرا دور کا رشتہ دار،
نواب۔ اوہ، آپ نے بڑا فکر کیا، اتنی سی بات کیلئے ایسا گہرا سوچ
بھلا آج کل ایسے دور کے رشتہ داروں کا کون صدمہ کرتا ہے۔
تنویر کا ساتھی۔ (آواز) اس زمانے میں اپنوں کو رونے کی فرصت نہیں
تو دور کے رشتہ داروں کا کس کو غم ۔۔ !
باقر۔ مگر یہ موت خوشی کا پیغام لانے والی معلوم ہوتی ہے۔
تنویر۔ خوشی کا پیغام ۔۔ ؟
آوازیں۔ موت ۔۔ اور خوشی کا پیغام ؟
باقر۔ جی ہاں ! کچھ حساب اسی طرح ہے۔
تنویر۔ ہونہہ، اجی چھوڑیئے اس حساب کتاب کے چکر کو۔
نواب۔ بھئی پوری بات کہنے دو، کیا مضائقہ ہے ؛
تنویر۔ اجی بس ہو گئی بات پوری ۔۔ چلئے بھی اب چلیں ۔۔
رات زیادہ ہو گئی۔
نواب۔ اچھا صاحب، آپ کی مرضی ۔ جانے دو۔ چلئے باقر صاحب!
باقر۔ جی، میں تو ابھی ٹھہروں گا ۔۔ ذرا اخبار پڑھ لوں۔
نواب۔ اچھا تو چلئے تنویر صاحب پھر چلیں ۔۔ (سب کا اٹھنا)
تنویر۔ جی ہاں ! چلئے،
تنویر کا ساتھی۔ (آواز) کچھ بھی ہو، آج کے تین چار معرکے رہے۔
" " (دوسری آواز) یہ نواب صاحب کے ہاتھ کی کرامات ہے۔
تنویر۔ نواب صاحب ناراض ہو جائینگے ان کے کھیل کی کرامات کہو۔
(سب کا ہنستے ہوئے چلنا)
سب۔ آداب عرض باقر صاحب! آپ کے اس تقدیر کے لکھے سے
بھی خوب دلچسپی رہتی ہے۔
باقر۔ تسلیم، یہ آپ لوگوں کی نوازش ہے۔
(سب کے باہر جانے کے بعد ۔۔ دروازہ بند ۔۔
پھر کھلنا۔ تھوڑی دیر میں تنویر کا واپس آجانا)
تنویر۔ (آہٹ) میرے دستانے یہاں رہ گئے۔
باقر۔ جی ۔۔ آپ کی کرسی پر تو نہیں،
تنویر۔ شاید اُدھر میز پر ۔۔ وہ ہیں،
باقر۔ خیر مل گئے۔ آپ تو کچھ گھبرا گئے۔
تنویر۔ جی ہاں، باہر نواب صاحب انتظار کر رہے ہیں نا ؟ ہاں باقر صاحب
مجھے یہ دریافت کرنا تھا آپ نے میرے ہاتھ میں اصل بات کیا دیکھی ؟
باقر۔ آپ کیسے سمجھے کوئی خاص بات ؟ ۔۔
تنویر۔ آخر میں بچہ نہیں، یہ تو سمجھ گیا کوئی خاص بات ضرور ہے۔
باقر۔ پھر دریافت ۔۔ ؟
تنویر۔ یہ پوچھنا ہے کہ عزیز کی موت سے خوشی کیسے ؟
باقر۔ خوشی ہو سکتی ہے اور ہو گی ۔۔ !
تنویر۔ واقعی سچ سچ بتائیے کیا بات ہے ۔۔ جلدی فرمائیے نواب
صاحب باہر انتظار ....

نواب۔ (باہر سے آواز) ہاں تنویر صاحب! خود ہی بھاگنے کی جلدی کر رہے تھے، اب رہ گئے۔

تنویر۔ دیکھئے نا۔ فرمائیے ——— جلدی کیا ——؟

باقر۔ کیا عرض کروں؟

تنویر۔ آپ اپنی فیس لینا چاہتے ہیں —— اس کے بغیر نہیں فرمائینگے فرمائیے کیا فیس ——؟

باقر۔ جی نہیں معاف کیجئے، میرا یہ پیشہ نہیں شغل ہے۔

تنویر۔ پھر فرما دیجئے —— اچھا میں آپ کے مکان پر آؤنگا —— آپ کا پتہ کیا ——؟

باقر۔ میرا مکان یہاں نہیں ——!

تنویر۔ بس میں کسی وقت ضرور آؤنگا —— اچھا آداب عرض،

آواز ——————

باقر۔ شکریہ! تسلیم، (جانے کی آواز)

دوسرا سین

[دوسرے دن باقر مرزا کو ہاتھ دکھا کر مفصل حال معلوم کر چکے ہیں۔ گھبراہٹ اور غصہ سے بڑبڑا رہے ہیں]

تنویر۔ (سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بڑبڑانے کی آواز) خون —— کیا سچ مچ قتل! باقر کا علم کہتا ہے میرے ہاتھ سے کوئی قتل ہوگا، مگر اس نے کہا، میرے ہاتھ کی لکیریں صاف بتا رہی ہیں کہ میرا کوئی رشتہ دار میرے ہاتھ سے مارا جائیگا۔ اور اس کی بڑی جائداد اور جاگیر کا مالک میں ہونگا۔

[سیڑھیوں سے اتر کر راستہ پر آچکا ہے]

واہیات، فضول، بکواس ہے، میں کس کو مارونگا۔ اپنے عزیز کو میں مارونگا، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اور اس کی جائداد —— کون ایسا عزیز ہوگا۔ کم بخت نے عجب الجھن میں ڈالدیا —— نامعقول سو روپیہ فیس بھی دیدی، مگر وہ کہتا ہے حساب یہی بتاتا ہے ممکن ہے ٹھیک ہو —— اُف، مگر خون —— اب جلدی گھر چلنا چاہئے چاء تک نہیں پی۔ باقر کی باتوں نے گھبرا دیا —— اس ہوٹل میں کیا ٹھہر سکتا (تانگہ کی آواز) اے تانگہ والا، ادھر لاؤ —— اے سنتا نہیں

ٹانگے والا۔ کہاں جائینگے صاحب!

تنویر۔ اپنے مکان جائینگے۔

ٹانگے والا۔ کس سڑک پر آپ کا مکان ——؟

تنویر۔ بدتمیز، زیادہ بکواس نہ کرو۔ کیا لوگے۔ ہمارے مکان پر چلنا ہے۔ بس!

ٹانگے والا۔ مگر بابوجی، مکان کا پتہ بھی تو ——،

تنویر۔ پتہ کے بچے گردن پکڑ کے نالی میں پھینک دونگا۔

تانگہ والا۔ (گھبرا کر) بابوجی، —— میں نے کیا کیا —— چھوڑیئے۔

تنویر۔ جا چلا جا، ابھی مارا جاتا کمبخت —— مگر اس کے مارنے سے کیا ملیگا؟ تانگہ والا میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہوسکتا —— جا بھاگ جا ——،

تانگہ والا۔ جی —— اچھا بابوجی —— (تانگہ چلا جاتا ہے)

تنویر۔ اُف —— خون، میرے ہاتھ سے، اگر سچ مچ کوئی خون ہوا تو کیا ہوگا —— کیسے ہوگا۔ (ٹیکسی آتی ہے) اے ٹیکسی والا، او موٹر ..... ادھر لاؤ ....."

موٹر ڈرائیور۔ جی —— جناب کہاں جائینگے؟

تنویر۔ پھر وہی بکواس۔ زیادہ باتیں ہم نہیں کرسکتے۔ چاء تک نہیں پی —— اس کمبخت نجومی سے مغز مارتے رہے۔ اب تم لوگ بک بک کرتے ہو۔

موٹر ڈرائیور۔ تو آپ بیٹھئے —— چلئے کہاں چلیں؟

تنویر۔ مکان چلنا ہے، کیا لوگے؟

ٹیکسی والا۔ جو ریٹ ہے اسی حساب سے دیدیجئے گا صاحب۔

تنویر۔ اوہ، بیوقوف، ٹھیک بات نہیں بتاتا، ابھی گلا دبا دونگا۔

ٹیکسی والا۔ صاحب خفا کیوں ہوتے ہیں۔ ٹھیک بات تو بتائی آپ

تنویر۔ آپ کا بچہ —— تمہارا نام کیا ہے؟

ٹیکسی والا۔ میرا نام —— کرن سنگھ!

تنویر۔ بچگیا، بیوقوف، جا گاڑی بھگا لیجا، تجھے مار کے کیا ملیگا مزا نہیں ہے۔ تجھ سے رشتہ داری کیا ہوگی۔

(ٹیکسی والا چلا جاتا ہے۔ اخبار والا تازہ اخبار بیچتا ہوا آتا ہے)

اخبار والا۔ (آوازیں لگاتا ہے) آج کے تازہ اخبار ــــ نئی خبریں پڑھئے
زبردست قتل ہوگیا ــــ قاتل کی گرفتاری کے لئے پانچہزار کا
انعام! ــــ تازی خبریں۔

تنویر۔ (خود بخود) قتل ــــ خون ــــ ہوگیا قتل ــــ کہاں ہوا؟
کون مارا گیا ــــ اوہنہ کوئی ہوگا۔ دن رات یہی ہوتا رہتا ہے
مگر ــــ کسی دن میرے ہاتھ سے بھی کسی کا خون ہوگا ــــ
کیا اسی طرح میری گرفتاری کے لئے بھی انعام ــــ،

اخبار والا۔ بابوجی! ــــ آج کا اخبار اسٹیٹسمین ــــ ہندوستان۔

تنویر۔ چلے جاؤ ــــ نہیں چاہئے، جھوٹی خبریں، قتل خون، واہیات
اُف ــــ اس ہاتھ کے لکھے کا کیا علاج کروں ــــ خون
میرے ہاتھ سے معلوم ہوتا ہے ــــ میرے کپڑوں پر خون کی
بوندیں پڑی ہیں ــــ کیا وحشت ہے ــــ پامسٹری کا حساب
سب واہیات! ایک رشتہ دار کا خون۔ مالدار ــــ جاگیردار
کا خون ــــ خون ــــ،

تیسرا سین

(تنویر اپنے مکان پر، بیحد تھکا ہوا پریشان، کرسی پر پڑا ہے
اور اپنی قسمت کے نوشتے پر غور کر رہا ہے)

تنویر۔ اوفوہ! معلوم ہوتا ہے کوئی میرے دماغ کو خوب کوٹ رہا ہے
کتنی وحشت ہے ــــ خون ــــ اگر سچ مچ مجھ سے کوئی
خون ہوگیا تو کیا ہوگا۔ (جماہیاں لیتا) اوفوہ کمبخت خدمتگار ابھی
تک چائے نہیں لایا ــــ یہ وقت ہوگیا اور ابھی تک چائے نہیں
پی ــــ اس کمبخت قسمت کے لکھے میں پڑکر سارا وقت خراب
گیا۔ دماغ خراب ہوگیا ــــ،

(خدمتگار چائے لیتا ہے)

خدمتگار۔ حضور چائے ــــ کیا انڈا ابھی لاؤں ــــ؟

تنویر۔ اتنی دیر میں چائے لایا، اور اب پوچھے جاتا ہے۔

خدمتگار۔ حضور چائے تو لے آیا۔

تنویر۔ حضور کے بچے بکواس کئے جاتا ہے ــــ چائے لے آیا۔ گویا یہ بھی
بڑا احسان کیا ــــ یہ لے اپنی چائے۔

خدمتگار۔ سرکار ــــ،

تنویر۔ میں اس احسان کو خاک میں (ٹرے لیکر سب برتن زمین پر
پٹک دیتا ہے) ملائے دیتا ہوں ــــ بس، اور ساتھ میں
تجھے بھی (گردن پکڑ کر) ــــ

خدمتگار۔ حضور ــــ سرکا ــــ ر ــــ اُف ــــ ہائے مرا۔

تنویر۔ جو کل ہونا ہے ــــ آج ہو جائے۔ کہیں اس ہاتھ کے لکھے کا
کام بھی تمام ہو ــــ تو ہی مر ٹھیک ــــ!

خدمتگار۔ حضور ــــ ر ــــ مرا ــــ آہ،

تنویر۔ تیرا نام کیا ہے ــــ؟

خدمتگار۔ حضور ــــ میرا نام تو شبن ــــ (ہانپتا ہے)

تنویر۔ شبن تو معلوم ہوتا ہے۔ پورا نام ــــ خاندان کا۔

خدمتگار۔ حضور ــــ شفیع اللہ ــــ،

تنویر۔ مرزا شفیع اللہ ــــ،

خدمتگار۔ نہیں سرکار ــــ میں مرزا نہیں،

تنویر۔ تو جا، بھاگ جا ــــ نکل یہاں سے، میرے سامنے سے چلا جا
نہیں ابھی مارا جاتا ــــ،

(نوکر ہانپتا کانپتا چلا جاتا ہے گھنٹہ گیارہ بجاتا ہے)

تنویر۔ اوفوہ، گیارہ بج گئے ــــ خدا جانے کیا نحوست ہے آج۔ ابھی
چائے تک نصیب نہیں ہوئی، مگر ــــ یہ خون کیسے ہوگا ــــ اس
سے کس طرح بچنا چاہئے۔ (پریشان ٹہل رہا ہے) اس پامسٹ
کی بات شاید سچ ہی ہو ــــ کیا ہوگا پھر ــــ ابھی تو منگنی ہوئی
ہے ــــ خون ــــ خون، سسرال میں قتل کی خبر ہوگی تو ــــ
پھر ہونا کیا چاہئے۔ اس آفت سے چھٹکارا کیسے ہو ــــ اور
اس پیشگوئی کا سارا حال سسرال والوں سے کہدوں۔ وہ
اس کے بچاؤ کی تدبیر نکال لینگے۔ لیکن سسرال میں یہ خبر پہنچی
تو ایک خونی کو کون اپنی بیٹی دیگا ــــ؟ (رک کر) ــــ مگر
میں خون کیوں کرونگا ــــ کیا ضرورت پڑی ہے ــــ؟

ہرگز نہیں — سب جھوٹ جھوٹ ہے — میں کسی کو نہیں مارونگا لیکن یہ پیشینگوئی ہے — قسمت کا لکھا کہتے ہیں مٹ نہیں سکتا پھر تو مناسب ہے کہ اس عذاب سے جلدی نجات پاؤں اور ایک خون کر ہی ڈالوں۔ شادی سے پہلے ہی یہ کام ختم ہو چکے — مگر میرا شکار کون بنے گا — شرط یہ ہے کہ وہ صاحب جائداد بھی ہوگا اور میرا رشتہ دار بھی۔ اچھا تو رشتہ داروں میں کون کون — بیٹھ کے پہلے ایک فہرست بنا ڈالوں — قریب اور دور کے عزیزوں میں کون کون لوگ ہیں۔ (بیٹھ کے لکھتا ہوں۔ — (سوچتا اور لکھتا جاتا ہے) پہلے دور کے رشتہ میں ..... عزیز مرزا — میرے بھائی کے خسر، مگر وہ تو معمولی حیثیت کے آدمی ہیں۔ ان کے پاس جائداد کہاں — چچا انور مرزا؟ وہ تو چچا ہیں — بہت دور کا رشتہ — نہیں، اوہو خالہ بی کے پاس تو بہت جائداد مگر وہ بھی قریبی عزیز ہیں۔ عورتوں میں اور کوئی — آہا، وہ والد صاحب مرحوم کی چچی کی ایک خالہ زاد بہن ہیں، بہت مالدار ہیں اور رشتہ بھی دور کا — ٹھیک اور ان کا کوئی وارث بھی نہیں — بڑھیا ہیں — سنا ہے اکثر بیمار بھی رہتی ہیں — بالکل موزوں، ان کا نام شاید۔ ہاں — اشرف جہاں بیگم — مگر کس طرح کام بنے گا — اوں، تدبیر تو ہو سکتی ہے — زہر کی گولیاں لے جاؤں اور دوا کے نام سے دیدوں۔ بہت دن سے گیا نہیں، کہیں شک نہ کریں — اونہہ دیکھا جائیگا — جب ایک کام کرنا ہی ہے تو سوچ بچار کیا، مگر کون سا زہر، کون زود اثر اور قاتل ہونا چاہئے — آج ہی اس کام سے فراغت کرنا ہے۔ ہاتھ کا لکھا مٹ نہیں سکتا — خون — جائداد — جاگیر — خون —"

چوتھا سین

[تنویر مرزا دوا فروش کی دکان پر]

تنویر۔ مجھے یہ دوا کے لئے چاہئے۔

دکاندار۔ مگر بابو صاحب، یہ تو بہت برا زہر ہے۔ کس دوا میں —؟

تنویر۔ آپ کو بحث کرنے کی کیا ضرورت! [illegible] دیجئے۔

دکاندار۔ اس کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے بغیر ڈاکٹری نسخہ کے ہم [illegible] ——!

تنویر۔ مجھے پتہ ہے [illegible] ڈاکٹر [illegible] ہوگا!

دکاندار۔ تو آپ پکڑے جائیں گے اور [illegible] پکڑے جا سکتے ہیں — ہم [illegible] اور ......

تنویر۔ اوہ، آپ فضول بحث کرتے ہیں — میں نے خود اس دوا کو کوہیا میں نے دیکھ کر لکھا ہے۔

دکاندار۔ مگر چوہوں کے لئے اتنے سخت قسم کے زہر کی حاجت نہیں —

تنویر۔ صاحب مجھے سانپ نے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ میرے سائیس کے پاؤں میں کاٹ لیا۔ نوکر بھاگے جاتے ہیں۔

دکاندار۔ سانپ زہر کھائیگا کیسے جناب — اور اس زہر سے سانپ کا کیا بگڑیگا — آپ کی بات —،

تنویر۔ اوہو، میری بات آپ کو سمجھنے کی کیا ضرورت، آپ تو اس زہر کی دو تین گولیاں بنا دیجئے — میں خود سب کچھ کر لونگا۔

دکاندار۔ بغیر نسخہ یا لائیسنس کے کیسے؟

تنویر۔ میرا نام و پتہ اپنے رجسٹر میں نوٹ کر لیجئے۔ شہر کے سب ڈاکٹر مجھے جانتے ہیں — تنویر مرزا —،

دکاندار۔ یہ ٹھیک ہے مگر —،

تنویر۔ اب اگر مگر نہ کیجئے — جلدی گولیاں بنا دیجئے۔ قیمت لگنی چوگنی، یہ لیجئے دس دس کے دو نوٹ۔

دکاندار۔ خیر آپ کی مرضی، دیکھئے احتیاط سے رکھئے — آپ کی ذمہ داری پہ

تنویر۔ بس آپ اطمینان رکھیں — میری ذمہ داری ہے — گولیاں جلدی —

دکاندار۔ ابھی بناتا ہوں، آپ بیٹھئے — میں ڈبیہ میں بند — (الگ جاتا ہے)

تنویر۔ (خود بخود) کمبخت جا، گولیاں تو بنا کے لا — افسوس یہ ہے کہ تو مرزا نہیں ہو سکتا — مجھ سے کوئی رشتہ نہیں — ورنہ اس تکرار کا مزا چکھا دیتا — ابھی گردن توڑ کر پھینک دی ہوتی۔

(کیمسٹ کی دوکان پر ٹیلیفون)

دکاندار۔ ہو — کون صاحب؟ ڈاکٹر صاحب! جی فرمایئے۔
دوسری آواز۔ دیکھو، میں ڈاکٹر لیتین ٹ سے بول رہا ہوں —
یہاں ایک بیگم صاحب کو دیکھنے آیا ہوں — انھیں دل کا
دورہ ہوا ہے —،
دکاندار۔ اچھا —!
دوسری آواز۔ ہاں ہاں جلدی، کمپونڈر کو انجکشن کا سامان دیکر جلد
بھیجو — سمجھ لیا۔ ہارٹ انجکشن کی خاص دواؤں کا بکس
بہت جلد، حالت خطرناک ہے۔
دکاندار۔ بہت اچھا، مگر کس جگہ بھیجوں ڈاکٹر صاحب؟
آواز۔ نواب اشرف جہاں کی کوٹھی ۲۶ ڈاکٹر لین — اشرف
منزل، جلدی، بہت جلدی —،
دکاندار۔ نواب اشرف جہاں کی کوٹھی — اچھا، بہت اچھا ابھی
(ٹیلیفون بند)
یہ لیجیئے صاحب آپ اپنی ڈبیہ — مجھے بہت ضروری کام۔"
تنویر۔ کیا — یہ نواب اشرف جہاں کا نام کیا لیا آپ نے —
ان کی کوٹھی پر —،
دکاندار۔ کمپونڈر جلدی آؤ — جی ہمارے ڈاکٹر صاحب وہاں سے
بول رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے۔ دل کی بیماری ہے
(ٹن ٹن۔ ٹن ٹیلیفون کی گھنٹی) معاف کیجیئے پھر ٹیلیفون کی گھنٹی
ہو — جی فرمایئے ڈاکٹر صاحب — کیا گذر گئیں؟ — تو
دوائیں نہ بھیجوں — بہت اچھا۔ (ٹیلیفون بند) سخت
حملہ تھا، مہلک اٹیک —،
تنویر۔ کیا — کیا ہوا —؟
دکاندار۔ جی! — وہ بیچاری بیگم صاحبہ گذر گئیں —!
تنویر۔ (گھبرا کر) کیا گذر گئیں —؟
دکاندار۔ جی ہاں — وہ —،
تنویر۔ "اوہو — اب کیا ہوگا — یہ تو —
دکاندار۔ ان کے رشتہ داروں کو جائدا دملیگی — سنا ہے بہت مالدار...
تنویر۔ مجھے جلدی جانا چاہئے — یہ لو اپنی زہر کی گولیاں — اوہ۔

دکاندار۔ کیا — کیا بات ہے صاحب — کیوں —؟
تنویر۔ مجھے نہیں چاہئیں، سب واہیات۔ جھوٹ، فضول!
(جاتا ہے)
دکاندار۔ یہ بھی عجب کا واک آدمی ہے — گولیوں کو کیوں لیا!!
پھر روپے اور گولیاں سب پھینک کے چلتا بنا۔ نہ جانے کون

پانچواں سین

تنویر۔ یہ لکیریں تو سب غلط، بالکل جھوٹ — پامسٹ، نجومی سب
بکواس کرتے ہیں — بڑے ہوشیار باتونی بن کے آئے۔ ساری
پیشین گوئی غلط، اتنی بڑی جاگیردار عزیزہ اشرف جہاں بیگم کا
انتقال ہوا، ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ چند منٹ
اور ٹھہر جائیں تو گولیاں کھلا دیتا۔ اور سب سچ ہوتا۔ اُن کی
ساری جائداد قریبی رشتہ داروں میں بٹ گئی۔ بھلا اتنے دُور
کے عزیز کو کون دیتا ہے؟ میرا نام بھی نہ لیا۔ اب کیا ہونا چاہیئے
خون — اس کمبخت کا نام کیسے مٹاؤں۔ سسرال سے
رخصت کا تقاضا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس پیشین گوئی کا
جھوٹ سچ شادی سے پہلے ہی معلوم ہو جائے۔ کیا کروں شادی
کی تاریخ ابھی ملتوی ہی رکھوں — یہ خون ہو چکے — اگر
بعد میں کچھ ہو گیا تو اس غریب کی زندگی تلخ ہوگی — ٹھیک
پھر ایک بار کوشش کرلوں، ہاں وہ فہرست — اور
کون کون نام باقی رہ گئے۔ ان بیگم کی موت میں تو بہت رشتہ
دار جمع تھے — دُور کے عزیزوں میں مالدار —
(سوچنا) ہاں ایک وہ ہے۔ ہماری ممانی کے بھتیجے۔ نواب
توقیر مرزا، مگر وہ بہت وہمی آدمی ہیں اور ہٹے کٹے تندرست
بھی۔ انھیں زہر کی گولیاں کیسے کھلاؤں۔ کچھ تدبیر اور — کسی
ڈاکٹر دوست سے مشورہ کروں — مگر راز نہ کھل جائے
خون کا معاملہ ہے سائنس کی کتابوں میں کوئی چیز دیکھوں (آہٹ
کون — کوئی آیا ہے۔
باہر سے آواز — تنویر صاحب اندر ہیں؟

تنویر۔ جی ہاں تشریف لائیے ــــ آہا مسٹر سعید ــــ!

سعید۔ بھئی! آپ نے تو دوستوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اچھی نسبت ہوئی۔ بس دن رات بیگم کی یاد میں ــــ (ہنسکر)

تنویر۔ نہیں دوست! یہ تو آپ کا خیال ہے۔ ذرا فرصت کم ملی ــــ ارادہ کر رہا تھا کہ آپ سے ــــ

سعید۔ ہاں صاحب! اب تو نئی شادی کے نئے منصوبے ہوتے ہیں، دوستوں سے ملنے کے تو ارادے ہی کئے جائینگے۔

تنویر۔ شادی ابھی کہاں بھئی، کچھ کام ایسے، ــــ

سعید۔ اچھا صاحب آپ کو کام سے فرصت نہیں تو ہم ہی آگئے۔

تنویر۔ نوازش آپکی ــــ کہئے آپ کی سائنس کی دنیا کی کیا خبریں ہیں؟

سعید۔ سائنس کی خبریں کیا پوچھتے ہو؟ دن رات نئی ایجادیں۔ نئی باتیں ــــ نئے کرشمے ــــ!

تنویر۔ بھئی یہ سائنس کی پروفیسری بھی ہے خوب ــــ!

سعید۔ کیا مطلب ــــ؟

تنویر۔ میں نے کہا۔ ذرا دلگی خوب رہتی ہے۔ نئی ایجادوں کی تفریح۔

سعید۔ تفریح ــــ قبلہ دماغ سوچتے سوچتے گھوم جاتا ہے جب کہیں کوئی ایجاد ہاتھ آتی ہے ــــ اب آج کل ــــ،

تنویر۔ ہاں آج کل کہا ــــ اچھا ایک بات تو بتائیے۔

سعید۔ ارشاد ــــ!

تنویر۔ میں نے کل ایک میگزین میں دیکھا تھا ــــ یہ ڈائنامیٹ ــــ

سعید۔ ڈائنامیٹ تو غضب کی چیز ہے۔

تنویر۔ کہتے ہیں اس کی ذرہ برابر مقدار گھر بھر کو اُڑا سکتی ہے۔

سعید۔ یقیناً۔ سنئے ایک تازہ ایجاد امریکہ کے سائنسدان کی ہے۔

تنویر۔ ہاں فرمائیے ــــ مجھے آج کل اس سے دلچسپی ــــ،

سعید۔ (ہنسکر) خیریت! کوئی بم کا کارخانہ تو نہیں کھولینگے؟

تنویر۔ جی نہیں ــــ اچھا وہ کیا ایجاد ــــ،

سعید۔ اُس نے تجربہ کیا ہے کہ ڈائنامیٹ کی تھوڑی سی مقدار ٹائم پیس کے پینڈولیم میں لگادیں اور اسے کہیں رکھ دیں ۲۴ گھنٹہ کے بعد اس کی رگڑ سے ٹائم پیس پھٹ جائیگا اور اُس کی گیس کمرہ کے ہر جاندار کو ختم کردیگی۔

تنویر۔ (حیرت وخوش) بھئی واہ، ــــ یہ تو حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اس کا تجربہ کرنا چاہئے۔ بہت دلچسپ،

سعید۔ مگر جناب اس تجربہ میں جان جوکھوں کا کام ہے۔

تنویر۔ کیوں کسی ایسی جگہ ٹائم پیس رکھی جائے جہاں آدمی موجود نہ ہوں

سعید۔ پھر تجربہ مکمل کیسے ہوگا؟

تنویر۔ کُتا۔ بلی۔ مرغی، کوئی جانور بند کردیا جائیگا۔

سعید۔ ہاں، یہ تو ممکن ہے۔

تنویر۔ تو یہ مرکب کہاں ملتا ہے۔

سعید۔ ڈائنامیٹ تو بن سکتا ہے۔ مگر اس کا گھنٹے میں لگانا کار دارد

تنویر۔ بھئی میرے مکان میں تو چوہے اس قدر ہوگئے ہیں کہ میں کمبختوں کو اسی دم اُڑا دینا چاہتا ہوں۔

سعید۔ جس طرح ہوسکے اس کو تیار کرو۔ ابھی ہندوستان میں اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ لیکن زیادہ مشکل نہیں۔ ایک کیمسٹ یہاں ہے بہت ماہر سائنسدان ــــ میرے خیال میں وہ بنا سکتا ہے

تنویر۔ تو اس سے ضرور بنوانا چاہئے۔ ہم سے کیوں چھپا رہے ہو۔

سعید۔ نہیں اسی نے مجھے یہ خبر سنائی تھی اور شاید وہ خود بھی تجربہ کر رہا ہے ــــ میرا بہت اچھا دوست!

تنویر۔ بس پھر کیا ہے ــــ تو اس کے نام ایک چٹھی دیدیجئے۔ خوب تفریح رہیگی، عجیب کرشمہ ــــ!

سعید۔ مگر اس میں کم از کم پچاس ساٹھ روپے خرچ ہوجائینگے اور پھر ٹائم پیس یا کلاک کی قیمت الگ ــــ،

تنویر۔ ارے یار تفریح اور پھر ان موذیوں سے چھٹکارا۔ ایک پنتھ دو کاج ــــ خرچ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

سعید۔ بہت اچھا ــــ میں اس سے زبانی بھی کہدونگا اور لائیے چٹھی بھی لکھدوں۔ (خط لکھتا ہے) مگر دوست ذرا احتیاط کرنا۔ کہیں اپنے کمرہ میں یا آدمیوں کے پاس نہ رکھ دینا ــــ اُٹھانا بھی احتیاط سے ــــ،

تنویر۔ آپ اطمینان رکھئے۔ آخر میں کیا جانتا نہیں ــــ؟

سعید۔ یہ لیجئے چٹھی وہ پانچ بجے اپنی لیبوٹری میں ملیگا۔ پتہ لکھدیا ہے۔
تنویر۔ شکریہ ــــ مگر یہ بھی کسی سے کہنا نہیں ــــ ورنہ سب مذاق اُڑائینگے کہ ذراسی تفریح کے لئے اتنا روپیہ اُڑا دیا۔
سعید۔ نہیں جی۔ آپس کی معمولی بات ہے ــــ اچھا خدا حافظ!
تنویر۔ کیوں اتنی جلدی چلے ــ؟
سعید۔ ذرا کام ہے ــــ پھر ملینگے!
تنویر۔ ہاں ہاں میں خود حاضر ہونگا۔ اس تجربہ کی اطلاع بھی دینی ہوگی
سعید۔ ضرور، ــــ آداب عرض ــــ (جانا)
تنویر۔ تسلیم ــــ خوب، یہ سامان قسمت ہی سے بن رہا ہے یقیناً نواب توقیر مرزا کی موت میرے ہاتھ سے لکھی ہے ــــ تقدیر کا کیا علاج؟ خونی بننا ہی پڑیگا۔ ابھی جاکے ڈائنامیٹ کا ٹائم پیس بنواتا ہوں ــــ بلکہ ڈائنامیٹ کلاک بنواؤں ــــ وہ تیزی سے اُڑیگا۔ اور بس نواب صاحب کے سونے کے کمرے میں رکھواتا ہوں ــــ مگر یہ کیسے پہنچے گا؟ اوہ دیکھا جائیگا ــــ نوکر سے یا کسی طرح سے بھی ہوجائے گا۔ پروفیسر سعید کا تو مجھے خیال ہی نہ تھا ــــ اس وقت یہ خوب آیا اور اچھا چٹکلہ ہاتھ لگا۔ کم بخت چھپانے لگا تھا۔ کہتا تھا مشکل ہے، کارے دارد ــــ مگر میں کب چوکنے والا تھا۔ نہ بتاتا تو اس کی جان کو آجاتا۔ ختم ہی کرکے چھوڑتا ــــ جانتا نہیں میں خونی ہوں ــــ ہونہہ ــــ مگر یہ تو مرزا نہیں ــــ سعید احمد خاں ہے، اس سے میرا رشتہ بھی نہیں ــــ مجھے پھر کیا ملتا ــــ ایسے خون تو سیکڑوں ہوسکتے ہیں، مگر شرط رشتے کی ہے۔

چھٹا سین

(پچھلے واقعہ سے کئی روز بعد۔ تنویر اپنے مکان میں ڈائنامیٹ کلاک کے نتیجہ کا منتظر ہے۔)

تنویر۔ ڈائنامیٹ کلاک کا نتیجہ ابھی تک نہیں نکلا۔ ۲۴۔ کیا اب تو ۴۸ گھنٹے ہوگئے۔ یقیناً کل رات سب کچھ ہوچکا ہوگا۔ نواب صاحب کی وفات کی اطلاع کسی اخبار میں نہیں آئی۔ شاید اس میں۔

(اخبار پڑھتا ہے)

اونہوہ! ــ کہیں نہیں، ــــ کیا بات! شاید ابھی کسی کو خبر نہ ملی ہو۔ حادثہ تو عجیب ہے، اخبار والے شایع ضرور کرتے مگر میرے پاس بھی تو خبر آنی چاہئے۔ وہاں جاکے معلوم کروں تو شک ہوجانے کا اندیشہ ہے۔
باہر سے آواز۔ بہن ــــ ارے کوئی ہے ــــ تنویر میاں کہاں ہو
تنویر۔ آپا آرہی ہیں ــــ یہی خبر ــــ،
آواز۔ تنویر بھیا تم کہاں ہو ــــ؟
تنویر۔ آپا بی ــــ یہ ہوں ــــ آداب عرض ہے۔ خیریت؟
بہن۔ خیریت ہے۔ خوش رہو ــ مگر یہ تم کہاں رہتے ہو آتے ہی نہیں
تنویر۔ جی کیا عرض کروں ــــ ذرا آج کل کام بہت ــ
بہن۔ ایسا بھی کیا کام ــــ خیر میں اس وقت اس لئے آئی ہوں کہ تمھاری شادی کی ــــ،
تنویر۔ جی ــــ کیا چچا توقیر مرزا کے یہاں سب خیریت ہے؟
بہن۔ ہاں سب خیریت ہے ــ کیوں تم نے کچھ سُنا؟
تنویر۔ نہیں ــــ میں نے پوچھا کہ ــــ
بہن۔ اچھا وہ اس گھنٹہ کا تم نے بھی کچھ سُنا ہوگا؟
تنویر۔ گھنٹہ ــ کیسا ــ کیا ہوا ــ بیچارے؟
بہن۔ ان کے سونے کے کمرہ میں ایک عجیب گھنٹہ......
تنویر۔ عجیب! سونے کے کمرے میں؟
بہن۔ ہاں ابھی میں نے سنا ہے۔ عجیب واقعہ ہے؟
تنویر۔ آپ نے سنا ہے، وہاں آپ خود نہیں گئیں؟
بہن۔ نہیں، ان کی نوکرانی آئی تھی۔
(جلدی جلدی موت کی خبر معلوم کرنا چاہتا ہے اور اسی کا تقاضا ہے ــــ)
تنویر۔ اچھا تو بیچارے ــــ!
بہن۔ ہمارے چچا توقیر بڑے سیدھے اور بھولے ہیں ــــ اتنی دور کے رشتہ دار ــــ مگر کیسی محبت ــــ!
تنویر۔ ہاں ہم سب کو حقیقی بھتیجا ــــ،

بہن۔ اس میں کیا شک ہے؟ حقیقی سمجھتے ہیں۔
تنویر۔ تو وہ گھنٹہ ——؟
بہن۔ ہاں شام کو ان کے کمرہ میں گھنٹہ رکھا دیا گیا۔ مگر کسی کو نہیں خبر کہ کہاں سے آیا — کون لایا —؟
تنویر۔ اچھا ——!
بہن۔ چچا باہر سیر کو گئے ہوئے تھے — وہ جو گھر آئے تو یہ گھنٹہ دیکھا۔
تنویر۔ (تعجب اور اُمید) دیکھا —— تو — پھر — بیچارے،
بہن۔ بھو کے چچا نے سمجھا — کوئی دوست لایا ہوگا اور چپکے سے تحفہ دے گیا ہے۔ گھنٹہ خوبصورت تھا۔
تنویر۔ ہاں ——!
بہن۔ انھوں نے نوکرانی کے ہاتھ اسی وقت مجھے بھیجدیا۔
تنویر۔ آپ کو —— وہ گھنٹہ ——
بہن۔ ہاں بھیا اس میں تعجب کیا ہے — تم ان کے پاس جاتے ہی نہیں، مجھ پر تو بہت مہربان ہیں وہ ——!
تنویر۔ پھر —— وہ گھنٹہ آیا —؟
بہن۔ میں اور تمھارے بہنوئی باغ میں تھے۔ بچوں نے جو گھنٹہ دیکھا، سب خوش ہو کے نوکرانی کو لپٹ گئے۔
تنویر۔ اچھا ——!
بہن۔ اس کے اوپر پری کی ایک شکل تھی —— بچّے اس سے کھیلنے لگے
تنویر۔ بچّے کھیلنے لگے —؟
بہن۔ ہاں — اتنے میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ کلاک بہت خوبصورت تھا۔ مگر ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ اس میں سے چنگاری سی نکلتی تھی —— اور ہلکے ہلکے پٹاخے سے چھٹتے تھے۔
تنویر۔ اچھا — تو — پھر —؟
بہن۔ پھر دیکھتے ہوئے کھانے کے کمرے میں لے گئے اور وہاں رکھدیا بچوں کو اچھا کھیل ملا — اس کے پٹاخوں کو تالیاں بجا بجا کے دیکھتے — کھانا بھی چھوڑ دیا ——،
تنویر۔ پھر اس میں سے ——!
بہن۔ اس میں سے اب تک پٹاخے چھٹنے کی آواز آتی ہے۔

تنویر۔ اب تک کیا وہ آپ کے یہاں رکھا ہوا ہے؟
بہن۔ اور کیا —— ہاں ایک بات اور ہوئی —— رات میں ایک دھماکے کی سی آواز ہوئی —— نوکروں نے دیکھا تو کلاک کے اوپر کی پری ٹوٹی پڑی ہے۔
تنویر۔ دھماکا ہوا — اُور پری ٹوٹ گئی — بس،
بہن۔ ہاں، اور گھنٹہ برابر چل رہا ہے۔ پٹاخہ کی آوازیں اب ہلکی ہو گئی ہیں — عجیب قسم کا گھنٹہ ہے۔
تنویر۔ اچھا — واقعی عجیب —— سب بے ایمانی ہے — دنیا میں کتنا مکر و فریب —!
بہن۔ کیا مکر بھیا؟ —— یہ تو کسی بڑے کاریگر نے ——،
تنویر۔ ہاں، کوئی بے ایمان، دغا باز کاریگر ہوگا۔ روپیہ اینٹھنے کیلئے
بہن۔ ہم تو سوچ رہے تھے اس کی پری درست ہو جائے تو تمھاری دلھن کو شادی کا تحفہ دیں ——،
تنویر۔ آپا یہ سب دھوکا ہے — فضول چیزیں ہیں —— ہاں آپ ٹھہرینگی —— مجھے ذرا کام کو ——،
بہن۔ کہیں جاؤگے — میں تو اپنے ساتھ لیجانے آئی تھی۔
تنویر۔ ایک ضروری کام ہے۔ پھر آؤنگا۔
بہن۔ اچھا تو میں جاتی ہوں۔ مگر تم شام کو ضرور آنا —— شادی کی بات چیت طے کرنا ہے۔
تنویر۔ جی ہاں —— (بہن کا جانا) —— (دروازہ بند) —— افوہ! کیا غضب ہے۔ ڈائنامیٹ کلاک بھی بیکار ثابت ہوا۔ یہ سب قسمت کا دھوکہ ہے، کہاں سے کہاں پہنچا۔؟ آپا بھی اس وقت کیا بری خبر لے کر آئیں۔ جی چاہتا تھا انہی کا گلا دبا دوں۔ کلاک ان کے کمرہ کو اُڑا دیتا تو کام بنتا —— بڑی آئیں چچا کی بھتیجی —— مگر یہ تو قریبی عزیز حقیقی بہن ہیں اور ان کے شوہر بچے سب موجود، مجھے کیا مل جاتا۔ دنیا میں کتنا فریب ہے سعید نے کیسا جھوٹ بولا۔ اس ڈائنامیٹ کی ناکامی کا تمام الزام سعید پر ہے۔ کمبخت کہتا تھا ۲۴ گھنٹے میں کمرہ اُڑ جاتا ہے — گھنٹہ اب تک چل رہا ہے؟ —— یہ بھی ٹھیک

ہوا — یہ سب اسی نمگرام کیمسٹ کی بے ایمانی ہے۔ روپیہ لیکر ٹھیک نہیں بنایا۔ کھلونا بناکے رکھدیا نامعقول نے — ہونہہ — فضول چیز ہے ورنہ چچا کے پاس ایک اور بھیجدیتا۔ اس نالائق کیمسٹ کا نام کیا تھا — شاید این این جوزف اینڈ کمپنی — اوہ، یہ بھی مرزا نہیں ہو سکتا — بیکار ہے ورنہ اس مکاری کا مزا چکھا دیتا۔ پستول سے اڑا کے اس کا ہی خاتمہ کرتا۔ اب کیا کروں — کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سب اس دھوکہ باز نجومی کا فریب ہے — افوہ —

نوکر۔ حضور — کھانا —

تنویر۔ کمبخت چلا جا — سامنے سے دور ہو — تو مرتا نہیں — کہاں سے لاؤں، کس کو دور کا رشتہ دار بناؤں — یہ آفت کہیں ختم بھی تو ہو۔

(بڑبڑاتا رہتا ہے)

ساتواں سین

(کئی روز بعد — تنویر پریشانی میں سیر کو او کھلا نہر پر جاتا ہے۔)

تنویر۔ یہ لکیریں ہاتھ کی — خون، — قتل، اتنی تدبیریں کیں سب بیکار — غضب میں جان ہے۔ پیشینگوئی کیا ہوئی۔ جان کا عذاب ہوگئی۔ نہ تو سچ ثابت ہوتی ہے نہ اس کے خیال سے دماغ مطمئن ہوتا ہے۔ پریشان کردیا ہے اس قسمت کے نوشتہ نے اس لئے میں ان فضولیات کا قائل نہیں ہوتا۔ مگر اس باقر نجومی نے پاگل بنا دیا۔ دن رات اسی سوچ بچار میں رہتا ہوں اور کچھ بن نہیں آتی کیا کروں کس سے کہوں۔ بات ایسی ہے کہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا۔ بڑا شوقیہ نجومی بنا پھرا کرتا ہے — کمبخت، پکا دکاندار اور فریبی مکار ہے — خون کی جھوٹی پیشینگوئی — کئی عزیزوں پر آزمائش کرچکا۔ اب تو کوئی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہوٹل میں کئی بار گیا — باقر مل جائے تو اس سے پوچھوں، اس مکاری سے تجھے کیا ملا؟ — اوہنہ ہوگا کچھ — دریا کا منظر کیا خوشنما ہے! آج ہوا بھی بہت خوشگوار معلوم ہو رہی ہے۔ سردی ہلکی ہے — یہ کون ہے پل پہ — باقر — ضرور — وہی نامراد — چلو خوب آیا اچھی سیر رہیگی، ذرا دل کی بھڑاس ہی نکلیگی۔ (چل کر)

باقر۔ (آواز) آہا تنویر صاحب — آداب عرض،

تنویر۔ آداب عرض، باقر صاحب!

باقر۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں؟

تنویر۔ کیا خاک مزاج ہیں؟

باقر۔ خیریت — کیا ہوا —؟

تنویر۔ جیسے آپ کو خبر ہی نہیں،

باقر۔ نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم کیا۔

تنویر۔ وہی آپ کی پیشین گوئی —

باقر۔ کیا آپ —؟

تنویر۔ خوب، مجھے اس چکر میں پھنسا کے اب ایسے ننھے بن رہے ہیں۔

باقر۔ آخر کیا ہوگیا صاحب — کیسا چکر —؟

تنویر۔ اس دن سے آج تک میں پریشان ہوں نہ کھانا اچھا لگتا ہے نہ پینا — خواب میں بھی خون کی بوندیں نظر آتی ہیں۔

باقر۔ (قہقہہ) لاحول ولا — آپ تو —

تنویر۔ دیکھئے باقر صاحب! یہ مذاق اڑانے کی سند نہیں — میں بیوقوف نہیں۔

باقر۔ خدا نہ کرے جناب، مگر آپ اس کی فکر میں ایسے کیوں پڑ گئے۔

تنویر۔ اور کیا کروں — یہ سب آپ کے فریب کی بدولت —

باقر۔ میرا فریب —؟

تنویر۔ اور کیا کہوں۔ مروت کی بھی حد ہوتی ہے۔ جھوٹی پیشینگوئی کے چکر میں ڈال کے اب میرا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

باقر۔ جناب میرا کیا قصور — یہ ہاتھ کی لکیریں —

تنویر۔ سب بکواس ہے، اب تک کچھ نہیں ہوا۔

باقر۔ اب تک نہیں ہوا تو کیا ہے۔ جب وقت آئیگا —

تنویر۔ وقت کیا قیامت کے دن آئیگا —؟

باقر۔ قبلہ جو کچھ جس کی قسمت میں لکھا ہے وقت آنے پر خود بخود ہو جاتا ہے ــــ اس کی تلاش میں پھرنے سے کیا ــــ

تنویر۔ بالکل غلط ــــ جب کوشش کرنے سے کچھ نہ ہو تو خود بخود کیا ہوگا۔ یہ آپ نے مجھے دھوکا دیا۔

باقر۔ دیکھئے میں ضبط کر رہا ہوں اور آپ تہذیب کے دائرہ سے ــــ

تنویر۔ میں تہذیب کے دائرہ سے نکل کر بد تہذیب ہو رہا ہوں ــــ آپ کی فیس ــــ،

باقر۔ وہ آپ نے اپنی خوشی سے دیا ــــ،

تنویر۔ اور میں اب اپنی ہی خوشی سے واپس لے رہا ہوں۔

باقر۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔

تنویر۔ تو میں آپ کو تہذیب کا سبق سکھاؤں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا۔

باقر۔ دیکھئے تنویر صاحب ــــ زبان سنبھال کے ــــ،

تنویر۔ کم بخت، ملعون، مکار ــــ،

باقر۔ یہ آپ کی شرافت ــــ ہیں ہیں! یہ بازاری حرکت ــــ میں آپ کا لحاظ، ٹھہرئیے ــــ دیکھئے میرا پاؤں پھسل جائیگا۔

تنویر۔ پل کے نیچے جا۔ (دھکا دینا اور باقر کا نہر میں گرنا)

باقر۔ او۔ او ــــ ہے ــــ ارے (گرنے کی آواز)

تنویر۔ کمبخت، حرامخور ــــ جھگڑا پاک ہوا، نہ یہ ہوگا نہ مجھے ہاتھ کی لکیریں یاد آئینگی ــــ پانی ــــ ڈوب گیا ــــ نجوم بجوم ہونہہ، یہ نجوم کبھی نہ دیکھا کہ اپنی موت بھی آئیگی ــــ،

آٹھواں سین

[تنویر اپنے مکان پر پچھلے واقعات کے بعد]

تنویر۔ اوہو، کیا پریشانی تھی ــــ توبہ! مصیبت میں جان تھی، اس کمبخت پامسٹ کا ہی خاتمہ ہوا۔ اب تو اس کی پیشینگوئی یاد نہ آئیگی ــــ اور ہر وقت خون آنکھوں میں نہ پھرے گا ــــ جھوٹ ــــ فریب ــــ دنیا کو لوٹنے کی فضول باتیں ــــ ہاتھ بانچنا، ہونہہ، باقر کی موت کا اب تو یقین ہو چکا ہے۔ اگر نکلا ہوتا تو اب تک اپنی جگہ پر آجاتا ــــ روز ہوٹل میں جا کے دیکھا ہوٹل والے خود تلاش میں ہیں ــــ کہیں پتہ نہیں۔ اب دوسری دنیا کا رمل دریافت کریں۔ آج ریڈیو کا پروگرام کیا ہے شاید ان کی موت کی خبر ہو۔

(ریڈیو سٹ کھولنا۔ اور گانے کی آواز]

گانا

شعاع محبت بہت دور پہنچی! مرے دل سے نکلی سر طور پہنچی
کہاں سے کہاں پہنچی نامرادی، مرادوں کی میت بہت دور پہنچی

تنویر۔ ٹھیک اس وقت حسب حال گانا ہو رہا ہے۔ اس نامعقول باقر کی میت کہیں سے کہیں جا پہونچی ہوگی۔ ہونہہ۔

ریڈیو کی آواز۔ یہ دلّی ہے۔ اب آپ ہندوستانی میں خبریں سنئے۔

خبریں۔ پہلے ہندوستان کی خبریں سنئے باقر حسین مشہور پامسٹ علم فراست الید (یا ہاتھ بانچنے) کے ماہر کئی دن سے لاپتہ تھے ان کے دوست تلاش کر رہے تھے آج دوپہر کو انکی لاش جمنا کی نہر او کھلا میں بہتی ہوئی ملی ایک ہاتھ اور پاؤں مچھلیوں یا دریائی جانوروں نے کھالیا ہے۔ مرحوم کے رشتہ داروں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ شاید ان کا کوئی عزیز نہیں خیال کیا جاتا ہے ان کی موت خودکشی سے واقع ہوئی جو شاید کام کی زیادتی اور دماغ کی پریشانی میں کی گئی ــــ

(خبریں جاری) مرحوم علم فراست الید یا ہاتھ بانچنے کے علم میں بڑے ماہر تھے عمر کا بڑا حصہ اس علم کی ریسرچ میں گذرا اور انکی آخری تصنیف "ہاتھ کی لکیریں" تیار ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی۔ نقد روپیہ اور کلکتہ میں کئی کوٹھیاں اور بہت کچھ جائداد چھوڑی جس کا کوئی وارث نہیں، تلاش ہو رہی ہے"

تنویر۔ (ایکدم گھبرا کر ریڈیو بند کرتا ہے) بس میں موجود ہوں۔ ان کا صحیح وارث وہ مرزا تھے ــــ مرزا باقر حسین ــــ ضرور وہ مرزا تھے تو میں انکا (قہقہہ) وارث ــــ میرے دور کے رشتہ دار ــــ بڑے ماہر پامسٹ رمال، نجومی، شریف خاندان۔ ان کی پیشینگوئی کا ــــ ایک ایک لفظ صحیح نکلا ــــ

نوکر۔ حضور ــــ کھانا ــــ؟

تنویر۔ ہاں جلدی لاؤ، مجھے بھوک لگی ہے۔ اُفّو ــــ کیسی سچی یہ لکیریں ہاتھ کی ــــ،

[پلاٹ اوسکر وائلڈ کے ایک شاہکار افسانہ سے اخذ کیا گیا ہے]

غزل

از جناب بزمی انصاری بی۔ اے

حسن کی شعلہ باریاں توبہ ‖ عشق کی بیقراریاں توبہ

دل کی دیوانہ واریاں توبہ ‖ صبر کش انتظاریاں توبہ

تیری ان شوخ انکھڑیوں کی قسم ‖ وصل کی شرمساریاں توبہ

فرقتِ یار کے زمانے میں ‖ غم کی ناسازگاریاں توبہ

عشق کے دورِ ابتدائی میں ‖ میری آشفتہ کاریاں توبہ

وہ اُدھر بے نیازیاں اور اِدھر ‖ میری اُمیدواریاں توبہ

دن میں بیتابیاں نگاہوں کی ‖ شب میں اختر شماریاں توبہ

وہ کسی لالہ رُخ کی فرقت میں ‖ رات بھر اشکباریاں توبہ

حسن کے التفات پر بزمی!
دل کی بے اختیاریاں توبہ

امریکہ میں علوم مشرقی کی اشاعت

ایک بہترین معلومات افزا علمی و تحقیقی مقالہ

از جناب حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد مولوی فاضل منشی فاضل

مندرجہ ذیل مضمون امریکن یونیورسٹی بیروت کے ایک پروفیسر کی تحقیقات کا نتیجہ ہے جو "الہلال - قاہرہ" میں شائع ہوا تھا۔ صاحب موصوف ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی کے علوم مشرقی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اسی وجہ سے ذیل کی معلومات ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہیں اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امریکہ جیسے دور افتادہ براعظم میں جس کا مشرق قریب کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کے علوم کی تعلیم و اشاعت کے لئے کس قدر انتھک کوششیں ہو رہی ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے ملک کے لیڈر اس فکر میں ہیں کہ یہاں علوم مشرقی کا تھوڑا بہت جو چرچا ہے اس کو بھی ملیامیٹ کردیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ؛ ثریا نے زمیں پر آسماں سے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی ؛ نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی ؛ جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

کیا اہل بصیرت ان حقائق کو چشم عبرت سے دیکھیں گے کہ ع عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ۔ ارشد!

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں علوم مشرقیہ کا چرچا اور ذوق و شوق اس قدر نہیں جس قدر یورپ میں ہے۔ اس کی وجہ بڑی حد تک جغرافی بعد۔ تجارتی اقتصادی اور سیاسی تعلقات کا فقدان ہے تاہم علوم مشرقیہ کی تعلیم و اشاعت کا جذبہ وہاں بالکل معدوم نہیں ہے بلکہ کثیر پیمانے پر وہاں بھی یورپ کی طرح مشرقی علوم کی تعلیم و اشاعت کا زبردست انتظام ہے۔

چونکہ مشرق قریب کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات قائم نہیں ہیں جس طرح کہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے تعلقات ہیں اس لئے سوائے مذہبی جذبات کے اور کوئی محرک نہیں جو انہیں مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرے۔ وہی نوجوان طلباء جو عیسائیوں یا یہودیوں کے مذہبی پیشوا بننا چاہتے ہیں اپنی مقدس کتابوں کے تعلق سے سرزمین مشرق کی تاریخ، لٹریچر اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں انہی میں وہ طلباء بھی شامل ہیں جو بلاد اسلامیہ چینی اور جاپانی ممالک میں مذہبی تبلیغ و اشاعت کا کام سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ان مقامات کے باشندوں کی زبان، مذہبی رسوم اور ان کے لٹریچر سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ امریکن کالجوں کے مشرقی شعبے کے تمام طلباء مذہبی نقطۂ نگاہ سے ان علوم کی تحصیل کرتے ہیں

بلکہ ان میں سے متعدد طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مقدس مقامات کی سیر و سیاحت یا مشرق قریب میں تجارتی سلسلہ قائم کرتے یا امریکن سفیر و قونصل بننے کے لئے ان علوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چند طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان مشکل علوم پر محض علمی اور طبعی ذوق کی وجہ سے توجہ دیتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سیاسی اور تجارتی تعلقات مشرق اقصیٰ (جزائر فلپائن۔ چین۔ جاپان) کے ساتھ بہ نسبت مشرق قریب کے زیادہ مستحکم اور قوی ہیں مگر دیگر مشرقی علوم کی نسبت امریکن طلباء کی توجہ سامی علوم و فنون کی طرف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ وہ تاریخی تعلقات ہیں جن کی وجہ سے فلسطین بیس لاکھ امریکن یہودیوں اور دس کروڑ امریکن عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔

تعلیم و اشاعت کے وسائل

امریکہ میں علوم مشرقیہ کی تعلیم و اشاعت کے چار بڑے ذرائع ہیں۔ مدارس انجمنیں۔ رسائل۔ کتب خانے۔

مشرقی مدارس!

اس قسم کے مدارس دو طرح کے ہیں (۱) وہ مدارس اور شعبہ جات جن کا یونیورسٹیوں سے تعلق ہے (۲) وہ مدارس جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اور اس کے ساتھ مشرقی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے یونیورسٹیوں کے مدارس کا ذکر ہوگا۔

مشرقی شعبہ جات

امریکن یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کی تحصیل کے لئے مختلف شعبہ جات موجود ہیں جن میں صرف گریجویٹ شامل ہو سکتے ہیں۔ ایسا طالب علم وہاں ایک یا دو سال تک تعلیم حاصل کرتا ہے اس کے بعد وہ ایم۔ اے کی ڈگری کا مستحق ہوتا ہے اور اگر وہ ایک سال اور تحقیقات میں مصروف رہے تو اُسے ڈاکٹری کا ڈپلوما بھی مل جاتا ہے۔ امریکہ میں کم از کم تیس یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن میں مشرقی علوم کا باقاعدہ انتظام ہے ان میں زیادہ اہم اور قابل ذکر ییل۔ ہارورڈ۔ کولمبیا۔ جونس ہپکنس۔ پنسلوانیا اور شکاگو کے جامعات ہیں

ہر ایک جامعہ میں مشرقی شعبے کے ماتحت مشرقی زبانوں اور سامی علوم سریانی۔ عبرانی اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز اردو۔ فارسی پہلوی۔ جاپانی۔ چینی اور ترکی لٹریچر کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام ہے۔

ہارورڈ کالج

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سب سے پرانا ہارورڈ کالج ہے جس کی ۱۶۳۶ء میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر پڑی۔ اس کے کئی پرانے گر نے مذہبی پیشہ اختیار کیا اس وجہ سے اس کالج کے پرانے دستور العمل میں عبرانی زبان اور مشرق کی تاریخ قدیم کا درس شامل تھا۔ مگر مشرقی شعبے باقاعدہ طور سے سال گذشتہ کے آغاز ہی میں منظم ہوئے ہیں۔ اس بارے میں کولمبیا اور ییل کے جامعات نے سب سے پہلے قدم اُٹھایا۔ ہارورڈ تک مشرقی علوم کی تحصیل کا اہم امریکی مرکز شمار کیا جاتا ہے۔ وہاں عربی پروفیسر ڈاکٹر جیمس ہیوٹ (James Hewett) ہیں۔ انھوں نے امریکن یونیورسٹی بیروت میں بھی درس دیا ہے اور سبط ابن الجوزی کی کتاب "مراۃ الزمان" بھی انھوں نے طبع کرائی تھی۔ ہارورڈ کے دوسرے مستشرق جارج فٹ مور G. Foot Moore ہیں جو سامی لٹریچر کے سب سے بڑے امریکی عالم سمجھے جاتے ہیں۔ ایک پروفیسر لیو وینر (L. Wiener) ہیں جنھوں نے "عربی تمدن کا ہسپانوی قوم کے ساتھ تعلق" کے عنوان پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

ییل یونیورسٹی کے مشرقی پروفیسر ڈاکٹر البرٹ کلے (A. Clay) ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ایک جدید نظریئے کے بانی ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ شام اور لبنان سامی قوم کا گہوارہ تھا۔ ڈاکٹر ٹاری بھی وہاں عربی زبان کے ایک معتبر فاضل سمجھے جاتے ہیں۔ ییل میں ایک عمدہ عجائب خانہ مشہور امریکی دولتمند مسٹر مورگن کی مالی امداد سے قائم کیا گیا ہے جس میں سامی تمدن کے متعلق نادر اشیاء موجود ہیں۔

امریکن اساتذہ

مشرقی شعبوں میں تمام اساتذہ امریکن، عیسائی اور یہودی مستشرق ہیں۔ بعض پروفیسر جرمنی کے ہیں مگر یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ

مالک کا کوئی عالم اس منصب پر متعین نہیں ہے۔ عام طور پر یہ اساتذہ جرمن، یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ ہیں اور خاص کر لیپزگ اور برلن ان کا تعلیمی مرکز ہوتا ہے اسی وجہ سے یہاں کی جامعات کا تعلیمی دستورالعمل اور طریقہ تعلیم اصولاً جرمنی مدارس کے پروگرام کے مطابق رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جرمنی ہی کی تالیف کردہ کتابیں بھی نصاب میں داخل ہیں۔ چنانچہ عربی نحو میں سوسن کی مرتب کردہ کتاب پڑھائی جاتی ہے اور سریانی سبق کے لئے بروکلمن کی تالیف کردہ کتاب داخل نصاب ہے اسی طرح اشوری زبان کی تعلیم ڈیلتش کی کتاب سے دی جاتی ہے اور قبطی زبان کی تعلیم کیلئے شینڈورنت کی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔

امریکن مستشرقین عربی زبان میں گفتگو اور تحریر پر اچھی طرح قادر نہیں ہیں حالانکہ وہ مصر و شام کی سیاحت بھی کر آتے ہیں پھر بھی ان کا تلفظ درست نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک مستشرق نے ایک مرتبہ تعارف کے بعد سب سے پہلے یہ سوال کیا۔ "کیا آپ "نخو" سے شناسا ہیں؟"

اس نے نحو کا تلفظ خائے معجمہ سے کیا۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے ہائے حطی سے تلفظ ادا کرنا بہت مشکل ہے تاہم باوجود اس قسم کی خامیوں کے یہ لوگ عربی زبان کے کتابی لٹریچر، تاریخ اور فلسفہ زبان (فیلالوجی) کے زبردست ماہر ہوتے ہیں۔ عربی اشتقاق اور فلسفہ زبان پر انھیں اس قدر مہارت ہوتی ہے کہ اس بارے میں میرے خیال میں شام و مصر کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سامی زبانوں کا سلیبس

چونکہ کولمبیا یونیورسٹی کا شرقی شعبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ منظم ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام کے سامنے اس کے اہم اسباق کا سلیبس تحریر کروں جو اس کے شائع کردہ پروگرام سنہ ۱۹۲۱ء سے ماخوذ ہے۔ (شعبوں کی ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے ہے)۔

سامی زبانیں

الف۔ عبرانی زبان ۔ (۱) قدیم عبرانی زبان کے قاعدے اور اصول (۲) تلمود کا انتخاب (۳) عہد متوسط کے فلاسفر۔

ب۔ سامی تحریرات ۔ (۱) فینیقی خط کی تشریح اور حروف تہجی کی تاریخ۔ (۲) شنجری آرامی تحریر کی تشریح۔ (۳) خط سند اور حمیدی کے کتبوں کی تشریح۔

ج۔ اشوری اور سومری ۔ (۱) زبان کے ابتدائی قواعد (۲) نحو (۳) تکوین اور علفیش کے قصوں کی خواندگی (۴) قانون حمورابی (۴) بابلی، اشوری اور سومری کے منتخب لٹریچر کا پڑھنا۔

د۔ عربی ۔ (۱) صرف و نحو کے قواعد اور عام خواندگی (۲) ابن خلدون کی خواندگی اور تشریح (۳) قرآن شریف (۴) عربی زبان جو مصر و شام میں مروج ہے۔

نوٹ:۔ عربی، عبرانی، چینی وغیرہ مروج زبانوں کے اسباق میں شام کو ہر خواہشمند طالب علم شریک ہو سکتا ہے۔

ہ۔ سریانی ۔ (۱) نحو اور بائبل مقدس کے سریانی ترجمے کی خواندگی (۲) سیر القدیسین۔ (۳) شعر و نظم۔

و۔ حبشی زبان ۔ حبشی زبان کی گرامر اور منتخب خواندگی۔

(مذکورہ بالا زبانیں سامی زبان کی قدیم شاخیں ہیں)

ز۔ تاریخ مشرق ۔ (۱) مغربی ایشیائے قدیم کی تاریخ فارسی عہد تک (۲) عربی تمدن کا نشو و نما اور اسلام کا زمانہ عروج۔ (۳) موجودہ ترکی اور مصر کا دور احیا، اور ان کا اجتماعی اور سیاسی انقلاب۔

ح۔ فیلالوجی یا سامی ادبیات کا فلسفہ زبان۔

ط۔ مصری زبان ۔ قبطی زبان کے قواعد جو قدیم زمانے میں مروج تھے۔

اس کے بعد اسی دستورالعمل میں آرین اور ہندوستانی زبانوں کا نصاب اور سلیبس بھی مندرج ہے۔ چنانچہ سنسکرت، پالی، وغیرہ زبانوں کے متعدد شعبے قائم ہیں۔ زردشتی (جو ایران کا قدیم مذہب تھا اور جس کو پارسی قوم مانتی ہے) بدھ مذہب اور تاریخ ہندوستان اور ایران کی تعلیم کا انتظام بھی ان شعبہ جات میں موجود ہے۔ نہ صرف اسی پر اکتفا ہے بلکہ ارمنی۔ ترکی چینی، جاپانی زبانوں کی تعلیم اور ان کا نصاب و سلیبس شرقی شعبہ جات کی طرف سے تیار کیا گیا ہے۔ الغرض کولمبیا یونیورسٹی ان تمام اسباق کا ہر اس طالب علم کے لئے انتظام کرتی ہے جو ان کی تحصیل کا ارادہ رکھتا ہو۔

مذکورہ بالا دستورالعمل سے ہمیں اس وسیع اور خاص طریقے کا پتہ چلتا ہے جس پر امریکہ کے مستشرقین گامزن ہیں اور جس کی قدر و

انگلینڈ۔ فرانس۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اطالیہ۔ ہالینڈ میں قائم ہیں۔ اسی طرح کلکتہ میں "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی" بھی قائم ہے اور یہ امر قابل اطمینان ہے کہ ایسی انجمنیں باہمی تعلقات قائم کرنے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہیں۔

اس وقت میرے سامنے "امریکن مشرقی مجلس" کی دو شاخوں کی رپورٹ ہے۔ مشرقی شاخ کے اجلاس کرسمس کی تعطیلات میں "جانسن ہپکنس یونیورسٹی" میں ہوئے اور مغربی شاخ کے جلسے جامعہ وسکنسن میڈیسن شہر میں منعقد ہوئے۔ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی شاخ کے جلسوں میں اکسٹھ ارکان شریک ہوئے جن میں نو خواتین تھیں۔ اس کے جلسے پانچ مرتبہ ہوئے۔ اس کے صدر ڈاکٹر ٹلکوٹ ولیمز مشہور امریکن صحیفہ نگار تھے جو اسّی سال قبل لبنان کے ایک موضع عقبیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جو مضمون پڑھا اس کا عنوان "اسلامی خلافت" تھا۔ اس سال جو ارکان منتخب کئے گئے تھے اُن کی تعداد ۱۳۱ تھی۔ اس انجمن کے اعزازی ارکین میں ہنری مور سابق سفیر ترکی اور ولیم ٹافٹ سابق صدر جمہوریہ اضلاع متحدہ امریکہ بھی شامل تھے۔ ان مضامین کے عنوانات سے جو وہاں پڑھے گئے تھے علوم مشرقیہ کے متعلق امریکن قوم کی کوششوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض مضامین حسب ذیل تھے۔

۱۔ کتاب سفر ایوب میں شتر مرغ کا ذکر۔

۲۔ جزائر فلپائین کی عام زبان۔

۳۔ قدیم مصری زبان کی علامتیں اور اس کے مقابلے میں سامی زبان کی علامات۔

۴۔ ان بخور کی کیمیائی ترکیب اور اجزا نباتی جن کا ذکر تورات میں ہے۔

۵۔ حشیشین قوم کی زبان۔

۶۔ طوفان نوح کے بعد کی قوس قزح۔

۷۔ زراعت سے متعلق کلدانی روزنامچہ۔

۸۔ وہ آیتیں جن کا ترجمہ سفر میں غلط کیا گیا ہے۔

۹۔ "حمو" کا اشتقاق۔

۱۰۔ تالمود میں طب

۱۱۔ سامی زبان میں "اداۃ المضارعۃ"؟

ولایات متحدہ امریکہ کے دوران اقامت میں سوائے حالت مجبوری کے اس انجمن کے جلسوں سے میں کبھی غیر حاضر نہیں رہا۔ اس بنا پر مجھے ان کی معلومات سے مستفید ہونے کا بہت موقع ملا۔ اور مجھے اپنے ملک کی تاریخ، زبان، فلسفہ اور مذہب سے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوئیں جو ان کی امداد کے بغیر معلوم ہونی بہت مشکل تھیں۔ مجھے بہت افسوس رہا کہ کوئی ہمارا مشرقی بھائی اس انجمن کا رکن نہیں ہے حالانکہ صرف مشرقی علوم سے دلچسپی کا اظہار اس کی رکنیت کی شرط رکھی گئی تھی۔

اس انجمن کی یہ کوشش یہ بھی تھی کہ یہ انجمن حکومت امریکہ سے ایک ایسا عام مشرقی مدرسہ قائم کرنے کے متعلق گفت و شنید کرے جس میں طلباء کو مشرقی ممالک میں سفارت اور قونصلوں کے منصب کے لئے تیار کیا جائے۔ پریذیڈنٹ ولسن کی حکومت نے اس تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا تھا مگر معلوم نہیں بعد میں حکومت کا کیا طرز عمل رہا۔

دوسری انجمن "انجمن تشریح و تفسیر تورات" ہے جس میں مذکورہ بالا انجمن کے اراکین بھی شامل ہیں۔ اس انجمن کا دائرہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے ان لسانی، تاریخی اور مذہبی مباحث تک محدود ہے جن کا تعلق تورات یا بائبل سے ہے۔ نیویارک اور شہر فلاڈلفیا میں مستشرقین کی ایک اور مختصر سی انجمن ہے جہاں اس کے ارکان کسی ایک رکن کے گھر مہینے میں ایک مرتبہ تعارف اور تبادلہ خیالات کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اور ان جلسوں میں علمی مباحث اور نئی مشرقی کتابوں کے مطالعے اور تبادلے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں نیویارک کی ایسی ایک انجمن کے جلسوں کے منظر کو فراموش نہیں کر سکتا جب اس کے ارکان شام کو آتے تھے اور ان میں سے ہر ایک بقدر استطاعت کتابیں۔ رسالے یا اوراق ہی اُٹھائے ہوئے چلا آتا تھا۔

مشرقی رسائل

"امریکن مشرقی انجمن" کا ایک سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں اراکین انجمن کے مقالات اور لیکچر شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ یال یونیورسٹی میں چھپتا ہے اور اس طرز پر مرتب ہوتا ہے جس طرز پر یورپ کی مشرقی مجالس کے سہ ماہی رسائل شائع ہوتے ہیں۔

ایک رسالہ "صحیفہ سامی لغات" ہے جو جامعہ شکاگو کے شعبہ شرقیات کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ ایک اور اہم شرقی رسالہ "انجمن تفسیر تورات" کی طرف سے بھی شائع ہوتا ہے۔

ان رسائل میں مضمون نگار کسی خاص مضمون پر نہایت جانفشانی اور صحیح تحقیقات کے بعد جو جدید علمی اصول پر مبنی ہوتی ہیں کوئی مقالہ سپرد قلم کرتا ہے تاکہ تعلیم یافتہ اور فضلاء ان کی تحقیقات سے مستفید ہوں۔ یہ مقالات عام مذاق کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ مشرقی علوم سے گہری دلچسپی رکھنے والا ہی ان کو سمجھ سکتا ہے۔ نیویارک میں دوسری قسم کا عام پسند ایک مصور رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جسے کافی امداد حاصل ہے۔ یہ رسالہ مشرق کے اجتماعی اور سیاسی معاملات پر عوام کی دلچسپی کے لئے عام فہم مضامین شائع کرتا ہے (اور تمام دنیا میں کافی مقبول ہے) اس رسالے کا نام "ایشیا" ہے۔

کتبخانے

دارالخلافہ واشنگٹن میں "کانگریس لائبریری" ہے جو امریکہ میں سب سے بڑی لائبریری ہے نہ صرف عمارت اور ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے بلکہ کتابوں کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ اس کی مستحکم عمارت نقش ونگار اور گلکاریوں کی وجہ سے نہایت خوبصورت اور روح افزا ہے۔ ملک کے قانون کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر مطبوعہ کتاب کے دو یا تین نسخے اس کتبخانے کو پیش کئے جاتے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد جب میں اس کتبخانے میں گیا تو اس وقت "الہلال قاہرہ" کے بہت سے پرچے وہاں محفوظ دیکھے۔ میرا گمان غالب یہ ہے کہ اس کتب خانے میں مشرقی کتابوں کا ذخیرہ امریکہ کے دیگر کتب خانوں سے بہت زیادہ ہے۔

نیویارک کی پبلک لائبریری بھی بہت بڑی ہے اس کے مشرقی شعبے میں تیس ہزار کتابیں ہیں یعنی امریکن یونیورسٹی بیروت کے کتبخانے سے بھی زیادہ اس میں مشرقی علوم کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتبخانہ مصر، شام، حجاز، عراق، ارمینیا، ممالک فارس اور دیگر مشرقی ممالک کے اخباروں اور رسائل سے تبادلہ کرتا رہتا ہے۔

موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے اپنا بیشتر وقت اس کتبخانے میں مشرقی کتب کے مطالعہ میں گزارا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ شعبہ کتب شرقیہ کا منتظم ہر اس نئی کتاب کے خریدنے پر آمادہ ہو گیا جس کا نام میں نے اس کے سامنے پیش کیا۔ ان کتابوں کے پہلے صفحہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کتابوں کی بڑی تعداد ایک دولت مند یہودی یعقوب شف کی عطا کردہ ہے۔

ان کتبخانوں کے علاوہ ہر بڑی یونیورسٹی میں ایک کتبخانہ ہوتا ہے جس کے ضمن میں مشرقی شعبہ بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی اشیاء کے عجائب خانے بھی ملحق ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عجائب خانے لندن پیرس اور برلن کے عجائب خانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

میرے علم میں امریکہ کے کتب خانوں میں کوئی نادر قیمتی قلمی کتاب نہیں آئی البتہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا ایک نسخہ کولمبیا یونیورسٹی میں اور سریانی زبانوں کی بائبلوں کے قدیم ایڈیشن واشنگٹن کی کیتھولک یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

مقتبس الہلال، قاہرہ

غزل

جناب مولوی سید محمد عبدالرشید صاحب فاضل بی۔اے۔

کہا تھا حال زار اپنا کبھی دلدار کے آگے
مگر ہوں آج تک نادم دلِ بیمار کے آگے

عبث تکرار دیں ہے اک خرافاتی سے اے واعظ
یہ قصے آپ فرمائیں کسی ہشیار کے آگے

الٰہی اِس طرف بھی وہ بتِ طنّاز آ نکلے
کہ آ جائے نصیحت واعظِ دیندار کے آگے

متاعِ حسنِ کنعاں ہو کہ جنسِ وادیٔ ایمن
نہیں چلتی تمھاری رونقِ بازار کے آگے

مجھے بھی ہے بہت آشوبِ دوراں کا خطر فاضل
نہیں چلتی مگر اس چشمِ دریا بار کے آگے

سچّی کہانی

از جناب آغا رشید مرزا صاحب (دہلوی)

سنگدل عمر نے اپنے بیرحم ہاتھوں سے اس کے چہرے پر غم کی جھریاں ڈال دی تھیں اور افکار کے بوجھ نے اس کی کمر کو خمیدہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کی خوبصورت راز دار آنکھیں جن میں برسوں کا غم پوشیدہ تھا اب بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ منزل شباب کی پرفریب راہوں سے اندھا دھند گذر رہے شوق کے پروں والے قدموں سے۔ اس راستے پر سے جو کبھی سنہری لمحوں کے میدان سے ہو کر گذرتا تھا۔

وہ زندگی سے بیزار تھا لیکن پھر بھی اُسے خندہ پیشانی کے ساتھ جینا پڑتا تھا۔ حیات انسانی کا ایک دَور ہوتا ہے جہاں انسان کے سارے وجود پر بیخودی سی چھائی رہتی ہے اور ہر زیر نقاب چہرے کو عُریاں دیکھنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ ہر انسان کے اس کیف آور دورِ حیات کے ساتھ کوئی نہ کوئی حُسن و عشق کا رومان ضرور واقع ہوتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے یہی کچھ ہوتا آ رہا ہے اور دنیا میں یہی کچھ ہوتا بھی ہے۔

اس نے اپنی زندگی کی سولہ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ اسے احساس حُسن و عشق کے ساتھ ہی زندگی کی تلخ کامیوں کا تجربہ ہونے لگا۔ یہیں سے اس کے رومانوی افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ آسمان نے اتنا تو ہنسایا بھی نہ تھا جتنا رُلانا شروع کر دیا اور اسی طرح رونے کیلئے اور خشک آنسوؤں کے ساتھ بے کیف زندگی بسر کرنے کیلئے اس دنیا میں چھوڑ دیا تھا۔

وہ شاعر تھا اس کے پہلو میں ایک حساس دل تھا پہلی بار جب حسین مجسمہ سے اس کی نظریں دوچار ہوئیں۔ وہ اس کی چچا زاد بہن تھی حُسن و عشق کی پرسوز رنگینیوں سے بے خبر۔ ننھا شاعر دل پکڑ کر رہ گیا۔ کیوپڈ کا وار چل چکا تھا۔ عشق کا تیر لگ چکا تھا۔ محبت کے اس تیر کی خلش نے اُسے ایک نئی بےچینی میں مبتلا کر دیا۔

شاعر حُسن کی طرف دیکھتا تو گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنا چاہتا لیکن کہہ نہ سکتا محبت کا راز چھپ نہیں سکتا۔ عشق کی کہربائی طاقت اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ حُسن کے دل میں بھی ایک نامعلوم کشش پیدا ہوگئی۔ محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں دونوں طرف بھڑک اٹھیں اور محبت کا جواب محبت سے دیا جانے لگا۔ ملاقاتیں ہونے لگیں چاندنی راتوں میں محبت کے رنگین لمحات ایک دوسرے کی معیت میں گذرتے۔ وعدہ وعید ہوتے۔ شکوے شکایات کی جاتیں۔ مستقبل کے لئے لائحہ عمل بنائے جاتے —— لیکن انسان بے خبر انسان مستقبل کی خوش آئند اُمیدوں پر کیسے کیسے قلعے تعمیر کرتا ہے اور زمانہ کا ظالم ہاتھ انھیں آن واحد میں منہدم کر دیتا ہے۔

آخر ایک دن محبت کا راز افشا ہوگیا۔ دنیا والوں نے دیکھ لیا اور دو دلوں کا خون کرنے پر تُل گئے۔ قدامت پسند بوڑھوں کو محبت سے خدا جانے کیا ازلی بَیر ہے —— حُسن کے والدین دل ہی دل میں بگڑ کر واپس چلے گئے۔ اُدھر شاعر کے والدین نے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے علی گڈھ بھیجدیا۔

کئی ماہ تک شاعر صاحب فراش رہا لیکن رفتہ رفتہ کالج کی دلچسپیوں اور تعلیمی مشاغل نے کسی حد تک یہ خیال دل سے محو کر دیا۔ البتہ کبھی کبھی یہ خیال درد بن کر دل میں ضرور چٹکیاں لیتا اور ماضی کے پرکیف لمحات کی یاد دلاتا۔

دن اسی طرح گذرتے گئے برسات کی ایک رنگین شام کو شاعر

ہوسٹل میں بیٹھا اپنے غمزدہ دل کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن بہار کی رنگینیاں اسے اُداسیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ شفق کے خونیں رنگ کو وہ اپنے دل کے خون سے معنون کر رہا تھا۔ غرضیکہ وہ اسی طرح اپنے افسانۂ حیات، کو اپنے ماحول سے مشابہ کر کے شاعرانہ تسلیاں دے رہا تھا کہ اس کے خیالات کا تسلسل ڈاکیہ کی آواز نے توڑ دیا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا، لکھا تھا۔

"امید کی آخری روشنی بھی مایوسی کے دریا میں ڈوبی جا رہی ہے لیکن محبت کی کرنیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دے رہی ہیں۔ ہماری محبت کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ جس کے خوف سے والدین نے جلد سے جلد میری شادی کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ قدرت کے فیصلہ کے آگے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ دنیا کے رسم و رواج اب اس کی بھی اجازت نہ دینگے۔ لیکن محبت کے مشرب میں اتنا ضرور جائز ہے۔ ع

"لبوں پر مُہرِ خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں"

اب آپ مجھے ملنے کا خیال نہ کریں اور حتی الامکان بھول جانے کی کوشش کریں۔"

شاعر نے خط پڑھا تو کچھ دیوانہ سا ہو گیا۔ زخم خوردہ دل پر اور چوٹ لگی۔ بیقراری اور رنج و غم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت شاعر کی تھی وہ ایک عالم بے اختیاری میں اُٹھا۔ سوٹ کیس میں ضروری سامان سفر رکھا اور خاموشی سے نہ معلوم کس طرف چلدیا۔

شاعر کو کالج سے غائب ہوئے کئی ماہ گذر چکے تھے۔ والدین نے خط پر خط ڈالے لیکن کوئی جواب نہ آیا تو کالج کے حکام کو لکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کئی ماہ سے کالج سے غیر حاضر ہے۔ غریب والدین گھبرا گئے اخباروں میں اشتہار دیئے گئے۔ فوٹو شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنے اور شاعر کے احباب کو شاعر کی گمشدگی کے متعلق لکھا۔

شاعر کافی عرصہ تک شہر در شہر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ اس آوارہ

گردی سے پریشان بھی ہوگیا تھا لیکن گھر واپس جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ آخر ایک دوست کے سمجھانے اور اس کی کوششوں سے وہ گھر پہنچا دیا گیا۔ گھر پہنچا تو کسی نے کچھ نہ کہا۔ بات رفت گذشت ہوگئی۔

کچھ دنوں بعد شاعر کو معلوم ہوا کہ حسن کی شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی ہے۔ تاریخ مقررہ سے ایک دن قبل اس نے چند تحائف خریدے اور حسن کو محبت کی آخری پیشکش نذر کرنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ شاعر اپنے دوست کے یہاں ٹھہرا اور بمشکل تمام ایک عورت کے ذریعہ تحائف حسن تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن حسن نے تمام تحائف بجنسہٖ واپس کردیئے۔ البتہ شاعر کی بھیجی ہوئی ساری کا ایک کونہ پھاڑ کر رکھ لیا۔

قضا و قدر نے حسن کو ایسے ہاتھوں میں سونپا جو پولیس میں ملازم تھا۔ انسانیت سے کوسوں دور۔ نااہلیت اور بدمزاجی کا پتلا تھا۔ اس کو حسن کی محبت کے تمام واقعات معلوم ہوچکے تھے۔ اس پر سے لوگوں نے مصالحہ لگا کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا کہ اس حیوان نما انسان کے جذبات برانگیختہ ہوگئے۔ شادی کی پہلی رات ہی کو اس نے حسن کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کیا جو شاید ہی کوئی سنگدل سے سنگدل کرسکتا ہو۔ حسن نے اپنی عقلمندی سے واقعات کو سنبھال لیا۔ ورنہ شاید اُسے ہاتھا پائی سے بھی گریز نہ ہوتا۔ تاہم اس کو حسن کے قابل اطمینان جوابات سے تسلی نہ ہوئی اور اُس نے شاعر سے انتقام لینے اور واقعات کے تصدیق کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

شہر سے دور ایک غیر آباد مقام پر دنیا سے بیزار شاعر اپنے خیالات کی برباد شدہ دنیا میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ کہ کسی شخص کی آمد کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ اس کا رقیب اس کے سامنے پستول لئے کھڑا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا تم میری بیوی سے محبت کرتے ہو؟"

شاعر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "بیوقوف ہو تم اور احمق ہے وہ شخص جو کسی کی بیوی سے محبت کرے"۔

"دنیا جو کہتی ہے۔ کیا یہ سب واقعات ——؟"

"جی ہاں وہ محبت اور واقعات تو آپ کی بیوی ہونے سے پہلے کے ہیں"

شاعر کی بیخوف باتوں اور اُس کے اطمینان سے اسے کچھ اور کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اپنا سا منہ لیکر وہاں سے چلا گیا۔

اس کے بعد شاعر نے ان تمام تحائف کو قبر کی صورت میں ایک جگہ دفن کردیا۔ اور اس کے ساتھ اپنی محبت بھی ہمیشہ کے لئے مدفون کردی۔

اس واقعہ کو دو سال سے زائد عرصہ گذر چکا تھا۔ اس اثنا میں حسن کے یہاں دو بچے بھی ہوئے لیکن اس کی صحت دن بدن گرتی ہی جاتی تھی۔ اور آخر کار ایک دن وہ شمع خاموش اندر ہی اندر جلتے جلتے گُل ہو کر رہ گئی۔ مرتے وقت اس کے بازو پر ایک تعویذ نما دھجی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی وصیت تھی کہ وہ دھجی کھولی نہ جائے اور اسی طرح اس کے ساتھ دفن کردی جائے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی دونوں بچے بھی اپنی ماں کی آغوش میں جا سوئے۔

شاعر کی شادی ہوچکی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے ہر طرح مطمئن تھا۔ لیکن دل کی خلش نے ایک ناقابل بیان تکلیف میں اسے ہمیشہ مبتلا رکھا —— وہ کبھی شاعر تھا، ایک مشہور انشا پرداز تھا لیکن اب وہ شعر و شاعری اور ادب سے بالکل کنارہ کش ہوگیا تھا۔ اس نے اپنا نام اپنا تخلص اپنا حلیہ سب کچھ بدل دیا تھا۔ اور اب ایک شہر میں مُردوں کی طرح زندگی گذار رہا ہے۔

زمانہ بدل جاتا ہے۔ وقت گذر جاتا ہے لیکن دل کے زخم نہیں بھرتے۔ کبھی کبھی جب دنیا کی کشمکش سے اس کی جان چھوٹتی ہے تو خیالات اس کی کتاب حیات کا خونیں باب کھول کر اس کے سامنے پیش کردیتے ہیں اس وقت ماضی کی داستان اور گذرے ہوئے واقعات اور زمانہ کی یادیں وہ ایک گریہ خاموش کرکے رہ جاتا ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے!

جانے والے کی یاد میں!

از جناب شیدا سُبحانی صاحب آدھوی

دردمندانِ محبّت کو ستانے والے — مذہبِ عشق پہ ایمان نہ لانے والے
آرزوؤں کا مری خون بہانے والے — اپنے بیمار سے مُنہ پھیر کے جانے والے
درد بن کر دلِ بیتاب کو تڑپاتے ہیں — یاد رہ رہ کے وہی آٹھ پہر آتے ہیں

اے خوشا وقت کہ رہتے تھے وہ جب ساتھ اکثر — دل میں دونوں کے خوشی ہوتی تھی باہم مل کر
گفتگو ہوتی تھی جی کھول کے بے خوف و خطر — نہ مجھے حِس تھی محبت کی نہ تھی اُن کو خبر
ان کے گھر جاتا تھا میں وہ مرے گھر آتے تھے — نہ جھجک ہوتی تھی مجھکو نہ وہ شرماتے تھے

ہم کو معلوم نہ تھا جذبۂ اُلفت کیا ہے — پیار کس چیز کا ہے نام اور چاہت کیا ہے
حُسن کہتے ہیں کسے حُسن کی قیمت کیا ہے — عشق ہے کون بلا اور محبت کیا ہے
ذہن میں اب بھی لڑکپن کی وہ سب باتیں ہیں — آج تک یاد وہ بچپن کی مُلاقاتیں ہیں

یاد ایام کہ جب مجھ پہ عنایات نہ تھی — اور اگر تھی تو فراوانیٔ جذبات نہ تھی
اس قدر ربط نہ تھا ایسی ملاقات نہ تھی — زندگی چین سے کٹتی تھی کوئی بات نہ تھی
تھا تو پہلے ہی سے اس عشق کا سودا سر میں — یعنی ارمان ہزاروں تھے دلِ مضطر میں

لیکن اُمید کی دنیا سے بہت دُور تھے ہم — اشک پروردہ و غم خوردہ و رنجور تھے ہم
رازِ دل اُن پہ عیاں کرنے سے معذور تھے ہم — عالمِ یاس تھا چُپ رہنے پہ مجبُور تھے ہم
درد اُٹھتا تھا تو سینے سے لگا لیتے تھے — دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو دبا لیتے تھے

حالِ دل اپنا سُنانے کو بھی جی چاہتا تھا — سینے کا زخم دکھانے کو بھی جی چاہتا تھا
ان کو پہلو میں بٹھانے کو بھی جی چاہتا تھا — اور کلیجے سے لگانے کو بھی جی چاہتا تھا
تھی کوئی بات جو خاموش رہا کرتے تھے — نہ دوا کرتے تھے دُکھ کی نہ دُعا کرتے تھے

اصل تو یہ ہے کہ اظہار کی جُرأت ہی نہ تھی — اور جُرأت بھی اگر ہوتی تو قسمت ہی نہ تھی
یہ بھی ممکن ہے انھیں میری محبت ہی نہ تھی — اور ہوتی بھی تو کیا وصل کی صورت ہی نہ تھی

خیر کچھ بھی ہو مگر دل کو یقیں کامل تھا،
جب یہ حالت تھی تو یک گونہ سکوں حاصل تھا
روح بیچین تھی ایسی نہ جگر بسمل تھا
ساز ہستی کا ہر اک تار تھا یکسر خاموش
آہ خاموش تھی سینے میں اور نالے خاموش
تیر خاموش تھے بیداد کے بھالے خاموش
یہ نہ سمجھا تھا کہ ان کو بھی ہے چاہت میری
کیا خبر تھی مرے نالے یہ اثر لائیں گے
زخم ہائے دل مجروح کو دکھلائیں گے
کرکے اقرار وفا صبر و سکوں لوٹ لیا
یاد ہے آنکھوں سے آنسو وہ بہانا اُن کا
کب ہوا ایسا جو ہوتا یہ زمانا اُن کا
صبر کرنے کی جو تلقین کئے جاتے ہیں
یوں تو پہلے بھی طبیعت مری گھبراتی تھی
بیکلی بھی تھی مگر جاں پہ نہ بن آتی تھی،
اب تو میں ہوں دل بیتاب ہے بے خوابی ہے،

غیر ممکن ہے کسی طور سے ملنا اُن کا
دو گھڑی چین سے پہلو میں بھی رہتا دل تھا
بیکسی مونس تنہائی تھی غم شامل تھا
دل میں جذبات کا تھا ایک سمندر خاموش
آبلے دل کے کلیجے کے تھے چھالے خاموش
دیکھکر مجھکو تھے سب دیکھنے والے خاموش
جاگزیں دل میں ہے ان کے بھی محبت میری
مضطرب ہوکے وہ اک دن مرے گھر آئینگے
خود بھی تڑپیں گے تڑپ کر مجھے تڑپائینگے
صاحب ہوش نے اے اہل جنوں لوٹ لیا
ہوکے بیخود مری آغوش میں آنا اُن کا
ہاتھ ملتے ہوئے افسوس وہ جانا اُن کا
وہ مصیبت کو بھی سنگین کئے جاتے ہیں
یاد اُن کی دل بیتاب کو تڑپاتی تھی
روتے روتے ہی سہی نیند تو آجاتی تھی
رات کٹتی ہے تڑپنے میں یہ بیتابی ہے

ضروری اطلاع

بعض خریدار حضرات نے باوجود تاکید کے ٹکٹ ارسال کرتے وقت اپنے نمبر خریداری نہیں تحریر فرمائے ان کی خدمت میں خاص نمبر بغیر رجسٹری کے ارسال کردیا گیا ہے جوکہ اُنھیں موصول ہوا ہوگا۔ اُن کے ٹکٹ دفتر میں محفوظ ہیں! اب بعض ایسے حضرات کے خطوط موصول ہورہے ہیں جن کی ٹکٹیں دفتر میں نہیں آئی ہیں لہذا ان کی غلط فہمی دور کرنے کیلیئے لکھا جاتا ہے کہ دفتر میں جن حضرات کے ٹکٹوں کے لفافے آتے ہیں ان کی باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی ہے پھر اسی فہرست کے مطابق اُن کی خدمت میں رجسٹریاں ارسال ہوتی ہیں۔ کسی خریدار کو جس کے ٹکٹ دفتر میں موصول ہوچکے ہوں پرچہ بغیر رجسٹری کئے نہیں بھیجا جاتا۔ ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔ — مینجر

صحافت کی کرشمہ سازیاں!

اخبار نویسی کے نوادر پر ایک حیرت انگیز مقالہ

از جناب اے۔ آر صاحب رشدی بھوپال

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فن صحافت یا اخبار نویسی اس کا نام ہے کہ اخبارات میں صرف مضامین لکھے جائیں اور ایک خاص زاویہ نگاہ سے سیاست حاضرہ پر تبصرہ کیا جائے لیکن اس سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر ہم اخبار نویسی کی تعریف کریں تو غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحافت اہم خبروں کے جلد از جلد عوام تک پہنچا دینے کا نام ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اخبار نویس نت نئے طریقہ سے خبریں حاصل کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات کسی اہم خبر کے چرانے یا کسی بحری معاہدہ اور جنگی تجویز کے قبل اشاعت اڑا دینے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں اور ہمیشہ اس امر میں کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے اخبار میں سب سے پہلے یہ اطلاع شائع ہو جائے۔ ذیل میں ہم چند واقعات ہدیۂ قارئین کرتے ہیں جن سے اخبار نویسوں کی حیلہ جوئی اور کرشمہ سازی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح انھوں نے یہ عجیب و غریب اطلاعات حاصل کیں۔

۱

۱۸۷۱ء کا ذکر ہے کہ "نیویارک ہیرلڈ" کے مالک نے ایک جماعت افریقہ کو اپنے اخبار کے ایک ایڈیٹر مسٹر "اسٹینلے" کی سرکردگی میں مشہور سیاح "لونگسٹن" کی تلاش کے لئے روانہ کی۔ جب یہ جماعت قصبہ "اوجی جی" میں وارد ہوئی جو جھیل "ٹنگانیکا" کے کنارے آباد ہے تو اس کو "لونگسٹن" کے متعلق کچھ اطلاعات موصول ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی اقامت گاہ کا پتہ بھی لگ گیا۔ اس جماعت کے سردار نے فوراً کچھ حبشیوں کو ایک قریب ترین ریلوے اسٹیشن پر بھیجا۔ تا کہ وہاں سے نیویارک ہیرلڈ کو اس کی اطلاع اس زمانہ کے ذریعہ خبر رسانی سے بھیجی جا سکے۔ کچھ روز کے بعد اسٹینلے اور لونگسٹن سیاح ایک جا جمع ہو گئے۔ اسٹینلے نے چاہا کہ اس کو اپنے ساتھ لے جائے لیکن لونگسٹن نے جانے سے انکار کر دیا۔

اس کے چار ماہ بعد یہ جماعت جس کو دو سال اسی تفتیش اور جستجو میں گذر گئے تھے دوبارہ لونگسٹن کی تلاش میں سرگرداں پھرتی رہی لیکن اس کا پتہ نہ چلا تو ۱۸۷۳ء میں اخبار "نیویارک ہیرلڈ" اور "ڈیلی ٹیلیگراف" نے اسٹینلے کو دوبارہ افریقہ بھیجنے کا ارادہ کیا تا کہ اس کے صحیح حالات معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ اسٹینلے نے اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔ اور اس عظیم جلیل سیاح کی وفات کی اطلاع نہایت تحقیقات سے شائع کی۔

۲

۱۸۷۹ء میں ایڈیسن نے برقی لیمپ ایجاد کیا۔ اس کی [illegible] خفیہ طور سے مسٹر فاکس کو جو "نیویارک ہیرلڈ" کے رکن ادارہ تھے پہنچ گئی انھوں نے عوام کے سامنے ایک ایسی خبر پیش کی جو بہ نسبت حقیقت کے وہم و گمان سے زیادہ قریب تھی اور جس نے تمام [illegible] گشت [illegible] مالک اخبار نے جونہی یہ خبر پڑھی دوڑا ہوا آیا تا کہ وہاں [illegible] تحقیقات کرے۔ دفتر میں معلوم ہوا کہ اس خبر کی اشاعت [illegible] جو نہایت معتمد اور ثقہ انسان [illegible] کرتے۔ حقیقتاً "نیویارک ہیرلڈ" کی [illegible]

اس خبر کی اشاعت کا فخر حاصل ہوا۔ اگرچہ ابتدا میں نہ صرف عوام بلکہ خواص اور اس زمانہ کے مشہور جرائد نے بھی اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔

۳

۱۸۸۴ء میں مسٹر جیمز بلائن جمہوریہ جماعت کی طرف سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی صدارت کیلئے اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ ہر شخص کو ان کی کامیابی کا پورا یقین تھا اور کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی جس سے ان کو ناکامی کا خیال پیدا ہو سکے حتیٰ کہ ان کے بعض احباب نے ان کی منتظرہ کامیابی پر پیشگی مبارکباد دینا شروع کر دی۔ اتفاقاً ان کے معاونین کی ایک جماعت نے جو تقریباً چھ سو افراد پر مشتمل تھی ڈاکٹر برشاڈ کو مسٹر جیمز کے انتخاب سے ایک دن قبل مدعو کیا۔ وہاں اتفاق سے ڈاکٹر صاحب نے ایک ایسی تقریر کر دی جس میں غیر متوقع طریقے پر ڈیموکریسی پارٹی کی مدح سرائی فرمائی۔ اس تقریر کا اثر حاضرین پر بہت زیادہ پڑا۔ نیز مزید براں یہ کہ ایک اخبار نے جو "جمہوری جماعت" کے خلاف تھا فوراً سب سے پہلے اس تقریر کو شایع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر جیمز بلائن جو ایک حد تک اپنے آپ کو صدر جمہوریہ امریکہ سمجھ رہے تھے اور وہی کیا بلکہ ہر شخص کا خیال تھا کہ ان کی کامیابی ایک یقینی امر ہے ناکام رہے۔ اگر اس تقریر کی اشاعت میں ایک روز کی دیر ہو جاتی تو مسٹر بلائن اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب تھے۔

۴

۱۸۸۵ء میں جنرل گرانٹ صدر جمہوریہ امریکہ سخت بیمار تھے۔ اور زندگی کی تمام اُمیدیں منقطع ہو چکی تھیں لوگوں کو ہر وقت یہ خیال تھا کہ اب ان کی وفات کی اطلاع شایع ہوئی کیونکہ ان کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک اخبار کے نامہ نگار نے یہ سوچا کہ کسی صورت سے صدر کے طبیب خاص سے مل کر یہ طے کر لیا جائے کہ جب ان کا انتقال ہو فوراً کوئی خاص نشانی محل کی کھڑکی میں رکھ دی جائے چنانچہ یہی ہوا کہ جب صدر کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر نے ایک مقررہ نشان کھڑکی میں رکھ دیا جس کو سوائے اس نامہ نگار کے کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے اخبار کو اس خبر کی اطلاع دی اور بقیہ اخبارات اس خبر کی اشاعت میں پیچھے رہ گئے۔

۵

[illegible]ء میں جزائر فلپائن کے بارے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سپین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ متعدد معرکہ آرائیاں ہوئیں مگر سب سے زیادہ اہم لڑائی وہ تھی جس میں امیرالبحر ڈیوی نے ہسپانوی بیڑے پر فتح پائی امیرالبحر موصوف اس کی اطلاع امریکہ کو نہ بھیج سکے۔ چونکہ ٹیلیگراف کے تار کاٹ ڈالے گئے تھے اور موقع جنگ کا فاصلہ امریکہ سے سات ہزار میل تھا یہی وجہ تھی کہ اس کامیابی کی اطلاع امریکہ میں ایک ہفتہ بعد پہنچی۔ اس خبر کی اشاعت بھی بڑی دلچسپ ہے وہ یہ کہ امریکہ کے بیڑے میں متعدد اخبارات کے نامہ نگار تھے اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اپنے اخبار کو سب سے پہلے اطلاع دے۔ چنانچہ جب یہ بیڑا ہانگ کانگ پہنچا اور لنگر انداز ہونے لگا۔ تو تین نامہ نگار پانی میں کود پڑے اور خشکی میں سب سے قبل پہنچنے کے لئے جدوجہد کرنے لگے تاکہ تار گھر پہنچ کر اپنے اخبار کو اس کامیابی کی اطلاع دیں۔ اس مقابلہ میں "نیویارک ورلڈ" اور "شکاگو ٹریبون" کے نامہ نگار مسٹر ہارون سب سے اول رہے انھوں نے اپنے دونوں اخبارات کو نہایت مفصل تار روانہ کر دیئے۔ جو فوراً امریکہ میں شایع ہو گئے۔ خود حکومت کو بھی اس کامیابی کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ پہنچی۔ امیرالبحر کی سرکاری رپورٹ تو سات گھنٹہ بعد موصول ہوئی۔ سرکاری رپورٹ کے اتنی دیر میں پہنچنے کی یہ وجہ تھی کہ اس کے ایک ایک لفظ کو نیویارک کا تار گھر مزید تصحیح کے لئے پھر ہانگ کانگ روانہ کرتا تھا اور ہانگ کانگ سے وہی الفاظ مکرر نیویارک بھیجے جاتے تھے تاکہ کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے غرض حکومت امریکہ اور اس کی رعایا دونوں نے اخبارات کے ذریعہ اس اطلاع کو معلوم کر لیا۔

۶

۱۹۰۳ء میں روم کے بشپ لیون سیزدہم کا انتقال ہوا اور رسم کے مطابق اس اطلاع کو پردۂ راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی بشپ مرتا ہے تو کئی گھنٹے تک اس کی وفات کی خبر راز میں رکھی جاتی ہے۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ بشپ کے انتقال سے پہلے روم میں امریکہ کے اخبارات کا ایک نامہ نگار موجود تھا۔ اس نے اپنے اخبارات سے یہ طے کر لیا تھا کہ جب بشپ کا انتقال ہوگا تو وہ ایک تار بھیجے گا جس کا مضمون یہ ہوگا کہ "فلاں گمشدہ چیک کا نمبر [illegible] ہے" اس میں بظاہر بشپ کے انتقال کی طرف کوئی اشارہ معلوم نہیں ہوتا

بشپ کا انتقال صبح ۹ بجکر ۴ منٹ پر ہوا تو نامہ نگار مذکور نے حسب ذیل برقیہ ارسال کیا۔ "گمشدہ چیک کا نمبر ۴،۴۴ ہے امید کہ تمام بینکوں کو مطلع کر دیا جائیگا۔" اب کیا تھا۔ بس اتنا ہی اشارہ کافی ہو گیا اور فوراً امریکہ کے تمام اخبارات نے یہ خبر اس وقت دنیا کو سنا دی۔ خود اطالیہ کے اخبارات نے یہ خبر اس وقت شائع کی جب امریکہ کے اخبارات کئی گھنٹہ قبل اس خبر کو شائع کر چکے تھے۔

۷

سنہ ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر سیلے نامہ نگار اخبار "نیویارک ہیرلڈ" اور جریدہ "نورفاک" پوشیدہ طور پر آرڈل اور ولبر رائٹ کے ہوائی تجربات کے دیکھنے کی فکر میں تھے ان کو اطلاع ملی کہ وہ دونوں خفیہ طور پر چند پر اسرار تجربات کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف اس میدان کے قریب جس میں یہ تجربات ہونے والے تھے ایک درخت پر چڑھ گئے ان کے ہاتھ میں ایک طاقتور دوربین تھی جس سے وہ اپنے مشاہدے میں مدد لیتے تھے انھوں نے دیکھا کہ وہ دونوں ہوا باز اپنے جہازوں میں تقریباً ۶۰ فٹ زمین سے بلند ہوئے اور ایک ہزار فٹ کے قریب تک پرواز کی۔ جب تجربہ ختم ہو چکا تو ڈاکٹر سیلے اپنی کمینگاہ سے اترے اور قریب ترین گھر میں پہنچکر "نیویارک ہیرلڈ" اور "نورفاک" دونوں کو ہوائی تجربات تفصیلات بھیجدیں۔ "نیویارک ہیرلڈ" نے اس برقیہ کو شائع کر دیا۔ دوسرے نے اس کو لغو سمجھ کر اشاعت سے احتراز کیا اور نامہ نگار کو تاکید کہ اپنا قیمتی وقت اس خیالی واقعات سازی میں مت ضائع کرو۔

جب تجربہ کنندگان نے اپنے تجربہ کی تفصیل اخبار میں پڑھی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کس طرح اخبار تک یہ اطلاع پہنچی۔ آخر ایک مدت دراز کے بعد اس خبر کی اشاعت کا حال ظاہر ہوا۔

۸

سنہ ۱۹۱۴ء میں جو جنگ عظیم کا ابتدائی زمانہ تھا "اوڈیشیئر" نامی انگریزی جنگی جہاز کو آئرلینڈ کے سواحل کے قریب جرمانیہ کے تحت البحر سازشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اتفاقاً ادھر سے وہائٹ اسٹار کمپنی کا ایک جہاز گذر رہا تھا۔ اس کے بعض مسافروں نے انگریزی جہاز کے

غرق ہوتے وقت چند فوٹو لے لئے۔ اس کی اطلاع مسٹر ہرسٹ کو جو کئی امریکی اخبارات کے مالک تھے ملی۔ اُنھوں نے کوشش کر کے ان تمام تصاویر کو خرید لیا اور اپنے اخبارات میں شائع کر دیا۔ "اوڈ نشیکش" کے ڈوبنے کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ اور نظارت بحریہ نے چار سال بعد اس کی تصدیق کی۔

۹

۱۹۱۲ء میں کارل وال ویگینڈ نمائندہ اخبار امریکہ نے امیر البحر دانشر بیڑ جرمنی بیڑے کے کمانڈر سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات میں مسٹر کارل کو یہ معلوم ہوا کہ جرمانیہ اپنے دشمنوں پر عنقریب آبدوز کشتیوں سے حملہ آور ہوگا۔ تو انھوں نے فوراً ان تمام امریکن اخبارات کو جن کے وہ نمائندے تھے مطلع کر دیا۔ اس کی اشاعت سے امریکہ کی ذہنی و فکری دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور درحقیقت یہی چیز تھی جس نے امریکہ کو اتحادیوں کی طرف سے جنگ عظیم میں شرکت پر مجبور کیا۔

۱۰

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی اور ۱۱ ر نومبر کو ۱۰ بجے دول اتحاد اور ان کے مخالفین کے مابین صلحنامہ مرتب ہوا۔ ایک امریکن جرنلسٹ ہوارڈ کو جس کا کچھ تعلق وزارت بحریہ سے تھا کہ امریکہ سفیر مقیم پیرس نے ۷ نومبر کو ایک تار وزارت بحریہ کے نام بھیجا کہ آج صلحنامہ مرتب ہوگیا ہے حالانکہ صلحنامہ ۱۱ ر نومبر کو مرتب ہونے والا تھا۔ اس نامہ نگار نے فوراً صلح کی اطلاع اپنے اخبارات میں بغرض اشاعت بھیجدی اور تمام ملک میں یہ خبر مشہور ہوگئی اب امریکہ کے سفیر متعینہ پیرس نے دوبارہ تار دیا کہ پہلا تار غلط تھا اور صلح ابھی نہیں ہوئی ہے اس دوسرے تار کی خبر جرنلسٹ مذکور کو نہ ہوسکی نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ میں دو تین روز تک صلح کی تقریب میں جشن منایا گیا جس پر ملک نے ۲۰ ملین امریکن ڈالر خرچ کر ڈالے لیکن چار روز کے بعد جب صحیح اطلاع موصول ہوئی کہ صلحنامہ ۱۱ ر نومبر کو مرتب ہوا تو دوبارہ صلح کی تقریب میں جشن منائے گئے اور مزید ۲۰ ملین ڈالر پھر خرچ ہوئے۔

جب صلح ہوگئی اور فریقین نے تمام شرائط منظور کر لیں تو امریکہ اور یورپ کے بہت سے ارباب صحافت نے ان شرائط کے انکشاف کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی جریدہ "شکاگو ٹریبون" نے بہت چاہا کہ معاہدۂ صلح کی ایک کاپی ڈاکٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ سے حاصل ہوجائے مگر ناکام رہا ایک روز شام کو تمام امریکہ میں حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی جب جریدہ مذکور نے معاہدہ کی پوری نقل شائع کر دی اور اس کی ایک ایک کاپی دارالامراء کے ہر رکن کے پاس روانہ کر دی۔ ڈاکٹر ولسن نے اس امر کی تحقیقات کے لئے کہ اصل معاہدہ کا علم اخبار کو کیونکر ہوگیا۔ اپنی جان لڑا دی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ یہ معاملہ آج تک پردۂ راز میں ہے اور قیاس آرائیوں کو حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شکاگو ٹریبون کے نامہ نگار نے معاہدہ کی اصل کسی ایسی سلطنت کے نمائندے سے حاصل کی تھی جو شرائط معاہدہ کو بہت جلد شائع کر دینا چاہتی تھی۔

۱۱

۱۹۲۸ء میں امریکن عدالت نے ایک نوجوان حسینہ کو کسی الزام میں بجلی سے ہلاک کرنے کا حکم دیا۔ قانون رسم و رواج اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی شخص مجرم کا ہلاک ہوتے وقت فوٹو لے جب ملزمہ کو سزائے موت دی جا رہی تھی تو اس وقت نیویارک ڈیلی نیوز کا نمائندہ موجود تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا کیمرہ ایڑی میں ٹخنے کے قریب چھپا لیا تھا اس طرح اس نے ملزمہ کا فوٹو اس وقت لے لیا جب اس کے جسم میں برقی رو گذر رہی تھی اور وہ اس کی تکلیف سے تڑپ رہی تھی۔ نمائندے نے اس فوٹو کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا جس سے تمام پبلک میں ہیجان پیدا ہوگیا اور محض اسی وجہ سے اس اخبار کی کئی لاکھ کاپیاں مزید فروخت ہوئیں حتیٰ کہ اخبار دوبارہ طبع کیا گیا لیکن پھر بھی کوئی کاپی دفتر میں نہ بچی۔

۱۲

۱۹۲۸ء میں ویٹرکس جہاز ڈوبا۔ اس کے ملاحوں میں ایک ملاح فریڈ ہانس بھی تھا۔ اس وقت اس نے غیر ارادی طور پر جہاز کے کپتان کے متعدد فوٹو لے لئے جبکہ وہ اپنی موت کے استقبال کے لئے نہایت شجاعت کے ساتھ متکبرانہ انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ اتفاقاً ایک دوسرے جہاز نے اس مصیبت زدہ جہاز کے مسافرین کے نکالنے کی کوشش کی اور بہت سے لوگ ڈوبنے سے بچ گئے۔ ایک امریکن جرنلسٹ جو امدادی جہاز میں موجود تھا ان نجات یافتہ مسافرین سے ملا اور خوش قسمتی سے اس کا تعارف ملاح مذکور سے بھی ہوگیا۔ اور اس نے وہ بارہ فوٹو ۲۰ ریال میں خرید لئے اور اپنے اخبارات میں شائع کرا دیئے۔

۱۳

۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں مسٹر ہرسٹ کے اخبارات نے ایک خفیہ بحری معاہدہ کی اصل جو فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا تھا، شایع کردی اور کوئی معلوم نہ کرسکا کہ مسٹر ہیرلڈ نمائندہ اخبارات "ہرسٹ" مقیم پیرس نے کس طرح اس خفیہ معاہدہ کا پتہ لگایا۔ اس معاہدہ کی اشاعت نے انگلستان اور فرانس دونوں کو برہم کردیا۔ اور دونوں حکومتوں نے متفقہ طور پر یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مسٹر ہیرلڈ نے کس طرح اس بات کا انکشاف کیا مگر کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ چنانچہ فرانس نے ناخوش ہوکر مسٹر ہیرلڈ کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ ادھر مسٹر ہرسٹ کے اخبارات نے مضامین لکھنے شروع کئے اور فرانس کو اس حرکت ناروا پر خوب خوب مطعون کیا۔

اے۔ آر۔ زیدی

پنکھڑیاں

چند حسین انگریزی نظموں کے ترجمے!

از جناب افسر صاحب ماہ پوری

خواب کی دُنیا

اُفق کے اُس پار ایک حسین دُنیا ہے۔
جہاں سورج معدوم ہے۔
لیکن ذرہ ذرہ سے نور کا فوارہ
چھٹتا ہے۔
ندیاں آہستہ آہستہ چلتی ہیں
اور موجیں شور وغل سے
اجتناب کرتی ہیں
کیونکہ میری محبوبہ
محوِ خواب ہے۔

صرف ایک درخشاں ستارے کی رہنمائی پر
وہ بہت دور دراز سے آئی وہاں
جہاں سائے
اُس کی حسین قسمت ہیں

اُس نے گلابی صبح سے مُنہ موڑلیا'
اُس نے ہرے بھرے کھیتوں کو ہمیشہ کے لئے تج دیا۔

طربناک آبشاروں اور
سکوت وسکون کی خاطر ——
نیند کی ہلکی اور دُھندلی نقاب میں سے
وہ دیکھتی ہے کہ
آسمان پر زردی چھاگئی ہے اور
عنادل کے نغموں میں غم کی لہریں
مچل رہی ہیں۔

وہ کامل سکون کی آغوش میں ہے۔
اُس کی پیشانی پر آنسو نہ بہاؤ
اُس کا چہرہ مغرب کی جانب ہے۔
جہاں سُنہری دنیا
آباد ہے۔
وہ کھیتوں کو نہیں دیکھ سکتی
وہ در ودیوار اور پہاڑیوں کو بھی نہیں دیکھ سکتی
اب اُس کے حسین ہاتھ بارش کے قطروں کی
نمی بھی محسوس نہیں کرسکتے۔

تو آرام کر میری محبوبہ!
تو آرام کر!
میرے دل کی انتہائی گہرائی میں آرام کر!
اور اُس وقت تک آرام کر
جب تک گردش لیل و نہار ہمیشہ کے لئے
بند نہ ہو جائے۔

وہ ایسی نیند سوئی ہوئی ہے کہ اُسے
درد و کرب میں بیدار نہیں کر سکتا۔
اُس کی رات صبح سے اس وقت تک محروم رہیگی
جب تک اُس پر
مسرت کی بارش نہ ہو
"روسیٹی"

الوداع

اے چشمہ!
آج میرے دل پر غم کی کس قدر روح فرسا گھٹا
چھائی ہے۔
تو حسب معمول ہمیشہ سمندر سے
ہم آغوش ہو کر موجوں سے خراج تحسین
حاصل کریگا۔
مگر افسوس!
اب میں تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔

اے جھیل!
تو کتنی خوش نصیب ہے کہ
سدا لہلہاتی ہوئی وادیوں کے درمیان
اپنی روانی سے
کشمکش حیات کا درس دیتی رہیگی۔
مگر افسوس!
اب میں تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔

اے درختو!
تم ہمیشہ خوش رہو گے اور
تمھارے نرم و نازک پتوں سے
نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی رہیگی۔
اور شہد کی مکھیاں تمھاری حسین ڈالیوں میں
اپنا چھتہ بنانے کی سعی پیہم کرتی رہینگی۔
مگر افسوس!
اب میں تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔

اے آبشار!
ہزاروں سورج تیری گود میں
مچلتے رہینگے اور ہزاروں چاند
تھرتھرائینگے۔
مگر افسوس!
اب میں تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔
"ٹینی سن"

غزل

از جناب ملک غلام عباس خاں صاحب نسیم بی اے

الٰہی خواب ہی میں وہ نگار آجائے
کسی طرح تو مرا دل قرار پا جائے

ہے فرشِ راہِ طلب جس کی انتظار میں آنکھ
دیارِ حسن کا وہ شہریار آجائے

دکھا جنونِ محبت وہ اک نرالی ادا
ستم ستم نہ رہے اُن کو پیار آجائے

ارے امیدوں کے گلشن کی پھر بہار نہ پوچھ
کبھی جو بھول کے غفلت شعار آجائے

غمِ فراق میں میرے لئے برابر ہے
خزاں کا دور رہے یا بہار آجائے

بلائیں جذبِ محبت کی لُوں نگاہیں بڑھکر
جو اُس کے در سے کبھی کامگار آجائے

چلا ہوں دردِ محبت بیان کرنے تو
خدا کرے کہ اُنھیں اعتبار آجائے

یہ باتوں باتوں میں بننا بگڑنا جاؤ بھی
ذرا سی بھول ہو دل پر غبار آجائے

نسیم اُس سے جدا رہ کے زندگی معلوم
بس اب تو موت کا ہے انتظار آجائے

ریویو

صحیفۂ چین!

از سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی بی۔ ایس۔ سی۔ آئی، ایف۔ ایس۔ حجم ۲۴۸ صفحات۔ چھوٹی تقطیع۔ جلد اور گرد پوش سے مزین ہے۔ ٹائیٹل پر چین کے قومی پرچم کا نشان ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی،

آج کل جبکہ چین و جاپان ایک خونریز جنگ میں مصروف ہیں اور چین اپنی ساری قوت اپنی آزادی کے باقی رکھنے پر صرف کر رہا ہے۔ یہ کتاب چین کے حالات جاننے کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

چین جس کے خاقان اور صناعی مشہور عالم ہیں جو تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے سب سے قدیم ملک ہے۔ اس کی تاریخ سے روشناس کرانے کے لئے مترجم نے وہاں کے مشہور عالم پیغمبر و مصلح کنفیوشس کی کتاب "شوکنگ" کا انتخاب کیا ہے۔ شوکنگ دنیا کی سب سے پرانی تاریخی کتاب ہے جس میں ۲۳۵۵ ق م سے ۶۲۷ ق م تک کے چینی بادشاہوں کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے چین کے اس مضبوط سماجی نظام سے واقفیت پیدا ہوتی ہے جو آج سے چار ہزار برس قبل وہاں رائج تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج بھی بہت سے ممالک میں اتنا مکمل سماجی و معاشی نظام نہیں پایا جاتا۔

ضمیمہ اول میں مترجم صاحب نے کنفوشیش جس کے آج ۳۵ کروڑ پیرو چین میں موجود ہیں کے فلسفہ اور تعلیمات پر بحث کی ہے اور اس کے حالات زندگی کو بھی بیان کیا ہے۔

دوسرے ضمیمہ میں ابتداء سے ۱۹۳۷ء تک کی چینی تاریخ وجغرافیہ مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ جس میں موجودہ رہنما مارشل چیانگ کائی شک اور اُن کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ ہے۔

تیسرے ضمیمہ میں چین کے تمام بادشاہوں کی سن وار فہرست ہے۔

مترجم نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے اور اس کے ساتھ تین ضمیمے پیش کر کے ان لوگوں کو جو چین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے اس کا موقع دیا ہے کہ وہ اس مختصر کتاب کو پڑھ کر چین کے جغرافیہ، تاریخ، مذہب اور رہناؤں وغیرہ کے متعلق خاص معلومات حاصل کر لیں۔

واردات

منشی پریم چند آنجہانی کی تیرہ کہانیوں کا مجموعہ حجم ۲۰۰ صفحے، لکھوائی چھپوائی عمدہ کاغذ نفیس، مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے قیمت عہ/ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

منشی پریم چند اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سے تھے جامعہ ملیہ نے آپ کی آخری تصنیف (تیرہ بہترین کہانیوں کا مجموعہ) شائع کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ منشی صاحب آنجہانی کے قصے زیادہ تر دیہاتی زندگی کے متعلق ہوتے ہیں اور زندگی کا اصلی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ منشی صاحب کی کہانیاں وقتی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک عرصے تک ہماری معاشرت کی الناکیوں پر روشنی ڈالتی رہینگی۔

ماہر القادری کے ننو شعر

حضرت ماہر القادری ہندوستان کے جوان فکر شاعر ہیں۔ آپ کی نظمیں اکثر عالمگیر میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں آپ کے ننو شعروں کا انتخاب ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ہر شعر اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

خلش دل کی قدر کر ناداں ۔۔۔ یہ کہیں بار بار ہوتی ہے،
رو گئے اپنی مست نظروں کو ۔۔۔ ساری دنیا خراب ہوتی ہے

نگاہِ مست کو مصروفِ ناز رہنے دے
کچھ اور روز مجھے پاکباز رہنے دے

آنکھیں اُداس رُوح پریشان دل نڈھال
برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں

ماہر القادری کی زبان نہایت پاکیزہ اور خیالات نہایت ارفع و اعلیٰ ہیں دس آنے مارکے ٹکٹ بھیجکر کتاب مندرجہ ذیل پتہ سے مل سکتی ہے
فرحت سکان ۱۸۶ جدید ملک پیٹ ،حیدر آباد دکن۔

آہنگ

اسرار الحق صاحب مجاز بی۔اے علیگ کا مجموعۂ کلام ہے۔ مجاز صاحب کی نظموں میں خاص برجستگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے مثلاً

مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سُوجھی جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی

اکثر نظمیں جذبات نگاری سے معمور ہیں۔ ہندوستان کے نوجوانوں کو ابھارنے والا جوش اور عشق والفت کی رنگینیاں نہایت پُرزور اور لطیف انداز میں نظم کی گئی ہیں۔
قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ :۔ حلقہ ادب لکھنؤ

مُسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ

مصنفہ جناب عبد الوحید خاں صاحب بی۔اے۔ قابل مصنف نے بکثرت حوالجات اور پوری چھان بین سے اپنے موضوع کو نبھایا ہے اور ثابت کر دیا کہ مسلمان آزادی اور حریت کے کتنے آرزومند ہیں۔ لیکن مصنف کے خیال میں اُنھیں کانگرس میں شامل ہونے کی بجائے اپنی علٰحدہ تنظیم کرنی چاہئے ہم مصنف کی جانفشانی اور عرق ریزی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے
قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ عبد الوحید خاں صاحب بی۔اے ۴۰۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

غزل

از۔ جناب بابو چمن لال صاحب دانش - ایڈیٹر شاعر

کہوں کیا ہمنشیں تجھ سے میں کیوں دن رات روتا ہوں
نظر ناپاک ہے میری اُسے اشکوں سے دھوتا ہوں

زمانہ کی نگہ سے چھپ کے وہ آتے ہیں جب دل میں
نہیں معلوم مجھکو بھی میں کس دنیا میں ہوتا ہوں

ضیا افروز ہوتے ہیں مرے سینے کے داغ اُس سے
لگا کر دل سے اُن کی یاد کو جس وقت سوتا ہوں

مری بزمِ تصوّر میں اچانک جب وہ آتے ہیں
قدم آنکھوں پہ لیکر آنسوؤں سے پاؤں دھوتا ہوں

تمنائیں مری جب عالمِ رویا میں ہنستی ہیں !
کہ قسمت جاگ اُٹھتی ہے مری گو آپ سوتا ہوں

خدا رکھے تصوّر کو کہ اُس کے فیض سے شاکر
وہ میرے پاس ہوتے ہیں میں اُن کے پاس ہوتا ہوں

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۰

فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۳۹ء

نمبر ۲

ضروری اطلاع

عالمگیر کے معرکہ آرا خاص نمبر کی (جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے) صرف چند کاپیاں اس وقت دفتر میں رہ گئی ہیں۔ خریداری کے خواہشمند حضرات جلد از جلد آرڈر بھجوا دیں۔ ورنہ بعد کو نمبر ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ صرف پہلی چند درخواستوں کو ترجیح دی جائیگی۔

منیجر "عالمگیر" لاہور

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

مُلاحظات!

عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۳۹ء خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے ہماری توقعات سے کہیں زیادہ مقبول ہوا ہے ہیں اس کی تعریف و توصیف میں تا دمِ تحریر متعدد خطوط آ رہے ہیں ہم اُن سب کو تو محفوظ نہیں رکھ سکتے البتہ نمونہ کے طور پر دو ایک خطوط کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

جناب مقبول حسین صاحب احمد پوری تحریر فرماتے ہیں:-

"ماشاء اللہ عالمگیر اور خیام دونوں کہاں سے کہاں پہنچے۔ نسرو والی تقریر اور وفادری صاحب کا مضمون مجھے بیحد پسند آئے۔ خیام میں بھی جدتیں ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے مساعی سے مجھے یہ کافی تقویت ہے کہ آپ صاحبان اردو زبان کو کبھی فنا نہ ہونے دیں گے۔"

محترمہ زکیہ بیگم صاحبہ کی رائے ملاحظہ ہو۔

"ماشاء اللہ کس قدر شاندار نمبر ہے۔ خاص نمبر دیکھتے ہی بے ساختہ دل سے آوازِ تحسین و آفرین نکلتی ہے۔ ہر مضمون اور ہر نظم جواہرات میں تولنے کے قابل ہے خصوصاً "خطرناک جادوگر" "شادی اور کانگریس" اور "کامیاب وکیل" افسانوں کا نچوڑ ہیں۔ درحقیقت عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۹ء کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے"

محترمہ آر مظہر رضویہ تحریر فرماتی ہیں:-

"یہ شاعرانہ تعلّی یا بیجا تعریف نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ موجودہ خاص نمبر غالباً اپنے تمام خاص نمبروں پر ہر پہلو، ہر حیثیت اور ہر طرح سے سبقت لے گیا ہے"

خاص نمبر پر مختلف اخبارات اور رسائل نے بھی نہایت حوصلہ افزا ریویو کیا ہے جس کے ہم تہ دل سے شکرگزار ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ صرف بلند پایہ اور دلچسپ مضامین شریکِ اشاعت کئے جائیں خیام اور عالمگیر کے معاونِ خصوصی جناب زبیر دبیر نے "افسانۂ محبت" سنائیں "بہت دلچسپ لکھا ہے" جرمنی و ایطالیہ میں عورت کی حیثیت" بیحد تحقیقی مضمون ہے جس کے لئے ہم جناب ناصح عظیم آبادی کے ممنونِ احسان ہیں۔ جناب جمیل احمد صاحب کندھاپوری نے "فریبِ تخیّل" ایک تحیّر زا رومان لکھا ہے جو اُمید ہے بہت پسند کیا جائے گا "چیکوسلواکیہ حالاتِ حاضرہ سیاسیہ کے متعلق ایک معلومات افزا مقالہ ہے۔ "سوتیلا باپ" ایک ایکٹ کا دلآویز ڈرامہ ہے۔

اس مرتبہ نظموں کا معیار خاص طور پر بلند ہے۔ ہم جناب نواب امانت جنگ معین الدولہ صاحب بہادر، جناب احمد ندیم صاحب قاسمی، جناب لطیف انور صاحب گورداسپوری، جناب جلال ملیح آبادی، جناب مخمور جالندہری، جناب طالوت کی خدمت میں اُن کی کامیاب نظموں پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ "ادارہ"

خریداری نمبر نوٹ کر لیجئے صرف خاص نمبر کے خریدار حضرات کی چٹیں از سرِ نو لکھائی گئی ہیں جس کی وجہ سے نمبر خریداری بدل گئے ہیں۔ براہِ مہربانی اپنے اپنے نمبر نوٹ کر لیجئے۔ خط و کتابت میں اِن کا حوالہ دینا اشد ضروری ہوتا ہے

نوٹ:۔ ماہ مارچ سے سالانہ نمبر کے خریداروں کی چٹیں بھی نئی لکھی جائینگی۔ خاص نمبر کے لئے (خ) کا نشان اور سالانہ نمبر کے لئے (س) کا نشان یاد رکھئے۔ (مینیجر عالمگیر)

عالمگیر ماہِ مارچ ۱۹۳۹ء

"عالمگیر" کی ہر اشاعت معرکہ آرا ہوتی ہے۔ ماہ مارچ میں شائع ہونے والے چند خاص مضامین اور افسانوں کی فہرست درج ذیل ہے۔ بیجد کیف بار نظمیں اور غزلیں ان کے علاوہ ہوں گی۔ آج ہی اپنے پرچہ کے لئے ایجنٹ کو کہہ دیجئے یا مستقل خریداری کے لئے براہِ راست دفتر عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور کو لکھئے۔

دوشیزہ کا انتقام

ایک پُر اسرار۔ حیرت زا اور جاسوسی شاہکار جس کا ہر ہر لفظ عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ دو اقساط میں ختم ہوگا پہلی قسط مارچ کے پرچہ میں ضرور ملاحظہ کیجئے۔ از جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی

ابومسلم خراسانی کی موت

دولت بنی اُمیہ کے مخرب اور سلطنت بنی عباس کے موسس ابومسلم خراسانی کا موت کا دردناک قصہ (بوجہ عدم گنجائش اشاعت ہذا میں شائع نہیں ہو سکا) از جناب طالوت۔

بیمارِ محبت

عنوان ہی سے افسانے کی دلچسپی کا اندازہ لگائیے (یہ بھی بوجہ قلت گنجائش اشاعت ہذا میں شائع ہونے سے رہ گیا ہے)

ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی!

افاداتِ مہدی کے مایہ ناز مصنف ایم مہدی حسن صاحب مرحوم کے دلچسپ سوانح حیات۔ جگہ جگہ مرحوم کے بہار آفریں نگارش قلم کے حوالجات دے کر مضمون کو بے حد کارآمد اور معلومات افزا بنایا گیا ہے از جناب سید دل محمد صاحب فضا ادیب فاضل منشی فاضل۔

حقہ

ایک نہایت دلچسپ مضمون جس میں حقہ کی سوانحمری حقہ اور موسم اور حقہ کے اثرات وغیرہ مذاقیہ رنگ میں پیش کئے گئے ہیں جگہ جگہ حقہ کے متعلق اشعار سے مضمون اس قدر پُر لطف ہو گیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ از جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری۔

بہترین معالج

دو سین کا ایک مزاحیہ ڈرامہ۔ جو پڑھنے اور صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے از جناب سید منظر کاظمی بی۔ اے (آنرز) بنارسی

بیوفا

موجودہ سوسائٹی کا ایک افسانہ جسکو پڑھکر آپ حیرت و استعجاب کے عالم میں کھو جائینگے۔ از جناب جمیل احمد صاحب کند ہاپوری بی اے

اُردو ادب پر غالب کا اثر

ایک بلند پایہ ادبی مضمون جس میں مرزا غالب کی شاعری کے علاوہ نثر نگاری کے حوالے دے کر بھی دکھایا گیا ہے کہ اردو ادب پر غالب نے ایک گرانپایہ اثر ڈالا ہے از محترمہ حمیدہ صاحبہ۔

ان مضامین کے علاوہ بھی بعض بہت بلند پایہ مضامین نظم و نثر ہوں گے۔

(ادارہ)

مخمس بر غزل بہزاد لکھنوی

از عالیجناب معلی القاب نواب اعانت جنگ معین الدولہ صاحب بہادر امیر پائیگاہ حیدرآباد دکن

دل کو مئے تسلیم کا پیمانہ بنا دے — مشرب کو مرے مشربِ رندانہ بنا دے
تو شمع سا بن جا مجھے پروانہ بنا دے — دیوانہ بناناہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

کب تک نہ تجھے قدر ہو پیمانۂ دل کی — کب تک نہ ہو شہرت مرے افسانۂ دل کی
تقدیر جگا دے کبھی ویرانۂ دل کی — آخر کوئی صورت بھی تو ہو خانۂ دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بُت خانہ بنا دے

انداز خموشی میں نہاں رنگِ فغاں ہے — صورت سے مری حال مرا سب پہ عیاں ہے
پڑتی ہے نظر جس پہ اب اُس کا ہی گماں ہے — میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ مری شمع کہاں ہے
جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے

اس طور سے انداز جنوں میرے نہ دیکھو — اِس طرح حقارت کی نگاہوں سے نہ دیکھو
ایسے ہی بُرے دن کہیں تم اپنے نہ دیکھو — اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

دیتا ہے معیں مشورۂ عشق پرستی — عاشق کے لئے جس میں بلندی ہے نہ پستی
دو چار ہی دن کا ہے یہ سب نشۂ ہستی — بہزاد ہر اک گام پہ اک سجدۂ مستی
ہر ذرّہ کو سنگِ درِ جانانہ بنا دے

افسانۂ محبت آؤ تمھیں سنائیں

ازجناب زبیر قریشی صاحب دبیر

وہ پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اِدھر سے اُدھر گشت کر رہا تھا۔ کل اس کا دفتر کھلنے والا تھا۔ اس نے پہنچنا ضروری تھا۔ اس وقت سوائے دفتری اُلجھنوں کے اس کے دماغ میں اور کوئی خیال نہ تھا — گاڑی قریباً چالیس منٹ لیٹ تھی — ٹہلتے ٹہلتے وہ سیکنڈ کلاس زنانہ ویٹنگ روم کے سامنے پہنچ گیا اور پھر لوٹا تو دیکھا کہ ایک حسین خاتون پیازی ساڑھی میں چلی آ رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ایک ملازم ہے۔ وہ کچھ آگے بڑھا اور لوٹ آیا — خاتون کا اسباب سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں رکھا جا چکا تھا اور وہ باہر بنچ پر بیٹھی تھی۔ اگرچہ وہ بے حد حسین تھی۔ لیکن اس کا محزون و ملول چہرہ اور مغموم نگاہیں اس کے دلی رنج و غم کا اظہار کر رہی تھیں — اس نے دیکھا کہ خاتون نظریں جمائے اس کی طرف دیکھ کر اور غالباً کچھ سوچ رہی ہے۔

یک لخت وہ پکار اٹھی "سلیم تم کہاں؟"

وہ ایک اجنبی خاتون کی زبان سے اپنا نام سُن کر چونک پڑا اور اپنے دماغ پر زور دے کر بہت سوچنے کی کوشش کی کہ وہ اُسے پہچان سکے لیکن وہ قطعاً ناکام رہا۔

"معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچان نہیں سکا" — اس نے استعجاب کے عالم میں کہا۔

وہ مسکرائی اور بولی "ارے کیا واقعی تم مجھے پہچان نہ سکے، ذرا یاد کرو کہ کبھی تم تعلیم کی غرض سے دہلی آئے تھے اور پنڈت کے کوچہ میں.... ٹھیکیدار صاحب کا مکان کرایہ پر لے کر اُس میں قیام کیا تھا۔ اب بھی یاد آیا، یا کچھ اور بتلاؤں"۔

"نہیں، اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، مجھے سب کچھ یاد آگیا — سلیم نے کہا — "تم ٹھیکیدار.. کی بیٹی ثریا ہو جو مجھے دہلی میں بہت ستایا کرتی تھی"

"ہاں میں وہی ثریا ہوں" خاتون نے جواب دیا — خدا کا شکر ہے کہ آخر تم نے مجھے پہچان لیا"

"لیکن تم یہاں اس عالم میں تنہا کیسی؟ — ثریا مجھے معاف کرنا اگر میں یہ کہوں کہ تم وہ پہلی سی ثریا رہی کب ہو جو کوئی نہیں پہچان سکے۔ نہ وہ پہلی سی شوخی ہے، نہ مسکراہٹ، ذرا اپنی صورت تو دیکھو کیسی اُداسی چھائی ہوئی ہے، جیسے کوئی غم کا بہت بھاری پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو"

ثریا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی کہ "خیر یہ سب باتیں تو پھر بتلاؤں گی کہ اب میں وہ پہلی سی ثریا کیوں نہ رہی، پہلے تم اپنی کہو کہ کہاں جا رہے ہو"

"میرے دفتر کی تعطیلات آج ختم ہو رہی ہیں۔ اس لئے اپنے کام پر واپس جا رہا ہوں۔ کل حاضر ہونا ضروری ہے" — سلیم نے جواب دیا۔

"لیکن اگر تم آج نہ جاؤ تو؟" — اس نے پوچھا

"جی نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، ورنہ غیر حاضری کی وجہ سے تنخواہ کٹ جائے گی، میں تو پہلے ہی غریب آدمی ہوں اس نقصان کو کیونکر برداشت کر سکوں گا"

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم آج رُک جاؤ اور دفتر کو اطلاع دے کر ایک روز کی رخصت لے لو، میں تم سے بہت سی باتیں کرونگی

—عجیب و غریب — اور تمہیں اپنی رام کہانی سناؤں گی — ہوشربا"
"ثریا ! جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ تم سے اتنی جلدی جدا نہ ہوں لیکن کیا کروں مجبوری ہے، روزی کا معاملہ ہے، تم جانتی ہو کہ آج کل ملازمت کس قدر دشواری سے ملتی ہے، اور پھر مجھے خود تمہیں یہاں اس عالم میں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے اور چاہتا ہوں کہ اصل حقیقت سے آگاہی حاصل کر دوں لیکن . . . . . ."

"لیکن ویکن کچھ نہیں تمہیں آج میرے پاس رہنا ہی پڑے گا، میں ابھی تار کے ذریعہ تمہاری علالت کی اطلاع دفتر کو بھیجتی ہوں — ثریا نے یہ کہہ کر ملازم سے تار کا فارم منگوایا اور خود ہی لکھ کر اُسے مع فیس کے تار گھر بھجوا دیا۔

"اچھا آؤ اب ڈیٹنگ روم میں چل کر اطمینان سے بیٹھیں — وہ سلیم کو پکڑ کر اندر لے گئی اور ایک صوفہ پر بٹھا دیا۔

"تمہاری تو شادی اُسی زمانہ میں ہو گئی تھی؟" — سلیم نے کہا۔ لیکن یہ سُنتے ہی ثریا کا چہرہ زرد پڑ گیا، اداسی چھا گئی اور جسم میں ارتعاش سا پیدا ہونے لگا۔ تاہم اپنی حالت کو سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں خانہ بربادی تو اسی زمانہ میں ہو چکی تھی۔ پھر ایک لڑکا بھی ہوا تھا۔ لیکن اب وہ مجھ سے بہت دور ہے اور اس کی جدائی میرے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے" — وہ اُٹھی اور اپنا ٹرنک کھول کر ایک البم نکالا۔ اور بچے کی تصویر سلیم کو دکھاتے ہو کہا — "دیکھو یہ ہے میرے پیارے بیٹے کی تصویر۔ گو وہ آج دنیا میں موجود ہے — لیکن مجھ سے بہت — دور دیکھو سلیم کیسی بھولی صورت ہے" — وہ رونے لگی۔

سلیم متعجب تھا کہ جب لڑکا زندہ ہے تو پھر رونے سے کیا حاصل؟ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا "روتی کیوں ہو، اگر خدا کو منظور ہے تو بچہ تمہیں واپس مل جائے گا۔ لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کہاں تاکہ اگر میرے امکان میں ہو تو اُسے تلاش کر کے تمہارے پاس لا سکوں"

"کیا کہا تم اسے میرے پاس لا سکتے ہو؟ بالکل غلط! — سلیم تم ابھی حالات سے واقف نہیں ہو — لوگ اُسے میرے پاس نہیں آنے دیں گے"۔

"آخر اس کی وجہ؟" — اس نے پوچھا۔

"وجہ؟ صبر کرو سب کچھ تمہیں معلوم ہو جائے گا — آہ میرا قلب! — سلیم میری روح مضطرب رہتی ہے، مجھے حقیقی مسرت حاصل نہیں — تم جانتے ہو اس کی وجہ؟ — میں تنہا ہوں کوئی شخص میرا شریک غم نہیں۔ مونس و غمگسار نہیں — مجھے تلاش ہے ایک ایسی ہستی کی جو میرے ساتھ رہ سکے، دلچسپ اور میٹھی میٹھی گفتگو کر کے میرا غم غلط کرتا رہے — سلیم کیا تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ — اس نے انتہائی حسرت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"فی الحال تو میں آپ کے ساتھ ہوں"

گاڑی آنے سے پہلے ثریا نے سلیم کے لئے بھی سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خرید لیا تھا۔

گاڑی آئی اور یہ دونوں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر روانہ ہوئے سلیم نے کہا "اب تو خدا کے لئے اپنا قصہ بیان کرو۔ مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہو سکتا"۔

"اچھا تو سنو، لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ میری داستانِ مصیبت سُن کر کہیں تم مجھے ذلیل نہ سمجھنے لگنا"۔

"داستانِ فریب"

میں کالج میں نہایت بے فکری کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی اس وقت مجھے دنیا کا کوئی غم نہ تھا۔ میرے نزدیک زندگی کا مقصد سوائے عیش و عشرت اور فرحت و مسرت کے اور کچھ نہ تھا۔ میں بہت سکھ میں تھی — لیکن یک لخت میری قسمت نے پلٹا کھایا — ایک دن میں نے دیکھا کہ کمرہ میں اماں جان اور ابا جان آہستہ آہستہ کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں پہنچی اور کواڑ کی اوٹ سے اُن کی باتیں سننے لگی — تم جانتے ہو میں نے کیا سُنا؟ وہ میری شادی کے سلسلہ میں مشورہ کر رہے تھے — سلیم یہ باتیں سُن کر میرے جسم میں نئی اُمنگوں کی ایک لہر سی دوڑ گئی، میری نگاہوں کے سامنے حیاتِ مستقبل کا ایک خوشگوار نقشہ کھنچ گیا، اور اس فردوسِ تخیل میں ایسی کھوئی کہ بہت دیر تک مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا — میں بہت شیریں خواب دیکھ رہی تھی، ایسے خواب جن میں مسرت ہی مسرت تھی، سکون ہی سکون تھا۔

لیکن میرا ہونے والا شوہر کون ہے، اور کیسا ہے۔ اس کا مجھے کچھ پتہ نہ تھا اور آخر دم تک میں اس سے بے خبر ہی رکھی گئی۔

میری شادی ہوگئی۔ ایک ایسے اجنبی سے جسے نہ میں نے کبھی پہلے دیکھا اور جس کے حالات اور اطوار سے مجھے کوئی واقفیت تھی، ___ وہ ایک دولت مند انسان تھا اور میری آسائش کے تمام وسائل نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ فراہم کر دیئے تھے ___ لیکن سلیم خدا گواہ ہے کہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے اس سے محبت نہ ہوسکی ___ نہ جانے کیوں ___ میں خود بھی نہیں جانتی۔ لیکن اس کی والہانہ شیفتگی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ میری ہر ادنیٰ خدمت کے لئے ہمیشہ آمادہ و مستعد رہتا تھا۔ میری تکلیف سے اُسے اذیت اور میری راحت سے اسے مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن اس کا ہر وقت میرے سر پر مسلط رہنا میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ جتنی دیر وہ مجھ سے جدا رہے غنیمت ہے۔ اُدھر اُس نے میری خاطر اپنا کاروبار بھی چھوڑ رکھا تھا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ اور میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ___ ہوبہو اپنے باپ کی شکل کا ___!

میری ایک سہیلی تھی "زہرہ" ہمارے مکان سے ملا ہوا اس کا مکان تھا اور آمد و رفت کے لئے درمیان میں ایک کھڑکی تھی۔ میں اپنا دل بہلانے کے لئے اس کے یہاں چلی جاتی، اور گھنٹوں وہیں بیٹھی رہتی۔ زہرہ بہت بھولی بھالی تھی۔ مجھے اس کی معصوم گفتگو میں بے حد لطف آتا اور جتنی دیر میں وہاں رہتی میرے دل کی ساری کدورت دور ہو جاتی ___ لیکن گھر واپس لوٹتے ہی پھر وہی روح فرسا زندگی......

زہرہ کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ بڑھتا گیا اور بعض اوقات تو میں صبح سے شام اسی کے پاس بیٹھی رہتی تھی ___ اس کا ایک بھائی تھا، ناصر۔ بے حد حسین ___ زہرہ کو اس سے بڑا اُنس تھا۔ اور وہ بھی بہن کو بہت چاہتا تھا۔ اور جب ہم دونوں باتیں کرتے تو وہ بار بار آکر اسے ستایا کرتا تھا۔ مجھے اس کی خوش مزاجی پر بے حد رشک آتا تھا۔

سلسلہ آمد و رفت کی زیادتی کے ساتھ ناصر میرے ساتھ بھی کچھ بے تکلف سا ہو گیا تھا۔ اور بہن کے ساتھ مجھے بھی چھیڑنے لگا ___

لیکن اس کی اس چھیڑ چھاڑ سے مجھے جو مسرت ہوتی وہ میرا دل ہی جانتا تھا ___ ایک ناقابل فراموش مسرت ___ اب میں بھی اس سے مانوس ہوگئی تھی اور نہ جانے کیوں میرا دل خود بخود اس کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا ___ اس میں کچھ کشش ہی ایسی تھی ___ پہلے میں زہرہ کے لئے وہاں جاتی تھی، لیکن اب! ___ ناصر کے لئے، اُس کی میٹھی اور پیاری باتیں سننے کے لئے ___

خاموشی کے ساتھ مجھے اس سے محبت ہوتی گئی ___ وہ تھا بھی محبت کرنے کے لائق ___ اگر کسی روز وہ گھر پر نہ ہوتا تو میری نگاہیں دیوانہ وار اس کا انتظار کرتی رہتیں اور ہر آہٹ پر کان دروازہ پر لگے رہتے۔ اس کی عدم موجودگی مجھ پر بار گزرتی، میں چاہتی تھی کہ وہ ہر دم میرے سامنے رہے ___ کیوں! ___ یہ میں نہیں جانتی ___ لیکن اسے خود بھی مجھ سے دلچسپی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی کبھی ہمارے کمرہ میں آتا اور بہن کو یا مجھے چھیڑ کر چلا جاتا۔ لیکن اب میرے پہنچتے ہی اپنا کام چھوڑ وہیں آکر بیٹھ جاتا اور جب تک میں رہتی برابر بیٹھا رہتا ___ میں خود بھی تو یہی چاہتی تھی ___ آہ کیسی پرکیف اور لذت بخش صحبت ___!!

اسی حال میں ایک عرصہ گزر گیا ___ اس کے بعد ایک دن جب حسبِ معمول میں وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ زہرہ اپنے کسی عزیز کے یہاں گئی ہوئی ہے اور شام تک واپس آئے گی۔ لیکن ناصر تنہا بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا ___ مجھے اس بات سے ملال ہوا کہ آج اس حیات افروز صحبت سے محروم رہوں گی اور مجھے فوراً واپس لوٹ جانا پڑے گا ___ لیکن ناصر نے کہا "بیٹھ جاؤ"۔ میں نے کہا۔ "نہیں جب زہرہ ہی نہیں تو پھر ٹھیر کر کیا کروں گی" اس نے دفعتاً تیور بدل کر کہا کہ "کیوں کیا صرف آپا جان ہی سے ملنے آتی تھیں" میں نے حسبِ عادت اسے چھیڑنے کے لئے کہا کہ "اور نہیں تو کیا آپ کے پاس آتی تھی" میرے اس جواب پر بجائے ہنسنے یا مسکرانے کے اس کے چہرے پر اضمحلال کے آثار نمایاں ہوگئے اور بے دلی کے ساتھ بولا کہ "خیر تو جاؤ۔ حالانکہ میں تو آج تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا" میں نے پھر اسے چھیڑتے ہوئے کہا کہ "کل زہرہ کے سامنے کر لینا باتیں، ابھی میں کوئی ہی

تو نہیں جا رہی ہوں" وہ بولا "لیکن میں تو تنہائی ہی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مدت سے موقع کا منتظر تھا"۔ میں نے کہا "اچھا تو کہو میں سننے کو تیار ہوں" میری اس آمادگی پر اس نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور بولا "کہ کیا واقعی تم میری باتیں سننے کو تیار ہو لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناراض ہو جاؤ کیونکہ میں آج بالکل انوکھی باتیں کرنا چاہتا ہوں وہ باتیں جنھیں آج تک میں نے اپنے قلب کی گہرائیوں میں چھپائے رکھا ہے۔ حالانکہ ہر وقت میرا دل یہی چاہتا تھا کہ تم سے کہہ دوں"۔

"ناصر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہیں تمہاری باتوں پر ناراض ہوں کہو کہو جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو میں تمہاری ہر بات کو بکشادہ پیشانی سننے کو تیار ہوں"۔

میرے ہاتھ پیر کانپنے لگے اور سانس پھولنے لگی کہ خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اس کی ہر بات سننے کو آمادہ تھی۔ وہ بڑھا اور میرے قدموں پر گر گیا اور کہنے لگا "ثریا بہت ہی ڈرتے ڈرتے آج یہ اظہار کرتا ہوں کہ میں تمھیں چاہتا ہوں، پوجتا ہوں، پیار کرتا ہوں ہوں۔ ثریا خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میں اب اپنے دل پر زیادہ جبر نہیں کر سکتا، میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا"

وہ رو رہا تھا، ہچکیوں سے میں گھبرا گئی لیکن مجھے خود بھی تو اس سے محبت تھی، میں نے کہا "ناصر یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ خدا کے لئے اتنے بے حال نہ ہو یقین رکھو کہ مجھے تم سے محبت ہے لیکن ہماری بدقسمتی ہمیں شاید ملا نہ سکے گی۔ کیونکہ تم جانتے ہو میں دوسرے کی ہوں"۔

"ہاں میں یہ جانتا ہوں۔ اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں کرنی چاہئے تھی، لیکن مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں، ثریا میں اپنے دل پر قابو نہ پا سکا"۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں ۔۔۔ اور میں ۔۔۔ میں خود بھی اس کے ساتھ رو رہی تھی ۔۔۔ وہ پھر بولا "ثریا خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا، صرف تم ہی میرا سکون و راحت ہو اور تمہارے ہی قبضہ میں زندگی اور موت کا فیصلہ ہے، اگر میں تم کو نہ پا سکا، اگر تم میری نہ بن سکیں تو سمجھتی ہو کیا ہو گا؟ ۔۔۔ موت! ۔۔۔ میں اپنی زندگی ختم کر دوں گا"

میں نے کہا "ناصر پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو بھلا تم خود ہی غور کرو کہ میں آخر تمہاری کیسے ہو سکتی ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے"

"ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر تم چاہو تو ہم اب بھی ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں"

"وہ کیسے؟" ۔۔۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے ساتھ بھاگ چلو ۔۔۔ بہت دور جہاں ہم ان سارے بکھیڑوں سے علیحدہ رہ کر سکون و راحت کی زندگی گزار سکیں جہاں ہم دونوں ہوں گے اور ہماری ابدی محبت، کہو منظور ہے" وہ پھر میرے قدموں پر گر پڑا ۔۔۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔

اس وقت میرے دل میں عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے، ایک طرف بدنامی کا خوف تھا، دوسری طرف ناپسندیدہ شوہر کا تصور مجھے ناصر کے ساتھ بھاگ جانے پر آمادہ کر رہا تھا، دوسری طرف سکون تھا لیکن بچہ کی یاد میرا دامن تھام رہی تھی ۔۔۔ ناصر نے میری تشفی کی کہ میں بچہ کے لئے زیادہ فکر مند نہ ہوں، باپ کو بچہ سے خود بے انتہا محبت ہے، وہ اسے آرام و آسائش پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کرے گا۔ دوسرے بچہ ماں کی محبت کو فراموش تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔ بڑا ہو جانے کے بعد مجھ سے مل جائیگا!

سلیم! ناصر نے مجھ سے اسی رات بھاگ چلنے کا وعدہ لے کر چھوڑا اور میں بھی اس تجویز پر نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت آمادہ ہو گئی ۔۔۔ رات ہو گئی ۔۔۔ وہ رات جس میں میری دنیا تبدیل ہونے والی تھی، گھڑی نے بارہ بجائے، میں نے سوچا کہ ناصر سڑک کے چوراہے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا ہو گا، میرا شوہر ۔۔۔ بدقسمت شوہر برابر کے کمرہ میں پڑا موت کی نیند سو رہا تھا، میں اٹھی اور دبے پاؤں اس کے کمرہ میں جا کر جھانکا، لیکن اسے مطلق خبر نہ ہوئی ۔۔۔ کاش وہ اس وقت سوتا نہ ہوتا۔ میں اس کی بدقسمتی پر مسکرائی اور واپس آ گئی ۔۔۔ میرا بچہ ۔۔۔ اس معصوم کو کیا معلوم کہ اس کی ظالم ماں اسے اپنی آغوشِ اُلفت سے محروم کرنے والی ہے ۔۔۔

وہ بھی سکون و راحت کے ساتھ سو رہا تھا، میں اس پر جھکی، میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، بچہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، میں نے اُسے جی بھر کے پیار کیا، لیکن اتنی آہستگی کے ساتھ کہ اس کی آنکھ نہ کھلنے پائے، پر دل یہی کہہ رہا تھا کہ اُسے کلیجہ سے لگا لوں

میں کئی بار دروازہ تک آئی۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی میرے پیر بوجھل ہو جاتے اور ایک قدم آگے نہ بڑھتا، پھر واپس آتی اور سر پکڑ کر کرسی پر گر جاتی، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں — آخر میں نے اپنے دل پر جبر کر ہی لیا اور ناصر کے پاس پہنچ گئی مجھے وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ دیر ہو گئی تھی، اس لئے وہ نہایت اضطراب و بے چینی کے ساتھ سڑک پر اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، غالباً وہ مایوس ہو چکا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ میں اب نہ آؤں گی۔

وہ مجھے لیکر لکھنؤ چلا آیا۔ اور ایک وسیع بنگلہ کرایہ پر لے کر دونوں رہنے لگے، وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا، میری معمولی سی تکلیف پر مضطرب ہو جاتا — رات دن ہم تھے اور ہماری بے پایاں محبت، لیکن اب تک میرے دل سے بچہ کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی، وہ مجھے رہ رہ کر یاد آتا اور اس کی یاد میرے سکون کو برباد کر دیا کرتی۔ لیکن زہرہ کے خطوط سے جو وہ اپنے بھائی کے پاس بھیجتی مجھے بھی اپنے گھر کی کیفیت معلوم ہو جایا کرتی، زہرہ نے میرے فرار ہونے کی بھی اطلاع نادر کو دی۔ اور اُس شخص کو بے حد بُرا بھلا کہا جو مجھے بھگا کر لے بھاگا زہرہ نے میرے متعلق بھی اس واقعہ پر بہت بُری رائے قائم کی تھی اور کہا کہ اُسے میری ذات سے ایسی توقع نہ تھی، اُس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ اسی کے بھائی کے کرتوت ہیں، ناصر نے بھی اسے اصل حقیقت سے باخبر نہ کیا، لکھنؤ میں اپنے قیام کی وجہ یہ ظاہر کی کہ وہ ایک بیمہ کمپنی میں ایجنٹ ہو گیا ہے اور روزگار بہت زوروں پر چل رہا ہے — زہرہ کے خطوط سے معلوم ہوا کہ میرے فرار ہو جانے کے بعد میرے شوہر کو بے حد صدمہ پہنچا، وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر مجھے تلاش کرتا پھرا اور جب میرا کہیں بھی پتہ نہ چلا تو وہ بالکل پاگل ہو گیا، اس سے میری مفارقت برداشت نہ ہو سکی اور کچھ دن ہیں سسک سسک کر جان دے دی — اس کے بعد میرے ابا جان میرے بیٹے کو اپنے پاس لے گئے اور اس کی پرورش کرنے لگے۔ لڑکا اب [illegible] ہے۔ انھیں بھی بچہ سے بے حد محبت ہے، وہ اسے اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کی نشانی سمجھتے ہیں۔

اس طرح ایک سال گزر گیا — لیکن اب کچھ دن سے ناصر کے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی، پہلے وہ ایک منٹ کے لئے بھی جدائی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ مگر اب اس کا بہت زیادہ وقت باہر صرف ہوتا تھا۔ میں گھر میں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہتی، پہلے تو میں کچھ روز تک اسے نظر انداز کرتی رہی، لیکن آخر کب تک؟

اس کی روش میں مسلسل تبدیلیاں ہو رہی تھیں، وہ اب پہلا سا ناصر نہ رہا تھا، نہ وہ والہانہ محبت، نہ وہ میٹھی میٹھی باتیں نہ وہ رات دن کی پُر کیف اور مسرت بخش صحبتیں، اکثر وہ رات کو بھی غائب رہتا۔ اور میں تمام رات اس کے انتظار میں آنکھوں میں گزار دیتی — مجھ سے اب ضبط نہ ہو سکا اور ایک دن جب کئی دن کی غیر حاضری کے بعد وہ گھر آیا تو میں نے اس سے شکایت کی، لیکن میرے شکوہ کا محبت آمیز جواب دینے کی بجائے وہ سختی کے ساتھ بولا "کہ تمہیں اس سے کیا غرض؟ تم میرے معاملات میں کیوں دخل دیتی ہو" اس کا یہ خلاف توقع جواب سن کر میں متحیر رہ گئی، میرے ہوش بجا نہ رہے، مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ الفاظ ناصر کی زبان سے نکلے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ "کیوں کیا میرے دریافت کرنے سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے"؟ وہ بولا کہ۔ "ہاں تمہیں ان باتوں سے کیا غرض، میں جاتا ہوں جہاں مجھے سکون نصیب ہوتا ہے"!

"کیا اب تمہیں دوسری جگہ سکون تلاش کرنے کی ضرورت ہے" — میں نے انتہائی افسردگی کے ساتھ پوچھا۔

اس نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا "ثریا تم بیکار مجھے دق کر کے وہ بات کہلوانا چاہتی ہو جسے بیان کرتے ہوئے تمہارا دل

دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب تم نے مجبور کر ہی دیا تو اب صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ خدا کے لئے تم میرے راستہ میں حائل نہ ہو۔ تم نے میرے ساتھ ایثار کیا ہے۔ جس کی میں قدر کرتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں تم کو بالکل چھوڑ دینا نہیں چاہتا۔ اور تمہیں ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ثریا مجھے معاف کرنا اب میرے لئے تمہارے پاس وہ راحتیں نہیں رہیں جن کی مجھے تلاش ہے"۔

سلیم مجھے چکر آگیا۔ میں بیہوش ہوگئی، اور بہت دیر کے بعد جب اٹھی تو دیکھا کہ وہ جا چکا تھا۔ آج مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک دغاباز اور خودغرض انسان ہے، جس نے محبت کا فریب دے کر میری زندگی برباد کی۔ میرا گھر بار اجاڑا۔۔۔ آہ عورت کی معصومیت وہ کیا جانے کہ دنیا نام ہے مکاری اور دغابازی کا، ہر طرف مکاری ہی مکاری ہے، دغابازی ہی دغابازی کا جال بچھا ہوا ہے۔ میں نے اس ذلت کے ساتھ اس دغاباز کے پاس رہنا گوارا نہ کیا، فوراً اپنا اسباب درست کیا اور وہاں سے چل دی، جس وقت میں اپنے شوہر کے گھر سے چلی ہوں اس وقت میں ہزار روپے کے نوٹ بھی ہمراہ لیتی آئی تھی۔ جنھیں ناصر کی لاعلمی میں بینک میں جمع کر دیا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس کی ہوا ناصر کو نہ لگ سکی۔ سلیم! میں نے سمجھ لیا ہے کہ مرد کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ انتہائی جھوٹا اور فریب کار ہوتا ہے۔۔۔ میں فریب کا شکار ہو چکی ہوں۔۔۔ یہ ہے میری تباہی کی داستان۔۔!!

ثریا رونے لگی۔ اور بے انتہا روئی۔ سلیم سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس نے تشفی کی کہ بے شک تم بڑی دکھیا ہو۔ تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا گیا ہے۔ لیکن اب رونے سے کیا حاصل، صبر کرو۔

ہاں میں جانتی ہوں کہ اب سوائے صبر کرنے کے اور چارہ ہی کیا ہے۔ لیکن سلیم میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں، اور صرف اس لئے رکھنا چاہتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔۔۔ تم نے میرے پوچھنے پر بھی محبت کا دعویٰ نہیں کیا۔ تم ایک سیدھے سادے انسان ہو۔ لیکن اگر بدقسمتی سے تم بھی اپنی محبت کا اظہار کر دیتے تو یقین رکھو میں تم سے بھی نفرت کرنے لگتی۔۔۔ لیکن اب یہ چاہتی کہ کچھ دن تم میرے ساتھ رہو۔ کیوں سلیم رہو گے نا!

اس نے کچھ ایسی حسرت و مایوسی کے ساتھ کہا کہ سلیم انکار نہ کر سکا۔ اتنے میں بھوپال کا اسٹیشن آگیا اور وہ دونوں اتر گئے۔

اسٹیشن پر ڈربی ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لیکر سلیم اور ثریا رہنے لگے۔ روزانہ شام کو موٹر میں سوار ہو کر دونوں تفریح کے لئے جاتے، بازار پہنچتے، اور ثریا وہ تمام چیزیں خرید لیتی جو سلیم پسند کرتا۔ دفتر سے سلیم نے ایک ہفتہ کی اور رخصت منظور کرا لی تھی۔

ابھی انہیں یہاں قیام کئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز دوپہر کے وقت ہوٹل کے ملازم نے اندر داخل ہو کر اطلاع کی کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور اپنا نام ناصر صاحب بتلا رہے ہیں" یہ نام سنتے ہی ثریا کے تن بدن میں آگ لگ گئی، چہرہ تمتما اٹھا اور جسم لرزنے لگا لیکن اس نے کہا "بھیجدو انہیں اندر"

چند ہی منٹ میں دروازہ کھلا اور ناصر دیوانہ وار اندر داخل ہوا اور ثریا کے قدموں میں سر رکھ کر کہنے لگا کہ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو"۔ سلیم اسے دیکھ کر باہر نکل گیا۔ آہستگی کے ساتھ نیچے مینجر کے پاس جا کر پوچھا کہ "گاڑی کس وقت آئے گی"! مینجر نے اسے بتا دیا کہ ریل اس وقت اسٹیشن پر کھڑی ہے، اگر وہ ابھی سیدھا چلا جائے تو مل سکتی ہے"۔

ادھر ثریا نے ناصر کی اس منت سماجت کی مطلق پروا نہ کی اور نہایت سختی کے ساتھ کہا کہ نکل جاؤ یہاں سے، میں اب ایسے کمینہ، دغاباز کے فریب میں نہیں آسکتی۔ سمجھتی ہوں تمہاری محبت کو، اب شاید روپے کا حال کسی طرح معلوم ہو گیا ہوگا اور

لئے یہاں آ کے پھر ناک رگڑنے لگا"

ناظم نے بہت خوشامد کی لیکن ثریا کا دل مطلق نہ پسیجا - آخر وہ خود اٹھی اور دروازہ کھول کر بولی کہ اگر اپنی عزت کی سلامتی چاہتے ہو تو خاموشی کے ساتھ چلے جاؤ اور آئندہ ادہر کا رُخ نہ کرنا ورنہ اچھا نہ ہوگا — اس وقت ثریا ایک خونخوار شیرنی کی طرح بل کھا رہی تھی۔

آخر مجبور ہو کر ناظم چلا گیا - اس کے بعد ثریا نے سلیم کو تلاش کیا تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا - وہ منیجر کے پاس آئی تو معلوم ہوا کہ اسٹیشن کا پوچھ رہے تھے - یہ سنتے ہی گھبرا گئی اور سیدھی اسٹیشن بھاگی - لیکن جس وقت پہنچی ہے تو دیکھا کہ گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ چکی ہے اور سلیم کھڑکی میں سے جھانک رہا ہے ۔

کیفیتِ عشق

از جناب مرزا ظفر حسین صاحب ظفرؔ ناگپوری

وہ ہم آغوشِ مدعا نہ ہوا
جو رہِ عشق میں فنا نہ ہوا

بے وفا مائلِ وفا نہ ہوا
حیف کچھ تجھ سے اے دعا نہ ہوا

مجھ کو گم گشتگی رہی منظور
کبھی محتاجِ رہنما نہ ہوا

کیا کیا دوستوں نے کیا کہئے
نہ کیا وہ جو ناروا نہ ہوا

نقشِ باطل نہ تھا زمانے میں
کیا کریں کوئی حق نما نہ ہوا

انکی آنکھوں میں ہی جگہ اسکی
ہائے کم بخت میں حیا نہ ہوا

نہ مٹا رنگِ تیرگیٔ بخت
محوِ رنگینیٔ قضا نہ ہوا

قصۂ عیش ناتمام رہا
کچھ یہاں طولِ ماجرا نہ ہوا

اور سب کچھ ہوا زمانے میں
حسن کا عشق مدعا نہ ہوا

اپنی اپنی کہا کئے احباب
کوئی بھی میرا ہم نوا نہ ہوا

یہ ظفرؔ یادگارِ سی۔پی ہے
ابتک ایسا شاعرہ نہ ہوا

تاثرات

جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔اے

یہ نیلے نیلے پہاڑوں کے لمبے لمبے سائے
یہ اُونچے اُونچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
صنوبروں کی چہکتی ہوئی حسیں چڑیو!
کدھر ہے میری صبوحی کا پیارا پیارا گاؤں

وہ پو پھٹی۔ وہ سمندر میں چاند ڈوب گیا
دکھائی دیتے ہیں مسجد کے مرمریں مینار
وہ گرم حجرے میں زاہد نے ایک کروٹ لی
وہ اک درخت تلے رو رہا ہے اک بیمار

پھونس کی اُجڑی ہوئی کٹیا میں مٹی کا دِیا
کانپتا ہے جیسے ویرانوں میں پردیسی کا دل
گاہے گاہے اک پتنگا آ کے کرتا ہے طواف
جس طرح یادوں پہ لہراتی ہے رُوحِ مضمحل

گونج میں شہنائیوں کے دھوم ہے گاؤں میں آج
پھر رہی ہیں کھیلتی۔ ہنستی۔ مچلتی۔ کنواریاں
دُور ویرانے میں اک برباد قبرستاں کے پاس
ہو رہی ہیں ایک سادہ قبر کی تیاریاں

شام کو کل اک مُسافر نے کیا مجھ سے سوال
ختم ہو جاتی ہے اس وادی کی پگڈنڈی کہاں
اُن دھندلکوں کی طرف میں نے اشارہ کر دیا
اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "وہاں"

آہ اے بھٹکے ہوئے بیکس مسافر یوں نہ رو
اپنی تنہائی کے غم میں تیرا دل ہے چُور چُور
دیکھ اُن ٹیلوں کی جانب ان کھجوروں کے قریب
اتنے لمبے چوڑے ویرانے میں وہ تنہا کھجور

چیکوسلواکیہ

از جناب محمد خیر الدین احمد صاحب صدیقی بی اے۔ بی ٹی

"چیکوسلواکیہ" بوہیمیہ کی قدیم سلطنت، موراویہ، سائیلیشیا کا کچھ حصہ، قدیم ہنگری کی سلوک ریاست اور کارپیتھین، وتھینیہ کی خود مختار سلطنتوں پر مشتمل ہے۔ یورپ کے بالکل وسط میں واقع ہے اور جرمنی، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ اور پولینڈ سے گھری ہوئی ہے یہ ایک مخلوط ریاست ہے جس کے باشندوں نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جمہوریت کا اعلان کیا اور تقریباً ایک سال بعد ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء کو اتحادیوں نے اس نئی سلطنت کو تسلیم کر لیا۔

گوناگوں اقوام کے مجتمع ہونے کے سبب اقلیت کے سوال نے حکومت کو طرح طرح کی دشواریوں میں ڈال دیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس سلطنت کی آبادی ۱۵۱۸۶۹۴۴ نفوس پر مشتمل تھی، اُن میں سے ۹۶۸۸۷۷۰ چیکس، ۳۲۳۱۶۸۸ جرمنز، ۶۹۱۹۲۳ ہنگریز، ۵۴۹۱۹۶ روسی، ۸۱۷۳۷ پولز، ۱۸۶۶۴۲ یہودی اور ۲۴۰۰۰۰ دیگر اقوام کے لوگ تھے۔

جرمنز کو باوجود اقلیت میں ہونے کے ایک اہم درجہ حاصل ہے ان کی زیادہ آبادی صنعتی حصہ میں ہونے کے علاوہ جرمنی علاقہ سے بالکل متصل ہے۔ جرمنی اقلیت کل آبادی کی ۲۲ فیصدی ہے اور شمال مغربی صوبہ، شمال مشرقی بوہیمیہ اور سائیلیشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

جب تک کہ بوہیمیہ نے جنگ سی سالہ میں اپنی آزادی ہاتھ سے نہیں دی تھی چیکس اور جرمنز مل جل کر رہتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی میں جذبۂ ملکی کے احیاء کے سبب دونوں اقوام کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ باشندگان چیکوسلواکیہ نے اس ملک کو جو ہیپسبرگ کے دور حکومت میں جرمنی کے زیر اقتدار ہو گیا تھا، واپس لے لیا۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر فی الحقیقت بین الاقوامی ازدواج اور مسلسل میل جول نے کشیدگی پیدا کر دی۔ کیونکہ ایک ہی خاندان میں ایک بھائی اور اس کی اولاد اپنے آپ کو چیکس، اور دوسرا بھائی اور اس کی اولاد اپنے آپ کو جرمنز کہتے تھے۔ دو اقوام اپنے معیار زندگی میں مشابہ ہوں تو اُن کے درمیان کشیدگی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے، بوہیمیہ میں چیکس اور جرمنز کے درمیان زبان اور وفاداری کے خاص اختلافات رہے نازیوں کے اقتدار بڑھنے پر یہ تنازعات اور زیادہ ہو گئے۔ اصول حرب کے لحاظ سے یہ ملک جنوبی مشرقی یورپ کا دروازہ ہے اور بسمارک کے قول "جو قوم بوہیمیہ کی مالک ہے وہ یورپ کی مالک ہے" نے ہٹلر کو بہت متاثر کیا۔

جنگ عظیم کے اختتام پر اتحادیوں نے مجلس صلح کے موقع پر ریاست چیک کی حدود کے تعین کے لئے تجویز کرنا چاہا۔ تو چیکس نے ایک یادداشت پیش کی جس میں بوہیمیہ کی تاریخی حدود کے حق کا مطالبہ کیا اور یہ بھی تجویز کیا گیا کہ سوڈیٹن جرمنز کو نئی ریاست میں کوئی خدشہ نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ حکومت کے ۲۰ مئی ۱۹۱۹ء کے فرمان کے مطابق سلطنت کو جمہوریت سوئٹزرلینڈ کے موافق منظم کیا جانا طے ہوا ہے اور مختلف اقوام کو اسی جمہوریت کے مطابق حقوق و مراعات دیئے گئے ہیں یعنی جمہوریت چیکوسلواکیہ کو سوئٹزرلینڈ کی طرح قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بوہیمیہ کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

۱۹۲۶ء تک سوڈیٹن جرمنز سرکاری ملازمتوں میں کمی اور دوسری رکاوٹوں کے سبب چیک معاملات سے علیحدہ رہے۔ لیکن

۱۹۲۶ء میں دو جرمن جماعتیں (جرمن کاشتکار اور جرمن ملازم پیشہ) عدم تعاون کا عمل چھوڑ کر گورنمنٹ میں داخل ہو گئیں - ان میں سے ہر ایک جماعت کا ایک ایک وزیر بھی منتخب ہوا تین سال بعد جرمن سوشل ڈیموکریٹ بھی ان جماعتوں میں شریک ہو گئے اور ان کا بھی ایک وزیر مقرر ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ان کی سرگرمی کا زمانہ شروع ہو کر مارچ ۱۹۳۸ء میں ختم ہوا۔ جبکہ تینوں جرمن وزراء مستعفی ہو گئے

بد قسمتی سے جب کہ یورپ اقتصادی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا ۱۹۲۹ء میں چیک گورنمنٹ کی دوستی اور یگانگت بڑھانے کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ بین الاقوامی اقتصادی سرد بازاری کا اثر سب ملکوں پر ہوا لیکن شمالی بوہیمیہ کے جرمن اضلاع اس کے زیادہ شکار ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاروں کی تعداد چیک علاقہ سے زیادہ جرمن علاقہ میں بڑھی۔ اول الذکر یا تو کاشتکار تھے یا موجودہ صنعت کے دستکار اس لئے انہوں نے اس طوفان کا مقابلہ اچھی طرح کر لیا۔

اب غیر مطمئن ہونے کا بہترین آلہ جرمنز کے ہاتھ لگا تو وہ اس کو استعمال کیوں نہ کرتے۔ اقتصادی سرد بازاری کو چیک کے سر تھوپنا اس کی حقیقت پر روشنی ڈالنے سے زیادہ آسان تھا۔ سوڈیٹن لیڈروں نے حکومت پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے بہتر خوراک اور بہتر پوشاک کا لالچ دے کر جرمن بچوں کو اپنی درسگاہوں میں داخل کیا۔ حکومت نے جواب دیا کہ اس نے جرمن اقلیت کے متعلق نہ صرف اپنی تمام ذمہ داریوں کو جن کا کہ قبل از جنگ اس نے وعدہ کیا تھا پورا کیا بلکہ ان سے کہیں زیادہ مراعات دے دیں۔ باوجودیکہ جرمن کل آبادی کے ۲۲ فیصدی ہیں تاہم ۱۹۳۷-۳۸ء کے بجٹ میں حکومت نے یونیورسٹیوں کی امداد میں سے جرمنی یونیورسٹی کو ۲۴ فیصدی حصہ دیا اور صنعت و حرفت کے درسگاہوں کے اخراجات میں سے ۲۹ فیصدی۔

جرمن شکایات کی آگ بھڑک اٹھنے کی وجہ سے بوہیمیہ کی "نیشنل" اور "نیشنل سوشلسٹ" جماعتیں بہت طاقتور ہو گئیں اور ہر ہٹلر کے نقش قدم پر چلنے لگیں جب ۱۹۳۳ء میں ہر ہٹلر برسر اقتدار ہوا تو حکومت چیک نے ان دونوں جماعتوں کو نیست و نابود کرنے کی بہت کوشش کی لیکن منحرف جرمنوں نے ہر ہنیلین کے زیر قیادت اپنے آپ کو منظم کر لیا۔ ۱۹۳۵ء کے انتخابات کے بعد چیمبر (ایوان) میں ان کی ۴۴ نشستیں ہو گئیں۔ اس لئے سوڈیٹن جرمن ملک کی دوسری طاقتور جماعت ہو گئے۔ اس وقت سے واقعات نے نہایت سرعت کے ساتھ پلٹا کھایا اور آسٹریا نازیوں کے قبضہ میں آجانے کے بعد سے، جس کے سبب چیکوسلواکیہ بھی خطرہ میں پڑ گیا پیچیدگیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس سال ۲۴ اپریل کو ہر ہنیلین نے علی الاعلان کہہ دیا کہ سوڈیٹن جرمنز "نیشنل سوشیلزم" کے پیرو ہیں اور باشندگان چیکوسلواکیہ سے درخواست کی کہ وہ اپنے آپ کو جرمنی کے مد مقابل خیال کرنے سے باز رہیں۔ اس نے حکومت سے یہ بھی استدعا کی کہ وہ اپنی خارجی پالیسی میں تبدل و تغیر کرے جس کے سبب وہ جرمنی کے مخالفوں میں شمار ہوتی ہے۔

اقلیت کا دوسرا سوال ابھی طے ہونیکو باقی ہے جو سلوواکس سے متعلق ہے جن کی آبادی ملک کی ۲۵ فیصدی ہے فادر ہلینکا آنجہانی کے زیر اقتدار اس تحریک نے بہت ترقی کی۔ لیکن خود اختیاری گروہ کی طاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بظاہر پارلیمنٹ کے $\frac{1}{3}$ سلوویک ممبروں سے زیادہ اس تحریک کے حامی نہیں ہیں تہذیب اور صنعت و حرفت میں سلوویکس چیکس کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں سوڈیٹن جرمن کی طرح جو کہ جرمنی سے مل جانا چاہتے ہیں خود مختار سلوویکس ہنگری سے مل جانا چاہتے ہیں جو مذہباً رومن کیتھولک ہیں دستوری طور سے حکومت چیکوسلواکیہ جمہوری ہے۔ مجلس ملی ایوان منتخبین پر مشتمل ہے جو ۶ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور جن کی تعداد تین سو ہے۔ مجلس عمائد کے ممبروں کی تعداد دو سو ہے جو ۸ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ دونوں ایوان متفقہ طور پر سات سال کے واسطے جمہوریت کا صدر منتخب کرتے ہیں۔

چیکوسلواکیہ کی فوج بہت اچھی ہے جس میں دس لاکھ کے قریب سپاہی ہیں۔ اس میں وہ روسی سپاہ بھی شامل ہے جس نے بیس سال قبل محیر العقول کارنامے کئے اور سخت سے سخت تکالیف برداشت کیں۔ فوج کی ملازمت ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے

قانون کے ماتحت ہے۔ فوجی ملازمت سترہ سال سے ۶۰ سال کی عمر تک لازمی اور ناگزیر ہے۔ لیکن عام طور سے بیس سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں باقاعدہ فوج کی تعداد ۱۰۰۵۹ افسران، ۱۵۳۳۵۶ سپاہی اور ۱۲۶۴۷ فوجی پولیس کے سپاہی تھے ۱۹۳۸-۱۹۳۷ء کے بجٹ میں ۷۹۳ ملین کراؤن فوج کے واسطے اور کل ۴۵۴۸۰۲۴۰۰۰ کراؤن ملکی حفاظت کے لئے خاص طور پر معین کر دیئے گئے تھے۔ فرانسیسی فوجی مشن نے، جو ۱۹۱۹ء میں چیکوسلوواکیہ آیا۔ اور دس سال وہاں ہی مقیم رہا، فوج کو تربیت دی اور اب اس ملک کی فوج لیاقت و قابلیت کے بہت بڑے معیار پر پہنچ گئی ہے چیکس طبعاً جنگجو ہوتے ہیں اور ترقی پذیر اسلحہ کی صنعت کے سبب ان کو اسلحہ کی بھی کمی نہیں مشہور "برین گن" جو آجکل برطانوی فوج میں مستعمل ہے اسی ملک کی ایجاد ہے۔ اس ملک کی فضائی طاقت چھ رجمنٹوں ۵۵۰ مشینوں سے زیادہ اور چھ ہزار افراد پر مشتمل ہے

لطفِ کلام

(از جناب لطیف انور صاحب گورداسپوری)

چل دیئے سب جانبِ میخانہ اُٹھ	دَور میں آنے کو ہے پیمانہ اُٹھ
خواب آور ہے بہت جس کا اثر	چھڑ گیا ہے اب وُہی افسانہ اُٹھ
شمعِ محفل جھلملاتی ہے ہنوز	جان دینے صورتِ پروانہ اُٹھ
آئینہ بن جائے حیرت سے جہاں	آج پہلو میں لئے میخانہ اُٹھ
عالمِ غربت میں آثارِ وطن	ڈھونڈلیں اے ہمّتِ مردانہ اُٹھ
گیسوئے برہم کو اے مست جمال	پھر ہُوئی ہے احتیاجِ شانہ اُٹھ

تیرے اُٹھنے سے اگر انور اُٹھے
امتیازِ کعبہ و بُت خانہ اُٹھ

از جناب جلال ملیح آبادی

۱

اے جمالِ سحر آگیں، اے نگارِ ماہتاب
یہ ملاحت خال و خد میں، یہ جبیں پر آب و تاب
خون کی لہریں ہیں یہ تیرے لبِ رخسار پر
الاماں کا فرجوانی ہے کہ ساون کا جلال
یہ جوانی، مسکراتی، جھومتی، گاتی ہوئی،
مسکرا کر عارضوں کا رنگ پیہم کھولتی
مرحبا! سبزہ نہ گلگوں کی رنگ آمیزیاں
رخ پہ یہ کھلتی ہوئی زلفِ پرافشاں کی مزے

آہ یہ کڑیل جوانی، اُف یہ طوفانی شباب
انکھڑیوں کی پشت پر ہیں مدھ بھری راتوں کے خواب
پڑ رہا ہے یا شفق کا عکس جوئے بار پر
ہر نظر بنتی ہے رُماں آفریں خوابوں کے جال
یہ لب و رخسار پر کلیاں سی چٹکاتی ہوئی
موتیوں کی پے بہ پے لڑیاں لبوں سے رولتی
سائے میں زلفوں کے ہونٹوں کی تبسم ریزیاں
حلقۂ ظلمات میں ہیں آبِ حیواں کے مزے

۲

یہ ملا کر آنکھ، لینا ناز سے انگڑائیاں
کشمکش اعصاب میں کیوں ہے یہ مجھکو دیکھکر
اے حسیں فتنے، تری اُلفت پرستی کے نثار
کیا بتا سکتی ہے تو، اس بے دلی کا کچھ علاج
مجھ کو یہ صد ہے مجھ سے عشق کر سکتا نہیں
اک نگارِ دل نشیں کے عشق میں ہوں پائمال
عزم ہو، تو دل سے جا سکتا نہیں صبر و شکیب
تجھ پہ مائل ہو! مجھے غم ہے کہ دل مجبور ہے

سرد آہیں بھر کے چٹکانا ادا سے اُنگلیاں
مسکراہٹ کی جھلک کیوں ہے لبِ رخسار پر
تیری بیباکی کے صدقے، تیری مستی کے نثار
دیکھتا ہوں جب تجھے ہوتا ہے مجھکو اختلاج
زندگی سے کتنا نادم ہوں کہ مر سکتا نہیں
تیرے دامِ حُسن میں میری اسیری ہے مُحال
عشق کھا سکتا نہیں حسنِ فسونگر کا فریب
یہ چراغِ رہگذر کب ہے چراغِ طور ہے

دوسرے مل جائیں گے تجھکو وفا کے واسطے
یوں مری جانب نہ دیکھا کر خدا کے واسطے

فریبِ تخیّل

ایک دلچسپ رومان

از جناب جمیل احمد صاحب کندہا پوری

نوجوان افسانہ نویس شمیم اپنی زوجۂ حیات شیریں کے ساتھ بےفکری کے عالم میں ساحلِ آب پر بیٹھا تھا۔ صبح ہونے میں چند لمحے باقی تھے اور ماہ چہاردہم پوری تابانی کے ساتھ حسن پاشیوں میں مصروف نظر آتا تھا۔ وسیع کائنات پر فرشِ نور بچھا ہوا تھا۔۔۔ تارے محبت پاش نظروں سے گھور گھور کر دلدادگانِ عشق کو دیکھ رہے تھے۔ خواب آور فردوسی ہوائیں چل رہی تھیں۔ فضا پر ہر سمت خاموشی مسلط تھی اور یہ رومانی ماحول آپس میں ممتزج ہو کر نہایت کیف آور سماں پیدا کر رہے تھے!

"کیسا سہانا منظر ہے شمیم!" شیریں نے دور حدِ نظر سے پرے نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں شیریں! کاش، یہ منظر جاودان ہوتا"۔۔۔ شمیم نے محبت پرست نظروں سے شیریں کو دیکھتے ہوئے کہا جو ضیائے چاند میں اس وقت حور معلوم ہو رہی تھی۔ "کاش! یہ کیف آور طلسم کبھی نہ ٹوٹتا۔۔۔۔ حقائقِ زندگانی ہمیں اپنا منحوس چہرہ نہ دکھاتے۔۔۔۔ یہی وادیٔ رومان ہوتا!۔۔۔۔ تم ہوتیں، میں ہوتا اور ماہتاب کی کبھی نہ ختم ہونے والی چاندنی"

"اور!" شیریں نے ایک ادائے خاص سے پوچھا "پھر کیا ہوتا؟"

"اور ہم یہیں فرشتوں کی سی پاکباز محبت میں ساری عمر گزار دیتے!۔۔۔ اسی وادیٔ حسن و رومان میں جہاں آہیں ہوتیں نہ نالے! غم ہوتا نہ مصیبت! رقابت ہوتی نہ رشک!"

"پھر!"۔۔۔ شیریں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کسی دن سالہا سال بعد ہم ایک ساتھ ایک ہی گھڑی اس وادیٔ حسن کو خیرباد کہہ کر ایک اس سے بھی زیادہ لطیف و پاکباز وادی میں چلے جاتے، جہاں ایک ساتھ بیٹھ کر ہم ہمیشہ نہ ختم ہونے والی عمر تک، نہ ختم ہونے والی محبت کے نغمے الاپتے!"

وہ گھنٹے خواب گریز پا کی مانند جلدی سے گزر گئے!

"صبح ہو گئی شیریں!" شمیم نے بیزاری سے کہنا شروع کیا۔ "اب پھر وہی حقائق ہیں۔۔۔۔ وہی نالے۔۔۔۔ وہی آہیں!۔۔۔۔ افسوس اس حسین منظر کو دوام نہیں!"

اتنا کہہ کر اس نے شیریں کی حنائی انگلیاں پکڑیں اور خراماں خراماں وہاں سے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

شمیم رومانی طبیعت کا ایک تخیل پرست انسان تھا۔ واقعات سے جی چراتا اور ان ہونی باتوں پر جان دینا اس کا شیوہ تھا۔ اسے ہر چیز میں ندرت کی تلاش رہتی۔۔۔۔ عام فرسودہ روش سے وہ حتی الامکان اجتناب کرتا۔ اسی جنون میں اس سے بسا اوقات ایسی حرکتیں بھی سرزد ہو جاتیں جو عوام کو غیر فطری معلوم ہوتیں۔ وہ لوگ جو ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اور باریک بینی جن کا شیوہ نہیں، وہ اکثر اس جلیل القدر افسانہ نویس کو ایک مافوق الفطرت ہستی تصور کرنے لگتے، جذبات پروری، تخیل پرستی اور رومانی طبیعت، ان تینوں کے امتزاج نے شمیم کو ایک عجیب چیز بنا رکھا تھا۔

اس وقت اس کی عمر بائیس سے کچھ ہی متجاوز ہوئی تھی۔ دو ماہ قبل اس کی بائیسویں سالگرہ کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ شمیم اپنے والد میاں شوکت کی واحد اولاد تھا۔ اس لئے اس کے آرام و آسائش پر دل کھول کر روپے صرف کئے جاتے تھے۔ شوکت شہر کے متمول اور باعزت رئیسوں میں سے تھے۔ کافی جائداد تھی۔ کلکتہ جیسے شہر میں چار عالیشان کوٹھیاں تھیں۔ پھر بنک میں بھی کافی روپیہ جمع تھا۔ زندگی میں وہ صرف دو ہستیوں کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک اپنے ہونہار فرزند شمیم کو اور دوسری اپنی یتیم بھتیجی شیریں کو، جس کے والدین مدت گزری اس جہان رنگ و بو سے سدا کے لئے رخصت ہو چکے تھے۔ شیریں بلاشبہ میاں شوکت کی اولاد نہ تھی۔ مگر پھر بھی ایک عجیب جذبے کے زیر اثر وہ اسے بھی اسی نگاہ سے دیکھتے جس سے شمیم کو! دونوں سے انہیں والہانہ محبت تھی اور یہ خیال سالہا سال سے ان کے دل میں پرورش پا رہا تھا کہ شیریں کو اپنی بہو بنائیں۔ اس خواہش، اس آرزو کا خواب انہوں نے اس وقت دیکھا تھا جب یہ دونوں محض طفل شیر خوار تھے اور اب ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ماضی کے اس پر کیف خواب کو جہاں تک جلد ممکن ہو حال کی حقیقت میں منتقل کر دیں۔ لہٰذا ہر آن کے حصول مقصد میں کوئی دقت بھی نہ تھی، کیونکہ شیریں و شمیم کے درمیان جنون آمیز محبت تھی اور دونوں ایک دوسرے پر پروانہ وار فدا تھے۔ چنانچہ آج سے ڈھائی تین ماہ بعد ان کی شادی ہونے والی تھی اور اس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

وادی حسن اسے جب یہ بندگان عشق واپس پہنچے تو آفتاب بساط آسمان پر اپنا سفر شروع کر چکا تھا اور اس کی لانبی لانبی پر انوار کرنیں فرش خاک پر پھیل چکی تھیں۔ شمیم اپنے دار المطالعہ میں بیٹھا تھا جو مکان کے بالائی حصہ پر واقع تھا۔ پشت پر ایک خوشنما جھیل تھی مشرقی دریچہ سے ساحل آب کی پر کیف ہوائیں آ رہی تھیں اور دریچوں کے رنگین پردے ہواؤں میں اس طرح جھول رہے تھے، جیسے رات کی تاریکی میں کوئی مہ جبینہ آہستہ محو خرام ہو!

صبح کی ڈاک آچکی تھی اور شمیم اس کے مطالعہ میں ہمہ تن غرق تھا۔ یکایک چپکے سے دبے پاؤں ایک لطیف شے کمرے کے اندر داخل ہوئی اور آہستہ آہستہ شمیم کی کرسی کے قریب پہنچ کر پیچھے سے اس کی آنکھیں اپنی گوری گوری حنائی انگلیوں سے ڈھانپ دیں۔ کمرے کے فرش پر چونکہ دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا اس لئے شمیم قدموں کی چاپ کی آواز مطلق نہ سن سکا اور آنکھیں بند پاتے ہی چونک کر بولا — "اوہو! یوسفہ!"

لیکن پھر بھی گرفت سے مخلصی نہ پا کر بولا — "شاید حامدہ!"

"نہیں..... ہوں.....!" شیریں نے انداز دلبری سے کہا۔

اور پھر دونوں کے لطیف قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

"لو! نیرنگ کا تازہ پرچہ آگیا" — شمیم نے رسالہ شیریں کو دیتے ہوئے کہا۔

"کوئی خط نہیں آیا!"

"ہاں! ایک نہیں تین تین!"

"دیکھوں تو" شیریں نے کہا جو بذات خود رومانی تو تھی نہیں مگر شمیم کے خیال سے اپنی فطرت کو اسی رنگ میں بدلنے کی سعی نامشکور میں منہمک تھی — "کوئی رومانی بھی ہے یا سب کے سب حسب معمول مادیت سے پر ہیں"

"یہ لو" شمیم نے ایک خط شیریں کو دیتے ہوئے کہا — "یہ دفتر نیرنگ سے آیا ہے"

"چھی!" شیریں نے حقارت کے ساتھ کہنا شروع کیا — "اس میں کیا جاذبیت ہو سکتی ہے، وہی دو چار جملوں میں شدومد سے قلم کاروں کا ذکر کرتے ہوئے کوئی افسانہ مانگا ہوگا..... ہے نا!"

"ہے تو صحیح، پر ذرا پڑھ کے بھی تو دیکھو!"

"خیر یہی صحیح!" — اتنا کہہ کر شیریں خط کے مطالعہ میں غرق ہو گئی لکھا تھا۔

دفتر رسالہ نیرنگ لاہور

۲۰ راکتوبر ۳۸ء

مجی بھائی شمیم!

افسانہ نمبر کے بعد آپ نے اب تک نیرنگ کے لئے کچھ نہیں لکھا درانحالیکہ قارئین آپ کے تازہ شاہکار کے لئے تڑپ رہے

ہیں۔ سالنامہ وسط دسمبر میں شائع ہو رہا ہے مازراہ کرم اس اشاعت کے لئے کوئی بہترین افسانہ ارسال فرمائیں اگر اپنی کوتاہیٔ قلم کی تلافی کر دیجئے ورنہ شکایت رہے گی۔

آپ کا افسانہ "خوابوں کا جزیرہ" مطبوعہ افسانہ نمبر اہل نظر طبقہ میں بہت پسند کیا گیا اور ادب کے جملہ ناقدین نے اسے سال رواں کا بہترین ادبی کارنامہ قرار دیا۔ اپنے بک ڈپو کی طرف سے ہم اسے بہت جلد جیبی سائز پر کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . .

توبہ! توبہ! کیا خرافات درج ہیں! شیریں نے شمیم کی طبیعت کا جائزہ لینے کے لئے مصنوعی نفرت کے ساتھ کہنا شروع کیا "اس خط میں کوئی جدت نہیں شمیم! ایسے تو روز ہی دو چار تمہارے پاس آتے رہتے ہیں"

شیریں کی رائے زنی دیکھکر شمیم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی!

"ایک جدت پسند کے لئے تو کوئی جدید طرز کا خط ہونا چاہئے" شیریں نے کہا "لاؤ! ذرا دیکھوں تو دوسرا خط"

شمیم نے ایک خط بڑھا دیا اور شیریں اسے پڑھنے لگی لکھا تھا۔

ادھر کچھ اوپر ایک سال سے آپ نے ماہنامہ ساغر کے لئے کچھ نہیں لکھا نتیجہ ظاہر ہے۔ جہاں نیرنگ کے خریداروں کی تعداد میں دن دونی رات چوگنی اضافہ ہو رہا ہے، وہاں ساغر کے قارئین کا حلقہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب اگر آپ نے فی الفور ہمارے حال زار پر کرم نہ کیا تو . . . . !"

"وہی پرانی بکواس ہے" شیریں نے خط کو لاپروائی کے ساتھ میز پر پھینکتے ہوئے کہا "اس میں بھی کوئی ندرت نہیں"۔

"تو پھر دکھاؤں ایک رنگین خط!"

"کیا ایسا ہی، جیسے کہ میں ابھی پڑھ چکی"

"ہاں! اسی رنگ میں مگر رومان کا پرتو لئے ہوئے"

"دکھیوں تو"

"یہ لو!" شمیم نے گلابی رنگ کا ایک پھولدار لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا "اس خط کے ہر ہر حرف سے رومان کی بو آتی ہے"

شیریں نے ایک خندہ زیر لب کے ساتھ لفافہ لیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

فیروز لمیٹڈ لنگ بمبئی

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء

محترمی شمیم صاحب!

میں آپ کے افسانے کچھ اوپر چار سال سے رسالوں میں پڑھ رہی ہوں۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں مجھے کسی کے افسانے اتنے پسند نہیں جتنے آپ کے! رازق جالندھری بھی بلاشبہ اچھے افسانہ نویس ہیں لیکن آپ کے مقابلہ میں ان کا طرز بیان بھونڈا اور مصنوعی معلوم ہوتا ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ آپ کی دماغی کاوشوں کے سامنے ان کے افسانے بے کیف اور رنگ و بو سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔

نیرنگ میں ہر ماہ صرف اس لئے خریدتی ہوں کہ اس کے اندر آپ کے افکار عالیہ اشاعت پذیر ہوتے ہیں . . . . وہ غیر فانی افسانے جو دور حاضر کے ادبیات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ماسی رسالہ کے افسانہ نمبر میں آپ کا تازہ افسانہ "خوابوں کا جزیرہ" پڑھا۔ سبحان اللہ کیسی پاکیزہ چیز ہے! میں کیا اور میری پسند کیا! آپ کے شہ پاروں کے متعلق کچھ کہنا تو یقیناً گستاخی اور بے ادبی ہوگی پھر بھی کم سے کم اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ افسانہ بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے ہماری زبان میں اس قسم کے چند ہی اور افسانے ہیں جن کو ہم فخر کے ساتھ مغربی افسانوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ رومان اور حقائق کو آپ نے اس کے اندر کچھ ایسے لطیف پیرایہ میں سمویا ہے کہ بے ساختہ زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔

یوں تو سبھی افسانہ نویس ماہر نفسیات ہوتے ہیں لیکن اس بلب خاص میں آپ کا مشاہدہ اتنا عمیق ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے . . . . دل و دماغ عش عش کرنے لگتا ہے۔ جو باتیں عورتوں کی زبان سے نکلنی چاہئیں وہ آپ کے قلم سے ادا ہوتی ہیں۔

پینتیس دنوں سے وہ افسانہ ہر روز سونے سے قبل پڑھ لیتی ہوں لیکن طبیعت ہے کہ سیر نہیں ہوتی۔ جتنا زیادہ اس افسانے کو پڑھتی ہوں اسی قدر اس کی خوبیاں مجھ پر واضح ہوتی جاتی ہیں . . . . ہاں! خط لکھ کر آپ کو زحمت دینے کی ضرورت صرف یہ ہے کہ مجھے اس افسانے کے متعلق ایک بات دریافت کرنے کی تمنا ہوئی . . . .

محض ایک معمولی سی چیز! ... یعنی آپ کا یہ افسانہ "خوابوں کا جزیرہ" محض خیالی ہے یا آپ نے اسے کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے؟

آپ کا پتہ ایک ماہنامہ کے ایڈیٹر صاحب سے معلوم ہوا۔
امید ہے جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

ناچیز
'نیلوفر'

"خوب" شیریں نے اپنے خوبصورت چہرے پر مسرت و اطمینان کی لہر پیدا کرتے ہوئے کہا — "جواب، تو تم لکھ چکے ہو گے!"

"ہاں لکھ دیں! لیکن محض دلبستگی کی خاطر!" — شمیم نے کہنا شروع کیا، "ٹھوس اور سنگین حقائق سے چند لمحوں کے لئے خوابوں کے جزیرہ میں پناہ لینے کے لئے۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے شمیم!"

"عورتیں جلد بدگمان ہو جاتی ہیں جان! اور مجھے ڈر ہے کہ شاید ایک غیر متعارف خاتون سے خط و کتابت قائم کرتے دیکھ کر تم بھی اسی کا شکار نہ ہو جاؤ"

"مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے شمیم" شیریں نے کہا — ذرا دکھاؤ تو جواب"

"یہ لو" کہکر اس نے جواب شیریں کی طرف بڑھا دیا۔

شوکت منزل کلکتہ

۲۳ر اکتوبر ۳۸ء

محترمہ سلام مسنون!

عنایت نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ! میرے افسانوں سے آپ کو دلچسپی ہے! اسے میں بجز اپنی خوش نصیبی کے اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں ادیب ہوں نہ شاعر، افسانہ نگار ہوں نہ ڈرامہ نویس! بس دل میں کبھی کبھی ایک خلش، ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے اور اس دل خانہ خراب کو سکون بخشنے کے لئے کبھی کبھی دو چار بے ربط جملوں میں اظہار جذبات کر لیا کرتا ہوں اور بس!

یہی ہے میری افسانہ نویسی کی نوعیت!

تازہ افسانہ خوابوں کا جزیرہ محض تخیل کی پیداوار ہے کسی واقعہ سے متاثر ہو کر نہیں لکھا گیا ہے۔

توجہ کا بطور خاص شکر گزار ہوں۔

نیاز آگیں
شمیم۔

ٹھیک ایک ہفتہ بعد شمیم کو پھر غیر متوقع طور پر نیلوفر کا خط ملا۔

فیروز بلڈنگ

۲۷ر اکتوبر ۳۷ء

مکرمی!

آپ کا خط پا کر کتنی خوشی ہوئی یہ بیان سے باہر ہے۔ مسرتیں میں نے بھی بیشک دیکھی ہیں۔ لیکن اس قسم کی مسرت سے، جیسی کہ آپ کا سرفراز نامہ پا کر ہوئی، اس سے قبل میں آج تک کبھی دو چار نہ ہوئی تھی۔ ملک کے سب سے بڑے جلیل القدر ادیب نے مجھے خط لکھا تھا... مجھ ہیچمدان کو! اور اس لحاظ سے میں مسرور ہونے میں گویا حق بجانب تھی۔

سچ پوچھئے تو مجھے اس کی امید نہ تھی کہ آپ جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ لیکن یاس و نا امیدی کی تاریک گھٹاؤں کے درمیان جب آپ کا عنایت نامہ آفتاب بن کر نمودار ہوا تو پھر میں خوشی سے باؤلی ہو گئی.... شاید فرط مسرت سے شادی مرگ ہو جاتی

مجھے اب آپ کا اوٹوگراف پانے کی بے حد تمنا ہے تاکہ اسے ہمیشہ کے لئے سرمایۂ حیات بنا کر رکھوں۔ کیا میں امید کر سکتی ہوں کہ آپ کوتاہئ قلم سے کام نہ لیکر اپنے ایک عقیدت مند کے جذبات کا خیال کریں گے۔

ناچیز
نیلوفر

نیلوفر کا تازہ خط پڑھ کر رومان پرست شمیم کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی اور دلچسپی قائم رکھنے کے لئے اس نے نیلوفر کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔

کئی ہفتے بغیر کسی قابل ذکر واقعہ کے گذر گئے، البتہ نیلوفر کے خطوط جن میں کسی نہ کسی قسم کے استفسارات اور مطالبات ہوتے شمیم کو برابر ملتے رہے... کسی میں فوٹو کی درخواست ہوتی.... کسی میں اوٹوگراف کی.... کسی میں تازہ افسانے کی!

ایک دن صبح کا وقت تھا اور شمیم شیریں کے ساتھ اپنے کمرے کے اندر مشرقی دریچہ کے پاس کھڑا تھا جس کے نیلے کواڑ خوشنما جھیل کے عین مقابل کھلتے تھے۔ طیور کنار پانی کے پاس خوش فعلیوں میں مصروف تھے اور بدمست ہوائیں چل رہی تھیں۔

"یہ طیور کتنے آزاد اور خوش فکر ہیں شیریں!" — شمیم نے اپنی عزیز از جان ہستی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا — "کیا تمہارے دل میں بھی اس قسم کی خواہش ہوتی ہے کہ بجائے طاقتور انسان کے تم محض ایک کمزور طائر ہوتیں!"

"مطلب کیا ہے؟" — شیریں نے شرارت آمیز شوخی سے پوچھا — "کیا اچھے خاصے انسان سے طائر ہونا چاہتے ہو؟"

"ہاں جان!" — شمیم نے اپنے انداز خاص میں کہنا شروع کیا — "مجھے صرف اس کی خواہش ہی نہیں ہوتی بلکہ ان پر رشک بھی ہوتا ہے ... گوشت و پوست کے ان حقیر چلتے پھرتے ٹکڑوں پر!"

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ طائر ہی ہو جاؤں گی!"

"کاش ہم دونوں ہی طیور ہوتے شیریں! ... کاش ایک صبح بیدار ہونے پر ہم اپنے کو معصوم دل طیور میں منتقل پاتے!"

"پھر!" شیریں نے اپنے پریشان زلفوں کو سمیٹتے ہوئے پوچھا جو دوش ہوا پر جھولے جھول رہے تھے۔

"پھر ہم ان عالیشان محلوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیتے شیریں! جن کے فلک بوس کنگوروں پر آج گدھ منڈلا رہے ہیں ..... اور ہوا میں پرواز کرتے ہوئے کسی ایسی رومانی وادی میں چلے جاتے جہاں رنگ برنگ کے پھول ہوتے ..... موسیقی ہوتی اور حسین نغمے!"

"اور وہاں سے؟"

"اور جب وہاں سے طبیعت سیر ہو جاتی تو اس وادی کو خیرباد کہکر سفید برف پوش پہاڑوں کے گرد منڈلاتے رہتے ...."

"اور جو کوئی شکاری مل جاتا اور اس کے نوکیلے تیر کا نشانہ میں بن جاتی تو ....!"

"تو پھر میں بھی اس بیرحم شکاری کے سامنے جا کر عرض کرتا کہ جہاں تو نے مجھ سے میری عزیز ترین ہستی، میری روح چھین لی ہے، وہاں مجھے بھی اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیر کا نشانہ بنا دے"

شمیم نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ دربان تازہ ڈاک لیکر حاضر ہوا اور وہ اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ایک خط نیلوفر کا بھی تھا۔

فیروز بلڈنگ

مکرمی شمیم صاحب! ۱۴ر نومبر ۳۷ء

حفیظ جمیلی کے افسانوں کے متعلق آپ نے جو کچھ قلمبند فرمایا ہے، اُن سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کے اور چیخوف کے افسانوں میں بہت کچھ مماثلت موجود ہے۔ البتہ طرز تحریر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

بہرحال! اب سر راہے آپ سے کچھ عرض بھی کرنی ہے۔ .... پریشان نہ ہوئیے! ..... نہایت معمولی سوال ہے۔ پورا کر دینے میں آپ کا کچھ نہ بگڑے گا اور میرے تخیل کی رنگین دنیا آباد ہو جائیگی .... محض یہ کہ مجھے آپ کے حالات جاننے کا بیحد شوق ہے .....

گھبرائیے نہیں میں اس میں حق بجانب ہوں، جہاں مجھے اپنی تحریروں کا گرویدہ بنایا ہے وہاں از راہ کرم میرا یہ شوق بھی پورا کر دیجئے .....

پھر یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں! یہ تو ایک فطری امر ہے!

جب کوئی شخص کسی مصنف کی دماغی کاوشوں سے دلچسپی لینے لگتا ہے تو لازمی طور پر اس مصنف کی پرائیویٹ زندگی کے حالات جاننے کا شوق بھی دل میں گدگدی پیدا کرنے لگتا ہے۔ کیا ملا سلطائی، موپاسان، برٹ ہارٹ اور آسکر وائلڈ کے جواہر ریزوں کو پڑھکر آپ کے دل میں ان جلیل القدر ادبا کے حالات جاننے کی اُمنگ نہ پیدا ہوئی ہوگی۔ اسی لئے تو مصنف خود آپ بیتیاں لکھتے ہیں اور جو خود یہ فرض ادا نہیں کرتے تو دوسرے ان کے عوض ان کی سوانح حیات لکھکر پبلک کو ان سے مستفید کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے دلائل پر غور فرما کر ضرور میری عرض قبول فرمائینگے۔

آپ نے پہلا افسانہ کب اور کہاں لکھا تھا؟

نیاز مند
'نیلوفر'

ایک نادیدہ خاتون سے اس طرح کی دلچسپ مگر معصومانہ خط وکتابت کیا بجائے خود ایک رومان نہیں شیریں!" شمیم نے خط پڑھاتے ہوئے کہا ـــ زندگی کی ناخوشگوار تلخیوں کو خوشگوار بنا کر برداشت کرنے کے لئے اس قسم کی چیزیں میرے خیال میں ضروری ہیں جان!"

شیریں نے ہم خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے خط اپنے ہاتھ میں لے لیا!

اُسی دن شام کے وقت شمیم نے نیلوفر کے خط کا جواب ارسال کر دیا اور اس کے آٹھویں دن اُسے پھر نیلوفر کا خط ملا جو حسب ذیل تھا۔

فیروز بلڈنگ بمبئی

۱۴ر نومبر ۲۸ء

شمیم صاحب!

حالات قلم بند کرنے میں آپ نے ذرا بخل سے کام لیا میں تو اس سے زیادہ تفصیل کی آرزو مند تھی۔ پھر بھی میری تحریک پر آپ نے جو کچھ لکھ بھیجا اس کی حد درجہ ممنون ہوں لیکن افسوس ہے آپ نے چند ضروری باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

کیا میں امید رکھوں کہ آپ ذیل کے چند سوالوں کے جواب ارسال فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

۱- آپ کیا کرتے ہیں؟

۲- آپ کی عمر کیا ہے؟

۳- آپ کی شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

جواب کی منتظر

نیلوفر

الجواب شمیم نے حسب ذیل خط لکھا۔

شوکت منزل کلکتہ

۲۷ر نومبر ۲۸ء

محترمہ!

جو سوالات آپ نے مجھ سے کئے ہیں ان کے جواب میں دوں گا لیکن ابھی نہیں! ـــ پہلے ان ہی سوالوں کے جواب اپنی طرف سے آپ مجھے ارسال فرمائیں گویا یہ سمجھئے کہ یہ سوالات آپ مجھ سے نہیں بلکہ میں آپ سے کر رہا ہوں ـــ پھر میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دوں گا۔

امید ہے آپ ضرور توجہ کریں گی

نیاز آگیں

شمیم

خط پوسٹ کئے ہوئے اس دفعہ دس دن گزر گئے لیکن اب تک نیلوفر کا جواب نہ پہنچا۔ حالانکہ پہلے خط کا جواب ایک ہفتہ کے اندر ہی آجایا کرتے تھے۔ اس سبب سے شمیم اپنے دل میں ایک قسم کی خلش ...... ایک بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے اُسے نیلوفر کے خط کا شدت سے انتظار ہو۔ پانچ دن اور گزر گئے لیکن پھر بھی نیلوفر کا خط نہ آیا۔ اب شمیم کے اضطراب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ خود سے ڈاک کے اوقات میں کار پر سوار ہو کر ڈاک گھر چلا جاتا، اس امید میں کہ نیلوفر کا خط ضرور مل جائیگا۔ لیکن جہاں اِدھر اُدھر سے اُسے متعدد خطوط موصول ہوتے وہاں اصل خط کی طرف سے اُسے ہر روز مایوسی کا ہی منہ دیکھنا پڑتا۔

ان ہی دنوں جب وہ امید وبیم کی حالت میں ڈاک بنگلہ کے اندر ٹہل رہا تھا۔ چپراسی نے اسے چند خط اور کچھ رسالے لاکر دیئے لیکن ان میں نیلوفر کا خط نہ تھا اور شمیم نے انتہائی ناامیدی کی حالت میں گھر پہنچتے ہی خطوں اور رسالوں کو نذر آتش کر دیا۔ پر پیچ شعلوں کو دیکھ کر وہ خود سوچنے لگا کہ "آخر ...... یہ ...... خلش ...... یہ اضطراب کیوں؟ ...... نیلوفر میری رشتہ دار ہے ...... نہ ...... عزیزہ! ...... ملاقاتی ...... نہ ...... محبوبہ! ...... پھر اس کے خط کے لئے یہ ...... بے چینی ...... کیوں!؟ ...... بہت سے ...... بہت ...... ایک عقیدت مند ...... ہے ...... اور بس ...... میری دماغی ...... کاوشوں ...... کی ...... ایک ...... دلدادہ! ...... پھر میں نے اُسے ...... نہ ...... کبھی ...... اپنی آنکھوں ...... سے دیکھا ...... نہ کبھی ...... اپنے کان سے ...... اس کی ...... لطیف آواز ہی سُنی! ...... وہ کون ہے؟ ...... کیا کرتی ہے؟ ...... یہ سب کچھ نہیں ...... جاننے کے ...... باوجود بھی ...... ایک نادیدہ خاتون ...... کے لئے ...... یہ تڑپ کیوں ...... یہ بے چینی کس لئے؟ ......!"

لیکن دل میں ان سوالات پر غور کرنے کے باوجود بھی کوئی شافی حل اُسے میسر نہ آیا۔

چار دن اور گزر گئے —— لیکن نیلوفر کا خط نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمیم کا اضطراب آمیز جنون بتدریج بڑھتا گیا اور پھر مجبوراً اُسے اکیسویں دن نیلوفر کے نام ایک تار ارسال کرنا پڑا جس میں اُس کی خیریت دریافت کی تھی۔ تار روانہ کر کے شمیم کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ اس خیال سے کہ چند گھنٹوں میں نیلوفر کا جواب مل جائیگا لیکن منٹ گھنٹے بنے اور گھنٹے دن! نیلوفر کا خط یا تار نہ آیا۔

اب شمیم کے دل میں منحوس اور ناخوشگوار خیالات خود بخود گدھ کی طرح منڈلانے لگے۔ . . . . شاید وہ بیمار پڑ گئی ہوگی، اور بے رحم موت کے سرد ہاتھوں نے اس کا شیرازۂ حیات بکھیر دیا ہوگا . . . . . .

وہ اب قبر میں ہوگی اور دائمی خواب میں مستغرق!

پھر ان خیالات کو جلد ہی دماغ سے نکال کر وہ سوچنے لگتا۔

—— اگر نیلوفر . . . . مر بھی گئی . . . . تو . . . . مجھے اس سے کیا . . . .

دنیا میں ہزاروں ہی تو . . . . ہر روز . . . . مرا کرتے ہیں . . . . پھر ایک ایسی ہستی . . . . کے لئے اظہار افسوس کے . . . . کیا معنی ہیں!

. . . . میں نے کبھی . . . . دیکھا تک نہیں! . . . . شیریں زندہ ہے . . . .

. . . . میں اُسے چاہتا ہوں . . . . میرے خیالات اسی کے لئے وقف ہونے چاہئیں . . . . !"

اسی کشمکش کی حالت میں قسمت ایک دن اُس پر مسکرائی اور اُسے نیلوفر کا خط ملا۔

فیروز بلڈنگ۔ بمبئی

۲۲ جنوری ۱۹۳۰ء

شمیم صاحب!

آپ کا خط مل گیا تھا۔ لیکن چونکہ میں بیمار پڑ کر تبدیلِ آب و ہوا کے لئے باہر چلی گئی تھی، اس لئے جواب وقت پر نہ دے سکی۔ معاف کیجیئے گا۔

میرے سوالوں کے جواب ارسال کرنے سے قبل، پہلے ان ہی سوالوں کے جواب آپ مجھ سے چاہتے ہیں، تو تو پھر سنئے! یہ ہیں:

۱۔ میں یہاں اپنے ماموں کے ساتھ رہتی ہوں، جن کا یہاں خاص مکان ہے۔ میرے والدین کشمیر میں سکونت پذیر ہیں۔ میں یہاں ایک مقامی کالج میں بی۔ اے میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ ادبیات بالخصوص رومانی لٹریچر سے مجھے خاصہ شغف ہے۔ اینڈرسن، گرم، مانڈر ہیگارڈ اور آسکر وائلڈ جیسے رومان نویسوں کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ پریوں کی کہانیاں بھی مجھے بہت مرغوب ہیں اور اُن کو پڑھتے وقت یہ خواہش میرے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے کہ "کاش بجائے انسان کے میں ایک ننھی سی پری ہوتی"

۲۔ میری اٹھارویں سالگرہ گذشتہ ماہ منعقد ہوئی تھی۔

۳۔ شادی ابھی میری نہیں ہوئی۔ اور چونکہ اس میں والدین نے مجھے کافی آزادی دے دی ہے۔ اس لئے فی الحال خیال بھی نہیں۔ شادی تو ویسے بھی ایک غیر شاعرانہ اور غیر رومانی چیز ہے۔ لیکن اگر اس پہلو کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس ضمن میں بہت سی قابلِ غور باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ شادی تو زندگی بھر کا سودا ہے۔ اس لئے جب تک ہر صورت سے کامل اطمینان نہ کر لیا جائے۔ شادی کس طرح کی جا سکتی ہے،

میں چاہتی ہوں کہ جس سے میری شادی ہو، وہ مزاج، فطرت اور مذاق غرضکہ ہر چیز میں مجھ سے یگانگی رکھتا ہو . . . . جو میری قدر کر سکے، جس کی میں قدر کر سکوں —— جو میرے جذبات کا خیال کر سکے —— میں کے جذبات کا میں خیال کر سکوں! جو مجھے سمجھ سکے اور جسے میں سمجھ سکوں، میرے خیال میں یہی ہے شادی اور اسی کا نام ہے کامیاب ازدواجی زندگی۔ آج کل ہندوستان میں جس قسم کی شادیاں رائج ہیں ان کی میں قائل نہیں —— بھلا آپ ہی کہئے، یہ بھی کوئی شادی ہوئی اگر بیوی روشن خیال ہے اور شوہر لکیر کا فقیر! ایک تعلیم یافتہ ہے اور دوسرا تعلیم سے محروم! ایک کی طبیعت رومانی ہے اور دوسرے کی اس کے برعکس!

اس طرف چونکہ بہت دنوں سے آپ کا کوئی افسانہ نظر سے نہیں گزرا اس لئے دل بیٹھا بیٹھا سا رہتا ہے۔ از راہ کرم میری خاطر کوئی افسانہ لکھ کر ارسال فرمائیے تاکہ اس کے مطالعہ سے طبیعت کچھ شگفتہ ہو جائے۔ پڑھ کر افسانہ واپس بھیج دوں گی۔

امید ہے خطوط کا خوشگوار سلسلہ اب برابر قائم رکھیں گے۔

ناچیز۔ نیلوفر۔

خط پڑھ کر نیلوفر کا ہر ہر حرف شمیم کے دل و دماغ پر نشہ کی طرح چھانے لگا۔ اس نے خط کو بیسیوں مرتبہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور ہر مرتبہ خط کے اختتام پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یکایک وہ خود کو حسن و رومان کی وادی میں محسوس کرنے لگا جہاں اس نے اپنے تخیل کی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ گلشن رنگ و بو میں نیلوفر کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ ...... "اٹھارویں سالگرہ گزشتہ ماہ منعقد ہوئی تھی ...... شادی ابھی میری نہیں ہوئی ...... والدین کشمیر میں سکونت پذیر ہیں ......!"

—— یہ تھے نیلوفر کے خط کے وہ جملے جو رہ رہ کر شمیم کے دل میں گدگدی پیدا کر رہے تھے۔ وہ انہیں جتنا زیادہ پڑھتا۔ اتنا ہی اپنے دل و دماغ پر ایک کیف آور نشہ، ایک لذیذ سرور چھایا ہوا محسوس کرتا۔

شمیم فطرتاً رومان کا دلدادہ تھا۔ نامعلوم اور غیر مرئی اشیاء پر جان دینا اس کا عزیز ترین شغلہ تھا۔ چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ اس نے محض دلچسپی اور آہوں بھری دنیا میں ایک معصوم مگر کیف آور رومان پیدا کرنے کے لئے قائم کیا تھا۔ لیکن اب یہ دلچسپی شمیم کی نظروں میں دوسری صورت اختیار کرتی نظر آتی تھی ...... وہ خود کو اب کچھ بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

نیلوفر کے خط کے جواب میں اس نے ذیل کا خط لکھا۔

شوکت منزل کلکتہ

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء

محترمہ!

جہاں مجھے اس دفعہ انتظار کی ناخوشگوار تلخیاں برداشت کرنا پڑیں وہاں آپ کے مسرت بخش خط نے کسی قدر اس کی تلافی بھی کر دی۔

آپ کے مطلوبہ سوالوں کے جواب حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ میری عمر بائیس "۲۲" سے کچھ متجاوز ہے۔

۲۔ شادی ابھی میری بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس باب خاص میں آپ کی اتفاق فرمائی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ واقعی جس قسم کی شادیاں ہمارے ملک میں کثرت سے رائج ہیں ان کا میں بھی مخالف ہوں لیکن یہ تو غور کیجئے کہ ہر شخص کو اپنی پسند کی چیزیں کب میسر آتی ہیں۔ ہوتا تو بالکل اس کے برعکس ہے۔ اگر عورت کو ایسا مرد اور مرد کو ایسی شریک حیات میسر آجائے جو ہر طرح سے ایک دوسرے کے ہم خیال ہوں تو پھر کیا کہنے! دنیا میں جنت کے لطف آنے لگیں۔

۳۔ آپ کی طرح رومانی ادبیات سے مجھے بھی بڑی دلچسپی ہے اور ویسے بھی میں ہمیشہ ٹھوس اور سنگین حقائق سے گریز کر کے رومان کی گود میں پناہ گزیں رہنے کا خواہشمند رہتا ہوں۔

افسانہ آپ کے حسب خواہش جلد ہی لکھ کر بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ابھی مجھ سے کچھ نہیں لکھا جاتا۔

براہ کرم اپنی خیریت کا خط اگر ممکن ہو تو ہر روز ارسال فرمایا کیجئے آپ کا خط پڑھ کر نہ جانے کیوں غیر معمولی مسرت ہوتی ہے۔ امید ہے آپ میرے جذبات کا خیال کریں گی۔

نیاز آگیں

"شمیم"

اب نیلوفر کے خط شمیم کو ہر روز ملتے اور وہ بھی نہایت پابندی کے ساتھ فوراً جواب بھیج دیا کرتا۔ یہ اس نوجوان افسانہ نویس کی زندگی کا وہ دور تھا جب اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں، تمام رعنائیاں نیلوفر کے رومانی خطوط میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ دن کے دو تین گھنٹے نیلوفر کو طول طویل خط لکھنے میں صرف کرتا اور بقیہ نیلوفر کے تازہ خط کو بار بار پڑھنے میں۔ اس سلسلہ کی جب ابتدا ہوئی تھی تو وہ نیلوفر کے خطوط شیریں کو دکھایا کرتا تھا جو آنے والے واقعات سے بے خبر رہتے ہوئے اس سلسلہ کو قائم رکھنے میں شمیم کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ لیکن اب شمیم نے شیریں کو خطوط دکھانا بند کر دیا تھا۔ شیریں اس حیرت انگیز تغیر کو جو شمیم کے دل و دماغ پر رفتہ رفتہ چھا رہا تھا اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی چونکہ اسے شمیم پر کامل اعتماد تھا۔ اس لئے اس کو وہم بھی یہ گمان نہ ہوتا کہ رومان کا دلدادہ شمیم واقعی ایک چلتے پھرتے زندہ رومان پر جان دینے لگا ہے۔

تین ہفتے نہایت مسرت کے ساتھ گزر گئے۔

اور شمیم نے نیلوفر کو جو آخری خط بھیجا وہ یہ تھا۔

شوکت منزل

۳ فروری ۱۹۳۹ء پیاری نیلوفر!

افسانہ کے لئے تمہارا اصرار حد سے تجاوز کر گیا ہے اور ادھر میں
ہوں کہ لکھنے لکھانے میں طبیعت ہی نہیں لگتی۔ پھر بھی ایک پلاٹ مرتب کر لیا
ہے۔ لیکن اس کا اختتام میں نہیں سمجھتا کہ کس طرح کروں۔ پلاٹ لکھے دیتا
ہوں۔ غور کر کے تم ہی بتاؤ کہ انجام کیا ہو سکتا ہے! اپنے دل و دماغ پر
مجھے تو نہ اب قابو ہے اور نہ اعتماد!

پلاٹ یہ ہے:— ایک مصور ایک ایسی لڑکی سے محبت
کرنے لگتا ہے جس کو اس نے کبھی دیکھا تک نہیں! لڑکی مصور کے
کسی شاہکار سے متاثر ہو کر خط و کتابت کا سلسلہ قائم کرتی ہے اور آخر
یہ چیز بڑھتے بڑھتے نوجوان مصور کے دل میں محبت کی تخم ریزی کرتی ہے
کیونکہ وہ رومانی طبیعت کا ایک تخیل پرست انسان ہے اور حاصل شدہ
چیز کے مقابلہ میں مشکل الحصول شے پر جان دینے کا عادی ہے — آخر
وہ مصور اپنی نادیدہ محبوبہ سے شادی کی درخواست کرتا ہے اور وہ لڑکی
................!

انجام میری سمجھ میں نہیں آتا نیلوفر! میں اس کا فیصلہ نہیں
کر سکتا کہ لڑکی شادی پر رضامند ہوگی یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے!
کیا وہ لڑکی مصور سے شادی کرنے پر رضامند ہوگی؟ سوچ سمجھ کر
جواب دو گی۔

تمہارا
"شمیم"

---

۳ فروری کو شمیم نے خط پوسٹ کیا اور ۲۱ فروری کو ہی صبح
سویرے اسے نیلوفر کا پر از جذبات خط ملا۔ لکھا تھا۔

فیروز بلڈنگ بمبئی

۱۸ فروری ۱۹۳۹ء شمیم صاحب!

کل شب ذرا سویرے ہی سے طبیعت مضمحل تھی اور نوشت و خواند
میں مطلق جی نہ لگتا تھا۔ لہٰذا میں سیر و تفریح کی غرض سے ساحل سمندر
پر چلی گئی۔ چاند کی تیرھویں تاریخ تھی اور اس کی روشنی نے اس خاص جگہ
کو اس وقت پرستان بنا دیا تھا۔ نہایت پر کیف منظر تھا۔ پر شور موجیں
لہریں لیتی ہوئی آتیں اور ساحل کی چٹانوں سے زور زور کے ساتھ
اس طرح ٹکراتیں جیسے کوئی ناکام محبت یاس و ناامیدی کی حالت میں
سر توڑ توڑ کر جان دے رہا ہو۔ میں قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گئی
اور تخیل کی مدد سے پھول اور موسیقی کے خواب دیکھنے لگی۔ اسی حالت
میں میرا خیال ادھر ادھر بھٹکتا ہوا آخر کشمیر پر مرکوز ہو گیا جو میرا وطن
ہے! اُف کیسی پر کیف جگہ ہے کشمیر بھی جس کے ہر ہر ذرہ میں رومان
کی دنیا مدفون ہے!......... خوشنما جھیل...... حسین
کہسار...... فردوس نظر سبزہ و مرغزار...... رنگ برنگ
کے پھول.....! کاش! آپ کبھی کشمیر تشریف لائیں اور ہم ایک
ساتھ وہاں کے خوبصورت اور دلفریب منظروں سے محظوظ ہوں!

گرمیوں کا موسم کشمیر میں خاصہ چہل پہل پیدا کر دیتا ہے۔ اس
سال کالج بند ہو جانے پر جب میں موسم بہار میں کشمیر گئی تو دیکھا ایک
اجنبی لڑکی جو شکل و صورت کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک تھی کہیں
دور سے بغرض تبدیلی آب و ہوا آئی ہوئی ہے اور میرے مکان کے
قریب ہی قیام کیا ہے۔ اس لڑکی سے جلد ہی میرے تعلقات دوستانہ
ہو گئے اور مجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک سنگ تراش سے اس
کے زندۂ جاوید مجسموں سے متاثر ہونے کے بعد محبت کرنے لگی تھی۔ اسے
اس سنگ تراش سے بے حد محبت تھی جو ہتھوڑی کی چند ضربوں سے بے جان
پتھروں میں روح پھونک دیتا تھا۔ آخر اس نے اپنے محبوب سے
سلسلۂ مراسلات قائم کیا۔ اور لڑکی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود
سنگ تراش کے خطوں سے بھی محبت کی بو آتی تھی۔ چنانچہ لڑکی نے
حوصلہ افزائی پا کر ایک خط کے اندر سنگ تراش سے شادی کی درخواست
کی اور قبل اس کے کہ اس کا جواب اسے موصول ہو وہ کشمیر سے روانہ ہو کر
اپنے وطن چلی گئی.................!

کل شب ایک کمزور تنکے کی مانند میں تخیل کے بحر ناپیدا کنار
میں بہی جا رہی تھی، میرے دل میں اس رومانی لڑکی کی یاد تازہ ہو گئی اور
میں سوچنے لگی کہ آخر اس کے مجنونانہ عشق کا انجام کیا ہوا ہوگا۔
شمیم صاحب! کیا آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنگ تراش

نے اس ناعاقبت اندیش لڑکی کو کیا جواب دیا ہوگا؟
جواب کی منتظر رہوں گی۔ "نیلوفر"

اس خط نے شمیم کے جذبات میں صرف ہیجان ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے دل کی دنیا میں ایک آگ سی لگا دی۔۔۔۔ "نیلوفر!۔۔۔۔۔ ایک نادیدہ خاتون!۔۔۔۔۔ صد درجہ تعلیم یافتہ۔۔۔۔۔ بندرگاہ بمبئی کے پاس بود و باش۔۔۔۔۔ وادیٔ کشمیر کے رنگین پھولوں کی گود میں پروردہ!"۔۔۔۔ جس لطیف شے نے ایسے حسین ماحول میں پرورش پائی ہو وہ خود کتنی نفیس اور لطیف ہوگی، اس کا تصوّر بھی شمیم کے امکان سے باہر تھا۔

"شاید یہ کشمیر اور مالابار کی قربت کا ہی اثر ہے جس نے نیلوفر کو اس قدر شاعرانہ۔۔۔۔ اتنا زیادہ رومانی بنا دیا ہے۔۔۔۔ بیشک میرے خوابوں کی تعبیر نیلوفر ہی ہو سکتی ہے جو سر تا پا حُسن ہے۔۔۔۔ شراب!۔۔۔۔ پھول۔۔۔۔ اور موسیقی!! اس کے بعد شمیم نے اپنے تصور میں شیریں کا نیلوفر سے مقابلہ کیا تو وہ ایک ایسا پھول معلوم ہوئی جس میں رنگ تو ہو لیکن خوشبو نہیں! کہاں نیلوفر اور کہاں شیریں!۔۔۔۔۔ ایک آبِ بقا اور دوسری سراب!

پھر رومانی طبیعت کے ایک تخیل پرست انسان کے لئے حاصل شدہ اور سہل الحصول شے بغیر حاصل شدہ اور مشکل الحصول کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ رومان نادیدہ میں ہے دیدہ میں نہیں!۔۔۔۔ نادانستہ میں ہے، دانستہ میں نہیں! شیر خوار بچہ جگنو پر لپکتا ہے۔ لیکن جب وہ کیڑا اس کی گرفت میں آجاتا ہے تو سارا شوق زائل ہو جاتا ہے اور وہ اُسے کچل دیتا ہے۔

"ہاں! میں بھی شیریں کے خیال کو اب کچل دوں گا۔۔۔۔ دل سے نکال دوں گا۔۔۔۔ صدف سے نکلے ہوئے گہر کے سامنے میں مصنوعی پتھر کا خیال نہیں کر سکتا"۔۔۔ شمیم نے اپنے دل ہی دل میں خیال کیا۔

شادی کو اب صرف چار روز باقی رہ گئے تھے اور جملہ انتظامات بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ لیکن شمیم اپنے دل میں شادی نہ کرنے کا اٹل فیصلہ کر چکا تھا۔

شام کے وقت اُس نے اپنے والد کے نام ذیل کا خط لکھا اور خود بردوان جا کر روپوش ہو گیا تاکہ کوئی اس پر بے جا دباؤ ڈال کر اس کے خوابوں کا قصرِ رنگیں متزلزل نہ کر سکے۔

خط یہ تھا:—

اباجان!

شاید آپ کو یہ سن کر بہت تعجب ہوگا کہ میں نے شیریں سے کبھی نہ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیوں؟ یہ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے اور میں تا دمِ زیست اسے بدل نہیں سکتا۔

آپ کے جذبات میرے اس رویّہ سے یقیناً مجروح ہوں گے لیکن مجھے مجبور و معذور سمجھ کر درگذر سے کام لیجئے۔ فرمانبردار "شمیم"

ایک ہفتہ کے بعد شمیم کو بردوان میں اپنے ایک دوست کا خط ملا جس نے کلکتہ سے لکھا تھا۔

عزیز دوست!

اپنے بوڑھے باپ کو تم نے بہت سخت صدمہ پہنچایا۔ شادی کی جملہ تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور تم نے عین وقت پر انکار کر کے ان کی مدت کی تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ عزت کا واسطہ تھا۔ اس نے فوراً نسیم کو راضی کر کے روزِ مقررہ پر اُسی سے شیریں کی شادی کر دی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ کہیں تو انھیں شیریں کی شادی کرنی ہی پڑتی پھر اگر تاخیر ہوتی تو چہ میگوئیاں زیادہ ہوتیں۔

شادی کے دوسرے ہی دن تمہارے والد یکایک حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب سے انتقال کر گئے۔ تمہارا اپنا "حامد"

شمیم نے اپنے والد کی موت کی خبر سنی لیکن آنے والی مسرتوں کے سامنے وہ جلد ہی سب کچھ بھول گیا۔ کلکتہ سے وہ بمبئی جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی بقیہ عمر حسن در رومان کی دنیا

میں گزارے۔ نیلوفر سے خط و کتابت جاری تھی اور شمیم نیلوفر کو اپنے عزم راسخ سے آگاہ کر چکا تھا۔

نسیم جس سے شیریں کی شادی ہوئی ' اوباش طبیعت کا ایک آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ رات رات بھر شراب خواری اور قسم قسم کی آوارہ گردیوں میں مصروف رہنا ہی اس کا عزیز ترین مشغلہ تھا چنانچہ جس شب شمیم بردوان سے کلکتہ پہنچا تاکہ اپنے ضروری سامان درست کر کے علی الصباح بمبئی روانہ ہو جائے، نسیم نشہ میں بدمست ہونے کے سبب سے شیریں کو زد و کوب کر رہا تھا نسیم کا مکان چونکہ شوکت منزل سے قریب ہی تھا۔ اس لئے شمیم ساری رات شیریں کی دلدوز چیخیں سنتا رہا۔ ایسی چیخیں جن سے سنگدل درندوں کے دل بھی ہل جائے لیکن رومان پرست شمیم اب ان چیزوں سے بے حس ہو چکا تھا۔ شیریں کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں شمیم کو متاثر نہ کر سکیں۔

وہ صبح سویرے بمبئی روانہ ہو رہا تھا اور اس خوش آئند خیال سے وہ دنیا بھر کو فراموش کر چکا تھا۔ اُسے بس نیلوفر کا خیال تھا اور بس! اس کے علاوہ ہر ذی روح شے کے لئے مردہ بن گیا تھا۔

علی الصباح شمیم اسٹیشن روانہ ہوا نسیم کا مکان راہ میں ہی پڑتا تھا۔ یکایک شمیم کی نظریں شیریں پر پڑیں جو بالاخانہ پر جھروکہ کے پاس کھڑی تھی۔ چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تڑپ تڑپ کر پامال شدہ تمناؤں کی داستانہائے غم بیان کر رہے تھے۔ لیکن شمیم نے فوراً ہی گردن نیچی کر لی اور نیلوفر کے خیالات میں ڈوبا ہوا وہ بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی پہنچکر اُس نے ایک ٹیکسی کرایہ کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا — "لے چلو فیروز بلڈنگ ...... جلدی کرو!"

موٹر روانہ ہوئی اور شمیم کے پُر شوق جذبات کی اس وقت کیا کیفیت تھی یہ بیان سے باہر ہے۔ دل میں تمنائیں مچل رہی تھیں... ... رومان کا نشہ اُسے خود فراموش بنا رہا تھا ...... وہ فردوسی منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تیر رہا تھا جب وہ فیروز بلڈنگ پہنچکر اپنے خوابوں کی تعبیر نیلوفر سے ملے گا جو جوان ہوگی ...... خوبصورت اور ...... عمر خیام کی کسی رُباعی کی مجسم تفسیر!

کار احاطہ کے باہر رُکی اور شمیم نے چہار دیواری کے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا کہ برآمدہ میں ایک نوجوان عورت جو بظاہر نیلوفر کی حبش نژاد خادمہ معلوم ہوتی تھی، ٹہل رہی ہے ..... پست قد، سیاہ رنگ، چہرے پر چیچک کے گہرے اور بدنما داغ — اور ساتھ ساتھ داہنی جانب کی آنکھ غائب!

"نیلوفر جیسی لطیف شے کی خادمہ کا اس قدر بدشکل ہونا بھی ایک رومان ہے" — اس انوکھے خیال پر دل ہی دل میں مسکراتا ہوا وہ آگے بڑھا اور قریب جاکر خادمہ سے پوچھا۔

"نیلوفر یہیں ہیں!"

"جی ہاں! آپ کی تعریف!"

"شمیم"

"اخاہ! آپ ہی ہیں شمیم صاحب! ...... ملک کے سب سے بڑے افسانہ نویس ...... زہے نصیب ..... آیئے .... آیئے!!"

"مگر نیلوفر کو تو بلوایئے!"

"اوہو! آپ نے مجھے اب تک نہیں پہچانا۔ ناچیز ہی کو لوگ نیلوفر کہتے ہیں"

نیلوفر اور یہ بدنما عورت! .... شمیم کا سارا رومان ختم ہو گیا... عقل و ہوش کافور ہو گئی ...... دماغ کی ساری طاقتیں جواب دینے لگیں ..... اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ اُس پر پھٹ پڑا ہو اور اسکے لاوا نے اسکو ایکدم جھلس کر رکھ دیا ہو ...

شمیم فوراً واپس ہونے لگا اور ابھی یہ احاطہ کے اندر ہی تھا کہ نیلوفر نے پوچھا۔

"جا کہاں رہے ہیں؟ .... آیئے نا؟"

"موٹر پر ایک چیز چھوٹ گئی ہے، اسے لیکر آتا ہوں"

باہر نکلتے ہی وہ موٹر پر سوار ہو گیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"— چلو واپس لے چلو! ..... جلدی ..... !"

"کہاں؟"

"جہاں جی چاہے"

م

غزل

از جناب مخمور جالندھری

عاشقی میں خامُشی ممکن ہے، ناممکن نہیں
کیا کروں مجھ سے تو ضبطِ التجا ممکن نہیں

میری خواہش ہے تجھے ذرّوں میں کر دوں آشکار
تیرے جلوے کچھ سہارا دیں تو نا ممکن نہیں

عالمِ امکاں میں گو ہر بات کا امکان ہے
اے وفا نا آشنا تجھ سے وفا ممکن نہیں

طالبِ آزارِ عشق اور حُسن آسائش پسند
تو بھی ہو میرا شریکِ مدّعا ممکن نہیں

میں جو مِٹ جاؤں تو بدلوں رنگ و بو کا پیرہن
عالمِ ایجاد میں میری فنا ممکن نہیں

ہر جگہ جلوے ترے میری نظر کے ساتھ ہیں
میں پُکاروں تو نہ ہو جلوہ نما ممکن نہیں

سازشِ دریا و ساحل کی تو کہہ سکتا نہیں
مجکو یہ موجیں ڈبو دیں ناخدا ممکن نہیں

جس نظر کو میرے دردِ دل کا بھی عرفان ہو
وہ نظر ہو جائے عالم آشنا ممکن نہیں

عشق کیا ہے صبر کا بدلا ہوا اک نام ہے
عاشقی ہو جائے خود صبر آزما ممکن نہیں

دے نہ الزامِ گناہِ عاشقی انساں ہوں میں
کیوں سمجھ رکھا ہے یہ مجھ سے خطا ممکن نہیں

میں ترا پرتو سہی مجھ میں ترا جلوہ سہی ؟ ؟
بندہ اور بندے کا بن جائے خدا ممکن نہیں

توڑتا ہے دل تو اس میں بیٹھ کر پیدا دگر
عکسِ خالی سے شکستِ آئینہ ممکن نہیں

ایک دل دے دے حقیقت آشنا مخمور کو
گر حصولِ ساغرِ عالم نما ممکن نہیں

جرمنی و اطالیہ میں عورت کی صحیح حیثیت

ظلم و ستم کی ایک لرزہ خیز داستان

(از جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناصح عظیم آبادی)

معارف جلد ۴۳ ۳ میں "یورپ کے جدید سیاسی نظام میں عورت کی حیثیت" کے زیر عنوان ہیبرٹ جرنل کے حوالہ سے ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے جس میں جرمنی و اطالیہ کے جدید نازی و فاسسٹی نظام حکومت میں عورت کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں مختلف شواہد و دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ہر دو سیاسی نظاموں کے ماتحت خواتین کی حالت نہایت ابتر ہو رہی ہے۔ وہ بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا کر دی گئی ہیں۔ انہیں انتہائی ذلت و خواری میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے سخت سے سخت ایذائیں دی جاتی ہیں۔ تمام قسم کے ابتدائی انسانی حقوق سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے انہیں خلاف ورزی قانون و احکام حکومت پر مردوں سے نسبتاً بہت زیادہ سخت اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی ہیں، اور ان سے سخت سے سخت خدمتیں لی جاتی ہیں مگر اس کے مقابلے میں ان کے قیام و طعام کا نہایت خراب انتظام کیا جاتا ہے۔ گویا جیل خانہ کے قیدیوں سے بھی ان کی حالت زیادہ المناک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حوا کی یہ بیٹیاں بیسویں صدی کے متمدن یورپ نہیں بلکہ قرون مظلمہ کے کسی وحشی ملک کی پیداوار ہیں۔

اس مضمون کے مطالعہ سے مجھ پر کوئی خاص اثر مترتب نہیں ہوا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مجھے اسکو سراپا مخالفین فسطائیت و معاندین نازیت کا پروپیگنڈا سمجھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس مضمون کے اندر کہیں تو مغالطہ سے کام لیا گیا ہے اور کہیں مبالغہ سے۔ کہیں مکر و فریب سے اور کہیں کذب و افترا سے۔ مجھے ذاتی طور پر نہ فسطائیت (فیسزم) سے کچھ عقیدت ہے اور نہ نازیت (نازازم) سے کوئی ارادت۔ میں اس مضمون کے ابطال و تکذیب پر محض اس وجہ سے قلم اٹھانے کے لئے آمادہ ہوا کہ حق و انصاف اس کا متقاضی ہے کہ کذب کو صداقت کا رتبۂ بلند حاصل کرنے سے باز رکھا جائے اور لوگوں کو غلط معلومات کی بنا پر غلط رائیں اور نظریئے قائم کرنے سے بچایا جائے کہ عامۃ الناس کو قعر جہالت اور چاہ ضلالت میں گرنے سے بچانا میرے نزدیک داخل حسنات ہے

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است!
وگر خاموش بنشینم گناہ است

اور خود قرآن شریف کی ہدایت ہے۔ یاایھا الذین آمنوا اذا جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین

افزائش نسل کی تدابیر

فیسزم اور نازازم کے نظام سیاست پر ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ ان میں عورتوں کا درجہ اسی حد تک قابل التفات ہے کہ وہ بہادر اور جنگجو افراد کی تولید کا آلہ ہیں۔ چنانچہ جرمنی میں یہ خیال سرعت سے

پیدا کیا جاتا ہے کہ مردوں کو زندگی کا اور عورتوں کو خانگی دھندوں کا ماہر ہو جانا چاہئے۔ مجھے اس بیان کی صحت سے انکار نہیں۔ مگر اس سے عورتوں کی پست حیثیت پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان ہر دو ممالک کو جنگی و فوجی ضروریات کے لئے سپاہیوں کی حاجت ہے جس کو نو آبادیات و مقبوضات کی عدم موجودگی کے باعث چار و ناچار اپنے ہی ابنائے وطن سے پورا کرنا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی داعی ہوئی کہ عورتیں فی الحال دیگر مشاغل حیات کو ترک کر کے خانگی امور کی طرف متوجہ ہوں اور بکثرت اولاد پیدا کر کے ملک کی آبادی میں اضافہ کریں۔ اس کے لئے عورتوں بلکہ مردوں تک کی طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کبھی کثرتِ اولاد پر انعام دیا جاتا ہے اور کبھی سرکاری ملازمت کے معاملے میں ان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں فسطائیوں نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو روما میں ایک جشن مناکحت منعقد کیا اور اس روز کوئی دو ہزار شادیاں عمل میں آئیں۔ بعدۂ ان سبھوں کا موٹروں پر ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔ جو شہر کے مختلف گلی کوچوں کا گشت لگاتا ہوا فسطائیوں کے صدر دفتر میں پہونچا۔ یہاں مسولینی نے بنفس نفیس دولہا دولہن کی پیشوائی کی اور انہیں تحفے دیئے۔ جب ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں تو انہیں سینٹ پیٹر کے گرجے میں لے جایا جاتا ہے۔ جہاں مسولینی خود ان کا نام تجویز کرتا ہے نازیوں نے بھی جرمنی کے ایک شہر اسٹوٹگارٹ میں ایک جشن عام میں جس میں جملہ اہل شہر براتی کی حیثیت سے شریک تھے سرکاری خرچ سے ۳۵۰ر اشخاص کی شادی کرائی۔

کثرتِ اولاد پر انعام دینے کی بدعت تنہا اطالیہ یا جرمنی میں ہی رائج نہیں بلکہ دیگر یورپین ممالک بھی اس بیں ان کی تقلید کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ فرانس کی ایک اکیڈمی کثیر العیال اشخاص میں برابر انعام تقسیم کیا کرتی ہے۔ اس اکیڈمی نے ۱۹۳۴ء میں ایک سگریٹ ساز کو جو آٹھ جیتے جاگتے لڑکوں کا باپ تھا ۲۵ ہزار فرانک کا اول درجہ کا انعام عطا کیا تھا۔ ترکی میں بھی لوگوں میں کثرتِ اولاد کا شوق پیدا کرانے کے لئے ۱۹۳۲ء میں ایک قانون بنایا جس کی رو سے ہر کثیر العیال شخص کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ متعلقہ محکموں کو اپنے متعلق اطلاع دیکر ۵۰ لیرہ ترکی وصول کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس قانون کے نفاذ پر بے شمار اشخاص نے موعودہ رقم حاصل کی۔ صرف شہر قونیہ اور اس کے نواح میں چار ہزار آدمیوں نے مقررہ وظیفہ وصول کیا۔ اس طرح اب یہ لوگ بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم تو الدوا و تناسلوا پر طوعاً یا کرہاً عمل پیرا ہو رہے ہیں اور کوئی دن جاتا ہے کہ تکثیر اولاد کے بہترین عملی طریقہ تعدد ازدواج پر بھی عمل ہوں گے۔

جرمنی میں مسئلہ بیروزگاری کا عاقلانہ حل

جرمن حکومت پر ایک الزام یہ لگایا گیا ہے۔ کہ اس نے عورتوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا ہے۔ اور اسکی ایک عجیب و غریب تدبیر یہ نکالی گئی ہے کہ نازی حکومت کی طرف سے ملازمت پیشہ عورتوں کو شادی کے لئے ۰ہ پونڈ بطور قرض دیا جاتا ہے تاکہ مقروض ہونے کی وجہ سے وہ قانوناً ملازمت کے قابل نہ رہیں۔ اس بیان میں گمراہ کن مغالطہ اور فریب کاری سے کام لیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق موجودہ پالیسی بیروزگاری کی روز افزوں وبا کا نتیجہ ہے شادی کی تشویق تکثیر اولاد کے علاوہ بدکاری و بیروزگاری کے ازالہ کے لئے بطور ایک مؤثر تدبیر کے ہے۔ چنانچہ روزنامہ "اصلاح" کابل نے اس مسئلہ پر "اصلاحات اجتماعی در المان" کی سرخی سے جلد ۵ ع۱۳۱ میں مفصلۂ ذیل خیال ظاہر کیا ہے:-

"گذشتہ ازیں دولت کنونی آلمان با وسائل
عملی از توسع دامنۂ عمل فحشاء دراں مملکت جلوگیری
مینماید و آن ہم تسہیل شرائط زناشوئی و مساعدت ہائے
نقدی دربارۂ اشخاصے ست کہ اقدام بتاہل میکنند
و ہم چنیں تائین جائزہ ہا دربارۂ اشخاص کثیر الاولاد ست
وایں اقدامات در تقلیل و تجدید عمل فحشاء میان
ملت عالمان عامل موثرے گردیدہ است"

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بدکاری کے انسداد کے لئے نازی حکومت نہایت سختی سے کام لے رہی ہے اس نے سال ماسبق میں بدکاری کے الزام میں بہ د من کیتھولک پ‍ے

متعدد پادریوں اور نیز کیتھولک سلسلہ کے ایک ہزار افراد کو جیل خانہ بھیجا گیا تھا۔ وزیر شعبۂ تبلیغ ڈاکٹر گوئبلس نے جرمن اخبارات میں گرجے اور خانقاہیں بدکاری کے اڈے ہیں" کی جلی سرخی سے ان کے ناگفتہ بہ حالات شائع کرائے ہیں۔ ساتھ ہی کیتھولک والدین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خانقاہیں عموماً لواطت کی مشق کرنے والے مقام ہیں نیز یہ انفرادی واقعات کا معاملہ نہیں بلکہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔

انسداد بیروزگاری کے سلسلے میں ہر ملک اور حکومت اپنے اپنے طور پر موثر تدبیریں عمل میں لا رہی ہے۔ نازی حکومت نے بھی منجملہ دیگر ترکیبات کے ایک ترکیب یہ اختراع کی کہ مردوں کو عورتوں کا کفیل قرار دیا اور ان کو برسر روزگار بنا کر ان کی آمدنی کا سامان پیدا کر دینا اپنے ذمہ لیا۔ اس وقت اور ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ابنائے ملک کو کس طرح بھوک کی مصیبت سے نجات دلائے اور بقدر ضرورت کفاف بہم پہنچایا جائے۔ اس بنا پر نازی حکومت نے عورتوں کو ملازمت سے سبکدوش کر کے ہدایت کی کہ وہ گھر کو سنبھالیں اور اس طرح ان کی خالی کردہ اسامی پر ان کے شوہروں اور دیگر متکفل مردوں کو بحال کر دیا۔ ان عورتوں کو شادی کر لینے پر انتظام خانہ داری کے لئے ابتداءً ۵۰۰ مارک اور بعد میں کثرتِ تعداد کی وجہ سے ۳۶۰ مارک کے عطیئے دیئے جاتے ہیں۔ لہذا یہ غلط ہے کہ اُنہیں ملازمت سے دور رکھنے کے لئے قرض دیا جاتا ہے۔ میں یہاں اپنے اس دعوٰی کی تائید میں جرمنی کی وزارتِ مالیہ کی رپورٹ کا تھوڑا سا اقتباس پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں:-

> حکومت اگست ۱۹۳۳ء سے جنوری ۱۹۳۴ء تک ۱۸۳ ہزار ایسی عورتوں اور مردوں کو جنھوں نے حکومت کے حسب ہدایات شادیاں کی ہیں بحساب ۳۶۰ مارک فی خاندان دے چکی ہے۔ عقد ازدواج کے سلسلے میں یہ تشویق اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ اب حکومت کو بجائے ۵۰۰ مارک دینے کے جو اگست سے پیشتر دیا جانا طے پایا تھا مجبوراً ۳۶۰ مارک پر اُترآنا پڑا۔ علاوہ بریں اسی زمانہ میں ۳۵۰ ہزار شادی شدہ بیروزگاروں کو برسر روزگار بنایا گیا اور وہ اس طرح کہ جن اسامیوں پر عورتیں بحال تھیں ان پر اُن کے شوہروں کو مقرر کیا گیا۔

اور رپورٹ کے اخیر میں مندرج ہے:-

> "چونکہ حکومت کی یہ کارروائی جرمنوں کی بیروزگاری اور اُن کے اقتصادیات کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے، اس لئے حکومت کا ارادہ ہے کہ کنواروں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے اس میں اضافہ کیا جائے اور اس رقم کو کثیر العیال خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے"

جرمنی میں بیکاروں کی تعداد کثیر ہے جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۳۴ء میں ۴۰۰ ہزار اشخاص کو برسر روزگار بنانے کے باوجود ۳ ملین اور ۷۴۳ ہزار نفوس بیروزگار پڑے ہوئے ہیں۔ مالی خستہ حالی کا یہ حال ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ گھر کا کام کاج اپنے ہاتھ سے انجام دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ۱۹۲۵ء میں ایک ملین عورتیں گھروں میں خادمہ کے طور پر بحال تھیں اب ان کی تعداد گھٹ کر صرف ۵۰۰ ہزار رہ گئی ہے۔

عورتوں کی جبری خدمت

نازی حکومت پر ایک تہمت یہ بھی لگائی گئی ہے کہ اس میں سترہ سے بیس برس تک کی لڑکیوں کے لئے کام کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے جس کی مشقت فوجی خدمات سے کم صبر آزما نہیں ہوتی۔ یہ الزام اس لئے مبنی بر اصلیت نہیں کہ جرمنی میں شادی شدہ عورت اور نیز ایسی عورت کی جو انتظام خانہ داری میں لگے، اپنی اوقات عزیز بچوں کی تربیت و پرداخت میں صرف کرے۔ آفسوں اور کارخانوں کو کام کے لئے نہ تاکے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ انیس کا بل جلد ۷ شمارہ ۴۷ میں رقمطراز ہے:-

"دکسانیکہ خانہا سے از اینجا بہ آنجانہ رفتہ ...

بعد عروسی مقصد حیاتی خود را بدون انجام دادن امور
خانہ داری دیگر چیزے تصور نہ کنند یعنی نہ در دفاتر
کار کنند و نہ در فابریکہا حاجات خود را پامال سازند
و نہ غیر عروسی ماندہ شکار خواہشات نفسانی گردند
قابل انعام شمردہ خواہند شد"

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان خواتین سے جبراً خدمت لینے کا دعویٰ کہاں تک قابل پذیرائی ہو سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں نا کتخدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جرمنی میں ۱۴ سال سے ۲۰ سال کی عمر تک تمام عورتیں رشتہ مناکحت میں منسلک ہو جاتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں صرف ایک سال کے اعداد و شمار پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ مثلاً ۱۹۳۵ء میں ۱۵ سے ۱۶ سال تک کی ۶۲ لڑکیاں کتخدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک پندرہ سال سے کم عمر کی تھی۔ اسی طرح ۱۶ سے ۱۷ سال تک کی لڑکیاں ۱۱۲۰ اور ۱۷ سے ۱۸ تک کی ۴۳۸۴۳ عقد مناکحت میں آئیں۔ ان میں سے ایک ایک سترہ سال کی بیوہ تھی۔

جرمنی نے عورتوں کو میدان سیاست سے الگ کر کے امور خانہ داری میں جبر و تشدد سے نہیں تشویق و تحریص سے اور تربیت تہدید سے نہیں ترغیب و ترحیم سے لگانے کی کوشش کی ہے مثلاً ۱۹۳۴ء میں جرمن میونسپلٹیوں (بلدیات) نے یہ اعلان کیا کہ جو عورت اپنی روٹی اپنے باورچی خانہ میں آپ پکانا چاہے گی اسے بجلی کی قوت (الیکٹرک پاور) منجانب بلدیہ مفت دی جائے گی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عورتوں نے کثیر تعداد میں آوارہ گردی و لاابالی پن سے باز آکر پاکبازی و نیک چلنی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ اور اپنے اپنے انتظام خانہ داری میں لگ گئیں۔ چنانچہ برلن کے ایک مشہور اخبار کا بیان ہے کہ صرف ایک ماہ کے اندر برلن میں ۱۳۰ عورتوں نے اعلان کیا کہ اب سے ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں کام کرینگے روٹیاں پکائینگے، انتظام خانہ داری سنبھالیں گے اور شوہروں کی خدمت اور اولاد کی پرداخت کریں گے۔ اس طرح اکثر مردوں کو ہوٹل کے کھانوں سے جس میں ان کا بہت زیادہ خرچ ہو جایا کرتا تھا نجات مل گئی۔

تعلیمِ نسواں پر پابندیاں

اس سلسلے میں ایک اور شدید الزام یہ لگایا گیا ہے کہ:۔

"یونیورسٹی میں عورتوں کا داخلہ نہایت ہی محدود ہو گیا ہے میٹریکولیشن کے امتحان کی پاس شدہ طالبات میں سے صرف ۱۰ فیصدی یونیورسٹی میں داخل ہو سکتی ہیں۔ ان کو بھی پیشہ کی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ سال میں صرف ۷۵ عورتیں طب کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں ٹیکنیکل علوم صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں"!

حقیقت کو مسخ کرنیکی بدترین مثال اگر ڈھونڈھنی ہو تو اس بیان سے ماوراء اور کہیں ملنی شاید ہی ممکن ہو۔ اس تحدید کو طبقۂ اناث کی تذلیل و توہین سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسکی تہ میں دراصل وہی بیروزگاری کا کرشمہ کارفرما ہے۔ چونکہ حکومت تمام تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کے مناسب حال روزگار فراہم کرنے سے معذور رہی ہے۔ اس لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ اعلیٰ تعلیم پر عارضی پابندی عائد کر دی جائے۔ اور صرف وہی لوگ کالج میں داخل کئے جائیں جو دماغی و جسمانی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ اخلاق و عادات درست ہوں اور قومی درد بھی دل میں رکھتے ہوں۔ اس قسم کے بہمہ صفت موصوف طلباء کے ۱۹۳۴ء میں فقط ۱۵ ہزار داخل کئے جانے کا حکم جاری کیا گیا جن میں سے عورتوں کا تناسب ۱۰ میں ایک کا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں کہ صرف فی صد ۱۰ عورتوں کی شرح متعین کر دی گئی ہے۔ ان دونوں شرحوں میں جو بیّن تفاوت ہے وہ علم حساب کے ہر واقف کار پر عیاں ہے۔ مثلاً اول الذکر تناسب کی رو سے ۱۵۰۰ طالبات میں سے کل کی کل کالجوں میں لی جائیں گی۔ مگر موخر الذکر تناسب کے بموجب زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو بھرتی کی جا سکیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال زیر بحث میں کم و بیش ۱۰ ہزار طالب العلم اعلیٰ تعلیم کے حصول

سے محروم رہ گئے۔ کابل کا سرکاری روزنامہ "اصلاح" رقمطراز ہے:۔

"برلن ۸ رجدی تعلیمات یونیورسٹی برلین در مستقبل بصورت خصوصی رائے یک عدہ جوانان جرمنی تخصیص خواہد یافت۔ قرار انتظامات حکومت کہ بغرض جلوگیری از ہجوم طلاب در یونیورسٹی ہائے جرمنی اعلان گردیدہ تنہا ۱۵ طلاب در ۱۹۳۴ء مجاز شمولیت در دس یونیورسٹی ہا خواہند شد و نسبت البنین و طالبات ۱۰/۱ خواہد بود۔ انتخاب ایں طلاب بلحاظ قوائے دماغی و قلبی و اوضاع جسمانی و حیات و اخلاق و اطوار احساسات ملی بعمل خواہد آمد اگرچہ ۱۵ ہزار طلاب بالمقابل ۲۸ ہزار طلابیکہ از ۱۹۲۶ء بایں طرف سالانہ در یونیورسٹی ہا شامل میگردند بسیار کم است مگر ایں عدہ برائے ۱۹۳۴ء تعین یافتہ است کہ در آں ہر سال تزئید سے بعمل خواہد آمد" (جلدہ ۵ ...)

یہی اخبار اپنی ایک اور اشاعت میں راوی ہے:۔

برلین۔ زائد از دہ ہزار طلابیکہ بہمیں نزدیکی ہا از تعلیم درجہ اوسط فارغ گردیدہ و حسب معمول داخل مکاتب اعلیٰ میشدند۔ از داخل شدن خود مکاتب اعلیٰ مایوس شدہ اند۔ چہ حکومت بمناسب آنکہ برائے آنہا کارے پیدا کردند نتوانند داخل شدن آنہا را در مکاتب اعلیٰ بایں عنوان ممانعت کردہ کہ زائد از ۱۰ ہزار فارغ التحصیل بمکاتب اعلیٰ داخل نشوند۔ چوں تعداد فارغ التحصیلان نظر بہ تعداد نصاب پارسالہ ۲۵ ہزار میباشد از آں دہ ہزار طلاب فالتو میمانند۔ علاوہ براں حکومت احکام صادر نمودہ طلابیکہ جہت تعلیم مکاتب اعلیٰ پذیرفتہ میشوند بائد وارائے ذکاوت و اخلاق خوب و جسم قوی و حیات ملی باشند (جلدہ ۴ ...)

خواتین پر ہولناک تشدد

یہ کہنا بھی مطلق صحیح نہیں کہ جو عورتیں ذمہ دار پیشوں اور صنعت و حرفت کے کاموں میں تھیں اب زمین اور کاشت وغیرہ میں لگا دی گئی ہیں حکومت تو ایسی عورتوں کو بھی جو ذہنی حیثیت سے نہایت بلند ہیں۔ ایسے کاموں کے لئے مجبور کرتی ہے۔ جن کی سختی غلامی کے مترادف ہے" اس وقت جرمنی میں سینکڑوں عورتیں طبابت، خیاطی، معلمی وغیرہ پیشوں میں مصروف ہیں حتیٰ کہ کتنی ایسی بھی ہیں جو سائنٹفک اشغال سے سروکار رکھتی ہیں۔ فراؤ سوفی نامی ایک جرمن خاتون نے ۱۹۳۳ء میں جرمن ایر منسٹری (وزارت فضائی) سے طیارہ رانی کا وہ غیر معمولی لائسنس حاصل کیا جس کا فخر جرمنی میں معدودے چند لوگوں کو حاصل ہے۔ اور یہ لائسنس خاتون موصوفہ کے پاس اب تک برقرار ہے۔ قصبہ ڈابس ڈٹ میں ایک ماہر علم الحیوانات خاتون فراؤ نین ایسی فر رہتی ہے وہ سانپوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی ایک مشہور و معروف مصور و محقق ہے اور یورپ کے ماہرین علم الحیوانات میں اسکو خاص وقعت حاصل ہے۔ چنانچہ چھپکلیوں کی ایک خاص نوع کا نام بھی اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کے مکان پر دو گھڑیال، کئی سانپ جن میں سے ایک زہریلا بھی ہے، متعدد چھپکلیاں، بچھو، سفید چوہیاں، چوہے وغیرہ ہیں۔ ایک دفعہ پولیس نے ان خوفناک جانوروں کے شر سے عامۃ الناس کو محفوظ رکھنے کے خیال سے اسے ان چیزوں کو شہر کی گنجان آبادی سے ہٹا دینے کا نوٹس دیا تو تمام اکابر ماہرین علم الحیوانات نے جن میں برلن کے بحری عجائب خانہ کا رئیس (افسر اعلیٰ) بھی شامل ہے۔ اسکی طرف سے ایک اپیل پر دستخط کرکے ذمہ دار حکام کے پاس روانہ کیا۔ یہ واقعہ السٹریٹڈ انڈین مورخہ ۴ جنوری ۱۹۴۰ء میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ نازی حکومت سے اختلاف رکھنے والی عورتوں کے ساتھ جو ظلم و تشدد برتا جاتا ہے۔ وہ نہایت درجہ قر

اور نفرت انگیز ہے" اور مثال میں ایک ۴۶ سالہ اشتراکی جرمن خاتون میریا جانکوسکی کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ جسے بالکل برہنہ کرکے اس قدر پیٹا گیا کہ اس کے جسم سے خون کے فوارے بہ نکلے اور بعد میں وہ ان زخموں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہوگئی" اس سلسلے میں میں بھی نازیوں کے ظلم و تشدد کے چند ہولناک واقعات کا اضافہ کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔ ایک کم سن قیدی خاتون کی لاتوں اور مکوں سے اس قدر تواضع کی گئی کہ وہ دیر تک قید خانہ کی دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ اس کے سارے جسم پر خراشیں پڑ گئی تھیں اور سر پر شدید ضرب پڑنے کے سبب سے وہ بیہوش ہوگئی تھی۔ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں وہ دن بھر غشی کی حالت میں پڑی رہی۔ ایک اور ۱۸ سالہ قیدی عورت کے شکم پر اس زور سے لات ماری گئی کہ وہ فوراً غش کھا کر گر پڑی۔ اسے اسی حالت میں اس کی کوٹھری میں لے جاکر رکھ دیا گیا۔ جہاں وہ ایک شبانہ روز بحالت کرب و الم پڑی رہی۔ دوسرے دن جب ڈاکٹر اس کے دیکھنے کو آیا تو اس لڑکی نے سارا واقعہ اسے کہہ سنایا۔ اس پر ڈاکٹر نے یہ کہہ کر کہ اس سے بڑھ کر خراب بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس کو انجکشن دیا۔ محض اس جرم پر کہ اس نے اس راز کو ڈاکٹر کے سامنے فاش کر دیا تھا۔ اسے دوبارہ سزا دی گئی اور ساتھ ہی ایک ہفتہ کنج خاص میں بند رکھی گئی اور نو ہفتے قید تنہائی بھگتتی رہی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انڈین نیشن مورخہ ۸ جون ۱۹۳۵ء۔

اگر محولہ بالا واقعات نازی حکومت کے خلاف محض پروپگنڈا کی حیثیت نہیں رکھتے اور وقائع نگار کے نہاں خانۂ دماغ سے باہر ان کا کوئی وجود ہے جب بھی ان حادثات سے عورتوں کی تذلیل و بیچارگی پر استدلال کرنا صحیح نہیں جب وہاں ایسے واقعات بعینہٖ اسی شکل میں مردوں کو بھی پیش آتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ناگفتہ بہ جور و تشدد روا رکھا جاتا ہے۔ تو صرف ایک جنس کے خلاف ان سے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انڈین نیشن کے اسی مضمون میں جہاں عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کے محولہ واقعات درج ہیں۔ وہیں مردوں کے متعلق بھی ایسے ہی بلکہ زیادہ المناک واقعات سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک بست سالہ مرد قیدی کو مسلسل دو ہفتے تک زنجیروں میں باندھے رکھا گیا۔ اس کی ناک کے بانسے کو مکے مار مار کر توڑ دیا گیا تھا اور اس کے ہاتھ کو جا بجا چھری سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ایک اور شخص کے چہرے کو کنجیوں کے گچھے سے مار مار کر زخمی کر دیا گیا تھا۔ ڈرسڈن میں ایک اشتراکی گرفتار ہوا۔ اسے ایک عہدہ دار نے بے طرح زدوکوب کیا۔ یہ شخص جب دوبارہ اس افسر کے روبرو لایا گیا تو عہدہ شت زن زبا کسر، ہونے کے باعث اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ چاروں شانے چت گرا۔ دو اور عہدہ دار اس کی مدد کو پہنچے تو ان کا بھی یہی انجام ہوا۔ اس پر اور لوگوں نے پہنچکر اسے اس قدر مارا کہ وہیں مر گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس صورت میں کہ ہٹلر خود سوشلسٹ ہے اور اس کی نازی تحریک کے اصول اسی سوشلزم ہی پر مبنی ہیں جس میں دہقان اور مزدور طبقے شریک ہیں۔ اسے سوشلسٹوں سے کیوں کر عناد ہوسکتا ہے۔

ایک اور واقعہ بیٹی سولیں نامی ایک خاتون کا دلیل میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے ایک یہودی کے ساتھ پائے جانے کے جرم میں یہ عبرتناک سزا دی گئی۔ کہ اس کا چونڈا مونڈ کر سڑکوں پر اس کی تشہیر کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی ذلت آمیز اور دل شکن سزا سے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اگر ازروئے منطق چند قصوروار عورتوں کے عبرتناک سزائیں پانے کو پورے طبقۂ اناث کی توہین پر محمول نہیں کیا جاسکتا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس واقعہ کو سند میں پیش کرنے کی کیوں جرأت کی گئی۔ اس قسم کے واقعات عورتوں ہی تک محدود نہیں بلکہ مرد بھی اس قسم کے قصور پر سخت سزا کے مستوجب ٹھیرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نازی جرمنی کی یہودی سے معاندت و مخالفت مبالغہ آمیز حد تک پہنچ گئی ہے اور اس کا مظاہرہ کرنے میں وہ مضحکہ خیزی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ گزشتہ سال ایک یہودی نے ازراہ ہمدردی ایک بیمار جرمن کے جسم میں اپنا خون منتقل کر دیا تھا۔ جس سے مریض کی حالت سنبھل گئی۔ لیکن جرمن قوم کے ایک فرد کی خیرخواہی کرنے کا انعام اس غریب کو یہ ملا۔ کہ جب اس کی اطلاع سرکاری حلقہ میں پہنچی تو اس یہودی پر اس بنا پر مقدمہ چلایا گیا کہ آرین نسل والے کے جسم میں

غیر آرین کا خون نہیں مل سکتا۔ چونکہ اس بارے میں مریض کی رضامندی کا ثبوت نہ مل سکا۔ اس لئے اس پر مواخذہ نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کا ایک، اور واقعہ السٹریٹیڈ انڈیا مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۶ء میں مندرج ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ ایک شخص بھورے رنگ کا پاجامہ پہنے ہوئے کسی جرمن ریل گاڑی میں دو یہودی عورتوں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ یہ شخص اپنے اس مخصوص وضع کے لحاظ سے نازی معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ اس کی یہ حرکت نازی تہذیب کے منافی تھی۔ اس لئے خانہ کے مسافروں نے اس کی اس روش پر غم و غصہ کا اظہار کرنا شروع کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ خود بھی یہودی تھا۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نے ایسا پاجامہ پہنا ہی کیوں جس سے نازیوں کے مقدس قومی رنگ کی توہین ہوئی۔ چنانچہ اسے دوسرے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا اور عدالت سے چھ ہفتہ قید کی سزا ہوئی۔

عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ جرمنی میں عورتوں کو مردوں پر نہ فضیلت حاصل ہے اور نہ برتری۔ بلکہ دونوں میں مساوات کا درجہ قائم ہے۔ البتہ ہر دو کے اعمال زندگی اور وظائف حیات میں تفریق کر دی گئی ہے جیسا کہ ہرہٹلر کی اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے چھ ہزار آدمیوں کے ایک عظیم الشان اجتماع میں تصریح کی تھی۔ اس نے کہا کہ:-

"جرمنی کی عورتیں مردوں پر فضیلت نہیں رکھتیں بلکہ برابر ہیں۔ جہاں مرد سلطنت کے شرف و عزت کے لئے اپنی جانِ عزیز قربان کرتے ہیں۔ وہاں عورتیں بھی اسی مقصد کے پیش نظر اولاد کی پرداخت کرتی ہیں۔ پس چاہیئے کہ عورت اور مرد اپنے اپنے مخصوص کاموں میں سعی کریں۔ اگر دونوں جُدا جُدا کاموں میں مشغول ہوں تو عورتوں کو کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔"

اس مساوات کے دعویٰ کی تصدیق جرمنی کے موجودہ قانون تبنیت سے بھی بخوبی عمل میں آتی ہے جس کی رو سے مرد اور عورت دونوں کو متبنیٰ بنانے کا یکساں حق حاصل ہے۔ مسز انیتا کشاپ ایک جرمن نژاد خاتون ہندوستان اور جرمنی کے قوانین تبنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:-

"جرمنی میں مرد ہی نہیں بلکہ عورت بھی خواہ وہ کنواری ہو، شادی شدہ ہو یا بیوہ ہو کسی بچہ کو متبنیٰ کرنے کی مجاز ہے۔ اگر اس کی شادی ہو چکی ہے تو اس صورت میں اسے اپنے شوہر سے اجازت لینا پڑے گی۔ اور اگر شوہر ایسا کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی اپنی بیوی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہوگا جو ایک خاص فارم پر ہی دی جا سکتی ہے۔ اس قانون کی رُو سے ایک بے اولاد عورت کو اس بات کا حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر شوہر کسی بچے کو اپنا بیٹا بنانا نہ بھی چاہے مگر اس کے متبنیٰ بنائے جانے پر اس کو اور کسی طرح کا اعتراض نہ ہو تو عورت بطور خود اسکو متبنیٰ قرار دے سکتی ہے۔ جرمنی میں لڑکا ہی نہیں بلکہ لڑکی کو بھی متبنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ جرمن قانون کے انہیں چند اصولوں سے مرد اور عورت کی مساوات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار تمام جرمن سول لا سے ہوتا ہے۔ بیٹا ہی نہیں بلکہ بیٹی رہنے پر بھی متبنیٰ کرنے کا حق سلب ہو جاتا ہے۔ بیٹا ہی نہیں بیٹی بھی متبنیٰ کی جا سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مرد ہی نہیں عورت بھی کسی بچے کو متبنیٰ کر سکتی ہے۔"

(سرچ لائٹ ۱۴ جولائی ۱۹۳۵ء)

عورتوں سے ہرہٹلر کے ذاتی روابط

جرمنی میں عورتوں کی محکومی و بیچارگی اور ان پر جبر و تشدد

کا یہ افسانہ اس وقت حقیقت و صداقت کا حامل ہو سکتا تھا - جب
ہر ہٹلر کو طبعاً عورتوں سے نفرت ہوتی - حالانکہ اسے عورتوں سے
بنہایت اُنس ہے سو اُن کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے
اور اُن سے گھنٹوں محبت آمیز انداز میں گفتگو کرتا ہے - واقعہ یہ
ہے کہ عورتیں اسے بغایت محبوب رکھتی ہیں اور وہ بھی عورتوں کا
عاشقِ زار ہے۔ "پیرس ویکلی" کے ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباسات
میرے اس بیان کی پوری پوری تصدیق کرینگے :-

امروزہ جرمنی میں ہر ہٹلر نے نازی مملکت کے
اندر عورتوں کی حیثیت کی وضاحت کر دی ہے ان
کی آئندہ جنگوں کے لئے جن میں مملکت کو مصروف
ہونا پڑے شادی کرنے اور بچے جننے میں حوصلہ
افزائی کی جاتی ہے اور وہی عورتیں جو اب تک
مردوں کی تخلیق کردہ دنیا جنگ میں صلح جو ہونیکی
مدعی تھیں - فوہرر کے فرمان پر بڑی گرمجوشی سے
لبیک کہہ رہی ہیں -

بہرحال آج جرمنی کی عورتیں اس ڈکٹیٹر کی
بدستور مطیع و منقاد بنی ہوئی ہیں - ہر ہٹلر کی ڈاک
پر ایک نظر ڈالنے سے اس کی تصدیق عمل میں
آتی ہے - نجی خط و کتابت کے لئے اس کا دفتر
علیحدہ ہے - شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا جب
اس کے پاس ۵ ہزار کے قریب خطوط نہ آتے
ہوں گے - ان میں سے اکثر و بیشتر خطوط عورتوں
کے ہوتے ہیں - بہتوں کے ہمراہ تحائف بھی ہوتے
ہیں - ایک دفعہ ایک عورت نے ایک قدیم جرمن
قصر اس کی نذر کیا تھا -

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان دنوں ہٹلر کو عورت
ذات سے قطعاً نفرت ہو گئی ہے - نہیں بلکہ
اس نے طبقہ نسواں سے مربی مسرت کا اظہار
کیا ہے - جب کبھی ہٹلر عورتوں اور لڑکیوں کی
صحبت میں ہوتا ہے تو انہیں لطف و مسرت کے
ساتھ نظر جما کر دیکھتا ہے اور ان سے ایسی
شرمیلی ادا سے ہم کلام ہوتا ہے جو اس کی
عمر اور مرتبہ والے شخص میں کم دیکھنے میں آتا ہے

(امرت بازار پتریکا ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء)

جرمن خواتین کی باقاعدہ تعلیم و تربیت

الحاصل موجودہ جرمنی کی عورتوں کے متعلق جو کچھ غیر ملکی
اخباروں میں شائع ہوتا ہے وہ کچھ تو پروپیگنڈا اور کچھ غلط فہمی پر
مبنی ہوتا ہے - اس وقت جو کچھ جرمنی میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس
کا سمجھنا غیر ملکیوں کے لئے بعید از امکان ہے - اس لئے اس خصوص
میں ان کی طرف سے جو کچھ سپرد قلم کیا جاتا ہے وہ محض قیاسی ہوتا ہے
پچھلے دنوں جرمنی کی نیشنلسٹ سوشلسٹ وومنز آرگنیزیشن کی
لیڈر جرٹروڈ اسکالز کلنک نے موجودہ جرمنی کی عورتوں کی حیثیت
کے متعلق ایک بیان شائع کرایا تھا جس سے ان تمام غلط بیانیوں کی
قلعی کھل جاتی ہے - اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کی
عورتوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ اصلاح یافتہ منظم اور باوقار
ہے - وہاں عورتوں کے سپرد جو کام ہے وہ محض رضاکارانہ ہے جس
میں جبر اور دباؤ کو مطلق دخل نہیں - ذیل میں اس مضمون کا ترجمہ
سرچلائٹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ء کے حوالہ سے درج کیا جاتا ہے :-

"ہم لوگ اکثر غیر ملکی جرائد میں پڑھتے ہیں کہ جدید جرمنی میں
عورتیں غلامی و مملوکی کی زندگی بسر کرتی ہیں - ہم سمجھتے ہیں کہ جدید جرمنی
کی عورتوں کے کام کے متعلق باہر والوں میں غلط فہمی رونما ہے اس
لئے کہ کسی غیر ملک والے کے لئے جو جرمنی اور جرمن قوم سے واقف
نہیں گزشتہ چند سالوں کے اندر وقوع پذیر ہونے والے انقلاب کا
سمجھنا سہل نہیں - اصل یہ ہے کہ قوم پرورانہ اشتراکیت (نیشنل
سوشلزم) نے جرمنی میں راہ پائی ہے - اس کی روح سارے ملک
میں جاری و ساری ہے اور لوگوں کی کایا پلٹ دی ہے -
تسلیم شدہ جرمن ریاستوں میں ہم عورتوں کو جداگانہ حیثیت

حاصل ہے اور عورت ہونے کے لحاظ سے ہم لوگوں کا فرض ہے کہ اپنے لئے مفید ترین میدانِ عمل تلاش کریں چنانچہ ہم لوگوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ سب سے بہتر طور پر ہم لوگ کس طرح ملک کے کام آ سکتے ہیں اور ہم سب اس نتیجہ پر آئے کہ سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ قوم کی نسلی زندگی کی اصلاح کی جائے اور وہ قوی الجثہ بھی ہو اور صحیح الدماغ بھی اس کام کے لئے ہم لوگوں نے نیشنل مدرس سروس (قومی انجمن خدمت الامہات) کی بنا ڈالی ہم لوگوں نے تمام شہروں میں ماؤں کے لئے مدارس قائم کئے جن میں ۱۸ سال سے فاضل عمر کی ماؤں کے لئے شریک ہونا لازمی ہے۔ معلمات ملک کا دورہ کرتی ہیں اور دیہاتوں میں ایک ایک ہفتہ ٹھیر کر تعلیم دیتی ہیں۔ ماؤں کو بتایا جاتا ہے کہ شیرخواروں کو کیسے پالنا چاہیئے۔ بچوں کی کس طرح تعلیم و تربیت کرنی چاہیئے اور انتظام خانہ داری کیوں کر عمل میں لانا چاہیئے کہ یہی تین میدان ہائے عمل انجمن خدمت امہات کے ہیں۔

ہم کو یقین ہے کہ ووِمنز لیبر سروس ماؤں کو تعلیم دینے کے علاوہ ایک اہم تعلیمی تحریک کا کام بھی دے گی۔ اس میں آبادی کے ہر طبقہ کی وہ عورتیں لی جاتی ہیں۔ جن کی عمر ۱۷ سے لیکر ۲۵ سال تک ہوتی ہے۔ بجز یونیورسٹی میں داخل ہونے والی طالبات کے اس انجمن کی شرکت ہر ایک کے لئے اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اول الذکر کو تعلیم شروع کرنے سے پہلے یہ ثابت کرنے کے قابل بننا پڑتا ہے کہ انہوں نے ووِمنز لیبر سروس میں چھ ماہ تک کام کیا ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان عورتوں کو سکھایا جائے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور اپنے ملک کے لئے بکار آمد بنیں خدمتی کمپ کی زندگی لڑکیوں کو جرمنی کی معاشرتی ضروریات و مسائل سے پوری طرح روشناس کرا دیتی ہے۔ ان مسائل کے متعلق ان کی دلچسپیوں کو بیدار کر دیتی ہے اور ساتھ ہی ان میں اپنی جنس کی مصیبت کو کم کرنے کی خاطر دوسروں کا ہاتھ بٹانے کی خواہش میں تعجیل پیدا کرتی ہے۔ وہ لوگ اپنی اس خدمت گزاری کے زمانہ میں جہاں عورتوں کے کام میں دشواریاں دیکھتی ہیں بلا معاوضہ مدد دینے کو آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ ایسی عورتوں کے مکان پر روزانہ کئی گھنٹوں کے لئے بھیجدی جاتی ہیں اور خوش دلی و رفیقانہ جذبہ کے ساتھ کاموں سے دبی ہوئی گھروالیوں اور ماؤں کو ان کے پہلو بہ پہلو کام کرکے مدد دیتی ہیں۔ یہ خدمت گزار لڑکیاں تیس تیس افراد کی ٹولیوں میں کیمپوں میں رہتی ہیں۔ ہر کیمپ کی ایک رئیسہ ہوتی ہے جو اپنی زیر نگرانی رضا کارنیوں کے کام اور چال چلن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہ لڑکیاں روزانہ چھ گھنٹے خدمت گزاری میں صرف کرتی ہیں۔ بقیہ دن کیمپ میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور کھیلنے کودنے میں گزارتی ہیں۔

ہم لوگوں نے جرمن لیبر فرنٹ کا زنانہ دفتر بھی کھول رکھا ہے جو کام کرنے والی اور خصوصاً کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کی خبر گیری میں مصروف ہے۔ اس دفتر کا خاص کام یہ معلوم کرنا ہے کہ کام کرنے والی عورتوں کی طاقت سے زائد مشقت تو نہیں لی جاتی۔ جس سے ان کی صحت کو ضرر پہنچنے کا احتمال ہو۔ نیز ان سے جو کام بھی لیا جائے وہ ان کی جسمانی طاقت اور دماغی صلاحیت کی مناسبت سے ہو۔ اس طرح فلزاتی اشیاء تیار کرنے والے کارخانوں کی ۲۰ فی صد عورتوں کو سخت کاموں سے ہٹا کر اسی شرح اجرت پر سہل تر اور زیادہ صحت بخش کام پر لگا دیا جاسکا۔ یہ دفتر نیشنل سوشلسٹ ولفیر آرگینیزیشن سے بھی کام کرنے والی ماؤں کی حفاظت کے لئے موجودہ قانون کے دائرۂ عمل میں وسعت دینے کی غرض سے تعاون عمل کر رہا ہے۔ اس بات کا بھی نظم کیا گیا ہے کہ وضع حمل سے چار سے لے کر چھ ہفتہ پیشتر عورتیں اپنا کام چھوڑ دیں اور انہیں زچہ و بچہ والے فنڈ سے مزید غذا و سامان کی پرورش کے طور پر امداد ملے۔

اکثر نوجوان طالبات نے درخواست کی ہے کہ انھیں تعطیل کے ایام میں ایسی عورتوں کی بجائے کام کرنے کی اجازت دی جائے جو کثیر العیال ہیں۔ اس صورت میں ان طالبات کو بطور جیب خرچ کے ایک قلیل سی رقم ملتی ہے اور مستقل کام کرنے والی کو چند ہفتے کی زائد فرصت پوری پوری تنخواہ کے ساتھ ہاتھ آجاتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں ہم لوگوں نے تربیت یافتہ مصلحات کو رکھ چھوڑا

ہے۔ ان عورتوں کو کارخانہ دار براہ راست بحال نہیں کرتے۔ بلکہ کارخانہ اور زنانہ دفتر دونوں سے ان کا مشترکہ معاہدہ ہوتا ہے اس لئے انہیں کارخانہ کا مہتمم نکال نہیں سکتا۔ اس طرح یہ لوگ اس کی نوازش یا عتاب سے بے پرواہ ہوکر بے کھٹک اپنا کام انجام دیتی رہتی ہیں۔

میں نے جن کارگزاریوں کا اوپر تذکرہ کیا ہے وہ خالص معاشرتی قسم کی ہیں اور ہماری تگ و دو کا میدان انہیں پر ختم نہیں ہوجاتا۔ جرمن عورت دیگر مشاغل مثلاً تجارت، اخبارات و مطابع، ریڈیو، فلم سازی وغیرہ میں بھی حصہ لئے ہوئے ہے۔ یہ سمجھنا کہ نئی جرمنی میں عورت کے مشاغل صرف اتنے ہیں کہ وہ اچھی بیوی اور عمدہ ماں بنے اور دیگر مشاغل خصوصاً دماغی مشاغل کے دروازے اس پر بند ہیں سخت غلط فہمی ہوگی۔ تاہم ہم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ صرف ان عورتوں کو یونیورسٹی میں شریک ہونے دیا جائے جو وہاں کی تعلیم کی حقیقی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ اگر کسی عورت میں ضروری صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ تو ہم لوگ ہر طرح اس کی اس تعلیم میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جرمن عورتیں ہنوز متعدد میدانوں میں سرگرم عمل ہیں۔ مثلاً وہ ماہر اقتصادیات ہیں، ڈاکٹر ہیں، قانون پیشہ ہیں، معلم ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگوں کو اس قسم کی جملہ کوششوں کی غرض صرف اتنی ہے کہ عورتوں کو ایسے پیشوں میں لگا دیا جائے جن میں عورت بحیثیت عورت کے اُن کے فطری جوہر کھُل سکیں جرمنی میں عورتوں کے کاموں کی مختلف شکلیں عورتوں کے ایک ہمہ گیر نظام میں جس کا نام جرمن فراؤن ورک مربوط ہے اور اس کی قیادت کی باگ فراؤ نشا فنٹ کے ہاتھوں میں دے دی گئی ہے۔"

ہر ہٹلر کی حکومت نے گزشتہ سال جو چہار سالہ پلین جرمنی کے لئے مرتب کیا ہے۔ اس میں بھی یہی جذبۂ عمل کارفرما ہے "اصلاح" کابل یہ خبر درج کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ہمچنین زنان و مردانیکہ قابل خدمات نظامی نہ باشند بعوض کارگران بکار انداختہ شدہ و کارگران مذکور برائے خدمات نظامی مدنظر گرفتہ میشوند"

(جلدہ ۲۵۰)

محولہ بالا بیان میں بھی جس طرح عورتوں سے کام لیا جانا مذکور ہے۔ اسی طرح مردوں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ حالات اب بہت کچھ تغیر پذیر ہو چکے ہیں۔ عورتوں کے متعلق جو طرز عمل بھی رہا ہے وہ ایک خاص ضرورت کی بنا پر تھا اور اب ۱۹۳۸ء میں اسی ضرورت کے ماتحت اس پالیسی میں ردوبدل کر دیا گیا۔ مانچسٹر گارجین، لندن کے نامہ نگار متعینہ برلن کا بیان ہے کہ اب جرمنی میں عورتوں کی خانہ نشینی کا دور ختم ہو گیا۔ جس کی نازی لوگ زوروں کے ساتھ تلقین کرتے اور اس پر ۱۹۳۳ء میں برسر حکومت آ جانے کے وقت سے عمل پیرا بھی تھے۔ بلکہ وہ پھر کارخانوں اور دکانوں میں واپس چلی گئی ہیں۔ البتہ اتنا اب بھی ہے کہ وہ گھر کے کام کاج سے فراغت کر چکی ہوں۔ فراؤ جرٹ رو ڈ اسکولز کلنک جو مملکت کی تمام عورتوں کی قاعد ہے بتاتی ہے کہ جرمنی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مردوں کی اتنی کمی ہے کہ اسکو رفع کرنے کے لئے تجارتی و صنعتی کاروبار میں جس قدر بھی عورتوں کو لایا جا سکے لایا جائے۔

اطالوی خواتین کا مرتبہ

خواتین جرمنی کے مسئلے پر بحث و تمحیص کرتے ہوئے مضمون اس قدر طویل ہو گیا ہے کہ دوسرے مسائل پر اتنی ہی تفصیل سے بحث کرنے کی مطلق گنجائش نہیں رہی مگر کیا کیا جائے کہ موضوع بحث کی دلچسپی اور دلائل و براہین کی فراوانی نے اس طوالت پر مجبور کر دیا ؏

لذیذ بود حکائت دراز تر گفتم

علاوہ بریں اطالوی خواتین کے متعلق اعتراضات کا دائرہ بھی اتنا وسیع نہیں جتنی وسعت جرمنی کو دی گئی ہے۔ فسطائی حکومت کی حکایات جبر و تشدد کو جہاں صرف دو صفحے کی جگہ عطا کی گئی ہے وہاں نازی حکومت کی خواتین کی حالت زار پر کم و بیش چار صفحوں میں ہمدردی کے آنسو بہائے گئے ہیں اس لئے بھی اس بحث کا مختصر ہونا قدرتی امر ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ فسطائی حکومت میں بھی عورتوں کی تقریباً وہی حالت ہے جو ان کی نازی حکومت کے ماتحت ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے تو ان کی حالت نہ صرف نازی حکومت بلکہ یورپ کے اکثر حصوں سے بہتر ہے۔ مسولینی نے ان کی حیثیت کا تعین کرتے وقت عورتوں کی سیاسی و مجلسی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ خود سائنور مسولینی اپنی ایک تحریر میں فسطائیت کے ہفت سالہ دور پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے :-

"فسطائی لوگ ان کثیر التعداد سادہ لوحوں اور متشککین میں سے نہیں ہیں جو عورتوں کی سیاسی و تمدنی اہمیت کا اندازہ کم لگاتے ہیں۔ ان ایام میں بھی جب عورتیں نہ ووٹ دیتی تھیں اور نہ دینے کی خواہشمند تھیں جس کو بہت زمانہ گزرا وہ انسانی سوسائٹی کی تعمیر میں زبردست طور پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ الغرض فسطائی عورتیں جو شاندار لبادہ پہنتیں اور ہمارے بیرقوں کے نیچے جمع ہوتی ہیں اپنا یادگار نقش چھوڑ جانے کے لئے ایک شاندار تاریخ سپرد قلم کرنے کو مقرر ہو چکی ہیں"

اطالیہ میں عورتوں کو بجز چند باتوں کے ہر کام میں آزادی تام حاصل ہے۔ وہ جملہ علوم و فنون کی تعلیم مردوں کے ہم پلہ حاصل کر سکتی ہیں۔ وہ طب کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ بلکہ طبی کالجوں میں مردوں سے زیادہ ان کی تعداد موجود ہے۔ چنانچہ زنانہ امراض، بچوں کی بیماریوں اور آنکھوں کے عوارض کے علاج میں تو بہتیری خواتین کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ سرکاری شفاخانوں میں بھی ان عورتوں کا کافی عمل دخل ہے اور کتنی ڈسپنسریوں میں تو ان کی حیثیت انچارج افسر کی ہے۔ زباندانی کی تعلیم بھی عورتیں کثیر تعداد میں حاصل کرتی ہیں۔ اور باوجود اس کے کہ بعض مصالح خصوصی کی بنا پر عملی سیاسیات میں حصہ لینے سے پرہیز کرتی ہیں۔ تاہم علمی حیثیت سے وہ نہایت ذوق و شوق سے بلا روک ٹوک اس فن کا باقاعدہ درس لیتی رہتی ہیں۔ تعلیم کا محکمہ زیادہ تر عورتوں ہی کے سپرد ہے۔ چنانچہ لڑکوں اور لڑکیوں کے معمولی اسکولوں میں معلمین کا پورا کا پورا عملہ خواتین ہی پر مشتمل ہے اور ۱۲ سال تک

کے لڑکے انھیں کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اُوپر کی جماعتوں میں بھی معلّم عورتوں کی تعداد مردوں سے کچھ زائد ہے۔ ۱۹۲۵ء میں ۱۷ ہزار گریجویٹوں میں سے ۵ ہزار عورتیں تھیں۔ ان کو (معلمات و طالبات کو) دوران تعلیم و تعلّم میں یہ خاص رعایت حاصل ہے کہ اگر وضع حمل کا زمانہ قریب آجائے تو انھیں لازمی طور پر رخصت مع تنخواہ کے عطا کی جاتی ہے۔ ہاں چند امور ایسے ضرور ہیں جن کی انجام دہی پر وہ مجبور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ کہ ہر لڑکی کے لئے ۱۲ سے لے کر ۱۴ سال کی عمر تک لازمی طور پر تحصیل علم کرنا ہوگا۔ دوسرے دوران تعلیم میں ایک خاص وضع کا سادا لباس پہننا ہوگا جس سے یہ فائدہ مدنظر ہے کہ امارت و غربت کا امتیاز جاتا رہے۔ اور دونو طبقہ میں ایک طرح کا مساوات قائم رہے۔ دستانہ پہننا بھی ہر چھوٹی بڑی عورت کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح ہر بالغ خاتون کے لئے رشتہ مناکحت میں منسلک ہو جانا فرض ہے۔ اس میں ایک طرف تو یہ حکمت مضمر ہے کہ عورت حفظ عصمت پر قادر ہو سکے اور دوسری طرف توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہے تاکہ قلت آبادی کا مسئلہ حل ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ وہ مستحسن و مبارک پابندیاں ہیں کہ ان پر ہزار آزادیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔ یہ انھیں قیود و ضوابط کا اثر ہے۔ کہ اطالیہ میں عورتیں بخلاف دیگر ممالک یورپ کی عورتوں کے بدچلنی اور آوارگی کی طرف مائل نہیں۔ چنانچہ عورتیں رات کے وقت عموماً بازار میں گشت نہیں لگاتیں اور نہ مردوں کے مجمع اور جلسہ میں شریک ہوتی ہیں۔ معزز روزنامہ "اصلاح" کابل نے ایک مغربی سیاح خاتون کے ایک مضمون کا ترجمہ "جرائد اراق" کے حوالہ سے اپنی اشاعت مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع کیا ہے۔ جس سے میرے مذکورہ بیان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے لکھتا ہے:۔

"مملکت ایطالیا در آخر ماہ اکتوبر ہر سال
در طے انعقاد جشن بزرگے از دختران جوان خود
سان می بیند۔ در سال جاری پنجصد ہزار زنان و
دختران جوان ایطالیا در این ریت بزرگ بالباس

نیم تنہ ہائے سفید و دامن ہائے سیاہ نیم بلند و کلاہ ہائے ابریشمی سیاہ و دست کش سفید کہ لباس متحد الشکل آنہا بود حاضر شدند۔ پوشیدن دست کش در ایطالیا برائے دختران و زنان امر لازمی است۔ در مدارس معمولی اکثر پسرانہ یا دخترانہ ہیئت تعلیم دہندگان مخصوصاً از زنہا مرکب ہستند۔ در دار الفنون ہا و در مکاتب ابتدائی وغیرہ جوان ہا تا سن ۱۶ سالگی متنا و با تحت تعلیمات استادان نسوان میباشند۔

معلمات و متعلمات بر طبق مقررات در موقع وضع حمل خود میتوانند از رخصی ہائے لازم استفادہ نمایند۔ در مؤسسات تحصیلی تنبیہات جسمی بہیچ عنوان و بہیچ شکل پذیرفتہ نمیشود۔ بر عکس مجازات دیگر مخصوصاً سخت و شدید بمنظور جائے گزین کردن عادت ڈسپلن محکم و آہنین در مغز شاگرداں بسہولت بکار میرود۔ دختران کوچک یا بزرگ غنی یا فقیر در جماعت درس برحسب مقررات وزارت معارف از نقطۂ نظر ایجاب و مساوات لباسی عبارت از پیراہن کوتاہ بیک رنگ و جنس میپوشند۔

در ایطالیا ہمہ جا بنائے مکاتب را در ہوائے آزاد میگزارند از چند سال باین طرف بجائے سن ۱۲ سالگی تحصیلات تا سن ۱۴ سالگی اجباری است۔ تعداد معلمات در ایطالیا خیلے از تعداد معلم تجاوز میکند۔ دار الفنون ہائے ایطالیا سال گذشتہ من حیث المجموع در حدود ۱۷ ہزار محصل داشت کہ بیش از ۵ ہزار نفر آنہا زنان و دختران بودند۔ تعداد محصلات در دار الفنون طب از ہمہ دار الفنون ہا زیادہ تر بود و عدۂ کثیرے از دختران جوان در امراض زنانگی و اطفال و در کحالی وغیرہ متخصص میشدند و عدۂ زیادے از آنہا اکنوں در شفاخانہ ہا و مطب ہائے عمومی بسمت مدیریت و ...

ودر دار الفنون ادبیات ہر سال عدۂ زیادے از دختران داخل میشوند۔ دار الفنون علوم سیاسی باقی میماند۔ محصلات ایطالیا در دورۂ جوانی خود دنبال ہیچگونہ ہوس بازیہا و بو الہوسیہا نمی گردند بہمان قدر کہ در .. وم محصلات از یک آزادی اختصاصی متمتع میشوند۔

اخلاق در ایطالیا مورد توجہ زیاد است وبلکہ شدت و استحکام عزیی از ہر گونہ تعرض مصئون میماند۔ ازدواج در ایطالیا تقریباً اجباری است۔ قبول شدگان در دار الفنون ہا یعنی زنہا بر حسب تاہل و بر حسب ارزش و اہمیت دیپلوم شاں بعنوان مستخدم رسمی در ادارات مختلفہ داخل میگردند۔

شب ہا بندرت وبلکہ ہرگز یک نفر زن ایطالوی در کوچہ و جادہ دیدہ نمی شود۔ نویسندۂ ایں اصل ترجمہ کہ زن است تعریف میکرد در میلان سال گذشتہ شبے من داخل یک کافہ پر جمعیتے شدم کہ دو صد نفر مرد در آنجا حضور داشتند و عجیب در ایں بود کہ در بین ایں عدۂ زیاد مرد فقط یک نفر زن و آں ہم او بود دیدہ میشد۔"

سطور بالا کے مطالعہ سے قارئین پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی کہ جرمنی و ایطالیہ میں خواتین کی اصلی پوزیشن کیا ہے۔ اور وہ ذلت و بے بسی، مجبوری و بے کسی کی حالت میں زندگی کے دن بسر کر رہی ہیں یا ان کے حقوق و اختیارات اور ممالک سے زیادہ محفوظ ہیں۔ ان شواہد و دلائل کی روشنی میں "ہیبرٹ جرنل" کے اس بیان کو بھی جانچا جا سکتا ہے۔ کہ:۔

"فاسزم اور نسوانی آزادی دو متضاد چیزیں ہیں فاسزم عملاً اور اصولاً قوت کی حکومت ہے۔ جس نظام میں عقل و انصاف اور انسانیت کی بجائے فوجی دستوں اور مادی دولت و ثروت کی قوت کی حکومت ہو وہاں نسوانی تحریک کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔ عورتوں میں برداشت کی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ لیکن وہ جسمانی قوت کے لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں ہمیشہ فروتر رہیں گی۔"

زندگی !

از جناب طالوت !

نسخۂ کائنات کا ایک ورق ہے زندگی ‖ مسلکِ سرفروش کا پہلا سبق ہے زندگی
صبحِ ازل کے واسطے رنگِ شفق ہے زندگی ‖ دیکھئے اصل میں اگر چودہ طبق ہے زندگی

وجہِ نمودِ ذات ہے جلوہ گہِ صفات ہے
بحرِ سکوتِ دہر میں موجۂ سالمات ہے

شورشِ لالہ زار میں نغمۂ جاں رُبا ہے یہ ‖ گرمیٔ کارزار میں رجزِ طرب فزا ہے یہ
میکدۂ بہار میں جامِ جہاں نما ہے یہ ‖ دامنِ کوہسار میں بھٹکی ہوئی صدا ہے یہ

محفلِ ناز میں یہی سجدہ گہِ نیاز ہے
چشمِ دروں نگر میں یہ منبعِ سوز و ساز ہے

رونقِ محفلِ شراب ہے تو اسی کے دم سے ہے ‖ زینتِ کاسۂ حباب ہے تو اسی کے دم سے ہے
شورشِ وحشتِ شباب ہے تو اسی کے دم سے ہے ‖ جوشِ جنون و اضطراب ہے تو اسی کے دم سے ہے

چمکی لبِ حسین پر اوڑھ کے تن پہ قہقہے
باغ میں جا کے بن گئی بلبل و گل کے چہچہے

مدرسۂ وجود میں درسِ خودی ہے اس کا کام ‖ عرصۂ ہست و بود میں اس سے ہے حرکتِ دوام
گلکدۂ نمود میں حسنِ ادا ہے اس کا نام ‖ شمعِ سحر کے دود میں سوز اسی کا ہے تمام

عربدہ خیز ہے یہی کرمکِ شب فروز میں
شعبدہ ریز ہے یہی دونو جہاں کے سوز میں

سوتیلا باپ

ایک ایکٹ کا ڈرامہ!

از جناب پروفیسر سید عارف شاہ صاحب گیلانی ایم۔ اے

افراد

تیس مار خاں	مصوّر۔ سلمیٰ کا سوتیلا باپ	شمشاد	سلمیٰ کی ماں
سلمیٰ	تیس مار خاں کی سوتیلی بیٹی	سلیم	آتالیق۔
مہربان	شمشاد کا باپ	بشیر	تیس مار خاں کا بڑا بھائی
رشید	سلیم کا دوست	مجید	سلیم کا دوست
حمید	سلیم کا دوست	کلن	سلیم کا نوکر

پہلا منظر

ماہیم بمبئی کے محلے میں ایک مسلمان نما عیسائی "رہتا ہے۔ اور دنیا کی آنکھوں میں مٹی جھونکنے کے لئے مصوّری کی ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی ہے جسمیں سوائے چند بوسیدہ تصویروں اور لکڑی کے بے ڈھب کھلونوں کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ بیوی ایلبٹی شہر کی ہیلتھ ایسوسی ایشن میں نرس کے عہدہ پر مامور ہے۔ رات کے آٹھ بجے ہیں۔ مکان کے اگلے کمرے میں تین کرسیاں اور ایک تپائی رکھی ہوئی ہے۔ شمشاد سفید ساری پہنے بیٹھی ہوئی ہے اور کچھ سوچ رہی ہے اتنے میں تیس مار خاں آتا ہے اور کوٹ اتار کر کھونٹی پر لگانے کے بعد شمشاد کے بالمقابل بیٹھ کر سگریٹ سلگاتا ہے

تیس مار خاں۔ یہ اداسی کیسی؟

شمشاد۔ "خاموش"

تیس مار خاں۔ میں نے کہا یہ خاموشی اور اداسی کیسی!

شمشاد۔ آپ کو کیا معلوم کہ درد کدھر ہوتا ہے۔

تیس مار خاں۔ تیری منطق سمجھ میں نہیں آتی۔

شمشاد۔ سچ ہے۔ دکھ دکھ اور سکھ سکھ کو پہچانتا ہے۔

تیس مار خاں۔ لعنت بر شیطان! آخر بات کیا ہے؟

شمشاد۔ وہی پرانا مرض۔ وہی درد۔ وہی غم!

تیس مار خاں۔ پھر وہی۔ وہی۔ وہی۔ آخر یہ وہی کونسی بلا ہے!

شمشاد۔ ہاں۔ وہی۔ وہی۔ وہی سلمیٰ کا......

تیس مار خاں۔ سلمیٰ کا کیا؟

شمشاد۔ سلمیٰ کی شادی کا خیال۔ سلمیٰ جوان ہوگئی ہے اور ہم سراسر

غافل ہو رہے ہیں۔

تیس مار خاں۔ تو ہونے دو۔ وہ تو بچہ ہے۔

شمشاد۔ جی ہاں۔ منہ سے دُودھ کی بُو آتی ہے۔

تیس مار خاں۔ کل کا بچہ ہے اور پھر تعلیم!

شمشاد۔ تعلیم جائے بھاڑ میں!

تیس مار خاں۔ اور ہماری وجہ کفاف!

شمشاد۔ جس نے دانت دیئے ہیں وہ کھانے کے لئے بھی دیگا۔

تیس مار خاں۔ سنو تو میں تو بغلیں جھانک رہا ہوں اور عنقریب تمھیں بھی برطرف کیا جائیگا۔ میرا خیال ہے کہ سلمیٰ گریجویٹ ہو کر ہمارے پیٹ پالے۔

شمشاد۔ چہ خوش۔ تو کیا آپ میری بیٹی کو نوکری کی ٹوکری دلواؤ گے!

تیس مار خاں۔ (مسکرا کر) میں نے یہ کب کہا! ۔ اور اگر پڑھائی بند کر دو گی تو تیس روپے کا وظیفہ جو اُسے مل رہا ہے وہ بھی بند ہو جائیگا۔

شمشاد۔ بلا سے۔

تیس مار خاں۔ لیکن تعلیم؟

شمشاد۔ لیکن میں زیادہ تعلیم کے خلاف ہوں اور مخلوط تعلیم کے سخت خلاف!

تیس مار خاں۔ عجب! لیکن بیاہ کی ہمت نہیں ہے؟

شمشاد۔ اللہ مالک ہے!

تیس مار خاں۔ میں تو اُسے انگلستان بھیجوں گا۔

شمشاد۔ گھر میں نہیں آٹا میاں چلے انگلینڈ!

تیس مار خاں۔ تم بھی...... (سلمیٰ چودہ سالہ لڑکی ہے متناسب الاعضا۔ بلند بالا۔ گول اور گورا چہرا۔ سبز ساری پہنی ہوئی ہے۔ آتی ہے اور ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

سلمیٰ۔ امی جان.....

تیس مار خاں۔ بیٹا سُناؤ تو امتحان کا نتیجہ نکلا؟

سلمیٰ۔ جی ابا۔ پاس تو ہو گئی ہوں۔ لیکن انگریزی میں فیل ہو گئی ہوں اور فارسی میں بھی کم نمبر اُٹھائے ہیں۔

تیس مار خاں۔ یہ کمزوری بھی رفع ہو جائیگی تم سے گھڑی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میں ——

سلمیٰ۔ ابا جان! مجھے گھڑی کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے لئے چار ماہ کے واسطے ایک اتالیق کا بندوبست کر دیجئے ورنہ میں انٹرنس میں فیل ہو جاؤں گی۔

تیس مار خاں۔ میں کل ہی بندوبست کئے دیتا ہوں (سلمیٰ جاتی ہے)

شمشاد۔ میں نے کہا میں زیادہ ایجوکیشن کے خلاف ہوں۔

تیس مار خاں۔ بھلا کیوں؟

شمشاد۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں شرم و حیا کا پانی مر جاتا ہے طوطی چشم بن بیٹھتی ہیں۔ پٹیل کی لڑکی سے عبرت حاصل کرو۔ بی۔ اے کی تو۔ اسے حاصل کر چکی ہے۔

تیس مار خاں۔ تم خاموش رہو۔ میں جانوں اور میرے کام۔

شمشاد۔ پچھتاؤ گے۔

تیس مار خاں۔ ہا ہا ہا ہا۔ خوب کہی میں ابھی جاتا ہوں (اُٹھتے ہوئے) اور غلام علی سے کہتا ہوں کہ سلیم سے کہدے۔

شمشاد۔ کون غلام علی؟

تیس مار خاں۔ وہی جن کے بارے میں کل محمد علی اور احمد علی کہہ رہے تھے۔

شمشاد۔ اور فیس کہاں سے آئیگی۔ (تایا آتا ہے)

تیس مار خاں۔ وہ میں جانوں۔ میں پیسے دے کر نہیں پڑھاتا۔ پیسے لے کر پڑھاتا ہوں۔

بشیر۔ (آگے بڑھتے ہوئے) تو اللہ خیر کرے۔

(تیس مار خاں جاتا ہے)

شمشاد۔ بھائی صاحب۔ آپ نہیں سمجھا سکتے؟

بشیر۔ (بیٹھتے ہوئے) اگر کتے کی دم کو ہزار سال نلی میں بند رکھا جائے تو وہی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ رسی جل جاتی ہے۔ لیکن ایں کا بل نہیں جاتا۔ اندھا ہے اندھا۔ ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی عقل کے ناخن نہیں لیتا۔ عادت سے مجبور ہے۔

شمشاد - لیکن یہ غفلت کب تک رہے گی!
بشیر - میں نے کئی مرتبہ سمجھایا ہے - لیکن ـــ
شمشاد - منہ کی کھائے گا -

(تیس مارخاں اور سلیم آتے ہیں)

سلیم - آداب عرض -
شمشاد - تشریف رکھئے -
تیس مارخاں - سلمیٰ کہاں ہے! بھائی بُلانا تو -
(بشیر جاتا ہے اور سلمیٰ کو ہمراہ لے آتا ہے سلمیٰ ماں کے پاس کھڑی رہتی ہے)
(سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ تمہارے اُستاد ہیں ہفتہ میں تین مرتبہ آیا کریں گے -
شمشاد - (سلیم کے لباس اور چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے) کب سے آئیں گے؟
سلیم - پرسوں سے!
(سلمیٰ سے) بھلا - کون سے مضمون میں کمزور ہو؟
سلمیٰ - (نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے) انگریزی اور فارسی میں -
سلیم - اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو کامیابی منہ چومیگی اور سُرخروئی پاؤں لے گی -
تیس مارخاں - آپ تو سراپا ہدایت ہیں -
سلیم - یہ آپ کا حسنِ ظن ہے - آپ تو مجسم ہدایت ہیں (اُٹھتے ہوئے) ہاں انگریزی میں "میرے نصب العین زندگی" پر ایک جواب مضمون لکھ رکھنا - فارسی کتاب کا پہلا سبق بھی دیکھ رکھنا -
تیس مارخاں - تو کل ملاقات ہوگی -
سلیم - جی ہاں - ضرور - اب تو روزمرہ ہوتی رہے گی - آداب عرض (جاتا ہے) سلمیٰ بھی جاتی ہے -
بشیر - (تیس مارخاں سے) تمھیں کوئی اُستانی نہیں ملتی جو اِس مُسٹنڈے کو رکھ رہے ہو؟
تیس مارخاں - آپ پروفیسر کب سے بن گئے ہیں - بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں -

شمشاد - سچ تو کہہ رہے ہیں - دیکھتے نہیں ہو زمانہ کس قدر باریک ہے
بشیر - تم جانو اور تمہارے کام (کان پکڑ کر) ہماری توبہ -
شمشاد - فیس مقرر کی ہے؟
تیس مارخاں - تیس روپے ماہوار -
شمشاد - تو رہا سہا سامان بھی نیلام کر دینا -
تیس مارخاں - میں بہتر جانتا ہوں -
بشیر - پیسے لے کر پڑھاتے ہیں! اللہ خیر کرے نتیجہ اچھا نکلے -

دوسرا منظر

(تیس مارخاں کا مکان - رات کے آٹھ بجے ہیں - کمرے میں غیر معمولی صفائی نظر آتی ہے - بجلی کا دیواری لیمپ جل رہا ہے - سلمیٰ میز کے سامنے بیٹھی ہوئی منہمک مطالعہ ہے - دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے - سلمیٰ اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے اور سلیم کو دیکھ کر آداب عرض کرتی ہے - دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

سلیم - آج لانگ فیلو کی نظم "نغمۂ زندگی" کی تشریح کروں گا -
سلمیٰ - وہ تو مجھے آتی ہے شیلے کی "ایڈونس" مشکل ہے -
سلیم - اچھا نکالو - اور ہاں فارسی میں حکایت لکھی؟
سلمیٰ - بھول گئی -
سلیم - نت نت بھول گئی - آج دو ماہ ہوگئے ہیں اور پھر بھی وہی حالت! یہ پسینہ کیسا؟
سلمیٰ - (رومال سے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے) گرمی محسوس ہو رہی ہے -
سلیم - (مسکراتے ہوئے) دسمبر کا مہینہ اور گرمی! اگر شرماؤ گی تو پڑھو گی کیا؟
سلمیٰ آپ ایرانی معلوم ہوتے ہیں -
سلیم - (حیران ہو کر) وہ کیسے؟
سلمیٰ - آپ کے لب ولہجہ اور وضع قطع سے -
سلیم - میں ایک ٹھیٹھ ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہونے پر

مجھے فخر ہے۔

سلمیٰ - تو کیا آپ کو غلامی پر فخر ہے؟

سلیم - غلامی! ہمارا ہندوستان سارے جہاں سے آزاد ہے۔ سارے جہاں سے اچھا ہے۔

سلمیٰ - اور جو ہزار سال سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

سلیم - یہ نفاق کی نحوست ہے - اور پھر زمانہ کا جوار بھاٹا ہے۔ اس بے ثبات دنیا میں سوائے اللہ کے اور کسی شے کو ثبات نہیں - ہزارہا بادشاہ آئے اور چل بسے - غیور قومیں اُبھریں اور اُبھر کر مٹ گئیں - شاندار حکومتیں بنیں اور بن کر بگڑ گئیں - کئی تمدن اُٹھے اور اُٹھ کر رہ گئے - لیکن ہمارا ہندوستان اب تک پورے زور و شور سے آباد ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے :-

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کوئی بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہمارا ہندوستان گلستان جہان بلبلستان جہان -

سلمیٰ - خوب! تو آپ ایک غیور محب وطن معلوم ہوتے ہیں -

سلیم - میں اپنی مادرِ وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں - اور ہر وہ ہندوستانی جو اپنی مادرِ وطن پر قربان ہونے کے لئے تیار نہیں - وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتا خواہ ہندو ہو یا مسلمان، پارسی ہو یا عیسائی، اچھوت ہو یا برہمن -

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

وہ دن بھی آ رہا ہے جب ہم اپنی مادرِ وطن پر آزادی کا تاج دیکھیں گے -

سلمیٰ - معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی کالج میں پروفیسر ہیں -

سلیم - نہیں - میں انجمن اسلامیہ ہائی سکول میں نائب مدرس ہوں۔ تمہاری دعا سے شاید پروفیسر بھی بن جاؤں -

سلمیٰ - (شرماتے ہوئے) آپ تو ---

سلیم - کیا کہا! اور میں نے کہا کہ تم تو شاید پنجاب کے خطہ سرسبز کی باشندہ معلوم ہوتی ہو۔

سلمیٰ - جی ہاں - ہمارا وطن لاہور ہے - لیکن ---

سلیم - لیکن کیا؟

سلمیٰ - میرا والد مرزا بیگ تو کلکتہ میں مقیم ہے!

سلیم - اور حضرت تیس مار خان؟

سلمیٰ - یہ تو اسم بامسمیٰ ہیں - نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی مفت میں باپ بن بیٹھا ہے -

سلیم - یعنی!

سلمیٰ - میرا سوتیلا باپ ہے!

سلیم - عجب! لیکن تم تو اپنے نام کے بعد انہی کا نام لکھتی ہو -

سلمیٰ - اور کوئی چارہ ہی نہیں - پرلے درجے کا رذیل آدمی ہے - زبان کا کچا - کان کا ہلکا - اور اخلاق کا گرا ہوا - اس کی آواز پر نہ جائیں - ازحد بزدل ہے ---

سلیم - تمھیں یوں نہ کہنا چاہیئے - کچھ بھی ہوں - تمہارے ولی نعمت ہیں -

سلمیٰ - آپ بہت اچھا پڑھاتے ہیں -

سلیم - ہم نے باتوں ہی باتوں میں وقت گزار دیا - اب کوئی کام کرنا چاہیئے (گھڑی دیکھ کر) او ہو - دس بج گئے - اچھا - اب میں جاتا ہوں - پرسوں آؤں گا - تعلیم نسواں پر جواب مضمون لکھ رکھنا -

سلمیٰ - آداب عرض -

(سلیم جاتا ہے)

تیسرا منظر

(تیس مار خاں کی دکان - تیس مار خاں تصویر کھینچ رہا ہے

(اتنے میں مجید آتا ہے)

تیس مار خاں ۔ آ گئے ۔ بھئی واہ !

مجید ۔ ایک ضروری کام پیش آ گیا تھا ۔ یُوں دیر ہو گئی ۔

تیس مار خاں (سگریٹ کیس پیش کرتے ہوئے) ابے جمن ہوٹل سے دو پیالے چاء کے تو لے آئیو ۔ سناؤ کوئی تازہ بات ۔

مجید ۔ کل رشید ملا تھا ! سلیم صاحب بھی وہاں تھے ۔ رشید سے معلوم ہوا کہ آپ کی صاحبزادی سلمیٰ کو پڑھا ۔ رہے ہیں ۔

تیس مار خاں ۔ جی ہاں ۔ غلام علی نے ڈھونڈ نکالے ہیں ۔

مجید ۔ آدمی تو نہایت ہی شریف ہے اور لائق فائق ہے ۔ اخلاق کا سچّا اور کردار کا دھنی !

تیس مار خاں ۔ مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ مِل گیا ۔ خوب پڑھاتے ہیں ۔ روز ملاقات رہتی ہے اور واقعی خوب آدمی ہیں ۔ ادیب شاعر ۔ فلسفی اور پھر حُسن اخلاق کا مالک !

مجید ۔ سُنا ہے کہ بہترین طریقہ سے پڑھاتے ہیں اور نہایت ہی کامیاب اُستاد ہیں ۔ علیگڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں ۔

تیس مار خاں ۔ علیگڈھ کی تعلیم واقعی اکسیر اعظم ہے ۔

مجید ۔ جی ہاں ۔ کیا کہوں ۔ علیگڈھ تعریف سے بالا ہے ۔ ہندوستان کا کارڈووا ہے ۔

تیس مار خاں ۔ میرا بھانجا بھی علیگڈھ میں تعلیم پا رہا ہے ۔

مجید ۔ پڑھائی کا کیا حال ہے ۔

تیس مار خاں ۔ سلمیٰ تو تعریف کر رہی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ دماغ کے مالک ہیں ۔

مجید ۔ سنائیے دُکان کی کیا حالت ہے ؟

تیس مار خاں ۔ کیا پُوچھتے ہو ! پلے سے کھانا پڑتا ہے ۔ بلکہ کرایہ بھی پلے ہی سے دینا پڑتا ہے ۔

مجید ۔ میں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا ۔ کہ آپ سو سو کما لیتے ہونگے ۔

تیس مار خاں ۔ سو کیا نکالی سفید ہاتھی مول لے لیا ہے ۔ نہ چھوڑ سکتا ہوں اور نہ چلا سکتا ہوں ۔

مجید ۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں ۔ بمبئی میں شاید آپ کا تعارف نہ ہو گا میں آپ کو اپنے ساتھ مجلسوں ۔ جلسوں اور دوستوں کے پاس لے جایا کروں گا اور اُمید غالب ہے ۔ کہ آپ تھوڑے ہی عرصہ میں مشہور آرٹسٹ گنے جائینگے ۔

تیس مار خاں (سگریٹ پیش کرتے ہوئے) شکریہ ! مجھے یہاں کے مسلمانوں سے شکایت ہے !

مجید ۔ وہ کیوں ؟

تیس مار خاں ۔ بجائے اس کے میری ڈھارس بندھوائیں اور میری دلجمعی اور پشت پناہی کریں ۔ میرے آڑے آتے ہیں ۔

مجید ۔ عجب ! بس آپ بیفکر رہیں میں بندوبست کئے دیتا ہوں آپ بھی اسلامی بُود و باش رکھیں ۔ لوگ تو آپ کو عیسائی سمجھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو کام نہیں ملتا ۔ آپ نے کرزن فیشن اختیار کر رکھا ہے ۔

تیس مار خاں ۔ لیکن اور مسلمان بھی تو ہیں !

مجید ۔ پیشہ ور مسلمان اکثر مسلمان نظر آتے ہیں اور بچہ میمن اور بوہرہ بھائی تو حد درجہ کے پلے مسلمان ہیں اور بمبئی میں انہی کا بول بالا ہے ۔ آپ اپنی وضع قطع تبدیل کر لیں اور پھر نتیجہ دیکھیں ۔

تیس مار خاں ۔ بہت اچھا ۔

مجید ۔ میں اتوار کو آؤں گا اور آپ کو جناح ہال میں مسلمانوں کے جلسے میں لے جاؤں گا ۔ وہاں آپ کا تعارف کراؤں گا ۔ آداب عرض !

تیس مار خاں ۔ بہت خوب ۔ خدا حافظ ۔

چوتھا منظر

(تیس مار خاں ۔ شمشاد ۔ بشیر اور سلمیٰ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں)

شمشاد ۔ (سلمیٰ سے) بیٹا ۔ آج تک تم نے یہ نہیں بتلایا کہ پڑھائی کیسی ہو رہی ہے ؟

سلمیٰ ۔ امی جان میں نے اب تک ایسا لائق اور ہمدرد اُستاد کہیں

نہیں دیکھا!

تیس مار خاں - ہزاروں میں ایک ہیں -

سلمیٰ - ہمارے کالج کے تمام پروفیسران کے سامنے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ستارے سورج کے سامنے -

شمشاد - خوب - اب تم جاؤ - کتاب کا مطالعہ کرو - ماسٹر صاحب آتے ہوں گے -

(سلمیٰ جاتی ہے)

شمشاد - معلوم ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب نے سلمیٰ پر اچھا اثر ڈالا ہے -

تیس مار خاں - میرا بھی یہی خیال ہے -

بشیر - اور میرا بھی - پہلے پہل تو ہر تیسرے روز آیا کرتے تھے اور ایک گھنٹہ کے بعد چلے جایا کرتے تھے - لیکن پندرہ روز گزر جانے کے بعد تین تین گھنٹے بیٹھنے لگے اور اب تو اتوار بھی ناغہ نہیں کرتے - میں نے کئی مرتبہ انہیں دبی زبان سے باتیں بھی کرتے دیکھا ہے -

شمشاد - آپ تو بھائی نہایت ہی شاکی ثابت ہوئے ہیں -

تیس مار خاں - شک کاہے کا ؟ بھائی سچ کہہ رہے ہیں - میں نے خود دو مرتبہ دیکھا ہے -

شمشاد - میں تو پہلے ہی سے کوئی بر ڈھونڈ رہی تھی - اللہ نے میری سُن لی - کس قدر لائق لڑکا ہے -

تیس مار خاں - تو اُسے داماد بنانا چاہتی ہو ؟

شمشاد - اندھے کو کیا چاہئے ؟ دو آنکھیں - اگر ہمیں مل جائے تو -

تیس مار خاں - سمجھا!

بشیر - پیش وہی آتی ہے جو نوشتے میں ہے - اب اگر ہو سکے تو -

تیس مار خاں - تو کیا ؟

بشیر - سلمیٰ اور سلیم کا عندیہ لیا جائے - اگر راضی ہوں تو دونوں کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے -

تیس مار خاں - بوڑھے کو کوئی لالچ ملا ہوگا -

بشیر - یہ کام تمہارے ہیں - میں نے حلال کی کمائی ہے - اور پھر گاڑھے پسینہ کی کمائی -

تیس مار خاں - تم دونوں نے صلاح کر رکھی ہے - میں خوب جانتا ہوں -

شمشاد - اس میں غصہ کی بات ہی کیا ہے - ہر نوجوان لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کے لئے بہترین رفیقِ حیات کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہمیں سلیم سے بہتر اور کوئی داماد نہیں مل سکتا -

بشیر - ماشاءاللہ - نوجوان ہے - تعلیم یافتہ ہے - کماؤ ہے اور خلیق کتنا ہے ؟

تیس مار خاں - بوڑھے خرانٹ - اپنے منہ کو تالا کیوں نہیں لگاتا!

بشیر - بوڑھا تو ضرور ہوں لیکن صاحب ہوش ہوں - دھوپ میں بال سفید نہیں کئے -

شمشاد - بھائی - اِن کی باتوں پر نہ جائیں - ہم جانیں اور ہمارا سلیم -

تیس مار خاں - لیکن اُس کا نہ کوئی آگا ہے اور نہ ہی پیچھا -

شمشاد - تو ہمارے ساتھ رہے گا -

تیس مار خاں - اور تمہاری بہن کا لڑکا جو بیٹھا ہوا ہے ؟

شمشاد - کون عبدل ؟ میں اُسے ہرگز نہ دوں گی -

تیس مار خاں - تیرے ماں باپ ناراض ہوں گے !

شمشاد - میں جانوں !

تیس مار خاں - اور میرا بھانجہ جو بیٹھا ہوا ہے !

شمشاد - بیٹھا رہے !

تیس مار خاں - اور پندرہ سو روپے جو ہضم کر رکھے ہیں -

شمشاد - تم نے ہر کسی سے اِسی اُمید پر پیسے کھائے ہوئے ہیں -

بشیر - تم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا -

تیس مار خاں - شمشاد میں اس سلیکشن کے خلاف ہوں -

شمشاد - سلیکشن الیکشن میں نہیں جانتی - جسے چاہوں گی دوں گی -

تیس مار خاں - خواہ وہ رہگذری کیوں نہ ہو -

شمشاد - جوڑے عرش سے اترا کرتے ہیں -

تیس مار خاں - تم ایک بھکاری کو دے رہی ہو -

شمشاد - میرے لئے وہ بادشاہ ہے - علم اور اخلاق بہترین دولت ہے -

تیس مار خاں - آہا ہا ہا - اور پرائی لڑکیوں کو گانٹھ لینا بھی اخلاق ہے

بشیر - اغوا کرلینا مذموم ہے - جائز تعلقات پیدا کرنا عین اخلاق ہے -
شمشاد - بے شک - میں نے کہا -
تیس مار خاں - کیا کہا تم دونوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے - میں
تو سلمیٰ کو اپنے بھانجے کو ہی دوں گا -
شمشاد - دوسرے جنم میں تمہیں سلمیٰ پر کوئی حق نہیں ہے -
تیس مار خاں - شمشاد تم بھی نری جاہل ہو - اگر سلمیٰ کی شادی میرے
بھانجے سے ہو گئی تو ہم زندگی کے بقیہ ایام عیش و عشرت میں
گزاریں گے اور سلمیٰ بھی زندہ در بہشت رہے گی -
شمشاد - زندہ درگور - تم لاکھ جتن کرو میں نے دل میں ٹھان لی ہے -
تیس مار خاں - تم جانتی ہو کہ میرا نام کیا ہے !
شمشاد - جی ہاں - اچھی طرح جانتی ہوں - میں اپنی دھن کی پکی ہوں -
تیس مار خاں - اور میرا ارادہ بھی اٹل ہے -
شمشاد - تقدیر کے سامنے تدبیر بھی بے دست و پا ہے - کوششیں
بیکار ہیں جب آدمی مجبور ہے !
(دروازے پر دستک آتی ہے - تیس مار خاں دروازہ کھولتا
ہے - سلیم اندر آتا ہے - سب چلے جاتے ہیں - سلمیٰ آتی ہے - پڑھائی
شروع ہو جاتی ہے)
سلمیٰ - (مخمور نگاہوں سے) آج آپ دیر سے آئے ہیں -
سلیم - راستے میں ایک دوست مل گیا تھا - اللہ ان دوستوں سے
بچائے -
سلمیٰ - شاید آپ دوستوں سے گھبرائے ہوئے ہیں -
سلیم - دوست - دنیا دوست دوست پکارتی ہے - اصلی دوست
کہیں ملتا بھی ہے - ملتے ہیں - کون ؟ مفت خورے - زبانی
جمع خرچ کرنے والے - گپّی - نکمّے - پرائے دسترخوان کی مکھیاں
فراغت میں چھکے وار تقریروں سے زمین اور آسمان کے
قلابے ملاتے ہیں - لیکن ذرا سی آنچ آئی اور یہ نو - دو گیارہ
ہو گئے - سوائے اپنے وجود کے اور کوئی دوست نہیں
ہو سکتا - دنیا مطلب پرست ہے - ہر کوئی اپنا اُلّو سیدھا
کرنا چاہتا ہے - مطلب نکلا اور پیٹھ پھیری - میرا دوست

تو میرے من میں مکیں ہے جب چاہا دیکھ لیا ؎
دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار ، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی -
سلمیٰ - خوب !
سلیم - ہاں - تم سے ایک بات پوچھتا ہوں ! اگر اجازت ہو تو -
سلمیٰ - شوق سے پوچھئے -
سلیم - (جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے) کل تمہاری جواب
مضمون کی کاپی میں یہ کاغذ پڑا ہوا تھا - جس پر یہ شعر
لکھا ہوا ہے ؎

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

اور دوسری جانب یہ مصرع لکھا ہوا ہے ؎
ترے وعدے کو ہم کیا سمجھوں آسان بھی ہو مشکل بھی ہو !
میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا -
سلمیٰ - آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟
سلیم - نہیں تو -
سلمیٰ - کہ میں -
سلیم - کہو تو -
سلمیٰ - کہ میں -
سلیم - اب سمجھا - تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں - سچ سچ بتانا -
ہاتھ ملاؤ (ہاتھ ملاتے ہوئے) تو کیا تم میری رفیقۂ حیات
بن سکتی ہو !
سلمیٰ - (شرماتے ہوئے) آپ میرے ابا سے پوچھ لیں -
سلیم - تمہارا اپنا کیا خیال ہے ؟
سلمیٰ - میں سوچ کر جواب دوں گی !
سلیم - اشارہ دینا اور یہ ٹال مٹول !
سلمیٰ - میں سوچ کر بتلاؤں گی -
سلیم - سوچ لو -
سلمیٰ - (سوچتے ہوئے) تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی -
سلیم - کہو -

سلمٰی - کہیں آپ کی بیوی بننے کے لئے تیار رہوں!

سلیم - (جوشِ مسرت سے) سچ کہہ رہی ہو؟

سلمٰی - بالکل سچ - آپ بدل تو نہ جائینگے؟

سلیم - یہ بھی کوئی بات ہے!

سلمٰی - کیونکہ مرد بیوفا ہوتے ہیں!

سلیم - آہا ہا ہا - چور کی ڈاڑھی میں تنکا - بیوفائی تو عورتوں کا شیوہ ہے - عورتوں کا ہر قول زبان کے دھنی ہوتے ہیں - اُن کا ارادہ اٹل ہوتا ہے - کٹ کر مر جاتے ہیں - لیکن زبان کی خاطر ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

سلمٰی - تو آپ سوال ڈال دیں - امی تو مان جائینگی لیکن ابا نہ مانینگے

سلیم - اُن کی اکڑ فوں بھی اُتر جاتے گی - تم مضبوط رہنا۔

سلمٰی - وہ بے پیندے کے گھڑے ہیں - گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔

سلیم - وہ خود بخود بنوں میں اُتر آئینگے - اب میں جاتا ہوں - تم ہوشیار رہنا!

سلمٰی - امی کو میں ہموار کر لوں گی - ابا کا خیال رکھیں۔

سلیم - خدا نے چاہا تو سب کام سنور جائینگے!

(جاتا ہے)

پانچواں منظر

(سلیم کا مکان سلیم اخبار پڑھ رہا ہے - پڑھ کر میز پر رکھ دیتا ہے اور کچھ سوچنے لگ جاتا ہے - کلن آتا ہے)

کلن - حضور چائے حاضر ہے (جواب نہ پا کر) ہُش -

سرکار میں نے کہا چائے حاضر ہے (جواب نہ پا کر نزدیک آتا ہے)

حضور میں نے کہا چائے لے آؤں؟

سلیم - (جھنجھلا کر) تم بھی کوئی اُلّو ہو - دیکھتے نہیں ہو کہ میں کچھ سوچ رہا ہوں - خواہ مخواہ بھیجا کھا رہے ہو - اِن نادانوں سے

اللہ ہی بچائے۔

کلن - (دبی آواز سے) تقصیر کی معافی مانگتا ہوں۔

سلیم - تم سے کئی مرتبہ کہا ہے - کہ جب میں کسی سے باتیں کروں یا اکیلا بیٹھ کر کچھ سوچوں تو تم خاموش رہا کرو - لیکن تیرا قصور نہیں ہے یہ تیرا بڑھاپا ہے - بڑھاپا۔

کلن - سرکار - گستاخی کی معافی - آج دو ڈھائی مہینے ہو گئے ہیں کہ نہ تو آپ کچھ رغبت سے کھاتے ہیں اور نہ ہی رات کو آرام سے سوتے ہیں - اور نہ ہی آپ کے چہرے پر رونق ہی نظر آتی ہے - شاید کہ۔

سلیم - شاید باید کچھ نہیں - سدھار و یہاں سے۔

کلن - (دست بستہ) میں نے آپ کا نمک کھایا ہے - اس لئے میرا فرض ہے کہ آپ کے غم کو اپنا غم سمجھ کر آپ کے غمزدہ دل کا غم غلط کروں۔

سلیم - کاہے کا غم!

کلن - میرا ساٹھ سال کا تجربہ بتلاتا ہے کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

سلیم - تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے!

کلن - سرکار ان بوڑھی ہڈیوں نے بہت کچھ دیکھا ہے - آپ ضرور کسی اُلجھن میں ہیں۔

سلیم - عجیب آدمی ہو - ہر چند کہتا ہوں کہ کوئی بات نہیں - لیکن تم ہو کہ وہی تان چھیڑے چلے جا رہے ہو۔

کلن - اب تو مجھے صاف کہنا پڑے گا کہ آپ اپنا دل ہار بیٹھے ہیں اور کسی فتنۂ روزگار کی چلبلی اور چنچل چال پر فریفتہ ہو گئے ہیں - کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

سلیم - (قہقہہ لگاتے ہوئے) عجیب انسان ہو۔

کلن - آپ مانیں یا نہ مانیں کہوں گا خدا لگی کی۔

سلیم - اچھا - اب جاؤ - چائے لیتے آؤ - (کلن جاتا ہے)

(عالمِ تنہائی میں) معلوم ہوتا ہے - کہ یہ بڈھا بھی اپنے زمانے میں مجنوں اور رومیو کا باپ رہ چکا ہے - اور [illegible] ہے - وہ کونسا درخت ہے جسے ہوا نہیں لگی اور وہ کونسا [illegible] میں

محبت سے مجبور دل نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر محبت نہ ہوتی تو یہ سنسار بیکار ہوتا۔ نہ یہ آگ ہوتی اور نہ یہ آسمان ہوتا اور نہ ہی یہ زمین نہ یہ وولولہ ہوتا اور نہ یہ سورج، چاند، ستارے ہوتے ؎

آدمی پہلے محبت میں بگڑ لے تو بنے
خاک میں دانہ ملے جب تو شگوفہ نکلے

کلّن۔ سرکار۔ تین صاحب آ رہے ہیں۔

سلیم۔ کون؟

کلّن۔ مسٹر رشید۔ مسٹر مجید۔ مسٹر حمید۔

سلیم۔ بلا لاؤ۔ ہاں چائے بھی لیتے آنا۔ اور میں نے کہا گولڈ فلیک کا ایک پیکٹ!

کلّن۔ اور دیا سلائی؟

سلیم۔ ابے جاتا ہے کہ ——

(رشید۔ مجید۔ حمید آتے ہیں)

سلیم۔ آئیے۔ آئیے۔ تشریف رکھیے گا۔ مزاج شریف!

رشید۔ الحمد للہ۔ یار تم تو آج کل عید کے چاند ہو رہے ہو!

سلیم۔ کیا کہوں۔ فرصت عنقا ہو گئی ہے۔

مجید۔ جی ہاں۔ سناؤ تو وہاں کی خبر۔

حمید۔ کہاں کی؟ ہم بھی تو سنیں!

مجید۔ تیس مار خاں کی صاحبزادی کو ٹیوشن دے رہے ہیں۔

رشید۔ اماں تم بھی چھپے رستم ہو۔ سناؤ تو۔

مجید۔ تیس مار خاں تو مرعوب ہو گیا ہے۔ شاید ——

سلیم۔ کلّن کے شاگرد ہونا!

رشید۔ کون کلّن!

سلیم۔ اپن جانب کا نوکر!

رشید۔ معلوم ہو گیا۔ کونسی منزل طے ہو رہی ہے!

مجید۔ کیوں۔ کونسا سبق زیر مطالعہ ہے!

حمید۔ انتہا ہو گئی۔ اب تو اعلان کا انتظار ہے۔

رشید۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ کیوں سلیم! کہو تو۔

کلّن۔ سرکار۔ تیس مار خاں صاحب آ رہے ہیں۔

سلیم۔ آپ فوراً دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ (کلّن سے) بلا لاؤ۔ (دوست جاتے ہیں اور تیس مار خاں آتا ہے)

آداب عرض۔ تشریف رکھیے گا۔ اس ذرہ نوازی کا شکریہ۔ (سگریٹ پیش کرتے ہوئے)

تیس مار خاں۔ (سگریٹ سلگا کر تمکنت سے) میں نے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

سلیم۔ (متحیر ہوتے ہوئے) فرمائیے۔

تیس مار خاں۔ ہم نے آپ کو سلمیٰ کو پڑھانے کے لئے رکھا تھا لیکن آپ نے امانت میں خیانت کی۔

سلیم۔ (چونکنا ہوتے ہوئے) وہ کیسے!

تیس مار خاں۔ خیر یہ تقدیر کا معاملہ ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ شریف ہیں اور آپ نے شرافت سے کام لیا ہے۔

سلیم۔ فرمائیے۔ آگے فرمائیے۔

تیس مار خاں۔ اب میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ

سلیم۔ (مشوش ہوتے ہوئے) فرمائیے۔

تیس مار خاں۔ کہ سلمیٰ آپ کی چیز ہے۔

سلیم۔ شکریہ۔

تیس مار خاں۔ اور شادی ۱۹۴۰ء میں ہوگی!

سلیم۔ وہ کیوں!

تیس مار خاں۔ کیونکہ سلمیٰ کا اپنا یہ خیال ہے۔

سلیم۔ عجب!

تیس مار خاں۔ اور ہاں۔ اس بات کا کسی سے ذکر بھی نہ کرنا!

سلیم۔ کوئی چوری تو نہیں ہے!

تیس مار خاں۔ یونہی۔ اسی میں مصلحت ہے!

سلیم۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

تیس مار خاں۔ آپ سوچ لیں۔ اور آج سے پڑھائی بھی بند کر دی گئی ہے۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ (جاتا ہے)

سلیم۔ شادی ۱۹۴۰ء میں۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔ پڑھائی بند کر دی گئی ہے۔ (دوست آتے ہیں)

رشید۔ اس کی باتوں پر نہ جانا۔
مجید۔ فریبی ہے فریبی۔
حمید۔ اور پرلے درجے کا دغاباز۔
رشید۔ شادی سنہ ۱۹۴۰ء میں۔
مجید۔ برات عاشقاں برشاخ آہو!
سلیم۔ اور کسی سے ذکر بھی نہ کرنا۔
مجید۔ اور پڑھائی بھی تو بند کر دی ہے۔
رشید۔ دھوکہ۔ فریب۔ مکاری۔ یہ بھی شطرنج کی چال ہے۔
سلیم۔ نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے۔
مجید۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ سلمیٰ کا کیا حال ہے۔
سلیم۔ وہ تو متعہد ہو چکی ہے۔
رشید۔ اسی نے بھیجا ہوگا!
مجید۔ اسے میں خوب جانتا ہوں شعبدہ باز ہے۔
رشید۔ مجید سلیم کی طبیعت پریشان ہو رہی ہے۔ کوئی پھڑکتی ہوئی غزل ہی سنا دو۔
حمید۔ ہاں۔ ضرور۔

(مجید گاتا ہے)

فلک کے چاند میں نے بھی زمیں پر چاند دیکھا ہے
پھر اس کے بعد سب دنیا کو میں نے ماند دیکھا ہے
جب اسکو دیکھ لیتا ہوں زمانہ بھول جاتا ہوں
زمانہ کیا خود اپنا تک فسانہ بھول جاتا ہوں

رشید۔ سلیم۔ حمید۔ ماشاء اللہ خوب۔
سلیم۔ بہزاد کی غزل معلوم ہوتی ہے۔
مجید۔ جی ہاں "فلک کا چاند"
سلیم۔ اسے تو میں نے علیگڑھ میں سنا تھا!
مجید۔ وہی۔ خوب ہے۔
سلیم۔ یہ غزل حال مشاعرہ تھی۔ جگر ایسے شاعر ماند پڑ گئے تھے۔
مجید۔ تم سلمیٰ سے مل کر تصفیہ کر لو۔
سلیم۔ اب تو پڑھائی بھی بند ہو گئی ہے۔
مجید۔ کہیں دوسری جگہ مقرر کر لو۔
حمید۔ ضرور۔

چھٹا منظر

(باغ۔ سلیم انتظار کر رہا ہے۔ سلمیٰ آتی ہے)

سلیم۔ تم آگئیں۔
سلمیٰ۔ آپ مغموم کیوں ہو رہے ہیں۔
سلیم۔ سلمیٰ۔
سلمیٰ۔ یہ باغ۔ یہ بہار۔ یہ جلترنگ۔ یہ پھول۔ یہ سبزہ۔ یہ تاروں بھری رات۔ اور پھر۔
سلیم۔ سلمیٰ تمہارے امتحان کا وقت ہے۔
سلمیٰ۔ وہ کیسے؟
سلیم۔ کل تمہارا باپ آیا تھا اور یہ کہہ کر چل دیا کہ شادی سنہ ۱۹۴۰ء میں ہوگی اور کسی سے ذکر بھی نہ کرنا اور یہ کہ پڑھائی بھی بند کر دی گئی ہے۔
سلمیٰ۔ نابکار کہیں کا۔
سلیم۔ اور لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب چال ہے انکار کا بہانہ تلاش کر رہا ہے!
سلمیٰ۔ فریبی کہیں کا۔ یہ شخص مجھے اپنے بھانجے پر بیچنا چاہتا ہے سوتیلا باپ ہے نا؟ جہنمی!
سلیم۔ فرض کرو وہ راضی نہ ہوا تو۔
سلمیٰ۔ میں اپنی ماں سے۔ اپنے نانا سے اور خود ماموں خاں سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ میری شادی ہو چکی ہے!
سلیم۔ خدا تمہیں ایسی ہی ہمت دے۔ چلو۔
سلمیٰ۔ آپ کچھ چنتا نہ کریں سلمیٰ ہمیشہ کے لئے آپ کی ہو چکی ہے زمین بدلے۔ آسمان بدلے۔ سورج، چاند اور ستارے بدلیں۔ لیکن آپ کی سلمیٰ آپ سے بدل نہیں سکتی۔
سلیم۔ (جوشِ مسرت سے) خدا [illegible] ایسا ہی کرے [illegible]

ساتواں منظر

(سلیم کا مکان۔ سلیم کچھ لکھ رہا ہے۔ کلّن آتا ہے)

کلّن۔ رشید صاحب آئے ہیں۔

سلیم۔ آنے دو۔

رشید۔ (آکر) کچھ سُنا؟

سلیم۔ کیا؟

رشید۔ محلے والوں سے سُنا ہے کہ سلمیٰ انکار کر رہی ہے۔

سلیم۔ آہا ہا ہا ہا۔ میں نے کہا کہ تم کوئی عقل کی بات کروگے!

رشید۔ تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

سلیم۔ تم نے بھی خوب بے پَر کی اُڑائی۔ ابھی غلط ہے غلط۔

رشید۔ معلوم ہو جائیگا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

سلیم۔ کل تو وہ مجھ سے ملی ہے اور تجدید عہد کر کے گئی ہے۔ اتنے میں بدل بھی گئی!

رشید۔ عورت ذات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے۔ گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ۔

سلیم۔ لیکن میری سلمیٰ نہیں بدل سکتی!

کلّن۔ سرکار تیس مار خاں بڑے تیش میں آ رہے ہیں۔ کہو تو ٹال دُوں۔

سلیم۔ رشید تم ذرا دوسرے کمرے میں جانا۔ تم اُنہیں بُلا لاؤ۔

(رشید جاتا ہے اور تیس مار خاں آتا ہے)

تشریف رکھئے۔

تیس مار خاں (کھڑے کھڑے) میرے پاس وقت نہیں۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ۔

سلیم۔ تشریف تو رکھئے۔

تیس مار خاں۔ کہ میری لڑکی انکار کرتی ہے!

سلیم۔ کس سے؟

(کلّن اندر سے ایک لاٹھی لے آتا ہے اور تیس مار خاں کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے)

تیس مار خاں۔ آپ سے!

سلیم۔ یہ ہو نہیں سکتا۔

تیس مار خاں۔ آپ نے سارے شہر میں اعلان کر دیا ہے۔

سلیم۔ کوئی چوری تو تھی نہیں۔

تیس مار خاں۔ اور لڑکی کی ماں۔ اور اُس کا نانا سب خلاف ہیں۔

سلیم۔ جھوٹ۔ افترا۔ دھوکہ۔ دغا۔ فریب۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

تیس مار خاں۔ ہو گیا ہے۔ ہو گا۔

سلیم۔ سلمیٰ میری ہے اور میری ہو کر رہے گی۔

تیس مار خاں۔ ہرگز نہیں۔

سلیم۔ وہ میری ہو چکی ہے۔

تیس مار خاں۔ آپ خواب دیکھ رہے ہیں خواب۔ میں نے کہا میں پٹھان ہوں۔

سلیم۔ تو یہاں بھی کوئی حجام نہیں۔ آپ اکڑ کیوں رہے ہیں!

تیس مار خاں۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔

سلیم۔ ورنہ؟

کلّن۔ مارے ڈنڈوں کے بھیجا پلپلا کر دیتا۔

تیس مار خاں۔ یہ گستاخی اور مجھ سے؟

سلیم۔ یہ سلمیٰ کی خاطر ہے ورنہ آپ تو ازالۂ حیثیت عرفی کے سلسلہ میں بڑے گھر کی ہوائیں کھاتے نظر آتے!

تیس مار خاں۔ سلمیٰ کے باپ سے یہ سلوک؟

سلیم۔ باپ!

کلّن۔ کس کا باپ؟

سلیم۔ کاہے کا باپ!

کلّن۔ کہاں کا باپ؟

سلیم۔ بڑا ابا بیٹی والا! ناک نہیں جو ٹو آئے۔ تم تو پرائی لڑکیوں کی کمائی کھانے والے ہو۔ کہاں گئی میری فیس؟

کلّن ــــ نکال۔

سلیم۔ اور دو سَو روپے جن کا آج تیسرا مہینہ ہو گیا ہے!

کلّن۔ نکال۔ نکال۔

تیمار خاں - میرا نام آپ جانتے تو ہیں -

سلیم - ایسے تیس مکھی مار ہمارے جیب میں رہتے ہیں -

تیمار خاں - اگر وہ میری بیٹی ہے تو آپ سے ہرگز شادی نہ کریگی -

سلیم - تب تو وہ ضرور میری ہے -

(تیس مار خاں جاتا ہے اور رشید آتا ہے)

رشید - خوب دانت کھٹے کئے! اس کے بدن پر نہ جانا بودا ہے بودا - اب دب کر رہے گا -

کلن - تایا آ رہا ہے -

سلیم - رشید تم اُدھر جاؤ - بلا لاؤ -

(بشیر آتا ہے)

بشیر - السلام علیکم

سلیم - وعلیکم السلام - مزاج شریف -

بشیر - الحمد للہ - اللہ کا فضل ہے - سب خیر ہے - یہ خط شمشاد نے دیا ہے -

(خط پڑھنے کے بعد) بہت خوب - میری جانب سے آداب عرض پیش کر دیں - لیکن تیس مار خاں صاحب! وہ تو پرانے دستر خوان کی مکھی ہے گھر میں اس کی دال نہیں گلتی -

لیکن ابھی ابھی کلہاڑے مار گئے ہیں!

وہ کیسے!

آئے تھے اور کھڑے کھڑے کہہ گئے کہ لڑکی کی ماں - لڑکی کا نانا سب کے سب خلاف ہیں اور خود سلمیٰ انکار کرتی ہے -

یہ تو مفت میں خالی ہنڈیا میں چمچہ پھرا رہا ہے - آپ فکر نہ کریں - طے ہو گیا ہے - کل ملاقات ہوگی -

آداب عرض - (بشیر جاتا ہے اور رشید آتا ہے)

بڑے میاں تو بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں -

خوب آدمی ہیں -

رشید۔ ہوں سلمیٰ کی ماں نے کیا لکھا ہے؟
سلیم۔ کہ شادی کا بندوبست کر رہی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔
رشید۔ اور تاریخ؟
سلیم۔ شاید پندرہ روز کے اندر اندر۔
رشید۔ ہاتھ تو دو۔ آخر لے ہی بیٹھے۔ اور میری مٹھائی؟
سلیم۔ لے لینا۔
رشید۔ ابھی منگواؤ۔
سلیم۔ کلن۔ کلن۔ ابے کلن!
کلن۔ جی۔ سرکار۔
سلیم۔ جھٹ سے جاکر ایک سیر برفی تو تلوا لائیو۔
کلن۔ جی سرکار۔ اور میں نے کہا تھوڑی سی جلیبی بھی لیتا آؤں؟
سلیم۔ آدھ سیر لیتے آنا۔ کلن:۔ جی سرکار۔
کلن۔ (واپس آکر) اور میں نے کہا تھوڑے سے گلاب جامن بھی لیتا آؤں؟
سلیم۔ ہاں۔ ایک پاؤ لیتے آنا! کلن:۔ جی سرکار۔
کلن۔ (واپس آکر) اور میں نے کہا تھوڑے سے پیڑے بھی لیتا آؤں؟
سلیم۔ ہاں۔ وہ بھی لیتے آنا! کلن:۔ جی سرکار۔
کلن۔ (آکر) اور میں نے کہا کلوروفارم کی ایک شیشی بھی لیتا آؤں؟
سلیم۔ وہ اپنی بیوی کو سونگھانا۔ کلن:۔ جی سرکار۔

آٹھواں منظر

(تیسمار خاں کا مکان)

تیسمار [illegible] بیٹھے ہوئے) اور تیرا باپ بھی یہی کہتا ہے!
شمشاد۔ ہاں [illegible]!
تیسمار [illegible] ہزار روپے دے رہے ہیں۔
[illegible]
[illegible] بھی!

شمشاد۔ اُسے کہہ دو کہ چوپاٹی پر جاکر ڈوب مرو۔ بڈھا کھوسٹ! ساٹھ سال کی عمر میں سینگ کٹوا کر بچھڑا بن رہا ہے۔ بال کھچڑی ہو گئے ہیں۔ منہ سے رال ٹپک رہی ہے۔ اور شوق چرایا ہے شادی کا!
تیسمار خاں۔ سلمیٰ سے تو پوچھ لو۔
شمشاد۔ وہ اِس مردود کا نام تک سننا نہیں چاہتی۔
تیسمار خاں۔ (اُٹھ کر) میں خود پوچھتا ہوں۔
شمشاد۔ (آگے آکر) تم یہ حرکت نہیں کر سکتے (مہربان آتا ہے)
مہربان۔ کیا ہو رہا ہے؟
تیسمار خاں۔ اسے سمجھا رہا ہوں لیکن یہ ہے کہ کوئی بات کہی کہ بگڑی!
مہربان۔ بات کیا ہے؟
شمشاد۔ ابا جان! سلمیٰ کی ماں کون ہے؟
مہربان۔ کچھ سناؤ تو۔
تیسمار خاں۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ سلیم ایک لفنگا آدمی ہے۔ تم اُسے داماد نہ بناؤ۔ لیکن —
مہربان۔ تیسمار۔ تم غلطی پر ہو۔ سلیم ایک شریف لڑکا ہے اور رفعت کا یوسف زئی پٹھان ہے۔
تیسمار خاں۔ (منہ لٹکا لیتا ہے)
شمشاد۔ اور انہیں موٹر بنگلے اور دس ہزار روپے چاہئیں!
مہربان۔ یعنی۔
شمشاد۔ وہ خان بہادر محمد احمد ہیں نا!
مہربان۔ کوئٹہ والے!
شمشاد۔ جی ہاں! عمر میں آپ سے بڑے ہیں اور شوق چرایا ہے شادی کا۔
مہربان۔ تیسمار خاں۔ یہ کیا گورکھ دھندا لگا رکھا ہے؟
تیسمار خاں۔ لیکن سلمیٰ سلیم کو نہیں چاہتی!
شمشاد۔ جھوٹ۔ ابا جان آپ سلمیٰ سے خود پوچھ لیں (جاتی ہے اور سلمیٰ کو بلا لاتی ہے)
سلمیٰ۔ نانا جی! آداب!

مہربان۔ بھئی دیکھو بیٹا۔
تیمار خاں۔ آپ پوچھ لیں (سلمیٰ کو اشارہ کرتے ہوئے) پوچھ لیں۔
مہربان۔ بیٹا سلمیٰ تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ شرم نہ کرنا صاف صاف بتانا۔ کیا تم نے مسٹر سلیم سے شادی کا ارادہ کیا ہے!
سلمیٰ۔ (خاموش)
تیمار خاں۔ میں نے کہا انکار کر رہی ہے!
مہربان۔ بیٹا کہو تو۔ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں تو صاف صاف بتا دیتی ہیں
سلمیٰ۔ (خاموش)
شمشاد۔ ابا جان! آپ کا ادب کر رہی ہے!
تیمار خاں۔ انکار کر رہی ہے!
مہربان۔ بیٹا کہو۔ کہو۔
سلمیٰ۔ (چپ)
تیمار خاں۔ میں نے کہا انکار کر رہی ہے!
شمشاد۔ خاموشی نیم رضا ہوتی ہے! تیمار خاں۔ انکار

مہربان۔ (سلمیٰ سے) اچھا تو جاؤ آرام کرو۔ (سلمیٰ جاتی ہے) لڑکی اقرار کر رہی ہے۔
تیمار خاں۔ انکار۔
شمشاد۔ ابا جان! آپ نے سُن لیا۔ اب آپ ہی شادی کا انتظام کریں۔ میں سلیم کو کہلا بھیجتی ہوں۔
بشیر۔ (آکر) چند عورتیں آئی ہیں۔
شمشاد۔ ابھی آئی۔ آپ سلیم سے جاکر کہہ دیں کہ ۲۵ ستمبر کو نکاح خوانی ہوگی۔
تیمار خاں۔ اتنی جلدی!
شمشاد۔ ایسی باتوں میں تاخیر اچھی نہیں۔
تیمار خاں۔ تو لاؤ سامان خرید لاؤں!
شمشاد۔ میں خود خرید لوں گی!
تیمار خاں۔ (مہربان سے) دیکھا آپ نے؟
مہربان۔ بیٹی بہ خود انتظام کریں گے۔

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳ | فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء | نمبر ۳

عالمگیر کی توسیع اشاعت میں بقدر امکان حصہ لیکر اپنی علم دوستی و ادب نوازی کا ثبوت دیجئے

... ایڈیٹر نے ... الکاک پریس، لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا

مُلاحظات

ہم عالمگیر کے سالنامہ سنہ ۱۹۳۹ء کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جاذبِ نظر تصاویر کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ مضامین نظم و نثر فراہم کئے جا رہے ہیں جن اہلِ قلم حضرات نے ابھی تک اپنے رشحاتِ گرامی دفتر میں ارسال نہیں فرمائے وہ جلد سے جلد توجہ فرمائیں تاکہ ہم سالنامے کی ترتیب و تہذیب اطمینان سے کر سکیں۔ مضمون نگار حضرات کو یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ مضامین حد درجہ دلچسپ اور طرزِ جدید کے ہوں۔ عربی۔ فارسی، ہندی انگریزی اور دیگر زبانوں کے تراجم شکریہ سے قبول کئے جائینگے۔ لیکن طویل افسانوں اور مضمونوں کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہ نکل سکے گی۔ صرف مختصر رومانی، تاریخی، علمی ادبی مقالات اور بلند پایہ نفسیاتی اور جدید قسم کے افسانوں کو ترجیح دی جائیگی۔ مزاحیہ ڈراموں اور مضمونوں کا خیر مقدم کیا جائیگا۔ لیکن اُن کا معیار نہایت بلند ہونا چاہئیے۔

ہمیں یقین ہے کہ آنے والا سالنامہ صحیح معنوں میں "شاہکاروں کا شاہکار" اور اُردو ادب کے خواب کی دلکش تعبیر" ہوگی۔ اُمید ہے اہلِ قلم حضرات ہم سے تعاون کریں گے۔

زیرِ نظر شمارہ میں بہت سے دلچسپ علمی و ادبی مقالات اور روح پرور افسانے جمع ہو گئے ہیں۔ توقع ہے کہ قارئین انہیں بیحد پسند کرینگے۔ ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی نے "افاداتِ مہدی" لکھکر زندہ و جاوید شہرت حاصل کر لی ہے۔ اُن کے دلچسپ حالاتِ زندگی جناب فضا نے سپردِ قلم کئے ہیں جس کے لئے ہم اُن کے سپاس گزار ہیں۔ "بہترین معالج" ایک بہترین مزاحیہ ڈرامہ ہے" اردو ادب پر غالب کا اثر" ایک خاتون کا تحریر کردہ ہے۔ باوجود طالبہ ہونے کے اُنہوں نے اپنے موضوع کو خوب نبھایا ہے۔ "باپ کی وصیّت" ایک اصلاحی افسانہ ہے۔ اُردو ادب کو ایسے معاشرتی افسانوں کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ "حُقّہ" بہت پُرلطف مزاحیہ مقالہ ہے۔ "بیوفا" اور "دوشیزہ کا انتقام" حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ہیں۔

افسوس ہے بوجہ قلّت گنجائش بعض اعلان کردہ مضامین شریکِ اشاعت نہیں کئے جا سکے۔

بلند پایہ، کیف بار اور روح پرور نظموں اور غزلوں کے لئے ہم جناب احمد ندیم صاحب قاسمی جناب آرزو عزیز احمد صاحب عزیز۔ علی احمد صاحب علی اور دیگر شعرائے کرام کے بیحد ممنون ہیں۔ اُمید ہے یہ حضرات اپنے لطفِ بے پایاں سے عالمگیر کو ہمیشہ نوازتے رہینگے

ضروری اطلاع

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی خائن نے دفترِ عالمگیر سے خریدار حضرات کے پتے چُرا کر کسی اور رسالے یا اخبار کو دیئے ہیں۔ ناظرین عالمگیر کے پاس اگر کوئی رسالہ یا اخبار بطور نمونہ پہنچے یا ان سے خریداری کے سلسلہ میں کوئی خط و کتابت ہو تو وہ سمجھ لیں کہ ان کا پتہ دفتر عالمگیر سے چوری کر کے حاصل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناجائز طریق سے پتے حاصل کرنیوالے اشخاص کی بداخلاقی کسی ہمدردی کی مستحق نہیں

عالمگیر کے ناظرین کرام کو اگر کوئی رسالہ موصول ہو چکا ہو یا آیندہ موصول ہو تو از راہ کرم دفترِ عالمگیر کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ ایسے اشخاص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکے یقین ہے کہ ناظرین کرام اس اطلاع کو خاص طور پر تصوّر فرمائینگے۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ۔
پروپرائیٹر عالمگیر و خیام لاہور

آئندہ اشاعت کے بعض ہنگامہ آرا مضامین

"عالمگیر" کا معیار بلند سے بلند تر ہو رہا ہے۔ ماہِ اپریل میں شائع ہونے والے بعض خاص مضامین کی ایک مختصر جھلک درج ذیل ہے:۔

قلوپطرہ اور جولیس سیزر کی داستانِ عشق

یونان کے اس زمانہ کا قصہ جب وہاں زندگی صرف عورت شباب، حسن اور عشق پر مشتمل تھی، سرود زندگی کا ترجمہ۔ از جناب افتخار احمد خاں صاحب۔

شمع الفت کے پروانے

وادیٔ نیل کی ایک زندہ جاوید سرگزشت۔ محبت، غلط فہمی حیرت انگیز انکشاف، خوفناک انجام۔ از جناب سید شمیم عزمی۔

قدیم اقوامِ عالم اور موسیقی

ایک بیحد تحقیقی مقالہ جس میں بتایا گیا ہے کہ موسیقی کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور قدیم اقوام نے اس کی ترویج میں کیا حصہ لیا۔ پڑھ کر آپ مصنف کی محنت و کاوش کی داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ از جناب امجد علی خاں صاحب یوسف زئی (عثمانیہ)

پُر اسرار چور

ایک ایکٹ کا نیم مزاحیہ ڈرامہ نفیس اور دلچسپ۔ از جناب جمیل احمد صاحب کندھا پوری۔ بی۔ اے۔

غزل گوئی پر ایک نظر

ایک بلند پایہ ادبی نقد۔ حضرت دل شاہجہانپوری کی بہار آفریں شاعری پر تقریظ۔ از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

دُکھیاری

"آخر اس کا جرم کیا تھا؟ اس نے کونسا قصور کیا تھا۔۔۔ بس یہی کہ وہ غریب تھی۔۔۔ غریب۔۔۔ جن کی غذا لوگوں کی گھڑکیاں اور ٹھوکریں۔۔۔ جن کی خوشیاں ناپید اور جن کی زندگی دنیا میں جہنم کا نمونہ ہوتی ہے"۔

اس دردناک آغاز سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کہانی میں کس قدر رقت انگیز جذبات موجزن ہوں گے۔ از جناب سید منظر کاظمی بی۔ اے (آنرز)

عکرمۃ الفیاض

تاریخ کا ایک عبرت آموز واقعہ عکرمہ کی فیاضی کے حیرت انگیز واقعات۔ از جناب طالوت۔

علاوہ ازیں

"دوشیزہ کا انتقام" کی دوسری قسط جو پہلی سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور تحسین زا ہے۔ دو ایک بلند پایہ مقالے جو اس دفعہ بوجہ قلت گنجائش روکنا پڑے۔ ہندوستان کے چوٹی کے شعراء کا بیحد کیف بار کلام۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج ہی اپنے پرچے کا انتظام کیجئے

حسن و عشق

(از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے)

یہ حریمِ عشق ہے اے حسن اس جا دم نہ مار — عشق کو اب حسن کی صحبت نہیں ہے سازگار
مدتوں میں نے ترے در پہ جبیں سائی بھی کی — اور تری منزل کی دھن میں دشت پیمائی بھی کی
تیرے نغمے سن کے محوِ رقص بھی ہوتا رہا — تیری خاطر اجڑے میخانوں میں بھی روتا رہا
سرد چشموں کے ترنم میں صدا ڈھونڈھی تری — صبح کے سیمیں دھندلکوں میں ضیا ڈھونڈھی تری
مرمریں ہاتھوں کی جنبش میں رہی تیری تلاش — اوس کے قطروں میں ڈھونڈا تیری دل کا ارتعاش
مدتوں میں نے تجھے سمجھا مدارِ ہست و بود — تیرے جلووں سے طلب کرتا رہا دل کی کشود
میرے سوزِ دل نے مجھ کو طاقتِ پرواز دی — عرش کی چوٹی سے بھی میں نے تجھے آواز دی
الٹا ہر پتھر کو میں نے چیرا ہر ذرے کا دل — رفتہ رفتہ ہو گئیں میری امیدیں مضمحل
بے نیازی سی مرے انداز میں آنے لگی — اپنے دل کو اپنے نغموں کی صدا بھانے لگی
غور سے دیکھا تو دل میں عکس تھا اک نور کا — جس کے آگے دم بخود ہو جائے جلوہ طور کا
میں نے جس جانب نظر ڈالی صفائی ہو گئی — حسن کی دنیا پہ میری ہی خدائی ہو گئی
عکس میرا ہی نظر آتا تھا تاروں پہ نہاں — میری طاقت کے سہارے سے کھڑا تھا آسماں
میرے دم سے مرتعش تھے انجمِ گردوں نشیں — میرے بل پر آنکھ دکھلاتی تھی جنت کو زمیں
اب مرے سینے میں کچھ تیری ہوس باقی نہیں — جا کہ اب میرا سبو شرمندۂ ساقی نہیں

عشق اپنا خود نگہباں ہے یہاں سے دور ہو
اور دھوکا دے اب اس سینے کو جو بے نور ہو

یادِ مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی

مصنفؒ افاداتِ مہدی کے حالاتِ زندگی

از جناب سید دل محمد صاحب فضا، ادیب فاضل منشی فاضل جالندھری

مہدی افادی الاقتصادی مصنفؒ افاداتِ مہدی کا صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں۔ لیکن قرین قیاس ہے کہ وہ ۱۸۶۷ء کے قریب قریب پیدا ہوئے۔ وہ گورکھپور کے ایک معزز شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شیخ حاجی علی حسن مرحوم کورٹ انسپکٹر تھے۔ مہدی مرحوم فطرتاً صفائی پسند اور شریف النفس واقع ہوئے تھے اور شروع ہی سے صفائی کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ کھیل میں اپنے لباس کو ذرا بھی میلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے والد ماجد نے مکتب کی ابتدائی تعلیم کے بعد گھر ہی میں ان کی تعلیم و تربیت کی۔ عربی و فارسی میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ انگریزی کی تعلیم اسکول میں حاصل کی۔ اور علیگڈھ کالج میں بھی کچھ دن رہے۔ انکی براقیٔ طبع اور ذوقِ سلیم کا اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ بلند شہر کے نواب صاحب ان کے والد سے ملاقات کے لئے آئے۔ اور نواب صاحب کو مہدی کے ذوقِ ادب کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے کوئی فارسی نظم سننے کے لئے فرمائش کی۔ مہدی مرحوم نے خوش الحانی کے اصولوں کے ماتحت نظم کو نہایت عمدگی سے پڑھ کر نواب صاحب سے دادِ تحسین حاصل کی اور نواب صاحب نے بطور حوصلہ افزائی مبلغ پچیس روپیہ بطور انعام کے پیش کئے۔ آپ نے نہایت ادب سے ان کا روپیہ شکریہ سے واپس کیا اور کہا کہ "اگر آپ واقعی مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں۔ تو کوئی اچھی سی کتاب میرا بہترین انعام ہوگا"۔ اتفاق سے اس وقت نواب صاحب کے پاس "تہذیب الاخلاق" کی ایک جلد موجود تھی۔ وہی آپ نے دی اور فرمایا کہ باقی جلدیں مکان سے بھیجوں گا۔ وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف "تہذیب الاخلاق" نے مجھے آدمی بنایا۔

آپ بچپن ہی سے پڑھنے۔ لکھنے کھانے ناشتہ غسل وغیرہ وغیرہ میں وقت کی پابندی کا خیال رکھا کرتے تھے۔ جب مہدی کی عمر ۱۸ - ۱۹ سال کی ہوئی تو اس وقت وطن ہی میں ایک خاندان سادات کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد ہی ملازمت کا سلسلہ ۱۸۹۶ء میں شروع ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد نائب تحصیلداری کے عہدے پر بنارس میں متعین ہو گئے۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۰۷ء کو اُن کی رفیق زندگی نے انتقال کیا۔ اور تین اولادیں چھوڑیں۔ یہ حادثہ ان کے لئے سخت روح فرسا تھا۔ زاں بعد ۱۹۰۹ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ پھر ۱۹۱۰ء کے قریب اُن کی دوسری شادی ہوئی۔ جن سے ان کے دو لڑکے شاہد حسن اور نافذ حسین پیدا ہوئے۔ شاہد کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہو گیا۔ نافذ بقید حیات ہیں اور ایک قابل ہستی ہیں۔ ان کی موجودہ بیوی نہایت شریف خاندانی ہے اور اپنے شوہر کی پرستار۔ ایسی وفا سرشت بیویاں ہی خاندانوں کی زینت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ مہدی اور اُنکی بیگم کے خلوص و محبت کے متعلق مضمون کے آخر میں خطوط شائع کئے جا رہے ہیں جن کا مطالعہ ہماری مستورات کے لئے خاص طور سے سبق آموز ہوگا۔

مہدی مرحوم کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا۔ کہ اپنی تنخواہ کا کثیر حصہ کتابوں پر صرف کر دیتے تھے اور زمانہ علالت میں بھی مطالعہ

...ں کرتے تھے چونکہ ان کی زندگی بحیثیت مجموعی بہت با اصول ...ں تھے مراسلت کا سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھا۔ ڈاک ...ان کو روزانہ سخت انتظار رہتا۔ ڈاک عموماً زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اخبار رسائل۔ دوستوں اور عزیزوں کے خطوط۔ دکانوں کی فہرستیں برابر آتی رہتی تھیں۔ خود خط لکھنے اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینے میں بہت باقاعدہ تھے۔ خط کا جواب نہ دینا اُن کے خیال میں ایک اخلاقی جرم تھا جس کے وہ کبھی مرتکب نہ ہوتے۔ وہ خواہ کسی شخص کا ہوتا۔ جواباً ضرور اس کو لکھتے تھے۔ بیگم مہدی لکھتی ہیں کہ عین وفات کے روز بھی کوئی دو بجے دن کو انہوں نے کئی خط لکھوا کر بھیجے۔ ان کے خلف اکبر احمد اپنے کسی کام کے لئے باہر جانا چاہتے تھے۔ اس لئے خط کو ٹالنا چاہا کہ۔ ابا جان اب کل لکھینگے۔ اسپر انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "نہیں بیٹا آج ہی لکھو جب میں دنیا میں نہیں ہوں گا۔ اس وقت یہ باتیں تم لوگوں کو یاد آئینگی کہ تمہارے باپ کی باقاعدگی نے آخری سانس سے پہلے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا"

اوصافِ ذاتی

۱۔ وہ اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کر دیتے تھے۔

۲۔ کسی شخص سے صرف ایک دفعہ کی ملاقات سے اس کی نسبت نہایت صحیح رائے قائم کر لیتے تھے۔

۳۔ اس قدر خود دار تھے کہ جن احباب کے گھروں میں بغرض ملاقات چلے جاتے اگر وہ ان کے یہاں نہ آتے تو آپ پھر کبھی اُن سے ملنے نہیں جاتے تھے خواہ کتنا ہی بڑا شخص کیوں نہ ہو۔

۴۔ صداقت خلوص سے بھرا ہوا دل پہلو میں رکھتے تھے۔

۵۔ وہ اچھے لباس کے شائق تھے اور اس کی سلائی بھی نہایت اہتمام سے کراتے تھے۔

غذا

غذا مقدار میں بہت کم ہوتی تھی۔ لطیف اور بہترین غذاؤں کے دلدادہ تھے اور ثقیل اشیا سے پرہیز کرتے تھے مچھلی اور انڈوں کا بے حد شوق تھا اور پھلوں میں لنگڑا آم بالطبع مرغوب تھا۔

انتقال

اگست ۱۹۲۱ء میں ڈیرا پورہ میں علیل ہوئے اور وہاں صحت نہ ہوئی اور پھر وطن آئے اور علاج کیا۔ مگر طبیعت نہ سنبھلی پھر لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں تندرست ہو کر طبیعت دفعتہً ایسی بگڑی کہ پھر نہ سنبھلی اور راہی ملک عدم ہو گئے اور وطن لاکر دفن کئے گئے۔

ادبی خدمات

بیگم مہدی صاحبہ لکھتی ہیں کہ ان کے مضامین کی پہلی قسط تمدن عرب پر کھلی چٹھی کے عنوان سے فروری ۱۸۹۹ء میں ریاض الاخبار گورکھپور میں شائع ہوئی اس کے بعد مختلف رسائل اور اخباروں میں اُن کے مضامین شائع ہوئے۔ . . . .

. . . . . . اور اس سلسلہ میں مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی مولانا شبلی۔ حضرت آزاد مولانا حالی مرحوم سے خط و کتابت شروع رہی۔ ان تمام بزرگوں میں سے مولانا شبلی سے آپ کو بہت محبت تھی اور مولانا شبلی بھی مہدی کو اپنا عزیز جانتے تھے اور مہدی کی شگفتہ بیانی کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں۔

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا۔ نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔ دو تین ہفتے ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی۔ یہ اس سے بھی زیادہ ہوش رُبا اور خیرہ کن تھی۔"

ایک دوسرے خط میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی جو مہدی مرحوم کے مخلص احباب میں سے ہیں۔ آپ کے مضامین افادات کے متعلق رقمطراز ہیں کہ؛

"ان کے آخری صفحہ ایسی صحت زبان، لطافت خیال
پختگی ترکیب، متانت بیان، شوخی ادا وغیرہ صفات
سے متصف ہیں۔"

بعض مضامین کی شوخیاں سنجیدگی ادب کے حدود سے متجاوز نظر آئینگی۔ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ حضرت مہدی معلم اخلاق نہ تھے۔ ادیب و انشاپرداز تھے۔ اور جب شاعر کے لئے برہنہ رقامی کا جواز بڑے بڑے ثقات نے تسلیم کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر انشائے عریاں حرام رہے۔

میرے خیال میں انشاء عریاں مہدی مرحوم کی وہ خوبی ہے جو اردو لٹریچر کی جان ہے۔ اور ان کے اس طرز کا اب تک کوئی حریف پیدا نہیں ہوا۔ شاعر ہو یا ناثر جب تک وہ اپنا ذاتی رنگ پیدا نہ کرے تب تک کبھی بھی مقبول زمانہ نہیں ہو سکتا۔ اب میں مرحوم کی شگفتہ تحریر اور رنگین انداز بیان کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ "سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے۔ سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد۔ صرف انشاپرداز ہیں۔ جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں اس لئے واقعات بھی انہوں نے جس قدر لکھے ہیں قصص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھیں افسانۂ یاران کہن سمجھئے"۔ صـ۲۵۲

۲۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آپ کے خیال میں صنف نازک یعنی عورت کو کیا ہونا چاہئے۔

"صرف خوبصورت جس کی سرسری جلوہ گری یعنی ایک جھپک اچھے اچھوں کے لئے صاعقۂ جانسوز سے کم نہ ہو۔ عورت او عورت تو مجسم عشوہ گری ہے اور دنیا میں بے فوج کی سلطنت کر سکتی ہے۔ تیرے فتوحات خالص اخلاقی ہیں۔ یعنی تو دلوں پر حکومت کرنیوالی ہے"۔ صـ۱۸۶

فلسفہ حسن پر اظہار خیال ملاحظہ ہو:۔

"غور سے دیکھو وہ بہترین عطیۂ فطرت جسے شعراء فتنۂ حسن کہتے ہیں اور آجکل کی اصطلاح میں آپ مخزن جذبات (یعنی بیٹری) کہئے بیخود تھے شراب پینے والے، مستی میں الٹ دیئے پیالے جس سے برقی رو تمام جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ اُسے اُمنگوں کی طرح یہ ماہوش اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہے۔ ذرا پردے پردے میں جوانی کی سرکشی دیکھئے گا۔ چھپتے ہوئے کپڑے گویا خود سانچے میں ڈھل گئے۔ جس کا جائزہ آنکھوں آنکھوں میں بھی عیش خالص سے کم نہیں۔ فطرت کا یہ نازک ترلطیف تر۔ ثمر پیش رس دراصل فلسفۂ حسن کا اولین عنوان ہے"۔ صـ۱۸۱

ان کی عریاں تحریر کس قدر شگفتہ اور لطیف ہوتی ہے۔ دیکھئے اور لطف اٹھایئے

"مقیاس الشباب" (پستان) کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چھپی ہوئی محرم سے اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے، اس پردہ کا فوری برہنہ حصہ افق! خیال کے لئے کیا باقی رہا! غرض مہرالنساء وہ عالم تصویر بنی ہوئی تھی۔ شاہی نگاہیں جم کر حسن عریاں کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں نہیں زلف عنبریں کے پیچوں میں جہاں پناہ کو جکڑنا شروع کیا۔ شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حسن گلوسوز سے شکست کھائی۔ جہانگیر سے ضبط نہ ہو سکا دل دل کا چور زبان پر یوں آیا۔

"تمہارے اور تمہاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے" اس کا جواب جو کچھ ملا اسی کا حصہ تھا۔ جو آگے چل کر نور جہاں ہونے والی تھی۔ جی ہیرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا۔ کیونکہ اسے شاہی خواہشات کے زیر اثر ہونا چاہئے"۔ صـ۱۸۳

عورت کے باب میں ان کا تخیل ملاحظہ ہو:۔

"ایک فلسفی نے کیا چبھتی ہوئی بات کہی کہ دنیا میں جہاں کہیں حسین عورت ہے میری رشتہ دار ازلی ہے۔ یہ تعلق

نوعِ انسانی میں ہمیشہ سے ہے اور وراثت طبعی کے قاعدہ سے ہمیشہ رہے گا۔" صفحہ ۱۹۷

اور ملاحظہ ہو:۔

"عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن چاہنے والا اس کی خوش ادائی کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے تو آرزوؤں سے بھرے دل پر کیا گزرے گی ایسا سہاگ کس کام کا جو جیتے جی بیوگی سے بھی گیا گزرا ہو"

یہ تحریر دیکھئے کس قدر شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہی مہدی کا مخصوص رنگ ہے جس سے وہ اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔

"مگر ایلسی با یڈ نیران کا فرا داؤں کی طرف جن کے سینہ کا اُبھار محض اس کے خیر مقدم کے لئے تھا بالکل متوجہ نہیں ہوتا تھا بادۂ شباب سے بھرے ہوئے دو قدرتی کنٹر جو آنکھوں آنکھوں میں پی جانے کی چیز تھے اس کے لئے بالکل بے اثر تھے"

بعض بعض جدید اصطلاحات اور الفاظ بھی وضع کئے جن کا ان کو ہمیشہ خبط رہا جن سے اُردو لٹریچر میں ایک خاصہ اضافہ ہوا ہے:۔

تحریر المرۃ۔ مرۃ الجدید۔ گول خانہ میں چوکھنٹی۔ ترحم فی الحیات۔ قاصر النظری۔ عوائد الرسمیہ۔ بدل الاشتراک مختص النوع۔ مخروطی دماغ۔ گرۂ شب۔ خمیازۂ شباب۔ تومِ مفتون۔ تموج ہوائی۔ سحر کا آسیب۔ زہرۂ شب۔ محبت کا ثمر اوّلین۔ ایسے متعدد الفاظ ہیں کہ یہ نگینے جہاں جڑ جاتے ہیں۔ عبارت چمک جاتی ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کی رائے ہے کہ حضرت مہدی ملازمت کی قیود اور انتظامی معاملات کی ذمہ داریوں میں زیادہ تر مصروف رہے۔ ورنہ اگر ان کو اطمینانِ قلب کُلّی طور سے نصیب ہوتا تو وہ یقیناً ثانی آزاد ہوتے۔

ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو افاداتِ مہدی کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد اُن کی پیاری بیگم نے شائع کر کے تشنہ کامان پر احسان عظیم کیا ہے۔ اور ایک ایسا ادبی مرقع پیش کر دیا ہے جس میں طالب و مطلوب دونوں کے نقوش ابد الآباد تک زندہ رہیں گے۔

افادات کا مقدمہ بہت طویل ہے۔ جسے اُن کی بیگم صاحبہ نے لکھا ہے اور پیارے شوہر کی رومانی محبت کی سچی تصویر پیش کر دی ہے۔ اس کے بعد "مکاتیب مہدی" کے عنوان سے مہدی بیگم نے مرحوم کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنے احباب کے نام لکھے تھے ستمبر ۱۹۳۸ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ خطوط کیا ہیں۔ مرحوم کے ادبی جواہر پارے ہیں جن کے مطالعہ سے بلا شبہ خطوط غالب و خطوط آزاد و نیاز بالکل بے نمک معلوم ہوتے ہیں۔ خطوط بھی انسان کی سیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کیونکہ ان میں دل کے ٹکڑے کاغذ پر رکھے ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم جناب مہدی کے خطوط کے چند دلنشیں ٹکڑے۔ چند دلکش اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک تازہ خوش رنگ پھول سے ان کی نازک پتیاں توڑ کر الگ کر دی جائیں۔ تو پھول کی رعنائی میں فرق آجاتا ہے یہی حال حال مہدی مرحوم کی تحریر کا ہے۔ بہتر ہوتا اگر سالم خطوط نقل کئے جاتے۔ چونکہ مضمون بہت طویل ہو رہا ہے۔ اسی لئے میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ایک دوست کے نکاح ثانی کی ضرورت اور تحسین میں یہ فقرے کچھ زیادہ کھولنے کے محتاج نہیں۔

"دو آتشہ اچھی کھینچی ہوئی ہو تو نشاطِ ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں" صفحہ ۔

مرحوم اپنی تحریروں میں بعض دفعہ تلمیحات سے خوب کام لیتے تھے۔ دیکھئے اس نثر میں اپنا کمالِ اُستادی دکھا رہے ہیں صفحہ ۴۳ پر یہ فقرہ ہے جس میں اپنے انگریز افسر کی غلط رپورٹ سے جو تکلیف اُنھیں ایک دفعہ پہنچی تھی۔ اسکی پوری تفصیل اس میں بند ہے۔

"گورے کے دل کی سیاہی جب قلم سے ٹپکتی ہے تو نیلہ

پھبلتی ہے"۔

ہم گزشتہ اوراق میں لکھ چکے ہیں کہ شگفتہ بیانی حضرت مہدی کا مخصوص وصف ہے۔ دیکھئے اس خط میں کیا کیا گلفشانیاں کی ہیں۔

۱۵ ۱/۳۲ **بنام سید سلیمان ندوی**

مکرمی۔ آپ کے ڈیڑھ خط زیر جواب ہیں ادھر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا میں سنتا تھا مولوی خلوت کے اکیلے ہوتے ہیں لیکن آپ کی "رودادِ عروسی" جہاں تک معلوم ہوئی بغیر حوصلہ افزا ہے۔ یہ کیا کہ مرعوب ہوکر "صنف قوی" کی آبرو کھوئی۔ خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا۔ لیکن دوستوں کو قلق رہے گا کہ جسے "بستر شکن" ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں "شکن بستر" نکلا۔ عورت کتنی ہی نازک اور لچکدار ہو لیکن یہ اس کی فطرت کا راز ہے کہ حریف مقابل کے ثقل پر غالب رہتی ہے یعنی ہارنے والی نہیں۔ یہ دلچسپ شکست خدا کے صرف مقبول بندوں کے حصوں میں آتی ہے۔ یہ تصریحات آپ کے مذاق سے کتنی ہی بیگانہ ہوں غیر سنجیدہ نہیں ہیں۔ اور گو آپ کا عہد زفاف (یعنی مون) بستر علالت پر گزرا تاہم سننا چاہتا ہوں آپ کہاں تک اپنے قصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کے خط میں لکھتے ہیں "آپ لکھتے ہیں وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے۔ ایک صاحبہ فرماتی ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے۔ بیگم اپنی ہیں۔! یہ نکتہ رہ گیا تھا کہ پوری کئے دیتا ہوں۔

نیند اس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

یہ مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے۔ اس میں ریاض خیرآبادی مرحوم میر ناصر علی دہلوی۔ سید سلیمان ندوی۔ مولانا شبلی مرحوم۔ مولوی عبدالرزاق ابراکمہ ہوش بلگرامی۔ حالی مرحوم۔ شاہ دیگر اکبرآبادی وغیرہ مشاہیر کے نام خطوط ہیں۔ بڑے سائز پر ۲۰۴ صفحات کا مجموعہ ہے۔ میرے خیال میں یہ مجموعہ اردو لٹریچر میں بلحاظ شگفتگی بیان کے بالکل نئی چیز ہے اور اس قابل ہے کہ اسے اردو کے اعلیٰ امتحان ادیب فاضل اور منشی فاضل کے پرچہ اردو میں ضرور بطور نصاب داخل کر دیا جائے۔ اگر اس کتاب کی اہل ملک نے قدر کی قدر نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تو مہدی بیگم صاحبہ ایک اور مجموعہ خطوط جس میں ان کے نام اور خاندانی اعزہ کے نام خطوط ہیں۔ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ مہدی بیگم صاحبہ نے از راہ کرم میری درخواست پر چند غیر مطبوعہ خط عنایت فرمائے ہیں، جنہیں ذیل میں درج کرتا ہوں۔ دیکھئے مرحوم کی رعنائی محبت، صفائی قلب، معصوم کیرکٹر کی کتنی دلکش تصویریں ہیں۔

بنام بیگم مہدی صاحبہ

تحصیل بارہ ۲ ۱۴/۱۵

میری نورجہاں۔ کارڈ کے ساتھ ۱۳ کی پھڑکتی ہوئی تحریر دیکھی وہ صبح میرے لئے کتنی امید افزا ہوتی ہے جب ڈاک میں اپنی پیاری کے خیالات کا لفافہ کھولتا ہوں۔ دنیا کا قیمتی سے قیمتی لٹریچر بھی دلچسپی اور خالص جذبات کے لحاظ سے تمہاری چند سطروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کو لکھنا تمہاری دلی جذبات کی جھلک تمہارے آئینہ تحریر میں دیکھنا میرے لئے نصف عیش سے کم نہیں۔ اور سچ یہ ہے تم سے الگ ہو کر اسی پر جیتا ہوں۔ میری بلائیں لے کر تمہارے دشمن دنیا سے جائیں۔ یہ تو دراصل میری فنا ہوگی۔ کیونکہ اب تک سائنس کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہ کر سکا۔ جس سے بقاء جسم بغیر روح کے ممکن ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تم میری روح رواں۔ اور زندگی کی وہ قوت محرکہ ہو جس سے قطع نظر کرنے کے بعد میں صرف خاک کا ایک ڈھیر رہ جاؤنگا۔ مجھ میں تم میں جو کچھ لڑائی ہے۔ وہ سبقت یعنی پہل کی ہے اور میں ایک سے زیادہ موقعوں پر ثابت کر چکا ہوں، کہ فطرت اگر اپنا قرض مجھ سے پہلے وصول کرے تو نسبتاً اس میں اتنی خرابی نہیں۔ لیکن انشاء اللہ ابھی بیس برس تو تم کو چھوڑتا نہیں۔

. . . .

مگر یہ تو معلوم ہے۔ کہ تم خصائل کے لحاظ سے پوری عرب یعنی شوہر پرست ہو اور یہی وفاداری مجھے اس وقت تک لازماً رکھے گی جب

تک تمہاری چمپئی رنگت۔ ناگن کے سے کالے کالے لمبے لمبے بال۔
.... منطق رہنے دیجئے......
...... اس خلوص پر بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے ....؟
فقرہ تو یہ ہے کہ ناقد قطعاً وہ نہیں ہے۔ خواہ آپ کچھ ہی کیوں نہ ہوں
سچ کہنا اس کا کیا مطلب ہوا.......... انشاپردازی اتنی
تو ہو شاباش مہدی سے ادیب کی بیوی کو ایسی ہی ہونا چاہئے۔ یہ بھی
لاجواب فقرہ تھا۔ کہ جس غلطی پر آپ کو افسوس ہے۔ اسی پر مجھے ناز ہے
جہاں تک ہماری شرافت کا اقتضا ہے۔ حرف حرف الہامی ہے۔
جو ایک فلسفی کی رائے میں بھی قطعاً لائق تسلیم ہے فلسفی کی قید میں نے اس
لئے لگائی کہ اس میں کھوٹے کھرے کی پرکھ اور نفس انسانی کے رازہائے
سربستہ کی بے نقابی کی پوری پوری قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک
دو طرفہ جذبات کا تعلق ہے۔ میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ لیکن اب
شکایت ہی کیا.......... او خدا تیرا شکر ہے۔
شاہد سے کہو چھوٹا گھوڑا دھوبی سے لے کر خالو ابا کے لئے بھیج
دیں۔ میں تو کلاس راس یعنی کشیدہ قامت پسند کرتا ہوں۔ سلام۔ دعا
پیار۔ تیرا جہانگیر۔

مہدی

خط نمبر ۲ بنام مہدی بیگم صاحبہ

ڈیرہ پور ۹/۱۱ ۴۴

میری پیاری۔ مدت کے بعد یہ اتفاق ہوا ہے کہ برس کے برس
دن تم مجھ سے جدا ہو۔ گزشتہ سال تم نے اس موقع پر میری تحصیلداری
اور...... کی دعا مانگی ہوئی۔ آج کی عید اس حیثیت سے لائق مبارکباد
ہے کہ تمہاری یہ دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں۔ لیکن آرزو کا (جسے زندگی
کا سہارا کہو) جیتے اسی امید پر ہیں کہ جو کچھ کر چکے اس سے ابھی زیادہ
کرنا باقی ہے۔ بہرحال خواہشات کی تکمیل کے یہ دونوں رخ لائق غور
ہیں۔ ایک طرف حصول آرزو کی بے چینی۔ دوسرے جہاں یہ ذخیرہ
ختم ہوا۔ گویا ہم خود چلے۔ عشاق کا فلسفہ ناکامی اس خیال سے برا نہیں
کہ عیش سے خیال عیش میں زیادہ لذت ملتی ہے۔ اور یہ الجھاؤ شب
فراق کی تاریکی کو کاٹ دیتا ہے۔ جو برق امید کی چمک سے خالی نہیں

جبکہ بہتر ہے دل نہ سہی گلے ایک دوسرے سے ملیں گے میں ان
چند سطروں کے ذریعہ تم سے مل لیتا ہوں ....!
...... لطف زندگی کی ضروری شرط یہ ہے کہ اپنی تندرستی کے ساتھ
دوسرے بھی تندرست رکھے جائیں۔ جس وقت میں تمہاری چھٹی ذریات
یعنی چشم بد دور ایک درجن بیٹے بیٹیاں اور دامادوں پر نظر ڈالتا ہوں
تو سہرے تو رکھپور میں یہ موزونیت کہیں نظر نہیں آتی۔ اگر اس دائرہ کو
اپنے گھر تک محدود کر دو۔ تو لائق فخر پاکبازی اور ہمدردی کی نظیر۔
اس سے بہتر کہیں نہیں ملیگی۔ یہ اخلاقی فوقیت تمہاری شائستگی اور
بے لوث خصائل کا وہ راز ہے جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔
اور جس پر اس مرغی کی طرح جو بہت سے بچوں کی ماں بن کر دل قابو میں
نہیں رکھ سکتی۔ تم بھی سے جتنا اتراؤ زیب دیتا ہے۔ مجھ کو بھی افسوس
ہے کہ تمہارے کوٹھے کا لطف نہ اٹھا سکا۔ لیکن جذبہ وطن پرستی
اگر مارچ تک پھر کھینچ لے گیا۔ تو انشاء اللہ نیم کی..........
...... ؟ میں تو تم پر کوہ نور قربان کرنے کو طیار ہوں۔
دیکھو اگلے ہفتے کا وعدہ ہے۔ ۱۳ یعنی سنیچر کی شام کو ملوگی
۱۴ یعنی اتوار کی صبح کو میں کانپور اسٹیشن پر ملوں گا۔ نیت میں کچھ فتور ہو
یعنی کچھ روز ٹھیرنا چاہتی ہو۔ تو فوراً اطلاع دو۔ شاہد۔ ناقد سے
میری طرف سے عید مل لینا۔ نماز پڑھنے کے بعد تم کو لکھنے بیٹھ گیا۔
سب کی یاد تمہارا

مہدی

خط نمبر ۳ بنام مہدی بیگم صاحبہ

کارڈ ملا اور مزید اطمینان ہوا۔ بھائی افراغ کے کل کے خانے
میرے افکار بالکل غائب کر دیئے میں صرف تمہارے قلب کا سکون
چاہتا ہوں خواہ اس کے لئے آسمان کے تارے توڑنے پڑیں۔... میں ہرگز
کوئی خط نہیں لکھونگا۔ جواباً جو تحریر بھیجی تھی اسکے بعض شاندار فقرے تمہارے
سننے کے لائق تھے۔ ایک حرف دستاویز کے لائق نہیں۔ ایسی بے صبری ہے
اور جی نہیں لگتا تو کلکٹر کو لکھئے اور مجھے طلب فرما لیجئے۔ نوکری کا سہی لیکن
بندہ تو آپ کا ہوں۔ لڑکوں کو دعا۔ شاہد۔ ناقد کو پیار۔ ڈیرہ پور ۲/۱۱ ۴۴
الغرض مہدی مرحوم کی انشاپردازی زندہ جاوید رہنے
...... والی ہے۔ اس لئے وہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کیلئے مشعل ہدایت کا کام دے گی۔ فقط۔

بحر فصاحت

(از حضرت دل شاہجہانپوری)

عشق میں ایسی ٹھوکر کھائی آس کا شیشہ ٹوٹ گیا
روز نئے دکھ سہنے سے اے ہمدم جی چھوٹ گیا

پتھر کی جو مورت تھی وہ راحتِ دل کی صورت تھی
کعبہ خدا کا گھر ہے مانا دَیر تو ہم سے چھوٹ گیا

چُن لیں پلکوں سے سب ٹکڑے اہلِ نظر کو ہے یہ لازم
اُن کی راہ گزر میں گر کر دل کا شیشہ ٹوٹ گیا

راہِ طلب میں کس کو ڈھونڈیں دل بھی آخر ہم کھو بیٹھے
اب تک ہمدم تھا جو اپنا ساتھ اُسی کا چھوٹ گیا

اُف رے جوشِ جنوں کا عالم کس کے صدمے کس کو پہنچیں
خار چبھے تلووں میں لیکن دل کا چھالا پھوٹ گیا

کاش بر آتی دید کی حسرت کون نکالے ایسی صورت
کیوں کر نکلے وہ کانٹا جو دل میں چبھ کر ٹوٹ گیا

دل کے ٹکڑے دیکھ کے اے دلؔ ہنس ہنس کر وہ کہتے ہیں
کس نے توڑا کیسے ٹوٹا توڑ دیا یا ٹوٹ گیا

بہترین معالج....؟

ایک مزاحیہ ڈرامہ دو سین میں

از جناب سید منظر کاظمی بی اے (آنرز) بنارسی

پہلا سین

(خان بہادر شب بیدار خاں کے خوبصورت بنگلہ کا سجا ہوا ملاقاتی کمرہ -

رات کا وقت ہے اور حسب معمول یاران طریقت کا مجمع ہے - شب بیدار خاں نہایت ہی لحیم و شحیم آدمی ہیں جیسا کہ عموماً دولت مند لوگ ہوا کرتے ہیں - اُن کے تقریباً تمام احباب دُبلے پتلے اوسط قد کے آدمی ہیں اور خصوصاً خان بہادر صاحب کے "معیاری موٹاپے" کے سامنے سب دُبلے ہی معلوم ہوتے ہیں)

شب بیدار خاں (جمائی لیتے ہوئے) دوستو! کل شب کو میں اچھی طرح سو نہ سکا - تمام رات بے چینی اور شب بیداری میں گزری -

ریاض خاں - (چہرے پر تفکر کے آثار پیدا کرتے ہوئے) اوہ - تو یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس وقت بھی جماہیاں آرہی ہیں -

احمد علی - لیکن میرے خیال میں تو جناب رات کو اچھی طرح نیند کا نہ آنا یہ ایک مرض ہے جس کو انگریزی میں انسومیا کہتے ہیں - یہ نہایت ہی مہلک قسم کی بیماری ہے اور اس کا معقول علاج فوراً ہی ہونا چاہیئے - اسے معمولی سمجھ کر ہرگز نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔

اچھا میں کل صبح ہی اپنے چچازاد بھائی کو آپکی خدمت میں بھیج دُونگا - وہ ہومیوپیتھک کا ایک تجربہ کار ڈاکٹر ہے -

منشی پیارے لال - لیکن میری عقل ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ اس مرض کے لئے ایلوپیتھک کا علاج زیادہ مفید اور بہتر ثابت ہوگا میرے بھتیجے نے ایلوپیتھک کی پریکٹس شروع کر دی ہے اور ایک بڑا دواخانہ بھی کھول رکھا ہے - خدا کی عنایت سے کافی چل رہی ہے - میں اُس سے کہہ دُونگا کہ وہ صبح ہی آکر حضور کو دیکھ لے -

شب بیدار خاں - نہیں، نہیں - کوئی خاص ضرورت نہیں یہ تو ایک معمولی سی بات ہے میں اکثر راتوں کو جاگا کرتا ہوں کل کی شب بیداری کوئی پہلی ہی تھوڑی تھی -

پیارے لال - اچھا - تو یہ کہئے کہ اب یہ روز کی عادت ہو چکی ہے - یہ تو صاحب بہت ہی بُرا ہے - نہایت ہی خطرناک - آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو رات کو نیند نہ آنے کی عادت پڑ چکی ہے - نہیں صاحب نہیں، دیر ہرگز نہ کیجئے - اس کا فوراً ہی علاج ہونا چاہیئے -

احمد علی - ضرور - ضرور - یقیناً - اور سب سے بڑھ کر علاج ہومیوپیتھک کا ہوگا - آپ تو خود ہی جانتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر ہومیوپیتھک سے بڑھ کر کوئی دوسرا علاج نہیں -

نہ تو لمبی لمبی شیشیاں خالی کرنی ہیں اور نہ کٹورے بھر کر دوائیں نہ بدبودار مکسچر اور انجکشن ۔ بس ایک رتی برابر گولی ایک گھونٹ پانی میں پی لیا اور بس مرض غائب ۔

پیارے لال ۔ لغو ۔ بالکل مہمل ۔ میں تو کبھی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی مریض ہومیوپیتھک سے بھی شفا پا سکتا ہے ۔ یہ تو درحقیقت مریض کی تقدیر اور حیات ہے کہ اچھا ہو جاتا ہے او[ر نا]م ہوتا ہے ہومیوپیتھک کا ۔ ہیں ۔ ایک گھونٹ پانی سے بھلا کیا ہو سکتا ہے ۔

ریاض خاں ۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے منشی جی بہت کچھ ہو سکتا ہے میری بیوی کی آنکھ سے نکلا ہوا آنسو کا محض ایک قطرہ ۔۔ مجھے گھنٹوں ۔۔

شب بیدار خاں ۔ (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا کہنا ہے ۔ خان صاحب آپکے جملے ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ ۔ مذاق کرنے کا حق بس آپ ہی کا ہے ۔

شمیم ۔ (ابھی نوعمر ہے اور ذرا شاعر واقع ہوا ہے) درست ہے ایک قطرہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔ اور آخر یہ تاج محل کیا ہے ارے بھئی شاہجہان کی آنکھ سے گرا ہوا آنسو کا ایک قطرہ اور بس ۔

احمد علی ۔ تو دیکھا آپ نے ۔ پانی کا ایک قطرہ سب کچھ کر سکتا ہے ! خان بہادر صاحب اب آپ بالکل فکر نہ کریں ۔ میں اپنے ہومیوپیتھک بھائی کو کل صبح ہی آپ کے پاس بھیجدونگا ۔

پیارے لال ۔ آپ کا جو جی چاہے کیجئے لیکن (شب بیدار خاں سے) خان بہادر صاحب میں پھر کہے دیتا ہوں کہ اگر مجھے کسی علاج پر کچھ بھروسہ ہے تو وہ ایلوپیتھک ہے اور جناب میرا بھتیجا تو بس ڈاکٹر کیا ہے کہ بس معجزنما ہے اور سچ پوچھئے تو انسومنیا (بیخوابی) کے علاج کے لئے تو وہ پیدا ہی ہوا ہے ۔ ارے جناب کل ہی تو وہ اسی مرض کے متعلق ایک بہت ہی ضخیم کتاب پڑھ رہا تھا ۔ اگر آپ مبالغہ نہ سمجھیں تو میں عرض کروں کہ اس قدر وزنی اور موٹی کتاب تھی کہ اگر کسی کے سر پر گرے تو سر ہی پھٹ جائے ۔

احمد علی ۔ ایلوپیتھک کی کڑوی مکسچر اور انجکشن سے تو بس خدا ہی بچائے میرے تو خیال ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اور جناب ہومیوپیتھک میں نہ مکسچر اور نہ انجکشن ۔

پیارے لال ۔ لیکن انجکشن نہ لگا کر مر جانے سے انجکشن لگا کر [illegible] بہتر ہے ۔

رشید ۔ لیکن حضرات شائد آپ صاحبان کو یہ معلوم نہیں کہ ان دنوں پانی کے ذریعہ علاج کرنے کا طریقہ بہت ہی ترقی کر رہا ہے ۔ کوئی بھی دوا نہیں ۔ پانی اور بس پانی ۔ اب آپ ہی غور کریں کہ یہ طریقۂ علاج کس قدر دلچسپ ہے ۔۔۔ اور ہاں شائد کل ہی تو یا پرسوں میں نے "اسٹیٹس مین" میں ایک اشتہار دیکھا تھا ۔ کہ ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ وہ پانی کے ذریعہ بے خوابی کے مرض کا شرطیہ علاج کرتا ہے ۔

ریاض خاں ۔ کیا بتلایا آپ نے ! پانی سے علاج ؟

رشید ۔ جی ہاں ! اور اگر آپ اس علاج کا انگریزی نام جاننا چاہتے ہیں تو اسے انگریزی "ہائیڈرو پیتھی" کہتے ہیں ۔ میرے خیال میں تو خان بہادر صاحب آپ ہائیڈرو پیتھی کا علاج کریں وہ یقیناً مفید ثابت ہوگا ۔ اس کے ڈاکٹروں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ نوّے فیصدی مرض کا علاج شرطیہ کرتے ہیں ۔

ریاض خاں ۔ لیکن پھر بھی تو دس فیصدی قسم کے مریض ہونے کا خطرہ باقی رہتا ہے ۔ نہیں ۔ نہیں میرے خیال میں تو خان صاحب آپ کو آفتاب کی کرنوں کے ذریعہ اپنا علاج کرانے سے یقیناً فائدہ ہوگا اور لطف تو یہ ہے کہ آپ کو ایک پیسہ خرچ بھی نہیں کرنا ہوگا ۔ صرف ایک گھنٹہ سورج کی کرنوں سے غسل کر لیا کیجئے اور بس ۔ مجھے اسی طریقہ سے گٹھیا سے آرام ہوا تھا ۔

پیارے لال ۔ ریاض صاحب یہ روپیہ پیسہ کا سوال تو آپ نے بیکار

ہی کو درمیان میں ٹھونس دیا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔ کہ ہمارے خان بہادر صاحب نہ تو کنجوس ہیں اور نہ کبھی اخراجات وغیرہ سے احتراز کرتے ہیں۔

رشید۔ اور دوسرے یہ کہ آپ آخر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آفتابی غسل آپکی گٹھیا کے لئے مفید ثابت ہوا تو خان بہادر صاحب کو بھی اس سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں گٹھیا اور شب بیداری دو مختلف مرض ہیں۔

احمد علی۔ یقیناً قطعی مختلف اور پھر ریاض صاحب یہ آپ نے کیسے تصور کر لیا کہ خان بہادر صاحب دھوپ میں دیر تک کھڑے رہ سکیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ شب بیداری کے مرض کا علاج کرنے کے ساتھ ہی ساتھ کسی دوسرے مہلک مرض میں گرفتار ہو جائیں۔ آپ ہی فرمائیں خان بہادر صاحب کیا آپ دھوپ میں کچھ دیر تک کھڑے ہو سکتے ہیں۔

شب بیدار خاں۔ ارے نہیں بھئی نہیں۔ میں تو اگر ایک منٹ بھی دھوپ میں کھڑا ہوا کہ بس پسینہ میں شل ہو گیا۔

احمد علی۔ ہاں جناب میں تو یہ سمجھتا ہی تھا۔ آپ کے ڈیل ڈول کا آدمی ہرگز دھوپ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہاں ریاض خان صاحب ایسا دبلا پتلا آدمی البتہ دھوپ میں کچھ دیر ٹک کر سورج کی ابتدائی کرنوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جگہ کی کمی ہونے کی وجہ سے دھوپ کافی نہ ٹھیر سکے گی۔

رشید۔ تو یہ طے ہو گیا کہ آفتاب کے ذریعہ علاج کرنے سے پانی کا علاج کہیں مفید اور بہتر ہے۔

ریاض خاں۔ لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ وہ پانی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

رشید۔ ارے بھئی۔ یہ بھی کوئی جاننے کی بات۔ ہے کم سے کم خان بہادر صاحب روزانہ غسل فرماتے ہی ہوں گے۔ کیوں خان بہادر صاحب!

شب بیدار خاں۔ ہاں میں روزانہ نہانے کا عادی ہوں۔ اور جاڑے کے دنوں میں بھی بلا ناغہ غسل کرتا ہوں۔

رشید۔ اور میرے خیال میں خان بہادر صاحب بغیر پانی کے تو ہرگز نہ نہاتے ہوں گے کیوں ریاض خان صاحب!

پیارے لال۔ لیکن صاحب اس پانی کے طریقۂ علاج پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ ابھی کچھ ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک شخص نے پانی کے علاج پر بھروسہ کیا اور ایک ہی ہفتہ میں اس کا لڑکا مر گیا۔

رشید۔ مگر یہ واقعہ پانی کے علاج کے خلاف تو کوئی ثبوت نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ پانی کے علاج کی وجہ سے وہ لڑکا ایک ہفتہ اور زندہ رہ گیا ہو ورنہ شائد اس موت سے پہلے ہی مر جاتا۔

ولی صاحب۔ لیکن خان بہادر صاحب اگر آپ میری سنیں تو میں یہ کہوں گا۔ کہ آپ کے لئے بہترین علاج یہ ہوگا کہ آپ کوئی پیٹنٹ دوا استعمال کریں۔ کسی آزمودہ اور تجربہ کار ڈاکٹر کی پیٹنٹ دوا۔ میری مشہور "تمام شفا گولیاں" آپ صرف ایک ماہ تک استعمال کر کے دیکھیں۔ شرطیہ فائدہ ہوگا ورنہ قیمت واپس اور قیمت صرف مبلغ دس روپے۔ لیکن نہیں، نہیں میں آپ سے ایک پیسہ بھی قیمت نہ لوں گا۔

احمد علی۔ لیکن معاف کیجئے گا ولی صاحب! مجھے دوستوں کے ساتھ آپکی یہ کاروباری پالیسی بالکل پسند نہیں۔

ولی صاحب (ذرا ترشی سے) یہ کیا لغو مذاق ہے۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہو آخر میں نے کب کہا کہ میں قیمت لوں گا۔

احمد علی۔ ہاں آپ نے صاف صاف ہرگز نہیں کہا لیکن در پردہ آپ یقیناً قیمت چاہتے ہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہمارے خان بہادر صاحب حد درجہ کے خوددار واقع ہوئے ہیں۔ بھلا وہ آپ کی گولیاں کبھی بلا قیمت قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ . . . . . . !

ولی صاحب (بات کاٹ کر) نہیں۔ نہیں بخدا اس میں میری
کوئی بھی پالیسی ہرگز نہیں ہے۔ میں تو ایک مخلص دوست
کی حیثیت سے انھیں ...... !

احمد علی ۔ ہاں۔ ہاں اب تو آپ مخلص اور شفیق سب ہی قسم کے دوست
بننگے۔ اب تو بھانڈا پھوٹ گیا نہ۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ
جب ذرا سا بھی موقع ملا کہ آپ اپنی "تمام شفا گولیاں" لئے
کھڑے ہو گئے۔ ذرا تھوڑی دیر کے لئے خود ہی غور کیجئے
کہ بھلا کوئی بھی ایسا بیوقوف ہے کہ یقین کرلے گا کہ ایک
گولی دُنیا کے تمام امراض کے لئے یکساں طور پر مفید ہوسکتی
ہے اور پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ میں کاروباری پالیسی نہیں
برت رہا ہوں۔

ولی صاحب ۔ ہرگز نہیں قطعی نہیں۔ پالیسی اور ذلیل پالیسی تو
آپ برت رہے ہیں۔ آپ یقیناً اپنے چچا زاد بھائی سے
کمیشن پاتے ہیں اور جب ہی آپ خان بہادر صاحب کو
ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ ہومیوپیتھک کا علاج کریں۔

احمد علی ۔ ذرا بات سمجھ کر بولئے۔ میں کہتا ہوں میں ہرگز ایسی باتیں
برداشت نہیں کرسکتا ایسی) .... (غصہ میں اُس کے ہونٹ
کانپنے لگتے ہیں)

شب بیدار خاں ۔ خدا کے لئے آپ لوگ آپس ہی میں نہ لڑیں
یہ کوئی لڑنے کی جگہ تو ہے نہیں۔ آخر آپ لوگ کیوں
بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔

سب ۔ آپ لوگ خاموش رہیں۔ آپ لوگ خاموش رہیں۔ خان
بہادر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ صاحبان خاموش
ہو جائیں۔

شب بیدار خاں ۔ دوستوں کو آپس میں ہرگز نہ لڑنا چاہئے۔

پیارے لال ۔ واقعی کس قدر قابلِ افسوس بات ہے۔ خان بہادر
صاحب آپ ان لوگوں کے جھگڑے کو یوں ختم کر دیجئے
کہ پیٹنٹو پیتھی اور ہومیوپیتھی دونوں کو چھوڑ کر ایلوپیتھی کا علاج
کیجئے میں کل صبح ہی اپنے ایلوپیتھک بھتیجے کو آپ کے

پاس بھیجدوں گا۔

رشید ۔ ہائیڈروپیتھی کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا جناب؟

احمد علی ۔ اور خان بہادر صاحب ہومیوپیتھک کے بارے میں
آپ کا کیا خیال ہے؟

ولی صاحب ۔ آپ میری "تمام شفا گولیاں" نہایت ہی اطمینان
سے استعمال کریں وہ نہایت ہی خوش ذائقہ اور میٹھی
بھی ہیں۔

پیارے لال ۔ کمال کیا آپ نے ولی صاحب۔ ارے بھئی خان
بہادر صاحب کیا کوئی بچے ہیں جو آپ مٹھائی کا نام لیکر
پھسلا رہے ہیں۔

احمد علی ۔ (مذاقاً) خوش ذائقہ اور میٹھی ۔ اہا۔ ہا بھئی واہ۔ اب میں سمجھ گیا
یقیناً یہ گولیاں محض چینی کی ٹکیاں ہیں۔ خوب بیس روپے
محض چینی کی ٹکیوں کے لئے۔

ولی صاحب (غصہ سے) میں کہتا ہوں احمد صاحب بس اب
خاموش ہو جائیے یہ ایک شریف آدمی کی کھلی ہوئی توہین ہے

شب بیدار خاں ۔ ارے صاحبو! پھر وہی بے وقوفی تم لوگ
بیکار کو رائی کا پہاڑ بنا رہے ہو۔

شمیم ۔ اور اس پہاڑ پر ایک دوسرے کا سر توڑ دینا چاہتے ہیں

شب بیدار خاں (شمیم کے مذاق کا لطف لیتے ہوئے) کیا کہنا
ہے۔ بھئی واقعی شاعر ہو۔ واللہ کیا بات کہی ہے۔

شمیم ۔ اگر حضور اجازت دیں تو کچھ اس سے بھی بہتر کہوں۔

شب بیدار خاں ۔ ہاں۔ ہاں کہو ضرور کہو۔

شمیم ۔ تو میں یہ کہونگا کہ جب کبھی مجھے نیند نہیں آتی تو بس میں اپنی
آنکھوں کو بند کر لیتا ہوں۔ اس طرح سے پھر میں تصور کرتا
ہوں کہ میں ایک پرستان میں پہونچ گیا ہوں۔ ایک خوشنما
باغ میں کھڑا ہوں۔ خوبصورت چھوٹی چھوٹی چڑیاں
شاخوں پر چہک رہی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔

پیارے لال ۔ بس شاعر صاحب بس۔ ورنہ میں مارے ہنسی کے
مرجاؤں گا۔ بھئی واہ۔ اب آپ شاعری سے افسوسیا

یا شب بیداری کے مرض کو اچھا کرنا چاہتے ہیں۔

قمر - خان بہادر صاحب ابھی تک میں نے کچھ نہیں کہا ہے لیکن اجازت دیجئے تو میں بھی کچھ عرض کر دوں۔ دیکھئے شب کو نیند نہ آنے کی وجہ دماغ کی خشکی ہے جب دماغ پر کسی قسم کا بوجھ ہو یا کوئی فکر ہو تو خیالات بٹ جاتے ہیں اور نیند نہیں آتی۔ یہ دماغی بیماری ہے جسمانی نہیں۔ میرے خیال میں آپکو دماغی مسہل لینے کی ضرورت ہے۔

نسیم - بہت درست ہے۔ یقیناً آپکو دماغی مسہل کی ضرورت ہے اور دماغی مسہل سوائے مسمریزم کے ماہر کے اور کون دے سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو مسمریزم پر اعتبار ہے۔ کیوں خان بہادر صاحب؟

شب بیدار خاں - یقیناً۔ مجھے اس پر کافی اعتماد ہے۔

نسیم - بہت خوب کل میں اپنے دوست پروفیسر عارف مشہور ماہر مسمریزم کو آپ کے پاس بھیجدونگا اور وہ یقیناً مسمریزم سے آپ کے شب بیداری کے مرض کو دور کر دیں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ میں دعوے کے ساتھ مسمریزم سے تپ دق کے مریض کو بھی اچھا کر سکتا ہوں۔

پیارے لال - لغویات نہ بکئے۔

نسیم - آپ اپنی مہمل گفتگو رہنے دیجئے۔

شب بیدار خاں - میں دیکھتا ہوں کہ آج شب کی محفل آپ لوگ لڑ لڑ کر خراب کر دینگے۔ آئیے ہم لوگ کوئی اور دلچسپ بات کریں۔ خانصاحب کوئی قصہ وصہ کہئے۔

رشید - نہیں خان بہادر صاحب ہم لوگ ہرگز کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔ جب کہ ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کو بے خوابی کا مہلک مرض ہے۔

نسیم - بہت درست ہے اور یہ مرض ہرگز نہ جائیگا جب تک پروفیسر عارف آ کر مسمریزم سے اس کا علاج نہ کرینگے۔ میں انھیں کل ہی بھیجدونگا۔

احمد علی - اپنے دوست کو یہاں بھیجنے کے بدلے جہنم میں بھیجدیجئے ایسے ایسے مسمریزم جاننے والے بہت دیکھے ہیں۔

نسیم - اور تم اپنے چچازاد بھائی کو یہاں بھیجنے کے بجائے جہنم میں بھیجدو ہم نے بھی ایسے ایسے ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر بہت دیکھے ہیں۔ جیہ پدی اور جیہ پدی کا شوربہ۔

شب بیدار خاں - پھر آپ لوگ لڑنے لگے آخر آپ لوگ خاموش نہ ہوں گے۔ اچھا تو لیجئے۔ شب بخیر۔ میں اب نہیں رک سکتا۔ شب بخیر صاحبو (چلا جاتا ہے) (سب ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں)

دوسرا سین

اُسی کمرے میں دوسرے دن نو بجے۔ (کوئی ایک درجن کے قریب آدمی شب بیدار خاں کا انتظار کر رہے ہیں۔ روزگار خاں داخل ہوتا ہے۔ یہ خان بہادر شب بیدار خاں کا سب سے بڑا لڑکا ہے اور ڈیل ڈول شکل وصورت میں بالکل ہی اپنے باپ کی نقل ہے۔ سب لوگ اسے سلام کرتے ہیں اور وہ مسکرا کر سب کا جواب دیتا ہے)

روزگار خاں - آپ حضرات کہاں سے تشریف لائے اور کس سے .... ؟

ہومیوپیتھک کا ڈاکٹر - (بات بھی ختم نہیں ہونے دیتا) ہم لوگ مختلف جگہوں سے حاضر ہوئے ہیں۔ میں تو اس وقت محلہ شام پور سے آ رہا ہوں۔ جہاں میں ایک ہیضہ کے مریض کو دیکھنے گیا تھا مسٹر احمد نے۔ مجھے بتلایا ہے کہ آپ کو ان دنوں انسومیا یا شب بیداری کی شکایت بہت زیادہ ہے۔

روزگار خاں - کیا کہا۔ انسومیا شب بیداری کی شکایت اور مجھے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کو کچھ غلط فہمی تو نہیں ہوئی

ایلوپیتھک کا ڈاکٹر - مجھے منشی پیارے لال صاحب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ جو اتفاق سے میرے چچا ہوتے ہیں ہاں یہ دیکھئے آپ کے چہرے پر انسومیا کی علامتیں صاف ظاہر ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ بہت فاسد

مرض ہے۔ دیکھئے نا آپ کی آنکھوں میں کس قدر خُمار کی لہر
ہے۔ آپ فوراً ہی اس کا معقول علاج کیجئے۔ ورنہ آیندہ
آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ ذرا ادھر آئیے۔ میں سب سے پہلے
آپ کے دل کا معائنہ کروں گا (قریب جاتا ہے)
روزگار خاں۔ لیکن جناب، ذرا ٹھیریئے۔ سنیئے تو۔ بات در اصل
یہ ہے۔۔۔۔۔
پروفیسر عارف۔ (بات کاٹ کر) ہاں مجھے خود یقین ہے کہ آپ
نے میرا نام ضرور سُنا ہوگا۔ اگر نہیں سُنا ہے تو اب سُن لیجئے
میں اپنا تعارف خود آپ سے کراتا ہوں۔ میں مشہور و معروف
پروفیسر عارف ہوں مسمریزم کا بہترین ماہر اور اُس کے ذریعہ
ہر مرض کا شرطیہ علاج کرنے والا (اِدھر اُدھر دیکھ کر) لیکن
یہ کمرہ مناسب نہ ہوگا۔ یہاں کافی مجمع ہے۔ مسمریزم کے ڈاکٹر
اور مریض دونوں کو علیحدہ ایک کمرہ میں تنہا ہونا چاہیئے۔
(کچھ سوچ کر) ہاں یہ کمرہ بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ
آپ حضرات یہاں سے تشریف لے جائیں۔ کیا آپ لوگ
مہربانی کر کے چلے جائینگے۔
سب۔ تمہارا جہاں جی چاہے خود چلے جاؤ۔
مُغنی۔ (اس کے ہاتھ میں ایک بکس ہے جس پر "قیانوسی دواخانہ
اجمیر" لکھا ہوا ہے اور یہ خود اسی دواخانہ کا ایجنٹ ہے) کسی کو
بھی کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ سب یہیں موجود رہیں۔
(بکس کھولکر) ذرا اِن تمام "شفا گولیوں" کا حیرت انگیز اثر
ملاحظہ کیجئے۔ شب بیداری کی بہترین دوا ہے اور تین شیشیوں
کے خریدار کو ہم ایک دلچسپ جاسوسی ناول بھی دیتے ہیں۔
مفت۔ بالکل مفت۔
روزگار خاں۔ آپ تشریف لے جائیں اور فرصت کے وقت
خود ہی تمام ناولیں پڑھ ڈالیں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔
ہائیڈروپیتھی والا۔ میں عرض کرتا ہوں جناب کہ انسومیا کے مرض
کے لئے پانی کے علاج کے علاوہ اور کوئی دوا ہے ہی
نہیں۔ یہ سب سے مناسب اور بہترین ہے۔

(ایک نوعمر شخص سُوٹ میں ملفوف داخل ہوتا ہے
اس کے ہاتھ میں ایک چھپا ہوا فارم ہے اور ایک فونٹین پن)
روزگار خاں سے مخاطب ہو کر:-
نووارد۔ یہ لیجئے جناب۔ میں ڈاکٹر فی۔ فاشون کے ہسپتال سے
حاضر ہوا ہوں۔ اتفاق سے ہمارے انسومیا وارڈ میں صرف
ایک ہی مریض کی جگہ خالی ہے۔ یہ لیجئے فارم اور آج ہی
داخلہ کرا لیجئے۔
روزگار خاں۔ لیکن حضرت مجھے انسومیا وغیرہ ہرگز نہیں ہے۔
نووارد۔ (کھسیانی ہنسی ہنسکر) آپ کا خیال بالکل درست ہے۔
لیکن یہ دن کا وقت ہے۔ آپ کو شب میں البتہ معلوم ہوگا
کہ آپ کس حد تک اس مہلک مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ
کو شاید معلوم نہیں یہ رات کی بیماری ہے۔ پھر بھلا آپ کو
اس وقت دن میں کیسے معلوم ہو سکتا ہے (روزگار خاں
فارم پھاڑ دیتا ہے) ارے ارے۔ آپ نے فارم پھاڑ
دیا۔ اچھا خیر۔ کوئی حرج نہیں میں جا کر دوسرا فارم لاتا
ہوں۔ اس درمیان میں آپ خوب غور کر لیں (چلا جاتا ہے)
نہال۔ جناب عالی! میں ہندوستان کے اس واحد دواخانہ سے
حاضر ہوا ہوں جو دُنیا کے ہر گوشہ کے مریضوں کا علاج
گھر بیٹھے ڈاک کے ذریعہ کرتا ہے۔ اور آپ خاطر جمع رکھیں
تمام خط و کتابت صیغۂ راز میں رہے گی۔ میں اس کا وعدہ
کرتا ہوں۔ یہ لیجئے اس پر دستخط کر دیجئے۔
پروفیسر عارف۔ ڈاک کے ذریعہ علاج بھی واللہ کیا جدت ہے
میں نے اس سے زیادہ مہمل بات آج تک نہیں سُنی۔
میرے خیال میں تو پہلے آپ ڈاک کے ذریعہ خود اپنے
دماغ کا علاج کرائیں۔
(ایک دوسرا شخص آگے بڑھتا ہے) جناب میں شکارپور
کا مشہور و معروف حاذق حکیم مولوی باقل بوس چقندری
ہوں۔ پوری ستائیس پیڑھی سے میرے باپ دادا حکمت
کرتے چلے آئے ہیں اور میں اُن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ

محض اڑھائی دن میں آپ کے شب بیداری کے مرض کو رفو چکر
کر دونگا میرا یہ معجون.....

روزگار خاں ۔ لیکن حکیم صاحب.....!

(ایک شاہ صاحب قسم کے بزرگ داخل ہوتے ہیں) صاحبان!
میں اشتہاری حکیم ہوں اور نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں
آپ نے شیخ واہیات خاں مشہور عامل کا نام تو ضرور ہی سنا
ہوگا ۔ اس وقت میرے تعویذ اور گنڈے دنیا تو کیا تمام
ہندوستان میں پھیلے ہوتے ہیں ۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو شب
بیداری کے مرض کی شکایت ہے اور میرے پاس اس مرض کے
لئے ایک زبردست تعویذ ہے کتنی ہی ضدی اور اڑیل قسم
کی شب بیداری کی بیماری کیوں نہ ہو ۔ مگر اس سے فائدہ ضرور
ہوگا ۔ بہت ہی سریع التاثیر اور لطف یہ ہے کہ بہت
ہی سستی ۔ صرف ساڑھے پانچ آنے کی ایک تعویذ (جیب سے
ایک ٹکڑہ ناڑہ اور تعویذ نکالتے ہوئے) ذرا اپنا بائیاں بازو
تو بڑھایئے ۔

روزگار خاں ۔ لیکن قبلہ آپ کرینگے کیا یہ تو بتلائیے ۔

شاہ صاحب ۔ میں یہ تعویذ آپ کے بازو پر باندھ دونگا ۔ آپ
فکر نہ کریں ۔ اس ناڑہ اور باندھنے کی قیمت میں کچھ نہیں
لیتا ۔ لائیے چاہے بایاں ہاتھ دیجئے چاہے دایاں ۔

پروفیسر عارف ۔ کوئی بھی نہیں نہ بایاں اور نہ دایاں ۔ یہ تعویذ
اور گنڈے محض لغو اور بے ہودہ باتیں ہیں ۔ بالکل مہمل صرف
جاہل اور بے وقوف اس پر ایمان رکھتے ہیں ۔

شاہ صاحب ۔ (روزگار خاں سے) میں درخواست کرتا ہوں کہ
آپ اس پر اعتبار اور ایمان رکھیں ۔

عارف ۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہو کہ میں درخواست
کرتا ہوں کہ ذرا بیوقوف بن جایئے" چہ خوش اس طرح ایک
معزز اور شریف آدمی کی ہم لوگوں کے سامنے بے عزتی اور
توہین کر رہے ہو ۔ یہ بدتمیزی اور میرے سامنے ۔ پروفیسر
عارف کے سامنے ۔ اگر میں نے ابھی مارے گھونسوں کے
تمہارے دانت پیٹ میں نہ پہنچا دیئے تو آج سے اس
مسمریزم کو قطعی چھوڑ دونگا ۔ (شاہ صاحب کی جانب
لپکتا ہے اور وہ دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں)

عارف ۔ دیکھا آپ نے ۔ دیکھا ۔ بھاگ گیا نا ۔ چور ۔ ٹھگ ۔
بدمعاش ۔ ڈرپوک (روزگار خاں سے مخاطب ہوکر)
آیئے جناب اب زیادہ دیر نہ کیجئے ۔ یہ لوگ نہیں جانتے
ہیں تو آیئے ہم آپ دوسرے کمرے میں چلیں ۔ آیئے
مسمریزم سے......

نہال ۔ پروفیسر صاحب اب مسمریزم کو قطعی چھوڑ دیجئے ۔

عارف ۔ کیوں ؟ کس لئے ؟ کیوں ؟ ۔

نہال ۔ میں کہتا ہوں اب ہمیشہ کے لئے مسمریزم چھوڑ دیجئے ۔

عارف ۔ آخر جناب کیوں ۔ کوئی وجہ بھی یا یونہی ۔

نہال ۔ کیا خود آپ نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ آپ مسمریزم قطعی
چھوڑ دیں گے ۔ آپ شاہ صاحب کے دانت توڑنے
میں ناکامیاب رہے ۔

عارف ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ لیکن میں کوئی سنجیدگی سے تھوڑا ہی کہہ
رہا تھا ۔ وہ تو محض مذاق تھا ۔

نہال ۔ تو پھر بڑی مشکل ہے جناب ۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی معلوم
کر سکے کہ کب آپ سنجیدگی سے بات کرتے ہیں اور کب
مذاقاً کہہ رہے ہیں ۔ اور جب یہ حالت ہے تو پھر خان
صاحب کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ آپ جو یہ کہہ رہے
ہیں یا یونہی مذاق سے ۔ اب آپ ہی بتلایئے ایسے آدمی
پر کون بھروسہ کر سکتا ہے ۔

عارف ۔ کیا کہا ۔ ذرا پھر تو کہیئے گا ۔ اچھا ۔ اچھا ۔ آج انشاء اللہ
مشہور زمانہ پروفیسر عارف آپ کو بھی ایک کبھی نہ بھولنے
والا سبق سکھلا کر چھوڑے گا ۔ (آگے بڑھتا ہے)

نہال ۔ (تن کر) اجی رہنے بھی دیجئے یہ بندر بھبکیاں ۔ میں کوئی
شاہ صاحب تھوڑا ہی ہوں جو ڈر کر بھاگ جاؤں گا ۔
میں بھی سبق سکھلانا جانتا ہوں ۔ لیجئے آج بلا فیس

سکھلائے دیتا ہوں۔

روزگار خاں۔ مہربان حضرات۔ آپ لوگ اپنے سبق باہر جا کر سیکھیں اور سکھلائیں۔ اور مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ آپ فیس لیں یا بلا فیس سکھلائیں۔

(عارف اور رہنال ایک دوسرے کی طرف ان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ گویا یہ حقیقت اُن پر بھی پہلی بار ظاہر ہو رہی ہے)

روزگار خاں۔ خیر اب کافی مذاق ہو چکا۔ اب آپ لوگ خدا کے لئے میری جان بخشی فرمائیے۔ میرے ناشتہ کا وقت ہو گیا ہے

سب۔ لیکن آپ کے علاج کا وقت؟

روزگار خاں۔ ارے بھائی۔ مجھے کسی علاج کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے ہرگز کوئی مرض نہیں۔ میں رات کو خوب میٹھی نیند سوتا ہوں۔

ہومیو پیتھک کا ڈاکٹر۔ لیکن جناب سنیئے تو۔ احمد صاحب نے مجھ سے صاف صاف کہا تھا۔ کہ اُن کے دوست خان بہادر شب بیدار خاں آجکل شب بیداری کے مرض میں مبتلا ہیں اور ...

روزگار خاں۔ اور بات یہ ہے کہ احمد صاحب کے دوست میرے والد صاحب ہیں۔ میرا نام روزگار خاں ہے میں شب بیدار خاں کا لڑکا ہوں۔

ایلوپیتھک والا۔ اچھا۔ تو کیا آپ تکلیف فرما کر ان کو بلا سکتے ہیں۔

روزگار خاں۔ میں ضرور بلا دیتا لیکن وہ صبح چار ہی بجے موٹر سے کہیں چلے گئے ہیں۔ شائد آپ ہی حضرات سے پیچھا چھڑانے کیلئے۔

عارف۔ تو آپ نے ہم لوگوں کو یہ پہلے ہی بتلا دیا ہوتا۔ ہم لوگوں نے بیکار کو اس قدر وقت ضائع کیا۔

ہومیو پیتھک والا۔ میرے بھی کس قدر مریض واپس چلے گئے ہونگے۔

ایلوپیتھک والا۔ واقعی بیکار کی دردسری رہی (سب ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں)

لطفِ کلام

(از جناب لطیف انور صاحب گورداسپوری)

مرمر کے جسے حاصلِ انجام کیا تھا
ہستی کو اسی درد نے بدنام کیا تھا

ہر ذرّے کو خواہش ہے بنے دیدۂ بینا
کیوں تو نے کبھی جلوہ سرِ بام کیا تھا

کس طرح یہاں کھلتی غمِ دل کی حقیقت
کیا جانے کوئی آہ نے کیا کام کیا تھا

اے صاحبِ میخانہ مجھے یاد ہے ابتک
جب ہنستے ہوئے میری طرف جام کیا تھا

اُس کفر میں شامل ہو مری نغمہ سرائی
جس کفر کو زینت دہِ اسلام کیا تھا

کیا کہیے اگر قسمتِ خوابیدہ نہ جاگے
نالہ تو بہت اے دلِ ناکام کیا تھا

کیا ذکر اٹھائیں دلِ گم گشتہ کا انور
کچھ روز مرے پہلو میں آرام کیا تھا

"تصویر سے"

(از جناب آرزو سہارنپوری)

مجسمے! محبت کی حسین تفسیر ہی میں ہوں
نگاہوں سے فریبِ رنگ و بو برسا رہا ہوں میں
سکوتِ خامشی میں جذب ہے احساس کا عالم
میں کہتا ہوں کہ ظالم جسکا تو اک عکسِ عریاں ہے
خموشی سے بھی میں تیری سبق لیتا ہوں فطرت کا
ترے صدقے بتا! کوزے میں کیونکر بند ہے دریا
نظر کو جنبشیں دیکر پریشانِ نظر کر دے
حجابِ ظاہری کو توڑ کر باہر نکل بھی آ،
دکھا بھی دے ذرا رنگِ محاکاتِ جبیں اپنا
بتا دے عقدۂ قانونِ تسلیم و رضا مجھ کو
سکوتِ خاص کی فطرت کو سازِ گفتگو کر دے
خبر بھی ہے تری خاموشیوں کا مدّعا ہو نہیں

مری خلوت ہی خلوت میں مری تصویر ہی میں ہوں
عروجِ حسرتِ نظّارہ پر اترا رہا ہوں میں
تری تصویر سے کہنے چلا ہوں داستانِ غم
وہ کافر میرے قلب و روح کی خلوت میں پنہاں ہے
سکوتِ ساز بھی گویا ہے اک نغمہ محبّت کا
نکل آ لیکے انگڑائی حجابِ کاغذی کیسا؟
مرے اجزائے دل کو گیسوؤں نے منتشر کر دے
یہاں خلوت میں میری کون ہے پردا ہی کیسا!
مری ہر ہر رگِ جاں میں سمو دے معنوی جلوہ
سمجھ لے تو فقط اپنا پرستارِ وفا مجھ کو
نگاہوں سے ذرا فرقت کے زخموں پر رفو کر دے
نظر کے چند رنگیں آئینوں میں گھر گیا ہوں میں

مگر تو داد ذوقِ انتہائے دید کیا دے گی
دماغِ عاشقی تجھ کو۔ نہ تجھ میں حسنِ گویائی!

بے وفا

ایک بیحد دلچسپ افسانہ!

(از جناب جمیل احمد صاحب کندھائیہوی بی اے)

(۱)

کلکتہ سے دارجلنگ پہنچے ہوئے مجھے اب تین ہفتے گزر چکے تھے بھابی جان کی صحبت اور پھر دارجلنگ جیسی پُرفضا جگہ، جسے اگر مشرقی جنت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی۔

ایک روز ہم یونہی گراموفون بجا رہے تھے۔ کہ بھابی جان نے سینما چلنے کی تجویز پیش کی کہنے لگیں تم تو اب تک یہاں کے سینما نہیں گئے۔ آج تماشہ بھی اچھا ہے، گرٹیا گاربو نے ہیروئین کا پارٹ کیا ہے! چلو گے دیکھنے؟

—— میں نے رضامندی ظاہر کی تو بھائی صاحب کی رائے دریافت کی گئی اور جب انہوں نے بھی ہم خیالی کا ثبوت دیا تو بھابی جان صدر مجلس کی طرح بولیں —— "تو پھر جلد تیار ہو جاؤ! زیادہ وقت نہیں تماشہ چھ بجے ہی شروع ہو جاتا ہے"۔ الغرض جلد جلد تیار ہو کر ہم سینما پہنچے لیکن تماشہ شروع ہو چکا تھا میں نے لپک کر تین ٹکٹ خریدے اور ہال کے اندر قدم رکھا۔ مگر اب جو نظر دوڑاتا ہوں تو یہاں سے وہاں تک صرف سر ہی سر نظر آتے تھے کہیں تل دھرنے کی جگہ بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے گیٹ کیپر سے کہا "جگہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ آخر بیٹھوں کدھر؟" اس نے پورے درجہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کہا —— "وہ دیکھئے اس کنارے میں تین چار کرسیاں خالی پڑی ہیں"۔ تاریکی میں بصد دقت ہم وہاں پہنچے۔ پہلے بھابی جان کو بٹھایا۔ پھر بھائی صاحب کو اور سب سے اخیر میں خود بیٹھنے لگا لیکن ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ جاپانی گڑیا کی طرح میں بجلی کی سرعت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پیچھے سے آواز آئی "احمق! بیوقوف!"...... اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل غلطی تھی [illegible] بزرگوں کو بٹھانے میں یہ بھول گیا کہ دائیں جانب کی کرسی خالی پڑی ہے یا اس پر کوئی صاحب جلوہ افروز ہیں۔ پس جلدی سے "معاف فرمائیے" کہہ کر بغل والی کرسی پر بیٹھ گیا لیکن ہمنشین کے الفاظ "احمق! بیوقوف" آس پاس کے سب لوگوں نے سُن لئے تھے اور اب یہ نوکیلے کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھے جا رہے تھے سامنے پردۂ سیمیں پر گرٹیا گاربو اپنی سحر خیز اداؤں سے پبلک کو گرویدہ بنا رہی تھی ...... لیکن میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ انٹرول کے وقت جب میرا ہمنشین اور آس پاس کے لوگ مجھے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھیں گے تو میں کس قدر ذلت محسوس کروں گا۔ وہ تو کہیئے ابھی تاریکی غالب تھی اس لئے عزت بچی ہوئی تھی۔ ورنہ اگر روشنی اپنی خیرہ کن اداؤں کے ساتھ جلوہ افروز ہو جاتی تو پھر سوائے ذلت و رسوائی کے اور کیا —— ! ایک بار خیال آیا کہ سگرٹ پینے کے بہانے سے نکل کر بھاگ جاؤں لیکن پھر تہذیب مانع ہوئی اور اٹھنا دشوار معلوم ہوا۔

اسی کشمکش کی حالت میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ کہنے کو تو میں بھی ہال کے اندر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا لیکن قسم لے لیجئے جو ایک منظر بھی آنکھوں کے سامنے آیا ہو۔ بس یکایک پردے پر انٹرول کا بلاک دیکھا جس کا استقبال بجلی کی خیرہ کن روشنی نے کیا۔ میں اس طرح سہم گیا۔ جیسے بلی کو دیکھ کر غریب خستہ حال کبوتر! بس یکایک ایک خیال بجلی کی طرح سرعت سے میرے دماغ میں آیا اور میں نے اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کر لیں! اس غرض سے کہ کچھ نہ دیکھ سکوں اور کچھ نہ سُن سکوں لیکن بغل سے ایک شخص نے کہا "ارے یار شوکت!" لیکن یہاں تو کان بند تھے۔ سنتا کون؟ ہمنشین

نے دوبارہ اپنا جملہ دہرایا لیکن اسے بھی صدا بصحرا ثابت ہوتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی ہے۔ اور زور سے میرا بازو پکڑ کر کہا "بیوقوف! یہ جگہ سونے کی ہے؟" ـــــ یہ الفاظ نہ جانے کس طرح میرے کانوں کے پار ہوگئے اور ہمنشین کو اس کی بدتہذیبی اور بدزبانی کا مزہ چکھانے کی غرض سے جو نظر اوپر کی تو بے اختیار میری زبان سے نکلا ـــــ

"ارے یار عمانوئیل! تم یہاں کہاں؟"

"جدھر تم" اس نے عجیب شرارت آمیز شوخی سے کہا۔

آس پاس کے لوگ حیرت سے ہمارا منہ تک رہے تھے اور میں خوش تھا۔ کہ خیر ذلت سے تو بچ گیا کیونکہ میرا دوست عمانوئیل ہی تھا۔ جس نے ایک گھنٹہ قبل احمق اور بیوقوف جیسے الفاظ سے میری تواضع کی تھی۔

اس کے بعد ہم دونوں نے انتہائی جوش سے مصافحہ کیا۔ پھر ادھر ادھر کی دو چار باتیں کیں۔ کچھ ایام رفتہ کی بھولی بسری باتیں دہرائیں اور ان کے بعد میں نے اسے دوبارہ سرتاپا دیکھ کر کہا ـــــ "مگر یار! یہ تو بتاؤ تم چھ سات سال تک رہے کدھر؟"

"کدھر! ...... بس یہاں وہاں آوارہ گردی میں آج ادھر کل ادھر! ..... حال میں بنارس گیا ..... وہاں ایک اینگلو انڈین گرل مل گئی۔ اس سے شادی کرلی۔"

لفظ شادی سن کر مجھ پر ایک بجلی سی گری۔ ایسا معلوم ہوا کہ پنڈت نہرو اشتراکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے ہیں۔ یا مہاتما گاندھی خود اپنی زبان سے عدم تشدد کی برائیاں بیان کر رہے ہیں۔

"لیکن عمانوئیل! تم تو کہا کرتے تھے۔ میں کبھی شادی کروں گا ہی نہیں!"

"لیکن یہ شادی تو معاشقہ کا نتیجہ ہے۔"

"معاشقہ کی شادی! .... یہ اور بھی! تمہیں یاد ہوگا دوست ایک زمانے میں تم کہا کرتے تھے۔ کہ مجھے دنیا میں دو ہی چیزوں سے نفرت ہے۔ محبت اور عورت! ایک کو طلسم غیر حقیقت سمجھتا ہوں اور دوسری کو مکر و فریب کا زندہ مجسمہ! حیرت ہے کہ تم نے دونوں کو اُلٹا کر دکھایا۔"

"لیکن دوست بعض وقت انسان اپنے خیالات بدل دینے پر مجبور ہو جاتا ہے" ـــــ عمانوئیل نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ گھنٹی بجی اور تماشہ پھر شروع ہوگیا۔ اس نتیجہ سے کہ ہماری گفتگو متزلزل ہو کر وہیں کی وہیں رہ گئی۔

تقریباً ۸ ½ بجے تماشہ ختم ہوا۔ ہم سب ہال سے باہر نکلے۔ عمانوئیل کا جائے قیام قریب ہی تھا۔ جدا ہو کر جانے لگا تو میں نے پوچھا ـــــ "تم کس جگہ ٹھیرے ہو عمانوئیل؟"

"گرینڈ ہوٹل میں ہوں۔"

"اور تمہاری گھروالی؟"

"وہ بھی ساتھ ہیں۔"

میں یہ سن کر خاموش ہو رہا تو وہ بولا ـــــ "تکلیف نہ ہو تو کل شام کی چائے میرے ہی ساتھ پینا" میں نے اس کی دعوت قبول کرلی اور "شب بخیر" کہہ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

رات کے وقت گھر پہنچ کر یہ سوچتا رہا کہ کیا یہ وہی عمانوئیل ہے جو محبت کا دشمن تھا۔ جسے حسن و عشق کی پارینہ داستانوں سے انتہائی نفرت تھی .... وہی جو عورتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہتا تھا سب باتوں پر غور کرنے کے باوجود بھی مجھے یقین نہ آیا۔ میں خیال کرتا تھا کہ شاید عمانوئیل نے مذاقاً مجھ سے یہ باتیں کہی ہوں گی۔ یا شاید وہ میری دلی کیفیت کا جائزہ لے رہا ہو ـــــ غرضیکہ میری یقین کی کشتی شک و شبہ کے بھنور میں ہچکولے کھاتی رہی۔

ـــــ ۲ ـــــ

دوسرے روز صبح کے وقت ناشتہ سے فراغت حاصل کرلینے کے بعد میں نے جیب سے اپنی ڈائری نکالی۔ اس لئے کہ روزنامچہ لکھنا میری عادت میں داخل ہے۔ اس وقت نہ جانے میرے دل میں کیا آیا کہ پچھلے لکھے ہوئے اوراق کو غیر ارادی طور پر یونہی پڑھنے لگا۔ ایک صفحہ پر لکھا تھا ـــــ

"۹ر دسمبر ۱۹۳۶ء دنیا والے بھی کس قدر حاسد ہوتے ہیں شاید دوسروں کو خوش و خرم دیکھ کر ان کے دلوں میں رقابت کی آگ جلتی ہے میں اگر کاملتا سے محبت کرتا ہوں تو اس سے دوسروں کو کیا غرض۔ وہ کیوں فضول میرے سامنے لتا کی شکایتیں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "لتا عیار عورت ہے" یہ کسی منوہر کی محبوبہ رہ چکی ہے" .... کسی کی زبان سے نکلتا ہے کہ

"یہ موجودہ دور کی قلوپطرہ ہے" ـــــــ لیکن کچھ بھی ہو، میں ان ہوائی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ کامتا لتا نہایت ہی باوفا لڑکی ہے۔ وہ کبھی دغاباز اور طوطا چشم نہیں ہو سکتی"۔

اس کے بعد چند اوراق میں نے بغیر پڑھے کے اُلٹ دیئے۔ ایک صفحہ پر سرخ روشنائی سے میں نے یہ جملے قلمبند کئے تھے، انہیں بغور پڑھنے لگا۔

"۴ جنوری ۳۲ء"۔ "میرا بچپن کا دوست عمانوئیل سچ کہتا تھا۔ کہ عورتیں بیوفا ہوتی ہیں! اور ان کی محبت جھوٹی اور ناقابل اعتبار! آج مجھے اس کی باتوں کی صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا۔

کل تک میں کامتا لتا کی جھوٹی محبت کے جھوٹے نشہ میں مدہوش تھا۔ دنیا و مافیہا کی مجھے کوئی خبر نہ تھی ...... لیکن آج لتا نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج کل کی روشن خیال، پڑھی لکھی فیشن پرست لڑکیوں کی محبت جھوٹی اور ناقابل اعتبار رہتی ہے! ...... لتا سچ مچ سنہری ناگن ثابت ہوئی۔ کل تک وہ میری محبت کا دم بھرتی تھی ...... میری پرستار تھی ...... کہتی تھی تمہارے سوا میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ...... تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی لیکن آج معلوم ہو گیا۔ کہ یہ سب اس کی مصنوعی محبت کے وعدے تھے۔ کل تک اس کے درد بھرے عہد و پیمان کو سُن سُن کر میں مسرور تھا۔ کہ وہ کبھی مجھ سے جدا نہ ہوگی لیکن آج میں اسے ہری ہر کی آغوش میں دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہی محبت ہے! ...... کیا اسی کو پریم اور عشق جیسے دلکش اور دلفریب الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔

اتنا پڑھ کر میں نے ڈائری بند کر دی۔ بھولی ہوئی باتیں دماغ میں پھر یکایک تازہ ہو گئیں۔ جیسے راکھ تلے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر کسی نے اکسا دیا ہو ...... کامتا لتا اور اس کی باطل محبت کی داستان! کس طرح اس نے مجھے اپنے زلف گرہ گیر میں اسیر کیا تھا اور پھر بیوفائی کا تلخ سبق دیا تھا۔ یہ بھولی بسری باتیں سینما کی فلم کی طرح میرے پردۂ دماغ پر رقص کرنے لگیں۔

اس کے بعد میں نے اپنا روزنامچہ لکھا اور دوسرے ضروری کاموں میں مشغول ہو گیا۔

۳

شام کے وقت حسب وعدہ گرینڈ ہوٹل پہنچا۔ دیکھا کہ عمانوئیل ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھا اخبار بینی میں مصروف ہے۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اُٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"عمانوئیل! تمہاری اہلیہ کدھر ہیں؟ ان کو نہیں دیکھتا!"

"اپنے ایک دوست سے ملنے گئی ہیں۔ شائد آتی ہی ہونگی"۔

میں یہ سن کر چُپ ہو رہا لیکن قدرے توقف کے بعد بولا ـــــ

"لیکن عمانوئیل! تم نے اپنی شادی کے حالات مجھے نہیں سُنائے"!

"حالات! ...... ! ...... ! ...... ! ...... !"...... یہ سُن کر کیا کرو گے"؟ عمانوئیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں گا! ...... کچھ بھی نہیں! ...... ہاں! یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ انتہائی نفرت کے باوجود تم نے پھر آخر شادی کی کس طرح؟"

"کی نہیں کرایا گیا ...... محبت کا جام پیا نہیں بلکہ پلایا گیا ...... صیاد نے بلبل کو اسیر دام نہیں کیا بلکہ بلبل خود اسیر دام ہوئی ...... ایسی حالت میں تم ہی بتاؤ میرا کیا قصور ہے"؟

"قصور! خوب! ...... یہ تو تم نے اچھا کہا! پر تم کوئی دودھ پیتے بچہ تو نہ تھے"!

"سچ ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ مقناطیس میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ لوہا اس کی طرف خود بخود بے بسی کی حالت میں کھنچ جاتا ہے ......!"

ابھی عمانوئیل نے یہ جملہ پورا ہی کیا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنائی دی عمانوئیل نے کہا ـــــ "شائد وہ اپنے دوست سے مل کر واپس آ گئیں"۔

تین چار سیکنڈ بعد مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کسی نے میری آنکھوں کے سامنے آفتاب کو لا کر رکھ دیا۔ جس کی تابش سے میری طاقت بینائی ضایع ہو گئی ...... آنکھیں خیرہ ہو گئیں ...... طاقت گویائی سلب ہو گئی ...... عضو شل ہو گئے ...... دماغ بیکار ہو گیا ......

ہوش کافور ہو گیا ...... کیا میں سچ مچ اس وقت اپنی آنکھوں کے سامنے کامتا لتا کو دیکھ رہا تھا؟ ...... میری جھوٹی معشوقہ کامتا لتا اور عمانوئیل کی رفیقۂ حیات!! کامتا لتا ...... جو ہندو تھی، اور جسے عمانوئیل اینگلو انڈین

بجھے ہوئے تھا۔ یا اینگلو انڈین جسے میں ہندو تصور کئے ہوئے تھا۔

کاش یہ تنا خود مجھے اس طرح اچانک دیکھ کر سراسیمہ ہوگئی۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں میں عمانویل کے سامنے اس کا راز فاش نہ کر دوں لیکن یہ میرے ضبط امکان سے باہر تھا۔ میں تنا کو اس عجیب و غریب طریقہ سے پاکر اس قدر حیران و سراسیمہ تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ عمانویل کے ساتھ میرا اس جگہ ٹھیرنا دشوار ہوگیا اور بغیر چائے پئے میں اس سے بہانہ بنا کر کچھ اس طرح بھاگا کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔

گھر پہنچا لیکن وہاں بھی مجھ پر وحشت طاری رہی۔ گذشتہ واقعات مجھے بالکل طلسم معلوم ہوتے تھے۔

خیال آیا کہ عمانویل کو سب باتوں سے آگاہ کر دوں لیکن دل نے اس حرکت سے باز رکھا...... عورت سے انتقام!......

دل نے اسے قبول نہ کیا! کچھ بھی ہو، لیکن پریشانی اس قدر بڑھی کہ دوسرے روز مجبور ہو کر میں کلکتہ روانہ ہوگیا۔

— ۴ —

ایک مہینہ بعد کالج کھلا اور میں کلکتہ چلا گیا...... وہاں ایک دن کالج کے کامن روم (Common Room) میں بیٹھا اخباروں کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دفعتاً ایک اخبار میں میری نظر ذیل کی عبارت پر پڑی:

"دارجیلنگ میں مسٹر عمانویل کی موت"

"کل ایک نووارد جو تبدیلی آب و ہوا کے سلسلہ میں اپنی بیوی کے ساتھ دارجلنگ میں آیا تھا، سنو پارک کی سڑک پر مردہ پایا گیا۔ بدن پر خنجر کے نشانات ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول اسی آلہ سے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ مقتول کی بیوی کے اسمتھ (Smith) نامی ایک نوجوان سے ناجائز تعلقات تھے۔ اور انہی دونوں نے سازش کر کے عمانویل کو خنجر سے قتل کیا۔ مقتول کی بیوی مع اپنے عاشق کے حراست میں لے لی گئی ہے۔"

یہ خبر پڑھ کر میں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں اپنی آنکھیں بند کر لیں ——!

یوں پھرتا ہے اک خاک بسر تیری گلی میں — دل ہے تری محفل میں نظر تیری گلی میں
ہر گام پہ جھک جاتا ہے سر تیری گلی میں — ہوتا ہے یونہی اپنا گزر تیری گلی میں
آنکھوں میں لئے پھرتی ہے دنیا مری آنکھیں — دیکھ آئی ہے کیا! میری نظر تیری گلی میں
وہ دن کرے اللہ کہ یہ کہہ اٹھے دنیا — آیا ترا وابستۂ در تیری گلی میں
مقصد تھا یہی جستجوئے شوق کا شاید — دل کی طرح کھو جائے نظر تیری گلی میں
اجڑا ابھی ہماری ہی طرح اور بنا بھی — ہر خانماں برباد کا گھر تیری گلی میں
بیٹھے ہیں لئے سایۂ دیوار میں دل کو — مچلے ہوئے ارمان نظر تیری گلی میں
ہر وقت خدا سے یہ دعا مانگ رہا ہوں — ہو جائے یونہی عمر بسر تیری گلی میں
مشتاق ہوں کس درجے میں ایک جھلک کا — کھولے ہوئے آغوش نظر تیری گلی میں
سنتا ہوں کلیم آ بھی گئے طور سے، لیکن — اب تک نہ ہوا میرا گزر تیری گلی میں
سکھلاتا ہے آداب رہ عشق و محبت — ہر نقش قدم پر مرا سر تیری گلی میں
اس شوق زیارت کی بھی حد ہے ارے توبہ — چھوڑ آیا ہوں میں اپنی نظر تیری گلی میں
ہم کو بھی مذاق جگر افگار ملا تھا — با دیدۂ تر، خاک بسر تیری گلی میں

بکھرے ہوئے پھول

از جناب علی احمد صاحب علی

اُف رے عہدِ شباب کی دُنیا ‖ ہے سراپا شراب کی دُنیا
اے تصوّر حسین کتنی ہے ‖ میرے رنگین خواب کی دُنیا
تم نے کیا سازِ دل کو چھیڑ دیا ‖ ہر نفس ہے رُباب کی دُنیا

یہ کس کی ہے تجلّی گاہ کس کا آستانہ ہے ‖ تڑپ اُٹھے ہیں کیوں سجدے جبیں نے کیا کہاں رکھدی
فنا انجام ہے میرا فنا کی سمت مائل ہوں ‖ جھکی جو شاخ گُل اُس پر بنائے آشیاں رکھدی

دل کی دُنیا میں اضطراب ہے کیوں ‖ مرتعش دامنِ رُباب ہے کیوں
ساری دُنیا ہے لڑکھڑائی ہوئی ‖ اتنا رنگیں ترا شباب ہے کیوں

ترے لب پر تبسّم کا جو خرمن دیکھ لیتا ہوں ‖ گُلِ مقصود سے پُر اپنا دامن دیکھ لیتا ہوں
گھٹا میں مُسکرا کر کوندتی ہے جب کبھی بجلی ‖ میں گھبرا کر سوئے شاخِ نشیمن دیکھ لیتا ہوں

علی خود آپ ڈھا دیتا ہوں میں اپنے نشیمن کو
جہاں آثارِ بربادیِ گلشن دیکھ لیتا ہوں

اُردو ادب پر غالبؔ کا اثر

ایک بلند پایہ ادبی مضمون

از محترمہ حمیدہ صاحبہ

میں پوچھتی ہوں کہ شاعری کو کمال معراج تک کس نے پہنچایا؟ اُردو زبان کے ماڈرن لٹریچر میں تموج و تلاطم کس نے پیدا کر دیا؟ اپنی قوتِ تخیلہ کی جولانیاں ختم کر دہ راہوں کو روشناسِ جادۂ استقامت کس نے کیا؟ اپنے اندازِ تحریر میں برقِ جہاں کی چمک اور آتشِ درخشاں کا نور کس نے منور کیا؟ درد و سوز کو پیہم اور پہلو بہ پہلو لباسِ شعر میں ملبوس کرنے والا کون ہے؟ واضح صاف عام فہم اور مربوط کلام سے مافوق الذہن نتائج کا استخراج کس نے سکھا دیا؟

کیا اُس کی مسلم الثبوت ہمہ دانی اور شیوہ بیانی محتاجِ بیان ہے؟ کیا اُردو کا شیکسپیئر ہنوز محتاجِ تعارف ہے؟ اور کیا نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب سا صاحبِ اقلیم دیرینہ سال اور بہ صفت موصوف گو ہر شب چراغ کسی کی غواصی کا منتظر ہے؟ مگر پھر بھی کسی کی یک پیدائی تشنہ لب کیوں رہتی ہے؟

غالب اور فرقہ معترضین زمانہ گزشتہ کی طرح بہت سے فرومایہ لوگ فی زمانہ بھی موجود ہیں جن کا شیوہ نیش زنی اور مسلک طعن و تشنیع ہے۔ کھجور کے پودے لگانے والے دہقان کی مانند غالب نے آیندہ نسلوں کی خوشہ چینی کے لئے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ مگر افسوس کہ آج تمازتِ آفتاب سے جھلسے ہوئے راہگیر اسی تناور درخت کے زیر سایہ بیٹھ کر "ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام" کا بے سرا راگ الاپ رہے ہیں۔ شدتِ تپش سے بچاؤ کے لئے اظہار کے ساحرِ نواز نغمے کی بجائے دیپک کی پر سوز و گداز راگنی سے دل کے تاروں کو جلا کر بھسم کئے دیتے ہیں۔ یا دوسرے معنوں میں اپنی لاعلمی۔ کم حوصلگی۔ بے سلیقگی اور کم مائگی کے معترف ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو "اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر" تکذیب و تسفید کے عادی ہیں۔ اور سورج کو چراغ دکھا کر اپنی خفت مٹانا چاہتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں ان کے لئے "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کا جواب مسکت کافی و وافی ہے۔

اسلوبِ بیان غالب کا اندازِ بیان نرالا ہے۔ سلیس۔ رنگین ہے۔ بیہودہ اور کم وزن تصریحات سے گریز اور رمز و کنایہ سے کام لیا گیا ہے۔ جستہ جستہ اشعار ہی نہیں بلکہ سب کا سب کلام فحش و ہزل سے مبرا و منزہ ہے۔ پردہ عشق میں لیلیٰ اور مجنوں کی سرگزشت کا اعادہ نہیں۔ بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ اور پاکیزہ و لطیف جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اشعار میں جودتِ طبع اور اخلاق کی بلندی اخلاق فاضلہ اکتساب کا بیّن ثبوت ہے۔ مختلف النوع اسالیب بیان میں خوش فہمی کی سلسلہ جنبانیوں کا لا انتہائی تسلسل روحانی جذبات میں اشتراک کا موجب ہو گئی ہیں۔

طرزِ تحریر غالب کا ذہن رسا اچھوتی تشبیہوں اور دقیق خیالات کی اختراع سے کبھی عاجز نہیں ہوا۔ بادی النظر میں چیز ترکیب اشارہ بھی جدت آفرینی اور نازک خیالی کے حامل ہیں۔ طرزِ ادا میں ایک شوخی اور اٹکھیلیاں ہے استعارہ و کنایہ اور تمثیل کے استعمال میں پدطولیٰ حاصل ہے۔ محاورات پر قدرت مناسبتِ لفظی اور اصنافِ سخن نے طرزِ بیان میں ایک گھلاوٹ شیرینی اور نفاست پیدا کر دی ہے۔ اکثر صنعتِ ایہام مدنظر ہے۔ مگر اس طرح کہ معنوی خوبیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کیا ہے مگر کمالِ شاعری محض قافیہ پیمائی

نہیں بلکہ شاعر منی ۔ قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے علاوہ اپنا کلام کے زیور سے آراستہ ہے ۔ صنائع و بدائع کے التزام میں ہم کو سرشتہ معنی ہاتھ سے نہیں دیا ۔ ردیف اور تابع قوافی غزلوں میں بھی دلسوزی کا پہلو حسن و تشنیع پر غالب ہے ۔

خصوصیت کلام

تمام کلام خواہ وہ مشتمل بنظم ہو یا نثر مجموعہ محامد و محاسن ہے ۔ مگر چند نمایاں خصوصیتیں غالب کو زمرۂ شعراء میں نمایاں کرتی ہیں :۔

۱۔ ابتذال سے بچنا ۔
۲۔ استعارہ کنایہ اور تمثیل کا التزام ۔
۳۔ فحش، ہزل اور ہجو سے گریز ۔
۴۔ طرز ادا میں صنعتِ ایہام کا لحاظ خصوصی ۔

نمونۂ کلام

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

رفعتِ تخیل کی انتہا ہے اپنی پریشانیٔ خاطر کے اظہار کے لئے ایسی چیزوں کو منتخب کیا ہے ۔ جو بالذات پریشان ہیں کیسی آشفتہ دل اور پراگندہ خاطری بیقراری کا ترجمان ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے ؟

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

خود فراموشی اور محویت ملاحظہ ہو ۔ موت و حیات میں امتیاز نہیں از دیادِ الم نے حالتِ زیست و مرگ یکساں کر رکھی ہے ۔ موت کی زردی سے پیشتر بھی رنگ بیدہ مایوسیٔ عشق پر دال ہے ۔ گویا موت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ۔ بلکہ رنج و غم سے رہائی دلانے کا موجب ہے ۔

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

دنیا میں ہر مشکل کا حل ۔ ہر دکھ کا علاج اور ہر درد کا مداوا موجود ہے ادق سے ادق الفاظ مغلق و پیچیدہ عبارتیں اپنے اندر کچھ نہ کچھ مفہوم ضرور رکھتی ہیں ۔ مگر لفظِ وفا جو کہ سرمایۂ الفاظ ہے بے معنی سا معلوم ہوتا ہے گویا کہ نخلِ وفا میں پھل نہیں آتا ۔ اور اس کا وجود کسی رنگ میں بھی باعث تسکین نہیں ہے ۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اپنی محرومی اور بیکسی کا نقشہ کن موثر الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے ؟ جذباتِ عشق کا کتنا سچا ۔ کیسا پاکیزہ اور کس قدر ارفع و اعلیٰ مرقع ہے ! اندوہ وفا سے بچنے اور جفاؤں سے نجات کی کیا صورت سہل ہے ! مگر ساتھ ہی تسلیم و رضا کی بہترین مثال بھی پیش کی ہے ۔ در پردہ محبوب کی انتہائی تعریف مضمر و مرکوز ہے ۔ گویا جان فدا کرنا اس کی شانِ استغنا کو قبول نہیں ۔ اور اس کی غیرت اس امر کی مقتضی نہیں کہ وہ میری جان زار میں حقیر و ناکارہ چیز کو شرفِ قبولیت بخشے ـــــ یا ـــــ وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ میرا نام اس کے نام کے ساتھ کسی رنگ میں بھی لیا جائے اور آئندہ کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ وہ ہے جس پر فلاں نے اپنی جان فدا کر دی تھی ـــــ یہ مفہوم بھی قریب الفہم ہے کہ اسے کچھ جفا میں ہی مزہ ملتا ہے میرے مرنے سے یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور مشقِ ستم بند ہو جائے گی ۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

میری مسجود تو برق ہے جس کا کام جلانا اور خاکستر کرنا ہے ۔ لامحالہ وہ میری کشتِ تمنا اور خرمنِ امید پھونک دے گی اس یقین کے باوجود میرا رنگ کچھ عجیب ہے ۔ نہ اس کی محبت سے کنارہ کشی ممکن ہے اور نہ ہی یہ گوارا ہے کہ مزرعِ ہستی نیست و نابود ہو جائے ۔ غرضیکہ بیم و رجا کا عالم طاری ہے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ۔

آج کیوں اپنے اسیروں کی نہیں پروا تمہیں کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

شکوہ کس دلآویز پیرایہ میں کیا گیا ہے کج ادائی اور بے اعتنائی کی شکایت کس نفیس اسلوب سے کی گئی ہے ۔ زمانہ گزشتہ کے لطف و کرم اور مہربانی کی طرف کس عمدگی سے اشارہ کر دیا ہے ! محبت و الفت کے بیتے ہوئے دنوں اور عیش و آرام کے گزرے ہوئے زمانہ کی طرف کیسا لطیف و موزوں کنایہ ہے ! اور موجودہ کم توجہگی اور بے وفائی کا گلہ کن دبے ہوئے مگر پرمعنی الفاظ میں کیا ہے ! ایک طرف مہر مجسم کہہ کر تعریف کی ہے تو دوسری جانب بے پروائی کا الزامی جواب دے کر تہدید مد نظر ہے ۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہائے میرا قاتل کیا ہی جلد پشیمان ہوا میرے قتل ہوتے ہی اس نے ہمیشہ کے لئے جفا سے توبہ کر لی ۔ اور دستِ تظلم کھینچ لیا کتنی لطیف طنز

مضمر ہے یعنی میرا مرنا تھا کہ تو جور و ستم سے تائب ہو گیا۔ اگر تیرا شیوہ کچھ دیر اور قتل و غارت گری رہتا تو ممکن تھا کہ کوئی نہ کوئی رقیب بھی نشانہ مشقِ ناز ہو جاتا۔۔۔۔ مگر تجھے تو میرا ہی قتل مقصود تھا اس لئے تو نے صرف اسی پر اکتفا کی غیروں کی باری آتے ہی تو نے ظلم سے کشیدگی اور کنارہ کشی اختیار کر لی۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

حضرتِ ناصح کی آمد آمد ہے۔ بسر و چشم آئیں۔ مگر لِلّٰہ کوئی یہ تو سمجھا دے کہ وہ مجھے کیا نصیحت کریں گے؟ کیا مجھ ایسے دانا و فرزانہ کو انہوں نے بے وقوف و نادان تصور کر رکھا ہے؟ اور کیا میرا عشق محض ایک ڈھکوسلہ اور مصنوعی جذبہ ہے جو سمجھانے سے زائل ہو جائے گا؟ ۔۔ یا میری محبت جذب صادق پہ مبنی نہیں بلکہ خود ساختہ اور اختیاری ہے کہ ان کی نصائح کارگر ہوتے ہی میں راہ راست پہ آ جاؤں گا۔ اسی مضمون کا اعادہ۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔
میں بھی کیا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

میری بے یار و مددگاری اور کسمپرسی کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں کوئی بھی دوست و حبیب نہیں رہا جنہیں دوستی کا دعویٰ تھا وہ بھی ناصح بن کر وبالِ جان ہو رہے ہیں۔ حالانکہ میری الم انگیز اور پر از یاس و حسرت حالت تو اس کی مقتضی ہے۔ کہ میری غمخواری و دلداری کی جائے۔ اس آڑے وقت میں جبکہ بلاؤں کا نزول اور حسرت و اندوہ کا اژدہام ہے میں تسلی و تشفی کا جویاں ہوں۔ نہ کہ مجروح دل پر کاری چرکے لگا کر میرے زخموں کو تراوش کا عادی بنا دیا جائے۔

کہوں کس سے میں کیا شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اے ہمدم تجھے میری قلبی کاہشوں اور روحی اذیتوں کا کیا علم؟ ہر شب میرے لئے ایک نئی موت لے کر آتی ہے۔ ہر "تارِ بستر" میرے لئے "خارِ بستر" ہے۔ بجائے اس کے کہ رات کی خاموشیوں میں خوابِ راحت کے مزے لوں۔ کیفیتِ خواب سے دل و دماغ کو سکون بخشوں میں تو درد و کرب سے دوچار رہتا ہوں۔ کاشکہ اس عذابِ الیم سے نجات ممکن ہوتی۔ اور اس مرگ و زیست کی کشمکش کا خاتمہ موت کے سرد ہاتھوں سے ایک مرتبہ ممکن ہوتا۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

عاشقِ ناشاد کا دل ہی کتنا؟ کیوں میرے ضبط و تحمل کا امتحان کرتے ہو؟ میں نے جگر دری اور برداشت کا کب دعویٰ کیا؟ نگاہ تغافل سے دل و جگر کو کیوں برباتے ہو؟ مجھ زار کو کب حوصلہ صبر و شکیب ہے؟ ہاں، ڈالو، ایک بے باک اور تحمل سوز نگاہ! جو کہ جلا کر خاکستر کر دے دل و دماغ کی عظیم الشان بستیوں کو

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

میری غیور طبیعت کو بھلا یہ کب گوارا ہے کہ کسی کے زیر بار احسان ہو۔ ایسے بچنے سے تو مرنا ہی بھلا۔ درد کی عارضی تکلیف سے نجات کے لئے درد کا مرہونِ منت کیوں بنوں؟ نہیں مجھے ایسی صحت درکار نہیں۔ اس وقتی جسمانی تکلیف سے بچنے کے لئے ابدی روحی اذیت کیوں مول لوں؟ ؎

منتِ حضرتِ عیسےٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

وہ میرے عشق کا معترف ہے اور میری حد سے بڑھی ہوئی شیفتگی اسکے نزدیک ایک امر مسلم ہے کیونکہ اس بارے میں اس کا شک مبدل بہ یقین ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اتنا اوچھا اور کم مایہ نہیں کہ آہیں کھینچوں اور دوسروں کو اپنے راز کا محرم بنا کر اس کے لئے باعثِ ننگ و بدنامی بنوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر آہ پر چونک اٹھتا ہے اور بدظنی سے گمان کر لیتا ہے۔ کہ کہیں میں نے تو دامنِ ضبط و الم ہاتھ سے نہیں دے دیا

وہ میری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنواں سمجھا

جبین کو عنوان سے خاص ربط ہے ——— میرے خفتہ و نہفتہ جذبات کا گہوارہ تو ہمیشہ خلوت گہہ راز ہی رہا۔ میں نے اپنی آرزوؤں کو کبھی اذنِ پرواز نہیں دیا۔ پھر بھی میرا رازِ دل افشا ہو ہی گیا وہ تو انداز دو فہم اور نکتہ سنج ثابت ہوا کہ میری چین جبیں سے غم پنہاں کو پا گیا۔ حالانکہ وہ تو اسی مقصد کے لئے ڈالی گئی تھیں۔ کہ کوئی کچھ نہ سمجھے ——— اور دوسری چیز جس نے رازِ دل طشت از بام کر دیا وہ میرے مکتوب کی بے ربطی تھی۔ اگرچہ میں اس میں حرفِ مطلب زبان پر نہیں لایا مگر اس کا بے سروپا ہونا اس امر کی دلیل ٹھہری کہ میں کچھ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں ؎

کل وہ جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

بدظنی محبت کا جزو لاینفک ہے۔ اس کا اقتضاء ہے۔ کہ میں اس تاخیر کی شکایت کروں۔ آپ کو آنے میں آج غیر معمولی دیر ہوئی۔ اس کی کچھ وجہ ضرور ہے۔ اور وہ وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ یہی نا! کہ آپ کو کسی نے روک رکھا تھا ——— اور روکنے کا مجاز کون ہوسکتا ہے؟ سوائے کسی ایسی ہستی کے جو مجھ سے بغض اور آپ سے قرب رکھتی ہو کوئی نہیں اگر یہ صحیح ہے تو یہ امر میرے لئے باعثِ صد تشویش اور موجب ہزار اندیشہ ہے۔

تم نے سمجھا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

میری تباہی و بربادی کا باعث صرف تم ہی نہیں ہو۔ بلکہ اس میں میری خوبیٔ قسمت کو بھی بڑا دخل ہے۔ تمہارا وقار اور ادبِ حسن تو اس امر کا مقتضی ہے۔ کہ تم مجھے حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دو۔ اور اپنے بے لوث دامن کو ہر قسم کی آلودگی و بدنامی سے بچائے رکھو ——— یہ جانتے ہوئے بھی اگر میں حزیں رہوں یا فنا بھی ہو جاؤں تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ میری تقدیر کا لکھا پورا ہونا لازمی ہے۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

او بھول لینے والے! بے مروّت! تو مجھے بھول گیا۔ وعدہ فراموشی کی کچھ انتہا بھی ہے؟ کچھ تو یاد کر! وہ زمانہ ——— جب کہ تو ابھی نو آموز تھا اور محض مشق ستم کرتا تھا ——— اے صبا! کچھ یاد ہے؟ تیرا ایک صید زبوں بھی تھا جس کو تو نے کبھی اپنے فتراک کی زینت بنایا تھا اور جو تیرے قادر انداز ہونے پر دلالت کرتا تھا میں فراموش شدہ وہی نخچیر ہوں۔ اپنے ذہن پر زور دے۔ شاید اس اتنے پتے سے تجھے ایک لمحہ کے لئے میری یاد آسکے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہ کیا کہ آپ گزرتے ہوئے چلے گئے۔ جلوہ دکھایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئے سا ایک لمحہ کے لئے دکھائی دیئے اور پھر نہاں ہوگئے۔ اس چیز نے تو ہمارے ہوش و حواس بھی پراگندہ کر دئے بلکہ تمہاری برقِ تجلّی نے تو آنکھیں ہی خیرہ کر دیں۔ میری خواہش پوری ہونا تو درکنار تشنگی میں اور اضافہ ہوگیا میرا مقصد تو یہ تھا کہ اپنی کہوں اور تمہاری سنوں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

کیسا عجیب فلسفہ ہے کہ فنا میں ہی بقا مضمر ہے قطرہ دریا میں مل کر بظاہر فنا ہو جاتا ہے اور اُسے کوئی قطرے کے نام سے موسوم نہیں کرتا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی ناپائدار اور معرضِ خطر میں تھی دریا میں ملتے ہی اسے ثبات حاصل ہوگیا بعینہٖ یہی مثال انسانی تکالیف کی ہے درد جو کہ ایک الم انگیز چیز ہے جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو تکلیف اگرچہ بظاہر ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ حد سے گزرتے ہی ابدی راحت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ نہ مرض رہتا ہے اور نہ ہی مریض۔ درد کے احساس کے فنا ہوتے ہی اس کا وجود بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ہائے افسوس تیری بیگانگی اس قدر بڑھ گئی کہ تو نے ہمیں جفا سے بھی محروم کر دیا تیرا ستم بھی ہمارے لئے کرم اور موجبِ مسرت و ابتہاج تھا تیری جفاکیشی کا جواب ہم اپنی وفا و مروت سے دیتے تھے اور اس طرح ایک تعلق اور ربط باہمی قائم تھا مگر تو نے یہ کیا غضب کیا کہ دستِ تعلق کھینچ لیا اور وہ سب امید کی رمق جو ہمارے دل میں باقی تھی مٹا دی۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

میں نے اتنے ظلم و ستم سہے کہ اب ضعف و ناتوانی سے طاقتِ گفتار بھی نہیں۔ روداد دل کہنا تو درکنار تابِ سخن بھی نہیں میری یہ حالت دیکھ کر اور مجبوری سمجھتے ہوئے بھی تمہارا یہ کہنا کہ میں تیری ہر خواہش پوری کر دیتا ہوں تو بیان تو کر کہ تو کس چیز کا طالب ہے۔ تیری مثال تو اس صیاد کی سی ہے جو بلبل کو طاقتِ پرواز سلب ہو چکنے پر رہا کر دیتا ہے اور کہتا ہے جا اڑ جا! تو آزاد ہے

اردو نثر نظم کی مانند غالب کی نثر بھی بہت سی غیر معمولی خوبیوں کی حامل ہے مثلاً (۱) لمبے لمبے القاب و آداب جن کو مترسلین نے زمانہ قدیم سے

بندش اختیار کر رکھا تھا ترک کر دئیے نہ القاب کے بعد ہی اور مطلب شروع کا آغاز کرتے ہیں

۲- بیانگی اس قدر ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بالمشافہ بات چیت کر رہے ہیں

۳- مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے کرتے غائب تصور فرض کر لیتے ہیں

۴- سوال و جواب کے موقعہ پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے مگر ادائیگی جواب میں ایسے الفاظ لاتے ہیں جو سوال و جواب میں باعثِ تمیز بن جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ چند ضمنی مگر قابلِ لحاظ خصوصیتیں بھی ہیں۔ مثلاً شوخیٔ تحریر، بذلہ سنجی، ظرافت، خطوط میں مرزا کا نصب العین ہمیشہ مکتوب الیہ کو مسرور و محظوظ کرنا ہوتا ہے۔

غالب نے فارسی تراکیب کو نہایت عمدگی سے اردو میں استعمال کیا۔ اور کئی نہایت ہی عجیب اور نادر تشبیہوں کا اختراع کیا ہے یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان کی ترقی اور اس کے ادب کی وسعت کا یہی بہترین طریقہ ہے کہ دوسری زبانوں کا لٹریچر اور اس کی عمدہ اور حسین چیزیں اعلیٰ رنگ میں رنگین اور عمدہ لباس میں ملبوس کر کے اپنے ہاں رائج کی جائیں +

واردات

از جناب عزیز احمد صاحب عزیزؔ

دل میں غارتگرِ صد ہوش نظر آتے ہیں
چشمِ ادراک سے روپوش نظر آتے ہیں

مست گل مست فضا مست ہوا کے جھونکے
سب کے سب میکدہ بردوش نظر آتے ہیں

لغزشیں کیفِ جوانی کی غضب ہیں توبہ
آپ ہر گام پہ مدہوش نظر آتے ہیں

کیوں نہ پھر ناز کرے اُنکے تغافل کی ادا
دیدہ و دل مرے غم کوش نظر آتے ہیں

دیکھئے دیکھئے وہ صبح کا تارا ڈوبا
چارہ گر رات سے خاموش نظر آتے ہیں

اپنی نظروں کی حدوں کا ہی کوئی اور مقام
ورنہ وہ دل ہی میں رُوپوش نظر آتے ہیں

سجدے پھر خاک میں ملنے کیلئے ہیں بیتاب
جلوے پھر حُسن کے گلپوش نظر آتے ہیں

اپنے بیتاب تصور کو سنبھالے کوئی
شب کے جاگے ہُوئے خاموش نظر آتے ہیں

کس کے رنگین تصوّر کا یہ صدقہ ہے عزیزؔ
بے پیے آپ جو مدہوش نظر آتے ہیں

دوشیزہ کا انتقام

ایک پُراسرار، تحیّرزا اور جاسوسی شاہکار

از جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی

(۱)

مدتوں کا ذکر اور گذری ہوئی بات ہے کہ دریائے ستلج کی خشمگین موجوں نے پھر ایک حسین دوشیزہ کی لاش کو اپنے ساحل کے دامن پر ڈال دیا۔ اور بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مُرجھایا ہوا پھول شاخ گل سے گر پڑے۔

ریاست مہر نگر میں یہ وحشتناک خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور آنِ واحد میں نعش کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوگیا ان میں سے ہر ایک اپنے مذاق و نظریئے کے مطابق رائے زنی کرنے لگا۔

"نعش کس قدر حسین و جمیل دوشیزہ کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نشۂ حسن و شباب سے مست اور لطیف مسرتوں کے طوفان خیز ہنگاموں سے فرصت پاکر ابھی ابھی مصروف خوابِ ناز ہوئی ہے"! یہ فقرہ ریاست کے ایک چلبلے نوجوان شاعر نے کہا!

دوسرا معمر شخص متحیّر کن لہجہ میں گویا ہوا۔ "حیرت تو صرف اس بات کی ہے کہ اب تک جس قدر نعشیں برآمد ہوئی ہیں سب کی سب حسین و نوجوان لڑکیوں ہی کی تھیں اور مزا یہ کہ کسی ایک کے جسم پر زخم تو کیا خراش تک نہیں پائی گئی۔ خدا جانے کیا اسرار ہے؟ بہت ممکن ہے کہ یہ نعش بھی خودکشی کا نتیجہ ہو!!!"

لیکن ایک جوشیلے ادھیڑ عمر کے انسان نے سب کی توجہ اپنے ان لفظوں کی طرف معطف کرائی "غضب تو دیکھو! ابھی پورے تین ہفتہ بھی نہیں ہوئے کہ یہ تیسری نعش دستیاب ہوئی ہے اور غالباً یہ نعشیں تو بہت ہیں سے وہ چند ہیں جو حسن اتفاق سے ہماری ریاست کے ساحل پر آلگنے کے باعث ہمارے علم میں آگئیں ورنہ خدا جانے کتنی ایسی نعشیں ہونگی جو غیر آباد و ویران ساحلوں پر سڑ کر گردو پیش کو متعفن کررہی ہونگی یا تہ آب غرق ہو جانے کے باعث آبی جانوروں کی خوراک بن چکی ہوں گی ایک طرف تو صنف نازک کے اس پاکیزہ و لطیف طبقے کو صفحۂ عالم سے یوں مٹایا جارہا ہے اور دوسری طرف حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اس اثنا میں ریاست کے مہمان سعید سراغرساں جس کے حالات لوگوں کے لئے ایک چیستان بن کر رہگئے تھے، آن کے آجانے سے سب خاموش ہوگئے۔ سعید سراغرساں نے نعش کو نہایت غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنی نوٹ بک میں ضروری یادداشتیں درج کرکے واپس چلاگیا جس کے بعد ہی مقامی پولیس بھی موقعہ پر آگئی اور ضابطہ کی خانہ پُری کے لئے پنچایت نامہ برگ خودکشی مرتب کرکے نعش کو اہل ریاست کے حوالے کردیا جنھوں نے

حسب دستور تجہیز و تکفین کر کے اس ناگہانی مصیبت سے نجات پائی۔

(۲)

سراغرساں تازہ آئے ہوئے اخباروں میں سے ایک کا انتخاب کر کے سرخیاں دیکھنے لگا کہ یکایک اس کی نظر ایک اور دردانگیز واقعہ پر پڑ گئی

عشق کا حیرت خیز کارنامہ

ناکامیٔ محبت کی دردناک کہانی

دنیائے محبت میں تہلکہ برپا کر دینے والی عشق کی عجیب و غریب کہانی۔ قارئین کرام کیلئے یہ خبر موجب دلچسپی ہوگی کہ قاضی ابرار حسن صاحب دارالافتا کی حسین و جمیل دختر سعیدہ اور محب الحق صاحب کے صاحبزادے جمیل الرحمٰن میں نہ معلوم کب سے تعشق کا سلسلہ جاری تھا۔ چونکہ دونوں عالی خاندان سے تھے لہٰذا طرفین کے رشتہ داروں نے اس انتخاب پر بہ اظہار پسندیدگی رسم نسبت کر دی تھی۔ اسی زمانے میں جمیل میاں نے ریاست مہرنگر کی شہزادی جمال آرا کے حسن کا غائبانہ شہرہ سنا اور اس پر عاشق ہو کر عفت مآب سعیدہ سے سرد مہری شروع کر دی حتیٰ کہ عین اس وقت جبکہ عقد کی تاریخ متعین ہو رہی تھی سعیدہ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ سعیدہ اس خبر کو سن کر بے ہوش ہو گئی اور چونکہ اس کی نسوانی غیرت نے اس ذلت کو کسی طرح برداشت کرنا گوارا نہ کیا اس لئے رات کی خاموش تاریکی میں نہ معلوم کہاں غائب ہو گئی۔ صبح جب وہ گھر سے غائب پائی گئی تو ہر سو تلاش و جستجو کرنے پر ایک جھاڑی کے کانٹوں میں اس کے خون آلود کپڑوں کے بعض حصے دستیاب ہوئے جو شناخت کر لئے گئے اور جن سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ نامراد سعیدہ کسی خونخوار درندے کی نذر ہو گئی اس کی ناکامیٔ محبت کا پتہ اس کے اس خط سے چلتا ہے جس کو اس نے گھر سے رخصت ہوتے وقت اپنی مسہری پر چھوڑا تھا۔ اور جس میں اس نے تمام حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ بیوفا جمیل نے اس کو کس طرح اپنی پرفریب باتوں میں پھنسایا تھا۔ اور جذبۂ انتقام سے متاثر ہو کر تحریر کیا تھا۔ کہ ایک کمزور لڑکی کو حقارت سے ٹھکرانے والے جمیل کو صحرائے ابا سین میں انتظار کرنا چاہیئے تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ ایک دوشیزہ کا کیسا انوکھا انتقام ہوتا ہے

جو مر گئی بھی تو یہ نہ سمجھو کہ ان سے رشتہ وفا کا ٹوٹا
پس فنا بھی میں ان کے دل میں غبار بن کر رہا کروں گی

اس المناک خبر کی اطلاع جب جمیل کو پہنچی تو فرطِ الم سے اس کا دماغ الٹ گیا اور وہ کپڑے پھاڑ کر سعیدہ! پیاری سعیدہ!! کے پُرشور نعرے لگاتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا۔ اور دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرتا رہتا ہے۔

سعید سراغرساں اس خبر سے بہت متاثر ہوا اور کسی گہرے خیال میں پڑ گیا۔ ہنوز وہ ذہنی ہیجان میں الجھا ہوا تھا کہ مہرنگر کی شہزادی جمال آرا کی ایک کنیز نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی کہ ملکۂ جہاں پناہ شاہزادی صاحبہ نے اپنے گمنام مہمان کو یاد کیا ہے۔ سعید نے پیغام سنا۔ اور کنیز کے ساتھ ہولیا۔ صحن باغ میں پہنچکر اس چھوٹی سی ریاست کی ملکہ کا تزک و احتشام دیکھ کر سعید متحیر سا رہ گیا خوبصورت روشوں سے ملحق مشرقی صنعتوں کے بہترین نمونے مرمریں بتوں سے گلاب و کیوڑے کے فوارے اپنے رقص سے مسلسل موسیقی پیدا کر رہے تھے چمنستان کثرت شگفتگی سے مثل سیل آتشیں دہک اٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فردوس بریں اپنی تمام دلکش رعنائیوں اور نزہت آرائیوں کے ساتھ اسی گلشن میں منتقل ہو کر آ گئی ہے یا بہار کی دیوی نے یہیں جنم لیا ہے۔

ڈرائنگ روم کے پس چلمن سعید بصد عزت ایک پرتکلف ریشمیں صوفہ پر بٹھایا گیا جس کے دوسری جانب شاہزادی جمال آرا معہ اپنی خواصوں کے فروکش تھی۔ اور

ہنگامِ جمال سے سارا کمرہ کیفیاتِ رنگ و بو میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔

شہزادی جمال آرا کی جانب سے ادیبہ نے سعید کی رسمی مزاج پرسی کے بعد کہا غالباً آپ شہزادی عالم جہاں پناہ کے شرائطِ مہر سے بخوبی واقف ہونگے۔

سعید۔ باوجود اس واقفیت کے بھی آرزو ہے کہ شہزادی صاحبہ اسے خود ہی فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ عین ذرہ نوازی ہوگی۔

ادیبہ۔ ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ آپ کی طرح کتنے ہی اولوالعزم نوجوان آئے اور حضور شہزادی صاحبہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر کے ایسے گئے۔ کہ پھر لوٹ کر خبر نہ لی۔ لہٰذا مجبوراً شہزادی صاحبہ نے یہ عہد کر لیا ہے کہ اب وہ براہِ راست کسی غیر مرد سے ہمکلام نہ ہونگی۔ یہ کہتے ہوئے ادیبہ نے کہنا شروع کیا :۔

ہماری شہزادی عالم پناہ دو بہنیں تھیں۔ اب سے چند سال پہلے اُن کی چھوٹی ہمشیرہ جہاں آرا بانو جن سے شہزادی عالم پناہ کو بے انتہا محبت تھی۔ عین سالگرہ کے دن پُراسرار طریق پر غائب ہو گئیں۔ ہر چند تلاش و جستجو کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا حتیٰ کہ اس واقعہ کے اکیسویں دن ریاست کے قریب والے قصبہ کے گھاٹ پر اُن کی نعش دستیاب ہوئی۔ گو کہ ان کے جسم کا اکثر حصہ آبی جانوروں کی خوراک ہو جانے کی وجہ سے شناخت نہ ہو سکا۔ تاہم جسم کے بعض لباس و زیورات سے ثابت ہوا کہ یہ ہماری شاہزادی جہاں آرا بانو کی نعش ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے شاہزادی عالم پناہ نے عہد فرما لیا۔ کہ اس وقت تک شادی نہ کریں گی۔ جب تک کہ اُن کی مظلوم ہمشیرہ کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ مگر اس وقت سے اب تک وقتاً فوقتاً متعدد لڑکیوں کی نعشیں دستیاب ہو کر خوف و ہراس کا سبب بن چکی ہیں۔ آج بھی ایک واقعہ اسی قسم کا تمہاری نظر سے بھی گزرا۔ بہر حال اگر تم شاہزادی جہاں پناہ کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی ذہانت و فراست کا بہترین ثبوت پیش کر کے ان کے انتقام کو پورا کرو۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کیا اسرار ہے نعشوں سے اس وقت تک سوائے دہشت و ہراس کے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔

سعید۔ یہ غلط ہے کہ نعشوں سے کوئی مفید نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔ آج میں نے جس نعش کا معائنہ کیا۔ ہے وہ محمد اسلم خاں کی حسین و جمیل دختر سعیدہ خانم اہلیہ عبدالحمید خاں پٹھان ساکن پنجاب کی نعش ہے جس کی شادی کو ہنوز ۲۔۳ سال سے زائد نہیں ہوئے وہ ستار بجانے میں مشاق تھی۔ یہاں سے ۲۰۰ میل شمالی جانب ساحل پر ایک مقام ہے۔ جہاں اس کی عصمت پر کل شب کو ۱۰ بجکر ۳۰ منٹ پر حملہ ہوا جب کہ وہ ستار بجا رہی تھی۔ اس پر حملہ کرنے والے دو شخص تھے۔ جن میں سے ایک دراز ریش ہے۔ جس کی ڈاڑھی کے بالوں کا ¼ حصہ سفید ہو چکا ہے۔ اور دوسرا بھورے بالوں والا ہے جس کے سر پر پٹھے دار بال ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک شخص موٹے دانوں کی تسبیح استعمال کرتا ہے جیسا کہ آجکل زاہدانِ بازاری خوش اعتقاد ملاؤں کو دھوکہ دینے کے لیئے بالالتزام استعمال کرتے ہیں۔ جس وقت سعیدہ خانم پر اچانک حملہ ہوا ہے وہ بے خبر تھی۔ لیکن اس پیکر عصمت نے اپنی کائنات عصمت کی حفاظت میں بہادری سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور بہت ممکن تھا۔ کہ وہ اپنے حریفوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی۔ کہ حملہ آوروں میں سے ایک تیسرے شخص نے عقب سے آکر اس کے سر پر ضرب لگائی جس سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ مگر ملعونوں نے بخوف افشائے راز مظلومہ کو اسی حالت میں دریا میں ڈال دیا۔

ادیبہ۔ (حیرت زدہ انداز میں) یہ حسنِ اتفاق ہے کہ آپ بدنصیب سعیدہ اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن حیرت تو اس بات کی ہے کہ مجرموں کے ارتکاب جرم کی نقل و حرکت کا راز آپ پر کیسے منکشف ہو گیا؟۔

سعید۔ یہ میں نے کب عرض کیا کہ میں سعیدہ یا اس کے خاندان سے واقف ہوں۔ یہ تمام باتیں جو میں نے عرض کیں محض نعش کے بغور معائنہ سے اخذ ہو سکتی ہیں۔

ادیبہ۔ اگر آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ معائنہ نعش سے آپ نے یہ

نتیجہ مرتب کیا ہے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ آپ کا
قیاس صحیح ہے

سعید۔ ہاں! جب تک آئندہ کے واقعات اس کی تردید نہ کریں
میں اپنا نظریہ قابلِ ترمیم خیال نہیں کرتا۔

ادیبہ۔ شاہزادی صاحبہ فرماتی ہیں کہ مہربانی فرما کر دلائل بیان
کیجئے کہ کن وجوہ سے آپ نے مقتولہ کے خاندانی حالات،
قتل کا صحیح وقت، قاتلان کا حلیہ، نیز مقام واردات وغیرہ
معلوم کر لیا۔

سعید۔ گو جذبۂ خودداری اجازت نہیں دیتا۔ کہ کسی ایسے میزبان
کے حضور اپنے نظریئے کی تشریح کی جائے لیکن عورت
کے مقابلہ میں مرد عالی حوصلہ واقع ہوا ہے اور اس لئے
بھی کہ آدابِ مہمانی سفارش کرتے ہیں۔ کہ میں معزز میزبان
کے حکم کو بسر وچشم بجالاؤں۔ عرض کرتا ہوں:۔

میں نے نعش کا معائنہ کیا ہے۔ نعش کی حالت سے صاف
عیاں تھا۔ کہ یہ نعش تازہ ہے۔ اور چونکہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا
شیشہ دھینگا مشتی سے چور چور ہو گیا اور گھڑی۔ ایک بجکر ۱۳ منٹ پر بند
ہو چکی تھی۔ اس لئے وقوعہ کا صحیح وقت۔ ایک بجکر ۱۳ منٹ باور کر لینا
حق بجانب ہے اور چونکہ نعش کے جسم پر قیمتی زیورات مثلاً یاقوتی بندے۔
ہیرے کے لونگ۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں موجود تھیں اس لئے
پتہ چلتا ہے کہ قتل زیورات کے لالچ سے نہیں کیا گیا ورنہ کوئی وجہ
مانع نہ تھی کہ زیورات چھوڑ دیئے جاتے۔ بلکہ اس کے برعکس نعش
ایک ایسی حسین وجمیل نوخیز لڑکی کی تھی جس کے حسن کی ضیا پاشیاں
ایک بوالہوس کے دل ودماغ میں ہیجان برپا کرنے کے لئے کافی سے
زیادہ تھیں۔ اس لئے یہ نظریہ قائم کرنا لازمی تھا۔ کہ اس عفت مآب
کے عصمت کے جگمگاتے ہوئے تاج کو پامال کرنے کی کوشش میں
اچانک حملہ کیا گیا۔ اچانک حملہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسے
وقوع پذیر ہونے والے ہولناک خطرہ کا علم ہوتا تو وہ یوں ستار
نوازی میں مصروف نہ ہوتی اور وقت وقوعہ ستار نوازی میں مصروف
ہونے کے لئے اس سے زبردست اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ
مقتولہ کی انگلی میں قتل کے بعد بھی مضراب موجود تھی اور یہ کوئی پوشیدہ
حقیقت نہیں کہ مضراب اس وقت استعمال کی جاتی ہے جس وقت
کہ ستار بجایا جائے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پوروے بنظرِ
غور دیکھنے سے پتہ چلا کہ ستار کے تاروں پر کثرت سے رقص
کرنے کے باعث انگلیوں میں تاروں کے نشانات پڑ گئے ہیں۔
جس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ کثرت سے ستار نوازی کی شائق تھی۔
بلکہ رات کے ایک بجے ستار بجانے میں مصروف ہونا جو ایسی نازنین
لڑکی کے لئے استراحت کا وقت ہو سکتا ہے۔ اس امر پر روشنی
ڈالتا ہے کہ اُسے ستار سے نہ صرف انس تھا۔ بلکہ عشق تھا۔ حملے
کے حالات اور مرتکبان کا حلیہ ان وجوہ سے معلوم ہو سکا کہ مقتولہ
کی مٹھیاں بند تھیں جن کے کھولنے پر ایک سے ڈاڑھی کے اور
دوسرے سے سر کے بھورے بال جو دھینگا مشتی میں گھسٹ کر رہ گئے
تھے برآمد ہوئے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ مقتولہ نے مدافعانہ جدوجہد
میں ایک کی ڈاڑھی اور دوسرے کے پٹھے مضبوطی سے پکڑ رکھے
تھے اور ان بالوں کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ مجرمان میں سے ایک
بھورے بالوں والا آدمی ہے جس کے سر پر پٹے ہیں اور دوسرے
کے منہ پر لمبی گھنی ڈاڑھی ہے۔ جس کے بالوں کا ۱/۴ حصہ سفید ہو چکا ہے
جو عموماً چالیس سال سے زائد عمر والے آدمی کے لئے ممکن ہو سکتا ہے
سفید بالوں سے مہندی کے خضاب کا پتہ چلا اور چونکہ بعض موئے
ریش جڑ سے اکھڑ اُٹھے تھے اس لئے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے آخری
مرتبہ خضاب ۲۰-۲۵ یوم قبل لگایا تھا کیونکہ اس عرصہ میں جو بال بڑھے
ہیں وہ سفید تھے۔ مقتولہ کے کپڑوں میں ایک بڑا موتی تسبیح کے
دانے کا نکلا۔ جو کشمکش کی حالت میں تسبیح کے ٹوٹ جانے کی وجہ
سے اتفاقیہ طور پر کپڑوں میں اُلجھ کر رہ گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ
مرتکبان تسبیح بھی استعمال کرتے ہیں۔ مقتولہ کے سر کے عقبی حصہ کے
بالوں کے نیچے ایک زخم بھی پایا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ
جس وقت پوری قوت سے مقابلہ کر رہی تھی۔ ایک کی ریش اور
دوسرے کے سر کے لمبے بال (پٹھے) پکڑ کر زور آزمائی میں مصروف
تھی۔ کسی آلہ کند مثلاً لاٹھی۔ سے یہ زخم پہنچایا گیا۔ چونکہ ضرب کے خون

ہراس اور غیظ و غضب میں مبتلا ہونے کے باعث دورانِ خون جسم میں اپنے تناسب سے زیادہ نہایت شدت و سرعت سے گردش کر رہا تھا۔ اس لئے اس اچانک ضرب سے مضروبہ کا بےہوش ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ جس کی تائید میں مضروبہ کی مٹھیوں کا بند ہونا اور ان میں بالوں کا موجود ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ مضروبہ فوراً بےہوش ہو گئی اور اُسے اسی حالت میں دریا کی خوفناک طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ افشائے راز کا امکان باقی نہ رہے۔ چونکہ نعش کی حالت بتاتی ہے کہ قبل اس کے کہ اسے ہوش آئے وہ غرق کر دی گئی۔ اس لئے پتہ چلتا ہے کہ مقام وقوع ساحل سے قریب تر ہے۔ کیونکہ اگر جائے وقوع زیادہ فاصلہ پر ہوتی تو مضروبہ کے ہوش میں آجانے کے باعث مٹھیاں کھل جاتیں۔ مضروبہ کی ریشمیں دراز زُلفوں میں ایک پہاڑی پھول بھی آویزاں پایا گیا۔ جسے اُس نے آرائش کے لئے لگایا ہوگا۔ اس لئے یہ کہنا بےجا نہ ہوگا۔ کہ وہ مقام لبِ ساحل ہونے کے علاوہ دامنِ کوہ میں ہے جہاں ایسے پھولوں کا ہونا ممکن ہے۔ یہ دریا شمال سے بہہ کر یہاں پہنچا ہے۔ جو شروع میں تو نہایت سرعت رفتاری سے بہا ہے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا ہے نشیب و فراز کی وجہ سے اسکی رفتار سست ہوتی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اب معمولی رفتار پر بہاؤ ہے۔ چنانچہ موجودہ بہاؤ کی رفتار بتا رہی ہے کہ اگر اس میں اس وزن کی نعش تیرائی جائے۔ تو اس کی رفتار فی گھنٹہ ۵ میل ہو سکتی ہے۔ اور نعش نے تقریباً ۱۰ ½ بجے رات سے بہنا شروع کیا ہے اور دن کے ایک بجے ریاست کے ساحل پر آ لگی ہے۔ گویا اس طرح اس نے ۱۴ گھنٹہ میں ۷۰ میل کی مسافت طے کی جس کے یہ معنی ہوئے کہ جائے وقوعہ یہاں سے ۶۰-۷۰ میل جانب شمال لبِ ساحل، دامن کوہ میں واقع ہے مقتولہ کا نام و پتہ اس طرح معلوم ہوا کہ وہ ایسا لباس زیب تن کئے ہوئے تھی جیسا کہ پنجاب کے مہذب شہروں میں مسلمان شریف گھرانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۶-۱۷ سال ہوگی۔ لیکن ناک میں ہیرے کی لونگ اور مانگ اور چوٹی اس کے سہاگ کا پتہ دیتی ہے اور اس کی تائید اس کاغذ سے بھی ہوتی ہے جو اس کے لباس سے ملا اور جو کسی خط کا حصہ تھا اور پانی میں دیر تک پڑے رہنے کے باعث بالکل گل گیا تھا۔ تاہم اس کے اس فقرہ سے یہ پتہ چلا "نور چشمی میں نے تمہارے شوہر عبدالمجید خاں کو بھی لکھا ہے" جس کا مرسلہ علیہ محمد اسلم خاں مقتولہ کا پدر تھا اور چونکہ بپابندی شاردا ایکٹ کسی لڑکی کی شادی ۱۴ سال سے کم عمر میں نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی شادی کا زمانہ ۱۴-۱۷ سال ہی ہو سکتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ اس کی شادی کو ۲-۳ سال سے زائد عرصہ نہیں ہوا ایک حد تک صحیح ہے۔ اس کے دستی رومال پر بخط طغرا نہایت نفاست اور سلیقہ کے ساتھ اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ اس کا نام سعیدہ خانم تھا جس سے اس کی قومیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہاں تک بیان کر کے سعید کے خاموش ہو جانے سے ہر طرف ایک گہری خاموشی مستولی ہو گئی۔ چلمن میں خواتین اس کی اس غیر معمولی ذہانت پر حیرت زدہ ہو کر عش عش کر رہی تھیں۔ اور ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر اس کی خداداد قابلیت کا اعتراف کر رہی تھیں کہ چلمن سے پھر ادیبہ کی آواز سنائی دی۔ معزز مہمان! شہزادی عالم پناہ آپ کی اس قابلانہ نتیجہ خیزی کو بہ نظر تحسین و پسندیدگی ملاحظہ فرما کر بہ اظہارِ خوشنودی آپ کو خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمانا چاہتی ہیں۔

سعید۔ میری محترم میزبان خوشا نصیب کہ شہزادی عالی وقار ایک بےخانماں اور پراگندہ حواس کو اپنے الطاف و اکرام بےپایاں سے اس طرح مشرف فرمائیں جس کے اظہار کے لئے بہ اندازۂ تاثر لفظوں کی عدم رسی اپنی بےمائیگی کی دلیل میں پیش کی جا سکتی ہے۔ بہر نوع شاہزادی صاحبہ کی یہی نوازش کیا کم تھی۔ کہ ایک غریب الوطن کو شرفِ باریابی سے سرفراز اور تلطف و کرم سے مشرف فرمایا۔ جن سے متاثر ہو کر اس دنیا میں دوبارہ زندہ رہنے کی کس کافر کو ہوس رہ سکتی ہے۔ ابھی ابھی احسانِ کرم سے سبکدوش ہو لینے دیجئے شاید یوں ہی کام

تمام ہو جائے۔
رہا یہ امر کہ شہزادی صاحبہ کا اس ناچیز خادم کو بھی عوام کے زمرہ میں شمار فرما کر براہِ راست تلطف تکلم سے محروم رکھنا اپنے حق میں بہتر ہی تصوّر کرتا ہوں۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ شادی مرگ ہو جاتی۔ لیکن اگر احترام مہمانداری مانع نہ ہوتا تو اس قدر مزید عرض کرنے کی جرأت کرتا۔ کہ یہ طرزِ عمل میری خود داری گوارا نہیں کر سکتی اور اگر وہ مجھے یہاں سے جلد رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہا ہو تو مجھے معاف فرمایا جائے۔
اس اظہارِ ناراضگی سے خواتین میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا اور قبل اس کے کہ وہ چلا جائے۔ ادیبہ نے کہا آپ کی ناراضگی سے شاہزادی صاحبہ کچھ متاثر ہوئے۔ آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ آپ سے خود گفتگو کریں گی۔ اس کے بعد ہی ایک باریک لیکن نہایت شیریں آواز سنائی دی۔ میرے محترم و عالی دماغ مہمان میں آپ کی اس خداداد ذہانت و فراست اور قدرتی و فطری قابلیت کی داد دینے سے قاصر ہوں۔ میں آپ کی ذات سے بہت کچھ توقعات وابستہ کر چکی ہوں۔ مجھے اعتراف ندامت ہے کہ میرے اس اخلاق سوز طرزِ عمل سے آپ جیسے معزز مہمان کو دلی اذیت پہنچی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری مجبوریوں پر نظر رکھتے ہوئے معذور سمجھ کر معاف کیا جائے گا۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ میں ایک سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ اس غلطی کی کس طرح تلافی کروں۔
سعید۔ عالیجاہ! یہ التفات و کرم کافی سے زیادہ تلافی کا معاوضہ ہے۔ کیا یہ کم کہا جا سکتا ہے کہ آفتاب مہر گستری سے ذرۂ کمتر کو منور بنا رہا ہے۔ میں خود مجوب ہوں کہ شاہدِ طور کی طرح کیوں ہمکلامی کی جسارت کی۔
شہزادی۔ آپ کی اس عنایت کا شکریہ۔
سعید۔ مہرعالم مجھے مزید شرمندگی کی سزا دیئے بغیر چند استفسارات کا جواب مرحمت فرمائیں۔
شہزادی۔ فرمائیے میں حتی الوسع تعمیلِ حکم کی کوشش کرونگی۔

سعید۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ممدوحہ نے عہد فرما لیا ہے کہ تا انتقام کسی کی زینت آغوش نہ بنیں گی اور ازدواج کی مبارک کڑی میں منسلک نہ ہوں گی۔
شہزادی۔ جی ہاں۔
سعید۔ مہربانی فرما کر یہ فرمائیے کہ وقتِ اغوا شاہزادی جہاں آراء کا حلیہ اور عمر کیا تھی اور لاش دستیاب ہونے کے بعد کون کونسا حصۂ جسم معدوم ہو چکا تھا۔
شہزادی۔ معصومہ کی عمر وقتِ اغوا ۱۱ سال تھی اور وہ خوبصورت نازک اندام پست قامت تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں بڑی تھیں۔ ناک ستواں تھی۔ جب اس کی نعش دستیاب ہوئی تھی تو وہ پانی میں پڑے رہنے کے باعث خراب اور ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں اس کا سر چہرہ اور جسم کا بعض مخصوص حصہ آبی جانوروں کی خوراک بن چکا تھا۔ صرف لباس و زیورات ہی ایسی چیزیں تھیں جن سے نعش شناخت ہو سکی۔
سعید۔ کیا میں ان کے جسم سے برآمد شدہ زیورات دیکھ سکتا ہوں۔
شہزادی۔ کیوں نہیں؛
اس کے بعد حسب الحکم خزانہ سے زیورات کا صندوقچہ طلب کیا گیا اور ایک مخملی ڈبے سے ایک ہیرے کا ہار۔ یاقوت کی لونگ اور پکھراج کی انگشتری نکال کر سعید کو دکھائی گئی اور بتایا گیا کہ انگشتری برہما میں بارہ سو کا ہار کلکتہ میں ۳ ہزار کا لونگ بمبئی میں دو ہزار دو سو میں خریدی گئی تھی۔ ان کو دیکھ کر سعید نے تبسم کیا اور کہا کہ ایک التجا اور ہے کہ میں ایک نظر دفن شدہ لاش کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ زیورات بھی سربمہر کر لئے جائیں اور میرے طلب کرنے پر مجھے پھر دکھائے جائیں۔
شہزادی۔ میں خیال کرتی ہوں کہ اب نعش کا معائنہ بیکار ہے کیونکہ اب اسے اتنا زمانہ ہو چکا ہے کہ کسی مفید نتیجہ کے برآمد ہونے کی توقع نہیں رہی۔

سعید ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لئے نعش کا معائنہ کرنا ضروری ہے۔

شہزادی ۔ اگر آپ کی رائے ایسی ہی ہے تو مجھے بھی کوئی انکار نہیں ہے ۔ کل صبح میں خود آپ کی معیت میں معصومہ کی قبر پر چلوں گی ۔

(۴)

دوسرے دن قبل اس کے کہ آفتاب اپنی ضیا باریوں سے کائنات کو روشن کرے ۔ سعید سراغرساں عشرت منزل میں حاضر ہوا ۔ شہزادی کے گرد ایک نقاب پوش پرستان تھا ۔ اور شہزادی اس وقت سیاہ گراں جیسے لباس میں ملبوس تھی ۔ اس کے چہرہ پر ایک باریک قرمزی نقاب پڑا ہوا تھا جس کی جالیوں سے اس کے حُسن کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر گرد و پیش کی ہر شے کو قوسِ قزح کی رنگینیوں میں تبدیل کر رہی تھیں ۔ صبا کی نزہت سے اس کے سنہری بال دوش پر لہرا رہے تھے ۔ سعید نے بعد آداب شاہانہ فرشی سلام کیا جس کے بعد سب موٹروں میں سوار ہو کر خانقاہ پہنچے جو ریاست سے دو میل کے فاصلہ پر تھا ۔ غلاموں نے نہایت سرعت سے قبر کے تعویذ کو کھود کر علیحدہ کیا اور پتھر ہٹایا گیا ۔ آہ ! وہ ناز و نعم کی پروردہ معصوم شہزادی جو کبھی اپنی مخمور آنکھوں سے مستیوں کی بارش اور اپنے پُرکیف تبسم سے فضا کو بجلیوں سے معمور کر دیتی تھی آج فرشِ خاک پر بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ امتدادِ زمانہ نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا ۔ اب تو صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا ۔ شہزادی اس نظارہ سے متاثر ہو کر رونے لگی ۔ سعید جو اس وقت تک ڈھانچہ کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اپنے خیالات سے چونکا اور شہزادی صاحبہ کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا شہزادی مغفورہ کو کبھی ٹھوکر لگی تھی جس سے ان کے پیر کا ایک ناخن خراب ہو گیا تھا ۔

شہزادی رومال سے اپنی اشک آلود آنکھوں کو پونچھتے ہوئے ! ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ ہاں البتہ ایک مرتبہ شہسواری کے اتفاقی حادثہ سے اس کی کلائی کی ہڈی ضرور ٹوٹ گئی تھی اور بعد صحت شہزادی کی بے احتیاطی سے خفیف سا نقص رہ گیا تھا ۔ جو غور کرنے سے اب بھی معلوم ہو سکتا ہے ۔

سعید ۔ شہزادی صاحبہ مبارک ہو کہ آپ کی ہمشیرہ جنہیں آپ مُردہ سمجھ چکی ہیں ہنوز زندہ ہیں ۔

شہزادی ۔ چونک کر یہ آپ کیسے کہتے ہیں !

سعید ۔ یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ مجھے بتا رہا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ عزیزہ خدا کے فضل و کرم سے صحیح و سالم ہیں اور اس وقت اپنے دشمنوں کی قید میں عنفوانِ شباب کی اوّلین منزلوں سے گزر رہی ہیں ۔

شہزادی ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ کہ آپ کیا فرما رہے ہیں ۔ میں نے تو آج تک کسی کو ہڈیوں کے ڈھانچہ سے ہمکلام ہوتے دیکھا تو کیا کبھی سنا بھی نہیں ۔

سعید ۔ کاش شہزادی عالم پناہ ان ہڈیوں کے ڈھانچے کی گفتگو کانوں کے بجائے آنکھوں سے سُننے کی کوشش کرتیں تو خدا جانے کیا کیا منکشف ہو جاتا ۔ اور زیادہ حیرت اس بات سے ہوتی کہ جب ڈھانچہ زبانِ حال سے کہتا کہ اے شہزادی غم نہ کر بلکہ خوش ہو کہ تیری بہن قید حسیات میں ایام زندگی بسر کر رہی ہے ۔ اس کی موت کا یقین دلانے کے لئے مجھ غریب کو موت کے گھاٹ اُتار اگیا ۔ میرے حُلیہ کو ناقابلِ شناخت بنا دیا گیا اور جہاں آرا کا لباس اور مصنوعی زیورات پہنا کر مجھے دریا میں ڈال دیا گیا ۔

شہزادی ۔ یا اللہ ۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ۔ میں تو اس کا کچھ بھی مطلب نہیں سمجھی ۔ خدا کے لئے صداقت بتایئے کہ یہ کیا معاملہ ہے ۔

سعید ۔ شہزادی صاحبہ جس وقت ، آپ نے مجھے بتایا تھا کہ نعش کا سر اور چہرہ اور خاص خاص اعضا غائب تھے اور انکی بابت خیال تھا ۔ کہ آبی جانوروں کی خوراک ہو گئے اور بعض پانی میں پڑے رہنے کے باعث ناقابلِ شناخت ہو گئے تھے ۔ تو اُسی وقت میرے دماغ میں ایک

خیال بجلی کی طرح آیا جس کی تصدیق کے لیئے میں نے زیورات طلب کیئے۔ زیورات کے دیکھنے سے میرے قیاس کی تصدیق ہوئی۔ اس لیئے نعش دیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چنانچہ اب مجھے کافی تسلی ہو گئی۔ کہ وہ نعش آپ کی ہمشیرہ کی نہ تھی بلکہ ایک ۱۲ سالہ غریب لڑکے کی تھی۔

شہزادی - ذرا مجھے بھی سمجھائیے۔ کہ آپ یہ کس دلیل سے فرماتے ہیں۔

سعید - آئیے خود میں آپ کو ڈھانچہ سے ہمکلام کرادوں۔

(سعید ڈھانچہ کے ایک حصہ کو بتاتے ہوئے) ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کولھے کی ہڈی ہے عورت اور مرد کے ڈھانچہ کی شناخت صرف اسی ہڈی سے ہوسکتی ہے۔ ورنہ اور کوئی ذریعہ شناخت کا نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ہڈی بتاتی ہے کہ یہ نعش کسی لڑکی کی نہیں بلکہ لڑکے کی ہے۔ اب سوال ہے تو صرف یہ کہ یہ لڑکا ہے کس قوم کا؟ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس قدر ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ کسی غریب قوم کا لڑکا ہے۔ اس کے علاوہ شہزادی صاحبہ کی بابت یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ اُن کی کلائی کی ہڈی اتفاقیہ حادثہ سے ٹوٹ کر درست ہو چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہڈی ٹوٹنے کے بعد جڑ بھی سکتی ہے۔ لیکن اس کا نشان نہیں جاتا۔ مگر اس ڈھانچہ کی داہنی کلائی ملاحظہ فرمائیے بالکل صاف ہے۔ گویا اس کی ہڈی کو کبھی کوئی صدمہ ہی نہیں پہنچا۔ پھر شہزادی کو نحیف الجثہ اور بڑے سر اور آنکھ والی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس کے برعکس ہے ڈھانچہ کا کاسۂ سر جسم کے تناسب سے چھوٹا ہے اور آنکھوں کے گڑھے بتاتے ہیں۔ کہ آنکھیں بڑی نہ ہوں گی۔ اس کے علاوہ ناک کی ہڈی بتلاتی ہے کہ ناک چپٹی ہوگی۔ پھر ملاحظہ فرمائیے کہ داہنے پیر کی بیچ والی انگلی کا ناخن خراب ہے جو اکثر برہنہ پا رہنے اور بے احتیاطی سے سخت ٹھوکر کھانے سے ہی خراب ہوسکتا ہے۔ اسی کی بابت میں نے دریافت کیا تھا۔ کہ کیا اُن کا کوئی ناخن خراب تھا۔ کیونکہ مجھے تعجب تھا کہ ایک شہزادی کا برہنہ پا پھرنا کیونکر قرین قیاس ہوسکتا ہے چنانچہ اسی سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ڈھانچہ جس بدنصیب لڑکے کا ہے وہ نہایت مفلوک الحال ہوگا جس کو جوتہ نہ میسر آنے کے سبب برہنہ پا پھرتا ہوگا۔ کسی سخت ٹھوکر سے اسکا ناخن خراب ہو گیا لیکن علاج نہ کرا سکا۔ علاج نہ ہونے سے اس کی مجبوریوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پھر تمام ہڈیوں کا تناسب بتا رہا ہے کہ وہ گداز جسم کا ہوگا نہ کہ نحیف الجثہ۔ یہ دیکھیئے کھوپری کے پیچھے شدید ضرب لگائی گئی ہے۔ جو اس کی موت کا باعث ہوئی۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکا بیخبری میں پوشیدہ طور پر قتل کیا گیا ہے۔ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شہزادی عالم جیسی نازک اندام نازنین کو اس درجہ سختی سے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ وہ معمولی طور پر گلا گھونٹ کر بھی ابدی خواب راحت میں سُلائی جاسکتی تھی۔ لائیے زیورات جو نعش کے جسم سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ تمام جواہرات نقلی ہیں۔ نہ کہ اصلی جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ سازش کر کے شاہزادی صاحبہ کو اغوا کیا گیا۔ اور چونکہ شہزادی کا غائب ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس لئے مجرم نے اُن کی موت کا یقین دلانے کے لیئے یہ چال چلی کہ ایک غریب لڑکے کو قتل کر کے اس کے سر، چہرہ اور بعض اعضا کو تراش خراش کر بگاڑ دیا۔ پھر نعش کو پانی میں ڈال کر اور بھی خراب کیا پھر اسے یہ نقلی زیورات اور شہزادی صاحبہ کا لباس پہنا کر گھاٹ پر لاکر ڈال دیا اور اپنی کامیابی پر مطمئن ہو گئے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت شہزادی صاحبہ عنفوان شباب کی سرمستیوں میں محو ہیں۔

شہزادی (خوش ہو کر) یہ کیسے؟

سعید - یہ تو بہت معمولی بات ہے شہزادی صاحبہ کو غائب ہوئے تین سال سے زائد ہوئے۔ اور وقت اغوا اُن کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ تو اس حساب سے اس وقت اُن کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال ہونا چاہیئے جو نسوانی شباب کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔

شہزادی - میں حیران ہوں کہ آپ کی اس خداداد ذہانت کی کن لفظوں میں تعریف کروں۔ آپ کے قول کی ایک اور واقعہ سے بھی تائید ہوتی ہے کہ گزشتہ سال ایک سنسنی خیز واقعہ

موصول ہوا تھا کہ اگر پچاس ہزار روپیہ کوہ ابابیین کے غار میں رکھ دیا جائے تو میں آپ کی ہمشیرہ کا صحیح پتہ بتا دوں لیکن چونکہ ہمیں ان کی موت کا کامل یقین ہو چکا تھا۔ اس لئے اس خط پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی اور بیکار سمجھ کر تلف کر دیا گیا۔ لیکن احتیاطاً ہم نے اپنا آدمی کوہ ابابیین کے غار میں پوشیدہ طور پر بھیج دیا جس نے یہ اطلاع دی کہ وہاں ایک فقیر کی نعش کے سوا کچھ نہیں ملا۔

سعید۔ وہ خط ٹھیک تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقیر اسی گروہ کا آدمی ہے جس نے شہزادی صاحبہ کو اغوا کیا ہے جب آپس میں رنجش پیدا ہو گئی تو اس طرح اس نے فائدہ حاصل کرنا چاہا لیکن افسوس کہ اس کے پیچھے جاسوسوں نے اس کی اس حرکت کی اطلاع کر دی اور وہ اسی غار میں جہاں وہ روپیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ ہلاک کر دیا گیا۔ بہر حال آپ مطمئن رہئے میں انشاء اللہ تعالیٰ اس گروہ کا جلد پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر آنجنابہ کا اقبال شامل حال رہا تو بامراد واپس آؤں گا۔ کل قبل اس کے کہ آفتاب بلند ہو کر آپ کے محل کے سب سے بلند کنگورے کو بوسہ دے میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مجھے صرف اپنے یہاں کا سب سے پرانا کبوتر دے دیجئے تاکہ اگر میں اسے کسی جگہ سے اپنی اطلاع کے لئے چھوڑوں۔ تو وہ آپ کے یہاں چلا آئے۔

شہزادی۔ مجھے یہ جدائی کے ایام بہت شاق گزریں گے۔

سعید۔ میں استدعا کرتا ہوں کہ آپ خدا کے لئے ایسے الفاظ نہ اپنے منہ سے نکالیں جنھیں سن کر میں مارے خوشی کے دیوانہ ہو جاؤں۔

اس کے بعد موٹر پر سوار ہو کر سب قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۴)

فردوسی خانقاہ فلک بوس پہاڑ کی پیچیدہ گھاٹیوں کے عقب میں خودرو الجھی ہوئی جھاڑیوں کے کنج میں طلسم سربستہ کی طرح واقع تھی جس کے مخصوص کمروں اور پوشیدہ تہ خانوں سے جو بھول بھلیوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ خانقاہ کے چند معتمد راز دان خادموں کے سوا کوئی بھی واقف نہ تھا۔ سامنے پہاڑی ندی چنچل رقاصہ کی طرح بل کھاتی ہوئی نہایت سرعت خرامی سے بہ رہی تھی۔ حضرت فردوسی شاہ سجادہ نشین اور خانقاہ کے مالک اپنی اس کرامت کے لئے نہایت مشہور تھے کہ آپ نے اپنے اکثر مریدوں کو عالم حیات میں فردوس کا نظارہ کرا دیا تھا اور یہی کشش تھی جو کبوتر شاہ جیسے کیمیاگر قلندر کو دور دراز سے کھینچ لائی تھی۔ کبوتر شاہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے مرشد اعظم کمل شاہ نے ایک حسین نوجوان کو مرید کیا جو انھیں کی خدمت میں وفات پا گیا۔ یہ کبوتر اس کے پاس سے دستیاب ہوا تھا اس میں اس کے نفس کو قید فرما کر ان کے حوالے کر دیا گیا تھا اسے وہ نہایت حفاظت سے رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ کمل شاہ نے کبوتر شاہ کو کیمیا کا مکمل نسخہ بھی مرحمت فرما کر تمول سے مالامال کر دیا تھا۔

چنانچہ آج حضرت فردوسی شاہ کے حضور سونا بنانے کا پروگرام طے ہوا تھا اور اسی کے انصرام میں کبوتر شاہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگل گیا ہوا تھا اور وہ شام کو واپس آیا تھا۔ چنانچہ فردوسی شاہ مع اپنے معتمد قلندروں کے منتظر تھے کہ کبوتر شاہ نے اپلوں کا ڈھیر لگایا جس کے اندر گھریا میں پارہ رکھ کر بوٹیوں کا عرق نچوڑا اور پھر گھریا کے منہ پر ایک اپلہ رکھ کر بقیہ اپلوں سے ڈھک کر آگ دے دی۔ لیکن فردوسی شاہ اور ان کے ہمنواؤں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ پارہ سونا ہو گیا۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس نے کبوتر شاہ کو امتیازی خصوصیت حاصل تھی اور جس سے کبوتر شاہ کو امتیازی تفوق حاصل ہو گیا تھا گو فردوسی شاہ کے پاس دست غیب سے زر و جواہر اور قیمتی زیورات کی ریل پیل رہتی تھی۔ تاہم یہ نسخہ ذہب معلوم کرنے کے لئے زمرۂ مریدین خاص میں داخل کر کے اعلان کر دیا کہ مابدولت کبوتر شاہ کو اس کا مقام

فردوس جو بعد مرگ حاصل ہوگا۔ اس کو زندگی ہی میں دکھانا
چاہتے ہیں۔

چنانچہ شام کو کبوتر شاہ دار المراقبہ میں حضرت فردوسی شاہ
کے حضور میں پیش ہؤا۔ کمرہ مکلف سامان سے آراستہ تھا اور شمع کافوری
سے جگمگا رہا تھا۔ عود سوز ان سے ایک خاص قسم کی خوشبو کمرہ کو معطر
کر رہی تھی یکایک کبوتر شاہ کا سر چکرانے لگا اور غنودگی طاری
ہونے لگی حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس
کے کانوں میں غیر مرئی گانے والوں کے دلکش ترانے گونجے
کسی نے تیز مسرکے کا بھیگا ہؤا اسپنج اُسے سُنگھایا جس سے اسے
ایک چھینک آئی اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے اپنے آپ
کو حسینوں کے جھرمٹ میں ایک نہایت پُر تکلف گلزار میں پایا اس
نے ان سے متعجبانہ لہجہ میں دریافت کیا کہ اس مقام کا کیا نام ہے اور
تم سب کون ہو؟

کہ ایک حسینہ نے آگے بڑھ کر بصد ادب خم ہو کر عرض کیا کہ
آپ اس وقت فردوس کے اس مقام پر ہیں جہاں بعد وفات آنا
ہوگا۔ ہم سب فردوس کی حوریں ہیں۔

کبوتر شاہ۔ وہ سامنے کس کی کوٹھی ہے۔

ایک حور (ایک ادائے دلبری سے تبسم ریز ہو کر) حضور والا یہ
کوٹھی نہیں بلکہ آپ کا قصر ہے۔

کبوتر شاہ۔ اچھا تو اب گویا میں فردوس میں موجود ہوں مجھے
دُنیا میں طوبیٰ کے درخت دیکھنے کا بہت شوق تھا مجھے
اُس کے پاس لے چل۔

حور۔ وہ تو برباد کرادیا گیا۔ کیونکہ اس پر فردوسی طیور بسیرا لیتے
تھے اور بیٹ کرکے ناپاک و نجس کرتے تھے۔

کبوتر شاہ۔ مجھے پیاس لگی ہے میں دودھ اور شہد کی نہروں سے
محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔

حور۔ چونکہ اُن کی وجہ سے تمام فردوس میں چپچپاہٹ اور مکھیوں
کی بھنبھناہٹ رہتی تھی جو اہلِ فردوس کو ناگوار ہوتی ہے
اس لئے وہ نہریں قطعی طور پر منسوخ کردی گئیں۔

کبوتر شاہ۔ میں نے دنیا میں سُنا تھا۔ کہ فردوس میں انگور کا خوشہ اتنا
بڑا ہوتا ہے کہ اگر کوّا اس کے گرد برابر ۱۰ ہزار برس تک
پرواز کرتا رہے تو ایک چکر ہو سکے لیکن یہاں تو میرے
تصوّر کے خلاف ہماری دُنیا ہی کے خوشوں کے برابر ہیں۔

حور۔ جی ہاں! ابتدا میں فردوس کے انگوری خوشے اسی قدر
بڑے ہوتے تھے۔ لیکن اہلِ فردوس نے ان کے خلاف
پروٹسٹ کیا۔ اس لئے اب ان خوشوں کی یہ صورت
ہوگئی ہے۔

کبوتر شاہ۔ مجھے عُلماء نے بتایا تھا۔ کہ اہلِ فردوس جس پھل کی
خواہش کریں گے وہ خود بخود اپنی شاخ سے ٹوٹ کر
اس کے لبوں کے قریب آجائے گا۔ لیکن میں نے امتحاناً
ایسا ارادہ کیا مگر کسی ایک پھل نے بھی اپنی شاخ سے جنبش
نہ کی اس کی کیا وجہ ہے۔

حور۔ اس امر میں بہت کچھ قوّت ارادی کو دخل ہے۔ چونکہ
حضور والا جسم مادّی کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں۔ اس لئے
قوّت ارادی میں وہ طاقت نہیں ہے۔ لیکن جب آپ
بعد از وفات تشریف فرما ہوں گے تو چونکہ جسم خاکی جو
اس قوّتِ ارادی میں خارج و مانع ہے ہوگا نہیں لہذا
اس وقت آپ کی قوّتِ ارادی کی کشش سے ہر میوہ خود
بخود کھنچ آئے گا۔

کبوتر شاہ۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ یہاں آم کے درخت بھی
بکثرت موجود ہیں جن کا قرآن، حدیث، و فقہ کی کتابوں
میں ذکر نہیں۔

حور۔ جی ہاں! یہ کوئی ضروری و لازمی بات نہیں کہ جنت کے
ہر ایک درخت اور میوہ کا تذکرہ کیا جانے۔ اگر ایسا کیا جاتا
تو طلسم ہوش رُبا کی طرح ضخیم دفتر ہو جاتا۔

کبوتر شاہ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موسم کے لحاظ سے بعض درخت
پھل چکے ہیں اور بعض خزاں رسیدہ۔ یہ کیا بات ہے۔

حُور۔ مگر بارہ ماہ۔ پھل ہر قسم کے مہیا و موجود رہتے تو انسان اُکتا جاتا اور پھر اس کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہ رہتی اس لئے مشیت ایزدی نے موسموں کے تغیر کے ساتھ دنیا کی طرح فردوس میں بھی وہی جاری کر دیئے ہیں۔

کبوتر شاہ۔ اچھا تو میں اب سمجھا کہ فردوس میں بھی وہی باتیں ہیں جو دنیا میں ایک متموّل انسان کے لئے چمنستان میں ہو سکتی ہیں۔

حُور۔ کیا آپ نے قرآن شریف کی اس آیت کا مطالعہ نہیں فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت یہ کہیں گے کہ ارے یہ تو ویسی ہی چیزیں ہیں۔ جیسی کہ دنیا میں تھیں

یہ باتیں کرتا ہوا کبوتر شاہ قصر فردوسی میں پہنچا۔ جہاں اس کا مہ جبین نامی حُور نے پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہ مہ جبین حور بہت ہی حسین و جمیل تھی اُس کے حُسن کی شعاعیں پھُوٹی پڑتی تھیں۔

مختصر یہ کہ تمام دن فردوس کی سیر و سیاحت اور نکتہ چینی میں مصروف رہا اور مہ جبین سے اچانک سوال کر بیٹھا کہ فردوس میں ایسا کونسا حادثہ پیش آگیا جس کی وجہ سے تمہاری کلائی ٹوٹ کر خراب ہو گئی۔ مہ جبین اس غیر متوقع اچانک سوال پر سٹپٹا سی گئی لیکن اس نے فوراً ہی آئندہ خطرات اور نزاکتِ وقت کا احساس کرتے ہوئے جذبات پر قابو پا لیا اور مصنوعی تبسم کے ساتھ گویا ہوئی میرے داہنے ہاتھ کی کلائی ٹوٹنے کی مختصر روئداد یہ ہے کہ ایک مرتبہ شامتِ اعمال سے اسی ہاتھ سے نافرمانی ہو گئی تھی کہ قہر الٰہی کا غیبی کوڑا کلائی پر اس زور سے پڑا کہ اُس کی شدتِ ضرب سے ہڈی ٹوٹ گئی اور بطور امتیازِ خطا کلائی بدنما ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک بیان کرنے کے بعد بغیر مزید موقعہ بحث دیئے کہ آیا فردوس میں بھی گناہ، قصور، غلطی، خطا کا امکان ہے یا نہیں۔ بات کا پہلو بدل دیا اور بولی کہ ہاں اُس وقت آپ شراباً طہوراً کی نسبت کیا فرما رہے تھے۔

کبوتر شاہ۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اس شراب میں نشہ ہے یا نہیں۔

مہ جبین حُور۔ اس میں ایک کیف نوری ہے جس کے پینے کے بعد انسان خدا کے نور میں کھو جاتا ہے (ایک جام پیش کر کے) ملاحظہ فرمائیے کیسا خوبصورت رنگ ہے معلوم ہوتا ہے تمام دنیا کے شعلہ آتشیں جمع کر کے اس جام میں قید کر دیئے گئے ہیں۔ خوشبو کا وہ عالم ہے کہ نکہتیں مست ہو ہو کر لڑکھڑاتی پھرتی ہیں۔ اس کو نوش فرمائیے یہ شربت الحریم فردوس کا بہترین تحفہ ہے۔

شربت نوش کرنے کے بعد کبوتر شاہ خود رفتہ ہو کر بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے کو اسی جگہ دار المراقبہ میں پایا اور طرفہ یہ کہ جو جس حالت میں تھا اسی حالت میں نظر آیا اور گھڑی کی سوئی صرف ایک منٹ آگے ہوئی تھی۔ گویا یہ تمام واقعات ایک منٹ میں ہوئے تھے۔ کمرہ کی ہر چیز اپنی اسی حالت میں تھی۔ سوائے اس کے کہ عود سوزاں اب خاموش تھے۔ کبوتر شاہ اس حیرت انگیز کرامت سے متاثر ہو کر حضرت فردوسی شاہ کے قدموں پر گر پڑا اور بعد عقیدت و احترام عرض کرنے لگا کہ یا حضرت اپنے تصرّف اور توجہ کرم سے ان چند لمحات میں حضور نے مجھ پر وہ کچھ منکشف فرما دیا جس کا معلوم کرنا قبل الحشر ناممکن و محال تھا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں سابق مرشد کاملین کمل شاہ سے بیعت فسخ کرنے کے اعلان میں ان کے کبوتر کو آزاد کر دوں۔ حضور والا فردوس میں ایک ایسی نایاب چیز میری نظر سے گزری ہے جس کے بعد دنیا کی تمام دولتیں ہیچ اور تمام حکومتیں بے حقیقت ہیں اور کیمیا گری تو ایسی ہے جیسے آفتاب کے سامنے ٹمٹماتا ہوا چراغ۔

فردوسی شاہ۔ جلد کہو وہ کونسی چیز ہے۔

کبوتر شاہ۔ عالیجاہ وہ عجیب و غریب چیز ایک خوبصورت پتھر کا ٹکڑا ہے جس کو پارس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میرے سابق مرشد مرحوم نے مجھ کو اس کے خواص و حلیہ سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا اور خدا بخشے وہ اسی جستجو و تلاش میں فردوس کے ہو گئے لیکن نہ ملنا تھی نہ ملی۔ میں نے جس وقت اس کو اس کس مپرسی کی حالت میں پڑا پایا تو بہت تعجب ہوا اور مجھ کو یقین نہ آیا کہ یہ وہی پارس ہے جس کی تلاش میں نہ معلوم کتنی عمریں تمام ہو چکی ہیں۔ لہذا میں

نے امتحاناً اس کو ایک نعلِ آہنی سے مس کیا جس کی تاثیر سے وہ سونا ہو گیا۔

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک طلائی نعل کا ایک ٹکڑا نکال کر حضرت فردوسی شاہ کے دست حق پرست پر رکھ دیا اسے دیکھ کر شاہ صاحب بہت ہی متاثر ہوئے اور فرمایا کہ اے نورِ نظر تم نے پارس کو کیا کیا؟

کبوتر شاہ - یا حضرت میں نے وہیں فردوس کے کنج میں پوشیدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ کہ جب واپس پہنچنے لگوں گا تو حضور کے نذرانہ کے لئے لیتا چلوں گا۔ لیکن خلاف اُمید و توقع حضورِ انور نے یکایک توجہ ہٹالی اور میں پھر عالمِ اسباب میں حضور والا کے قدومِ میمنت لزوم میں باریاب ہو گیا۔

فردوسی شاہ - اس جگہ کا کیا پتہ ہے جس جگہ تم نے وہ پتھر پوشیدہ کیا ہے۔

کبوتر شاہ - یا حضرت میں فردوس میں نو وارد تھا اور چونکہ فردوس میں شمال و جنوب مشرق و مغرب کی سمتیں تو تھیں ہی نہیں جو عرض کر سکوں۔ مقام سے واقف ہوں۔ لیکن اس مقام کا پتہ بتانے سے مجبوری ہے۔ کیونکہ خود مجھے بھی معلوم نہیں۔

فردوسی شاہ - اچھا کچھ پروا نہیں آئندہ جمعرات کو ہم خود تمہاری فردوس کو چلیں گے۔

اس کے بعد کبوتر شاہ بہ نظر اظہار عقیدت و ترک تعلق کمال شاہ، کبوتر جس کو وہ اس وقت تک جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ رہا کر دیا۔ جو آزاد ہو کر آسمان میں غائب ہو گیا۔ دیکھنے والوں کا یہ بھی بیان ہے کہ ایک خط بطور استعفا، لکھ کر کبوتر شاہ نے اس کے گلے میں باندھ دیا تھا کہ اب آپ سے اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

(باقی آئندہ)

افکارِ زیب

از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی

ملک وہ ناقص تھا جسکا اقتصادی کاروبار
اپنے ہم چشموں میں ادنیٰ انداق لیے وقار

ہو نہ برہم کیوں اُلٹ دی ہیں فنے عالم کی بساط
خیر گزری سہل ہی نکلا مرے دل کا غبار

میں جو اپنے ضبط و ہمت کا غلط دعویٰ کروں
روک کب سکتا ہے کوئی گریۂ بے اختیار

دل سے مجھ کو شکوۂ ناسازگاری ہو تو ہو
ورنہ تھا تیرا زمانہ تو ہمیشہ سازگار

قوم جو کرتی رہی اپنے سلف کا احترام
اُسکی حرمت کا رہا قائم جہاں میں اعتبار

اس سے بدتر حرصِ انساں کی نمائش ہوگی کیا؟
کوڑیوں پر بٹ رہے ہیں اچھے اچھے تاجدار

فیضِ خانِ حق سے کوئی جا کے پوچھے آج زیب
پیشِ باطل کتنا بے موقع ہے اُن کا انکسار

حُقّہ

ایک پُرلطف مزاحیہ مضمون!

(از جناب سید مقبول حسین صاحب۔ احمد پوری)

حقہ سب سے پہلے اکبر بادشاہ کے درباری طبیب نے ایجاد کیا اس کی سوانحعمری اس طرح ہے۔

سر ٹامس رو یا ان کے کسی دوسرے ہم مشرب کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ جب اکبر بادشاہ کے دربار میں انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے باریابی ہوئی تو منجملہ دیگر تحایف کے ایک سگار تمباکو کا چھوٹ بھی پیش کیا۔ تمباکو دنیا کے کسی حصہ میں پیدا نہ ہوتی تھی سوائے امریکہ کے۔ امریکہ جب دریافت ہوا تو تمباکو کا رواج یورپ میں عام ہو گیا اور وہاں اس کے سگار بننے لگے سلطنت مغلیہ کے زمانے میں اس کا رواج یورپ میں ہو چلا تھا الغرض اکبر بادشاہ کو جب اس کی خصوصیت کا علم ہوا تو اس کے استعمال کو بھی جی چاہا۔ بادشاہ نے ایک ہی کش لیا تھا کہ سکر آور بیہوشی سی طاری ہو گئی! اور چھوٹ پیش کرنے والے کو فوراً حراست میں لیلیا گیا کیونکہ بہ سبب دشمناں بادشاہ کی جان خطرے میں تھی۔ جب بادشاہ کو ہوش آیا تو وہی چیز پھر طلب کی۔ درباری طبیب نے تمباکو کو خوب اچھی طرح جانچا اور کہا کہ اس میں ہیئت نہیں ہے۔ بلکہ محض مادہ کی تیزی ہے۔ لہٰذا کسی قسم کا اندیشہ نہ کیا جائے۔ البتہ اس کی مصلح اشیا سے اس کو مرکب کر کے پانی کی سطح سے ملائیں۔ تاکہ رہی سہی ہیئت پانی میں رہ جائے۔ اور صاف دھواں منہ تک پہنچے اس طرح اس کے دھوئیں کا مصلح پانی قرار دیا گیا۔ اور حقے کی شکل کی ایک شے طبیب نے ایجاد کی اور یوں حقہ ہندوستان میں رائج ہو گیا۔ کڑوا خمیرہ۔ بیس۔ پچاس اور سو روپے تولہ والا تمباکو وغیرہ۔ بعد کی ایجادیں ہیں۔

غرض اس کی نشو و نما عہد مغلیہ میں ہوئی مغل بادشاہوں کے زوال کا زمانہ اس کے شباب کا وقت تھا۔ پہلے ہی بہادر شاہ ظفر کا استعمال حقہ پیتے ہی ہو انگریزوں نے مغل بادشاہوں کو حقہ کے ذریعہ سے تھوڑی بہت شکست دے دی اور حقہ نوش بادشاہ شطرنج کا مہرہ بن کر رہ گئے۔

حقہ کو ہندوستان کے خاص و عام اور امیر و غریب نے ایسا منہ لگایا کہ رفتہ رفتہ یہ شئے جزوِ غذا اور جزو معاشرت ہو گئی۔ پان بیچارہ تو صرف شادی بیاہ اور خوشی خرمی کے موقعوں پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ مگر حقہ شادی اور غم کے موقعوں پر۔ گرمی۔ جاڑے ہر موسم میں مستعمل ہے تعجب ہے کہ شعر و شاعری میں حقے کو وہ مرتبہ نہ مل سکا جو شراب و ساغر وغیرہ کو حاصل ہے۔ لیکن ہندی شاعری میں چلم کی بڑی آؤ بھگت ہے۔ ہندو سادھوؤں میں چلم بھگتی کی تعلیم کا جزوِ اعظم بن گئی ایسی کہ اس نے بھانگ کو نیچا کر دکھایا ہے۔ منشی پریم چند مرحوم نے اپنے ایک افسانہ میں اس چلم بازی کا مضحکہ اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ جو سادھو چلم کا سب سے لمبا کش لگائے اس کی شکتی سب سے زیادہ ہے اور اگر لمبا کش لگانے کے بعد کھانسی نہ آئے تو گویا مکتی حاصل ہو گئی۔ خدا کا شکر کرو فیلسوفئے اسلام نے اس کو یہ مرتبہ نہیں دیا ورنہ سارا لفتوف بھگتی کی طرح دھواں ہو گیا ہوتا لیکن مکتبوں میں اور فنون مختلفہ کی درسگاہوں میں جو شاگرد چلم بھرنے میں مستعد ہو اس کی شاگردی بھی شاگردی اور اور اس کی تعلیمی ترقی ایک مسلّمہ مرتبی تینکر ہے کہ اب اس قابلیت کی اہمیت بھی ماند پڑ رہی ہے۔

عرب۔ ایران اور ترکی وغیرہ میں قہوہ نے دھوم مچا رکھی ہے۔ وہاں کے قہوہ خانوں کی تقلید یورپ اور انگلستان میں بھی ہوئی اسی طرح ہندوستان میں چانڈو خانوں کا رواج عام ہوا اور یہ ایک خاص پست طبقے میں اس قدر ہر دلعزیز ہوئے کہ خوش وقتی اور دلبستگی کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اس طبقے کی سوسایٹی کا پبلسٹی ہاؤس بن گئے کچھ لوگوں نے "حقہ کلب" کا پرچار کیا تھا۔ مگر وہ کلب سگار۔ سگرٹ اور بیڑی وغیرہ کی وجہ سے آگے چل نہ سکا۔ اور اب تو لوگ عندالملاقات سلام اور مزاج پرسی کے بعد بجائے پان پیش کرنے کے سگرٹ یا بیڑی ہی سے منہ جھلس دیا کرتے ہیں۔

لکھنؤ کے فقیروں نے ایک نئی جدت کی تھی۔ حقہ بھر کے

چوراہوں پر کھڑے ہو جاتے اور آیندہ روند کو ایک دو کش حقّے کی دعوت دیتے۔ پینے والا حقہ گڑ گڑاتا اور یہ اقبالمندی اور درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگتے۔ اس طرح دن میں دس بارہ آنے بنا لیتے تھے۔ مگر بیڑی نے اس پیشے کو بھی نہ چلنے دیا۔ پھر بھی باوجود ان تمام شکستوں کے حقّے نے اپنی وضعداری قایم رکھی۔ اب بھی مشاعروں میں محفلوں میں اور احباب کی ملاقات کے وقت خاطر و مدارات کے لئے حقہ ایک ضروری شئے سمجھی جاتی ہے کانگریسی راج میں تو شراب اور دیگر منشیات کی طرح حقّہ ذرا ڈرنے لگا ہے۔ مگر سُنا جاتا ہے۔ کہ اسمبلی میں چند آنریبل ممبران پیچوان کی غیر موجودگی کے شاکی ہیں۔

ہر چیز کے لئے ایک موسم ہوا کرتا ہے۔ پانی کے لئے گرمی کا زمانہ۔ پان کے لئے بہار کا۔ اسی طرح حقہ کا خاص موسم سردی کا زمانہ ہے کسی حقہ باز نے کہا ہے کہ ؎

حقّہ ہو جو سردی میں تو جنّت ہے زمیں پر
جنّت میں نہ حقّہ ہو تو دوزخ سے بھی بدتر

اور اس کے استعمال سے متعلق مختلف قسم کے اوامر و نواہی ہیں۔ ایک مشہور کہاوت یہ ہے کہ۔

"حقّے کے چار وقت:۔ سو کے اُٹھ کے۔ منہ دھو کے، کھا کے۔ نہا کے۔

یہ تو اس کے فوائد ہوئے۔ اس کی مضرتیں بھی چار ہی رکھی گئی ہیں۔ یعنی چار وقت حقّے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ وہ اوقات یہ ہیں:۔ "آندھی میں۔ اندھیری میں۔ بھوک میں، اور دھوپ میں"۔

بھلے مانس حقہ بازوں میں ایک اور کہاوت مشہور ہے۔ گویا اسے حقہ کلب کا علم اخلاق کہنا چاہیئے۔ یعنی ؎

حقہ بھر بھر بڑے کو دیجے ✦ جب سلگے تب آپ بھی پیجے
خود کسی کے ہاتھ سے لیجے ✦ جب وہ دے تو شوق سے پیجے

حقّے سے جو خراب اثرات سوسائٹی پر پڑے ہیں۔ ان کا ذکر شعر و شاعری میں بہت کم اس وجہ سے ہے کہ شاعر لوگ عموماً حقہ کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ حقّے کے مخالف شاعر بہت کم ہوئے ہیں۔ ہندی کی ایک کہاوت اس کی مخالفت میں اس طرح شاکی ہے ؎

حقّے سے حُرمت ہو گئی ✦ تعلیم[1] گیا سب چھوٹ
پگڑی بیچ لیا تمباکو ✦ گئی بیٹے کی پھوٹ[2]

اس کہاوت اور ایسی دیگر مثالوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو حقّے کی تعریف میں بہت مواد ملے گا۔ ہندو مسلمان انگریز سب ہی اس کے مداح ہیں۔ ہر قوم کا فرد اس کی مدح میں رطب اللسان ہے، چنانچہ ایک انگریز شاعر صاحب جو غالباً ابھی بقید حیات ہیں حقّے کے بڑے مدّاح ہیں۔ ان شاعر صاحب کا نام ولیم ایچ ڈیوس ہے۔ William H. Davis، حقے سے آپ کو جو دلچسپی ہے، ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:۔ ؎

ترجمہ: میری بیوی نہ خادمہ ہے No maid is near
یہ ایک حقہ ہے اور میں ہوں I have no wife. But
اسی کے کش لیکے جی رہا ہوں love is my pipe. And on
لگن لگائی ہے شاعری سے my life. With it to smoke
میں اس کے بدلے نہ لونگا ہرگز And woo the muse to be
جو سلطنت بھی مجھے کوئی دے! a King I would not choose!

ان اشعار میں حقہ صاحب بہادر کی زندگی ہے۔ بیوی ہے اور خادمہ ہے۔ اور شاعری کے وسیلے سے معشوقہ بھی ہے۔

ایک صاحب یوں غزلسرا ہیں ؎

اگر دو چار کش شیطاں لگائے — تو جنّت کا مزہ دوزخ میں پائے

اسی طرح گنہگار کی بابت کہا گیا ہے کہ اگر حقہ پئے۔ ع

"تو اڑ جائیں معاصی اس کے حقّے کا دھواں ہو کر"

غرض اس طرح کی باتیں حقّے کی بابت زبان زدِ عام ہیں۔ اب اس کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ سگار، سگرٹ اور بیڑی وغیرہ کی وجہ سے یہ زمانہ اس کے انحطاط کا زمانہ ہے۔ اس لئے نہ اب اس کی مذمّت کی ضرورت رہی نہ مدح سے کوئی دلچسپی۔ منجملہ آثار قدیم کے یہ ایک شے تھی اس لئے یہاں اتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ اور شعر و سخن میں اس کو جو دخل تھا اس کو بھی نمایاں کر دیا گیا۔

---

[1] تعلیم یعنی تعلیم، مذہب وغیرہ [2] بیٹے کی پھوٹنا یعنی بے غیرتی اختیار کرنا۔

اس کے مداح بہت ہوئے ہیں۔ یعنی مذمت کے مقابلے میں مدح بہت ہے۔ ایک قصیدہ بارہ بنکی کے اعجاز مرحوم سے نے کہ یہاں نقل کیا جاتا ہے اس میں شاعر نے حقے کی مدح میں جو تشبیہات اور استعارات استعمال کئے ہیں اپنی پختگی اور کامیابی پر دلالت کرتے ہیں۔ شاعر نے شاعری کا حق بخوبی ادا کیا ہے اور قصیدے کی خوبیاں بھی قائم رکھی ہیں وہ قصیدہ یہ ہے:-

دیکھو نہیں معشوق سے کم بانکپن اس کا ۔ کیا حسن کے سانچے میں ڈھلا ہے بدن اس کا

ہے پھولوں کی چادر سے بنا پیرہن اس کا ۔ پھولا پھلا رہتا ہے ہمیشہ چمن اس کا

سوزاں ہے چلم آتش رخسار کی صورت

اور اس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

جو بات ہے حقے میں کسی شئے میں نہیں ہے ۔ یہ کیفیت افیوں میں نہیں مے میں نہیں ہے

گر زمزمۂ ساز ترنم بھی کسی لے میں نہیں ہے ۔ جو لطف ہے اس نے میں کسی نَے میں نہیں ہے

اللہ ری بلاغت تری اللہ ری آواز

اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز

دنیا میں مساوات ہے حقے ہی کے دم سے ۔ تخصیص ملاقات ہے حقے ہی کے دم سے

خاطر ہے مدارات ہے حقے ہی کے دم سے ۔ جو چیز ہے جو بات ہے حقے ہی کے دم سے

ہستی میں اولوالعزمی ہمت ہے تو حقہ

پستی میں خیالات کی رفعت ہے تو حقہ

محفل میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں ۔ یا جاتے ہوئے ہوں کہیں گاڑی کے سفر میں

ہے اس کا دھواں سینے میں اور شکل نظر میں ۔ یہ دلبر دمساز یہ معشوق ہے بر میں

ہم اور کسی شئے کا اجارہ نہیں کرتے

حقے کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے

بیخودی ہستی کیا بجا نہیں

[illegible] کیا بجا نہیں

[illegible]

وہ عیش کا لطف بیخودی [illegible]

رعنا اکبرآبادی

باپ کی وصیّت

ایک دلکش معاشرتی افسانہ

(از جناب چوہدری محمد طفیل صاحب ۔ نیّر ۔ بی ۔ اے ۔ بی لٹ جرنلسٹ)

ضیق النفس کے شدید دورے کی وجہ سے کھانستے کھانستے سیٹھ دولت رام کا دَم رکنے لگا ۔ چہرہ سُرخ ہوگیا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا ۔ سردیوں کے دن ۔ پیری کا عالم بیماری کا دورہ اور اس پر نوکروں کی بے پروائی ۔ کوئی عزیز پاس نہیں تھا ۔ بیچارہ مرا تو نہیں تھا ۔ لیکن مر رہا تھا ۔

کاروبار خوب چلتا تھا ۔ مگر سوائے اپنے کوئی دوسرا آدمی نگرانی کرنے والا نہیں تھا ۔ فرم کا منیجر لالہ گھسیٹا رام کچھ ایسی اُفتاد کا مالک تھا ۔ کہ بظاہر تو کام نہایت تندہی اور ایمانداری سے کرتا تھا ۔ لیکن اس کے حساب کتاب میں ہمیشہ گڑبڑ رہتی ہے سیٹھ کو وقت بے وقت دمے کا دورہ محض کاروباری صدمے کی وجہ سے ہوجاتا تھا ۔ بیوی مرچکی تھی ۔ ایک نوجوان بیٹا تھا جو اپنی بدعنوانیوں اور بادہ نوشیوں کے باعث ہفتوں مکان پر نہیں آتا تھا ۔ اکثر شراب ، جوئے اور رقص و سرود میں گزرتی تھی ۔ اُسے معلوم تھا کہ باپ بیمار ہے اور چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہا ہے لیکن پھر بھی اسے اپنی عیاشی سے کام تھا ۔ ظاہر ہے کہ ایسی اولاد کا ہونا نہ ہونے سے زیادہ روحانی رنج کا موجب ہوتا ہے ۔

شام کا وقت تھا ۔ سیٹھ کو دورے نے تنگ کر رکھا تھا ۔ جسم کی تمام رگیں پھول رہی تھیں ۔ اور اعصاب کھنچ رہے تھے ۔ دو نوکر ذرا فاصلے پر کھڑے تھے ۔ تین چار کاروباری دوست پاس بیٹھے ، دورے کی شدّت کو کم کرنے کی مناسب تدابیر سوچ رہے تھے ۔

اچانک کمرے کا دروازہ بڑے دھماکے کے ساتھ کھلا اور کوٹھی کا دربان رائے دیوا ہانپتا کانپتا کمرے میں داخل ہؤا ۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ۔ "چھوٹی سرکار کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے ہیں" ۔ یہ فقرہ تھا کہ تیر بے کمان جو نوکر کے منہ سے نکلتے ہی سیٹھ کے اینٹھتے ہوئے سینے میں پیوست ہوکر دل کے پار ہو گیا ۔ اس پر غشی طاری ہوگئی ۔ نوکر ڈاکٹر کو بلانے کی دوڑ دھوپ میں لگ گئے ۔ اور احباب نبضیں پکڑ کر بیٹھ گئے ۔

منیب گھسیٹا رام لتا سیٹھ دولت رام سے لتنا خوش نہیں تھا . جتنا اس کے بیٹے گنگا رام سے مانوس تھا ۔ گنگا رام بدمعاش تھا قمار باز تھا اس لئے اسے روپے کی ضرورت ہر وقت رہتی تھی ۔ جو منیب جی کی وساطت سے پوری ہوجاتی تھی ۔ وہ اگر پانصد روپیہ وصول کرتا ۔ تو گھسیٹا رام بہی کھاتے میں ہزار کی رقم اس کے نام ڈال دیتا تھا ۔ نہ گنگا رام باپ کے سامنے کبھی آتا اور نہ تصدیق ہوتی کیونکہ بیٹا اپنے باپ اور منیب اپنے مالک کی جائداد ل کر تباہ کر رہے تھے ،

قمار بازی کے جرم میں گنگا رام کا چالان ہوگیا ۔ جب یہ خبر منیب جی کو ملی تو وہ فوراً تھانے میں پہنچا اور دو ہزار کی ضمانت دیکر چھڑا لایا ۔

— ۳ —

سیٹھ کا دم دم کے ساتھ رہا۔ جب آخری وقت آیا۔ اور مرض الموت کے آثار چہرے پر نمودار ہوئے لوگ لعن طعن کر کے گنگا رام کو اس کے سامنے لے آئے۔ تاکہ مرتے وقت اکلوتے بیٹے کی جدائی کا داغ ساتھ نہ لے جائے،

جب گنگا رام باپ کے سامنے آیا تو دونوں کی حالت خراب تھی، باپ مرض کے دورے سے مجبور و معذور تھا۔ بیٹا شراب کے نشے میں چُور تھا۔ تاہم دونوں ایک دوسرے سے ملے مگر اس طرح جیسے اجنبی ملتے ہیں۔ نہ باپ نے شفقت پدری کا اظہار کیا۔ نہ بیٹے نے باپ کی چنداں پروا کی۔ ہاں اتنا معلوم ہو رہا تھا کہ سیٹھ دولت رام کا چہرہ غیر معمولی طور پر سُرخ ہے۔ معلوم نہیں زور سے کھانسنے کی وجہ سے تھا یا بیٹے کی حرکت پر غصے کے سبب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ مگر دونوں چپ تھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست نے کہا۔

"سیٹھ جی! گنگا آ گیا ہے کوئی بات کیجئے۔"

دولت رام نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"گنگا!"

بیٹے نے جو ابھی تک ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا بناوٹی بیقراری کے انداز میں نشے سے ہکلاتے ہوئے کہا!

"پتا جی! کہئے کیا حال ہے؟"

سیٹھ کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔ مگر اس نے اوسان بجا رکھتے ہوئے بردباری اور استقلال سے جواب دیا۔

"اچھا ہوں"

پھر ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا جسے گنگا رام نے توڑا

"پتا جی! کوئی بات کیجئے۔"

سیٹھ نے اپنی جبلی متحمل مزاجی کو قائم رکھتے ہوئے کہا:۔

"بیٹا! میں تو اب اس جگہ جانیوالا ہوں۔ جہاں دنیاوی رنج و الم پہنچ نہیں سکتے۔ میں تمہیں آخری وصیت کرتا ہوں غور سے سنو۔

میرے بعد تمام جائداد کے تم واحد مالک ہو جو عمر بھر کے لئے کافی ہے میں نے جمع کی لیکن کوئی لطف نہیں اُٹھایا۔۔۔ اس لئے تمہیں میری وصیت ہے:۔

(۱) شراب خوب پیو۔۔۔۔۔

مگر اس جگہ جا کر جہاں بنتی ہو۔

(۲) جوا خوب کھیلو۔۔۔۔

مگر اس کے ساتھ جس نے کبھی نہ ہارا ہو۔۔۔۔ اور

(۳) عیاشی خوب کرو۔۔۔۔۔

مگر شب کے آخری حصے میں۔۔۔۔۔

دولت رام ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ دورے نے آ دبایا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھیں باہر کو اُبھر آئیں لیکن یہ کیفیت لمحہ بھر سے زیادہ دیر تک نہ رہی۔ اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

گنگا رام نبض پکڑ کر زور سے چلایا۔

"پتا جی!"

مگر وہ دوسرے لوک میں جا چکے تھے۔

۴

باپ کی ہڈیاں ہردوار پہنچانے کے بعد گنگا رام کی طبیعت اپنی دلچسپی کے مشاغل کی طرف عود کر آئی۔ کچھ اس لحاظ سے کہ وہ عادتاً مجبور تھا۔ اور ہر وقت عیش و عشرت اور لہو و لعب چاہتا تھا۔۔۔ اور کچھ اس خیال سے کہ سرگباشی پتا کی وصیت پر عمل کرے۔ تاکہ اس کی آتما کو شانتی ہو اس خیال کا آنا تھا کہ ہم نوالہ ہم پیالہ احباب کی دعوت قرار پائی۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر سب دوست جمع ہوئے۔ بزم ناؤ نوش گرم ہوئی۔ کئی دنوں کے پیاسے تھے۔ مفت کا مال تھا کسے دریغ ہوتا۔ کنٹروں کے کنٹر بھرے اور خالی کر دیئے۔ گنگا رام خود مہمانوں کی آؤ بھگت اور خاطر داری میں مصروف تھا۔ جب سب ایک ایک کر کے نشے میں چور ہونے لگے تو میزبان نے بھی ایک اُٹھایا لیکن ہنوز لبوں تک نہیں پہنچا تھا کہ اس میں باپ کے بستر مرگ

کی تصویر جھلکنے لگی۔ معاً ڈیمیت یاد آگئی۔ پیالہ وہیں رکھ دیا۔ اور فوراً ایک رقعہ ڈسٹلری کے مینیجر کے نام لکھا کہ ہم بہت سی شراب خریدنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کل دوپہر کو آپ کے پاس پہنچیں گے۔

اگلے روز گنگا رام چند خاص دوستوں کو لیکر ایک ڈسٹلری میں پہنچا۔ مینیجر نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ اور انواع و اقسام کی شرابوں کے نمونے دکھائے اور فہرستیں پیش کیں۔ یار لوگ تو بانگی سے متمتع ہونے میں مشغول ہو گئے۔ لیکن گنگا رام مینیجر کے ہمراہ ڈسٹلری کی مشینری اور شراب کی ساخت کے عمل کا معائنہ کرنے کے لئے چلا گیا۔

ایک طرف ایک وسیع حوض میں پھلوں کا شیرہ۔ درختوں کی چھال اور کئی قسم کی اشیا پڑی ہوئی تھیں جن سے تعفن اُٹھ رہا تھا مکھیاں ٹڈی دل کی طرح اُڑ رہی تھیں۔ اگرچہ ان کو اڑانے کے لئے برقی پنکھے چل رہے تھے۔ لیکن جو مکھیاں ہوا کے زور سے شیرے میں گر پڑتی تھیں وہ جزو شیرہ ہو کر رہ جاتی تھیں۔

گنگا رام نے مینیجر سے سوال کیا۔

"کیا شراب انہی چیزوں سے بنتی ہے"؟

مینیجر:- ہاں سیٹھ جی! ہمیں شراب کشید کرنے سے پہلے اشیا کا قوام تیار کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ ہمیں مٹھائی بنتی نہیں دیکھنی چاہیئے، بلکہ بنی ہوئی کو دیکھنا چاہیئے۔ کیسی خوبصورت اور لذیذ ہوتی ہے۔ یہی کیفیت شراب کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر تعفن اور بدبو اٹھ رہی ہے لیکن جب شراب کشید ہو کر بوتلوں میں بھری جائیگی تو اس کی بو دماغ کو خوشبو ہو جائیگی۔ . . . . اور سیٹھ جی! شراب پر ہی کیا منحصر ہے کھیتی باڑی میں کھاد استعمال کی جاتی ہے جو ہر قسم کی غلاظت سے بنتی ہے۔ اسی سے غلہ پیدا ہوتا ہے"۔

گنگا رام نے ناک سکوڑا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت مالش کر رہی تھی مینیجر نے یہ کیفیت دیکھ کر اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"انگور جو میووں کا سردار ہے۔ ہر قسم کے جانوروں کے خون سے پرورش پاتا ہے۔ . . . اور تو اور انسان خود پہلے گندے پانی سے گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ پھر ارتقائی منازل طے کرتا ہؤا مکمل انسان بن جاتا ہے۔ اور ایسے کارہائے نمایاں کرتا ہے جو خود اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ . . . . یہ سب فطرت اور قدرت کے کھیل ہیں۔ شراب بھی اسی قبیل سے بنائی جاتی ہے اور اب تو سائنس کا زمانہ ہے۔ دنیا بہت ترقی کر چکی ہے۔ صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن کوئی وہ وقت تھا۔ جب گنے کی رس کو مٹکوں میں بھر کر کھاد کے ڈھیروں میں دبایا جاتا تھا۔ وہ تو بالکل غلاظت ہوتی تھی۔ اب ہر کام میں صفائی ہے"۔

لیکن گنگا رام کے ماتھے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ منہ سکڑا ہؤا تھا۔ وہ سُن رہا تھا۔ مگر کچھ نہیں سنتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ بدبو سے اس کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا۔ دماغ چکرانے لگا۔ اُسے ایک ابکائی آئی۔ جس کو روکنے کی ناکام کوشش کے بعد اس کے تمام اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور ضبط کی تاب نہ رہی۔ اسے قے آئی۔ اور ساتھ ہی تمام جسم شرابور ہو گیا۔ اور وہ دھڑام سے مینیجر کے قدموں میں گر کر بیہوش ہو گیا۔

۵

انسان ہمیشہ کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ اور ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے۔

گنگا رام کی طبیعت کئی دن کے بعد سنبھلی جب وہ بستر سے اُٹھا تو اس نے اشنان کے بعد کرشن بھگوان کی مورتی کے سامنے پرن کیا۔ "میں کبھی شراب نہیں پیؤنگا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایسی بُری [illegible] ہے۔ میں تو [illegible] ہے۔ اسے بھگوان تم ساکھشی ہو۔ میری آتما کو اپوتر ہونے سے بچائے رکھنا۔ اور رکھشا کرنا"۔

دن گزرتے گئے اور گنگا رام کی طبیعت میں بتدریج استقامت اور استقلال آتے گئے۔ اس کی توبہ رسمی نہیں تھی کہ ساغر گلرنگ کی ایک ہی جھلک سے ٹوٹ جاتی۔ اسی عرصے میں کئی قسم کی رنگین محفلوں اور پارٹیوں میں جانے کا اتفاق ہؤا

مگر اس کا دل کبھی نہ للچایا، بلکہ ایسے موقعوں پر وہ شرابیوں کی خلاف انسانیت سوز حرکات دیکھ کر دل ہی دل میں پشیمان اور شرمندہ ہوتا تھا۔ اسے بارہا یہ خیال آتا تھا۔ کہ میں بھی ضرور ایسی غیر شریفانہ حرکات کا مرتکب ہوتا رہا ہوں۔ اس قسم کے احساسات نے اسے توبہ شکنی سے باز رکھا۔

ایک دن ایک بے تکلف دوست کے ہاں دعوت تھی۔ دور شراب چل رہا تھا۔ مگر گنگارام علیحدہ بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میزبان نے ایک پیگ اس کے سامنے بھی رکھ دیا۔ لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ کہ مجھے ایسی شراب سے نشہ نہیں آتا ؎

ساقی پلا دہ مے کہ خمار دوام ہو
وہ کیا نشہ ہوا جو چڑھا اور اتر گیا (ن)

"جوا کس کا ہوا"؟ مگر دنیا اس کی ہو گئی۔ جوئے کا شوق اصل میں حرام خوری کی دلیل ہے، قمار باز محنت سے جی چراتا ہے۔ اور قسمت سے پانسہ کھیلتا ہے۔ تاکہ وہ ایک ہی دفعہ بہت سا مال و دولت جمع کر لے اور بلا مشقت امن کی زندگی بسر کرے۔ لیکن اس سمجھ داؤ پیچ کشمکش حیات کے منافی نہیں۔ اس لئے وہ اپنے ارادوں میں شاذ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ایک بار بازی ہے جاتا ہے۔ تو قسمت آزمائی کے لئے بار بار داؤ لگاتا ہے۔ حتیٰ کہ سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ اور جو کوئی ایک دفعہ ہارتا ہے۔ دوسری دفعہ امید موہوم پر اپنا اثاثہ گنوا بیٹھتا ہے۔ پھر بھی اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے کبھی چوری کرتا ہے کبھی ڈاکہ ڈالتا ہے اور کبھی راہزنی کرتا ہے۔ اس طرح قمار باز نہ صرف اپنی ہی دولت برباد کرتا ہے بلکہ سوسائٹی اور سماج کے لئے مستقل خطرہ بن جاتا ہے۔

دیوالی کی رات تھی۔ تمام شہر دیپ مالا سے رشک کہکشاں بنا ہوا تھا۔ بازاروں میں چہل پہل اور رونق تھی۔ عام لوگ تو لکشمی دیوی کو خوش کرنے کے لئے تعزیہ اور رسا کھیلتے تھے۔ مگر

بڑے بڑے نامی گرامی قمار باز ہزاروں کی بازی لگاتے تھے مشہور قمار باز "سوما" کا بالاخانہ آج کھلاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ روا روی کا عالم تھا۔ ایک آتا تھا ایک جاتا تھا۔

آج کے کھیل کی دھوم شہر بھر میں مچی ہوئی تھی۔ کیونکہ صبح سے شام تک یہی کام ہو رہا تھا سوما خود نہیں کھیلتا تھا۔ مگر بازی لے جانے والے سے ۱۰ فیصدی نال کے طور پر وصول کرتا تھا۔ ایک منچلے کھلاڑی نے ایک ہزار کی رقم بڑھ کر جو پانسہ پھینکا تو تماشائیوں میں سے وہ مارا کی پہنچائی ہوئی آواز آئی اور سوما نے مچائی ہوئی نظروں سے اوپر کو طرف دیکھا یہ آواز نوجوان سیٹھ گنگا رام کی تھی سوما نے کھڑے ہو کر کہا۔

"سیٹھ جی آئیے، کیا خیال ہے"؟

گنگا رام آگے بڑھا اور کھلاڑیوں کے عین درمیان آ کر نوٹوں کا ایک بنڈل رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک لاکھ کی ایک ہی بازی"۔

بس پھر کیا تھا۔ تمام قمار خانے پر سناٹا چھا گیا۔ سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ گویا ان کو سانپ سونگھ گیا تھا کس کی بساط تھی کہ دم مارے ایک منٹ کے بعد سوما نے کچھ کہنے کی کوشش کی قمار بازوں نے فرش پر گڑی ہوئی نگاہیں اوپر کو اٹھائیں۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے۔ اور ایک تجربہ کار کھلاڑی نے آمادگی ظاہر کی۔

گنگا رام نے نوٹوں کے بنڈل پر سے ہاتھ اٹھا کر کہا:۔

"مگر ایک شرط پر۔ ہم اس سے کھیلیں گے جس نے کبھی نہ ہارا ہو"

اب پھر سکوت کا عالم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی بازی نہیں ہاری۔ قمار باز اپنی بدقماشی کے باوجود وعدے کے پکے اور ایک دوسرے سے برتاؤ کرنے میں نہایت صاف گو ہوتے ہیں۔

...... سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ہم میں سے ایسا کوئی نہیں"

گنگا رام نے کہا:۔

"جب جوئے میں کوئی جیت نہیں سکتا تو ہم ایسے کھیل سے باز آئے۔"

اور اپنا نوٹوں کا بنڈل اٹھا کر نیچے اتر آیا۔

۶

آئین جدید کا نفاذ ہو چکا تھا۔ ارکان بلدیہ اور رؤسائے شہر نے وزارت کے اعزاز میں نہایت پرتکلف دعوتِ چائے کا انتظام کیا۔ گنگا رام اگرچہ میزبان تھا لیکن باتوں باتوں میں چائے زیادہ پی گیا۔ پارٹی سے فراغت پانے کے بعد وہ مکان پہنچا اور اپنے معمولی کاروبار سے فرصت پانے کے بعد سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ مگر کافی رات گزر جانے پر بھی اسے نیند نہ آئی۔ کروٹیں لیتے لیتے ایک بج گیا۔ جب "آجا نندیا" کی میٹھی اور مدھر سُریں بھی نیند کو بلانے سے قاصر رہیں تو وہ بستر سے اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

سردیوں کے آخری دن تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ دروازہ کھولا۔ ہوا کا ایک ہی جھونکا اسے کسی اور عالم میں لے گیا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اور نصف اللیل کا چاند عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ رات۔ جوانی۔ دولت ایسے میں انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ وہ پھر کمرے میں آیا کپڑے پہنے اور موٹر لیکر باہر نکل گیا۔ موٹر نہایت مدھم رفتار سے جا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا طبیعت میں ایک گونہ مسرت بلکہ ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

بلدیہ نے شرفائے شہر کی پیہم درخواستوں پر پیشہ ور طوائفوں کو شہر سے دور کوئی دو میل کے فاصلے پر جگہ دے رکھی تھی، گنگا رام نے ادھر کا رُخ کیا۔ شب کا آخری حصہ تھا اس لئے باپ کی وصیت کے تیسرے حصے پر عمل کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقعہ نہ تھا مشہور طوائف شانتی بائی کے مکان کے سامنے موٹر ایک دھچکے سے رکی، شانتی بائی نہ صرف خوبصورتی میں یکتائے روزگار اور شہرہ آفاق تھی بلکہ گانے میں بھی بے مثل تھی۔ مگر اس وقت اس کے بالاخانے سے کسی ساز اور سارنگی کی آواز نہیں آتی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں لیکن اندر برقی لیمپ جل رہا تھا۔ باہر کا دروازہ بند تھا۔ گنگا رام نے دستک دی۔ اُوپر کی کھڑکی کا دروازہ کھلا۔ اندر سے کسی نے جھانک کر پوچھا:۔

"کون ہے"؟

جواب دیا

"دروازہ کھولو۔ ہم گانا سنیں گے"۔

کئی منٹ گزر گئے اور کوئی نہ آیا۔ مگر اندر سے کسی ایک لوگ

کی آوازیں آنے لگیں۔

ایک آواز۔ ایسے میں کون مُوا آدھمکا۔ جواب دے دو۔

دوسری آواز۔ مگر موٹر والا ہے۔ موٹی مرغی ہوگی۔

تیسری آواز۔ جاکر دیکھو تو لو۔ شاید ہزار۔ پانسو مل جائیں۔

پہلی آواز۔ مجھے تو تیار ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ اسے کہو کل آئے۔

دوسری آواز۔ جو اس وقت وصول ہو سکے گا وہ کل نہیں ہو سکتا اور پھر ممکن ہے وہ کل نہ بھی آئے۔

تیسری آواز۔ کل کیا ممکن ہے ابھی ہمسائے میں جا دھمکے۔ بائی جی آپ غلطی نہ کریں۔

پہلی آواز۔ اچھا دروازہ کھولو...... اور ......

پھر دستک ہوئی۔

فوراً ہی بعد دروازہ کھلا اور ایک بھاری آدمی دوشالے میں لپٹا ہوا باہر نکلا جس نے دیکھتے ہی پہچان کر کہا۔

"آہا سیٹھ جی! آپ ہیں؟ آیئے چیونٹی کے گھر نارائن۔ کیسے اچھے بھاگیہ ہیں؟"

گنگا رام خاموشی سے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اوپر جاکر دیکھا تو وہ شانتی بائی جو اپنے حسن وجمال میں خاص شہرت کی مالک تھی سلمندی اور گلگونہ وغازہ کے بغیر بدصورت معلوم ہو رہی تھی۔ گنگا رام کن جذبات کو لے کر آیا تھا۔ مگر یہ عالم دیکھ کر دل برداشتہ سا ہو گیا۔ گلوری پیش کی گئی اس نے طاس میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیا مگر گلوری کو ہاتھ نہ لگایا۔

ایک پتلے دبلے آدمی نے جو بہت چوکس اور چالاک تھا۔ فوراً کہہ دیا:۔

"بائی جی! ایسے ایسے سیٹھ پان اپنے ہاتھ سے تھوڑا ہی کھاتے ہیں آپ کھلائیں تو شاید کھا لیں۔"

گنگا رام اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گلوری خود ہی اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور سگرٹ سے کش لگاتے ہوئے کہا:۔

"بائی جی! کوئی پھڑکتی ہوئی چیز ہو جائے۔ مجھے جلد ہی واپس جانا ہے۔"

شانتی بائی:۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی آکر نہیں بیٹھے۔ ابھی اُون سنبھالا ہے۔ ایسے ہی آپ کو کیوں جانے دیں گے؟

گنگا رام۔ میں ارادے سے نہیں آیا۔ یونہی طبیعت پریشان تھی۔ دل نے کہا چلو کچھ سن آئیں۔

شانتی بائی:۔ یہ آپ کی بڑی کرپا ہے۔ گانا تو ابھی سناتی ہوں مگر جانا نہیں ملے گا۔

گنگا رام۔ آپ شروع تو کیجئے۔

آن واحد میں طبلہ اور سارنگی کی تانیں اڑنے لگیں۔ شانتی بائی نے ایک دو دفعہ کھانس کر پان کا فضلہ پھینکا اور کلی کر کے جوگ راگ الاپنا شروع کیا ؎

جب جنوں آئے کسے تاب شکیبائی ہے
پھر وہی ہم ہیں وہی بادیہ پیمائی ہے
کچھ تو ہے بات کہ تجھ میں جو یہ رعنائی ہے
کہ ترے حسن کی ہر آنکھ تماشائی ہے
دیکھنے والوں کو دیکھے کہ وہ تجھ کو دیکھے
خود تماشا ہے کہ جو تیرا تماشائی ہے
آنکھ سے مارتے ہو دل سے جلا دیتے ہو
موت قبضے میں ہے قدرت میں مسیحائی ہے
کیوں اٹھاتا ہے ستمگر در دولت سے مجھے
میری قسمت میں ترے در کی جبیں سائی ہے
دیکھ لیتے ہیں کبھی ایک نظر سے۔ نیّر
کچھ توجہ تو مرے حال پہ فرمائی ہے

بگڑی ہوئی صورت کی طرح آواز بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس وقت حسن اپنے اصلی روپ میں گنگا رام کے سامنے تھا۔ اور موقع کی چیز بےوقت کی راگنی کی طرح نہ صرف بے اثر تھی بلکہ بھدی معلوم ہوتی تھی۔ بائی جی بہت بجی اور استادوں نے بھی بہت زور لگایا۔ مگر گنگا رام کو گانے میں کچھ لطف نہ آیا۔ اس کی طبیعت بےچین ہو گئی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے چلتے

سو روپے کا نوٹ پھینک کر نیچے اتر آیا۔ ہوا اب بھی کیف آور تھی جو موٹر کی سبک رفتاری کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ موٹر سڑک پر اس طرح چلتی تھی جیسے دوش ہوا پر ساون کے بادل اڑے جا رہے ہوں۔

۸

دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ مگر گنگا رام نے نہ تو کبھی شراب پی۔ نہ جوا کھیلا اور نہ عیاشی کی وہ اپنا تمام وقت کاروبار میں صرف کرتا تھا اور جب کبھی تفریح کی ضرورت محسوس ہوتی تو سیر کے لئے کبھی پیدل اور کبھی موٹر پر نکل جاتا۔ وہ نہایت کامیاب تاجر اور کاروباری آدمی تھا۔ منڈی کے بھاؤ اس کے اشاروں پر بدلتے تھے شہر میں بڑا نام تھا۔ میونسپل کمیٹی کی صدارت، مقامی ودھوا آشرم، ٹمپرنس سوسائٹی اور اناتھ شالہ کی سرپرستی وغیرہ اس قسم کے کئی ادارے گنگا رام کو ہمہ وقت مصروف و منہمک رکھتے تھے۔ اب فرم کا منیجر ایک تجربہ کار یوروپین تھا۔

گنگا رام کو کاروباری زندگی میں وہ لطف و سرور حاصل ہوتا تھا جو پہلے کبھی میسر نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں پاکیزہ جذبات موجزن رہتے تھے ایمانداری، رحم، غریب پروری اور سخاوت اس کی بدلی ہوئی سیرت کے خاص جوہر تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پتا کی آتما پتری لوک سے اسے آشیرباد دے رہی ہے +

یادِ ایامِ سطوتِ جہانبانی

(از جناب آغا اعجاز احمد رضوی المشہدی)

مجلہ جلیلہ عالمگیر" کا نیا خاص نمبر زیر مطالعہ تھا کہ پڑھتے پڑھتے جب میں اس کے صفحہ ۶۰ پر پہنچا جہاں جناب شاد عظیم آبادی کا پرمعانی قصیدہ زیر عنوان "تبرکات شاد" درج تھا جس کو جناب حمید عظیم آبادی نے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ ارسال فرما کر تشنہ کامان علم و ادب کو دہن تر کرنے کا موقع دیا ہے۔ اور جس میں ضمناً عظیم ما ئے شیرازی کی ایک الہامی قطعہ بند نظم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ تو میرے خیال میں گزرا کہ کیوں نہ اس لاثانی کلام کو معہ اس کے اُردو ترجمہ کے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ لیکن یہ عجیب و غریب اتفاق ہے کہ امروہہ کی وہ مقتدر ہستی جن کے روزنامچہ سے نقل کر کے میں یہ نظم ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ خلد مکاں حضرت عالمگیرؒ کے ہی شاہی منصبداروں میں سے تھے۔ اور عمر بھر شہزادہ والا جاہ محمد اعظم کے ہمرکاب رہ کر کل شمالی ہندوستان میں دورہ فرماتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شاہزادگان والا تبار تک شاہی محلات کی حدود میں بند ہو کر بیٹھنا ہنوز گوارا نہ کرتے تھے۔ بلکہ بخت و یاوری کے گھوڑے پر سوار ہو کر طول و عرض ہند میں ' چتر جاہ و اقبال کا سکہ ہر کہ و مہ پر جھلاتے پھرتے تھے۔ گویا کہ انہوں نے اس قدر وسیع مملکت کو صرف اپنی چوگان بازی کا ایک میدان خیال کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس روزنامچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً اس کے ہر صفحہ پر بعد اندراج جگہ جگہ کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔ کہیں لکھا ہے: "بتاریخ ۲۰ صفر ختم اللہ بالخیر و الظفر ۱۰۸۷ھ جلوسی در دار السلطنت لاہور ۱۰۸۵ء بروز یکشنبہ تحریر کردہ"۔ تو کہیں "راقمہ (س۔ف۔ا) ساکن امروہہ بتاریخ بست و چہارم شہر شعبان المعظم ۱۰۹۱ھ در مقام چتور ہمراہ شہزادہ محمد اعظم"۔ ایک اور جگہ درج ہے۔ "راقمہ (س۔ف۔ا) ساکن امروہہ بتاریخ بست و ہفتم شہر جمادی الاولی ۱۰۹۲ھ مقابل آب تالاب رانا ہمراہ شہزادہ محمد اعظم"۔

تو کسی دوسری جگہ پر لکھا ہوا ہے: "بتاریخ بست و ہفتم شہر جمادی الثانی ۵۰ جلوسی مطابق ۱۱۱۸ھ ہجری روز شنبہ بوقت عصر در امروہہ باتمام رسید" یہ شان و شوکت اس زمانہ کی ہے جبکہ کہتے ہیں کہ آفتاب عروج ڈھل چکا تھا لیکن کچھ کہیں پھر بھی وہ زمانہ علم و عمل کا ضرور تھا اور تھا بھی اب سے ہزار درجہ بہتر۔ غرضیکہ جس مقام پر موصوف پہنچتے بڑے بڑے علم دوست اُمرا و فضلا سے ملاقاتیں ہوتیں اور علمی صحبت میں جو شعر، رباعی، غزل محفوظ رکھنے کے قابل ہوتی اسے اپنی ڈائری میں ثبت فرما لیتے۔ کوئی نادر نسخہ ہی کہیں ہاتھ آ گیا ہے تو وہ بھی لکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض تعویذ وظائف و عمل تک درج کر دیئے ہیں جس سے اس عہد کے اپنے بزرگوں کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت کس کس طرف مائل تھی۔

اب میں اس قصیدہ بند غزل کو تماماً مع ترجمہ کے دجو خاکسار کی محقر کوشش کا نتیجہ ہے) درج کئے دیتا ہوں۔ تاکہ غیر فارسی دان حضرات بھی اس سے مستفیض ہو سکیں۔ اور کیف و جذبہ سے متاثر ہو کر اس مرحوم و مغفور کو اس کے الہامی کلام کی روحانی داد دیں:۔

فارسی اصل		اُردو
قاصد آمد گفتمش آں ماہ سیمیں بر چہ گفت؟ گفت، با ہجرم بساز و "گفتمش" دیگر چہ گفت؟	۱	قاصد جب پیغام لیکر آیا تو میں نے پوچھا "میرے اس نوری محبوب نے تجھ سے کیا کہا؟" کہا "میرے فراق کی تکلیفوں کو برداشت کر" پھر میں نے دریافت کیا "اور کیا کہا؟"

گفت: "باید پا ز حدِ خویش نگذارد بروں"
گفتمش "جمع است از پا خاطرم، از سر چہ گفت"؟

(۲) کہا "قدم وہ ہرگز وہ اپنی حد سے باہر نہ رکھے"۔
میں نے کہا "اپنے قدم کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے کہ غلط نہیں پڑیگا۔ تو یہ بتلا اس سر کے بارے میں اس نے کیا کہا"؟

گفت: "سر را بایدش از خاکِ رہ کمتر شمرد"
گفتمش "کمتر شمردم۔ از تنِ لاغر چہ گفت"؟

(۳) کہا" اسے چاہیئے کہ اپنے سر کو خاکِ رہ سے بھی کمتر سمجھے"
میں نے کہا" ہاں میں اپنے سر کو ایسا ہی سمجھے ہوئے ہوں لیکن اس تنِ لاغر کی بابت بھی کچھ کہا"؟

گفت "جسمِ لاغرش را از غضب خواہیم سوخت"
گفتمش "چوں سوختم در بابِ خاکستر چہ گفت"؟

(۴) کہا "اس کے تنِ لاغر کو ہم اپنی قہر کی آگ سے جلا کے رکھ دیں گے"۔
میں نے کہا" اچھا جب وہ مجھے کشتہ کر چکا تو میری راکھ کے بارے میں اس کی کیا رائے تھی"؟

گفت: "خاکستر چو گردد، خواہمش بر باد داد"
گفتمش "بر باد دادم در حقِ محشر چہ گفت"؟

(۵) کہا: جب وہ راکھ ہو چکے گا۔ تو ہم اس کا ذرہ ذرہ ہوا میں اڑا دیں گے"۔
میں نے کہا: مانا میری خاک تک بھی اڑا دی لیکن محشر کی بابت بھی تو کچھ کہا ہوگا"؟

گفت: "در محشر بیکدم زندہ اش خواہیم ساخت"
گفتمش "چوں زندہ کردم بہر خیر و شر چہ گفت"؟

(۶) کہا ہاں "محشر کے دن تو ہم اسے دم بھر میں جلا دیں گے"۔
میں نے کہا" جب اس نے جلا کے مجھ اُٹھا یا بٹھایا تو پھر خیر و شر (یعنی عذاب و ثواب) کے بارے میں کیا کہا"؟

گفت "خیر و شر نباشد عاشقانرا در حساب"
گفتمش "ایں ہم حسابی از سر کوثر چہ گفت"؟

(۷) کہا۔ "عاشقوں کے نزدیک خیر و شر کیسا"؟
میں نے کہا" یہ بھی معقول بات کی۔ اچھا تو حوضِ کوثر کی بابت بھی کچھ کہا"؟

گفت: "با ما بر لبِ کوثر نشیند عاقبت"
گفتمش "چوں عاقبت اینست زیں خوشتر چہ گفت"؟

(۸) کہا" وہ دن بھی ضرور آئے گا جب وہ ہمارے ساتھ حوضِ کوثر پر بیٹھے گا"۔
میں نے کہا" جب ایسا ہونے والا ہے تو اب یہ بتلا کہ اس سے بڑھی ہوئی بات بھی کوئی کہی"؟

گفت: "دیگر نگذرد در خاطرش یادِ کسے"
گفتمش "دیگر بگو"؟ گفتا "مگو دیگر چہ گفت"!

(۹) کہا ہاں "یہ یاد رہے کہ کسی اور کی یاد تیرے دل میں نہ آنے پائے"۔
میں نے کہا "اور کچھ بتلا"؟ کہا "اس سے زیادہ دریافت کرنیکو یا) بتلانے کو منع کر دیا ہے"۔ (دونو معنی ہوسکتے ہیں)

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳ | نمبر ۵

فہرست مضامین ماہِ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر پیسہ اخبار بازار لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

جون میں شائع ہونے والا "عالمگیر" کا "سالانہ نمبر" مرتب کیا جا رہا ہے۔ بہت سے مضامین نظم و نثر موصول ہو چکے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ اسکی ترتیب و تہذیب میں ملک کے اکابر علم و ادب نے حصہ لیا ہے۔ اور اپنے اس سال کے بہترین جواہر پارے صرف "عالمگیر" کے سالنامے کے لئے وقف کر کے ہمیں بھجوا دئے ہیں اور اسبا ہم یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ یہ گلدستۂ علم و ادب اس قدر اچھوتا اور نادر ہوگا کہ نہ صرف دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دے گا۔ بلکہ اپنے اگلے پچھلے ریکارڈ بھی مات کر دیگا۔ جواہر پاروں کے اس مجموعہ کی نظمیں اور غزلیں اس قدر بہار آفریں۔ افسانے اتنے دلکش اور مضامین اس قدر معلومات افروز اور ہنگامہ پرور ہوں گے کہ آپ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ نے حسن و جمال اور پاکیزگی و نفاست کا اس قدر دلفریب نمونہ آجتک نہ دیکھا ہوگا۔ تصاویر کا انتخاب عمل میں آچکا ہے یہ اتنی باصرہ نواز اور دیدہ زیب ہوں گی کہ آپ گھنٹوں ان کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوں گے۔

لکھائی چھپائی کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے۔ کہ رسالہ عالمگیر کا اپنا پریس ہے جو طباعت کے لحاظ سے ممتاز ترین پریسوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ظاہری محاسن کو چمکانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرینگے۔

الغرض آپ جون کے پہلے ہفتہ میں ہماری محنت و کاوش کے بیش بہا ثمر کی حلاوت و لذت کا اندازہ خود ہی لگا سکیں گے۔

یہاں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ عالمگیر کے مستقل خریدار نہیں ہیں تو اس شاہکاروں کے شاہکار کو مفت حاصل کرنے کے لئے آج ہی اپنی فرمائش مع سالانہ چندہ کے بھجوا دیجئے اور اگر پہلے ہی ہمارے کرم فرما ہیں۔ تو کیا ادب نواز ہونے کی حیثیت سے آپ کا یہ اولین فریضہ نہیں ہے کہ آپ اپنے حلقۂ اثر میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں اور اپنے دوستوں سے بھی سفارش کریں کہ وہ سالانہ نمبر کو مفت حاصل کرنے کے لئے آج ہی عالمگیر کے مستقل خریدار بن جائیں۔

اہل قلم حضرات سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنے بہترین رشحات قلم زیادہ سے زیادہ ۲۰ / اپریل تک ضرور بھجوا دیں ورنہ انہیں مناسب جگہ نہ مل سکے گی۔ اور بہت اغلب ہے کہ وہ درج ہونے سے ہی رہ جائیں۔

پرچۂ زیر نظر کا حصۂ نظم حسب معمول بہت بلند ہے۔ احمد ندیم قاسمی۔ جلال ملیح آبادی۔ فضا جالندھری۔ مجید لاہوری۔ انور گورداسپوری۔ بزمی انصاری اور محترمہ زیب عثمانیہ و مضطر رضویہ کے ہم بہت زیادہ ممنون احسان ہیں کہ وہ اپنا کیف بار کلام عالمگیر میں شائع ہونے کے لئے بھجواتے رہتے ہیں۔

عکرمتہ الفیاض جناب طالوت کا ایک تاریخی مضمون ہے جو امید ہے بہت پسند کیا جائیگا۔ پُراسرار چور۔ شمع الفت کے پروانے۔ دوشیزہ کا انتقام۔ قلوپطرہ اور جولیس سیزر کی داستان عشق۔ دکھیاری اور گھاٹ نہایت دلچسپ و دلآویز افسانے ہیں۔ غزل گوئی پر ایک نظر۔ قدیم بابلیوں کی یادگار اور موثر شاعری معلوماتی اور بلند پایہ مقالات ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ ملک کے بہترین انشا پرداز عالمگیر کی قلمی معاونت میں حصہ لیتے ہیں۔ امید ہے ان کی یہ کرمفرمائیاں جاری رہیں گی۔

ادارہ

ضروری

عالمگیر کا وہ معرکۃ الآرا سالنامہ جس ماہ جون ۱۹۳۶ء میں جلوہ آرا ہونا ہے ... حاصل کرنا چاہتے ہیں ... عالمگیر کے ... صرف ... علاوہ ... روپے چاہئے ... نہیں

آئندہ شمارہ کی ایک جھلک

عالمگیر کی اشاعت ماہ مئی میں شائع ہونے والے بعض معرکہ آرا اور ہنگامہ خیز مضامین کی فہرست درج ذیل ہے

سوزِ ناتمام

ایک بالکل سچا واقعہ افسانے کے رنگ میں جب آرزوں اور تمناؤں کا خون ہو جاتا ہے۔ اُس وقت انسان کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کے لئے اگلے پرچہ میں شائع ہونے والے بے حد دلآویز افسانہ "سوزِ ناتمام" کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ از جناب رحمت علی صاحب صابر

ہندوستان میں بردہ فروشی

عہد قدیم کی غلامی کے لرزہ خیز واقعات۔ ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں کی عملداری میں غلامی کا موازنہ۔ آپ پڑھکر مصنف کی تحقیق و تدقیق کی داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ از جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناصح۔

شاہی ڈاکو

کانن ڈائل کے "شرلاک ہومز" کا ایک حیرت انگیز کارنامہ "ریڈ ہیڈیڈ لیگ" کا ترجمہ۔ صرف یہی ایک مضمون اس قابل ہے کہ آپ عالمگیر کا اگلا پرچہ اپنے شہر کے ایجنٹ سے خرید کر پڑھیں۔

قدیم اقوامِ عالم اور موسیقی

ایک تحقیقی مقالہ جس میں بتایا گیا ہے کہ موسیقی کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور قدیم اقوام نے اسکی ترویج میں کیا حصہ لیا۔ افسوس ہے کہ بوجہ قلت گنجائش اس پرچہ میں شائع نہ کیا جا سکا۔ از جناب امجد علی خاں صاحب یوسف زئی۔

دانے کی سرگزشت

(افسانہ)

دانے کی عجیب وغریب سرگزشت جس میں زندگی کا فلسفہ بتایا گیا ہے۔ آج کل لوگوں میں خود اعتمادی کا جذبہ کیوں نہیں۔ ٹالسٹائی کے ایک شاہکار کا دلآویز ترجمہ۔ بے حد دلچسپ مضمون جسے پڑھکر آپ کو افسانے کا لُطف آجائے گا۔

از جناب جمیل احمد صاحب کندھاپوری بی۔ اے۔

علاوہ ازیں

ہندوستان کے چوٹی کے شعراء کا بے حد کیف بار تازہ کلام، چند دلکش افسانے اور پُرمغز مقالے۔
آج ہی اپنے پرچے کا انتظام کر لیجئے۔ یا مستقل خریداری کیلئے براہِ راست دفتر کو لکھئے۔

"ادارہ"

تاثّرات

(از جناب احمد ندیم قاسمی)

(۱)

ہوائیں سرسراتی جا رہی ہیں سبز وادی میں
نئے سورج کی کرنیں پڑ رہی ہیں کوہساروں پر

پروں کو دھو رہی ہیں ننھی چڑیاں سرچشموں میں
تھرکتے جا رہے ہیں ہلکے ڈونگے جوئباروں پر

دھوئیں کی پیچ کھاتی دھاریاں گاؤں پہ چھائی ہیں
حسیں چرواہیاں بکھری ہوئی ہیں سبزہ زاروں پر

یہ چٹکی کس نے لی دل میں یہ آنسو کیوں ابل آئے
اداسی کے دھندلکے چھا گئے سادہ نظاروں پر

اُدھر سورج میں چہرے جھلملاتے ہیں حسینوں کے
اِدھر پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں کوہساروں پر

(۲)

چلا جاتا ہے دھندلے راستوں پر کوئی پردیسی
ستارا صبح کا پربت کی چوٹی پر چمکتا ہے

درختوں کی قطاریں سو رہی ہیں تنگ وادی میں
الجھ کر جنگلی شاخوں میں کوئی طائر چہکتا ہے

اُدھر مشرق سے پھیکے نور کا سیلاب امڈ آیا
اِدھر بیمار کی پلکوں پہ اک آنسو دمکتا ہے

کبھی قطرے عرق کے پھوٹنے لگتے ہیں ماتھے پر
کبھی نبضیں پھڑکتی ہیں کبھی سینہ دھڑکتا ہے

اِدھر مرجھا رہی ہے زندگی [illegible]
اُدھر پھولوں کی خوشبو نے اک بستر [illegible]

"عکرمۃ الفیّاض"

تاریخ کا ایک عبرت آموز واقعہ

(از جناب طالوت)

بنو اُمیہ کی سیادت کے عین شباب میں جبکہ سلیمان بن عبدالملک سریرآرائے خلافت تھا۔ جزیرے (ایک صوبے کا نام) میں خزیمہ بن بشر ایک سردار رہتا تھا جو کرم اور مؤاسات کے معاملے میں اپنے وقت کا حاتم تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاں اپنے پرائے کی متعارف وغیر متعارف کی اور حاضر و بادی کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ جس طرح خویش و اقارب اس کے خوان کرم کے ذلہ ربا تھے۔ اسی طرح اخیار و اہل بدو کے لئے اس کے دروازے کے پٹ چوبیس گھنٹے کھلے تھے اہل عرب کے محاورہ کے مطابق وہ اعنی بہت بڑا کھ والا جس کے ہاں مہمانوں کی کثرت کے باعث خاکستر کی فراوانی ہو۔ گویا سموئل بن عادیا کے اس شعر کا وہ چسپاں ہا گتا مصداق تھا ؎

وما اُخمدت نار لنا دون طارق ولا ذمنا فی النازلین نزیل

ہماری آگ رات کے آنیوالے مسافر سے پہلے نہیں بجھادی جاتی اور نہ کسی مہمان نے کبھی ہماری مذمت کی ہے۔

۲

جود و سخا کے انتہا کی وجہ سے چند ہی دنوں میں (۱) کی دولت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور زمانے کے انقلابات نے اسے انہیں لوگوں کا محتاج کردیا جو چند دن پہلے اس کے محتاج اور اس کے مائدہ کرم کے ریزہ چین تھے مگر وہ لوگ چونکہ دنیا کے آرام کے ساتھی تھے۔ زیادہ دیر تک اس کی حاجت روائی وغمگساری نہ کرسکتے تھے۔ اس لئے چند ہی دنوں میں انہوں نے تنگ آکر منہ پھیرنا شروع کردیئے۔ خزیمہ بھی ان کے اعراض کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مگر احتیاج بڑی چیز ہے اس نے چند دن اسی امید پر گزار دیئے کہ شاید ان پتھروں میں جونک لگائی جاسکے۔ یاروں کی بدعہدی اور اپنی غلط بخشیوں کا اسے جلدی احساس ہوگیا اور اس نے زمانے کی روش سے تنگ آکر فیصلہ کرلیا کہ خانہ نشین ہوکر فاقوں سے جان دے دینا آسان ہے۔ مگر ایسے دوستوں کی ہمدردی و مؤاسات کے لئے ہاتھ بڑھانا بہت مشکل چنانچہ گھر واپس آکر اپنے اہل و عیال کو اس ارادے سے مطلع کیا۔ اور یہ کہہ کر اپنا دروازہ اندر سے بند کرلیا ؎

من گدائے بے نیازم مشربم این است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن مے تواں

۳

جزیرے کا گورنر ان دنوں امیر عکرمہ تھا جو اپنی فیاضی اور دریا دلی کے باعث **عکرمۃ الفیاض** کے نام سے مشہور تھا ایک دن اس کے دربار میں اہل خیر و مؤاسات کا تذکرہ ہو رہا تھا امیر نے پوچھا وہ خزیمۃ بن بشر کا کیا حال ہے؟ ایک شخص نے خزیمہ کا سارا واقعہ بیان کردیا۔ امیر نے معمولی اظہار افسوس کرکے بات کا رخ پھیر دیا۔ اور معاملہ رفت و گزشت ہوگیا۔ رات کو آدھی رات کے قریب امیر اٹھا ایک تھیلی دیناروں کی ساتھ لی۔ اور بھیس بدل کر خزیمہ کے

گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازہ پر پہنچ کر آواز دی۔ خزیمہ نے دروازہ کھولا تو عکرمہ نے اس کے ہاتھ میں تھیلی تھماتے ہوئے کہا۔ "اس سے اپنا حال درست کرو"۔ خزیمہ نے تھیلی زمین پر رکھ کر اس سے کہا۔ "جب تک آپ اپنا نام و نشان نہ بتلائیں میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔" عکرمہ نے کہا آپ نام کی جانب سے غرض رکھیں یہ پیڑ گننے کے بے محل شغل سے فائدہ؟ خزیمہ نے پھر اصرار کیا۔ تو عکرمہ نے صرف یہ کہہ کر اپنی راہ لی "انا جابر عثرات الکرام" یعنی میں شریف لوگوں کے نقصانات پورا کرنے والا ہوں۔

۴

خزیمہ نے اندر آ کر بیوی کو خیر و برکت کی خوشخبری سنائی اور کہا کہ چراغ جلاؤ تاکہ ہم دیکھ سکیں "یہ درہم ہیں یا دینار"۔ مگر بیوی نے کہا کہ تیل کہاں جو چراغ جلایا جائے۔ آخر تھیلی کو ٹٹول ٹٹول کر انہوں نے معلوم کر لیا کہ ہیں تو دینار اور اس خوشی میں رات بھر میاں بیوی جاگتے رہے۔ صبح خزیمہ نے اپنے قرضخواہوں کے قرض ادا کر کے سامان سفر درست کیا۔ اور دار الخلافہ کی راہ لی سلیمان بن عبد الملک خزیمہ کی سخاوت کے قصے سن چکا تھا اور اس کے دل میں خزیمہ کے متعلق حسن ظن کی بنا پر کافی قدر تھی۔ جب خزیمہ حاضر ہوا تو خزیمہ نے کہا بہت دیر کے بعد آئے ہو۔ تمہارے جیسے آدمی کے لئے تو جلدی آنا ضروری ہوتا ہے۔ خزیمہ نے معذرت کرتے ہوئے اپنا سارا حال کہہ سنایا۔ خلیفہ نے "جابر عثرات الکرام" کے نہ پہچاننے پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا۔ کاش ہم اسے پہچان لیتے تو اس کی اس نیکی کا بدلہ اسے دے سکتے۔ اس کے بعد خزیمہ کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا گیا۔ اور چونکہ امیر عکرمہ کی شکایات خلیفہ تک مکمل طور پر پہنچی ہوئی تھیں کہ وہ حساب ٹھیک نہیں رکھتا اس لئے خلیفہ نے مناسب سمجھا کہ اسے معزول کر کے اس کی بجائے خزیمہ بن بشر کو جزیرہ کا والی مقرر کیا جائے۔ چنانچہ احکام لکھ لکھا کر خزیمہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ اور اسے تاکید کر دی گئی کہ فوراً جا کر چارج لے لے اور نہایت سختی سے عکرمہ کا احتساب کرے۔ چنانچہ خزیمہ واپس روانہ ہو گیا۔ خزیمہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ عکرمہ کو اپنی معزولی اور خزیمہ کی

تقرری کا علم ہو گیا۔ اس نے شہر کے امرا و اعیان کو جمع کر کے انہیں آگاہ کر دیا۔ اور سب کو ساتھ لے کر خزیمہ کے استقبال کے لئے کافی دور تک گیا۔ نہایت عزت و احترام سے خزیمہ کو دار الامارت میں لایا اور چارج سنبھال دیا۔ خزیمہ نے خلیفہ کے حکم کے مطابق تین چار آدمی حسابات کی پڑتال کے لئے مقرر کر دیئے تاکہ کسی قسم کی کوتاہی کا اس پر الزام نہ آئے۔ حساب کے بعد بہت سی رقم عکرمہ کی طرف نکلی۔ اور خزیمہ نے حکم دیا کہ وہ فی الفور عکرمہ سے وصول کی جائے۔ عکرمہ اپنی فیاضی کے باعث وہ رقم غربا میں تقسیم کر چکا تھا۔ اور اس کے اپنے پاس اس وقت ایک کوڑی تک بھی نہ تھی۔ اس نے خزیمہ سے کہا "میں ان لوگوں سے نہیں ہوں جو اپنی عزت و آبرو کے بدلے مال کی حفاظت کو زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں میرے پاس رقم ہوتی تو پہلے ہی خزانہ عامرہ میں داخل کرا دی گئی ہوتی اور نہ جلدی اس رقم کی وصولی کی مجھ سے امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ جو کارروائی مناسب سمجھیں کریں"۔ خزیمہ یہ جواب سن کر بہت جھلایا اور حکم دیا کہ عکرمہ کو بیڑیاں لگا کر قید خانے میں ڈال دیا جائے۔ اور حتی الامکان اس پر سختی کی جائے۔ تاکہ وہ جلدی سرکاری قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل کرے۔ چنانچہ امیر کے حکم کی تعمیل کی جانے لگی اور علاوہ قید و بند کے عکرمہ کو کوڑوں سے مارا بھی جاتا تھا۔

۶

ایک مہینہ اسی حال میں گزر گیا۔ تو عکرمہ کے گھر والوں کو بڑی فکر دامنگیر ہوئی۔ آخر عکرمہ کی بیوی نے اپنی نسوانی کمزوری کی بنا پر عکرمہ کے راز کو افشا کر دینا مناسب سمجھا۔ اپنی ایک سمجھدار لونڈی کو بلایا اور اسے سمجھایا کہ تو امیر خزیمہ کے دروازہ پر چلی جا اور دربان سے کہنا کہ میں امیر سے ایک خاص معاملہ کہنے آئی ہوں۔ جب تجھے اندر بلا لیا جائے تو امیر سے کہنا کہ میرے معاملے کی اہمیت کے سبب خلوت ضروری ہے جب سب لوگ چلے جائیں۔ تو صرف اتنا کہنا "کیا جابر عثرات الکرام کا صلہ یہی ہونا چاہیئے جو تمہاری طرف سے دیا جا رہا ہے؟" چنانچہ لونڈی نے نہایت ہوشیاری سے یہ پیغام خزیمہ تک پہنچایا یہ بات

سنتے ہی خزیمہ کے ہوش اڑ گئے ۔ حیران و پریشان ہو کر اٹھا شہر کے امراء و رؤسا کو جمع کیا اور فوراً قید خانہ میں پہنچا ۔ عکرمہ نے جب خزیمہ اور شہر کے رؤسا کو دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ مصیبت اپنے انتہا کو پہنچنے والی ہے ۔ چنانچہ اس نے سر جھکا لیا اور صبر و شکر کے ساتھ آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگا ۔ خزیمہ جاتے ہی اس پر جھک پڑا اور اس کے سر و پا کے بوسے لینے شروع کر دیئے ۔ عکرمہ نے سر اٹھا کر پوچھا ۔ آخر یہ کیوں ؟ خزیمہ نے کہا تمہاری نیکی میری برائی پر غالب آگئی ۔ اس کے بعد حکم دیا کہ بیڑیاں عکرمہ کے پاؤں سے نکال کر میرے پاؤں میں ڈال دی جائیں ۔ عکرمہ نے پوچھا یہ کیوں ؟ تو جواب دیا تاکہ جتنی تکلیف آپ کو پہنچی ہے ۔ وہ مجھے بھی پہنچے ۔ عکرمہ نے قسمیں دے کر اسے اس بات سے منع کیا اور کہا ۔ یغفر اللہ لی و لکم لا تثریب علیکم الیوم ۔

۷

خزیمہ نے وہاں سے عکرمہ کو نہایت شان و شوکت سے باہر کرا کے دار الامارت میں لا اتارا اور خادموں کی طرح اس کے سارے کام کرنے لگا ۔ خود ہی اس کے لئے پانی گرم کیا اور خود ہی اسے حمام میں لے گیا اور ایک ادنیٰ خادم کی طرح سارے کام سر انجام دیتا رہا ۔ پھر اسے ایک نہایت ہی بیش بہا خلعت پہنایا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اسے سوار کرا کے خود اس کے گھر تک پہنچانے گیا ۔ ساتھ ہی بہت سامان و اسباب ، لونڈی ، غلام اور زر و جواہر اس کے ہاں بھجوا دیئے ۔ چند دن کے آرام اور کلفت رفع دور ہونے کے بعد اس کی خدمت میں عرض کی کہ وہ اس کے ساتھ بارگاہ خلافت میں چلے ۔ خلیفہ ان دنوں میں رملہ میں مقیم تھا ۔ اور یہ دونوں وہیں حاضر ہو گئے ۔

۸

حاجب نے جب امیر خزیمہ بن بشر کے آنے کی خبر دی تو سلیمان بن عبد الملک کو بڑی تشویش ہوئی کہ کل تو یہ ہم سے رخصت ہو کر جا رہا ہے اور اتنی جلدی واپس آ گیا ۔ ضرور کوئی بہت ہی برا حادثہ ہوا ہے ۔ خزیمہ اندر آیا تو اس نے بیصبری سے پوچھا ما وراءک یا خزیمہ ۔ خزیمہ ! کیا معاملہ ہے ۔ خزیمہ نے عرض کی خیر ہے یا امیر المؤمنین اور سارا قصہ کہہ سنایا ۔ سلیمان نے عکرمہ کو بھی بلوایا اور نہایت مہربانی اور ملاطفت سے پیش آیا ۔ اپنے پاس جگہ عنایت فرمائی اور بہت دیر تک اسے پیار کرتا رہا ۔ آخر میں نیکی کی قدر افزائی کے طور پر عکرمہ کو حکم دیا کہ اپنی ضروریات کی لسٹ بنا کر دے تاکہ بارگاہ خلافت سے وہ اسے عنایت کر دی جائیں ۔ چنانچہ ایک لمبی چوڑی لسٹ عکرمہ نے پیش کی ۔ خلیفہ نے حکم دیا جو کچھ اس فہرست میں ہے وہ ادا کر دیا جائے ۔ اس کے علاوہ دس ہزار دینار اور نہایت بیش بہا خلعت اور قیمتی تحفے بھی عنایت فرمائے تھے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ عکرمہ کو جزیرہ ، ارمینیہ اور آذربائیجان کا وائسرائے اور گورنر جنرل بھی بنا دیا ۔ اور اس سے کہا " خزیمہ کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ چاہو تو اسے بحال رکھو اور چاہو تو معزول کر دو ۔ عکرمہ نے عرض کی کہ اسے باعزت طور پر رخصت فرمایا جائے ۔ اور اپنے عہدے پر بحال رہنے دیا جائے ۔ چنانچہ دونوں وہاں سے نہایت احترام کے ساتھ رخصت ہوئے اور مدت تک اپنے اپنے عہدوں پر فائز رہ کر داد جود و سخا اور عدل و انصاف دیتے رہے ۔

۲

(از میاں سلطان احمد صاحب جودی)

آہ ! ۔ خوشبو بن کر پھول میں سما جا ۔ اس پھول میں جو تیرے
انتظار میں کئی پتیاں گرا چکا ۔
روح بن کر اس جسم میں آ جو تیرے انتظار میں مرگھٹ پر
پہنچنے کے قریب ہے
چاند بن کر اس چکور کو زندگی دے جو جنگل میں تیرے انتظار میں تجھ پر قربان ہونے کو بیقرار ہے

سحرِ نگاہ

ایک کیف انگیز غزل

(از جناب مجید لاہوری)

وہ قلب و نظر میں سمانے لگے ہیں
تمنّا کی بستی پہ چھانے لگے ہیں

تصوّر میں چپکے سے آنے لگے ہیں
تخیّل میں جنّت بسانے لگے ہیں

یہ کیا حشر سا حشر اُٹھانے لگے ہیں
کہ پچھلے پہر یاد آنے لگے ہیں

وہ خوابیدہ فتنے جگانے لگے ہیں
کہ پھر زیرِ لب مُسکرانے لگے ہیں

جوانی کی شامیں، جوانی کی راتیں
جوانی کے دن یاد آنے لگے ہیں

جہاں کو حسین و جواں دیکھتا ہوں
وہ ہر شے پہ اِس ڈھب سے چھانے لگے ہیں

وہ خود جھوم کر عالمِ سرخوشی میں
معطّر ہوا کو جھمانے لگے ہیں

وہ شانوں پہ بکھرے ہوئے گیسوؤں سے
گھٹاؤں کا خاکہ اُڑانے لگے ہیں

فضاؤں کو آنکھوں سے مدہوش کر کے
وہ نیندوں کے دریا بہانے لگے ہیں

وہ رنگین ہونٹوں کی دلکش ہنسی سے
چمن میں شگوفے کھلانے لگے ہیں

حسیں چاند سے رُخ کی تابانیوں سے
وہ دھندلاہٹوں کو مٹانے لگے ہیں

نگاہوں میں صبحِ ازل کا سماں ہے
فسونِ تمنّائے اُلفت جواں ہے

پُر اسرار چور

ایک ایکٹ کا نیم مزاحیہ ڈرامہ!

(از جناب جمیل احمد صاحب بی۔اے کندھاپوری)

افراد

۱۔ ہارون :۔ شہر کا قاضی، ایک بارعب مگر قدسی انسان۔
۲۔ نوری :۔ قاضی شہر کی رحمدل لڑکی۔
۳۔ مسز ہاشم :۔ شہر کے ایک مشہور ہوٹل "شبستان" کی مالکہ۔
۴۔ المردی :۔ قاضی شہر کا خادم۔
۵۔ ایک غریب پنشن یافتہ سپاہی

منظر اوّل

(قاضیِ شہر کا مکان)

(نوری مہندی کے پودوں پر آبپاشی کرتی نظر آتی ہے)

المردی ۔ (پردہ کے اندر سے) ہزار بار کہہ چکا کہ آقا ابھی سوئے ہیں ..... اس وقت تم ان سے نہیں مل سکتے، پر تم ہو کہ مانتے ہی نہیں!

نوری ۔ (قدرے چونک کر) یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو المردی؟

المردی ۔ ایک بڈھا ہے حضور! شاید قاضیِ شہر کے پاس کوئی فریاد لے کر آیا ہے۔

نوری ۔ (کچھ سوچکر) فریاد ... لیکر ... آیا ... ہے!! ... تو پھر اُسے نکالو مت! وہیں ٹھیرنے دو!

المردی ۔ لیکن قاضی صاحب نے ابھی قہوہ نہیں پیا ہے، اور میرا خیال ہے، وہ اس سے قبل کسی سے نہیں مل سکتے۔

نوری ۔ تو پھر اس بُڈھے کو یہاں بھیج دو ..... کچھ دیر یہیں انتظار کرے گا۔

(المردی باہر جاتا ہے .... نوری پھر مہندی کے پودوں پر پانی چھڑکانے لگتی ہے ۔ اور ساتھ ساتھ دھیمی لے میں کچھ گاتی بھی جاتی ہے المردی بڈھے کو لیکر نوری کے پاس آتا ہے)

المردی ۔ (بڈھے سے) قاضی صاحب سے تو اس وقت ملاقات ہو نہیں سکتی ۔ اگر چاہو تو یہاں کچھ دیر ٹھیر سکتے ہو

نوری ۔ (بڈھے کو دیکھ کر آپ ہی آپ) بیچارہ بُڈھا ہے اور شاید حوادث کے طوفان کا کوئی ستم رسیدہ نکلا! آہ! کس مظلومانہ انداز میں کانپ رہا ہے! (بڈھے سے) بیٹھ جاؤ بڈھے! بیٹھ جاؤ! ابا سے بہت جلد ملاقات کر سکوگے (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لو بیٹھ جاؤ!

(بڈھا پہلے کچھ پس وپیش کرتا ہے، لیکن نوری اس کی طرف ایک کرسی بڑھا دیتی ہے اور وہ بیٹھ جاتا ہے)

بُڈھا ۔ آپ بہت ہی رحمدل ہیں حضور! بہت غریب پرور!

(نوری پھر اپنے پودوں کی طرف چلی جاتی ہے)

نوری ۔ آہ! یہ پودا تو مرجھا! بالکل خشک ہوا جاتا ہے۔

(اسی اثنا میں بُڈھا ایک سرد آہ کھینچتا ہے اور نوری اس کی طرف رُخ کرکے دیکھتی ہے)

نوری ۔ (آپ ہی آپ) مجھ میں نہیں آتا ۔ آخر یہ کیوں اس طرح سرد آہیں کھینچتا ہے ۔ (بڈھے سے مخاطب ہوکر) گھبراؤ نہیں

بڈھے۔ ابا تم سے بہت جلد ملاقات کرینگے۔

بڈھا۔ جب بھی ملاقات کریں حضور کوئی مضائقہ نہیں، میرا معاملہ تو نہایت حقیر اور غیر اہم ہے۔

نوری۔ تو کیا تم اسی معمولی اور غیر اہم معاملہ کے لئے سرد آہیں کھینچ رہے ہو!

بڈھا۔ آہ! آپ کو کیا بتاؤں بیٹی! اپنی حیثیت کے لحاظ سے تو وہ نہایت حقیر اور ناقابلِ غور ہے لیکن میرے لئے تو وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے تو وہ چیز کھوئی ہے جو میرے لئے سب کچھ تھی۔

نوری۔ تو کیا تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہے!

بڈھا۔ آہ! میں آپ کو اپنی داستانِ غم سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

نوری۔ نہیں! نہیں!! آخر اس میں میری پریشانی کیوں ہونے لگی۔ تم اپنی مصیبت کا حال بغیر کسی اندیشہ کے بیان کرو۔ میں اسے دلچسپی کے ساتھ سنوں گی۔

بڈھا۔ جب آپ مصر ہیں حضور، تو خیر مجھے کہنا ہی پڑے گا۔ قصّہ یوں ہے کہ گذشتہ شب میں نے شبستان میں قیام کیا اور۔۔۔!

(دفعتاً ایک ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی ہے)

نوری۔ وہ دیکھو! ابا سیڑھیوں پر سے نیچے اتر رہے ہیں میں ذرا اس کمرے کے پاس جاتی ہوں۔ دل چاہے تو تم بھی چلو۔ (دو چار قدم آگے بڑھ کر) ہاں کہو! پھر اس رات شبستان میں کیا ہوا؟

بڈھا۔ میں نے رات وہیں گزاری اور میری۔۔۔۔۔۔۔۔!!

(دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں)

منظر دوم

(قاضی شہر کی نشستگاہ)

(قاضی ایک خوشنما قالین پر تکیہ کے سہارے بیٹھا ہوا ہے پاس ہی پیالی میں قہوہ رکھا ہے اور نوری اس میں شکر ڈال رہی ہے)

قاضی۔ فکر نہ کرو نوری، میں اس بڈھے سے بہت جلد ملوں گا۔

نوری۔ تو پھر میں اسے بلا لاتی ہوں۔۔۔۔ دوران قہوہ نوشی میں آپ اس سے گفتگو کر لیں گے۔

قاضی۔ نہیں! نہیں!! میں بغیر قہوہ ختم کئے ہرگز کسی سے نہیں مل سکتا۔ (اتنا کہہ کر ایک گھونٹ پیتا ہے) نوری! قہوہ تو بالکل بدمزہ اور پھیکا ہے۔۔۔۔۔۔ تم شکر ڈالنا بھول تو نہیں گئیں۔

نوری (حیرت سے) نہیں! شکر تو میں نے ڈالی ہے ابا!

قاضی۔ (دوبارہ چکھ کر) نہیں یہ تو بالکل پھیکا ہے!

نوری۔ مگر ابا! میں نے خود اپنے ہاتھ سے دو ٹکڑے ڈالے ہیں۔

قاضی۔ (چڑچڑا کر) کہہ رہا ہوں شکر نہیں ہے۔۔۔ فضول بکے جاتی ہو۔ جیسے میری بات کا یقین ہی نہیں آتا۔

(نوری شوخی کے ساتھ قہوہ کی پیالی کی طرف جھکتی ہے اور چمچی کی مدد سے دونوں ٹکڑے نکال کر قاضی کے سامنے رکھ دیتی ہے)

نوری۔ اور یہ کیا ہیں ابا؟

قاضی۔ اوہو! یہ پگھلے نہ تھے۔۔۔ جبھی تو ان کا وجود بھی عدم وجود کے برابر رہا۔ (دفعتاً قاضی کے فالج زدہ پاؤں میں درد اٹھتا ہے) آہ!۔۔ آہ۔۔۔ میرے پاؤں!! نوری! مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ جاؤ! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو!۔۔۔۔ المدد!۔۔۔۔ المدد!۔۔۔۔ ذرا ادھر تو آنا!

نوری۔ اور وہ مصیبت زدہ بڈھا ابا!

قاضی۔ لاحول ولاقوۃ!۔۔۔ بڈھا! بڈھا! جس وقت سے سو کر اٹھا ہوں، اسی بڈھے کی بکواس ہے! کمبخت نے ناک میں دم کر دیا! جاؤ کہہ دو! اگر وہ انتظار نہیں کر سکتا، اگر اسے ایسی ہی جلدی پڑی ہے تو پھر میرے مکان سے چلا جائے! وہ تو وہ اگر کوئی نواب یا والئی ریاست بھی آجائے تو میں اس سے بغیر قہوہ ختم کئے نہیں مل سکتا۔ (گھڑی دیکھ کر) ابھی صرف بارہ بجے ہیں، قیامت نہیں آگئی۔۔۔۔۔

نوری۔ ناراض نہ ہوں ابا! یہ تو اپنی طرف سے کہہ رہی تھی۔۔۔ وہ تو

مطلق نہیں گھبرایا ہے۔ اگر یہ غلطی تھی تو میری! خدا کے لئے آپ رنجیدہ نہ ہوں۔

قاضی۔ خیر! (قہوہ کا آخری گھونٹ نوش کرتے ہوئے) کچھ بھی ہو اس میں شکر ضرور کم تھی! اچھا جاؤ! المردی کو میرے پاس بھیجدو! میں اپنا کام ختم کرلوں تو پھر اُس بڈھے کی طرف رُخ کروں!

(نوری اچھلتی، کودتی، ناچتی، گاتی باہر نکل جاتی ہے، اور المردی اندر داخل ہوتا ہے)

قاضی المردی! تم شبستان سے کیا جواب لائے؛ مسز ہاشم ہوٹل کی مالکہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؛

المردی۔ جی ہاں! ابھی ابھی وہاں سے واپس آیا ہوں، مسز ہاشم خود ہی آپ سے ملنے آرہی ہیں!

قاضی۔ (خوش ہوکر) آرہی ہیں؛ کیا تم سچ کہہ رہے ہو المردی:

المردی! جی ہاں! سچ کہہ رہا ہوں اور یہ دیکھئے مکان کے نچلے حصہ سے ان کی آواز بھی آرہی ہے۔ شاید پہنچ بھی گئیں۔

قاضی۔ تو جاؤ! انھیں جلد اوپر لے آؤ۔

(مسز ہاشم، شبستان نامی ہوٹل کی مالکہ داخل ہوتی ہے)

مسز ہاشم۔ صبح بخیر! آپ اس وقت بہت بشاش نظر آرہے ہیں! خیر تو ہے؟

قاضی۔ (دو ایک بار آہستہ آہستہ کھانس کر) ہمیشہ خوش ہی رہتا ہوں مسز ہاشم، ہمیشہ اسی کی سعی کرتا ہوں (قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لو بیٹھ جاؤ! کہو مرغ مسلم کا کیا ہوا؟

مسز ہاشم۔ شکریہ! حضور! شکریہ! مرغ مسلم میں خود اپنے ہاتھوں سے چولھے پر چڑھا کر آئی ہوں۔ اور خدا نے چاہا تو یہ اس قدر لذیذ اور خوش ذائقہ ہوگا۔ کہ شاید ہی آپ نے آجتک اس سے بہتر کھایا ہو۔

قاضی۔ اچھا! تو براہ کرم اس کا خیال رکھوگی کہ کھانے کے وقت تک مرغ مسلم یہاں پہنچ جائے۔

مسز ہاشم۔ مطمئن رہئے! ضرور پہنچ جائیگا۔ اچھا۔ دیر ہو رہی ہے! اب مجھے جانا چاہئے۔ شاید میری غیر حاضری میں وہ بگڑ نہ جائے۔

(المردی قہوہ کی پیالی لے جانے کے لئے اندر داخل ہوتا ہے۔ اور مسز ہاشم اُٹھکر اپنی چادر سمیٹنے لگتی)

قاضی۔ المردی! میں اپنا کام ختم کرچکا! اب اُس بڈھے کو میرے پاس بلا لاؤ.....

المردی۔ بہت خوب حضور!

قاضی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ وہ کس قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے؛

المردی۔ شاید کوئی پریشان حال مسافر ہے!

(مسز ہاشم یہ گفتگو سُن کر کچھ متعجب سی ہوجاتی ہے اور چادر میں پن لگانے میں خود بخود کچھ دیر کرتی ہے)

قاضی۔ کوئی پریشان حال مسافر!..... اچھا جاؤ! اُسے میرے پاس بھیجدو اور باورچی سے کہدو کہ کھانے کے لئے مرغ مسلم مسز ہاشم کے ہوٹل سے آئیگا۔

مسز ہاشم مشتاق نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور اجنبی بڈھے کو اندر آتا دیکھ کر یکایک چلّا اُٹھتی ہے ——

"کون وہ بدمعاش بڈھا..... حیلہ ساز گرہ کٹ!"

(مصیبت زدہ بڈھا داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے نُوری بھی آتی ہے۔ بڈھا مسز ہاشم کو دیکھکر قدرے چونک جاتا ہے۔

قاضی۔ (بڈھے سے) آخر کھڑے کیوں ہوگئے! سامنے کیوں نہیں آتے!

مسز ہاشم۔ (بڈھے سے) اب تم یہاں بھی گھُس آئے... شاید قاضی صاحب سے کچھ شکایت کرنے آئے ہو.... ہے نا! (طنزیہ انداز میں) لیکن یاد رہے یہاں تمہاری دال نہیں گل سکتی۔

قاضی۔ (متعجب ہوکر) کیوں آخر ماجرا کیا ہے؛

مسز ہاشم۔ (بڈھے سے) بیوقوف! میں پھر بھی کہے دیتی ہوں کہ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا! جھوٹ اُلٹی پلٹی شکایتیں کرنے آیا ہے... شرم نہیں آتی، کم ظرف!!

قاضی۔ (پریشان ہوکر) خاموش! مسز ہاشم خاموش! یہ کیا فضول بکواس ہے! خیال نہیں تم اس وقت کس کے سامنے زبان درازی کر رہی ہو (بڈھے سے) اِدھر آؤ! میرے بھائی! اِدھر آؤ! میں سُنوں تو آخر قصّہ کیا ہے؟

(بڈھا آہستہ آہستہ سامنے آتا ہے)

قاضی - تم کون ہو۔ اس وقت یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

مسز ہاشم - حضور! اگر آپ اجازت دیں تو ——!

(قاضی ہاتھ کے اشارہ سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کرتا ہے)

بڈھا - جناب! میں ایام جوانی میں سپاہی تھا ——

مسز ہاشم - اور ایام ضعیفی میں گرہ کٹ!

قاضی تم اسے بولنے کیوں نہیں دیتیں مسز ہاشم؟

بڈھا - چند سال سے میں کام کے لائق نہ رہا - جوانی میں میں نے لائق رشک خدمات انجام دی تھیں۔

مسز ہاشم - لائق رشک خدمات! سفید جھوٹ!

قاضی - مسز ہاشم خدارا اسے اپنا حال کہنے دو۔ فضول کیوں چیخے چلی جاتی ہو۔

نوری - ہاں! ہاں ابا! اس بیچارے کی باتوں کو توجہ کے ساتھ سنئے۔

قاضی - (بڈھے سے) ہاں! ہاں کہو! پھر کیا ہوا؟

بڈھا - لیکن حضور بدنصیبی سے میرا بایاں ہاتھ بیکار ہو گیا۔ اور اس وقت سے میں اپنے کام سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں۔

مسز ہاشم - لغو! سراسر غلط!

قاضی - (مداخلت بیجا سے بگڑ کر) آخر تم خاموش کیوں نہیں رہتیں مسز ہاشم! ذرا دم لو! پھر جب تمہاری باری آئیگی تو دل کھول کر بول لینا۔

بڈھا - یقین کیجئے حضور! میں جھوٹ نہیں بولتا - گزشتہ چند سال سے بھیک مانگ کر گذر اوقات کرتا ہوں اور جب اس طرح بڑی کوششوں کے بعد میرے پاس ایک اشرفی جمع ہو گئی - تو میں نے اپنے بھتیجے کے مکان کا رخ کیا تاکہ وہاں پہنچکر اپنی بقیہ زندگی آرام و اطمینان کے ساتھ گذاروں - لیکن افسوس .... !

(اتنا کہکر بڈھا رک جاتا ہے اور سرد آہ کھینچتا ہے)

قاضی - ہاں ہاں کہو! پھر کیا ہوا؟

بڈھا - حضور! یہ آخری رات میں نے یہاں شہر کے مشہور ہوٹل شبستان میں گذاری ..... !

مسز ہاشم - میرے ہوٹل شبستان میں!! ..... بالکل لغو! ..... افترا!!

قاضی - تم پھر بول اٹھیں مسز ہاشم! کہہ چکا کہ اس کے بعد تمہاری باری آئیگی تو دل کھول کر بول لینا - لیکن تم ہو کہ سنتی ہی نہیں .... فضول چیخے چلی جاتی ہو (بڈھے سے) ہاں! تو کل رات تم نے شبستان میں قیام کیا .... پھر کیا ہوا؟

بڈھا - جی ہاں حضور! کل رات میں وہیں سویا - شب کے وقت تو میری حقیر رقم میرے پاس تھی - لیکن جب صبح آنکھ کھلی تو وہ گم ہو چکی تھی۔

مسز ہاشم - گم ہو چکی تھی —— کیا تمہارے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تمہاری اشرفی میرے ہوٹل میں غائب ہوئی - میں نے تمہیں رات بسر کرنے کی اجازت دے دی - اس کا یہ صلہ! کہتے تھے کہ مجھے ایک کونے میں پڑ رہنے دو اور جب میں نے مروت سے تمہیں اجازت دے دی تو مجھ پر جھوٹا اور غلط الزام عائد کرتے ہو —— تم سا احسان فراموش بھی شاید ہی کوئی ہوگا!

بڈھا - مسز ہاشم! میں تو ہرگز آپ کو چور نہیں کہتا ....

مسز ہاشم چور کہتے بھی، اور پھر اس سے انکار بھی کرتے ہو!

قاضی - (بگڑ کر) خاموش رہو مسز ہاشم! خاموش رہو! میں نے لاکھ بار چپ رہنے کی تاکید کی اور تم نے لاکھ بار حکم شکنی کی! اگر آئندہ بولیں تو اچھا نہ ہوگا! سمجھ گئیں۔

مسز ہاشم - (رنجیدہ ہو کر منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے) "اچھا نہ ہوگا" — نہ جانے یہ میرا کیا کر لیں گے (قاضی سے) اچھا اب میں جاتی ہوں - لیکن یہ تو کہئے کہ اگر مرغ مسلم تیار ہو تو اسے فوراً بھیجدوں یا نہیں!

قاضی - چولھے میں جائے تمہارا مرغ مسلم - دیکھتی نہیں مسز ہاشم کہ یہ جگہ مرغ مسلموں کی بکواس کی نہیں۔

مسز ہاشم - اچھا! اچھا! معاف فرمائیے میں جاتی ہوں۔

(مسز ہاشم غصہ میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے)

منظرِ سوئم

(قاضی، بڈھا اور نوری یہ تینوں آپس میں باتیں کرتے نظر آتے ہیں)

نوری - (بڈھے سے) لو! مسز ہاشم چلی گئیں - اب تم اطمینان سے اپنی مصیبت بھری داستان سُنا سکتے ہو - لیکن دیکھو! مسز ہاشم کی حکم شکنی کر کے ابا کو رنجیدہ خاطر نہ کرنا -

قاضی - ہاں ہاں! ڈرو نہیں! کہو، پھر کیا ہوا؟

بڈھا - شکریہ حضور شکریہ! آپ بڑے مہربان ہیں

قاضی - شکریہ! یہ کس بات کا - انصاف اور رحم یہ تو میرے فرائض ہیں - تمہیں اس کے لئے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں - اچھا تو پھر کہو - تم نے اپنی اشرفی شبستان میں کھو دی ہے نا! رات کے وقت یہ تمہارے پاس تھی - لیکن صبح گم ہو گئی - مجھے کچھ شک ہوتا ہے! کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ اشرفی رات تک تمہارے پاس تھی -

بڈھا - جی ہاں! سونے سے قبل میں نے اسے نکال کر دیکھ لیا تھا -

قاضی - اچھا - تم نے اسے رکھا کس چیز میں تھا؟

بڈھا - حضور وہ میری ناس کی ڈبیہ میں تھی - میں اسے برابر اسی کے اندر رکھا کرتا تھا -

قاضی - ناس کی ڈبیہ میں؟ — میں نے تو آج تک ایسا واقعہ کبھی نہیں سُنا - تمہارا بیان ہے کہ ڈبیا سونے سے قبل تمہارے پاس تھی لیکن بیدار ہونے پر تم نے اسے غائب پایا ..... ہے نا!

بڈھا - نہیں حضور! ڈبیہ تو اب بھی میرے پاس موجود ہے چور صرف اشرفی لے گیا ہے - ڈبیہ تو وہ بجنسہ چھوڑ گیا -

قاضی - بس بس بہت ہوا - میں یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں - سوچو تو سہی - بھلا ایسا بھی بے وقوف کون ہو گا جو اشرفی تو چرا لے جائے مگر ڈبیہ وہیں چھوڑ دے - بالکل جھوٹ - ناممکن الوقوع ہے - میں ہرگز یقین نہیں کر سکتا!

بڈھا - اب میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں حضور - لیکن میں حلف لیکر کہتا ہوں کہ میں تِل برابر بھی جھوٹ نہیں کہہ رہا -

قاضی - بس چپ بھی رہو - فضول کیوں بکتے ہو - کوئی سر پھرا ہو گا جو تمہاری باتوں کا یقین کرے گا -

بڈھا - یہ دیکھئے حضور! ڈبیہ آپ کے سامنے حاضر ہے -

قاضی - (بغیر ڈبیہ دیکھے ہوئے) ..... لغو ..... بالکل مہمل! ... میں اس پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا - بھلا کون ایسا بے وقوف ہو گا جو اشرفی تو لے لے اور ڈبیہ وہیں چھوڑ دے ..... سراسر لغو اور بے بنیاد ہے - دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے یقین نہیں دلا سکتی -

(نوری ڈبیہ لے کر اپنے باپ کے سامنے جاتی ہے)

نوری - آپ نے یہ ڈبیہ نہیں دیکھی ابا -

قاضی - لغو - سراسر لغو - یہ ہرگز وہ ڈبیہ نہیں ہے - اگر چور اشرفی لے گیا ہے تو بے شک ڈبیہ بھی ساتھ لے گیا ہے - بڈھا جھوٹا ہے ..... جھوٹ بولتا ہے ... یہ ہرگز وہ ڈبیہ نہیں ہے

بڈھا - لیکن حضور! میں تو سچ ....

قاضی - (چیں بجبیں ہو کر) میں تمہاری لغو بکواس سُن چکا اور ہزار بار کہہ چکا کہ میں ایسی ناممکن الوقوع باتوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا ... تم تو تم! اگر خود بادشاہ بھی آ کر میرے سامنے یہ کہے تو میں اس کی صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا

نوری - آخر آپ اس کی باتوں کا یقین کیوں نہیں کرتے ابا؟

قاضی - فضول بکو نہیں نوری! جاؤ اپنی گڑیوں سے دل بہلاؤ - ان باتوں کو سمجھنے کی ناکام کوشش نہ کرو - جو تمہارے فہم و ادراک سے باہر ہیں - بھلا تم قوانین کس طرح سمجھ سکتی ہو ... (گلو خلاصی کر کے پھر بڈھے سے) تمہیں میرے سامنے آخر یہ جھوٹی شکایت عائد کرنے کی ہمت کس طرح ہوئی - لو! میں تمہیں تھوڑی دیر کی مہلت دیتا ہوں - ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو - کہ دراصل معاملہ کیا ہے -

(کچھ دیر ٹھہر کر قاضی پھر بڈھے سے یوں ہمکلام ہوتا ہے)

قاضی - کہو - اب تم ڈبیہ کے متعلق کیا کہتے ہو ..... خیال رہے سچ سچ کہنا -

بُڈھا - حضور! میں تو پھر وہی کہوں گا جو قبل کہہ چکا۔

قاضی - (بگڑ کر) پھر وہی لغو تقریر!... اتنی مہلت دینے پر بھی وہی مہمل بکواس!.... بار بار وہی رٹ لگا رہے ہو! دیکھوں تو آخر تم مجھے کس طرح یقین دلاتے ہو۔

بُڈھا - یقین میں کس طرح دلاؤں حضور!!

قاضی - دیکھو! میں قانون سے بخوبی واقف ہوں اور تمھیں بھی بہت جلد اس سے متعارف کرا دوں گا۔ لو! ایک گھنٹہ کی اور مہلت میں پھر بھی تمھیں دیتا ہوں۔ اگر اس پر بھی اپنی کہانی سے درگزر نہ کیا تو جھوٹا اور غلط الزام عائد کرنے کے جرم میں خود تمھیں ہی سزا بھگتنی پڑے گی۔۔ المردی! المردی!! سُنتے ہو! اس بُڈھے کو علیحدہ لے جاکر بٹھاؤ!

(بُڈھا وہاں سے ہٹتا ہے اور قاضی نفرت آمیز لہجہ میں یہ الفاظ بڑبڑاتا ہے)

قاضی - عجیب احمق اور سر پھرا ہے کہیں ممکن ہے کہ چور اس کی اشرفی تو چُرا لے جائے اور ڈبیہ وہیں چھوڑ دے.... بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا۔

(نوری بھی آہستہ آہستہ بڈھے کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر جاتی ہے)

نوری - پریشان نہ ہو بھائی!... پریشان نہ ہو... اگر تم حق پر اور سچ کہتے ہو تو تمھیں ہرگز فکر نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ جیت آخر تمہاری ہی ہوگی۔

بُڈھا - میں تو سچ کہہ رہا ہوں بیٹی۔ جھوٹ بولنے سے کیا حاصل۔

نوری - اچھا! مجھے دفعتاً خیال آیا ہے! ذرا یہ تو غور کر کے بتاؤ کہ سوتے وقت ڈبیہ کو تم نے خوب مضبوطی سے بند کر دیا تھا یا نہیں؟

بُڈھا - نہیں بیٹی ڈبیہ کھلی رہ گئی تھی۔ موم بتی بجھ جانے کے سبب سے میں اندھیرے میں اس کا ڈھکنا ڈھونڈ نہ سکا۔ قسم لے لو بیٹی! میں جھوٹ نہیں کہتا۔

منظر چہارم

(قاضی اپنے دارالمطالعہ میں کچھ لکھتا نظر آتا ہے)

بُڈھا - (آپ ہی آپ) آہ! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ دنوں اور مجھے اس دنیاوی زندگی کی تکالیف برداشت کرنا پڑینگی۔

قاضی - (نظریں اُوپر اُٹھا کر) آخر تم اس غلط بیانی پر کیوں مُصر ہو کہ چور اشرفی تو لے گیا۔ لیکن ڈبیہ وہیں چھوڑ گیا۔ عقلمند انسان آخر اس جھوٹ سے فائدہ!.... المردی! ذرا ادھر تو آنا!......

(المردی داخل ہوتا ہے)

قاضی - لو۔ اس بُڈھے کو تھانہ لے جاکر سپاہی کے حوالہ کر دو۔ اور یہ وارنٹ بھی دے دینا.... کہدینا! یہ بڈھا جھوٹا ہے اور ملزم!! اس نے ایک شریف خاتون پر جھوٹی تہمت لگائی ہے۔

(المردی ابھی بڈھے کے ساتھ باہر نکلنے بھی نہیں پاتا ہے کہ نُوری دوڑتی ہُوئی ہانپتی کانپتی داخل ہوتی ہے)

نوری - اشرفی مل گئی! اشرفی مل گئی! ابا! میں نے چور کو ڈھونڈ نکالا

(اتنے میں مسز ہاشم بھی بشاش صورت بنائے کمرے کے اندر داخل ہوتی ہے)

مسز ہاشم - قاضی صاحب! کہئے تو آپ نے بھی کبھی ایسی عجیب و غریب بات سُنی ہے!

قاضی - (حیرت سے) لیکن آخر قصہ کیا ہے؟

(نوری مسز ہاشم کو خاموش رہنے کی درخواست کرتی ہے)

نوری - میں نے چور کو گرفتار کر لیا ابا! کہئے تو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں!

قاضی - (خوشی سے مسکراتے ہوئے) ہاں! ہاں! ضرور لے آؤ! میں بھی اس چور سے پوچھوں گا کہ اشرفی لینے کے بعد آخر اس نے ڈبیہ کو کیوں چھوڑ دیا تھا! اچھا اور تم مسز ہاشم! جب میں چور سے سوالات کر [illegible]

نہ کرنا.. سمجھیں!

(مسز ہاشم اپنی انگلیاں لبوں پہ رکھ لیتی ہیں۔ سب کی اشتیاق آمیز نظریں دروازے کی جانب لگی ہوئی ہیں۔ نوری ایک لکڑی کا پنجرا لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ پنجرے کے اندر ایک میگپائی[1] (magpie) ہے)

قاضی۔ (حیرت آمیز لہجہ میں) ارے یہ تو مسز ہاشم کی پرانی چڑیا ہے!

مسز ہاشم۔ جی ہاں! میری وہی پرانی چڑیا "میگپائی"!! آپ ہی سوچئے تو سہی بھلا کسی کی توجہ اس طرف مبذول ہو سکتی تھی۔ مس نوری تو واقعی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی بے مثل ذہانت سے چور کا پتہ لگا لیا۔

بڈھا۔ (حیرت آمیز مسرت سے بے خود ہو کر) شاباش! بیٹی شاباش!

قاضی۔ واہ بیٹی واہ! کیوں نہ ہو! آخر تھی تو قاضی ہارون کی بیٹی! اچھا نوری! یہ تو بتاؤ کہ تم نے اسے گرفتار کس طرح کیا!

نوری۔ تو سب سے پہلے مجھے آپ کو یہ بتانا چاہئے کہ آخر مجھے اس چڑیا پہ شبہ کیونکر ہوا۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا ابا، موسم سرما کا وہ دن جب میں آپ کے ساتھ شبستان کی لائق رشک رقص گاہ میں گئی تھی۔

مسز ہاشم۔ بھلا! یہ بھی بھولنے کی باتیں ہیں نوری! قاضی صاحب کو سب کچھ یاد ہوگا۔

نوری۔ ہاں: تو میں نے اسی دن اپنے چچا کو یہ کہتے سنا تھا کہ میگپائی کبھی کبھی روپے، اشرفیاں چرا لیا کرتی ہے اور اٹھا کر اپنے گھونسلے میں لے آتی ہے۔ ایک شخص کو اس وقت وہاں میرے چچا کی بات پر کچھ شبہ ہوا اور اس نے ان سے شرط لگائی۔ اس پر چچا نے میز پر ایک اشرفی رکھی اور یہ میگپائی اسے وہاں سے اپنے گھونسلے میں اٹھا لے بھاگی۔ اس لئے آج مجھے خیال آیا کہ شاید ابکے بھی اسی شریر چڑیا نے بڈھے کی اشرفی چرائی ہو!

قاضی۔ خوب! خوب! شاباش!!

نوری۔ ہاں! تو جب میں اس کے گھونسلے کے پاس گئی تو دیکھا کہ اشرفی رکھی ہے۔ لیکن ابا آپ نے دیکھا۔ یہ چڑیا ڈبیہ تو نہیں چرا لے گئی!

قاضی۔ (قدرے شرما کر) ہاں! چونکہ چور ایک چڑیا تھی۔ اگر کوئی آدمی ہوتا تو اشرفی لیکر ہرگز ڈبیہ نہ چھوڑ دیتا۔ دیکھا! میں سچ کہتا تھا نا!!

نوری۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ اس بڈھے کی اشرفی تو مل گئی!

قاضی۔ بیٹی نوری! لو۔ یہ چار اشرفیاں بھی بڈھے کو میری طرف سے بطور انعام دے دو۔ میں عجلت میں اس کے خلاف وارنٹ بھی جاری کر چکا تھا۔

مسز ہاشم۔ ہاں! اور میں نے بھی غصہ میں اسے سخت و سست کلمات کہہ دیئے تھے۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے! جہاں میرے ہوٹل کی بدنامی کا اندیشہ ہے وہاں اپنے ہوٹل کی طرف سے صفائی پیش کرنا میرا اولین فرض ہے۔

بڈھا۔ او خدا۔ میں اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مسرور انسان ہوں بیٹی نوری! تم نے مجھے دنیا کا مسرور ترین انسان بنا دیا۔ اگر تم اس وقت چوری کا انکشاف نہ کرتیں تو ان لوگوں کی نظروں میں میں ہمیشہ کے لئے جھوٹا ہو جاتا۔

مسز ہاشم۔ اچھا لو۔ یہ چڑیا میری طرف سے بطور پیش کش قبول کرو۔ سڑکوں پر لوگوں کو اس کا تماشہ دکھانا اور وہ تمھیں پیسے دینگے۔ اس کی مدد سے تمھیں کھانے کو کچھ نہ کچھ ہر روز ضرور ہی مل جایا کرے گا۔ سمجھے!

قاضی۔ اور تم براہ کرم! اپنا کھانا آج میرے ساتھ نوش کرنا! کیوں قبول ہے!

بڈھا۔ (جھک کر سلام کرتا ہے) بخوشی! شکریہ!

مسز ہاشم۔ اور قاضی صاحب یہ لیجئے مرغ مسلم آپکے سامنے میز پر موجود اور میرا خیال ہے اسوقت اسکا انکار ہرگز آپکی خفگی کا باعث نہ ہوگا۔[2]

---

[1] یہ کوے کی ہم شکل ایک چڑیا ہے۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روپے، اشرفیاں اٹھا کر اپنے گھونسلے میں لے آتی ہے۔ پہلے یہ چڑیا مغرب میں کثرت سے پائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کی تعداد پہلے سے کم ہو گئی ہے۔

[2] قاضی۔ نہیں نہیں [illegible] شکریہ [illegible]

برسات کی ایک شام

(از جناب جلال ملیح آبادی)

پھولی ہے شفق شام کو رنگین ہے جنگل!
وہ ریل، چمکتی ہوئی اس پل پہ ندی کے
چرواہے چلے جاتے ہیں گلّوں کو بھگائے
ڈوبے ہوئے پانی سے کھجوروں کے جزیرے
وہ موڑ پہ کھیتوں کے کوئی گاؤں کی لڑکی
کیا جانے کہاں جائیگی اس وقت یہ رانی
سیندور بھری مانگ ہی ماتھے پہ ہے ٹیکا
نکھرے ہوئے گالوں پہ جوانی کی دمک ہے
تالاب کے پانی پہ وہ مُڑ مُڑ کے جھکی ہیں
بجلی کہ چھلاوا ہیں یہ تالاب کی لہریں!
اِک دھوم مچا رکھّی ہے کوئل نے ہوا میں
بگلوں کی قطاریں ہیں کہ موتی کی لڑی ہے

میدان میں ساون کی پھواروں سے ہی جل تھل
کس ناز سے آتی ہے بجاتی ہوئی چھاگل
گرجے ہیں کہیں دُور یہ میدان میں بادل
پاتے نہیں آرام تھپیڑوں سے کسی پل
برسات کے پانی سے سمیٹے ہوئے آنچل
تیزی سے چلی جاتی ہے اِک سمت وہ چنچل
گردن میں ہے چاندی کی چمکتی ہوئی ہنسلی
بھیگی ہوئی پلکوں میں ہے پھیلا ہوا کاجل
برکھا کی پھواروں سے ہر اِک ڈال ہے بوجھل
سکھ ان کو نہ اس پل ہے نہ آرام ہے اِس پل
باغوں میں پپیہے کی صداؤں سے ہے ہلچل
ہوتی ہی چلی جاتی ہے بادل میں جو اوجھل

ایسے میں یہاں ہے کوئی بھگوان کا پیارا
بھر دے جو مئے ناب سے مجھ مست کا چھاگل

شمعِ اُلفت کے پروانے

وادیٔ نیل کی ایک حسرت آگیں داستان

(از جناب سید شمیم عسکری)

"کیا آقا خیری آفندی تشریف رکھتے ہیں؟" کوئی شخص چپراسی سے پوچھ رہا تھا۔

"دن کے چار بجے تھے صبح آٹھ بجے سے ابتک مجھے سر اُٹھانے تک کی فرصت نہ ملی تھی۔ کھانا چپراسی گھر سے لے آیا تھا لیکن وہ ہنوز جُوں کا تُوں رکھا تھا۔ اُن لوگوں کو جو کسی اخبار کے ایڈیٹر نہیں۔ کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی زندگی کس قدر عبرت ناک ہے۔ کولہو کا بیل تو اپنے آقا کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر رُک بھی جاتا ہے۔ لیکن ایڈیٹر کا دماغ اور ہاتھ چوبیس گھنٹہ مشغول رہتا ہے۔ ان ایڈیٹروں کو جو مر کے دیکھ چکے ہیں۔ شاید اس کا علم ہو کہ مرنے کے بعد بھی ہم غریبوں کو چین ہے یا نہیں۔ ورنہ مجھے تو اس کا بھی یقین نہیں۔

گرمی کے دن چیف ایڈیٹر صاحب غیر حاضر۔ سُنا ہے حضرت عزرائیل سے بر سر پیکار ہیں لہٰذا اُن کا کام بھی اس خاکسار کی گردن پر۔ صبح سے کام کر رہا ہوں اور کام لے رہا ہوں لیکن جب نگاہ اُٹھتی ہے میز کو بغیر دیکھے ہوئے کاغذات سے اٹا پاتا ہوں۔ معلوم نہیں قدرت کا یہ مذاق کب ختم ہوگا۔ کیونکہ بظاہر میں یا یہ کاغذات تو ختم ہوتے نظر آتے نہیں"

"کیا آقا خیری آفندی تشریف رکھتے ہیں؟"

دروازہ کے نیلے پردہ پر کسی کا متحرک سایہ نظر آیا۔ یارب العٰلمین: شاید حضرت ملک الموت کو اس خاکسار پر رحم آگیا چلو اچھا ہوا شاید چین مل جائے"

"آقا کیا میں آسکتا ہوں؟" موت تو خیر نہیں اِلّا اس کا کوئی رُکن خاندان ضرور تھا۔ نو وارد کی پسینہ سے شرابور اُنگلیوں نے ایک نیلا لفافہ آگے بڑھایا۔

"کیا ہے؟" میں نے بغیر پڑھے پوچھا۔

"حضور! آقا زیدی طالبی ـــــ!" اس کے آگے یا تو اُس نے کچھ کہا نہیں اور اگر کہا تو میں نے سُنا نہیں۔

"زیدی طالبی؟" میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سوچا۔ کون زیدی طالبی؟" لفافہ پر نظر ڈالی۔

علامہ خیری آفندی

مدیر روزنامہ "الاخبار"۔ قاہرہ۔

لفافہ چاک کیا! یا خود ہو گیا۔ بہرحال خط میرے ہاتھ میں تھا۔

۱۳۔ مصطفائی محلہ۔ قاہرہ

۱۴۔ جمادی الاوّل

پیارے خیری!

کیا میں اُمید کروں کہ تم ایک مرنے والے کی! اپنے بچپن کے ایک عزیز ترین ساتھی کی آخری خواہش پوری کرنے میں بخل نہ کروگے برائے خدا فوراً حاملِ رقعہ کے ساتھ چلے آؤ! ورنہ دونوں کی حسرت رہ جائیگی۔ ایک کو تکمیلِ آرزو کی اور دوسرے کو دید کی ـــ!

تمہارا قریبِ مرگ دوست،
"زیدی طالبی"

ملا تبریزی کی مسجد سے قاہرہ کالج تک کا تمام مہذبانہ طالب علمی آنکھوں کے سامنے پھر گیا" آہ! وہی زیدی طالبی جس کی صورت دیکھنے کو نو سال سے آنکھیں ترس گئیں!" میری آنکھیں خودبخود ڈبڈبانے لگیں۔

"اچھے خیری تم آگئے!" یہ مدہم آواز اس شخص کی تھی جو موت و زیست کی کشمکش میں اس وقت تک فاتح تھا لیکن بایں ہمیشہ کہ خود موت کو ترس آئے۔

"آہ! زیدی تم نے یہ کیا حالت کر لی!" میری نمناک آنکھیں بے قابو ہوگئیں۔

"شکر ہے دوست کہ تم آگئے! ورنہ میرے دل میں حسرت ہی رہ جاتی" اُس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ "آؤ! یہاں بیٹھ جاؤ" اُس نے اپنی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس پر اُس کا وجود بسبب لاغری عدم وجود کے برابر تھا۔ "مجھے اپنا ہاتھ پکڑنے دو" اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "اب زیادہ وقت نہیں اس لئے میں جلد از جلد تمہیں وہ واقعہ سُنا دینا چاہتا ہوں جس کے لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔ پر ایک وعدہ کرو!" اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ "عمر بھر کسی سے اس کا تذکرہ نہ کروگے۔ کیوں؟"

"میں قسم کھاتا ہوں" میں نے کہا۔ "دوست کا راز دوست کے سوا کسی کو نہ معلوم ہوگا۔ لیکن آخر تم اس قدر ناامید کیوں ہو۔ ابھی جلدی نہیں جب صحت ہو جائیگی تو اطمینان سے تمام باتیں سُنانا۔ زیادہ بولوگے تو اور طبیعت خراب ہو جائیگی!"

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو" اس کے خشک لبوں پر ایک تلخ تبسم نمودار ہوا۔ "میں اپنی حالت خوب سمجھتا ہوں۔ ایک طبیب اور ڈاکٹر سے کہیں زیادہ اچھی طرح۔ لو سنو!" اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"میں تمہید میں وقت صرف کرکے قصہ کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا اس لئے اصل مدعا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

"سلمیٰ" ایک نادار باپ کی بیٹی تھی۔ غربت ہی میں اس نے آنکھیں کھولیں اور غربت ہی میں ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ ماں کا تصور اُس کے ذہن سے بالاتر تھا۔ کیونکہ وہ اُسکی ولادت کے چند ماہ بعد ہی فوت ہو چکی تھی۔ البتہ وہ باپ کی محبت اور شفقت کا اندازہ دوسروں کی نسبت زیادہ اور اچھی طرح کر سکتی تھی جس نے اسکی پرورش اور محبت کے جوش میں اپنی جوانی کو ہمیشہ کے لئے اپنی تیرہ و تار کوٹھڑی میں دفن کر دیا تھا۔ سلمیٰ ہی اُس کی زندگی کا مقصد اور اُس کی آرزوؤں اور خواہشوں کی انتہا تھی۔

سرما کی ایک مرطوب شام کو میں "مجمع علمی" سے واپس آ رہا تھا۔ ہوا میں معمول سے زیادہ خنکی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ درویشوں کے محلے کی تنگ و متعفن گلیاں ناقابلِ گذر بنی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کی زیادتی سے راہگیروں کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور شاید اسی خوف سے ان گلیوں میں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ میں خود کو اس حماقت پر لعن طعن کرتا ہوا ناک پر رومال رکھے جلد از جلد ان گلیوں سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ یکایک گلی کے آخری موڑ پر پہنچا کہ خودبخود قدم رُک گئے۔ احمد درویش کی کوٹھڑی کا بوسیدہ پردہ کوٹھڑی میں دھوئیں کی کثرت کے سبب ایک طرف کھسکا دیا گیا تھا۔ سامنے ایک نایاب لعل گدڑی میں درخشاں تھا۔ مٹی کے شکستہ چولہے پر مٹی ہی کی ایک ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ جس کے جھڑے ہوئے کنارے اُسکی کہنگی کا ماتم کر رہے تھے۔ ایک گوشہ میں ایک گربۂ لاغر اپنے آقا کی مفلسی کا نمونہ بنی بیٹھی تھی۔

پر آہ! وہ لعل! جس کی قیمت جم و کسریٰ کی ہفت اقلیموں اور فراعنہ مصر کی دولت و عظمت پر بھاری تھی۔ کس قدر حسین تھا۔ ایک نامعلوم رنگ کے چیتھڑوں سے مشابہ کپڑوں میں ملبوس چولہے میں آگ سُلگا رہی تھی۔ ممکن ہے امتدادِ زمانہ کا شکار ہونے سے قبل ان کپڑوں کا رنگ سُرخ ہو۔ مگر اس وقت کسی رنگ کا اطلاق ناممکن تھا۔ افلاس کا آئینہ دار چہرہ۔ فلاکت کا نوحہ خواں جسم۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے۔ دستِ مشاطہ سے ناآشنا۔ آنکھیں استبدادِ زمانہ کی شاکی حلقۂ چشم میں دھنسی ہوئی۔ خشک لب، زرد رُخسار۔ قامت مثلِ سرو مگر جسامت مثلِ بید۔

درِ درویش پر کسی اجنبی کو حیران و ششدر کھڑا دیکھ کر اُس کی غمگین نگاہیں اُٹھیں۔ لیکن ایک نامحرم کی پُرشوق نگاہوں سے دوچار ہو کر خودبخود جھک گئیں۔ یہ میری اور اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ جو صرف ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھنے پر ختم ہوئی۔ لیکن بلحاظ تاثیر ایک طویل ترین

ملاقات سے زیادہ اہم تھی۔

اس روز سے میں اپنے دل و دماغ میں ایک نامعلوم انقلاب محسوس کرنے لگا جسکی نشوونما درویشوں کے محلے کی گلیوں کے روزانہ چکر کے ساتھ ساتھ بسرعت ہو رہی تھی۔ اب میں محسوس کرنے لگا تھا کہ حسین سلمٰی کے دل میں میرے لئے جگہ ہو چلی ہے۔ مجھے دیکھنے سے اُس کا متبسم ہو جانا اور اُسکی شرمگیں آنکھوں کا کبھی کبھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں کسی اور طرف دیکھ رہا ہوں میری جانب دیکھنا میرے لئے بہت کچھ ہمت افزا تھا۔ بالآخر مضطرب کے ہاتھوں سے دامنِ ضبط چھوٹ ہی گیا۔

موسم سرما کا عہدِ شباب۔ رمضان کا مہینہ۔ محلہ کے تمام مرد مسجد میں تراویح کے لئے جا چکے تھے۔ میں نے سہج سے سلمٰی کی تاریک کوٹھڑی کا بوسیدہ پردہ ہٹایا۔

"آہ! میری ارمانوں کی دنیا۔ میری تمنّاؤں کا مرکز۔ میری زندگی کا سہارا سلمٰی۔ مجھے اس گستاخی پر معاف کر دو۔ میں بے حد شرمسار ہوں۔ پر دل کے ہاتھوں مجبور۔ پیاری سلمٰی میرا یہ حرکت نہ کرنا ناگزیر تھا۔ میں مجبور تھا۔ کہ تمہارے حضور اپنا دل چیر کر پیش کرتا۔ آہ! کاش سلمٰی تم میری مجبوری کا اندازہ لگا سکو۔ کاش تم سمجھ سکو کہ میں کس قدر اضطراری حالت میں اس جسارتِ بیجا کا مرتکب ہو رہا ہوں ——!"

میری آنکھیں مجبورِ اشکباری تھیں۔ آنسو ٹپک ٹپک کر کوٹھڑی کی نمی میں اضافہ کا باعث بن رہے تھے۔

"آہ! زبیدی تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ آہ! تم بھولتے ہو! میں تو اپنا دل آج سے بہت مدت قبل تمہاری نذر کر چکی ہوں۔ اُسی روز جس روز تمہارے قدم پہلے پہلی بار اس کوٹھڑی کے دروازے پر رُکے"

میں نے سلمٰی کو دیکھا۔ آہ! کیا شیریں الفاظ میری پیاری سلمٰی ہی کے ہیں۔ ہاں اِسی کے ہیں! اسی کے۔ اس کی شاہد اس کے چہرہ کی بوسیدہ نقاب ہے جو اس کے لبوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ میں واپس آگیا۔ آج دنیا میں مجھ سے زیادہ مسرور کوئی نہ تھا کوئی ایسا نہ تھا جو میری مسرت کا اندازہ لگا سکتا ہو۔

بیمار زبیدی طلابی کی بے نُور آنکھیں آبگوں ہو چکی تھیں۔ اس نے خیرگی سے پانی کا اشارہ کیا اور پانی پی کے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ اب کے اُسکی آواز پہلے سے بھی زیادہ دھیمی اور بے ربط تھی۔

"وقت گزرتا گیا۔ مہروماہ کے طلوع و غروب کے ساتھ ساتھ میری اور سلمٰی کی ملاقاتوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ ہماری ملاقات نہ ہوتی ہو۔

اتفاقاً سلمٰی کا بوڑھا باپ بیمار ہو گیا۔ اب ہمارے لئے ایک دوسرے سے ملنا بیحد مشکل تھا۔ کیونکہ بیمار احمد اپنی کوٹھڑی سے کسی وقت بھی نہ نکلتا تھا۔ انھیں دنوں میں نے ایک بدوی نوجوان کو درویش کے گھر آتے جاتے دیکھا۔ جو اکثر صبح ہی صبح اپنے مریل خچر پر سوار آجاتا اور دیر تک بیٹھا احمد کے ساتھ گفتگو کرتا رہتا تھا۔ "کیا اُلّو کی طرح تاکتا رہتا ہے!" ایک دن اس نے مجھے درویش کی کوٹھڑی کے سامنے کھڑا دیکھ کر نفرت سے کہا "کیا تیرے لئے دنیا میں اور کوئی جگہ نہیں ہے؟"

"یا اخی!" میں نے اس وحشی جوان سے دروغگوئی سے کام لیا۔ میں یہاں ایک شخص کا انتظار کر رہا ہوں"

"لعنتُ اللہِ علی الکاذبین"! اُس نے ایک عجب نفرت انگیز انداز سے کہا "کیا میں تجھے یہاں روز کھڑے اور اس کوٹھڑی کی طرف تاکتے نہیں دیکھتا؟ اچھا اب یہاں سے فوراً بھاگ جا۔ ورنہ اس دروغگوئی کی پاداش میں ایسا مُکّا کھائے گا کہ ہوش غائب ہو جائینگے" اُس نے واقعی مُکّا مارنے کے انداز سے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

میں ڈر گیا کہ مبادا یہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر نہ بیٹھے۔ پس میں وہاں سے واپس آگیا۔ اور اُس روز سے وہاں جانے میں احتیاط برتنے لگا کہ کہیں اس شقی کی نظر دوبارہ نہ پڑ جائے۔

چند روز اسی حالت میں گزرے۔ آخر ایک روز خود سلمٰی نے ملاقات کا ذریعہ نکالا۔ "یا ابو!" اس نے کہا "کل صبح میری سہیلیاں خانقاہ جائینگی۔ کیا میں اُن کے ساتھ جا سکتی ہوں؟"

"آہ! بچی" بوڑھے درویش نے کھانستے ہوئے کہا "میں بیمار ہوں گھر میں اکیلا کیسے رہ سکوں گا؟"

"نہیں ابو! میں جلد واپس آجاؤں گی" سلمیٰ نے تسلّی دیتے ہوئے کہا "مجھے دیر نہ لگے گی"

"اچھا جا! لیکن دوسری لڑکیوں سے علیحدہ ہو کر نہ پھر" بوڑھا باپ خاموش ہو گیا۔

میرا معمول تھا کہ میں روز بیخ درویش کی کوٹھڑی سے دور کھڑے ہو کر سلمیٰ کو دیکھ لیا کرتا تھا اور وہ مجھے چنانچہ جب اگلے روز آیا۔ تو میں نے سلمیٰ کو خانقاہ کی طرف دیکھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

"خانقاہ کے مغربی گورستان میں" اُس نے آہستہ سے مجھ سے کہا اور تیزی سے گلی میں مڑ گئی۔

زبیدی کو کھانسی کا ایک شدید دورہ اٹھا جس کی تکلیف سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"یا حبیب!" اُس نے خیری کے ہاتھ کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں جلد ہی ختم ہو جاؤنگا۔ کاش ۔۔۔!" اُس نے زور سے کھانستے ہوئے کہا۔ "کاش! مجھے کھانسی تھوڑی سی فرصت اور دیدے اور میں یہ قصّہ سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں"

اس نے پھر کہنا شروع کیا:-

آہ! خانقاہ کی ملاقات بے حد دردناک تھی۔ وہ! مجھے ملی' اس کا چہرہ وفورِ غم سے پژمردہ ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بدوی حمدان ابن طعلی اُس کا منگیتر ہے اور اب وہ اس بات پر مُصِر ہے کہ جلد از جلد عقد ہو جائے۔ آہ! اس اندوہناک خبر نے میری عقل و خرد کو جلا دیا۔ میرے ہوش و حواس زائل ہو گئے۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ دنیا میرے لئے بالکل تیرہ و تار تھی۔ معلوم نہیں میں اس حالت میں کب تک بیٹھا رہا جب سر اُٹھایا تو آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ "اُف میرے اللہ! صبح سے شام ہو گئی!"

میں وہاں سے آ گیا۔

اگلے روز' اُس سے اگلے روز' حتیٰ کہ آج تک میں پھر درویشوں کے محلہ میں نہیں گیا۔ میں نے سلمیٰ کو اپنی جان سے عزیز سلمیٰ کو پھر کبھی اس بوسیدہ پردہ کی اوٹ میں کھانا پکاتے نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ میں پھر وہاں کبھی نہیں گیا۔ میری زندگی میرے لئے ایک وبالِ جان تھی۔ شہر کی ہنگامہ آرائیوں سے طبیعت متنفر ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے ایک طویل سفر کا ارادہ کیا اور تنِ تنہا روانہ ہو گیا۔

مدت گزر گئی۔ بہار خزاں اور خزاں بہار بنتی رہیں حتیٰ کہ پھر بہار کا آغاز ہوا۔ میں نیل کی ایک حسین وادی میں سفر کر رہا تھا۔ نیل کے کنارے خانہ بدوشوں کے خوشنما خیمے ایک بیحد دلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں ان خیموں کے آگے سے گزرتا ہوا نیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یا ابنِ عم! کیا آپ یہ گھڑا اُٹھوا سکتے ہیں؟" ایک خاتون نے غالباً مجھ سے درخواست کی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

آہ! کیا میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔ میں حیرت سے خاتون کو تک رہا تھا۔ نیل کے کنارے نیل کے حسین ساحل پر میری جان سے زیادہ عزیز پیاری سلمیٰ ایک معصوم بچہ کو آغوش میں لئے پانی سے لبریز گھڑے کو سر پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے سلمیٰ کو اور سلمیٰ نے مجھے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹ کر گر گیا۔

"آہ! زبیدی! یہ تم ہو" اُس کے کانپتے ہوئے لبوں سے ایک کانپتی ہوئی آواز نکلی اس نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لی۔

"سلمیٰ!" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن میں اُسکی اُن نگاہوں کی تاب نہ لا سکا جن سے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ "آہ! پیاری سلمیٰ کیا میں سو تو نہیں رہا۔ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں۔ کیا تم واقعی سلمیٰ ہو۔ وہی سلمیٰ جسے دیکھنے کے لئے میری آنکھیں ترس گئیں۔ جس کی یاد میرے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ ہو سکی۔ بھیانک جنگلوں اور پُرخطر صحراؤں میں کہیں نہیں۔ کیا تم دراصل وہی سلمیٰ ہو۔ میری عزیز از جان سلمیٰ؟"

سلمیٰ آہستہ سے بڑھی۔

"زبیدی!" اُس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ "تم درحقیقت بیدار ہو۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ تمہاری آنکھیں تمہیں دھوکا نہیں دے رہیں۔ میں واقعی سلمیٰ ہوں! پر آہ! وہ سلمیٰ نہیں جسے تمہاری آنکھیں

ڈھونڈ رہی ہیں وہ سلمیٰ! جس کی تصویر تمہارے لوحِ دل پر کندہ ہے اب میں کسی اور کی ملکیت ہوں۔ ابن طلعی میرا شوہر ہے۔ میں اس کے بچوں کی ماں ہوں۔ وہی میرے جسم اور جان کا مالک ہے۔ کسی دوسرے کا خیال بھی اب میرے لئے گناہِ عظیم ہے"۔

سلمیٰ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میری آنکھیں نمناک تھیں۔ میری زبان بند تھی۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا اور باوجود کوشش کے بھی میرے لئے بولنا ناممکن تھا۔ میں نے سلمیٰ کی نگاہوں کی طرف دیکھا سات سال کی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی بے سود نہ تھی۔ میں نے سب کچھ پالیا۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ میں نے سب کچھ سن لیا۔ سلمیٰ کی آنکھیں آئینہ کی مانند کچھ دکھا رہی تھیں۔ وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں بے خود ہو گیا۔ میرے دل و دماغ پر ایک نامعلوم جذبہ کی حکمرانی تھی۔ میں بڑھا۔ سلمیٰ مسکرائی۔

"یا ابن عم!" اس نے دل کے پار ہو جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یا بنتِ عم!" میرا معمولی جواب تھا۔ لیکن دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکلا ہوا۔ میرے گھٹنے خود بخود اظہارِ عبودیت کے طور پر زمیں بوس ہو گئے۔ سلمیٰ کا مرتعش ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے کانپتے ہوئے ہونٹ جھکے اور سلمیٰ کے ہاتھوں پر اولین اور آخری بار ایک برادرانہ مہرِ محبت ثبت کر دی۔

میری آنکھیں بند تھیں اور شاید سلمیٰ کی بھی۔

کھجوروں کے جھنڈ سے ایک گولی چلی اور سلمیٰ کی چھاتی کو چیر کر نکل گئی۔

"آہ! فریب! دھوکا! افسوسناک دھوکا۔ ناقابلِ ازالہ غلطی!" ابن طلعی بندوق لئے اپنی وحشی آتشبار آنکھوں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ وہ کھجوروں کے جھنڈ سے میری طرف بڑھا۔ لیکن اس کا وجود میرے لئے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھا۔ میں سلمیٰ کے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے جسم پر جھکا ہوا تھا۔

"آہ! پیاری سلمیٰ! میری پیاری بہن سلمیٰ! تو اپنے بھائی کو بھائی کہتے ہی رخصت ہو گئی۔ اور ایک دفعہ بھی اور بھائی کے شیریں نام سے نہ پکار سکی۔ سلمیٰ! میری پیاری سلمیٰ بول۔ دیکھ تو تیرا بھائی کس قدر غمگین ہے۔ آہ! وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ تیری جدائی کا نیز ہمیشہ کی جدائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہو سکے گا۔ میری عزیز بہن! آہ ایک اور صرف ایک دفعہ تو اور مجھے بھائی کہہ کر پکار۔ ایک دفعہ! بس ایک دفعہ ہنس کر، مسکرا کر، شرمگیں آنکھیں جھکا کر مجھے بھائی کہہ دے"۔

میری آنکھوں سے ایک نہ تھمنے والی جوئے اشک رواں تھی۔ سلمیٰ کا شوہر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میرے الفاظ اس کے ہوش و حواس پر برق بن کر گرے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"آہ! غلط فہمی! فریب! دھوکا!" اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ گرم گرم اشکوں کی بارش اس کے دامن کو تر کر رہی تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔

سورج کی آخری شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔ کائنات پر ایک اداسی! ایک غمناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس ماحول میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ جانثار سلمیٰ کے بیجان لبوں پر ایک شیریں تبسم تھا۔ مستقل اور غیر فانی تبسم! اس کا بیجان لاشہ سورج کی الوداعی اشعہ سے چمک رہا تھا۔ میں جھکا۔ کشتۂ فریب سلمیٰ کے مرمریں ہاتھوں کو الوداعی بوسہ دیا۔ اور روانہ ہو گیا۔ ایک نامعلوم سمت کو! میں نہیں جانتا تھا۔ کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ ہوش و حواس سے بیگانہ۔ فکر خور و نوش سے لاپروا۔

آخر ایک دن ناطاقتی نے مجبور کر کے ریگزار پر گرا دیا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ دنیا و مافیہا سے غافل! آنکھ کھلی تو آپ کو قاہرہ ہسپتال میں پایا۔ وہاں دیکھا کہ اب طبیعت سنبھلنی مشکل ہے اسلئے عمال شفاخانہ سے بضد ہو کر یہاں آگیا ——————"

اس کی زبان خود بخود رک گئی۔

جاں بلب زبیدی کے ہاتھ پاؤں سرد ہو چکے تھے۔ اس کی زبان بولتے بولتے تھک چکی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بھی اشکبار تھیں یکایک اس نے آخری بار آنکھیں کھولیں!

خیری! اس نے انتہائی نحیف آواز میں کہا: میرے دوست اب میں مر رہا ہوں! کیا تم میری آخری آرزو پوری کرو گے!" اُس نے حسرت سے اُسے دیکھا۔" میری آرزو! میری آخری خواہش سلمیٰ کے پہلو میں دفن ہونے کی ہے"!

اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ روح جسم کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ سرہانے کے دریچے سے غروب آفتاب کا منظر ایک غمگین تصویر تھا جو آنکھوں کی راہ اپنے فسردہ نقوش دل کی گہرائیوں میں اتار رہی تھی۔

خیری نے حسرت کی نگاہوں سے سورج کی آخری کرنوں کو دیکھا جو مرحوم زیدی کے بے نور چہرہ پر اپنی جگمگاہٹ قربان کر رہی تھیں اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کبھی نہ رُکنے والی آنسوؤں کی لڑیاں برابر اُس کا دامن تر کر رہی تھیں۔

بہت سی بہاریں آئیں اور خزاں میں بدل گئیں۔ مدت گزر گئی لیکن دریائے نیل کی حسین وادی سے گزرنے والوں کو اب بھی دو سفید مزار پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ نیل کی عقیدت مند لہریں بڑھ بڑھ کر آتی ہیں۔ اور اُن مقدس قبروں کو بوسہ دے کر لوٹ جاتی ہیں کھجور کے درختوں نے اپنے سائے اُن کے لئے وقف کر دیئے ہیں حسین پرندوں کے صبح کے نغمے اور شام کے چہچے صرف ان قبروں کے بسنے والوں کے لئے ہیں۔ اُن کی خوش الحانیاں صرف "انھیں" کے لئے ہیں۔

قبروں کے درمیان ایک لوحِ مرمریں نصب ہے۔ جو ہر گزرنے والے کو پکار پکار کر اپنی تحریر سناتی ہے۔

" اس جگہ۔ نیل کے اس مقدس ساحل پر ایک بھائی اور ایک بہن کی قبریں ہیں۔ بہن نے بھائی اور بھائی نے بہن کے لئے جان قربان کی، اور اس جگہ دفن ہوئے۔

وادیٔ نیل سے گزرنے والو آگے بڑھو! اور اِن محبت کے متوالوں! شمعِ اُلفت کے پروانوں کی مقدس قبروں پر عقیدت کے پھول چڑھاؤ"!! ❊

(طبعزاد)

حُسن و عشق باہم ہے جانے کس زمانے سے
ہم رہے مقدر کے شکوہ سنج کیوں آخر
میں کسی کو کس منہ سے اب دکھاؤں گا سینہ
عشق وہ جنوں پائے حُسن مُسکرا اُٹھے
شیخ کو لگا لاؤں میکدے میں اے ساقی
آبروئے سجدہ ہو یا خجالتِ پیہم

تم کو یاد آئے گا مجھ کو بھول جانے سے
حرص نے بدل ڈالا اُسکو ایک دانے سے
دُور جا پڑا ہے تیر آپ کا نشانے سے
آرزو کو حیرت ہو اُس کے مُسکرانے سے
ہاں کسی طریقے سے ہاں کسی بہانے سے
کچھ تو لے کے اُٹھینگے تیرے آستانے سے

کیوں کمالِ انور سے انحراف کرتے ہو!
چاند چھپ نہیں سکتا خاک بھی اُڑانے سے

(از جناب لطیف انور گورداسپوری)

سکوتِ شب میں

(از محترمہ مضطر رضویہ)

(۱)

وداعِ مہرِ تاباں سے جہاں کی
فضا تاریک ہوتی جا رہی تھی
عروسِ شب کئے نیچی نگاہیں
بخاموشی افق سے آرہی تھی
مصفا روشنی ہر ایک شے کو
زمیں سے عرش تک چمکا رہی تھی
خموشی کا یہ عالم تھا، ہوا بھی
دبے پاؤں ٹہلتی جا رہی تھی
فرشتوں کے تفکر کا سماں تھا
صبا روحانیت برسا رہی تھی
معاً اس محویت پرور سکوں میں
نظر اک سائے سے گھبرا رہی تھی
تعمق سے حجابِ راز اٹھا
تخیل کا پر پرواز اٹھا

(۲)

نواحِ شہر سے اک غم کی ماری
پریشاں سر جھکائے آرہی ہے
چمک جاتی ہیں پلکیں چاندنی میں
کہ چپکے چپکے روتی جا رہی ہے
نگاہیں منتشر، زلفیں پریشاں
وفورِ رنج سے گھبرا رہی ہے
ذرا ڈرتی، جھجکتی، لڑکھڑاتی
سوئے "شہرِ خموشاں" جا رہی ہے
وہ ٹھٹکی، آکے اک "قبرِ جواں" پر
گھٹا حسرت کی جس پر چھا رہی ہے
رکھا غمگیں نے سر بالینِ تربت
وفورِ غم سے روئے جا رہی ہے
کبھی کی تھیں جو باتیں زندگی میں
انہی کو زیرِ لب دوہرا رہی ہے
معاذ اللہ! محویت کا عالم
لبوں پر مسکراہٹ آرہی ہے
تصور میں اسے قبرِ حزیں سے
"محبت کی صدا" سی آرہی ہے
نکل آیا لحد سے جیسے کوئی
نظر کچھ اس طرح بہکا رہی ہے
تصور میں حسیں ماضی کی دنیا
مہکتی، مسکراتی، آرہی ہے
یکایک سنسنی سی دل پہ چھائی
بدن میں جیسے جاں گھبرا رہی ہے
نظر جھپکی تو وہ بس ہو چکی تھی
شبستانِ اجل میں سو چکی تھی

دوشیزہ کا انتقام

ایک پر اسرار تحیر زا، جاسوسی شاہکار!

(گزشتہ سے پیوستہ)

(از جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی)

(۵)

جمعرات کے دن کبوتر شاہ صبح سے ہی فردوس جانے کی تیاری میں معروف ہو گیا۔ چنانچہ وہ بعد غسل نئی کفنی میں ملبوس ہو کر تیار ہوا ہی تھا۔ کہ حضرت فردوسی شاہ کا فرستادہ پیغام طلبی لے کر حاضر ہو گیا۔ کبوتر شاہ حاضر بارگاہ حضرت فردوسی شاہ ہوا اور بصد ادب بہ اظہار احترام فرش بوس ہو کر قدموں کے پاس مؤدب بیٹھ گیا۔ جس کے بعد حضرت فردوسی شاہ کے حکم سے اس کو فردوسی عطر سے معطر کیا گیا۔ جس سے اس کا دماغ ماؤف سا ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ فردوسی دلکش ترانوں کی گونج میں وہ بیدار ہوا۔ اس نے دیکھا کہ فردوس دلہن کی طرح سجائی گئی ہے۔ ایرانی نفیس قالینوں کا فرش تھا۔ جس کے صدر مقام پر حضرت فردوسی شاہ ایک بیش قیمت ریشمی صوفہ پر فروکش تھے۔ دائیں بائیں حضرت ممدوح کے دونوں خلیفہ دراز گیسو حضرت بھورے شاہ اور رنگیلے حضرت ریشائیل شاہ پُر تکلف مسندوں پر تشریف فرما تھے بقیہ معتمد خادمان بصد آداب صف بستہ حاضر خدمت گرامی تھے۔ حوروں کی ٹولیاں معروف رقص و سرود تھیں کہ حضرت فردوسی شاہ نے کبوتر شاہ کو دیکھ کر کہا "بیٹا ہم سب تمہاری فردوس میں بطور مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اٹھو اور اپنے مہمانوں کو جام طہورا سے سرشار کرو۔ جس کی تعمیل کبوتر شاہ نے نہایت سلیقہ مندی سے کی۔ وہ ہر شخص کو جام پر جام دیتا تھا اور صراحی خالی ہونے پر دوسری صراحی بھر لاتا تھا۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ حضرت قبلہ بھی اس عرق سے محظوظ ہوں۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اور اسی دور میں حضرت فردوسی شاہ کے حکم سے مہ جبین حور نے فردوسی رقص کچھ اس دلکشی سے کیا کہ ہر ایک کے منہ سے سبحان اللہ کے بیساختہ کلمات نکل گئے۔ اور خدام مست ہو ہو کر بے ہوش ہو کر گرنے لگے۔ جس سے محفل میں ایک ابتری سی پیدا ہو گئی۔ حضرت فردوسی شاہ کبوتر شاہ کی طرف سے مشکوک ہو کر فرمانے لگے۔ "بیٹا تمہاری شراب میں بہت نشہ ہے"

کبوتر شاہ۔ یہ تو حضور کا تصرف ہے ورنہ اس ناچیز غلام میں کہاں یہ قدرت کہ وہ کسی کام میں کامیاب ہو۔

فردوسی شاہ۔ اچھا بیٹا اب دیر ہوتی ہے تم اپنا وعدہ وفا کرو۔ اور کیمیا کے نسخے کے انکشاف کے ساتھ پارس پتھر بھی مجھے دو۔

کبوتر شاہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا "فردوس میں مہمان بزرگو! واقعی میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ واقعات جلد سے جلد بے نقاب کر کے اس خوفناک کھیل کا خاتمہ کیا جائے۔ اور بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ آنجناب کی خود بھی یہ خواہش ہے۔

چونکہ اس مقدس مقام پر مجھے بعض اہل دنیا فردوس کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں میرے داخلے کا سبب میری کیمیا گری کا ہنر ہے۔ لہذا اخلاقاً میرا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے اس نسخہ کو مکمل طور پر بیان

کر دو تاکہ ہر شخص مجاز ہو کہ جب اور جہاں جس قدر چاہے سونا تیار کر سکے۔

حضرات! میرے پیر و مرشد نہ صرف فقیر بلکہ ایک زبردست سائنسدان بھی تھے۔ اور یہ انہیں کے فیضِ صحبت کا کرم ہے کہ اس وقت میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ اس شیشی میں سیماب ہے اور یہ سونے کی ڈلی ہے۔ جسے پگھلا کر بجنسہٖ گھریا میں ٹھنڈی کر لی ہے۔ اب سونا بنانے کی ترکیب پر بغور توجہ فرمائیے۔ اُپلوں کا ڈھیرا لگا کر اس کے اندر گھریا رکھکر اس میں سونے کے ہموزن پارہ ڈال دیجئے اور پھر لوگوں کو دکھلانے کے لئے کسی غیر معروف گھاس کا عرق نچوڑ دیجئے پھر اس گھریا کے مُنہ پر وہ اُپلا جس میں پیشتر سے سوراخ کر کے سونے کی ڈلی پوشیدہ کر رکھی تھی بقیہ اُپلے چن کر آگ لگا دیجئے۔ آگ کی حرارت سے پارہ اُڑ جائے گا اور گھریا خالی رہ جائیگی جس کے منہ پر ڈھکی ہوئی اُپلے کی راکھ میں سے سونے کی ڈلی بوجہ اپنے وزن کے گھریا میں ٹپک پڑے گی اور آگ کے سرد ہونے کی حالت میں برآمد ہوگی۔ اس سے ناظرین کو یقین ہو جائے گا کہ سونا پارے سے تیار ہوا ہے۔

یہی ہے وہ طریقہ جس سے لالچی آدمی سر میں دماغ رکھنے کے باوجود احمق بن جاتا ہے۔ اور اسی ترکیب سے پچھلی مرتبہ میں نے آنجناب کے پیر و مرشد حضرت رضوی شاہ اور حضرت والا کو دکھایا تھا جس کی بنا پر زندگی ہی میں نظارۂ فردوس ہذا سے مفتخر کیا گیا ہوں۔

قبل اس کے کہ جناب کی طرف سے پارس حاضر کئے جانے کا مطالبہ ہو میں عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ پارس سے مراد کسی قسم کا پتھر نہیں بلکہ مہر نگر کا وہ لعل ہے جو شاہی محلوں سے منتقل کر کے اس مصنوعی فردوس کی زینت بنایا گیا اور جس کا زمانے کی رفتار نے جہاں آرا کی بجائے مہ جبین حور نام رکھ دیا ہے۔ یہ اسی کے حُسن کا اعجاز ہے کہ ایک معمولی فردوس میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی کی کشش کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں آگیا ہوں۔

حضرت فردوسی شاہ نے اپنی قہر آلود آنکھوں سے کبوتر شاہ کو گھور کر دیکھا اور خونخوار شیر کی طرح گرجدار آواز میں ڈانٹ کر کہا کم بخت جاسوس گو ابتک تو نے اپنا پارٹ نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ لیکن یہاں سے اب تیرا زندہ نکلنا محال ہے۔

کبوتر شاہ۔ (ایک قہقہہ لگاتے ہوئے) میرے محترم بزرگ شاید آپ یہ اس خیال سے فرماتے ہیں کہ فردوس ہذا کے مخفی راستوں سے مجھے آگاہی نہیں۔ لیکن یہ آپ کی بھول ہے۔ میں نہیں پسند کرتا کہ زیادہ عرصہ تک ایک بزرگ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل کہ میں پہلی مرتبہ دار المراقبہ میں روانگی فردوس کے لئے طلب کیا جاؤں۔ میں نے یہاں کا پتہ لگا لیا تھا۔ دار المراقبہ کے عود سوز دان اور انگیٹھیوں میں ایسا مرکب جلایا جاتا ہے جس میں کلوروفارم وغیرہ اجزا شامل ہیں۔ جنکی خوشبو سے سوائے اُن لوگوں کے جنکے نتھنوں میں کافی تیز مسکہ لگایا گیا ہو دوسرا فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی بطور مدافعہ کافی عطر لگا رکھا تھا جنکی تاثیر سے اس خوشبو کا جس سے کہ دار المراقبہ معطر کیا گیا تھا۔ مجھ پر مطلق اثر نہ ہوا۔ چونکہ مجھے فردوس کے مخفی راستے معلوم کرنے تھے۔ اس لئے محض از راہِ مکر بے ہوش بن گیا اور تمام راستوں کو ذہن نشین کرتا گیا جس کی مفصل اطلاع ایک پرچہ پر لکھ کر کبوتر کے گلے میں باندھکر اُسے چھوڑ دیا جو کبھی کا مہر نگر پہنچ گیا ہوگا۔

فردوسی شاہ۔ لیکن تو میرے ہاتھ سے بچکر نہیں جا سکتا۔

کبوتر شاہ۔ (مسکرا کر) میرے بزرگ شاید میری لمبی و سفید ڈاڑھی اور مونچھ سے اپنی طرح عمر رسیدہ ضعیف انسان کا اندازہ لگایا ہوگا۔ ادھر دیکھئے یہ کہکر اس نے ایک معمولی جھٹکے سے مصنوعی ڈاڑھی مونچھ علیحدہ کر کے زمین پر پھینک دی اس وقت فردوسی شاہ کو پتہ چلا کہ جسے وہ ابتک ضعیف و ناتواں سمجھے ہوئے تھا ایک نوخیز جوان ہے۔ کبوتر شاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میرے محترم بزرگ آپ کس برتے پر مجھ سے جنگ آزمائی کرنے کی جرأت کر رہے ہیں جب کہ آپ کے تمام رفیقوں کو شراب میں دارو بے ہوشی پلا کر ایسا مدہوش کر دیا ہے کہ اگر ان کے جسم کے کسی حصہ کا

آپریشن بھی کر دیا جائے تو ان کا بیدار ہونا ناممکن ہے پھر اس کے علاوہ چونکہ آپکو کسی ایسے اچانک خطرہ کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس لئے آپ بلا کسی تیاری کے فردوس میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے میں خطرہ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے پوری تیاری سے حاضر ہوا ہوں ملاحظہ فرمائیے یہ جرمنی ساخت کا بہترین پستول ہے جس کے اندر کافی ذخیرہ کارتوسوں کا موجود ہے۔

فردوسی شاہ۔ تو ہے کون اور تیرا کیا مطلب ہے!

کبوتر شاہ۔ میں ایک گمنام انسان ہوں۔ لیکن سر دست ریاست مہر نگر میں مجھے سعید سراغرساں کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے میرے آنے کا مقصد ۔ بت شہزادی جہاں آرا کی رہائی اور آپ کے مشن کو فنا کرنا ہے۔ چنانچہ اس وقت ۹ بجکر ۲۹ منٹ ہوئے ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے ریاست مہر نگر کی پولیس اور فوج یہاں آموجود ہوگی۔ صرف ایک منٹ باقی ہے۔ آپ کو زیادہ انتظار کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑے گی۔

حوریں جو اس وقت سناٹے کے عالم میں یہ تمام باتیں ہتھر کی مورتیں بنکر سن رہی تھیں اُن کے چہروں سے مسرت و شادمانی کے آثار نمایاں ہونے لگے کہ زور سے دھماکے کے ساتھ چاروں طرف سے پولیس اور فوج نے محاصرہ کر لیا۔ حوریں سہم کر بیٹھ گئیں اور جہاں آرا اپنی بچھڑی بہن جمال آرا سے چمٹ گئی۔

کارکنان فردوسی خانقاہ کا جو حشر ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے۔ تمام ملزموں پر گن گیس چلایا گیا۔ ان میں سے اکثر نے نہایت ہولناک اور سنسنی خیز بیانات دیتے ہوئے اقبال جرم کیا اور بالآخر اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔

یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد حسب قرار داد شاہزادی جمال آراء کے عقد کی تیاریاں نہایت تزک و احتشام سے شروع ہو گئیں۔ چونکہ سعید کی رائے تھی کہ مراسم شادی سرحدی علاقہ جام نگر میں انجام پذیر ہوں اس لئے یہ شاندار قافلہ بصد خدم و حشم روانہ ہو کر کوہ گل پوش کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ برسات کا خوشگوار موسم تھا اودی اودی گھٹائیں

نشۂ بادِ بہاری سے گرجتی گاتی ہوئی اٹھتیں اور رم جھم رم جھم برس کر نکل جاتیں۔ کوسوں تک سبزہ لہلہا رہا تھا۔ پہاڑی وادیاں ایک عجیب دلکشی میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا تمام کائنات شراب و شعر اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی ہے جن کے سوئے ہوئے جذبات اور خوابیدہ آنکھیں بیدار ہو کر ایک ہیجان برپا کر رہی تھیں۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا سعید مناظر قدرت کے نظارہ سے لطف اٹھانے کے لئے ندی کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک پتھر کی چٹان پر اسکی محبوبہ جمال آرا کسی خاص خیال میں بیخود بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ نہایت افسردہ ہے اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں سے آنسوؤں کے قطرے جھلک رہے ہیں۔ وہ اسے اس حالت میں دیکھکر بیقرار ہو گیا اور قریب جاکر نہایت پیار سے ایک گلاب کے پھول کو اُس کے رخسار سے مس کر دیا۔ جس سے وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح چونک پڑی اور سعید کو اپنے قریب دیکھکر مصنوعی تبسم سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور اندرونی جذبات پر قابو پانے کی امکانی کوشش کرنے لگی۔ لیکن سعید معاملہ کو تاڑ گیا تھا۔ جمال آراء کا ہاتھ پیار سے اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا "اس وقت کی آزردگی کا کیا سبب ہے۔ جمال آراء نے ہرچند اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن سعید کے اصرار پر حالِ دل بتانے پر مجبور ہو گئی۔ اُس نے کہا کہ میں سمجھ نہیں سکتی کہ عقد کی متبرک ساعتوں میں تعویق کیوں کی جا رہی ہے نیز اب تک آپ نے اپنے نام و پتہ سے مجھے کیوں لاعلم رکھا ہے۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کی خلش اکثر میرے دل میں کچھ کے دبتی رہتی ہے۔ کیا مہربانی فرما کر آپ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔

سعید۔ میری جان سے زیادہ عزیز شہزادی یہ ایک رازِ سربستہ ہے جس کے انکشاف کا اب وقت آگیا ہے۔ انشاء اللہ کل قبل اسکے کہ آفتاب طلوع ہو کر غروب ہو تمھیں ان دونوں باتوں کے راز سے بخوبی آگاہ کر دونگا۔ تم نے اس قدر صبر کیا ہے کل تک میری خاطر اور صبر کرو۔

اتنے میں ایک کنیز نے حاضر ہو کر دست بستہ عرض کیا کہ ایک صحرانشین سودائی درِ دولت پر حاضر ہے اور شرف باریابی کا خواستگار ہے

جو حکم ہو تعمیل کی جائے۔

جمال آراء۔ ہیں؛ یہ صحرانشین سودائی کون ہے۔ اور اس کے یہاں آنے کا کیا مطلب ہے؛

سعید۔ شہزادی عالم پناہ! میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ کون ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ (کنیز کو مخاطب کرتے ہوئے) وہ کس لباس و حالت میں ہے؛

کنیز۔ حضور والا وہ نہایت فلاکت زدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کپڑے تار تار ہیں۔ اس کے بال بڑھے ہوتے ہیں اور وہ بن مانس معلوم ہوتا ہے۔

سعید۔ اچھا جاؤ اسے حمام کرانے، لباس سے آراستہ کرنے کے بعد دیوان خاص میں میرے سامنے پیش کرو۔

اس کے بعد سعید نے شہزادی جمال آرا کو اس کے خیمہ میں پہنچا دیا اور خود اپنے خیمہ میں چلا گیا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر دیوان خاص میں فروکش ہو گیا اور صحرانشین سودائی کو طلب کیا۔ چونکہ شہزادی جمال آرا کو بھی اس عجیب و غریب شخص کے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے وہ بھی پس چلمن رونق افروز ہو گئی۔ صحرانشین سودائی مستوں کی طرح جھومتا جھامتا آیا اور سعید کے اشارہ پر ایک پرتکلف صوفہ پر نہایت بے باکی سے بیٹھ گیا۔

سعید۔ کیا مہربانی فرما کر آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؛ کہاں رہتے ہیں؛ کیا شغل ہے؛ اور مجھ سے کیا کام ہے؛

صحرانشین سودائی۔ میں دیار عشق کا سلطان ہوں۔ مجھے صحرانشین سودائی کہتے ہیں جنگل و بیابان میں سعیدہ کو تلاش کرنا میرا شغل ہے اور آنجناب کو ایک اہم خطرہ سے آگاہ کرنے کی کشش آپ کی خدمت میں باریابی کی محرک ہوئی۔

سعید۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں صحرانشین سودائی کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ البتہ خطاب یا عرف ہو سکتا ہے۔ لہذا کیا مہربانی فرما کر اصلی نام و پتہ اور سابقہ حالات سے آگاہی فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور ہاں سعیدہ کون خاتون ہیں اور آپ انہیں کیوں تلاش کرتے ہیں؛

صحرانشین سودائی۔ آہ! وہ راز جو اب تک میرے سینہ میں ایک شعلۂ آتشیں کی طرح فروزاں رہ کر ہر چیز کو اپنی تپش سے دعوت فنا دے رہا تھا۔ آج آپ کی فرمائش سے بے نقاب ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرا اصلی نام صحرانشین سودائی نہیں بلکہ بدنصیب جمیل ہے اور ریاست مردمک کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری زندگی کے اہم اور مختصر واقعات یہ ہیں کہ قضا و قدر کی کارفرمائیوں کی بدولت بن حسن کی شہزادی نیک دل سعیدہ پر عاشق ہو گیا۔ بعد میں ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔ لیکن اسے شومئی قسمت کہئے یا حماقت سے تعبیر کیجئے میں شہزادی جمال آرا کے حسن و جمال کا شہرہ سنکر اس پر نادیدہ عاشق ہو گیا چنانچہ عین اس وقت جبکہ میرے اور سعیدہ کے عقد کی تاریخ مقرر ہو رہی تھی۔ میں نے حور وش سعیدہ کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا جس سے اس کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور وہ جوش انتقام سے خود رفتہ ہو کر نکل پڑی۔ لیکن افسوس کہ کسی خونخوار درندہ کا شکار ہو گئی۔ اس کے بالیں سے ایک خط بھی برآمد ہوا جس میں اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے انتقام لے گی۔ لیکن کب اور کہاں یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ چنانچہ اس وقت سے میں اسکی تلاش و جستجو میں صحرا بصحرا پھرتا رہتا ہوں اور اس کا یقین ہے کہ وہ مجھے ضرور ملے گی اور انتقام لے گی۔

سعید۔ اچھا میں سمجھ گیا۔ آپ وہ جمیل ہیں جنہوں نے ایک ناتجربکار بھولی بھالی لڑکی کے ساتھ بیوفائی کی جن کے حالات سے اخباری دنیا میں تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ معاف فرمائیے میں آپ کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لئے حیرت ہے کہ ایک ایسا بزدل و دغاباز انسان جو ایک لڑکی کی ہلاکت اور خاندان کی تباہی کا باعث ہوا اور جو محبت کے میدان میں ایک عورت کے مقابلہ میں شکست یاب ہو کر بجائے عزت کے ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہو کسی کی

امداد نہیں کر سکتا ہے اور اس سے کوئی کیا بھلائی کی اُمید رکھے؟ -

جمیل - بے شک آپ ٹھیک فرماتے ہیں - میں محبت کے میدان میں حور وش سعیدہ کے مقابلہ میں لپسپا ہو گیا اور اس قابل نہیں رہا کہ دنیا یا اہلِ دنیا کو اپنا منہ دکھاؤں - لیکن اب سوائے اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ میں اس اُمید موہوم پر کہ سعیدہ ضرور ایک دن مجھے ملے گی زندہ رہوں - بہرحال یہ میرے ذاتی حالات ہیں - ان سے آپ کو واسطہ نہ ہونا چاہئے - میرا تمہارے پاس آنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ میں آپ کو ایک خطرہ سے آگاہ کر دوں - میں نے سُنا ہے کہ آپ نے ہرنگر کی شہزادی جہاں آرا کو اپنی خداداد ذہانت سے فتح کر لیا ہے اور اس مقام پر مراسم شادی ادا ہونے والے ہیں - اس لئے میں خبردار کرنے آیا ہوں کہ تو جس کو حسین و جمیل جہاں آرا تصور کئے ہوئے ہے وہ ایک زہریلی ناگن ہے جس کے زہر کا کوئی اُتار نہیں - اُس نے میری سعیدہ کو ڈس لیا - اس سے میں نے صرف غائبانہ محبت کی تھی - اس کا صلہ مجھے وہ کچھ ملا جسے تو جانتا ہے - لیکن اس شخص کا کیا حشر ہوگا جو اس کے ساتھ عقد کر رہا ہو -

سعید - (گرج کر) او بیہودہ بد تمیز بزدل زبان کو لگام دے - ورنہ مجھے مجبوراً تیری زبان کاٹ لینے کا حکم دینا پڑے گا - تیری یہ مجال کہ تو میرے سامنے شاہزادی جہاں آرا کی شان میں گستاخانہ کلام کرے - کجا بدنصیب سعیدہ جس کی عصمت کی بابت اخباروں میں لے دے ہو رہی ہے -

جمیل (غصہ سے خود رفتہ ہو کر) خبردار بدزبان اگر تو نے مرحومہ کے متعلق ایک لفظ بھی کہا تو سمجھ لے کہ دُنیا تیرے وجود سے خالی ہے - میں اس مقدس ہستی کی بابت ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتا -

سعید - او کمینہ فطرت انسان آپے سے باہر نہ ہو آج میرے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس مقدس ہستی کی بابت ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتا - لیکن کیا اس قدر جلد اُس دلدوز واقعہ کو بھول گیا جب وہ نہایت عاجزی سے گڑگڑا کر تیرے قدموں پر گری تھی - لیکن او ناہنجار تُو نے اُسے ٹھکرا دیا تھا - وہ جس قدر بھی عاجزی کرتی تھی تو اسی قدر بے رحمی کا اظہار کرتا جاتا تھا - اُس نے تجھ سے منت سماجت، عاجزی، خوشامد، غرض ہر ممکن طریقہ سے التجا کی - لیکن او ظالم جمیل تو نے کچھ پرواہ نہ کی - اُس نے تجھ سے خدا کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ تیری اس تضحیک سے اُس کا خاندانی وقار خاک میں مل جائیگا تو دُنیا کے دکھاوے کے لئے شادی کر لے - اس کے بعد تجھے اختیار ہے جو چاہے کرے - نہ میں ہوں گی نہ میرا وجود، دنیا مجھے جلد بھول جائیگی - لیکن یاد کر او سنگدل تو ایک خوفناک قہقہہ لگا کر چلتا بنا تھا -

جمیل - او، ساحر مرا یہ راز تجھے کیسے معلوم ہوا - جلد بتا ورنہ تیرا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا -

سعید - میں اُس وقت تیرے قریب برابر کے خیمہ والے درخت کی آڑ میں لیٹا ہوا تھا اور تمہاری تمام گفتگو سُن رہا تھا -

جمیل نہیں - نہیں (اس نے جوش سے کھڑے ہو کر کہا) اب تجھے دُنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں - تو نے اس معصومہ کی توہین کی اور تو ایسے راز سے واقف ہے - جس سے اُس کی توہین کا پہلو نکلتا ہے - لہٰذا میں تجھے چیلنج کرتا ہوں کہ تو ڈوئل کے لئے آمادہ ہو جا - اگر تو مرد میدان ہے اور عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر دوپٹہ کے سایہ میں نہیں بیٹھنا چاہتا تو میرے سامنے آ - !

سعید - میں تیرا چیلنج منظور کرتا ہوں - کل صبح طلوع آفتاب سے قبل ہم میں سے ایک کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا ہوگا - اور اہلِ دنیا کو حق و باطل میں امتیاز کرنے کا ایک اچھا موقعہ مل جائے گا - رات زیادہ ہو چکی ہے - اب جاؤ آرام کرو - برابر والے خیمہ میں تمہارے سونے کا مناسب انتظام کر دیا گیا ہے -

جمیل کے چلے جانے پر پریشان حال جمال آرا دیوانہ وار جھپٹ کر پردے سے باہر آگئی اور فرطِ الم سے مضمحل ہوکر سعید کی گود میں گر گئی اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگی "میرے آقا تم نے یہ کیا کیا۔ اس مصیبت کا ٹل جانا ممکن نہیں۔ جلد کہو ورنہ میرا دم گھٹ کر میری روح فنا ہو جائے گی۔ بولتے کیوں نہیں" اور پھر جواب نہ پاکر اس کے سینے سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سعید اپنے خیالات سے چونکا۔ اُس نے جمال آرا کی تشفی کی اور اطمینان دلایا کہ کل صبح وہ خود دیکھ لے گی کہ اس کا عاشق کس طرح فتحیاب ہوتا ہے۔ لیکن ....

جمال آرا۔ میرے پیارے کہو کہو جلد کہو ۔۔ لیکن ..... لیکن کیا ..... خدا کے لئے جلد کہو؟

سعید۔ کل میری فتحیابی کا دن ہے۔ کل میں انشاء اللہ تعالےٰ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گا۔ کل ہی تمام رازہائے سربستہ تمہارے سامنے منکشف ہوں گے۔ ایک عجیب وغریب منظر بھی تم دیکھو گے اور کل ہی تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی مگر

جمال آرا۔ مگر کیا! مگر کیا۔ میرے سرتاج وہ بھی جلد کہدو۔

سعید۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے ایک عہد لوں۔

جمال آرا۔ کیا آقا اپنی لونڈی کو آزمانا چاہتا ہے۔ خدا کی قسم یہ خنجر حاضر ہے سر کاٹ لو۔ اگر میرے مُنہ سے اُف بھی نکل جائے تو سمجھ لینا کہ جمال آرا مہر نگر کے شاہی خاندان سے نہیں بلکہ کسی ارذل طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ میں عہد کرتی ہوں کہ تمہارے لئے زندہ رہوں گی اور تمہارے لئے مروں گی۔

سعید۔ اچھا تو یہ عہد کرو کہ تم میرے دشمن کو ہمیشہ دشمن ہی سمجھتی رہو گی۔

جمال آرا۔ مجھ کو قسم ہے اس جاہ وجلال والے خدا کی جس نے محبت کی تخلیق فرما کر ہماری ہستیوں کو ایک کر دیا ہے۔ میں اس عہد پر ہمیشہ قائم رہوں گی لیکن میرے آقا برائے خدا مجھے بتا دو کہ آج کی گفتگو کا بعض حصہ اُلجھا ہوا کیوں ہے۔ جسے میں باوجود کوشش کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آہ اس تصور سے میرا دل لرز رہا ہے کہ کیا ہوگا۔ اگر کوئی بتا سکتا تو میں تمہاری محبت کے سوا اپنا سب کچھ دے کر معلوم کر لیتی۔

سعید۔ پیاری جمال آرا صبر کرو۔ کل صبح تم سب کچھ معلوم کر لوگی۔ شاید تم موت کے تصور سے لرز رہی ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زندگی ایک سراب کا نام ہے اور دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر ایک انسان ایکٹر کی طرح ایکٹنگ کر کے اپنے اصلی وطن کو واپس چلا جاتا ہے۔ کس کو انکار ہے کہ موت کے بعد ہی بقائے دوام کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ آہ! پیاری کسے معلوم ہے کہ کل آفتاب کس کے لئے آخری بار طلوع ہوگا بہرحال مستقبل کے اندیشہ سے طبیعت کو رنجیدہ کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ صبح اُٹھنا ہے چلو تمہیں تمہاری خوابگاہ تک پہنچا آؤں۔ تاکہ کچھ دیر آرام کر لو۔ صبح ہمیں اپنے ڈرامہ کا آخری باب مکمل کرنا ہے۔

نسیم سحری کے خوشگوار جھونکوں میں تین خوبصورت عربی النسل گھوڑے حاضر کئے گئے جن میں سے ایک پر جمیل دوسرے پر سعید اور تیسرے پر شہزادی جمال آرا سوار ہو کر میدان ایاسین کے سبزہ زار میں آئے۔ ملازم نے دو جرمنی ساخت کے عمدہ پستول مع کارتوس ل کے پیش کئے۔ جن میں سے ایک جمیل نے اور دوسرا سعید نے انتخاب کر کے دو دو آسمانی فیر کر کے پستولوں کی روانی کا جائزہ لیا اور پھر ایک دوسرے سے ۲۲ قدم پر مقابلہ میں شست لے کر جمال آرا کے رومال کے اشارہ کے منتظر ہو گئے۔ جمال آرا یہ روح فرسا منظر دیکھ کر کانپ رہی تھی۔ بیم ورجا کے خیالات نے اس کے سینے میں ایک محشر خیز تلاطم برپا کر رکھا تھا۔ اس کے جسم کا تمام خون خشک ہو چکا تھا۔ اور دماغ ماؤف ہوا جاتا تھا کہ اس کے سفید رومال کے آخری اشارہ کے ساتھ ایک دھڑاکے کی آواز آئی، جمیل کے پستول سے دھواں نکل کر اس کے گرد بادل کی طرح چھا گیا اور سعید زمین پر خاک وخون میں تڑپتا ہوا نظر آیا۔ سعید کے گرنے سے اس کا کلاہ سر سے علیحدہ ہو کر دور جا پڑا جس کی وجہ سے اس کے سر کے لمبے نسوانی بال زمین پر لہرانے لگے سعید کو تڑپتا دیکھ کر جمال آرا دیوانہ وار اس کے قریب آئی اور اپنی ساری سے اس کے خوبصورت چہرہ کی مٹی صاف کرنے لگی۔ جُوں ہی اُس نے

رومال سے اس کے ہونٹوں کو صاف کرنا چاہا۔ سعید کی مصنوعی خوبصورت مونچھ الگ ہو کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن وہ اس وقت ایسی حواس باختہ ہو رہی تھی۔ کہ ان میں سے کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چونکہ گولی سعید کے بائیں جانب سینہ سے اوپر پھیپھڑے کو توڑ کر پار نکل گئی تھی۔ جہاں سوراخ ہو کر اور خون نکل کر منجمد ہو گیا تھا۔ اس لیے جمال آرا نے بعجلت قمیص کے بٹن کھول کر سینہ برہنہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جس کو وہ اس وقت تک ایک بہادر نوجوان تصور کئے ہوئے تھی۔ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ جس نے ایک پٹی کے ذریعہ سے اپنے نسوانی سینہ کے ابھار کو اب تک پوشیدہ رکھنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اسی عرصہ میں جمیل بھی وہاں آگیا۔ اور اس نے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا کہ یہ تو اس کی سعیدہ ہے جس کے انتظار میں وہ صحراؤں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ جمیل کے منہ سے ایک چیخ نکلی کہ آہ سعیدہ تو نے کیا کیا۔ کیا نسوانی دنیا میں یوں ہی محبت کا انتقام لیا جاتا ہے۔ اور بے اختیار اس سے چمٹ گیا۔ بول بول سعیدہ جلد بول ورنہ میں تجھ سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ جہاں تو جا رہی ہے میرے وہم و گمان میں بھی ایسا خوفناک انتقام نہیں تھا۔ آہ تو نے مجھ سے ملاقات کی بھی تو کب جبکہ —— اتنے میں بے ہوش سعیدہ ایک آہ دلدوز کے ساتھ تڑپی اور آنکھ کھول کر دیکھا کہ اس کا سر جمیل کے زانو پر ہے۔ اور جمال آرا غم کی تصویر بنی اپنے رومال سے ہوا کر رہی ہے اس نے جمال آرا کو پیار سے دیکھ کر کہا "پیاری جمال آرا اب تو تمام واقعات مفصل طور پر تمہاری سمجھ میں آ گئے ہوں گے۔ کہ میں نے بیوفا جمیل سے انتقام لینے کی کیا کیا تدبیریں کیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اپنے مقصد میں آج کامیاب بھی ہو گئی۔ میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ میں جس کے تیر نظر کی گھائل تھی۔ اسی کی گولی کا نشانہ بنی جس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ اسی کے زانو پر دم توڑ رہی ہوں پیاری جمال آرا جہان فانی میں کسی کو بقا نہیں۔ ایک دن تم کو اور جمیل کو بھی وہیں آنا ہے۔ جہاں میں جا رہی ہوں۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ لیکن خوش نصیب ہے وہ ہستی جو اپنی زندگی کے مقاصد میں کامیاب ہو جائے۔ سانس میرے سینہ میں اٹکتی ہے ...... خیر کچھ پروا نہیں میں اپنا کام پورا کر چکی ——"

جمال آرا۔ (فرط محبت سے اس کے منہ پر منہ رکھ کر) میری پیاری سعیدہ تم تنہا فردوس میں نہ جانے پاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی جہاں ہم اور تم ایک ساتھ رہینگے۔

سعیدہ۔ (درد سے بیقرار ہو کر) جمال آرا کیا اس قدر جلد کل شب کا وعدہ بھول گئیں۔ مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔

جمال آرا۔ (رو کر) پھر تم مجھے کس پر اس دنیا میں چھوڑے جاتی ہو۔

سعیدہ۔ خدا پر۔ گھبراؤ مت۔ اور یہ کہکر جمال آرا کا ہاتھ جمیل کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ کہ میں نے کل شب اس سے عقد کا وعدہ کیا تھا اور آپ اس وقت اس کی تکمیل کر رہی ہوں۔ دیکھ بے وفا جمیل عورت کی فطرت کا مطالعہ کر جس ہستی کے لئے تو نے مجھے حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ آج اسی کو قوت بازو سے خرید کر تجھے سونپتی ہوں۔ اب تک تو سعیدہ کے لئے زندہ رہا اب جمال آرا کے لئے زندہ رہ لیکن اس طرح جیسے مجرم قیدخانہ میں یا گنہگار جہنم میں رہتا ہے۔ کیوں پیاری جمال آرا رات کا وعدہ یاد رکھو گی نا...!

جمال آرا۔ سعیدہ میں تیرے لئے اور صرف تیرے لئے۔ اس دنیا کو اپنے اور اس شخص کے لئے جہنم بنا لوں گی!!! تو اطمینان رکھ۔

اس کے بعد اس کا منکا ڈھلکنے لگا اور اس نے دونوں کی طرف ایک آخری الوداعی نظر سے دیکھا۔ الوداع... الوداع پیاری جمال آرا کو دنیا کے نظارے اور رات دن کے ان انقلابات نے مجھے مبہوت و متحیر بنا دیا مگر محبت کی ظاہری ناکامی لیکن در اصل کامیابی کا یہ حیرت انگیز نقش اب تک حافظہ کی لوح پر ثبت ہے اور شاید دوسری دنیا میں جانے کے بعد بھی یوں ہی ثبت رہے گا۔ اس وقت بظاہر نامرادی کی موت مر رہی ہوں۔ لیکن کل قیامت میں فخر و غرور کے ساتھ اٹھوں گی اور دنیائے نسائیت میرے انتقام کو فخر سے بیان کریگی الوداع۔ رخصت برائے خدا میرا کہا سنا معاف کر دینا اس کے بعد ایک آخری ہچکی آئی اور سعیدہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

سیاحوں کا بیان ہے کہ گو اس واقعہ کو برسوں گزر چکے ہیں لیکن اس نواح میں اب بھی ایک عالیشان مقبرہ ہے۔ جس کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیک دل سعیدہ کی آرامگاہ ہے۔ اس کی بہادری ایک

عورت اور مرد کرتے ہیں جن کا نام جمال آرا اور جمیل ہے۔ جس وقت مرد حسن و عشق کی سرشاری سے خود رفتہ ہو کر محبت سے عورت کو دیکھتا ہے تو اس عورت کی آنکھوں میں فرطِ غضب سے خون اتر آتا ہے۔ اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُسے ڈانٹ کر کہتی ہے " زندہ رہ مگر اس طرح جس طرح گنہگار جہنم میں"۔ وہ خوف سے تھرتھرانے لگتا ہے۔ اور اُن کا یہ بھی بیان ہے۔ کہ وہ کبھی کا خودکشی کر چکا ہوتا لیکن اُسے یقین ہے۔ کہ اُس نے ایسا کیا تو اُسے سعیدہ قیامت تک پھر نہ ملے گی۔

نوائے مسافر!

(از عکاس فطرت نواب غازی صاحب بہادر آف گوردھا اسٹیٹ)

خاموشیوں کی گویا تفسیر لیے چلا ہوں
مَیں پتلیوں میں تیری تصویر لیے چلا ہوں

صحرا نورد غم سے دل کی خلش نہ پوچھو
اِک پھانس چبھ گئی ہے اک تیر لیے چلا ہوں

اِس بیکسی کے صدقے رختِ سفر تو دیکھو
میں ساتھ اپنے پھوٹی تقدیر لیے چلا ہوں

نشتر چبھو دیئے ہیں ظالم کی گفتگو نے
سینہ میں آج رکھکر شمشیر لیے چلا ہوں

جذبہ ہے ولولہ ہے حسرت ہے آرزو ہے
دو چار ساتھ اپنے رہگیر لیے چلا ہوں

ناکامیوں کی دنیا ہمراہ چل رہی ہے
میں آہِ بے اثر کی تاثیر لیے چلا ہوں

پیارا خیال غازی پھر ہمدم سفر ہے
آرامِ جاں کی اپنے تدبیر لیے چلا ہوں

قلوپطرہ اور جولیس سیزر کی داستانِ عشق

"سرِ زندگی" کا ترجمہ

(از جناب افتخار احمد خاں صاحب)

سرِ زندگی اگر ایک پہلو سے نصیحت آموز اور عبرت انگیز ہے تو اس کے دوسرے پہلو میں یونانی کیرکٹرس کو پیش کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ بقول حضرت نیاز فتحپوری "یونان کے مذہبی و حسن پرستی کا بیہودہ زمانہ اختلاط تھا جبکہ مذہب اُن کے ہاں نام تھا صرف اس زندگی کا جس کی ترکیب صرف عورت۔ شباب حسن اور عشق کے عناصر اربعہ سے ہوئی تھی اور جہاں عصمت آغشتہ بجنون اور محبت "آوارہ جنون" نظر آرہی تھی۔

ملک کا کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر کے سینکڑوں دن اس سعی میں بسر نہ کر دیئے ہوں کہ اس فضا کی کم از کم ایک ہی معطر رات اُسے میسر آجائے اور مشکل سے ہی کوئی آشفتہ شباب ایسا ملے گا۔ جس نے ایک مرتبہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دنیا میں پھر کسی اور لذت کی خواہش کی ہو۔"

ماتم گزار کون ہے اب دل کی لاش پر
کہتے نہ تھے کہ خونِ تمنا نہ کیجئے

شام کا وقت تھا۔ بہار کی خنک ہوا عطریات صحرا سے لبریز آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سورج کی آخری نرم شعاعوں نے بلند درختوں کا بوسہ لیا اور غائب ہوگئیں۔ چڑیاں اپنے نغمہ ہائے الوداع سے کوہستی کی غیر مرئی امواج پیدا کر رہی تھیں۔ ذرہ ذرہ محبت سے معمور اور مستور نظر آتا تھا۔ اور ہر شے اپنی جگہ عالم سکوت میں نئی شان میں جلوہ گر تھی۔ کہ قلوپطرہ کی قبر بلند پہاڑی پر ایک نہر کے کنارے پھولوں کے کنج میں عشق کی افتادگیوں اور حسن کی بے نیازیوں کی داستان سے معمور دنیا کی بے ثباتی کا اعلان کر رہی تھی۔

جس دن سے عالم ایجاد نے قلوپطرہ کی گرہ اُسی کے حسین عاشق کے بڑے بھائی سے باندھ دی۔ کون کہہ سکتا کہ یہی شادی دونوں میں اتنا انقلاب عظیم پیدا کرے گی۔ کہ ایک دل ہمیشہ کے لئے خاک سے پیوند ہوا اور دوسرا ماہیِ بے آب کی طرح رُوخا کے اس جنگل میں آٹھوں پہر بے کل اور بے چین رہے۔ قلوپطرہ کی اس خودکشی نے لوگوں کی زندگی میں بھی ایک خاص رنگ پیدا کر دیا تھا جس کی تشریح سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جولیس نے اپنی عبدیت کی آستان جبیں سائی صرف قلوپطرہ ہی کی بارگاہ کو قرار دے لیا تھا۔ ایک طرف دُنیا اس سانحہ عظیم سے کچھ اچھا عبرت رہی تھی تو دوسری طرف راتوں کے سکوت اور چاندنی درخشانی میں اہل رُوخا جولیس کا نغمہ جانگداز سن لیتے تھے اور یونان کے گھر گھر میں قلوپطرہ کے فرضی مجسمہ بنا کر اپنے سرِ عجز کو اُن کے سامنے جھکا دیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ خداوند حسن تھی جو دُنیا سے صرف چودہویں سال ہی میں نامراد اُٹھا لی گئی۔

قلوپطرہ اپنے حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ اُس کے کتابی چہرہ کی صفائی اعضاء کے تناسب کا دلفریب نظارہ ہلکے ہلکے خندہ ہائے یاسمین اُس کی نرم نرم گفتگو موجِ تسنیم کی موسیقی کی طرح فضا کو مسحور کر دیتی تھی۔ سبک رفتاری کا قد کی رعنائی کو خراماں میں بدل دینا کم کا ہر ہر قدم پر اظہار نزاکت کرنا۔ غرضکہ اُس کی ہر نگاہ اور ہر ادا دل کے عمیق ترین

گوشوں میں انقلاب پیدا کر دیتی تھی۔

قلوپطرہ کی قبر سے چند جریب پرے رُوخا کے دیہات میں اسی موضوع پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہو رہی تھی اور ہر طرف ایک عجیب قسم کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ اس ہجوم میں ایک ایسا وجود بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ ایک پتھر پر خاموش بیٹھا کسی گہری فکر میں مستغرق تھا۔ اس کے تمام حواس رفو ہو چکے تھے۔ اس نے تمام ہجوم ساری دنیا بلکہ خود کے وجود کو باطل کر دیا تھا۔ جولیس اسی عالمِ سکوت و محویت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے ایک ساتھی نے بڑھکر اُسے آواز دی۔ لیکن اُسے جواب نہ ملا تو قریب آکر اُس نے جولیس کے شانہ پر ہاتھ رکھکر کہا۔

"تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ محبت بھی ایک عجیب بلا ہوتی ہے"

جولیس چونکا اور اس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی گہری نیند سے بیدار کر دیا جائے اور فوراً کسی کو نہ پہچان سکے۔ اُس کے ساتھی نے کہا "تم نے سُنا میں نے کیا کہا" جولیس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور کہا۔ "نہیں"

"میں نے یہ کہا کہ محبت بھی عجیب بلا ہوتی ہے"

جولیس نے اپنے ساتھی کو قدرِ تنفر کی نگاہ سے دیکھا جس سے ملامت اور نکوہش ٹپک رہی تھی۔ اور پھر خاموشی کے ساتھ گردن جھکا کر اپنی چھڑی کی نوک سے زمین پر آڑے ترچھے خطوط بنا بنا کر مٹانے میں مصروف ہو گیا۔

پھر اُس کے ساتھی نے جو نفسیات سے قطعاً ناواقف تھا۔ یوں کہنا شروع کیا "تمہارے اِس سوگ کا سبب آجتک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خدا جانے تمہارا مقصدِ حیات کیا ہے۔ تمہاری یہ سوگواریاں رُوخا کے گوشہ گوشہ میں اس بات کا اعلان کر رہی ہیں۔ کہ تمہیں محبت کا آزار ہو گیا ہے۔ ہاں تمہیں قلوپطرہ کی مُردہ محبت کو چھپانا چاہئے"۔ اپنے ساتھی کے یہ الفاظ سُنکر جولیس اندر ہی اندر کانپ اُٹھا۔ اور نہایت خشمگیں انداز میں جواب دیا "یہ تم کیا بک رہے ہو اگنس۔ تمہیں بار بار قلوپطرہ کا نام لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ تمہاری نگاہ اس پیوندِ خاک کو نہیں سمجھ سکتی تمہاری دنیا لذتِ محبت سے قطعی ناآشنا ہے۔ تمہارے نزدیک محبت کا مقصد صرف اتصالِ جسم ہے۔ تم کیا سمجھ سکتے ہو کہ قلوپطرہ سے مجھے محبت ہے یا نہیں۔ اور ہے تو کس پیمانہ پر۔ میں اب بھی جب کہ اس کا گوشت و پوست ندرِ خاک ہو چکا ہے اُسے کس نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ تم اُسے صرف عورت سمجھتے ہو۔ میں اسے عورت سے بدرجہا بلند ہستی جان کر محبت سے زیادہ قیمتی چیز اُس کے لئے اپنے پاس رکھتا ہوں تم اُسے سمجھنے سے قاصر ہو۔ آئندہ کے لئے یہاں نہ آنا چہ جائیکہ اس معاملہ میں تمہاری ناپاک زبان حرکت میں بھی آئے ۔۔۔ پس یہ میرا آخری جذبہ احترام ہے کہ ۔۔

میری نگاہ تمہاری نگاہ سے بلند ہے

شام ہو چکی تھی۔ قلوپطرہ کا معبد زائرین سے خالی ہو چکا تھا۔ چاند کا طلوع ہونا جولیس کے لئے ایک خونیں منظر پیش کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سرد مہری کا اعلان ببانگ دہل کر رہی تھیں۔ الغرض اب وہ اس زمین و آسمان، صبح و شام، رات دن یہاں تک کہ اپنے وجود سے بھی بیزار قلوپطرہ کے مزار پر اپنی جبینِ شوق رکھے ہوئے احوالِ تمنا پر خاک کو پُرخون کر رہا تھا۔ اس کا دل نازک اور حساس تھا۔ اُس نے مسرت کے گہوارہ میں آنکھ کھولی لیکن یہی میٹھی لوریاں جو اس کے کان کی راہ سے دماغ میں داخل ہوئی تھیں۔ اب وہ آہِ شرربار بن کر نکل رہی تھیں۔ اس کی مسرت کبھی مکمل نہ ہوئی اور اُس کے معاشقہ کا انجام اُسی کی بھائی کی شادی پر ختم ہوا۔ اور اس کی تمام خوشیاں چھین لی گئیں۔ ختم نہ ہونے والے غم اسے ہر آن ملتے رہے۔ اب ان ناکامیوں اور زندگی کی گوناگوں تلخیوں نے اُس کی طبیعت میں اور بھی سوز و گداز پیدا کر دیا۔ اور اس عالم میں جو کچھ اس کی زبان سے نکل جاتا شعر بنکر رہ جاتا۔ لیکن یہ شعر نہ ہوتا۔ بلکہ ایک دلِ سوختہ کی شرربار آہ ہوتی۔ ایک نامراد کے اشکِ خونیں۔ اور غم نصیب کی بے اختیار چیخیں ہوتیں۔

اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور اپنے ارد گرد کی فضا پر اپنی مدہوش اور مخمور نگاہیں ڈالیں۔ عروسِ فطرت کی رعنائیوں، بہار کی دلفریب ہواؤں سبزۂ گل کی رنگینیوں اور قطعاتِ رُوخا کی شادابیوں، چاندنی اور تاروں بھری راتوں، مست گھٹاؤں اور ننھی ننھی بوندوں نے پھر مدت دراز کے بعد اُس کے جذبات کو ٹھیس لگائی۔ اور وہ جذبات کا مصوّر بن گیا۔ اُس نے اپنا سر دوبارہ اُٹھا لیا۔ اندوہناک محویت سے اپنی بھیانک زندگی کا دردناک

بھرا ماگ الاپنا شروع کیا۔ ایک بے خودی سی اُس کے حواس پر چھا گئی سرود کے میٹھے میٹھے سُروں نے اُس کی روح کو تڑپا دیا۔ ساز کے نغموں نے اُس کے دل میں بجلیاں بھر دیں۔

اُس نے سرود پر ایک الم انگیز راگ چھیڑا۔ فرشتوں نے اُس کی روح سلب کرنے کی اجازت چاہی۔ اُس نے جواب دیا:۔

"ٹھیرو! صرف اتنی مہلت ۔۔ کہ شباب کے جاں نواز لمحے ختم ہو لیں" پھر سر کو سرود کی تکوڑ پر رکھکر عروسِ فطرت کے ذرّہ ذرّہ کو اپنے سرود کے میٹھے سروں سے شراب پلانے میں مصروف ہو گیا۔ کائنات کا ذرہ ذرّہ مست ہو کر جھوم رہا تھا۔ اُس کے حواس پر ایک کیفیت طاری ہو گیا۔ اور رہروؤں کو ایسا محسوس ہونے لگا۔ کہ یہ نغمہ نہیں بلکہ کسی بیکس کا مارا دل تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا ہے خود سرود کا نغمہ سُن کر اُس کی روح رقص کرنے لگی۔ اور وہ اپنے تئیں گویا نہیں بلکہ ساحر سمجھنے لگا۔ اُس نے دل تھام لیا۔ اُسے بھولے ہوئے خواب یاد آ گئے حسین ماضی کی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔

خدا جانے جذبات کی کن گہرائیوں میں ڈوب کر وہ گا رہا تھا۔ اُس کی روح اہتزاز کر رہی تھی۔ اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد اُس کا جوشِ وحشت حد سے تجاوز کر گیا۔ اُس کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم پیدا ہو گیا۔ اور آنکھوں میں آنسو اُتر آئے۔

جولیس نے سرود کو زمین پر والہانہ انداز میں ٹپک کر چکنا چور کر دیا۔ لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کا ساز بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ پھر اپنے محبوب کی قبر سے لپٹ کر وہ دردِ فراق کا اظہار کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمنڈ آئے۔ رات اپنی منازل بڑی سرعت کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ بہار کا جذبات انگیز موسم اور اُس کی گوناگوں کیفیتیں اُس کے دل پر چرکے لگا رہی تھیں۔ اُس نے پلٹ کر اپنے سرود کو اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ چند ٹوٹے اور بکھرے ہوئے تار اُس کے ہاتھ لگے ۔۔۔۔۔ یا رالٰہا! یہ کیا ہوا۔ آخری مونس و ہمدم بھی جاتا رہا۔

اُس نے سرود کے پُرزے آسمان کی طرف پھینکے۔ لیکن وہ پھر اُس کے نڈھال جسم پر آ گرے۔ اُس نے انھیں غور سے دیکھا۔ اور اپنی

مجنونانہ حرکت پر کچھ خجل سا ہو گیا۔ پھر اُس نے سرِ عجز کو بارگاہِ ایزدی میں خم کیا اور التجا کی۔

"بارِ الٰہا! ہجومِ آلام نے میرے دل کا خون کر دیا ہے۔ ضبط و اندوہ سے میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ انتہائی مایوسی کے باوجود بھی مجھے اس خلش سے نجات نہیں ملتی۔ ۔۔ یہ ویران اور سنسان رات میرے دل کے لئے اور بھی جانگداز بن گئی ہے۔ کسی پہلو قرار نہیں۔

اے زمین و آسمان کے مالک! تو ہی انصاف کر کہ میری قلوپطرہ مجھ سے کیوں بات نہیں کرتی۔ وہ اس قبر کے گوشہ میں سو رہی ہے۔ میں نے اُسے اپنے آنسوؤں کے درد بھرے راگ سے جگانا چاہا۔ اب جگا بھی نہیں سکتا۔

بارِ الٰہا! میں اس آرزو میں تڑپ رہا ہوں کہ کوئی میری اس اُجڑی بستی کو پھر بسا دے۔ محبت کی بجھی ہوئی آگ کو پھر روشن کر دے۔ اے آسمان و زمین کے بادشاہ! اب میں اپنی درد بھری داستان تیری بارگاہ میں سنانے آیا ہوں۔ اب ضبط کی ہمت نہیں۔ میری التجا صرف شیون ہے ۔۔ میں رات بھر اپنے ساز کے تاروں کو بے قرار اور اپنی آنکھوں کو اشکبار رکھتا رہا۔ لیکن اب میں ان دونوں نعمتوں سے محروم ہو چکا ہوں ۔۔۔۔"

اِتنے میں آسمان پر سحابِ نور چھا گیا اور ایک آواز آتی ہوئی سنائی دی۔

"ٹھہر! شباب کے جاں نواز لمحے ختم ہو لیں"

جولیس کے دل سے بے اختیار ایک چیخ نکلی۔ اِس ندائے آسمانی سے وہ کانپ اُٹھا۔ اُس کے جسم کا ایک ایک ریشہ تھرانے لگا۔ وہ اِس انداز سے جھکا کھڑا تھا۔ جیسے رحمتِ حق اب مائل بہ کرم ہو گی۔ لیکن جونہی سحابِ نور آسمان کی سطح سے غائب ہوا۔ اُس نے اپنے جسم پر ایک ایسا بوجھ محسوس کیا کہ اُس کے لئے جنبش کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور لب خشک۔ اُس کی آسمان کی طرف لگی ہوئی آنکھوں سے ایک مبہم جستجو ٹپک رہی تھی اور پیشانی پر قطرے اِس بات کے شاہد تھے کہ اُس پر ایک خوفناک بلا نازل ہونے کو ہے۔ اُس نے پھر بارگاہِ ربّ العزت میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ۔۔۔

"اے شاہِ حشمت و جلال! میں نے سنا تھا۔ کہ دل سے نکلنے والا ایک آنسو دنیا کی سخت سے سخت چیز کو نرم کر دیتا ہے ۔۔ غالباً یہ صحیح نہیں ۔۔ اے دیوتائے حسن و عشق! میری اشکباریوں کو دیکھ اگر تو قلوپطرہ کا سکوت دُور کر دے۔ تو اپنی جان کی قربانی بھی دینے کے لئے تیار ہوں"

غرضکہ ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ جولیس ہر آن اور ہر گھڑی اُس ساعت کا انتظار کرتا رہا کہ اُسے سحابِ نور پھر جھلملاتا ہوا نظر آ جائے پھر ایک مرتبہ اُس کے کانوں میں وہی ندا آ سکے۔ جس کے لئے اُٹھوں پہر اُس کی نظریں سوئے آسمان لگی رہتی تھیں۔ لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ قلوپطرہ کے مزار کی طرف بڑھا دیئے۔ کچھ دیر تک بے حس و حرکت آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دیوانہ وار اُس نے قلوپطرہ کی قبر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُس نے عالمِ خیال میں ایسا محسوس کیا کہ قلوپطرہ کی قبر انسانی جسم کی طرح نرم ہو چکی ہے اور یہ یقین کر کے کہ شاید اب اُس کے زندہ ہونے کا وقت بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ اُس کی حالت میں ایک حیرت انگیز تغیر پیدا ہو گیا۔ لیکن جب اُسے ہوش آیا تو قبر سے لپٹ کر خاموش پرستش میں مصروف ہو گیا۔

"اے سکون و سکوت کی دیوی! خدا کے لئے بتا کہ تیری گراں خوابی کو کیوں کر دُور کیا جا سکتا ہے۔ میں بعض اوقات ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تیری خاموشی مجھ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہے ۔۔۔ اگر تو پیوند خاک نہ ہوتی تو تیرے لبِ لعلیں کو کھول کر اپنی سانس کے صدمات کی ضرب سے تجھ میں زندگی کی روح دوڑا دیتا۔ اگر تو پیوند خاک نہ ہوتی تو تیری ان سیاہ پلکوں کو چیر کر پھر ایک بار تجھ سے خرمنِ ہوش پر بجلیاں گرانے کی التجا کرتا۔ تیری اِس نیند کو دور کرنے کے لئے اپنی زندگی کی تمام بیداریاں تجھ پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اے ملکۂ جاہ و حشم! میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر تو زندہ ہو جائے تو تیری پرستش کر کے تیری زندگی میں چار چاند لگا دوں گا۔ تاکہ لوگوں کی نظریں خیرہ ہو جائیں اور عورت کی حقیقت کو جان لیں۔ لیکن اے ملکۂ عظمت و جلال! میں صرف اتنی جسارت کرتا ہوں کہ تو مجھے اس قعرِ فراق

سے ملا کر وصل کی سطح پر لا۔ وقت آگیا ہے۔ کہ اس ہجر کی المناک گھڑیاں ختم کر دی جائیں۔ کیا تیرا استغنا کبھی مجھ سے خطاب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا ـــ کیا تیری شاہانہ تمکنت اس امر کی متقاضی نہیں ہے۔ کہ مجھ ایسے ذلیل انسان کی طرف اعتناء کرے ـــ"

جولیس کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور کائنات کے ذرہ ذرہ نے سوائے لفظ "آہ" کے اور کچھ نہ سُنا۔

اب بھی رُوما کے اس کنج میں قلوپطرہ کی قبر کی داہنی جانب جولیس کی قبر ہے۔ جہاں ہر سال ہزاروں پریم پجاری ہجر و وصال کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اور ان دونوں کی مشترکہ لوحِ تربت پر یہ عبارت پڑھکر حسرت و ارمان کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

"آرام گاہِ قلوپطرہ اور جولیس"

"جبری شادی کا انجام۔ دونوں ناکام و نامراد اُٹھے"

غزل

(افکارِ تازہ جناب خان صاحب حکیم محمود علی خان ماہر اکبر آبادی)

بلا سے صرفِ ستم ہائے اہلِ ناز ہوں میں
نیاز کیش ہوں سرتا بہ پا نیاز ہوں میں

جنابِ عشق نے بخشی ہے مجکو جراتِ شوق
ہر اک قصور ہر اک جرم کا مجاز ہوں میں

میں شغلِ بادہ کا فتویٰ طلب کروں کس سے
کہ آپ اپنے لئے حجتِ جواز ہوں میں

گلے عبث جو ہیں لحباب سے نہیں کہتا
اُنہیں خبر نہیں کس کا امینِ راز ہوں میں

مجھے تلاشِ معالج کے خبط سے کیا کام
خود اپنے درد کا دنیا میں چارہ ساز ہوں میں

میں اپنی منزلِ مقصد ہوں آپ اے رہبر
تلاشِ منزلِ مقصد سے بے نیاز ہوں میں

مجھے پتہ ہے کہ آیا ہوں بہرِ خدمتِ خلق
مجھے خبر ہے کہ شایانِ فخر و ناز ہوں میں

رہونگا ابکدن آقائے دوجہاں بنکر
خبر ہے کس کی غلامی سے سرفراز ہوں میں

مجھے یہ فخر ہے کافی ابد تک اے ماہر
ازل سے بندۂ شاہنشہِ حجاز ہوں میں

"گھاٹ"

ٹیگور کا ایک نادر شاہکار

(مترجمہ جناب ایم۔ اے خان یوسفی)

اگر تم عہدِ کہن کی رنگین داستان سُننا چاہتے ہو تو میری سیڑھیوں پر بیٹھ کر ننھی ننھی لہروں کی سرگوشیاں سنو۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ دریا طغیانی پر تھا۔ میری تمام سیڑھیاں پانی کی یلغار سے اپنا منہ چھپا چکی تھیں۔ صرف چار باقی رہ گئی تھیں جو سطحِ آب سے اُٹھ اُٹھ کر گستاخ لہروں کی بدمستیاں دیکھ رہی تھیں۔ پانی ندی کے ان نشیبی حصّوں تک آگیا تھا جہاں اب آموں کی شاخوں تلے "کچو" کے خودرو پودے اُگ رہے ہیں۔ ندی کے اس موڑ پر اینٹوں کے تین ڈھیر سطحِ آب سے اُبھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کنارے پر "بابلا" کے درختوں سے بندھی ہوئی ماہی گیر کشتیاں صبح کو تھرکتی اور کروٹیں بدلتی ہوئی بیقرار لہروں کے سینہ پر سینہ مل رہی تھیں۔ سورج کی نحیف و نزار کرنوں نے کنارے پر اُگی ہوئی لمبی لمبی سبز بیلوں کی پیشانیوں پر گرم گرم بوسے ثبت کرنا شروع کر دیئے تھے۔ پھول کھلنا شروع ہو چکے تھے لیکن ہنوز پُورے نہیں کھلے تھے۔

چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ننھے مُنّے بادبان جو پگھلی ہوئی چاندی کی سطح پر بہتی ہوئی معلوم دیتی تھیں ہوا سے پھُول کر کپّا ہو رہے تھے برہمن پجاری اپنے ظروف سنبھالے ندی پر اشنان کرنے آگیا تھا۔ عورتیں بھی دو دو تین تین کی ٹولیاں بنا کر گھروں سے پانی بھرنے چل نکلی تھیں مجھے معلوم تھا کہ یہ وقت کُسم کے گھاٹ آنے کا ہے۔

لیکن اس صبح کو وہ مجھے نظر نہ آئی بھوبن اور سوارنو گھاٹ پر اُداس بیٹھی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی سہیلی نئے لوگوں انئی بستی اور ناآشنا سڑکوں پہ ——— ندی سے بہت دُور ——— اپنے شوہر کا گھر آباد کرنے چلی گئی ہے۔

امتدادِ زمانہ نے اس کی یاد کے دھُندلے نقوش کو میرے دل سے محو کر دیا۔ سال دیکھتے دیکھتے گذر گیا۔ گھاٹ آنے والی عورتیں بھی اب شاذ و نادر ہی اس کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ لیکن ایک ناقابلِ فراموش شام کو میں ان دیرینہ آشنا پاؤں کی چاپ سُن کر چونک پڑی۔ اُف! کچھ نہ پوچھو! اب یہ پاؤں اپنے پُرانے ترنّم اور دیرینہ موسیقیت کو کھو بیٹھے تھے۔ ہاں! اب اس کے نازک سیمیں پاؤں پازیبوں کی جھنکار سے محروم ہو گئے تھے!

کُسم کا سہاگ لُٹ چکا تھا ——— وہ بیوہ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا خاوند کسی دُور دراز مقام پر کام کیا کرتا تھا۔ ایک خط نے اس کی جوانمرگی کی خبر وحشت اثر سُنائی۔ آہ! قضا و قدر کے ظالم ہاتھ نے صرف آٹھ برس کی عمر میں اس کا سہاگ لُوٹ لیا۔ اس نے مانگ کی سندور کو جو اس کی زوجیت کا اوّلین نشان اور عروسیت کی واحد یادگار تھی مٹا ڈالی۔ اس کی نازک کلائیاں اب کنگن کی مرہونِ منّت نہ رہی تھیں۔ وہ گنگا کنارے اپنے میکہ واپس آگئی۔ لیکن اب اس کی سہیلیوں کا جھرمٹ بکھر چکا تھا۔ بھوبن، سوارنو اور آملا کی شادی ہو

چکی تھی صرف سارت رہ گئی تھی سو اُس کا بیاہ بھی آئندہ ستمبر میں ہونے والا تھا

جس طرح موسم برسات کی آمد پہ ندی نالے بھر جاتے ہیں اور گنگا بھرپور ہو کر اپنی جولانیاں دکھاتی ہے اسی طرح کُستم بھی حسن و شباب کی منزل کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔ لیکن اس کے پھیکے رنگ کے کپڑوں، اس کے فکرمند چہرہ اور خاموش اداؤں نے کسی گہر کہر کی طرح اس کے قیامت خیز شباب پر ایک نقاب ڈال کر اسے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ دس برس آنکھ جھپکاتے گذر گئے اور کسی نے محسوس تک بھی نہ کیا کہ کُستم حُسن کے پُرخطر اور شباب کے خوفناک جادہ پر گامزن ہے۔

اخیر ستمبر کے دن تھے۔ آج کی طرح ہی صبح کا وقت تھا کہ ایک دراز قامت اور گورا چِٹا جوان سنیاسی محاذ والے شیوجی کے مندر میں وارد ہوا نہ معلوم کہاں سے آیا تھا۔ گھر گھر اس کی آمد کا چرچا ہونے لگا۔ عورتیں اپنی گگریاں چھوڑ چھوڑ کر "اشیرباد" کی غرض سے سادھو کے گرد جوق در جوق جمع ہو گئیں۔

مجمع دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ سنیاسی کی شہرت نے عورتوں میں خوب فروغ پایا۔ کبھی وہ بھگوت گیتا کا پارٹ کرنے لگتا اور کبھی مذہبی کتابوں پر خیال آرائیاں کرنے لگتا۔ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے —— کوئی کسی سحر کی تلاش میں، کوئی مشورہ کی غرض سے، اور کوئی کسی دوا کی فکر میں۔

اسی طرح مہینے گذر گئے۔ اپریل میں سورج گرہن کے موقعہ پر ایک جم غفیر گنگا اشنان کرنے اُمنڈ آیا۔ بابلا کے پیڑ کے نیچے ایک میلہ ہونے لگا۔ بہت سے یاتری سنیاسی کے بھی درشن کرنے گئے۔ ان میں ایک ٹولی ان عورتوں کی بھی تھی جن کا تعلق کُستم کے سسرال والے گاؤں سے تھا۔

صبح کا سُہانا سماں تھا۔ سنیاسی میری سیڑھی پر بیٹھا مالا جپ رہا تھا کہ یکایک ایک عورت نے دوسری عورت کو ٹہوکتے ہوئے کہا۔

"کیوں ری! یہ تو اپنی کُستم کا پتی ہے"

دوسری نے اپنی انگلیوں سے گھونگٹ کو تھوڑا سا کھولتے ہوئے جواب دیا:۔

"اری ہاں! ہے تو وہی۔ چتر جو دِنش کا سب سے چھوٹا لڑکا۔"

تیسری نے ذرا اپنا گھونگٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں! ذرا دیکھو تو! ہُوبہُو وہی نقشہ، وہی آنکھ، وہی ناک وہی پیشانی"

لیکن دوسری عورت نے جو سنیاسی کی طرف ذرا بھی ملتفت نہیں ہوئی تھی پانی کو اپنی گاگر سے جنبش دی اور آہ بھر کر کہنے لگی:۔

"وہ صورت اب کہاں! وہ تو جہاں کا تھا وہاں چلا گیا قسمت کُستم کی"

لیکن ایک نے اعتراض کیا:۔

"اس کے اتنی لمبی ڈاڑھی کہاں سے آئی"

دوسری نے کہا:۔

"وہ اتنا دُبلا بھی تو نہیں تھا۔ اور نہ اتنا لمبا"

فی الحال گفتگو ان ہی باتوں پر ختم ہو گئی۔ اور بات زیادہ بڑھنے نہ پائی۔ ایک رات کو جب چودھویں رات کا درخشاں چاند فضائے آسمانی میں نور پاشیاں کر رہا تھا کُستم میری سب سے نچلی سیڑھی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کا سایہ پانی کی سطح پر لرز رہا تھا۔

اسوقت وہ گھاٹ پر تن تنہا تھی۔ نزدیک ہی جھینگر بول رہے تھے۔ مندر کے گھنٹوں اور گھڑیالوں کی جھنجھناہٹ فضائے بسیط میں کپکپا کر غائب ہو گئی۔ گنگا کے گہرے پانی پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہم کے سائے جگہ جگہ —— کنارے پر جھاڑ جھنکاڑ میں، مندر کی محراب کے سامنے، تالاب کے عقب میں، کھجوروں کے جھنڈ میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ چمگادڑیں چتم کی شاخوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ گیدڑوں کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد کچھ سناٹا سا چھا جاتا تھا اور شور سکوت میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

سنیاسی مندر سے خراماں خراماں نکلا۔ گھاٹ کی سیڑھیوں پر ایک عورت کو تن و تنہا بیٹھا پا کر وہ لوٹنے ہی والا تھا کہ کُستم نے اپنا سر اٹھایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کا گھونگٹ کھسک گیا اور چاند کی زرد زرد کرنیں اس کے حسین چہرے پر ناچنے لگیں۔

ایک اُلّو ان کے سر پر سے بولتا ہوا گذر گیا۔ کستم آواز سن کر چونک پڑی اُسے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ اور یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً اپنا چہرہ آنچل سے چھپا لیا اور دوڑ کر سنیاسی کے چرن چھوئے۔

اس نے آشیرباد دیتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"کستم"۔ اس نے ذرا جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

اس شب کی گفتگو کا یہیں خاتمہ ہو گیا۔ کستم نہایت دھیرے دھیرے چل قدمی کرتی اپنے گھر واپس چلی گئی جو ندی سے زیادہ دُور نہ تھا لیکن سنیاسی بہت رات گئے تک مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ آخر جب تھکا ہوا چاند اپنی مسافت طے کر چکا اور سنیاسی کا سایہ پیچھے سے ہٹ کر اس کے آگے پڑنے لگا تو وہ اٹھا اور مندر کی جانب کا رُخ کیا۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ کستم روزانہ سنیاسی کے چرن چھونے آتی ہے جب وہ مقدس کتابوں کی تشریح و توضیح کرتا وہ کونے میں سراپا گوش بنی کھڑی رہتی۔ صبح کی پوجا کے بعد وہ اسے اپنے پاس بُلاتا اور مذہبی روایات اور احکام مقدسہ اس کے گوش گذار کرتا۔ حالانکہ یہ باتیں اس کے حیطۂ تفہیم سے بالاتر ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ بڑی توجہ اور انہماک سے سُنتی اور ان کو سمجھنے کی انتہائی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کے احکام کی لفظ بلفظ پابندی کرتی، اس کے اشاروں پر چلتی اور بلاناغہ مندر میں پوجا کرنے جاتی تھی دیوتا کی پرستش وہ انتہائی تضرع اور خشوع و خضوع کے ساتھ کرتی تھی۔ کبھی پوجا کے لئے پھول اکٹھے کر رہی ہے۔ کبھی گنگا جل سے مندر دھونے جا رہی ہے ——— یہی اس کا عزیز مشغلہ تھا۔

جاڑا رخصت ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ لیکن شام کو کبھی کبھی جنوب کی طرف سے یکدم گرم گرم برساتی ہوائیں چلنے لگتیں۔ نمی ہوا میں حلول کر جاتی اور ایک طویل سکوت کے بعد فضا انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی۔ گھر گھر بانسری کی میٹھی تانیں اور ترنم آمیز نغمات سنائی دینے لگتے ملاح اپنے اپنے چپو چھوڑ کر کشتیوں کو دھارے میں ڈال دیتے اور کرشن کے راگ الاپنے لگ جاتے۔ یہ تھی موسم کی جاذبیت اور سماں کی وجد آفریں کیفیت!۔

لیکن اب مجھے کستم نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ اس نے کچھ عرصہ سے مندر جانا، گھاٹ آنا، سنیاسی سے ملنا غرضیکہ سب کچھ ترک کر دیا تھا۔

مجھے علم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان دونوں کی ملاقات پھر میری سیڑھیوں پر ہوئی۔

کستم نے شرمگین نگاہوں سے پوچھا۔

"مہاراج! کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟"

"ہاں تمہیں دیکھے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ آخر کیا بات ہے؟ دیوتاؤں کی پوجا سے اس قدر غفلت؟"

وہ خاموش تھی۔

سادھو نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"درست۔ سچ سچ اپنے دل کا حال بلاکم وکاست سنا دو۔"

اپنے چہرہ کا رُخ بدلتے ہوئے اس نے کہا۔

"سوامی! میں پاپن ہوں۔ میری پوجا —— اسپھل رہی۔"

"مجھے معلوم ہے کستم کہ ان دنوں تمہارے جذبات میں کچھ ہل چل مچی ہوئی ہے۔"

سادھو نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

اس نے ایک جھرجھری لی۔ ساری کا پلہ چہرے پر کھینچ لیا اور سادھو کے قدموں پر گر کر رونے لگی۔

کچھ دور کھسکتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم مجھے اپنے دل کا حال بتا دو۔ میں تمہیں سکھ اور شانتی کے مارگ پر لگا دوں گا"

پھر اس نے ایسے انداز سے کہنا شروع کیا جو اس کی راسخ الاعتقادی کا آئینہ دار تھا۔ کبھی کبھی لفظوں کی کمی محسوس کرتے ہوئے اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"مہاراج! اگر آپ کی آگیا ہے تو میں کہہ دیتی ہوں۔ لیکن میں اسے —— الفاظ و معانی کا صحیح جامہ پہنانے سے —— اپنے کو قاصر پاتی ہوں۔ سوامی! تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے کسی کو اپنا دیوتا بنایا۔ دل و جان سے اس کی پرستش کی اور اس پوجا کی برکت نے میرے دل کو مضبوط بنا دیا۔ لیکن ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی باغ میں بیٹھا ہے۔ میرے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ میں مگر مارکھا ہے اور اسی طرح ہم راز و نیاز میں سرگرم ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر میں خدا بھی متعجب نہ ہوئی۔ خواب آئی گئی بات ہو گئی۔ لیکن اسکا اثر مجھ پر ابھی تک قائم ہے۔ دوسرے دن جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ ایک دوسرے ہی رنگ میں تھا۔ اس خوابناک صورت نے میری تصورات کی دنیا پر قبضہ جما لیا۔ میں اس سے ڈر کر بھاگی۔ لیکن وہ صورت مجھ سے جدا نہ ہوئی وہ دن تھا اور یہ دن ہے میرا دل برابر بے چین و بیقرار ہے۔ اب تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

جب وہ اپنا افسانۂ محبت سنا کر آنسو پونچھ رہی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سنیاسی میری سنگین سیڑھیوں کو اپنے پاؤں سے مسک رہا ہے۔

جب اسکا سلسلہ کلام منقطع ہو گیا تو سنیاسی نے پوچھا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون جس نے تمہارے خوابوں کی دنیا آباد کر رکھی ہے"

"نہیں سوامی میں نہیں بتا سکتی"

لیکن وہ مصر ہوا۔ تو بےصبری کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا تو کیا مجھے بتا دینا چاہیئے؟"

"ہاں ضرور بتا دینا چاہیئے"۔ اس نے پُر زور لہجہ میں کہا۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ تم ہی ہو سوامی" اور یہ کہہ کر اپنا حسین چہرہ پتھریلے فرش پر رکھ دیا اور پھر سسکیاں لینے لگی۔

سنیاسی نے کہا۔

"میں امشب اس گاؤں کو خیرباد کہنے والا ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ یاد رکھو! میں سنیاسی ہوں اور میرا تعلق اس جہان رنگ و بو سے نہیں ہے۔ تم مجھے بھول جانا۔"

کستم نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔ "ایسا ہی ہوگا سوامی!"

سنیاسی نے کہا۔ "اچھا لو الوداع"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے کستم پر ڈاکہ ڈالکر اس کی قوت گویائی سلب کر لی ہے۔ اس نے سنیاسی کے پاؤں چومے اور اس کے پاؤں کی خاک کو اپنے سر میں ملا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس بستی سے رخصت ہو گیا۔

چاند چھپ گیا۔ رات سیاہ ہوتی چلی گئی۔ پانی میں ایک دھماکا کی آواز سنائی دی۔ ہوا اندھیرے میں سرمستیاں کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستاروں کو اُڑا کر لے جائے گی۔

دُکھیاری

ایک رقّت انگیز افسانہ!

(از جناب سید منظر کاظمی بی۔اے (آنرز))

آخر اُس کا جُرم کیا تھا! — جُرم افلاس! اُس نے کون سا قصور کیا تھا! — بس یہی کہ وہ غریب تھی — غریب! — جن کی غذا میں ٹوکروں کی گھرکیاں اور ٹھوکریں۔ جن کی خوشیاں ناپید اور جن کی زندگی — دُنیا میں جہنم کا نمونہ۔ مسرتوں سے کوسوں دُور۔

اُس کا نام تھا رودھیا۔ اگر تقدیر اُسکی اچھی ہوتی اور قضا و قدر نے اس کے نصیب میں آرام و چین لکھا ہوتا۔ اگر خدا نے اُسے کچھ بھی دولت دی ہوتی تو بلاشک وہ رودھیا کے بجائے رادھا ہوتی یا رادھا رانی اور تب لوگ اُس کا نام بھی عزت سے لیتے۔ اُس کی بھی ہر جگہ توقیر ہوتی لیکن اب — اب اُس کا نام ہر معمولی اور ذلیل چیز سے بھی معمولی اور ذلیل تھا (ضرورت ہی کیا تھی اُس کا نام لینے۔ بس نوکرانی کہنا ہی کافی تھا۔ وہ میرے مکان کی پُشت پر پھونس کے ایک ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس کا دُنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف دو لڑکیاں گلابو اور بنیا۔ ایک کی عمر کوئی پندرہ سال کی اور دوسری تقریباً بارہ سال کی۔ دونو کی شادی — جلد از جلد شادی کر دینے کی فکر رودھیا کو کھائے ڈالتی تھی۔ ایک دبی ہوئی آہ کے ساتھ وہ اکثر کہہ اُٹھتی — "کاش آج وہ زندہ ہوتے" لیکن وہ تو اُسے دُنیا کے ہچکولوں میں تنہا۔ بے یار و مددگار چھوڑ کر اور سہاگ کی دولت سے بھی محروم کر کے چلے گئے تھے۔ بہت دن ہوئے لیکن.... اب؟

وہ روزانہ بازار جاتی تھی۔ کسی دن گھاس لیکر اور کسی دن لکڑیاں۔ اسے بیچ لینے کے بعد مزدوری کی تلاش کرتی۔ اگر قسمت میں ہوتا تو دو چار پیسے ہاتھ آجاتے۔ نہیں تو بیچاری مُفت کی تھکاوٹ سے چُور۔ چراغ جلنے کے وقت گھر لوٹ آتی۔ اُس وقت اس کا پچاس سال کا ضعیف جسم اس قابل ہرگز نہ ہوتا کہ وہ اُٹھ بھی سکے۔ بھوک کے مارے اُس کی جان نکل جانے کو تیار ہو جاتی لیکن پھر بھی..... یہ تو اُس کا روز کا دُکھ تھا!

گھاس کا بڑا سا گٹھا اُس کے سر پر تھا۔ ایک تو ضعیف جسم دوسرے بھاری بوجھ اور اُس پر ستم تھا اس آگ برستی دھوپ میں در در گھومنا۔ وہ ناک اور مُنہ دونوں سے سانس لیکر۔ میلی دھوتی سے پسینہ پونچھکر۔ اُمید بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن وہ پھر بھی بہت زیادہ غمگین نہ تھی۔ اس وقت یہ گھاس کا گٹھا اُس کے لئے گھاس کا بوجھ نہیں بلکہ اُمیدوں کا بوجھ تھا۔ اُس کے بوڑھے جسم میں ایک جوان مرد کی طاقت لہریں لے رہی تھی۔ بوجھ؟ — اُسکی تکلیفوں اور فکر کو ہلکا کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ دھوپ بھری دوپہر میں گھومنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو اُمیدوں کے پُر بہار باغ میں ٹہل رہی تھی۔ جہاں اُس کا ارمان بھرا دل اُمیدوں کے سایہ میں جھولا جھول رہا تھا۔ وہ سوچتی جا رہی تھی "چھ آنے تک تو بک ہی جائے گا۔ چار آنے کا اناج لوں گی اور چار پیسہ کا مصالحہ وغیرہ۔ چار پیسے بچیں گے۔ انہیں بنئے کے قرض میں دے دونگی۔ ہاں اگر جلد ہی بِک گئی تو کچھ مزدوری......"

خیالات ابھی ذرا ہی بڑھے تھے۔ کہ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ پسینہ بھرے مُنہ پر فکر کی ایک ہلکی سی زردی دوڑ گئی۔ لڑکیوں کی شادی کے

سے اگر کچھ رقم جمع کرے تو کیونکر؟ دُکھتے ہوئے دل کو پہلو میں دبائے وہ آگے بڑھ گئی۔ گردن اُٹھا کر سورج کی طرف دیکھا — ارے دوپہر ڈھلی جا رہی ہے۔ اس کی گھاس ابھی تک نہیں بکی۔ کیا شہر کے تمام گھوڑے والے آج مر گئے! جھنجلا کر اُس نے اپنے دل سے سوال کیا مگر وہ — ؟

اُس کے پیروں اور خیالات میں جیسے برقی لہر دوڑ رہی تھی پانچ بجگئے لیکن دونوں کا گھومنا بند نہ ہوا۔ نہ تو اُس کے پیر ہی رُکے اور نہ خیالات اور نہ گھاس ہی بکی۔ اُس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلکے دُکھے ہوئے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح بڑھی۔ اُس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔

ایک لمبی سانس لیکر اُس نے تن کر کہا "یہ نہیں ہو سکتا کہ آج گھاس نہ بکے!"

اتفاقاً اُسی وقت سامنے سے ایک یکہ والا آتا ہوا دکھائی دیا۔ خالی یکہ — مرجھائی ہوئی صورت! بڑھیا کی آنکھوں میں جیسے اُمید ناچنے لگی۔

"کیا لیگی بڑھیا!" یکہ بغیر رُکے ہوئے وہ بولا۔

"چھ آنے" بڑھیا نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

"چھ آنے؟" یکہ برابر آکر بغیر رُکے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

بڑھیا سنّاٹے میں آگئی۔ وہ سوچنے لگی — اب؟ پھر چلّا کر بولی "ارے تم کیا دوگے۔ کچھ بولو بھی"

"کیا دوں۔ آج تو بے موت کی موت مرے۔ کس کمبخت نے صبح سے ایک پیسہ کا منہ بھی دیکھا ہے۔ شہر کے تمام یکّے اور تانگے بیگار میں پکڑے گئے ..... اب گھر جا رہا ہوں" بڑھیا نے کچھ سنا اور کچھ نہیں سُنا۔ گھاس اور نااُمیدی دونوں کا بوجھ لادے ہوئے وہ آگے بڑھی تھی۔ کہ ایک آواز آئی "— اری او گھاس والی ٹھہر!" آواز میں غیر معمولی رُعب اور سختی تھی۔ بڑھیا اُمید و بیم کی حالت میں ایک دم سے پیچھے گھوم گئی۔ ایک سپاہی کھڑا تھا۔

چل لے چل اسے۔ تجھے خبر نہیں کہ آج کوتوال صاحب کے لڑکے کی شادی ہے۔ سینکڑوں گھوڑے دروازہ پر بندھے ہوئے ہیں"

"لیکن حضور......" ردھیا نے کچھ کہنا چاہا "سیدھی طرح نہیں چلے گی کیا؟.. گرجگر غریبوں کی جان ومال کے رکھوالے نے کہا۔ ردھیا کانپ اٹھی۔ اُسے سپاہی کے پیچھے گھاس لیکر جانا ہی پڑا —— بے بس۔ بیکس۔ لاچار۔

خلافِ معمول اُس دن ذرا طبیعت سست تھی۔ کسی کام میں بھی جی نہ لگتا تھا میں ایک ناول لیکر اُوپر کے کمرے میں جا بیٹھا۔ کھڑکیاں کھولدیں اور آرام کرسی پر دراز ہوکر ناول دیکھنے لگا۔ لیکن دل نہ لگا۔ بمشکل تین چار صفحے پڑھے تھے۔ شام کا پُرکیف سین کھینچتے ہوئے مصنّف نے دو حسین لڑکیوں کا ذکر کیا تھا۔ معاً میرے خیالات کا سلسلہ کتاب کی ان دو حسین لڑکیوں سے ہٹ کر ردھیا کی لڑکیوں کی جانب جانکلا۔ ردھیا میری ہمسایہ تھی اور ہر طرح ہمدردی کے مستحق۔ اکثر میرا خیال اُس کی امداد کا ہوتا رہا ہے۔ پھٹے پُرانے کپڑے ٹوٹے پھوٹے برتن اور کھانے پینے کی چیزیں وہ اکثر میرے گھر سے پاتی رہتی ہے۔ مجھے اُس کی مفلسی ایک چبھے ہوئے کانٹے کی طرح تکلیف دیا کرتی تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کر رکھا تھا۔ کہ اُس کی لڑکیوں کی شادی میں کافی مدد دونگا۔ لیکن شاید اُسے...... پر وہ شادی کریگی کب؟ لڑکیاں تو کب کی بیاہ کے لائق ہو چکی تھیں — لیکن وہ بیچاری کرے تو کیا کرے۔ اس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ یہی نا کہ وہ غریب ہے"

میں کتاب میز پر پھینک کر کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا —

نینا اور گلابو کھڑی ماں کا انتظار کر رہی تھیں۔ میرے ہمدردانہ خیالات کا سلسلہ یقیناً کچھ آگے بڑھتا لیکن......

"اچھا تو یہی وجہ جو ردھیا پر اس قدر مہربانی کی نظر ہے —

ہوں۔ اب میں سمجھی"

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا بیگم۔ اندر داخل ہو رہی تھیں۔

"کیا کہا" میں نے پوچھا۔

"یہی دونوں چڑیلیں اور کیا" اُنھوں نے تُرشی سے نینا اور گلابو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

اُف حسد کا مادہ عورتوں میں عقل وتمیز کو بھی جلاکر خاک کر دیتا ہے بیگم کے اس جملے نے صرف یہی نہیں کہ میرے بیگناہ ضمیر کو صدمہ پہنچایا! بلکہ دو معصوم اور پاک دلوں کو بھی رنج پہنچایا اور اُن کی عصمت وپاکبازی پر حملہ کیا۔

"لیکن اس طرح کی بدگمانی اچھی نہیں" میں نے بیگم سے کہا "یونہی کسی پر مُفت کا الزام نہ رکھ دیا کرو۔ یہ بیچاری تو ہمارے ہی ٹکڑوں پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ غریب ہیں۔ مگر پھر بھی عزت رکھتی ہیں۔ اِن کے بھی آن ہوتی ہے۔ اپنی بے عزتی کا احساس انھیں بھی ہوتا ہے۔ یہ شاید تم بھول گئی ہو!"

"ہاں۔ یہ تو میں بھول گئی ہوں اور تم طبیعت کی سستی کا بہانہ کرکے اُوپر بیٹھ کر آنکھیں سینکنا سیکھ گئے ہو۔ کیوں؟"

"تم تو بیکار کو بدگمان ہوتی ہو عقل سے کام لینا تو جانتی ہی نہیں"

"اچھا تو اب آپ ہی عقل سے کام لیجئے اور اُنھیں جی بھر کر دیکھئے" یہ کہکر غصّہ سے مُنہ پُھلائے ہوئے وہ نیچے چلی گئیں۔

غزل گوئی پر ایک نظر

"نغمۂ دل" کی روح پرور لطافتیں

(از جناب مولینا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی علیگ)

نقدنگاری اور وہ بھی اپنے ہمعصروں کے نتائج فکر پر۔ ممکن ہے کسی کے لئے دلچسپی کا باعث ہو مگر میرے خیال میں تو اس سے زیادہ صبرآزما اور حوصلہ شکن کوئی ادبی مشغلہ نہیں ہے۔ یہی ایک صنعت تحریر ہے جسمیں حق و باطل برابر درجے کی معاصی ہیں۔ اور یہی ایک دُنیا ہے جہاں صدق و کذب یکساں طور پر داخل جرائم ہیں۔ بے غرضانہ ستائش اور بے لوث اعتراض حق، اخلاقِ انسانی کا ایک شرف ہے مگر دیارِ تنقید کی آب وہوا میں اس کی ماہیت بدل جاتی ہے اور اس کا لقب یا تو قصیدہ خوانی یا فردتنی ورنہ کم سے کم غلط بحثی رکھا جاتا ہے۔ خردہ گیری اور ناتواں بینی کہیں اور مذموم ہو تو ہو مگر اس بزم مغاں کے فیض سے یہی عیب دفعتاً ہنر بن جاتا ہے۔ غضب ہے خدا کا مشاعرے میں جہاں ایک نومشق اور برخود متشاعر آپ کے سامنے قوالی یا بزم رقصاں کی نقالی کرتا ہے۔ اس کی ہر لایعنی سروں پر جھوٹی واہ وا کے شور و غل سے ہنگامۂ قیامت برپا کر دینا تو تہذیب سخن فہمی کا ضروری رُکن ہے۔ مگر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اور شاعر کے پس پشت اس انعام شعری پر جو شاعر یا راوی کے جنبش قلم و ابرُو اور نغمہ سرائی سے بے نیاز ہے۔ زبانِ قلم سے اضطراراً بھی حرفِ تحسین نکل جانا ایک ایسی معصیت ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ ایک طرف تو ممدوح خود بھی خوش نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ جو کچھ کہیں گے اس کے توقعات سے فروتر ہوگا۔ دوسری جانب مدعیانِ شاعر آپ کے نام سے بیزار ہو جائیں گے۔

اسی کو کہتے ہیں ازیں سو رانده و ازاں سو درمانده۔ یہاں تک تو مصائب نقدنگار کی قسط اول ہے۔ آگے چل کر جو مرحلہ پیش آتا ہے وہ اور بھی حوصلہ فرسا ہے۔ اگر ایک بار استحقاقاً آپ سے نقدنگاری کی خدمت سرزد ہو گئی تو مدۃ العمر کے لئے اخلاقاً اس کا اعادہ آپ پر فرض ہوگیا۔

جماعت انسانی میں اختلاف مذاق فطری ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ فطری ہے خود بینی اور خوشامد پسندی۔ فطرت کے ان دو متضاد مقتضیات کا باہمی تصادم نقدنگار کے لیئے عذاب الیم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے ذوق کے مطابق کسی کی تصنیف، یا شعر کے محاسن قلمبند کر دیئے تو مصنف اور شاعر کے سوا بقیہ ارباب فن اس کو شاعرانہ مبالغہ سمجھیں گے اور ہر شخص اپنے نتائج فکر کی نسبت اسی مداحی کا متمنی ہوگا یہاں تک کہ تقاضوں سے آپ گھبرائیں گے۔ اب اگر موضوع تنقید کو ناقابلِ اعتنا سمجھ کر یا عدیم الفرصتی کی بنا پر آپ نے خاموشی اختیار کی تو روابطِ اخلاص کا خون ہوا۔ اور اگر اپنا عزیز وقت ضائع کر کے آپ نے حتی الوسع محتاط انداز میں اپنی سچی رائے کا اظہار کر دیا تو شکریہ کیسا اُلٹی شکایت مول لے لی۔ الغرض نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

میں نے تو بوجوہ عہد کر لیا تھا کہ آئندہ نقدنگاری جیسی سعی ناحکم سے دامن بچاؤں گا۔ لیکن میرے بعض تنقیدی مضامین میں ضمناً بعض فنی مباحث پر جو خفیف اشارات کئے گئے تھے وہ ارباب نظر کے ایک مختصر حلقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس لئے خیال تھا کہ کسی مناسب موقعہ پر

صنف غزل کی نسبت اپنے خیالات کو مختصراً قلمبند کر دیا جائے۔ مگر مشاغلِ زندگی نے فرصت نہ دی۔ اور ایک مستقل مقالہ کے لئے جس وسعت مطالعہ اور دقتِ نظر کی ضرورت ہے وہ یہاں نصیب بھی نہیں۔ البتہ ایک سرسری اور ضمنی نظر کے لئے روشنی اور حرارت کا وہی تھوڑا سا سرمایہ کافی ہو جاتا ہے جو آج سے ۲۰، ۲۲ برس پیشتر ایک آفتاب کمال کے فیض آستان بوسی سے دل و دماغ نے جذب کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا موقعہ ہاتھ آگیا ہے یعنی سراپائے اخلاص حضرت ضمیر الحسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری کا دیوان جو نغمۂ دل کے نام سے شائع ہوا ہے زیر نظر اور طالبِ نظر ہے دیوان اچھا خاصہ ضخیم ہے اور صاحب دیوان اپنے تخلص کی طرح اردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ دیوان کے ساتھ اور مشاہیر کی تقریظیں بھی شائع ہوئی ہیں اس لئے اب مزید ریویو کا نہ محل ہے۔ نہ امکان۔ البتہ چونکہ حضرت دل کا دیوان تغزل کی تمام اسالیب کا ایک معتدل نمونہ ہے اس لئے اگر ضمناً اس صنف نظم کی نسبت کچھ اظہار خیال کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا اور اظہار نیاز کے ساتھ ہی خدمت کا فرض بھی بقدر استطاعت ادا ہو جائے گا۔ اب اگر تخلص کی تاثیر نے اس پر بھی کسی صاحب کو شکایت کا موقع دیا تو مجبوری ہے۔

معنوی یا لغوی حیثیت سے تو غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں عشق کی داستانِ درد خود عاشق کی زبان سے ادا کی جائے۔ اور عشق بھی وہ جو باصطلاح مولانائے روم فسادِ خوردن گندم ہے یعنی صنف قوی کا جنسی رابطہ صنف نازک سے۔ عرب کا تغزّل اور ہندوستان کا گیت اسی حد تک محدود تھا۔ البتہ اختلاف آب و ہوا سے اس قدر فرق ضرور ہوا کہ جس ملک میں جو چیز کمیاب تھی وہ اصول اقتصاد کی بنا پر گراں تر اور محبوب و مطلوب قرار پائی اور ملکی آب و ہوا نے جن صنفی جذبات کو زیادہ برانگیختہ کیا یا جس صنف کی اکثریت پیدا کر دی وہ صنف عاشقِ طالب کی حیثیت میں آگئی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب میں مرد عاشق اور جنسِ لطیف معشوق ہے اور ہندوستان میں قضیہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ ایران کی سرزمین ہمہ تن حسن و رنگینی ہے۔ اور جغرافیائی حیثیت سے بھی بین العرب والہند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ صرف زبان میں تذکیر و تانیث کا فرق مفقود ہے بلکہ آغاز عہد شباب تک چہرہ کی ساخت میں بھی صنفی لطافت و خشونت میں امتیاز

کرنا دشوار ہے۔ لہذا اس دنیا میں آ کر عشق و محبت نے اور عموم اختیار کر لیا ہے اور زلف گرہ گیر کے ساتھ خطِ سبز بھی نگاہِ محبت کا مرکز بن گیا۔ یہ اختلاف آب و ہوا محض عاشق کی صنف تک محدود نہیں ہے بلکہ جذبات عشق کے ظہور کا انداز اور اظہار کا لہجہ فطری طور پر متفاوت ہے۔ عربی غزل میں آپکو مردانہ بلند آہنگی، خود داری اور استغنا کی شان ملیگی۔ برعکس اسکے ہندی تغزل صنف لطیف کی نزاکت، جذبات، عجز و نیاز، صبر و رضا، بیکسی و بیچارگی کی آئینہ دار ہے۔ ایران میں ذرا اعتدال کے ساتھ یہ دونوں انداز پہلو بہ پہلو ملیں گے۔ مگر یہاں تو تغزّل دو بالکل متضاد حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اگر شاعر کا موضوع سخن اسی عشق کا اظہار ہے جسکو جنونِ شباب کہتے ہیں تب تو غزل بداخلاقی کی آخری انتہا تک پہنچ جاتی ہے اور صنفی امتیاز تک مٹ جاتا ہے۔ اور اگر شاعر بلند نظر اور حسنِ مجرّد کا پرستار ہے تو وہ ایک فطرت پرست فلسفی یا خدا پرست صوفی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ فارسی غزل گوئی کی بنیاد ابتداً تصوّف کے مبارک ہاتھوں نے ڈالی۔ ایران میں غزل کو ایک مستقل صنف نظم کی حد تک پہنچایا وہ حضرت مولانا روم ہیں۔ اس کے بعد شیخ سعدی شیرازی نے فارسی غزل گوئی کو سوز و گداز، صفائی، برجستگی، درد اور تاثیر کی اس حد تک پہنچا دیا جس پر آجتک بھی کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ سعدی کے رنگ کو امیر خسرو نے وجد و شوق کا اضافہ کر کے اور بھی چمکا دیا۔ یہاں تک کہ خواجہ حافظ شیراز سوزش و سرمستی کا چھینٹا دے کر اس شراب کو دو آتشہ کر دیا اس سے آگے ترقی کا امکان نہ تھا۔ اور غزل کی دنیا محدود تھی اس لئے اب ارباب کمال نے دوسری کروٹ بدلی اور بابا افغانی اور ان متبعین نے پیرایۂ بیان میں جدت پیدا کر کے ایک طرزِ نو ایجاد کیا۔ بعد کو حکمت، فلسفہ، پند و موعظت حقائق و اسرار کے نکتے بھی غزل ہی کی زبان میں ادا کئے جانے لگے۔ غرضیکہ معنوی حیثیت سے غزل اس صنف نظم کا نام ہے جسمیں بلا ترتیب و تخصیص دنیا بھر کے سارے مضامین یہاں تک کہ فسق و فحاشی سے لیکر عالم ملکوت کے اسرار تک ایک ہی نظم کے مختلف اشعار میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اب آیئے حقیقت صوری پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ میرے خیال میں جہاں تک ہیئت ترکیبی کا تعلق ہے تمام اصناف نظم میں غالباً غزل کا موزوں کر لینا سب سے زیادہ آسان ہے۔ صورت ظاہری کے اعتبار سے قطعات و قصائد بھی غزل کے ہم شکل ہیں مگر اول الذکر اصناف میں خیال کا تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے اور غزل میں اس سے بھی آزادی ہے۔ ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کے اعتبار سے آپ ایک غزل کے اشعار کو ایک ہی نظم کے اجزائے ترکیبی

کہہ لیں۔ مگر حقیقتاً ایک غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مستقل دنیا ہے اور ماسبق کو مابعد کے ساتھ کسی ربطِ معنوی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ایسی غیر مربوط گفتگو نثر میں کی جائے تو یقیناً متکلم کو مجنوں سمجھا جائے گا۔ لیکن یہی مجذوب کی بڑ تغزل کا معیار ہے۔ دوسری آسانی غزل میں یہ ہوتی ہے کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کسی خیال کا موجود رہنا ضروری ہی نہیں ہے۔ قافیے کے اعتبار سے وہی خیالات جو کئی ہزار بار ادا کئے جا چکے ہیں تھوڑے سے لفظی ردّ و بدل کے ساتھ دوہرائے جاتے ہیں طرحی مشاعروں کے رواج نے ایجادِ مضمون کی زحمت بھی رفع کر دی۔ ایک مصرعۂ طرح مل گیا۔ قافیہ اور ردیف متعین ہے۔ آٹھ دس قوافی اکٹھے کر لئے اور کسی طرح باندھ دیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے۔ سانچہ پہلے سے موجود ہے۔ مسالہ بنا بنایا تیار ہے۔ بس ڈھال دینا شاعر کا کام ہے۔ البتہ جتنی مشق بڑھی ہوتی ہے۔ ڈھلائی اتنی ہی صاف ہو گی۔ جو شعرا بازاری بول چال اور روزمرّہ پر جان دیتے ہیں وہ چاوڑی اور چاندنی چوک کے محاورے بقدر استعداد نظم کر دیں گے اور جو ذرا بلند مذاق رکھتے ہیں وہ فارسی ترکیبوں میں ادائے خیال کریں گے۔ اس طرح تھوڑی سی کاوش کے بعد یہ ادنےٰ فرق مراتب ہر موزوں طبع انسان شاعری کا مدعی بن سکیگا۔ اب ہزاروں بلکہ لاکھوں میں کہیں دو چار ایسے ہوں گے جو مخصوص فطری استعداد لے کر آئینگے اور یا تو غیر معمولی صفائی، برجستگی اور روانی کی بنا پر شہرت حاصل کریں گے، جیسے مرزا داغ دہلوی اور ریاض خیرآبادی مرحوم یا ندرتِ ادا، زورِ بیان، بلندیٔ خیال اور دقت آفرینی میں امتیاز پیدا کریں گے جیسے قدما میں غالب اور مومن اور دورِ جدید میں فانی و اصغر وغیرہ مگر یہ دونوں بزرگ افراط و تفریط سے خالی نہ تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل الذکر مذاق کی نقالی نے ابتذال، سوقیت اور فحاشی کی اشاعت کی۔ بہرحال غزل کی بدولت اُردو زبان میں ایک بے معنی دفتر مرتب ہوتا جا رہا ہے۔ جو بقول خواجہ شیراز غرقِ مئے ناب ہونے کا مستحق ہے۔

ہمارے لٹریچر میں صنفِ غزل کی یہ ہردلعزیزی طرحی مشاعروں کی یہ دبائے عام اور عام غزل گو شعرا کی یہ غیر معمولی فراوانی اس وجہ سے نہیں ہے۔ کہ غزل بجائے خود ادبی حیثیت سے کوئی زیادہ قابلِ قدر اور ممتاز صنفِ نظم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جذباتِ شباب کا حیوانی پہلو جو غزل کا مایۂ خمیر ہے فطرتِ انسانی کی ایک ضروری اور عالمگیر کمزوری ہے جس سے

کوئی رند و پارسا محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک سبب غزل کی مقبولیت کا ہو سکتا ہے۔ لیکن انہیں جذبات کا اظہار مثنوی، مسدس اور دوسرے اصنافِ نظم میں بھی تو ممکن ہے۔ پھر محض غزل کی یہ شہرت کیوں؟۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہی قسم نظم ہر شخص کے بس کی ہے۔ آج اگر آپ ایک مصرعۂ طرح مشتہر کر دیں تو ایک معمولی قصبے میں بھی اتنے شعرا جمع ہو جائیں گے کہ پورے ۲۴ گھنٹے بھی غزلخوانوں کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ اور ہر مبتدی اپنے ہاتھ میں ایک دفتر لئے اکھاڑے میں کرتب دکھانے کے لئے بیتاب اور مچھّروں کی طرح اپنا نغمہ سنانے پر مُصر نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے بجائے ایک یا چند عنوان نظم کے دے دیں۔ اور مضامین بھی وہی ہوں جو غزل کے موضوعِ جان ہوتے ہیں۔ تو بھی شاید ایک دو سے زائد شعرا آپ کو کسی بڑے سے بڑے شہر میں نہ ملیں گے اور اگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی جائے کہ مثنوی مسدس یا مستزاد کی شکل میں نظم کی ترتیب دینی ہو گی۔ تو ایک دو بھی شاید زحمت نہ فرمائیں۔ یہ خصوصیت کچھ آج ہی نہیں ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ ایران میں بھی تخمیناً سات سو برس کے اندر صرف چند باکمال شعرا مثنویاں لکھ سکے۔ اور ہندوستان میں تو مثنوی گویوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ لیکن غزل گویوں کی محض فہرست مرتب کی جائے تو بجائے خود ایک بارِ شتر سے کم نہ ہو گی۔ عرفی جیسے باکمال کے لئے کہا گیا ہے

مثنویش زنگِ فصاحت نداشت ٭ کان نمک بود و ملاحت نداشت

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوالفضل کو عرفی کے بارے میں یہ کہنا پڑا، "غنچہ استعدادش نشگفتہ پژمرد"۔ اس موقعہ پر کہا جا سکتا ہے کہ سہولتِ نظم فی نفسہٖ کون سا عیب ہے کہ وجہِ شکایت ہو۔ اور نظم کی دشواری کون سا ہنر ہے کہ قابلِ تعریف ہو۔ اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ غزل گوئی کی اس سہولت اور رواج نے زبانِ اُردو کی ترویج میں جو مدد دی ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن شاعری یعنی قافیہ سنجی کون سا ایسا کمال ہے کہ سرستانِ ازل کے سوا ہر کس و ناکس کو اس میکدہ میں بادہ پیمائی کی دعوت دی جائے اور ایسی ہی سہولت پسندی ہے تو کیوں نہ انگریزی کی طرح نثر مرجز یعنی نظم غیر مقفیٰ کو رواج دیا جائے۔ بہرحال سہولتِ نظم کو ہنر اُسوقت قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ اس سے اور نقصانات پیدا نہ ہوں اور غزل گوئی نے اُردو ادب کو وہ عظیم الشان نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں ممکن نہیں

ایک طرف تو اس غزل گوئی کی بدولت روز بروز ایک نحیف اور گندے لٹریچر کا انبار لگتا جاتا ہے۔ اور تخریب اخلاق کے لئے جو اولاً اسباب موجود تھے اُن پر ایک مزید محرک کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب قوم کے بہت سے افراد جن کو قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا محض موزونی طبع کے دھوکے میں اپنے آپ کو فطری شاعر سمجھ کر وقت ایسی قیمتی چیز کو شاعری جیسے بیکار شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔ کاش یہی وقت کسی تصنیف تالیف یا دوسرے کارآمد اور مفید شغل میں صرف ہوتا۔

ان نقصانات کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہے وہ یہ ہے کہ شعرا اور ادبا کی دماغی صلاحیت اصول فطری کے مخالف چل کر ضائع ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر یہی سلسلہ کچھ دنوں تک قائم رہا تو بہتر لٹریچر پیدا کرنے کی قابلیت آئندہ نسلوں سے مفقود ہو جائے گی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظ محض ادائے معنی کا ذریعہ ہیں نہ کہ تخلیق معانی کا سبب۔ اس لئے بلحاظ ترتیب محل انسانی دماغ میں پہلے آنا چاہیئے۔ پھر اس کے لئے موزوں عبارت اور موثر پیرایۂ بیان تلاش کرنا چاہیئے جس طرح ایک مصوّر پہلے اپنے دماغ میں تصویر کے تمام خط و خال کو متعین کرنے کے بعد تصویر بناتا ہے اور مناسب رنگ بھرتا ہے۔ یا ایک افسانہ نگار قصّہ کے تمام پلاٹ اور تفصیلات کو ذہن کے سامنے رکھ کر افسانہ مرتب کرتا ہے۔ اسی طرح شاعر کا فرض ہونا چاہیئے کہ پہلے ایک خیال کو معہ اس کی ضروری تفصیلات اور اجزائے ترکیبی کو اپنے ذہن میں متعین کرے۔ اور پھر اس خیال کی مناسبت سے وزن بحر اور صنف نظم کا انتخاب کرے۔ مثنوی اور مسدّس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہاں یہ طریقِ عمل ناگزیر ہے۔ لیکن غزل میں اُلٹی بہائی جاتی ہے۔ یعنی قافیہ سے پہلے دماغ میں آتا ہے۔ پھر اس قافیہ کا چراغ ہاتھ میں لے کر اندھیرے میں مضمون ٹٹولا جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے ہاتھ لگ گیا تو اکثر شعرا پہلے مصرعۂ ثانی مرتب کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس مصرعۂ ثانی سے عقد نکاح کے لئے موزوں جوڑا مصرعۂ اوّل کا تلاش کرتے ہیں جو کبھی نصیب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں غزل گوئی کی وہ دنیا ہے جہاں لفظ اپنے لئے معانی کی تلاش کرتا ہے۔ یہ طریقہ خلاف فطرت ہونے کے علاوہ اتنا مصنوعی ہے کہ ہرکس و ناکس تھوڑی سی محنت کے بعد شاعر ہو جاتا ہے۔ اب حقیقی شعرا اپنا امتیاز قائم کرنے کے لئے ایک قافیہ لے کر پہروں کیا مضمون تلاش معانی میں سرگرم رہتے ہیں اور عامۃ الورود خیالات مسترد کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی جدید مضمون ہاتھ آ گیا تو فہو المراد۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو انہیں فرسودہ خیالات کو دلکش ترکیبوں یا جدید اسالیب بیان کے ذریعہ سے جدّت کا رنگ دیتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ خیال کافی وسیع ہے اور بحر چھوٹی جس میں پوری بات سما نہیں سکتی۔ تو اب دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو کبھی اشارات وغیرہ کے ذریعہ سے کسی حد تک کامیاب ہوتی ہے اور کبھی "معنی الشعر فی بطن الشاعر" کا مصداق بن جاتی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ جسطرح معمولی غزلیں کہہ لینا آسان ترین کام ہے اسی طرح عام سطح سے بالاتر اور ممتاز غزل گوئی حد درجہ مشکل ہے جو ۹۹ فیصدی مدعیان شاعری کے امکان میں نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں صرف معدودے چند اس کڑی کمان کو زہ کر سکتے ہیں۔ مگر ان حضرات نے اظہار کمال کے اس طریقہ سے جتنا فائدہ اس لٹریچر کو پہنچایا ہے اس سے زیادہ اپنے دماغ پر ظلم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چنے کی دال پر سورہ اخلاص معہ بسم اللہ و نام کاتب لکھنے کی سعی لاحاصل ہے۔ اچھے اچھے خوشنویسوں کی بھی صلاحیت کتابت جاتی رہتی ہے اور تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی چکّر میں عمر گذار دینے سے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔ اس طرح بہت سے بہترین دل و دماغ ضائع ہو گئے اور ضائع ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر اس مدت العمر کی جگرکاری اور ضیاعِ وقت کے بعد جو سرمایہ ہاتھ آتا ہے وہ صفر کے برابر۔ آپ غالبؔ سے لے کر موجودہ عصر کے کسی بہتر سے بہتر غزل گو شاعر کا مجموعہ کلام اٹھا لیں۔ اور خیالات کے اعتبار سے اشعار کی فہرست مرتب کریں۔ اور جن خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ان کو یکجا کر دیں تو غالباً عنوانوں کی تعداد کہیں بھی پچاس تک نہ پہنچے گی۔ اب سخن فہم طبقہ کو لیجیئے۔ تو وہ بھی اس طرز شاعری کے اثر بد سے محفوظ نہیں ہیں۔ جس طرح تیز مرچوں کا عادی سادہ اور لطیف غذائیں پسند نہیں کر سکتا۔ اور افیونی کو چسکی لئے بغیر چین نہیں پڑتا اسی طرح ہمارے سخن فہم حضرات جو بیدلؔ و غالبؔ کے دلدادہ ہیں۔ ان کو سادہ اور لطیف نظموں میں مزہ نہیں آتا۔ اور غزل جیسی ادنیٰ ترین صنف نظم کو کمال شاعری کا معیار قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک تو جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ خواص سے متعلق تھا۔ عام شعرا و سامعین کا تو ذکر ہی کیا

وہاں تو محض قافیہ پیمائی کا نام شاعری ہے۔ مشاعروں میں داد بھی اسی طرح کی دی جاتی ہے۔ سبحان اللہ گریبان آپ ہی کا حصہ ہے۔ بسمل کا قافیہ تو آپ نے اپنا کر لیا۔ واہ کیا ردیف کھپائی ہے وغیرہ وغیرہ اب سے کچھ پیشتر تو سب سے بڑا کمال یہی تھا۔ کہ مشکل طرحوں میں غزلیں کہی جائیں اسی بد مذاقی کا نتیجہ تھا کہ بلغ قافیہ کے ساتھ (رسے دوہ اور شکستہ پر) کا دُم چھلا بطور ردیف لگا کر غزل کہی گئی۔ یا شراب میں سانپ۔ جوڑا سانپ کا۔ قفس کی تیلیاں جنگل دوش پر۔ زحل کی مکھی۔ تصویر پشت آئینہ وغیرہ وغیرہ مہملات سے دواوین پُر کیے گئے۔ اس تمہید کا یہ مدعا نہیں ہے کہ میرے نزدیک غزل یکلخت قابلِ ترک چیز ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ طرحی مشاعروں کو قطعاً بند کر دینا چاہیئے۔ اور غزلیں اگر کہی جائیں تو اس طرح کہ یا تو کوئی مکمل خیال پیشِ نظر رکھ کر ایک مسلسل غزل کہی جائے تا کہ تصویر کے تمام ضروری پہلو سامنے آجائیں یا منفرد حکیمانہ خیالات کو لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختصر غزلوں میں یکجا کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہ ہو کہ فلسفہ سائنس یا تصوف کی مصطلحات و مبادی کو یکجا نظم کر دیا جائے بلکہ اسرار و حقائق و سیاست کو گل و بلبل کی داستان اور حسن و عشق کا افسانہ بنا کر پیش کیا جائے اور اگر کوئی خاص پہلوئے بلاغت پیشِ نظر نہیں ہے تو حتی الوسع پیرایۂ بیان سہل اور سادہ رکھنا چاہیئے۔ خیر یہ تو آئندہ کے لئے محض ایک تمنا ہے جس کا وجود میں آنا کسی ایک فردِ واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔ نہ اصول نفسیات کے مطابق فوری اصلاح ممکن ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ میں تدریجی طور پر غزل کی جو اصلاح ہو رہی ہے بہت کچھ قابلِ قدر ہے۔ اور اس میں سب سے زیادہ حکیم مومن خاں مرحوم کے سلسلے یعنی اصغر علیخان نسیم دہلوی (اور ان کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی اور پھر اُن کے مشہور تلامذہ حسرت۔ فانی و اصغر کا ہے۔ یہ حضرات تو کچھ اُستاد کی صحت مذاق اور زیادہ تر اپنی فطری استعداد کی بدولت عام بدمذاقی سے علیٰحدہ رہ سکے۔ پھر بھی حسرت کے ابتدائی کلام میں معاملہ بندی اور فانی کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں میت و جنازہ کی کثرت خواہ وہ کسی حد تک لطیف کیوں نہ ہو غلط ماحول کے نتائج اور قابلِ حذف عناصر ہیں۔ بہر حال فانی و اصغر تو پھر تغزل کے مہرو ماہ ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں موجد طرز کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بھی اچھی خاصی تعداد ان غزل گو شعرا کی ہے جنہوں نے قدامت پر جدت کا رنگ چڑھا کر اور عام شاہراہ سے الگ ہو کر اچھا خاصہ نمونہ غزل گوئی کا پیش کیا ہے۔ مثلاً جگر مراد آبادی۔ بیخود موہانی۔ مرزا جعفر علیخاں اثر۔ جوش ملیح آبادی۔ مرزا یاس عظیم آبادی۔ عیاں میرٹھی اور یادش بخیر حضرت دل شاہجہان پوری۔

ضمیر الحسن خاں صاحب دل شاہجہان پوری اپنے تخلص کی طرح اردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ پھر بھی "آنکھیں دکھانے والے" سے وہ الگ باندھ کر رکھا ہوا مال دکھانے کی تمنا نہیں کرتے! آپ کا پورا دیوان اس طرح کی عُریانیِ مذاق سے مبرّا ہے۔ کہیں کہیں قدیم رنگ کی جھلک ضرور ہے۔ مگر اتشٰی کا المعدوم اور جتنی بھی ہے وہ ابتذال سے خالی اور رکاکت سے پاک۔

حضرت دل کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال مذاق ہے۔ صفائی سلاست اور برجستگی کے ساتھ کہیں کہیں لطیف فارسی ترکیبیں بھی آتی ہیں۔ صحت زبان کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ خیالات نہ تو عامیانہ ہیں۔ نہ اس قدر دقیق و عمیق کہ پتہ نہ چل سکے۔ بلندی ہے مگر اسی حد تک کہ ہر شخص دیکھ سکے۔ اتنا اونچا اڑنا پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کو دوربین لگانی پڑے۔ حسن و عشق کی داستان میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور شاذ و نادر فلسفہ و حکمت کے اشارات بھی ملتے ہیں۔ سوز و گداز، سوزش و سرمستی سبھی کچھ ہے۔ مگر اتنی ہی جیسی دال میں نمک۔ دیوان سے کچھ اشعار سرسری انتخاب کے بعد پیش کئے جاتے ہیں۔

نغمۂ دِل کا انتخاب

کسی کی رہگذر میں جان دینے کا یہ حاصل ہے
کہ ہر عشرت کدہ میں ہو رہا ہے آج غم میرا

نارسائی کا سبب کیا ہے یہی جوشِ طلب ؛ بڑھ گئے ہم اسقدر آگے کہ رہبر رہ گیا

قفس میں بھول گیا ہمکو لطف آزادی ؛ خیال تک نہیں آتا اب آشیانے کا

ملگئی راحت ہمیشہ کیلئے نیند آگئی ؛ چارہ گر رخصت ہوئے بیمار اچھا ہوگیا

خوشا قسمت کہ رخصت ہوگئی جانِ حزیں پہلے ؛ کوئی کہتا خدا حافظ تو اک محشر بپا ہوتا

یہ جنوں بھی ہو شاملِ حالاتِ مصیبت ؛ اُن سے نہ سُنا جائیگا افسانہ کسی کا

کہتے ہیں لوگ حضرتِ دل بھی ضمیرؔ کو ؛ یہ دوسرا ہے نام اسی بیقرار کا

گو کوچۂ بتاں میں صدمے اُٹھائے پیہم ؛ لیکن مری زباں پر قسمت ہی کا گلا تھا

چند آبلہ پا وحشی کہتے ہوئے گذرے ہیں ؛ کانٹا کوئی صحرا کا بیکار نہیں ہوتا

ہاتھ رکھکر وہ دل پہ کہتے ہیں ؛ اب نہ کہنا کہ بے قرار کیا

کیا سناؤں سرگذشتِ زندگیِ پُر الم ؛ آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا

میکش تو ہیں اندیشۂ امروز سے غافل ؛ واعظ کی ہے فردائے قیامت پہ نظر آج

بہارِ گل ہے کتنی فرحت انگیز ؛ جھکی پڑتی ہیں شاخیں آشیاں پر

اُفنے جنوں کا جوش کہ تلووں کے آبلے ؛ دیوانہ وار ٹوٹ پڑے نوکِ خار پر

کیا ہی اُس اقرار کا مطلب اے حسرت نصیب ؛ مسکرا کر وہ یہ کہتے ہیں ضرور آئیں گے ہم

مجھے در پہ جو دیکھا بول اُٹھے اے دل وہ درباں سے
یہ کیا کہتے ہیں، کیا مطلب ہے، کیوں بیکار بیٹھے ہیں

تجھے یاد وعدہ فراموش مری جان نثار ؛ ہاں پھر اکبار یہ کہدے کہ مجھے اب یاد نہیں

دفعتاً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد ؛ ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

اب یہ صورت ہے دلِ زار کے بہلانے کی ؛ ذکرِ ناکامیِ اربابِ وفا کرتے ہیں

وہ اک پیامِ اجل تھا مریضِ غم کے لئے ؛ کسی کا آہ یہ کہنا خدا کو یاد کرنا

ہے جنوں میں بھی لطافت کا خیال ؛ خاک صحرا آج چھانی جائے گی
سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار ؛ سچ کہوں گا جھوٹ مانی جائے گی

دل کی اُمید بر نہیں آتی ؛ ہمکو آتی نظر نہیں آتی
عالمِ خواب میں بھی وہ صورت ؛ نظر آتی نظر نہیں آتی
تھی اجل کی امید حضرتِ دل ؛ وہ بھی آتی نظر نہیں آتی

حیرت میں ہوں کشاکشِ اُمید و بیم سے ؛ طاقت سکوت کی ہے نہ جرأت سوال کی

حرم بھی اہلِ طلب کا ہی اک مقامِ تلاش ؛ ادھر بھی ہم نکل آئے ہیں جستجو کرتے

اک بیخبریِ ہوش کا عالم ہی جدا ہے ؛ نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے

ہم نہیں ہجر کی شب بھی تنہا ؛ درد اُٹھتا ہے غش آجاتا ہے

آج تک وہ نظر نہیں آئے ؛ دوستی اُن سے غائبانہ ہے

محفل تری اے ساقی میخواروں کی جنّت ہے
رنگینیِ ساغر سے رعنائیِ مینا سے

قدیم بابلیونکی یادگار

فرقہ صابیہ

(از جناب سید رشید احمد صاحب ارشد مولوی فاضل و منشی فاضل)

یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ قدیم زمانے کا فرقۂ صابیہ عراق عرب میں ابھی تک موجود ہے مگر امتداد زمانہ سے یہودیت عیسائیت اور اسلام کے اثر سے یہ مذہب کسی قدر ان مذاہب کے مخلوط عقائد کا مجموعہ بن گیا ہے لیکن معاشرت و تہذیب اور دیگر امور میں یہ ان سے بالکل الگ ہے۔

ان لوگوں کا اصلی نام "ماندین" ہے۔ اور ان کی زبان نہایت پرانی ہے جو قدیم سریانی زبان سے کسی قدر مشابہ ہے۔ مختلف عالموں نے اس زبان کو سیکھنے اور ان لوگوں کے مذہب و لٹریچر پر عبور حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر زیادہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ان کا لٹریچر طبع شدہ نہیں ہے۔ بلکہ نایاب قلمی نسخوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اور ہر شخص ان کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

جرمن کے مشہور مستشرق پیٹرمین نے ان کے لٹریچر کو ان کے علاقے میں دو سال رہ کر حاصل کیا تھا۔ اور موجودہ زمانے میں "ماندی" لٹریچر کے وہ سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ گو ان کے مذہب کی کتابیں اور دیگر مذہبی لٹریچر "ماندی" زبان میں ہے۔ لیکن اُن کے روزمرہ بول چال کی زبان عربی ہے۔

سترھویں صدی میں اس فرقہ کی تعداد بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی مگر جنگ عظیم کے بعد ان لوگوں کی تعداد گھٹ کر تین ہزار نفوس رہ گئی ہے اور یہ سب آبادی عراق عرب ہی میں ہے۔ بغداد میں ان کی کافی تعداد آباد ہے۔ لیکن زیادہ تعداد "سوق الشیوخ" میں مقیم ہے۔ چونکہ مذہباً انہیں پانی کے قریب رہنے کا حکم ہے اس بنا پر وہ دریا سے دور دراز علاقوں میں آباد نہیں ہوتے۔ ان کی تعداد میں روز بروز کمی واقع ہونے کی سب سے بڑی وجہ خانہ جنگیاں ہیں۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ سے ان کی عورتیں مسلمانوں کے حلقۂ ازدواج میں آ رہی ہیں۔ اور بتدریج مسلمانوں میں مخلوط ہونے کی وجہ سے ان کی اصلی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔

معاشرت

ان لوگوں نے یہ تین پیشے اختیار کر رکھے ہیں۔ چاندی کا کام۔ کشتی سازی۔ دباغت یعنی کھال رنگنا۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کی کشتی تیار کرتے ہیں جو "مشحوف" کہلاتی ہے۔ چاندی کے کام میں ان کی ہنرمندی بہت مشہور ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے ہر صابی مرد و زن نہایت دلکش اور حسین ہے اور ظاہری شکل سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ شخص صابی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ سکھوں کی طرح یہ لوگ اپنے بال نہیں ترشواتے۔ مرد مذہباً سیاہ کپڑے نہیں پہن سکتا۔ اسی طرح ان کی عورتیں بھی نیلے رنگ کی کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتیں۔

مذہب

ان کا مذہب عجیب و غریب قسم کا ہے۔ یہ قدیم بابلی ستارہ پرستی۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے عقائد سے مخلوط و مرکب ہے

یہودیت سے اُنہوں نے قربانی کی رسم لی اور مسیحیت سے عشاء ربانی اور یوحنا بپٹسٹ (حضرت یحییٰ) کی تعلیم کا خیال اخذ کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کی کئی چیزیں ان کے مذہب میں داخل ہیں۔

ان کی سب سے بڑی کتاب "سدرہ ربا" ہے۔ اس میں ان کے مذہب کے اصول مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ جابجا مختلف و متضاد باتیں بھی نظر آتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی تھی۔ یہ بہت نادر اور نایاب کتاب ہے۔ مختلف مستشرقین اور دیگر فضلاء نے اس کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس نسخے کی ایک نقل صرف برٹش میوزیم میں ایک ناقص لاطینی ترجمے کے ساتھ موجود ہے۔

دوسری کتاب "الارواح" ہے۔ جس کے دو تہائی حصے میں زندوں کے لئے دُعائیں ہیں اور ایک تہائی حصے میں مُردوں کے لئے دُعائیں ہیں۔ اس کتاب میں حضرت آدمؑ کی موت کا واقعہ بھی درج ہے حضرت آدمؑ کو یہ لوگ بہت بڑا پیغمبر مانتے ہیں۔ تیسری ایک اور کتاب ہے۔ جس میں پجاریوں کے لئے ہدایتیں ہیں۔ علاوہ ازیں چند رسالے بھی ہیں۔ جن میں سے کچھ رسائل علم نجوم سے متعلق ہیں۔ اور چند رسالوں میں شادی نکاح کی رسومات مندرج ہیں۔ ایک رسالہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

عبادت گاہیں

ان کے عبادت خانے اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان میں صرف دو یا تین پجاریوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ان معابد کے بیچوں بیچ چھوٹی نہریں یا ندیاں جاری رہتی ہیں۔ ان ندیوں کے پاس دُعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں صرف ایک الماری ہوتی ہے جس میں مذہبی کتابیں اور ضروری سامان رکھا جاتا ہے۔ یہاں عورتیں اور مرد دونوں پوجا پاٹ کر سکتے ہیں۔ عورت کے پجاری بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ کسی پجاری مرد سے شادی شدہ ہو۔ یہ لوگ مختلف سیاروں کو برائیوں کا منبع خیال کرتے ہیں۔ مگر قطبی ستارہ کو وہ جنت کے قریب سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں

ہر اتوار کو بپتسمہ کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

گزشتہ تاریخ

یہ فرقہ قدیم زمانے میں بڑی شان و شوکت رکھتا تھا۔ شام و عراق کے وسیع علاقوں میں اسی کی آبادی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نمرود کی قوم اس فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جو طوفانِ نوحؑ کے بعد عالم وجود میں آئی۔ آثار و قرائن سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ اور قرآن مجید بھی جابجا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ صابیوں کا ذکر آیا ہے جو اس بات کی قوی شہادت ہے کہ بہت عرصے تک یہ فرقہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ خود اسلامی عہد میں اس قوم کی کئی نامور ہستیاں فلسفہ، ریاضی اور علم نجوم کی ماہر تھیں۔ خلفاء عباسیہ کے عہد میں حرّان ان کا مرکز تھا۔ اور اس زمانے میں ثابت بن قرہ الصابی اور سنان بن ثابت جیسے نامور حکماء اور فلاسفر اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہمیشہ خلفاء اسلام کی طرف سے ان پر انعام و اکرام کی بارشیں برستی تھیں اور یہ اسلامی خلفا کی رواداری اور مہربانیوں کا نتیجہ ہے کہ اب تک اس فرقے کی قومی زندگی فنا نہیں ہوئی۔ آج کل بھی حکومت عراق نے اقلیت کی حیثیت سے اُنہیں بہت سی رعائتیں دے رکھی ہیں۔

اِنکسار

(از جناب رعنا اکبر آبادی)

آفاق میں یادگار ہوتا ہے وہی
ہاں قابلِ اعتبار ہوتا ہے وہی
دولت کے ہنر کے علم کے ساتھ جو ہو
حق یہ ہے کہ انکسار ہوتا ہے وہی

مؤثر شاعری

جملہ انشائیہ بمقابلہ جملہ خبریہ

از جناب پیر محمد عبد اللہ صاحب نثار منشی فاضل

فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ دُنیا میں دو چیزیں حیران کُن اور تحیّر زا ہیں۔ پہلی چیز نبضِ انسانی کہ بغیر بولے باطن کا حال بیان کرتی ہے اور دوسری چیز شعر، کہ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے ایسی موزوں عبارت بن جاتی ہے۔ کہ سُنتے ہی ایک عجیب تاثیر کے ساتھ دل میں اُتر جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شعر کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہوئی ہے۔ وہ اِس طرح کہ جب قابیل کے طفیل حضرت آدم کو صدمہ پہنچا اور دل پر غم چھا گیا۔ اُس وقت گداز طبیعت سے جو کلام نکلا وہ موزوں تھا چنانچہ وہ سُریانی زبان میں اب تک موجود ہے۔

شعراء کہتے ہیں جو کلام مؤثر ہو۔ بغیر تاثیر کے کلام موزوں یا منظوم تو جسدِ بے روح ہے۔

شعر ایک پھول کی طرح ہے۔ جیسے پھول مختلف نوع اور اقسام کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اشعار بھی گوناگوں طرز کے ہوتے ہیں پھول میں بھی کسی کی بُو تیز ہے، کسی کی مست اور کسی کی بُو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن ہے۔ اِسی طرح مضامین شعر کا حال ہے مختلف رنگوں میں باندھنے سے مختلف کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

موسیقی اور الفاظ کے لحاظ سے اشعار کے اقسام اور محاسن کو چھوڑتا ہُوا میں معنوی لحاظ سے اشعار کی جو دو موٹی اقسام ہیں اُن کا بیان کرتا ہوں۔ اِس بحث کو سمجھنے کے لئے گرامر کے چند موٹے اصول ذہن میں آنے ضروری ہیں۔

جملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جسے سچّا یا جھوٹا کہہ سکیں اِسے جملہ خبریہ کہتے ہیں مثلاً ؎

میرؔ اِن نیم باز آنکھوں میں ٭ ساری مستی شراب کی سی ہے

دوسرا جملہ انشائیہ جسے سچّا یا جھوٹا نہیں کہہ سکتے مثلاً ؎

بستی ہمہ بربادی صحرا ہمہ آبادی ٭ یہ عشق کی دُنیا ہے کیا عشق کی دُنیا ہے

آگے جملہ انشائیہ کی بھی اقسام ہیں۔

(۱) امر جیسے
اک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں
مینا بدوش آنکھیں ساغر بکف نگاہیں

(۲) نہی ؎ رو کئے اپنی مست نظروں کو ٭ ساری دُنیا خراب ہوتی ہے۔

(۳) استفہام ؎
کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!

(۴) تعجب ؎ شیخ اللہ رے تیری عیاری ٭ کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

(۵) تحسین ؎ نہ اک آہ کی زخم سو سو اُٹھائے ٭ تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے۔

(۶) انبساط ؎
ہاں کیفِ بے خودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

(۷) ندا ؎ نہ کرو اب نباہ کی باتیں ٭ تم کو اے مہرباں دیکھ لیا

(۸) ندبہ و تلہف ؎ رہنے دو جو ہوا سو ہوا ٭ عہدِ ماضی پہ تبصرہ نہ کرو

(۹) قسم ؎
اگر مجھے نہ ملیں تم! تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا

(۱۰) عرض ؎
حُسن محشر ہے مگر اک محشرِ خاموش ہے
عشق محویت ہے لیکن پھر سراپا جوش ہے

(۱۱) تمنا ؎

کیا تمھیں بتاؤں جو میری آرزو تھی
اب کیا کروگے سُن کے جو میرا مدعا ہے

حاصل مدعا یہ ہے کہ شاعری میں خبر سے زیادہ انشا میں لُطف ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس کی اقسام بھی لُطف سے خالی نہیں۔ خاص کر قسم استفہام تو سراپا محاسن سخن سے پُر ہوتی ہے۔ اس کی تائید میں میں چند امثال حوالۂ قلم کرتا ہوں

؎ تلاطم کیوں نہیں آتا خدا کے بحرِ رحمت میں ٭ گناہوں کی ندامت سے مرا دل پانی پانی ہے

؎ مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح ٭ میں اک روز مر جاؤنگا یہی نا۔

؎ کسکو سلام کیجئے کس کا مزاج پوچھئے ٭ اپنی اداہیں ہر ادا ناز ہے اپنے ناز میں

؎ توبہ! میخانہ میں ناصح کی کہاں گنجائش ٭ ایک محدود سی دنیا ہے گنہگاروں کی

مندرجہ بالا امثال کے علاوہ استفہام کی اقسام انکاری، استنجاری اور اقراری بھی اسی طرح لطیف اور حسین ہوتی ہیں ٭

غزل

(از جناب بزمی انصاری بی۔ اے)

پھر دلکشی ارزاں ہے اداؤں میں کسی کی
پھر آنے لگا لطف جفاؤں میں کسی کی

کچھ وہ بھی پریشاں سے نظر آتے ہیں اب تو
تاثیر جھلکتی ہے دُعاؤں میں کسی کی

کیوں سوز سے محروم ہوئی جاتی ہیں آہیں
لذّت ابھی باقی ہے جفاؤں میں کسی کی

تا حدِ نظر نور کا دریا سا رواں ہے
جلوے وہ سمائے ہیں قباؤں میں کسی کی

لذّت کشِ آزار دلِ زار ہوا ہے
کیا بات ہے آخر کو جفاؤں میں کسی کی

آنکھوں سے مری کیوں نہ بہیں خون کے آنسو
شک ہے دلِ غمگیں کو وفاؤں میں کسی کی

ہر شعر غزل کا مری رنگین ہے بزمیؔ
رعنائیاں ایسی ہیں اداؤں میں کسی کی

پانچ ہزار روپے کا چیلنج

آجکل نقلی اور جعلی عامل حکیموں اور جوتشیوں کی وہ کثرت ہے کہ توبہ ہی بھلی پبلک بھی سچی ہو کسی پر اعتبار آئے تو کیونکر جب کہ بقول پاکرک یا کاتب یا مدرس کا اپنے پیشہ میں کام نہ چلا تو جھٹ خواہ مخواہ کے پیر اعامل یا جوتشی بن بیٹھے۔ ان میں بعض ایسے بھی اشتہار باز ہیں جنکو اشتہار کا مضمون لکھنا بھی نہیں آتا۔ پبلک کو انکی دغا بازی کا تب علم ہوتا ہے جب وہ ان کے مسخرہ خیز تعویذات یا جوتش کو دیکھتی ہے۔ غرضیکہ اس علم و عمل کی اچھی طرح مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ پبلک جس قدر بے اعتباری ظاہر کرے بجا ہے۔ دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ ہم نے عرصہ ۲۰۰ برس سے اس علم و عمل کو شہرت دی جس کا ثبوت ہندوستان کے قدیم اخبارات کی فائلوں اور ہمارے پاس لاتعداد تعریفی خطوط سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا ہنر کہ جس کی بدولت ہے کہ سوائے نیک نامی اور داستی کے کبھی فروغ نہیں پا سکتا۔ دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ آپ جہاں کہیں میرا نام کا ذکر کریں گے انشاء اللہ تعریف کے ساتھ ہی یاد کیا جائیگا۔ آپ ایک مرتبہ تشریف لا کر آزمائش کریں۔ اگر آپ بوجہ آنے سے معذور ہیں تو خط و کتابت جوابی سے مشورہ لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میرے مقابلہ میں اپنے اشتہار کو سچا ثابت کر دے تو

پانچ ہزار روپیہ وصول کر سکتا ہے

یہ روپیہ کسی بنک یا عدالت میں جمع کر دیا جائیگا

پس اگر آپ صحیح معنی میں کسی مصیبت یا مشکلات میں ہیں اور مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی بیماری ہے جس پر دوا اثر نہیں کر سکتی۔ حکیم و ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مرض سمجھ میں نہیں آتی یا کسی حاسد دشمن نے سحر وغیرہ کر کے مرض لگا رکھی ہے یا کسی مقدمہ سے پریشانی ہے یا کسی سے ناچاقی ہے۔ یا کاروبار گر رہا جاتا ہے۔ یا اولاد نہیں ہوتی یا ہو کر مر جاتی ہے۔ یا امتحان میں کامیابی نظر نہیں آتی۔ یا ملازمت میں ترقی کے لئے رکاوٹ ہے غرضیکہ کوئی بھی دنیاوی یا روحانی تکلیف ہے تو مشورہ لیں۔ فیس مشورہ ایک روپیہ چھ آنے

میرے محترم و معظم عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب کے متعلق معززین کے ارشادات:۔

جناب عامل حکیم کریم الدین صاحب۔ السلام علیکم۔ میری بیوی عرصہ ایک سال سے بیمار تھی۔ علاج ڈاکٹری و یونانی ہر قسم کیا گیا۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مریضہ کی دو ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ میں علوم شیرازی صاحب کو ملا اور حالات بتلائے۔ انہوں نے پانچ عدد اس سنایت کیں اور طریقہ استعمال بتلایا۔ کیا عرض کروں پہلی ہی بتی سے مریضہ کی ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ یہ ایک عملیات کا معجزہ ہے جس سے خاص علاقہ میں ہر چہار طرف ان جادو عمل بتیوں کا شہرہ کر دیا۔ میں نے تقریباً ایک صد سو روپیہ مریضہ پر خرچ کیا تھا۔ اور مایوس ہو گیا تھا۔ مریضہ ہر وقت آپ کو دعائیں دیتی ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرما دیں۔ اور میرے حالات کو اگر مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے۔

(چودھری منظور حسین ذیلدار چک ۳۶ جنوبی براستہ سرگودہا)

جناب ہدایت اللہ صاحب گرداور شاہو ضلع پشاور سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں اٹھ نہ سکتا تھا۔ دوسرا آدمی سہارا دے کر اٹھاتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کو از حد درد رہتی تھی۔ آپکے کلام عملیات نے یہ صحت بخشی اور اب دور دور تک چلتا پھرتا ہوں۔

جناب شیخ عبدالقادر صاحب سانگلہ ہل سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں عامل صاحب سے ملا۔ دو تین سوالات کئے گئے۔ ان کا بالکل صحیح جواب ملنے پر میں بالکل حیران رہ گیا۔ میں کسی جوتشی یا عامل پر یقین نہ رکھتا تھا۔ حکیم صاحب کا علم دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس قدرت نے صحیح علم دیا ہے۔ پس اگر آپ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مثلاً بیماری پر دوا اثر نہ کرتی ہو۔ حکیم و ڈاکٹر سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یا کسی سے ناچاقی رہتی ہے۔ خواہ مخواہ دشمنی بڑھتی جا رہی ہے۔ یا میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار ہو رہے ہوں یا مقدمہ میں کامیابی چاہتے ہوں تو صرف ایک دفعہ تشریف لا کر مشورہ لیجئے۔ فیس مشورہ فی سوال ایک روپیہ۔ بذریعہ وی۔ پی چھ۔ خط و کتابت جوابی کریں۔

ملاقات کا وقت:۔ صبح ۹ بجے سے ۷ بجے شام تک۔

ملنے کا پتہ

عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی۔ انارکلی موڑ گنپت روڈ۔ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۱ — نمبر ۶

فہرست مضامین ماہ مئی ۱۹۳۹ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا۔

عالمگیر کا اگلا پرچہ سالانہ نمبر ہوگا۔ ذیل میں سالانہ نمبر کے صرف بعض معرکہ آرا مضمونوں، رومانی افسانوں اور رنگین نظموں کی ایک جھلک دکھائی جارہی ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرماسکیں گے کہ جون میں شائع ہونیوالا سالانہ نمبر عالمگیر کتنا بلند پایہ اور ہنگامہ پرور ہوگا:-

دلچسپ حقائق افروز مضامین

سیاسیات عالم پر ایک نظر (ایک دلچسپ سیاسی مقالہ جس کا مطالعہ مقتضیات وقت ہے) از شبلی بی کام

بادشاہوں کی باتیں (ظریفانہ کہانیاں) از جناب قریشی محمد عبداللہ صاحب بی-اے

راجر بیکن (یورپ کے سب سے بڑے فلسفی کے حالات) از جناب حافظ غازی پوری

ٹیلی وژن (سائنس کا ایک معلومات افزا مضمون) از جناب جوشی آروی۔

اردو زبان کے دوست نما دشمن (ایک ادبی مقالہ) جناب خیر بھوروی

ایک ہی صدف کے چار موتی (اردو ادب کے چار بہترین نثر نگار) جناب عطاء اللہ پالوی

اردو ادب اور حقیقت (ایک بلند پایہ مضمون) از جناب جمیل احمد صاحب کنہ پوری

کیٹس (انگلستان کا ایک حسن پرست شاعر) از جناب عزیز احمد صاحب عزیز

بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسہ کا حصہ (ایک بہترین نفسیاتی مقالہ) جناب سید مقار عظیم

ٹیگور کی افسانہ نویسی (ایک دلچسپ بحث) از جناب ابو امام الدین رامنگری

برگد کا درخت اور مغربی شعرا (ایک تحقیقی مضمون) از جناب افسر ماہ پوری

وسط ایشیا کے سبزہ زاروں میں (ایک سیاح کے دلچسپ [illegible]) از جناب [illegible] صاحب بسمل [illegible] فاضل

— وغیرہ وغیرہ —

[illegible] رومانی افسانے

سر [illegible] (ایک دلکش دیہاتی افسانہ) از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی-اے

زہر کی شیشی (بیک وقت مسرت اور غم کے جذبات پیدا کرنے والا افسانہ) از جناب ماہر القادری

دو تصویریں (کالزوردی کا ایک دلگداز افسانہ) از جناب علی احمد صاحب حسینی

موت کا راگ (ایک بلند پایہ روح نواز افسانہ) از جناب میرزا ادیب بی اے

سفید پھول (ایک نفسیاتی شاہکار) از جناب کرشن چندر ایم اے

بچوں کا کھیل (ایک نفیس ڈرامہ) از جناب نریندر ناتھ بی اے ایل ایل بی

مشاہیر کے رومان آفریں لمحے (ایک کیف انگیز افسانہ) از شبلی بی کام

نقش حسرت (ایک غم آگیں افسانہ) از جناب پروفیسر عشرت رحمانی

رقابت کا کرشمہ (ایک دلچسپ افسانہ) از جناب خیال مراد آبادی

ناطون (ایک تاریخی افسانہ) از حضرت سیماب اکبر آبادی

شمع وطن کے پروانے (ایک انقلاب انگیز داستان) از جناب آسی رامنگری

معمہ (مشہور روسی مصنف چیخوف کا ایک شاہکار) از جناب سش مظفر پوری

فاؤسٹ باؤنز (مزاحیہ کہانی) از جناب شفیق الرحمن صاحب

بڑے میاں کی دعوت (مزاحیہ) از جناب لطیف فاروقی

نوجوان (ڈرامہ) جناب شاہین کے قلم سے

اِن کے علاوہ

کئی بہار آفریں افسانے ہوں گے

بلند پایہ سحر طراز نظمیں

حُسن سراپا ہے ۔ حضرت سیماب اکبر آبادی ۔
فریبِ حُسن ۔ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی ۔
اپنے دل کی بہار سے ۔ جناب اعجاز اکبر آبادی ۔
آوارۂ ہوش ۔ جناب عزیز احمد صاحب عزیز
آجا ۔ حضرت جلال ملیح آبادی
دوہرے ۔ جناب علی احمد صاحب علی
اَن دیکھا محبوب ۔ جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی ۔ اے
حریم حُسن میں ۔ حضرت اثر صہبائی
عشق باقی باقی ۔ جناب ابن حزیں سیالکوٹی ۔
درسِ حیات ۔ حضرت ولی شاہجہانپوری ۔
ستم شعار نظارے ۔ حضرت الطاف مشہدی
پردیسی پریتم کا انتظار ۔ محترمہ نواب ذکیہ سلطانہ
مجاز و حقیقت ۔ حضرت ماہر القادری
غزل ۔ فصاحت جنگ حضرت جلیل
غزل ۔ حضرت فراق گورکھپوری
نظرتِ عشق ۔ حضرت دعا ڈبائیوی
رات دن ۔ حضرت نوح ناروی
تصور ۔ جناب محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی

علاوہ ازیں

مندرجہ ذیل شعراء کا بلند پایہ کلام ہوگا :۔
جناب طالوت ۔
جناب اندرجیت شرما ۔
جناب تنویر نقوی ۔
جناب دل محمد فضا ۔
جناب اثر چکوالی ۔
جناب رضا ہمدانی ۔
جناب فارغ بخاری
جناب لطیف انور گورداسپوری
جناب مخمور جالندھری
جناب حافظ غازی پوری
جناب راز چاند پوری
جناب لطیف فاروقی
جناب اختر ماہ پوری
جناب رسا ہمدانی
جناب حسرت لکھنوی
حضرت فطرت واسطی
—— وغیرہ وغیرہ ——

محسوساتِ ماہر

(از حضرت ماہر القادری)

ترے روشن تبسّم کا جو افسانہ سُنا دیتے
فضائیں جگمگا اُٹھتیں ستارے مُسکرا دیتے

اگر وہ بھول کر بھی رُخ سے پردے کو اُٹھا دیتے
یہ ذرّے خاک کے بھی خون کے دریا بہا دیتے

چمن کے پھول ہنس ہنسکر صدائے مرحبا دیتے
وہ ایسے میں اگر "صبحِ بہاراں" گنگنا دیتے

وفا پردہ، نظر پردہ، محبّت سر بسر پردہ
ہمارا بس اگر چلتا تو ہر پردہ اُٹھا دیتے

وہ خود آگاہ ہو جاتے کہ وہ کیا ہیں زمانے میں
نظر کو اک گھڑی بھر کیلئے گویا بنا دیتے

مرے ساقی! اگر تیری نظر حائل نہ ہو جاتی
ترے میخوار! پیمانے صراحی سے لڑا دیتے

وہیں سب کچھ چلا آتا وہیں جنّت اُتر آتی
ترے در کے گدا جس خاک پر بھی سر جھکا دیتے

دلِ مجروح، چشمِ خونفشاں، اسبابِ ویرانی
عطا کی کوئی حد بھی ہے مجھے وہ اور کیا دیتے

جسے اُردو زباں کی تنگ دامانی کا شکوہ ہے
ذرا تم اسکو ماہر کی غزل پڑھ کر سُنا دیتے

ہندوستان میں بردہ فروشی

عہدِ قدیم کی غلامی پر ایک معرکہ آرا مضمون

(از جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناصح)

عہد قدیم میں غلامی کا رواج لوازمات تہذیب میں شمار ہوتا تھا اس لئے اس چیز کو گونہ عالمگیر حیثیت حاصل تھی۔ جو ممالک جس قدر زیادہ متمدن ہوتے تھے۔ اتنا ہی وہاں غلامی کا رواج بڑھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ غلاموں کا رکھنا شان امارت و شرافت میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس لئے گویا وضع میں داخل تھا۔ اور کچھ یہ بھی کہ مہذب اقوام میں کام کی کثرت ہوتی تھی۔ جسے صاحب خانہ تنہا یا محض گھر والوں کی مدد سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم میں رومیوں، یونانیوں، مصریوں، فلسطینیوں، ایرانیوں، چینیوں وغیرہ کے ہاں غلامی کا رواج بہت عام تھا۔

رسم غلامی کی ابتدا

ہندوستان بھی چونکہ تہذیب و تمدن کا مدعی تھا۔ اس لئے کیوں کر ممکن تھا کہ یہاں بھی اسی تناسب سے غلامی رائج نہ ہوتی۔ اگرچہ یہ بتانا تو دشوار ہے کہ اس کا آغاز ٹھیک کب سے ہوا۔ تاہم اس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں اس کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ منو شاستر اور یاگیہ ولکیہ کی اسمرتیوں میں بھی اس کا تذکرہ قوانین کے زمرہ میں ملتا ہے۔ قیاس مقتضی ہے کہ اس کا رواج اسی وقت سے چلا آرہا ہے جب آریاؤں نے وسط ہند سے منتقل ہو کر ہندوستان میں قدم جمایا ہوگا۔ ان لوگوں نے یہاں کے قدیم غیر مہذب یا نیم مہذب باشندوں کو مغلوب کرنے کے بعد بہتوں کو اپنی خدمت کے لئے پکڑ کر رکھ لیا ہوگا۔ اس لئے "ورن" مقرر کرتے وقت انہیں شودر کا خطاب دیا گیا اور تقسیم عمل کے سلسلے میں آریاؤں کی جسمانی خدمت ان کے فرائض میں داخل کر دی گئی۔

جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو ہندوستان کی تہذیب و تمدن بلکہ تکلفات معاشرت اور ضروریات زندگی کے معیار میں بلندی رونما ہو جانے کے سبب سے بردہ فروشی کے رواج میں بھی وسعت پیدا ہو گئی اور اب غلاموں کی درآمد ممالک خارجہ خصوصاً افریقہ و عرب کی بندرگاہوں سے ہونے لگی۔ اس عہد میں غلاموں کی تجارت باقاعدہ طور پر بازاروں میں ہوتی تھی۔ اس وقت کون سا متمول گھرانا تھا جہاں ایک آدھ بردہ بھی نہ ہوگا۔ خدمت کے اعتبار سے حبشی غلاموں کی بڑی قدر تھی، اور عیاشی کے لئے کوہ قاف، آرمینیا اور مصر کی لونڈیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ مرکزی شہروں میں بردہ فروشی کے خاص اڈے ہوتے تھے۔ جہاں فروخت کا طریقہ ایک حد تک وہی تھا جیسا مویشیوں اور دیگر قیمتی جانوروں کے معاملے میں ہوا کرتا ہے۔

غلامی ہندوؤں کے عہد میں

ہندوؤں کے عہد میں غلاموں کے ساتھ بحیثیت مجموعی اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ ذیل میں رائے بہادر مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند کے ایک لیکچر کا اقتباس درج کر دینا کافی تصور کرتا ہوں۔ جو موصوف نے ۱۹۲۸ء میں ہندوستانی اکیڈمی میں دیا تھا اور جس سے اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے :-

> یہاں کی غلامی دوسرے ملکوں کی غلامی کی طرح حقیر قابلِ نفرت اور شرمناک نہ تھی۔ یہ غلام گھروں میں

گھر کے آدمیوں کی طرح رہتے تھے۔ تیوہاروں اور تقریبوں میں غلاموں کی بھی خاطر کی جاتی تھی جو غلام تندہی سے کام کرتے تھے ان کے مالک ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے سلطنت کی طرف سے غلاموں کے ساتھ رحم اور انسانیت کا برتاؤ کرنے کیلئے قانون بنے ہوئے تھے۔ یاگیہ ولکیہ اسمرتی میں لکھا ہے کہ زبردستی غلام بنائے اور چوروں سے خریدے گئے غلاموں کو اگر مالک خود آزاد نہ کرے تو راجہ انہیں آزاد کرا دے کوئی سانحہ پیش آجانے پر آقا کی جان بچانے کے صلے میں غلام آزاد کر دیا جاتا تھا (متاکشرا ص۲۴۹) نارد اسمرتی میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ آقا کی جان بچانے والے غلام کو اولاد کی طرح جائداد میں ورثہ بھی دیا جائے جو لوگ قرض کی علت میں غلام بنتے تھے وے قرض ادا کر دینے پر آزاد ہو سکتے تھے قحط زدہ غلام دو گائیں دے کر، آہستہ غلام روپے دے کر، لڑائی میں پکڑے ہوئے اپنے کو خود بیچنے والے اور جوئے وغیرہ میں جیتے ہوئے غلام کوئی نمایاں خدمت انجام دے کر یا عوض دے کر آزاد ہو سکتے تھے (متاکشرا صفحہ ۲۴۹-۵۰) متاکشرا میں اسی زمانہ میں غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ بھی لکھا ہوا ہے۔ آقا غلام کے کندھے سے پانی کا بھرا ہوا گھڑا اٹھاتا اور اسے توڑ کر اکشت، پھول وغیرہ غلام پر پھینکتا ہوا تین بار کہتا تھا اب تو میرا غلام نہیں ہے۔ یہ کہکر اسے آزاد کر دیتا تھا۔ یہاں کے غلام معتمد ملازم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی یا زیادتی روا نہ رکھی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں چینی اور عرب سیاحوں کو ملازموں اور غلاموں میں کوئی فرق ہی نظر نہ آیا پھر وہ لوگ غلاموں کا ذکر کیسے کرتے۔ (قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۵)

اسلامی دور اور غلامی

مسلمانوں کے عہد میں غلاموں کی حالت بہت بہتر رہی۔ اس زمانہ میں غلاموں کی علمی و سیاسی ترقی کے وسیع مواقع فراہم کئے جاتے تھے چنانچہ دہلی میں تو کم و بیش ایک صدی تک غلاموں نے داد فرمانروائی بھی دی۔ جن میں سے بعض بہت شان و شوکت کے فرمانروا تھے۔ اُن میں کا پہلا تاجدار قطب الدین ایبک تھا۔ اسے ایک تاجر نے ترکستان سے نیشاپور لے جا کر قاضی فخر الدین بن عبد العزیز کوفی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا کچھ عرصہ بعد ایک اور تاجر نے قاضی صاحب سے خرید کر اسے غزنی لایا اور سلطان شہاب الدین کے پاس بیچ ڈالا۔ سلطان نے اسے اعلیٰ صفات سے متصف پاکر مناصب جلیلہ پر سرفراز کر دیا اور آخرش ایک لشکر جرار کی سرکردگی میں اسے پرتھی راج سے جنگ کرنے کو ہندوستان روانہ کیا جس کے فتح ہو جانے کے بعد ایبک کو اسکا حاکم بنا دیا جو اسکی وفات پر ہندوستان کا خود مختار فرمانروا بن بیٹھا۔ اسی خاندان کا ایک تیسرا بادشاہ شمس الدین التمش ایک ترکی غلام تھا۔ جسے قطب الدین ایبک نے ایک ہزار اشرفی پر خریدا تھا۔ اسی طرح غیاث الدین بلبن کو سلطان شمس الدین التمش نے خواجہ جمال الدین بغدادی سے دہلی میں خریدا تھا اور بعد میں اپنی لڑکی سے اُسکی شادی بھی کر دی تھی چنانچہ التمش کے بعد وُہی اُس کا جانشین ہوا۔ سلطان غیاث الدین بھی تغلق شاہ بن ملک تغلق بن سلطان غیاث الدین بلبن کے زمرۂ غلامی میں شامل تھا اور خسرو خاں کو قتل کر کے سریر آرائے تخت دہلی ہوا تھا۔

حبشی غلاموں کی بھی ان دنوں خوب قدر تھی اور دربار شاہی میں انھیں کافی اقتدار حاصل تھا۔ جمال الدین یاقوت حبشی رضیہ سلطانہ کا معتمد علیہ سپہ سالار تھا۔ اسی طرح ملک کافور سلطنت کے کاروبار میں اس قدر رسوخ رکھتا تھا۔ کہ علاؤ الدین کی وفات کے بعد خورد سال بچہ شہاب الدین کو تخت دہلی پر بٹھایا اور خود اس کے نام پر انتظام سلطنت کرنے لگا۔ ایک ماہ اور پانچ روز کے بعد دشمنوں نے موقع پاکر اسے سوتے میں قتل کر ڈالا۔ یہ حبشی غلام "سیدی" کے لقب سے مشہور تھے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے سیدیوں کے عروج و ترقی کی بہترین مثالیں ملیں گی۔

پندرہویں اور سولھویں صدی میں بھی دکن کے مختلف حصوں میں

غلاموں نے اوجِ رفعت کے اعلیٰ ترین منازل طے کئے اور اکثروں نے داد فرماں فرمائی بھی دی۔ چنانچہ ان میں سے ایک قاسم برید ترک تھا جسے سلطان محمد نے خواجہ شہاب الدین سے جن کی غلامی میں وہ چلا آتا تھا خرید کیا اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کی۔ پھر اسے مرہٹ کی امارت پر مقرر کیا۔ اس نے ہندوؤں سے لا بھڑ کر قلیل عرصہ میں اطراف و جوانب پر اپنی دھاک بٹھا دی بعدہٗ محمود شاہ کے اخیر عہد میں علم خود سری بلند کر کے دولت آباد میں اپنی مستقل سلطنت بھی قائم کرلی۔ ایک اور شخص فتح اللہ عماد الملک ہے یہ کسی ہندو کا لڑکا تھا۔ ایک لڑائی میں قید ہو کر آیا اور خانجہان کا جو محمد شاہ بہمنی کی طرف سے برار کا سپہ سالار تھا غلام بنا۔ یہ شخص مسلمان ہوگیا۔ اس نے اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر اس قدر ترقی حاصل کی کہ خانجہان کے انتقال کے بعد خود عماد الملک کے خطاب سے سپہ سالار بن گیا۔ اور پھر خود سر بن کر برار میں اپنی ایک جداگانہ حکومت قائم کرلی جو ۸۷ سال تک قائم رہی۔
تلنگانہ حیدر آباد کا پہلا تاجدار سلطان قلی ترکمان بھی ایک غلام ہی تھا۔ وہ محمد شاہ بہمنی کے عہد میں دکن وارد ہوا تھا۔ اور مدتوں اسکی غلامی میں رہا۔ اور بسبب سلطان کی عنایت سے حدود تلنگ کی امارت (گورنری) اس کے ہاتھ آئی تو کچھ عرصہ کے بعد گلکنڈہ کے قلعہ میں سلطان قلی قطب شاہ کے لقب سے خود سر بادشاہ بن بیٹھا۔ اسی خاندان کا آخری بادشاہ ابو الحسن تانا شاہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ دولت آباد دیوگیری کی سلطنت کا بانی بھی غلامی کا جوا اپنے دوش شاہی پر رکھ چکا تھا یہ شخص برہمن ذات کا ہندو تھا۔ ایک جنگ میں قید ہو کر آیا تھا اور عرصہ تک سلطان احمد کی غلامی میں رہا۔ اسلام لانے پر اس کا نام ملک حسن پڑا حسن نے آہستہ آہستہ جاہ و منصب میں ترقی کر کے احمد نگر میں نظام الملک کے لقب سے سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کرلیا۔ اسکی قائم کی ہوئی سلطنت اکبر کے عہد میں شہزادہ دانیال کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔
لیکن غلاموں کے ساتھ یہ حسن سلوک اٹھارہویں صدی میں قائم نہ رہا۔ یہ عہد ہندوستانی حکومت کے زوال کا تھا اور غیر ملکیوں خصوصاً انگریزوں کی حکومت جم رہی تھی۔ باشندوں میں اگلی سی دولت و ثروت باقی رہی تھی نہ شان و شوکت۔ صرف نمائش ہی نمائش رہ گئی تھی۔ بیجا فخر و غرور جو اس صورت حال کا لازمہ ہے۔ رؤسا اور اہل ثروت طبقہ میں عام طور پر رونما ہو گیا تھا۔ اس وقت غلاموں سے محض خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا اور شاذ و نادر ہی انہیں ابھرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ تاہم انہیں دوسرے نوکروں اور ملازموں پر یہ فضیلت حاصل تھی کہ وہ گھر کے ایک فرد اور خاندان کے ایک رکن متصور ہوتے تھے۔ اس لئے ان پر خاص اعتماد ہوتا تھا اور عام ملازموں کی نگرانی انہیں کے سپرد ہوتی تھی۔

انگریزی گھرانوں میں غلامی کا رواج

انیسویں صدی کے وسط تک باہر سے غلام آیا کرتے تھے۔ ان میں اکثر و بیشتر افریقہ و عرب ہی کی بندرگاہوں سے لائے جاتے تھے۔ جہازوں کے کپتانوں کو بطور خود محدود تعداد میں ان کی تجارت کرنے کی اجازت تھی۔ بنابریں بردہ فروشوں کو اپنے مال کی فروخت میں کچھ زیادہ دشواری و تکلیف اٹھانی نہ پڑتی تھی۔ بقول ایک سینئر مجسٹریٹ آف پولیس کے جیسا کہ اس کی ایک چٹھی مورخہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء میں مندرج ہے افریقی چھوکروں کی بمبئی میں اس قدر قدر ہے کہ میں انہیں باہر نکلنے نہیں دیتا مبادا انہیں کوئی چرا لے۔
کلکتہ میں بھی بردہ فروشی کی خوب گرم بازاری تھی۔ یہ غلام "کافری" کہلاتے تھے۔ اور شہر میں خصوصاً انگریزی گھرانوں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ اس سلسلے میں سنہ ۱۸۷۰ء کے اولین انگریزی اخبار "بنگی گزٹ" میں ہمیں کئی دلچسپ اشتہار مندرج ملتے ہیں جن سے اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے کہ ان ایام میں بردہ فروشی انگریزوں میں کتنی وسعت کے ساتھ رائج تھی اور کیا کیا شرمناک باتیں اس کی وجہ سے معرض وقوع میں آتی ہوئی تھیں۔ ذیل میں قارئین کی دلچسپی کے لئے بعض ایسے اشتہارات کے ترجمے درج کئے جاتے ہیں جن میں افریقی غلاموں کی فرمائش کی گئی ہے۔ اور ایک تو قدرے شرمناک پیرایہ میں بھی ہے:-
"**ضرورت ہے**:- دو نفر کافریوں کی جو فرانسیسی قرنا اچھی طرح بجانا جانتے ہوں۔ نیز وہ حجامت اور خانساماں یعنی باورچی کے کام کے بھی اہل ہوں۔ شراب کے ہرگز شائق نہ ہوں۔ جو صاحب ایسے

غلاموں کو جُدا کرنا چاہتے ہوں سو وہ مجھے مطلع کریں تاکہ بات چیت کی جائے"

ضرورت ہے۔ ایک صاحب کو جو ان دنوں کلکتہ میں مقیم ہیں دو اصلی سیاہ فام مگر نہایت خوبصورت افریقی خواتین کی جو کافری" کہلانے والے نیچ طبقہ کی ہوں۔ وہ نہ تو چودہ سال سے کم سن کی ہوں اور نہ ہی ۲۰ تا ۲۴ سال سے زیادہ عمر کی ہوں۔ ان لڑکیوں کا انتخاب عمر کے لحاظ سے بخوبی ہو۔ نکھ سکھ سے درست ہوں اور اپنے قویٰ سے کما حقہ کام لیتی ہوں اگر نفاست پسند بھی ہوں تو بہتر ہے۔ مگر واضح ہو کہ داغ دھبہ سے پاک ہوں ان لوگوں کا عقد نکاح انہیں کے رنگ ذات اور ملک کے دو صاحبوں سے کیا جائیگا۔ نہ انہیں اپنے ہمراہ جہیز لانے کی ضرورت ہے اور نہ ان سے مہر پانے کی توقع رکھنی چاہئیے چونکہ ان افریقی حضرات کا آقا انہیں علیٰحدہ کرنا نہیں چاہتا اس لیئے اسے توقع ہے کہ وہی خواتین درخواست کرینگی جو واقعی باکرہ ہوں۔

اوپر کے اشتہارات ضرورتمندوں کی طرف سے تھے۔ اب ذیل میں چند ایسے اشتہارات بھی درج کیئے جاتے ہیں جن میں بردہ فروشی کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ ان میں سے ایک تو مقدسین کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک غلاموں کا بیع وشری غیر معیوب سا ہی نہیں بلکہ وضعداری میں شمار ہوتا تھا۔

برائے فروخت:۔ ایک کافری لڑکا جو خانساماں خدمتگار اور باورچی کا کام جانتا ہے۔ قیمت ۴۰۰ سکہ روپیہ۔ جن صاحب کو ایسے خادم کی ضرورت ہو وہ مشتہر سے درخواست کر کے اسے دیکھ سکتے اور مزید حالات معلوم کر سکتے ہیں۔

نجی طور پر فروخت کے لئے:۔ دو کافری لڑکے جو فرانسیسی قرنا بہت عمدہ بجاتے ہیں۔ عمر ۱۰ سال۔ ایک پرتگالی کی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ملک تھے تفصیل کے لئے پرتگالی کلیسا کے ویکار سے دریافت کیجئے

بردہ فروشی کے اڈے

اس دور میں ہندوستان کے اندر غلاموں کی تجارت اکثر و بیشتر کوچ اور سندھ کے تاجروں کی معرفت ہوتی تھی۔ یہ لوگ ان غلاموں کو زنجبار سے جہاں کھلے بازار میں اُن کی تجارت ہوتی تھی خرید لاتے تھے۔ یہ خرید و فروخت جس طرح عمل میں آتی تھی۔ اس کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ غلاموں کو علی الصباح بازار میں لایا جاتا تھا۔ مگر ان کا اصل بازار پچھلے پہر تین چار بجے لگتا تھا۔ ان کو ایک صف میں درجہ بدرجہ اس طرح کھڑا کر دیا جاتا تھا کہ پہلے ٹھنگنے قد کا۔ پھر اس سے بلند قامت کا۔ یہ ترتیب اخیر تک جاری رہتی تھی جنس کا امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کا بناؤ سنگار بھی کیا جاتا تھا۔ اُن کے اعضاء کو خوب صاف کیا جاتا اور اُن پر تیل کی مالش کی جاتی تھی۔ اُن کے عارض پر سُرخ وسفید رنگ کے نقش و نگار بنا دیئے جاتے تھے۔ اُن کے اُون جیسے بالوں پر لیپ لگایا اور زرد سفوف چھڑکا جاتا تھا۔ اُن کے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں چھلے ڈالے جاتے اور اُن پر بھی لیپ چڑھا دیا جاتا اور کمر سے نیچے نیا دھاریدار یا سادہ تہبند لپیٹ دیا جاتا تھا۔ صف کے اخیر میں بردہ فروش خود کھڑا ہوتا اور ہر دو جانب اُس کے معتمد غلام بطور پہرہ دار کے کھڑے ہوتے تھے۔ اس طرح ترتیب عمل میں آچکنے کے بعد اُن کا جلوس روانہ ہوتا اور بازاروں اور بڑی بڑی گلیوں سے گزرتا۔ بردہ فروش ایک گشت میں اُنکی قصیدہ خوانی کرتا اور اُنکی قیمتیں بیان کرتا جاتا تھا جب کوئی شخص اُنھیں خریدنا چاہتا تو صف کھڑی ہو جاتی اور دیکھ بھال شروع ہو جاتی اور پھر جانچ پڑتال کے دوران میں اکثر وہ شرمناک حرکتیں عمل میں لائی جاتیں کہ مویشیوں کی خرید پر بھی شاید ایسا طرز عمل اختیار نہیں کیا جاتا۔

غلاموں کے حصول کے طریقے

اب سوال یہ ہے کہ یہ بردے حاصل کس طرح کیئے جاتے تھے ہندو راجوں کے عہد میں جیسا کہ یاگیہ ولکیہ کے مشہور شارح وگیانیشور نے صراحت کی ہے غلام تیرہ چودہ طریقے پر بنائے جاتے تھے اور اس لیئے وہ گوناگوں طبقات پر مشتمل تھے مثلاً (۱) اسیرانِ جنگ (۲) زرخرید (۳) مدیون (۴) مرہون (۵) کتابی (۶) خود فروش (۷) خانہ زاد (۸) مجھوزہ (۹) خاندانی (۱۰) بازی میں جیتا ہوا (۱۱) قحط زدہ (۱۲) لونڈی کا یار یا شوہر (۱۳) بگڑا ہوا سادھو وغیرہ غرض ہندوؤں کے ہاں انہی چند مخصوص ذرائع سے غلام حاصل کیئے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر طریقے انیسویں صدی کے اخیر تک بلکہ اب بھی کہیں کہیں رائج ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب طوائف الملوکی پھیلی اور ہر

طرف فتنہ و فساد اور لوٹ مار مچنے لگا تو غلاموں کے حصول کے ذرائع بھی نئے نئے پیدا ہو گئے حتیٰ کہ تیرہ چودہ کے غلاموں کے اقسام یہاں تک پہنچ گئے۔ اس عہد میں اغوا بردہ حاصل کرنے کا خاص طریقہ تھا۔ غربا کے بچوں کی خریداری بالخصوص قحط کے زمانہ میں عام طور پر ہوتی تھی۔ افلاس اور قحط کے سبب سے والدین اپنے بچوں کو بھوکوں مرتے دیکھتے تو کم از کم اُن کی جان بچانے کے خیال سے ہی انہیں کسی متمول آدمی کے ہاتھ معمولی داموں پر فروخت کر دیتے تھے۔ جناب خان صاحب حکیم یوسف حسن خاں بہاری کے پاس تقریباً اسی عہد کا ایک وثیقہ ہے جس میں ان کے خاندان کے ایک بزرگ کی ایک لونڈی کی خریداری کا حال درج ہے۔ اس کے والدین نے چند روپوں کے عوض قحط و افلاس کے عذر پر اسے ان کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ ہندو خاندان کی نوجوان بیوہ عورتوں کو بھی بہکا پھسلا کر اور لالچ دلا کر کسی عیاش طبع کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ یہ بدقسمت عورتیں بردہ فروشوں کے ہتھے اس لئے بآسانی چڑھ جاتی تھیں کہ انہیں اپنے گھروں میں سخت روحانی کوفت اور جسمانی اذیت پہنچتی تھی جس سے وہ یا تو جان کھو کر ہی نجات حاصل کر سکتی تھیں یا پھر کسی بردہ فروش کے ساتھ مفرور ہو کر چھٹکارا پا سکتی تھیں۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار نے لکھا تھا کہ "کلکتہ میں بدکاری کی خاطر نوجوان دیسی بیواؤں کو جل دے کر نکال لے جانے اور چھوٹے چھوٹے غریب بچوں کا اغوا یا خریداری کرنے کی وارداتیں روزانہ بکثرت عمل میں آرہی ہیں۔"

غلاموں کی قیمت

اسلامی عہد میں ترکی غلاموں کی قیمت بہت گراں تھی۔ ان کے دام ایک سو دینار سے لیکر ایک ہزار دینار تک تھے۔ قطب الدین ایبک کی ابتدائی قیمت صرف ایک سو دینار تھی۔ سلطان شہاب الدین نے بعد میں اسے پانصد دینار پر خرید کیا۔ شمس الدین التمش کی خریداری ایک ہزار دینار پر ہوئی تھی۔ قاسم برید کو سلطان محمد نے دو سو دینار پر خرید کیا تھا۔ ملکی غلاموں کی قیمت عموماً بہت ارزاں ہوتی تھی اور نوجوان عورتوں کا دام قریب قریب مزدوروں کے ایک سال کی مجموعی اُجرت کے برابر ہوا کرتا تھا۔ البتہ حبشی غلاموں کی قدر و قیمت بہت تھی اور وہ ۴۰۰ روپے تک بھی فروخت ہو جاتے تھے۔

ملا بار میں جو بردہ فروشی کا مشہور اڈا تھا سب سے عمدہ قسم کے غلاموں کی اعلیٰ سے اعلیٰ قیمت ۲۵۰ طلائی فانم یعنی ۱۲۵ روپے کے قریب ہوتی تھی۔ ان غلاموں سے جو زیادہ سے زیادہ آمدنی سالانہ حاصل ہو سکتی تھی وہ ۶½ فانم یا تین روپے کے قریب ہوتی تھی۔ اگر ان غلاموں کے جملہ بیسوں مختلف انواع کی بکریوں کا اوسط دام نکالا جائے تو ۱۲۲ طلائی فانم یا ۶۵ روپے کے قریب فی غلام پڑتا ہے۔ گویا سالانہ اوسط آمدنی پانچ فانم یعنی دو سوا دو روپے آتے ہیں۔ مگر سب سے نیچے طبقہ کے غلاموں کی قیمت اور بھی کم ہوا کرتی تھی۔ مرد کی مالیت ۶۰ یا ۶۵ روپے ہوتی تھی۔ عورت کی اس سے بھی کم یعنی چودہ پندرہ روپے اور لڑکے یا لڑکی کی ساڑھے سات روپے سے لیکر ۱۰ روپے تک ہوتی تھی۔

رسمِ غلامی کا استیصال

ہندوستان میں غلامی کا استیصال انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی اقتدار کے قائم ہو چکنے کے بعد عمل میں آیا۔ جس طرح انگریزوں نے بچہ کشی، ٹھگی، ستی وغیرہ کا انسداد کیا اسی طرح انہوں نے بردہ فروشی کے ازالہ کی طرف توجہ مبذول کی۔ لیکن یہ ایک ایسا نازک مسئلہ تھا کہ یکایک سختی برتتے بن نہیں پڑتا تھا۔ اسکی ایک خاص وجہ یہ تھی۔ کہ اس زمانہ میں خود انگریز ملازم رکھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ لندن کی طرح کلکتہ اور بمبئی کی انگریز خواتین کے گھروں میں حبشی لڑکوں کی موجودگی ایک عام بات تھی۔

اس سلسلہ میں یہ امر [illegible] کہ اس زمانہ میں غلاموں کی حیثیت خانہ زادوں کی سی تھی جن کا تعلق مخصوص خاندانوں سے نسلاً بعد نسلٍ اس طرح چلا آرہا تھا کہ وہ ایک گونہ خاندان کے افراد میں شمار ہوتا تھا اور وہ "نفر" اور "باندی" کے القاب سے پکارے جاتے تھے۔ ایک اور قسم دیہاتی بلکہ زرعی غلاموں کی تھی جس کی ضرورت اقتصادی بنا پر پیش آتی تھی۔ غلامی کی یہ دونوں قسمیں اسقدر مروّج تھیں کہ کم از کم نوّے (۹۰) فیصدی آبادی اس میں ملوّث تھی۔ انگریزی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اہلِ ہند کے معاشرتی و مذہبی معاملات میں حتی الامکان دخل نہ دیا جائے۔ اور اس خاص قسم کی غلامی کو ہندو شاستر اور اسلامی شریعت نیز عام رسم رواج کی قبولیت حاصل تھی۔ علاوہ بریں اس مسئلہ کو اقتصادیات سے بھی گونہ لگاؤ تھا۔

آخر غلامی کا استیصال انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں ایک خاص قانون کے ذریعہ کر دیا۔ اور پھر ۱۸۶۰ء میں قانون تعزیرات ہند میں بھی اس کے متعلق چند اہم دفعات کا اضافہ کر دیا گیا جن میں نہ صرف غلامی بلکہ ان کے جملہ متعلقات جن سے غلامی کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً اغوا، آدمیوں کی خرید و فروخت، بیگار، وغیرہ سے اعتنا کیا گیا۔ اور انہیں کسی نہ کسی شکل میں جرم قرار دے دیا گیا۔ علاوہ بریں اس سلسلے میں کئی مقدمات بھی چلائے گئے۔

روداد فراق

(از حضرت فراقؔ گورکھپوری)

کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا کچھ بھی زماں مکاں نہ تھا
دیر تھی اِک نگاہ کی پھر یہ جہاں جہاں نہ تھا

ساز وہ قطرے قطرے میں سوز وہ ذرّے ذرّے میں
یاد تری کسے نہ تھی درد ترا کہاں نہ تھا

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

عشق کی آزمائشیں اور فضاؤں میں ہوئیں
پاؤں تلے زمیں نہ تھی سر پہ یہ آسماں نہ تھا

اب نہ وہ پرسشِ کرم اب نہ وہ چشمِ آشنا
شکوۂ عشق برطرف تجھ سے تو یہ گماں نہ تھا

صبر و سکوں کے راز کچھ ہاتو نہیں کھل گئے مگر
عشق کو بھی خوشی نہ تھی حُسن بھی شادماں نہ تھا

سوزِ نہاں میں وہ سکوں قلبِ تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی آگ تو تھی دھواں نہ تھا

خلوتیانِ راز سے حال وصالِ یار پوچھ
تھا نہ حجابِ حُسن بھی عشق بھی درمیاں نہ تھا

کس کے حواس تھے بجا کون تھا اپنے ہوش میں
وقتِ بیانِ غم کوئی مائلِ داستاں نہ تھا

پھر بھی سکونِ عشق پر آنکھ بھر آئی بارہا
گو غمِ ہجر بھی فراقؔ کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

دانے کی سرگزشت

حکیم طالسطائی کا ایک فلسفیانہ افسانہ

(از جناب جمیل احمد صاحب بی۔اے کندھاپوری)

دامن کوہ میں چند بچوں نے ایک دن مُرغی کے انڈے کے برابر ایک چیز پائی۔ جس کے بیچ میں ایک گہرا شگاف تھا اور جو غلہ کے دانے سے کسی قدر مشابہ تھی۔ اس طرف سے ایک مسافر گزر رہا تھا اُس نے ایک آنہ میں بچوں سے وہ چیز خریدلی۔ اور اُسے ایک نادر روزگار شے کی حیثیت سے شہر پہنچکر راجہ کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا۔

راجہ نے اپنی سلطنت کے تمام دانشوروں کو اکٹھا کر کے اس عجیب وغریب چیز کی نوعیت دریافت کرنے کو کہا۔ مگر متعدد بار غور و خوض کرنے کے باوجود بھی ان عقلمندوں کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ آخر وہ کیا بلا ہے۔ آخر ایک دن وہ چیز دریچے پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک مُرغی اُڑتی ہوئی اُس جگہ پہنچی اور اپنی چونچ سے اُس نے اُس کے اندر سوراخ بنا دیا۔ تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ عجیب وغریب چیز غلہ کا ایک دانہ ہے اور اُنھوں نے راجہ کے پاس پہنچکر اُسے یہ خبر سُنائی۔

راجہ یہ سُن کر متحیر ہوا اور اُن دانشوروں کو دوبارہ بُلا کر یہ پتہ لگانے کا حکم دیا کہ کب اور کس جگہ اتنے بڑے دانے پیدا ہوا کرتے تھے۔ اُن لوگوں نے ایک مرتبہ پھر نہ صرف سوچ بچار کی، بلکہ اپنی کتابوں کے اوراق کو بھی اُلٹا پلٹ اس کی بابت معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کی سعی مشکور نہ ہو سکی۔ اور آخر راجہ کے پاس جا کر اُنھوں نے کہہ دیا کہ:-

"چونکہ ہماری کتابوں میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس لئے ہم آپ کو اس کے متعلق کوئی واقفیت نہیں پہنچا سکتے۔ بہتر ہوگا اگر آپ کسانوں سے دریافت فرمائیں۔ شاید اُن میں سے کسی نے اپنے آبا سے سُنا ہو کہ کب اور کہاں اس قسم کا عجیب وغریب غلہ پیدا ہوا کرتا تھا۔"

اب راجہ نے اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا کہ وہ کوئی قدیم کاشتکار اس کے سامنے ڈھونڈ کر لائیں۔ اور تعمیل ارشاد میں انہوں نے سعی بہیم کے بعد آخر ایک کسان کو لا کر راجہ کے سامنے حاضر کر دیا۔ وہ زرد رنگ کا ایک نہایت ہی کمزور و ناتواں انسان تھا اور بڑی مشکل سے دو لکڑیوں کے سہارے لنگڑاتا ہوا راجہ کے سامنے پہنچ سکا۔ راجہ نے اس کے سامنے وہ دانہ پیش کیا مگر ضعف بصارت کے باعث وہ اسے بمشکل دیکھ سکا۔ البتہ ہاتھ میں لیکر اُس نے دانے کو ٹٹول کر اِدھر اُدھر سے دیکھا۔

"ضعیف انسان کیا تم بتا سکتے ہو کہ کب اور کس مقام میں اس قسم کے دانے پیدا ہوا کرتے تھے"۔ راجہ نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا تم نے خود بھی کبھی ایسے دانے بوئے یا خریدے ہیں؟"

اس بوڑھے کسان کی قوت سماعت اتنی معمولی تھی کہ وہ راجہ کا سوال مطلق نہ سُن سکا اور بڑی دشواریوں کے بعد اُس کا مفہوم سمجھنے میں کامیاب ہوا۔

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "اس قسم کے دانے نہ تو میں نے کبھی اپنے کھیتوں میں بوئے اور نہ کہیں سے خریدے۔ ہمارے زمانے میں تو دانے بجنسہ آجکل کے دانوں کی مانند چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ ہاں! میرے باپ سے آپ دریافت فرمائیں۔ شاید اُسے اِس کے متعلق کچھ علم ہو اور وہ کوئی واقفیت پہنچا سکے۔"

یہ سُنکر راجہ نے اس ضعیف کسان کے باپ کو بُلا بھیجا۔ جو صرف ایک ہی لکڑی کی مدد سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور جب اُس کے سامنے دانہ پیش

کیا گیا تو بصارت کسی قدر اطمینان بخش ہونے کے باعث اُس نے اُس پر ایک غائر نظر ڈالی۔

"ضعیف انسان!" راجہ نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس قسم کا غلہ کہاں پیدا ہوا کرتا تھا کیا تم نے کبھی اتنے بڑے دانے اپنے کھیتوں میں بوئے یا کہیں سے خریدے ہیں؟"

اگرچہ اس بڈھے کی قوت سماعت بھی اچھی نہ تھی تاہم وہ اپنے لڑکے کی نسبت زیادہ واضح طور پر سن سکتا تھا۔

"نہیں" اُس نے جواباً عرض کیا "اس قسم کے دانے نہ تو میں نے کبھی بوئے اور نہ کاٹے رہا خریدنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ میرے ایام جوانی میں نہ سکے ہی رائج ہوئے تھے ورنہ روپوں پیسوں کا استعمال ہی شروع ہوا تھا۔ ہر شخص کھانے کے لئے اُس وقت خود کافی غلہ پیدا کر لیا کرتا تھا۔ اور اگر اتفاقاً ضرورت پیش آ جاتی تو ہم ایک دوسرے سے مانگ لیا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں دانے آجکل کے دانوں سے بڑے ضرور ہوا کرتے تھے۔ مگر اتنا بڑا دانہ آجتک میری نظر سے نہیں گزرا۔ لہذا اس مخصوص دانے کے متعلق میں کچھ عرض کرنے سے قاصر ہوں۔ بہرحال! اپنے باپ کی زبانی میں نے اکثر سنا ہے۔ کہ اُس کے زمانے میں دانے اور بھی بڑے اور لذیذ ہوا کرتے تھے۔ اس لئے مناسب ہوگا۔ اگر آپ اس سے دریافت فرمالیں"۔

اب راجہ نے اس ضعیف کسان کے بڈھے باپ کو بھی طلب کیا اور خدمتگار اسے بھی ڈھونڈ کر سامنے لے آئے۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کسی لکڑی کے سہارے کے بغیر ٹہلتا ہوا آیا۔ اُس کی بصارت بھی اچھی تھی اور سماعت بھی۔ علاوہ ازیں وہ باتیں بھی صاف اور غیر مبہم طور پر کر سکتا تھا۔

راجہ نے اُس کی طرف وہ دانہ بڑھا دیا اور بزرگ سال نے اسے ہاتھ میں اُلٹ پلٹ کر بغور دیکھا

"اوہ! بہت دنوں کے بعد ایسا دانہ دیکھنے میں آیا ہے" اور پھر دانے کا ایک حصہ چکھ کر کہا "ہوبہو وہی چیز ہے"۔

"اچھا! بڑے میاں!! یہ تو بتائیے کہ ایسے دانے کب اور کہاں پیدا ہوا کرتے تھے" راجہ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیا آپ نے کبھی ایسے دانے خریدے یا اپنے کھیتوں میں بوئے تھے؟"

"ہمارے زمانے میں تو" بڈھا جواباً کہنے لگا "ایسا غلہ ہر جگہ ہی پیدا ہوا کرتا تھا۔ اپنے ایام جوانی میں تو میں برابر ایسے ہی دانے کھایا اور کھلایا کرتا تھا۔ ٹھیک اسی جیسے بڑے بڑے دانے ہم اپنے کھیتوں میں بویا اور کاٹا بھی کرتے تھے"۔

"بڑے میاں!" راجہ نے پھر دریافت کیا "کیا آپ خود ہی ایسے دانے پیدا کیا کرتے تھے یا کہیں سے خریدتے تھے؟"

"ہمارے زمانے میں" بڈھا مسکرا کر کہنے لگا "کوئی شخص غلہ کی خرید و فروخت جیسی گناہ آمیز بات کا تصور بھی ذہن میں نہ لا سکتا تھا۔ اور روپے پیسے!! اس کے متعلق تو ہم کچھ جانتے بھی نہ تھے۔ ہر شخص خود ہی وافر غلہ پیدا کر لیا کرتا تھا"۔

"میرے کھیت" بڈھا کہنے لگا "خدا کی لامحدود زمین تھے۔ جہاں کہیں بھی میں ہل چلا دیتا وہ اُس فصل تک کے لئے میری زمین ہو جاتی۔ اُس وقت نہ زمین کی کوئی قیمت تھی اور نہ کوئی اسے اپنی خاص ملکیت تصور کرتا تھا۔ لیکن محنت ایک ایسی چیز تھی جسے ہر شخص اپنا ذاتی حصہ سمجھا کرتا تھا"۔

"اچھا! تو میرے دو سوالوں کا جواب اور بھی دیجئے" راجہ نے پوچھا "اوّل یہ کہ زمین اُن دنوں کیوں اتنے بڑے اور لذیذ دانے اُگلا کرتی تھی اور اب کیوں ایسا نہیں کرتی؟ دوم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ تو بغیر کسی لکڑی کے سہارے آسانی سے چلے آئے۔ مگر آپ کا بیٹا ایک لکڑی کے سہارے پر آیا اور آپ کا نوجوان پوتا، وہ تو دو لکڑیوں کی مدد سے بھی بمشکل تمام یہاں پہنچ سکا۔ آخر ان عجیب و غریب تغیرات کا سبب کیا ہے؟"

"وجہ صرف یہ ہے" بڈھا جواباً کہنے لگا "کہ زمانہ حال کے آدمیوں نے اپنی محنت کے بھروسہ پر چلنا ترک کر دیا ہے اور وہ دوسروں کے بل بوتے کا سہارا ڈھونڈھنے کے عادی بن گئے ہیں۔ پہلے لوگ 'قوانین خداوندی' پر چلا کرتے تھے، جو چیز اُن کی تھی وہ بس اسی پر قانع رہتے۔ اور دوسروں کی حاصل کردہ چیزوں پر کبھی حریصانہ نگاہ نہیں ڈالا کرتے تھے"۔ (ترجمہ)

خوشیوں کا دیوتا

از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے

سپنوں کو مرے بہلاتا ہوا اور کون و مکاں پر چھاتا ہوا
یہ کون بھٹکتا آتا ہے کرنوں کے علم لہراتا ہوا

آنکھوں میں نیند سی چھائی ہوئی ہونٹوں پہ ہنسی سی آئی ہوئی
معصوم ستاروں کو ہلکی سی تھپکی سے چونکاتا ہوا

دل حوروں کے تڑپاتا ہوا نینوں کی رسیلی جنبش سے
گاتا ہوا دھیما سا نغمہ اور گاتے ہوئے بل کھاتا ہوا

وہ قوس قزح میں لپٹا ہوا اور ڈوبا ہوا خوشبوؤں میں
اپنی مخمور نگاہوں سے عالم پہ نشے برساتا ہوا

تاروں کو جلو میں لیتا ہوا اور چاند کو بوسہ دیتا ہوا
خوشیوں کے دیئے کی لو دکھیارے سینوں میں بھڑکاتا ہوا

مغموم امنگیں کیوں دل میں انگڑائیاں لیکر اٹھ بیٹھیں
جانے کیوں رک رک جاتا ہے ہونٹوں پہ تبسم آتا ہوا

تو ان مدہوش فضاؤں میں تا روزِ قیامت گاتا رہے
شاید کہ ترے گیتوں کے فسوں سے دکھیوں کا دکھ جاتا رہے

سوزِ ناتمام

ایک سچا واقعہ افسانے کے رنگ میں

از جناب رحمت علی صاحب صابر نور محلوی

"ہے اور ضرور ہے۔ چاہے تم مجھے رازدار بناؤ یا نہ بناؤ مگر تمہاری گزشتہ زندگی سے متعلق کوئی راز ہے جس کی یاد سے تم بے چین و بیقرار ہو جاتے ہو کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم... کسی سے محبت کرتے تھے.... مگر اسے اپنانے میں ناکام رہے....؟" میں نے ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس نے گزشتہ دو ہفتے سے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ مگر لطیف"... میرا اتفاقیہ دوست جس سے میری امان اللہ رسٹورینٹ میں ملاقات ہوئی تھی اور اب میں اور وہ بھنڈی بازار میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ بڑی خاموش اور تنہائی پسند طبیعت کا آدمی تھا۔ جی بہلا دینے کے وہ تمام سامان جو بمبئی ساجنت نظیر شہر پیش کر سکتا تھا۔ اس کے لئے دو کوڑی کے تھے۔ اور تفریحی لوازمات سے وہ ہمیشہ دور ہی رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے میری بھی دلچسپی کا خون ہوتا تھا۔ لاکھ پوچھا۔ مگر سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ تھا۔ ایک دن میں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ کہ یا تو پوچھ کے رہوں گا۔ ورنہ کوئی دوسرا مکان تلاش کر لوں گا.... اور آج میں نے چائے کی میز پر بیٹھتے ہی وہ سوالات شروع کر دیئے جن کا جواب دینے کے لئے میں نے انہیں مجبور کر دیا۔

"ہونہہ !.... اندازہ تو آپ کا بہت صحیح ہے"۔ وہ بدستور انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا: "مگر احمد! یہ میرے بس کا روگ نہیں... تمہاری نوازشیں مجھے منہ کھولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ مگر درد اور اس کی کسک لبوں پر مُہرِ خاموشی لگا دیتی ہے.... کیا کروں اور کیا نہ کروں"۔ وہ یہ کہہ کر پیالے سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔

"تو سناؤں... سنو گے!...." اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"میں موروثی پور ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں سے قبل ہی میرے چچا کا دعوت نامہ پہنچ چکا تھا۔ جو کہ اُن دنوں صوبہ بہار میں مقیم تھے۔ اور حال ہی میں اُن کی نور پور بدلی ہوئی تھی۔ ماں بھی روز یاددہانی کراتیں کہ بیٹا چچا کے یہاں ایک دفعہ ضرور ہو آؤ... اور وہ بھی انہی گرمیوں کی چھٹیوں میں۔ رہی دہلی۔ تو اُسے پھر کبھی دیکھ لینا۔ یہ تو گھر کے پاس ہی ہے۔" سوائے مان لینے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

میں چھٹیاں ملنے کے دوسرے دن ہی نور پور روانہ ہو گیا۔ دو روز کے طویل سفر کے بعد میں گاڑی سے اترا۔ آگے میرے لینے کے لئے ایک آدمی آیا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ میں گھر جا پہنچا۔ میری چچی نے میری بلائیں لیتے ہوئے گھر کی خیریت پوچھی۔ اور میری چچازاد بہنیں بھی میری آمد سے بہت مسرور تھیں۔ نور پور پرانی طرز کا ایک قصبہ نما گاؤں تھا۔ اور گاؤں والے چچا میاں کی بہت عزت کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے زمانۂ ہیڈ ماسٹری میں گاؤں کا اسکول دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

چچی سے محلے کی لڑکیاں قرآن شریف اور اردو کی درسی کتابیں پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ ایک دن میں باہر کی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ کہ رضیہ میری چھوٹی چچازاد بہن آئی۔ اور کہنے لگی "بھیا۔ چلو ہمیں سبق ہی پڑھا دو۔ امی کو آج فرصت نہیں"۔ میں نے کتاب کو تکیئے کے نیچے رکھ دیا اور سلیپر پہن کر صحن میں چلا گیا۔ جہاں پر چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رحلوں پر سیپارے

اور کتابیں لئے پڑھ رہی تھیں۔

"پہلے مجھے ہی پڑھا دو۔ کیونکہ مجھے ننھے کو لینا ہے۔" سلیمہ میری بڑی چچا زاد بہن بولی۔ اور پھر آموختہ سنانے لگی۔

سلیمہ اچھی ذہین لڑکی تھی۔ اس کا پندرھواں پارہ قریب الختم تھا۔ مگر باوجود بارہ تیرہ سال کی عمر کے اس میں بچپن بہت تھا۔ اور پل بھر میں سی پڑھا لکھا چھوڑ کھیل کود میں مشغول ہو جاتی۔ اس کے سسرال والوں کی مرضی تھی جس کی وجہ سے اس کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ ورنہ وہ شاید اتنا بھی نہ پڑھتی۔ خیر۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سب نے سبق پڑھ لیا۔ اور اٹھنے لگیں۔ میں اٹھنے ہی والا تھا۔ کہ باہر کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان لڑکی بغل میں کتاب دبائے دو قدم اندر آئی۔ مگر مجھے دیکھتے ہی جھجک کے پلٹ چلی۔

"کیوں! کہاں چلیں؟" سلیمہ نے وہیں سے سوال کیا: "یہ میرے لطیف بھیا ہیں۔"

"شرماؤ مت! آؤ بھی۔ ہم نے انھیں سے سبق پڑھا ہے۔" ایک دوسری بولی۔

"اور اب یہی پڑھایا کرینگے۔" ایک تیسری چیخ کر بولی۔

وہ بیچاری لجائی ہوئی آکر ایک کونے میں بیٹھ گئی اور کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ الٰہی یہ خواب تھا یا حقیقت میرے قائم کردہ معیار حسن سے تو وہ بہت ہی بلند ہی معلوم ہوتی تھی۔ گندم گوں رنگ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں متناسب اعضا۔ اور اس پر اس کی نیلی کرتی۔ فالسے کی شلوار اور ہلکے پیازی رنگ کی اوڑھنی غضب ڈھا رہی تھی میں گاہے گاہے اس کی طرف بے اختیار دیکھ لیتا تھا۔ اور وہ بھی کبھی کبھی آنکھیں چرا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ سلیمہ کے مجبور کرنے پر وہ سبق لینے کی نیت سے آئی۔ سمٹ سمٹا کر بیٹھنے کے بعد اس نے مجھے آموختہ سنایا۔ جو بمشکل میرے کانوں میں پہنچتا تھا۔ مگر اس میں بلا کی شیرینی تھی۔ اور لہجہ کتنا دلآویز تھا مجھے معلوم نہیں۔ کہ میں نے اس کی کوئی غلطی بھی نکالی۔ یا اسے کچھ بتایا بھی تھا یا نہیں۔ اور اس کی بھی خبر نہیں۔ کہ وہ کب اٹھی اور کب گئی۔ . . .

ہاں اتنا تو آج بھی یاد ہے۔ کہ اس دن میں بے طرح کھویا سا رہا۔

اسی طرح دن گزر گئے۔ سلیمہ کے ساتھ وہ لڑکی اب تو سبق پڑھنے کے بعد بھی آتی جاتی رہتی۔ اور دونوں ایک جگہ بیٹھ کر سینا پرونا کرتی رہتیں۔ یا پھر دن کو ہی آنکھ مچولی کھیلتیں۔ میں بیٹھا ہوا ان کی آزاد زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ یہ وقتی تفریح اور دلچسپ نظارے پر ہی بات ختم ہو جاتی۔ تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر اب میں اپنے میں ایک نمایاں انقلاب محسوس کرتا تھا۔ لاکھ سر ٹپکا۔ سوچنے کی کوشش کی۔ مگر سمجھ میں خاک نہ آیا۔ کہ آخر اس تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے ......! ادھر چچی جان نے پڑھانے کا بار گراں میرے ہی کندھے پر ڈال دیا۔ اور کچھ لڑکیاں بھی مجھ سے پڑھنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ میں انھیں ایسے آسان ترین طریقوں سے نیا سبق پڑھاتا۔ کہ ان کے بہت جلد ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ میں عجب کشمکش میں گرفتار تھا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد مجھ پر یہ عقدہ وا ہوا کہ میں "حفصہ" یعنی سلیمہ کی لاڈلی سہیلی سے محبت کرتا ہوں۔ اس انکشاف نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا۔ کتابیں سامنے ہوتیں۔ مگر دماغ کہیں اور رہتا۔ اسے دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔

ایک دن میں شکسپیر کی ایک نظم یاد کر رہا تھا۔ کہ پیچھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو حفصہ اور سلیمہ میری طرف آ رہی تھیں۔

"دیکھو بھیا! یہ رومال حفصہ نے بنایا ہے۔" سلیمہ نے یہ کہتے ہی رومال میرے ہاتھ میں دیدیا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لینا چاہا۔ مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اور ریشم کے تاگے سے بنے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگا۔

"بہت عمدہ ہے۔ اور یہ پھول تو ہو بہو کاسنی کا معلوم ہوتا ہے" میں نے ایک پھول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سلیمہ مسکرانے لگی اور حفصہ کی طرف جو اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں کچھ حیران سا ہو گیا۔ کہ شاید اسے میرا راز معلوم ہو گیا۔

"ارے کہاں چلیں" سلیمہ نے گھبرا کر حفصہ سے پوچھا جو دروازے کی طرف مڑ کر باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی: "دیکھتی نہیں۔ کہ بھیا تمہارے رومال کی کتنی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ کہکر اسے کھینچتے ہوئے میرے سامنے لے آئی۔ گو وہ پہلے کی طرح شرماتی تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی فطری حیا سے اس کا چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔

"کشیدہ کاری میں تو تم بہت ماہر معلوم ہوتی ہو"۔ میں نے بڑے شوق رومال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ بھی ابکے رومال بنوائینگے"! سلیمہ بیچ میں بول اٹھی۔

"ہوں"

"تو یہی رکھ لیجئے" حفصہ نے یہ کہکر منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

"شکریہ"۔ یہ کہکر میں نے رومال اپنے کوٹ کی سینے والی جیب میں رکھ لیا۔ اور وہ دونو ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ نہ میرے اور نہ ہی حفصہ کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی۔ جسے "اعترافِ محبت" کے نام سے موسوم کیا جاسکے۔ مگر اُس کے اوضاع و اطوار اور بات چیت سے مجھے کچھ کچھ شک ہوتا تھا۔ کہ اُسے میرے جذبات کی قدر اور میرے احساسات کی خبر ہے۔ مگر میں نے اس کی حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

ایک دن میں بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔ اور کمرے کی شمالی دیوار کے سامنے پلنگ پر سلیمہ اور حفصہ بیٹھیں میری کتابوں میں سے تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ کہ چچی نے سلیمہ کو آواز دی۔ اور وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اور حفصہ بھی۔ شاید تنہائی کا خیال کر کے جانے کے ارادہ سے اُٹھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے اچھا موقعہ پھر نہ ملے گا۔

"حفصہ ذرا اِدھر آؤ تو!"

وہ جھجکتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"بیٹھو!"

مگر وہ کھڑی رہی۔ میں نے جرأت سے کام لیکر ایک پرزہ کاغذ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس پر رات ہی میں نے چند فقرے لکھے تھے کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور. . . . . . ."

اُس نے رقعے کو پڑھا۔ اور شرم و حیا سے اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اور گھبراہٹ سے اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ . . .

"اس کا جواب جو مناسب سمجھو۔ لکھ دو"

"جواب کی ضرورت نہیں"۔ یہ کہکر اُس نے رقعے کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور تمکنت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے موقعہ ہاتھ سے جاتا دیکھکر آگے بڑھ کے اُس کا دامن تھام لیا۔

اور کہا "حفصہ! اِس کا جواب تو دیتی جاؤ"!

"کوئی آجائے گا۔ چھوڑ دو میرا دامن"۔

"تو کیا جواب نہ دوگی"؟۔

"بھلا میں کیا جواب دوں"۔

"جو مناسب سمجھو"!

"کیا ہر معاملے میں جواب کی ضرورت ہوا کرتی ہے. . . . ."؟

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو"!..

"جو تمہارے جی میں آئے۔ سمجھ لو"!

اتنے میں سلیمہ کی چاپ سے آگاہ ہو کر اُس نے ملتجیانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور میں کود کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ اور کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مگر گھبراہٹ میں ایک لفظ بھی نظر نہ آتا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

سلیمہ نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے چلی گئی۔ سلیمہ نے اِس فوری روانگی کی مجھ سے وجہ پوچھی۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو بھولے پن سے کہنے لگی۔ "شاید تم نے کچھ کہا ہوگا"!

"بھلا میں کیا کہتا" جواب دیکر میں کتاب دیکھنے میں محو ہوگیا۔ اور وہ بھی بیدلی سے ورق گردانی کرنے لگی۔

دو دن تک حفصہ نہ آئی۔ میں بے صبری سے اس کا انتظار کر رہا تھا اور مجھے اپنے اظہارِ محبت پر کچھ کچھ پشیمانی بھی تھی۔ اور اِس خیال سے مجھے اور پریشانی ہوتی تھی۔ کہ اُس نے اِسے بُرا سمجھا۔ سلیمہ سے اشاروں اشاروں میں پوچھا۔ مگر وہ بھی نہ جانتی تھی۔ کہ نہ آنے کی کیا وجہ ہے۔ پھر اُس کا گھر بھی ہمارے گھر سے کچھ دُور ہی تھا۔

رات ہی حفصہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں صبح کو روانہ ہونے والا ہوں۔ وہ اگلی صبح آئی۔ سلیمہ چھیڑ چھیڑ کر مجھ سے فضول سے سوال کر رہی تھی اور میں ہاں ہوں کر کے اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حفصہ دروازے کی کُنڈی میں انگلی ڈالے خاموشی سے میری تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ سلیمہ جب توشہ دان لیکر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ تو میں اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا

جانے سے پہلے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں۔۔ حفصہ۔۔"

وہ خاموش رہی۔

اُس دن میرے منہ سے کچھ ناشائستہ کلمے نکل گئے تھے جن کا مجھے ازحد افسوس ہے۔ اُمید ہے کہ تم معاف کر دوگی۔"

"کس قصور کی معافی؟" آخرکار اُس نے مہرِ سکوت توڑی۔

"وقت کم ہے اور قصہ طویل" میں نے رُکتے ہوئے کہا۔ "دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اُس دن اپنا رازِ دل تم سے کہہ دیا تھا۔ جس کا تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید بُرا مانا۔۔۔ اور آج رُخصت سے قبل تمہارے مُنہ سے معاف کرنے کے لفظ سُننا چاہتا ہوں۔"

"تو گویا۔۔ آپ اپنے لفظ واپس لے رہے ہیں؟" اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نہیں! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ بھلا میں اُن الفاظ کو کس طرح واپس لے سکتا ہوں جن سے میری آئندہ زندگی وابستہ ہے۔۔ ہاں برملا اظہار۔۔ البتہ ایک خطا تھی"

"تم نے میرا کون سا قصور کیا ہے لطیف! ۔۔۔جس کی میں معافی۔۔۔۔" شدّتِ گریہ سے باقی لفظ اُس کے حلق میں ہی رہ گئے اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

میں نے آنسو خشک کرتے ہوئے اُسے تسلی دی۔ مگر آنسو۔۔۔۔ روکے نہ رُکتے تھے۔ اِس جبری جدائی کا اُسے مجھ سے بھی زیادہ رنج تھا۔ اور قلق۔

"مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے لطیف!"

"مرتے دم تک نہیں!!"

"میرے لئے یہی بہت ہے!"

اتنے میں سلیمہ نے داخل ہوتے ہی کہا: "باہر ابّا جان بُلا رہے ہیں کیوں کہ گاڑی کا وقت تنگ ہوا جا رہا ہے"۔

نوکر نے میرا کتابوں کا بنڈل اور بستر اُٹھا لیا۔ اور میں نے سلیمہ اور حفصہ پر الوداعی نگاہ ڈالی۔ دونوں کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ میرا بھی رونے کو جی چاہتا تھا۔ مگر افشائے راز کے خوف نے آنسو نہ بہانے دیئے۔ با دلِ ناخواستہ دونوں کو ہچکیاں لیتے ہوئے چھوڑ کر چچی اماں سے رُخصت ہونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ایک دن اسکول سے واپسی کے بعد سلیمہ کا ایک طویل خط ملا جس میں بڑی شدّت سے مٹھائی کے لئے تقاضا کیا تھا۔ لکھا تھا کہ

"ایک دن میں اور حفصہ بیٹھی ہوئی آزار بند بنا رہی تھیں کہ باتوں باتوں میں تمہارا ذکر آ گیا۔ اور میں نے اُسے بتایا۔ کہ عنقریب ہی لطیف بھیّا کی شادی ہوگی۔ ابّا کسی اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ اور اُن کے میٹرک پاس کرتے ہی یہ مبارک تقریب منعقد ہوگی۔ شادی میں چلوگی نہ!۔۔۔۔۔ شادی کے نام سے وہ سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آزار بند میں لگی ہوئی تمام تیلیاں نیچے گر گئیں۔ میں نے گھبرا کے پوچھا۔ کہ "کیا ہوا جو تم اس قدر حواس باختہ ہو گئیں"؟ اُس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر میں بھلا کب چھوڑنے والی تھی۔ اور آخر کہلوا کے ہی چھوڑا کہ وہ تمھیں چاہتی ہے۔۔۔ اور تم بھی اقرارِ محبت کر چکے ہو۔ کہو! بڑے چھپاتے تھے مجھ سے۔ دوسرے دن میں نے باتوں باتوں میں تمہاری شادی کا ذکر چھیڑ کر امّی سے وعدہ لے لیا۔ کہ وہ ابا سے حفصہ کے بارے میں ذکر کرینگی۔ امّی حفصہ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اور کہنے لگیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو جائے۔ مگر وہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی لاڈلی اور چہیتی لڑکی ہے۔ شاید ہی وہ ہم پردیسیوں کو اُس کا رشتہ دینا منظور کریں۔ پھر وہ پٹھان ہیں۔ برادری سے باہر شاید ہی لڑکی دیں۔ اچھا تمہارے ابا سے کہوں گی۔"

دوسرے دن امّی نے زوردار لفظوں میں ابّا کو حفصہ کے رشتے کے بارے میں بتایا۔ اور اُن سے تاکید کی کہ وہ خان صاحب سے پوچھ دیکھیں۔ شاید کام بن جائے۔" ابّا شاید انکار کا کوئی پہلو نکالتے بھی۔ مگر امّی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ہار تھک کر گئے۔ مگر اُن سے ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں حفصہ کے چچا جو بہت سیدھے سادھے بزرگ ہیں۔ بات چیت ہوئی۔ اور اُنھوں نے بھی حامی بھر لی۔ کہ میں بھی حفصہ کے ابّا سے کہوں گا۔ اور وہ شاید تین چار دن میں آ جائینگے۔ کیوں۔ ہے نہ مٹھائی کھانے والی بات۔۔۔۔۔ آؤ گے نہ! ۔۔۔ہاں اب تو پر لگا کے اُڑتے ہوئے آؤ گے۔ بھلا یہ بھی کوئی رُکنے کی بات ہے۔۔ مگر جلدی میں کہیں مٹھائی خیال

سے نہ اُتر جائے"

شریر کہیں کی۔ میں نے خط کو جیب میں ڈالتے ہوئے دل میں کہا۔ اور پھر خود ہی کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ میری اُس وقت کی خوشی کا کوئی کس طرح اندازہ کر سکتا ہے۔

آخر وُہی ہُوا جس کا کہ چچی جان کو خدشہ تھا۔ کیونکہ حفصہ کے ابّا نے نہایت بے رُخی سے چچا جان کے سوال کو ٹھکرا دیا۔ "میری کوئی پانچ سات لڑکیاں تھوڑی ہیں جو اِسے کالے کوسوں بھیجکر غریب کی زندگی اجیرن کر دوں۔ نہ نہ مجھ سے یہ کلنک کا ٹیکہ نہ لگوایا جائیگا۔ جو کل کو برادری میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں۔ ... بھلا پٹھانوں کے رشتے کبھی شیخ برادری میں ہوسکتے ہیں۔" چچا اپنا سا منہ لیکر واپس آ گئے۔ جب مجھے اِن حالات کی اطلاع ہوئی۔ تو رنج کے مارے کچھ نہ سُوجھا ... اسی غم میں گرفتار رہنے کی وجہ سے میں اُس سال امتحان میں بھی فیل ہوگیا ....

دل شکستگی کے عالم میں میں نے ایک دفعہ پھر تور پور جانیکا قصد کیا۔ اور گیا تو سلیمہ نے میرے دل پر اور گھاؤ لگائے۔ اور جن لفظوں میں اُس نے حفصہ کی درد بھری کہانی سُنائی۔ وہ ناقابلِ برداشت تھے۔ بے اختیار میرے دل سے آہیں نکل گئیں۔ میں دو دن تک اُس کا انتظار کرتا رہا۔ اُسے نہ آنا تھا اور نہ آئی۔ آتی بھی کیوں کر ... مشرق کی باحیا اور ماں باپ کی فرمانبردار لڑکی اُن کے احکام کو ٹھکرا کر کس طرح آسکتی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے انتظار تھا .... اور بہت۔

میں ناکام و نامراد تیسرے دن واپسی کی نیت سے اسٹیشن کی طرف راہی ہوُا۔ پگڈنڈی حفصہ کے کھیتوں میں سے جاتی تھی۔ جب میری نظر اُس رومان خیز امرُودوں کے جھنڈ کی طرف گئی جس میں مَیں بارہا حفصہ کی معیت میں آ چکا تھا۔ تو بے اختیار دل ڈُوبتا ہُوا معلوم ہُوا .... اور منہ سے ایک آہ نکل گئی۔

اتنے میں کسی نے میرا نام لیکر آواز دی۔ میں چونک کر ادھر متوجہ ہوگیا۔ وہ حفصہ تھی۔ جو شہتوت کے سہارے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی ... پریشان و حیران۔ میں نے نوکر کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ اور خود تیزی سے حفصہ کی طرف بڑھا۔

"کسے خبر تھی کہ تم سے یہاں۔ اور اس حال میں ملاقات ہوگی ... . اور تم آئیں کیوں نہ!" میں نے بیصبری سے یہ جملہ پورا کر کے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ناخن سے شہتوت کی چھال کھرچتی رہی ....

"شاید فرصت نہ ملی ہوگی ....!" میں نے دوبارہ کہا۔

"فرصت! .. نہیں لطیف۔ اگر یہاں فرصت کا سوال ہوتا۔ تو خدا جانے میں کئے دفعہ وہاں ہو آتی۔ مگر ابّا نے میری آمد و رفت پر کچھ اس طرح کی پابندیاں کر رکھی تھیں کہ آنا مشکل تھا۔ تم کیا جانو۔ کہ میں تم سے ملنے کے لئے کس قدر بیقرار تھی۔ جب سے خبر ملی۔ کئی تدبیریں کیں۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر آج ساگ لینے کے بہانے سے ادھر آ نکلی ہوں۔"

"میں مایوس ہو چکا تھا۔ کہ شاید تمھیں ایک نظر دیکھ بھی نہ سکوں گا"

وہ بھی کھوئی ہوئی سی کبھی مجھے اور کبھی زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر کار بولی: "ایک بات کہوں مانو گے"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ماننے کی بات ہوگی۔ تو ضرور مان لوں گا"

"تو مجھے بھُول جاؤ ... لطیف!" یہ کہکر وہ سسکیاں لینے لگی۔

"میں بھول جاؤں! ..... اور تجھے ... حفصہ! شاید تمھیں مرد کے دل کا حال معلوم نہیں۔ ورنہ یہ سوال مجھ سے نہ کرتیں ...."

"اِس کے سوا چارہ بھی تو نہیں!" اُس نے اپنی اوڑھنی کو بے چینی سے مروڑتے ہوئے کہا۔

"میں تو تمھیں شاید مرتے دم تک نہ بھُول سکوں ... ہاں تم کوشش کر دیکھو۔ شاید مجھے بھُول سکو"

وہ میری اِس بات پر بے طرح چونکی۔ اور اشک بھری نگاہوں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی: "نہیں لطیف! یہ میرے بس کا بھی روگ نہیں ... مجھے اِس کے لئے معاف کرنا .... کہ میں نے ایک فضول سا مشورہ تمھیں دینے کی کوشش کی" یہ کہکر اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اب اُس کے بشرے سے اُس کے دلی مضبوط ارادے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تمھیں دیر ہو رہی ہے لطیف! .... اچھا جاؤ خدا حافظ ...."

زندہ رہے تو پھر ملاقات ہوگی"۔ یہ کہکر اُس نے نہ سیر ہونے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور کھیتوں کی مینڈھوں پر سے دوسری طرف چلی گئی۔ میں محویت کے عالم میں اُسے بہت دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر دل گرفتگی کے عالم میں پگڈنڈی پر ہو لیا۔

اس کے دو ماہ بعد سلیمہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا۔ کہ حفصہ کی اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو شادی ہے۔ اس خبر وحشت اثر نے مجھے حواس باختہ کردیا۔ ششماہی امتحان سر پر تھا چھٹی ملتی نہ تھی آخر پورے دو ہفتے کے بعد۔ بڑی مشکل سے چھٹی لیکر لوڑپور روانہ ہوا۔ اسٹیشن سے اُترتے ہی میرے دل پر غم واندوہ کے بادل چھاگئے۔ لاکھ سنبھلنا چاہا۔ مگر طبیعت نہ سنبھلی۔

تنہائی ہونے پر سلیمہ نے مجھے وہ دلدوز خبر سنائی ... جس نے میرے دل و دماغ میں ایک حشر برپا کر دیا۔ اور بے اختیار ٹھنڈی آہیں منہ سے نکل گئیں

کہنے لگی۔ کہ" بخار تو اُسے دو ہفتے سے ہی آتا تھا۔ مگر شادی کے دن جس جس طرح قریب آتے جاتے تھے۔ اس کی کمزوری اور تکلیف میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آخر ایک دن اُس نے اپنی چھوٹی بہن سلمیٰ کے ہاتھ مجھے بُلا بھیجا۔ میں اور رضیہ گئیں۔ آہ! میں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔

ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ چہرے پر مُردنی۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ ... یہ حالت دیکھکر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور بے اختیار اُس سے لپٹ گئی اور اُس نے دل کی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعے نکال کر مجھے سوز وگداز سے لبریز اپنی آپ بیتی سُنائی۔ جسے سُن کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور ڈھائیں مار مار کر رونے لگی۔ آنے سے پہلے اُس نے مجھے ایک چیز دی۔ اور تاکید کی۔ کہ بحفاظت تمام آپ تک پہنچا دوں۔ اور وہ .... یہ ریشمی رومال تھا۔ جسے اُس نے بڑی محنت سے آپ کو تحفۃً دینے کی نیت سے تیار کیا تھا۔ مگر اپنے ہاتھوں آپ کے سپرد نہ کرسکی ..... اور آہ ..... اُسی شام کو وہ چل بسی"

میں نے رومال لیکر بیقراری سے سینے سے لگا لیا۔ مگر دل میں لگی ہوئی آگ ... شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھی۔ سلیمہ بھی بیقرار ہوگئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

وہ تو چلی گئی۔ مگر میں آج تک زندہ ہوں .... زندہ کیا زندگی کا نام بدنام کر رہا ہوں۔ موت کی بارہا دعائیں مانگیں .... مگر ہنوز درِ ایجاب وا نہیں ہوا .... دیکھوں وہ دن کب آتا ہے"

یہ کہکر میرا دوست خاموش ہوگیا۔

شوخ اور مغرور دریا بہتا ہے

(از میاں سلطان احمد صاحب وجودی)

(۱)

هم اس کنارے رہتے ہیں-
اور وہ
اُس کنارے پر-
بیچ میں
شوخ اور مغرور
دریا بہتا ہے-

وہ ہم تک پہنچنے کا-
ارادہ رکھتے ہیں-
ہم
اُن پر قربان
ہونے کے لئے
ہر لمحہ

اور ہر لحظہ
تیار ہیں-
درمیان میں
شوخ اور مغرور
دریا بہتا ہے-

(۲)

آہ پیارے!
اس محبت کا صدقہ
جو سُلگ رہی ہے-
دل کے اندر-
پھاند جائیں
اپنے درمیان

رُکاوٹ بن کر
آنے والے
اس کو
جو
شوخ اور مغرور
دریا بہتا ہے

احساسات

(از جناب اعجاز صدیقی خلف الرشید حضرت سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی)

جس طرح بھی ہو، اے دوست مرے دلکی دنیا برہم کر دے
یا جانِ تمنا ہی بن جا، یا ذوقِ تمنا کم کر دے

دو بوندیں اشکِ تمنا کی بیتاب ہیں کب سے بہنے کو
لبِ خشک سراب دیدہ کو سوزِ غم سے پُرنم کر دے

پھر نجد کے خوابیدہ ذرّے بیداریٔ شوق کی دعوت دیں
پھر حسن و عشق کی دنیا میں اک بار نیا عالم کر دے

غم اور الم کی باتوں کو نامحرمِ الفت کیا جانیں
ان حرص و ہوس کے بندوں کو یارب آگاہِ غم کر دے

یارب چمکوں غازہ بنکر رخسارِ بہارِ رنگیں پر
اس آخرِ شب کے آنسو کو ہم تعدادِ شبنم کر دے

ماضی پہ جس کا قبضہ تھا مستقبل اُسکے ہاتھ میں ہے
امروز کو دل افروز بنا، اندیشۂ فردا کم کر دے

دردِ پنہاں کی شدت سے اک عالم درد و کرب میں ہے
دل ہی ہو اگر باہر غمِ دل، کیا جانئے کیا عالم کر دے

تسکین کے پہلو مل نہ سکے ان چاندنی راتوں سے بھی مجھے
اے فطرتِ رنگیں احساں کر نظّارہ مرا برہم کر دے

اک حد پہ عشق کا رک جانا، توہین ہے تکمیلِ دل کی
اپنے جذباتِ ناقص کو یا اور بڑھا یا کم کر دے

سننے والوں کو دوش نہ دو یہ پریم کا گیت ہی ایسا ہے
جو نغمہ کو نوحہ کر دے، جو عشرت کو ماتم کر دے

اعجاز جہان و مافیہا پابندِ رضائے خالق ہیں
پھر عیش اُسے کیوں راس آئے وہ جسکو اسیرِ غم کر دے

زیب النسأ کی شاعری پر ایک نظر

ایک دلچسپ ادبی و تاریخی مقالہ

از جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی

زیب النساء کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بڑے بڑے ادیب اہلِ قلم حضرات اس موضوع پر موشگافیاں فرما چکے ہیں اور نہیں معلوم کب تک فرماتے رہیں گے۔ لیکن میں کہوں گا کہ اس چیز پر جس قدر قلم اُٹھایا جائیگا۔ اتنے ہی اس کے پوشیدہ اور چھپے ہوئے گوشے سامنے آتے جائینگے اور اہلِ ذوق کو لذّت و سرور کی کیفیت بخشتے رہیں گے۔

یوں تو ہر قوم اور ہر ملک میں جہاں بڑے بڑے مرد شعراء اور ادباء پیدا ہوئے وہیں عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہمیشہ ایسی رہی کہ جس نے فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی میں وہ ملکہ حاصل کیا جس نے قومی و ملکی عروج و کمال کو اور چار چاند لگا دیئے۔ خوش کُن تو نہیں بھی ایسی بڑی بڑی شاعرہ پیدا ہوئی ہیں کہ جن کے ایک ایک شعر کے بدلے ہزارہا انسانی جانیں قربانی ہوگئیں۔ اور زر و جواہرات کا تو کیا ذکر۔ قوم کے ہونہاروں نے اپنے بے بہا خونوں کے دریا بہا دیئے ہیں۔ لیکن اس بزم میں زیب النساء نے جو جگہ پائی سچ تو یہ ہے کہ بہت کم کو یہ شرف نصیب ہوا اور اگر دنیا کے ملکوں کو اپنی اپنی بہترین خواتین شاعرہ پر فخر و ناز رہیگا تو ہندوستان کو بھی زیب النساء جیسی بیمثال شاعرہ اور بدیہہ گو کے کمالات ہمیشہ مغرور رکھیں گے۔

زیب النساء کی شاعری میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی حاضر جوابی اور نزاکتِ تخیل اور اس کی معصومیت بھری بلند فکری ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ایک دن شہنشاہ اورنگ زیب نے زیب النساء کی خواصوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ نماز فجر سے پہلے مجھے آج جگا دینا۔ بادشاہ کا رعب و جلال شہرۂ آفاق تھا خواص اس ڈر سے کہ کہیں آنکھ نہ لگ جائے اور بادشاہ کی عدول حکمی ہو جائے تو جان کے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ رات بھر قطعاً نہ سوئی اور کروٹیں بدلا کی مُرغ کبھی رات میں بھی بول اُٹھا کرتے ہیں۔ آج بھی جب مُرغ نے بانگ دی تو اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب بادشاہ کے جگانے کا وقت آگیا ہے۔ بادشاہ کو جا کر اُٹھا دیا۔ حالانکہ وہ ابھی ابھی تہجد کی نماز پڑھکر بستر استراحت پر تشریف لے گئے تھے اور پوری طرح پر سونے بھی نہ پائے تھے۔ کہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ بادشاہ کو یہ جگانا انتہائی ناگوار اور تکلیف دہ محسوس ہوا اور اسی حالت میں آپکی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "سر بریدن لازم است" یہ کلمہ سُنتے ہی خواص نے اسے اپنے لئے پیغامِ موت محسوس کیا اور جب زندگی سے مایوس ہو گئی تو آخری سلام کے لئے اپنی مالکہ زیب النساء کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت وہ محوِ خواب تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ پاؤں دبا کر اسے بیدار کیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر خاموش ہو رہی۔ زیب النساء نے اس کے اس طرح آنے اور رونے اور پھر خاموشی کا سبب دریافت کیا۔ مگر اُس نے نہ بتایا آخر اُس کے بہت اصرار پر سارا واقعہ کہہ سُنایا اور کہا کہ اب میں آپ کو

آخری سلام عرض کرنے حاضر ہوئی ہوں۔ کوئی دم میں میرا سر میرے تن سے جدا ہو گا اور میری روح میرے جسم خاکی کو الوداع کہا چاہتی ہے۔

زیب النساء کو یہ خواص بے حد محبوب تھی وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس وقت اسے تسلی و تسکین دی اور صبح حسب عادت بادشاہ کو سلام کرنے کے انکی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اسکے ساتھ وہ خواص بھی دست بستہ حاضر تھی۔ زیب النساء نے سلام کے بعد عرض کیا اباجان! اس لونڈی کے لئے حضور کا کیا حکم ہے۔ بادشاہ نے پھر وہی الفاظ دہرائے "سر بریدن لازم است" زیب النساء نے اس موقع پر اپنی ذہنی قابلیت اور بلندیٔ طبیعت کا جو ثبوت دیا ہے وہ شاید تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ سونے کے حرف میں لکھا جائیگا۔ فوراً عرض کیا ؎

سر بریدن لازم است آں مرغ بے ہنگام را

این پری پیکر چہ داند وقت صبح و شام را

بادشاہ یہ سُنکر مسکرا دیئے اور اس خواص کا خون معاف کر دیا۔ دیکھیئے اس شعر میں سر بریدن کو جس طرح سے نباہا ہے اور اس کو جس خوبی سے ادا کیا ہے وہ خود اپنی نظیر اور خود اپنی مثال ہے۔

زیب النساء چونکہ زبردست شاعرہ تھی اور شعر ہی اس کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب چیز تھی۔ اس لئے جب اُس کے سامنے کوئی بہترین شعر آجاتا تو وہ کسی اور چیز کی پروا تک نہ کرتی۔ ایک بار اس نے اپنی کسی لونڈی کو بیاض لانے کو کہا راستہ میں اسے حوض ملا جس میں سُرخ مچھلیاں تیر تیر کر فطرت ازلی کے حسن نہاں کا راز فاش کر رہی تھیں۔ وہ جذبات سے بے خود ہو کر اس طرف کی ہو کر رہ گئی اور اسی عالم میں بیاض حوض میں گر کر ضائع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ زیب النساء کو بیاض کتنا پیارا ہو گا اور اس کو کیا کچھ نہ صدمہ ہوا ہو گا لیکن وہ دوسروں کے بہترین اور فی البدیہہ کلام کی بھی حقیقی قدردان تھی جس وقت اس لونڈی فی البدیہہ یہ رُباعی پڑھ کر اس واقعہ کو سُنایا ؎

آں بیاض خاصہ شاہی کہ در وے ہر طرف

چلا نگہ کو اکب نقطہ ہائے انتخاب افتادہ است

ایں زمان از دست روشن خام غالش در یقین

چوں بیاض در سینہ ماہی در آب افتادہ است

تو اگرچہ اس کا سب سے زیادہ محبوب متاع عزیز ضائع ہو چکا تھا اس نے از راہ قدردانی اس روشنی نامی لونڈی کو کچھ نہ کہا اور اس کی تقصیر معاف کر دی۔

اسی طرح اسی لونڈی سے ایک بار اتفاقیہ ایک آئینہ ٹوٹ گیا جو کسی بادشاہ کا تحفہ تھا اور نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے ہوئے زیب النساء کے پاس آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ کس قدر اہم اور تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتا تھا جس وقت وہ ٹوٹ گیا تو اس لونڈی نے اپنے الفاظ میں اس واقعہ کی اطلاع کی ؎

از قضاء آئینہ چینی شکست

زیب النساء نے اس عظیم الشان نقصان کی پروا نہ کرتے ہوئے کیا خوب فی البدیہہ مصرعہ ارشاد فرمایا ؎

خوب شد اسباب خودبینی شکست

لفظ "خودبینی" میں کیا کیا لطافتیں اور باریکیاں پوشیدہ ہیں اور دیکھیئے کس پُرشوکت خندہ پیشانی سے اس نقصان کو برداشت کرتے ہوئے اپنی قابلیت کا بے پردہ ثبوت دیا ہے۔

ایک دن رُخِ انور پر نقاب ڈالے اپنے کوٹھے پر چہل قدمی فرما رہی تھیں۔ ادھر سے ایک ایرانی شاہزادہ کا بھی گذر ہوا دیکھتے برجستہ کہا ؎

پردہ بردار نظر محتاج است

مرہمے داغ جگر محتاج است

زیب النساء نے کیا خوب جواب دیا ہے ؎

اگر من پردہ بردارم فتد بر آسمان غوغا

کہ یارب ایں چہ طوفان است مہ شد بر زمین پیدا

اللہ اللہ پردہ داری کی کیا وجہ بیان کی ہے اور غرور حسن کا کیا اچھوتا مرقع پیش کیا ہے۔۔۔؟

اسی طرح ایک بار کسی ایرانی شاہزادہ نے جو ایک عرصہ سے اس کے حسن جہاں آرا کا شیدائی اور اُسکی شہرہ آفاق قابلیت کا فدائی تھا۔ اُس کے پاس ایک شعر لکھ کر روانہ کیا ؎

ترا اے مہ جبیں بے پردہ دیدن آرزو دارم ٭ تجلی ہائے حسنت را بدیدن آرزو دارم

زیب النساء نے یہ سُن کر لکھ بھیجا ؎

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
ہم چو بو پنہاں شدم در رنگ گل مانند گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

عاشق مزاج شاہزادے نے جس وقت ان اشعار کو سُنا۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ ایک میخوار و بادہ نوش کی طرح بدمست اور بیہوش ہو گیا جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے ارادہ سے توبہ کی اور اب وہ اُس کی صورت پر نہیں بلکہ اس سیرت پر کہ جس پر ملائک بھی سو جان سے عاشق او دفریفتہ تھے۔ قربان تھا۔

سرو کے درخت کو شعراء اکثر بہت پسند کرتے ہیں اور اس کی اکثر مثالیں تشبیہیں دیا کرتے ہیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ زیب النساء کسی باغ میں تفریح کر رہی تھیں۔ وہاں اور تمام اسباب تفریح و نشاط کے ساتھ ہی ساتھ لمبے لمبے سرو کے درخت بھی تھے۔ ان تمام مناظر سے بیخود ہو کر وہ سرو کے درخت سے لپٹ گئی۔ لیکن جب اُس کے جسم نازک کو اس سے تکلیف پہنچی تو اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ قطعہ نکل گیا ؎

وائے بر شاعران نادیدہ ✤ غلطے را بخود پسندیدہ
سرو را قد یار میگویند ✤ سر چوبے است ناتراشیدہ

کس لطیف پیرایہ میں شعرا کی غلطی کا احساس کرایا ہے اور "قد یار" کی حقیقی تعریف و توصیف کا بلند و بالا نظریہ پیش کیا ہے ؎

اورنگ زیب نے ایک بار زیب النساء کو شعر گوئی سے منع کر دیا تھا۔ یہ اُس کی موزوں طبیعت کے لئے اس قدر زبردست سزا تھی جسے وہ کسی حال میں نہ تو برداشت کر سکتی تھی اور نہ اُس کی فطرت رواں کے یہ بس کی بات تھی۔ لیکن بہرحال باپ کے حکم شاہی سے کچھ روز رُکنا ہی پڑا۔ ایک دن بادشاہ تشریف فرما تھے۔ باغ تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ مسکراتے ہوئے غنچے اور کھل کھلاتے ہوئے پھول تھے قمریوں کے ترانے اور بلبلوں کے نالے تھے۔ اگرچہ بادشاہ کا رعب مانع تھا مگر دل میں جذبات کا جو سمندر موجزن تھا بھلا کس بادشاہ کے روکے رُک سکتا تھا۔ شعر نکل ہی گیا ؎

اے عندلیب نالاں دم در گلو گرہ بند
نازک مزاج شاہاں تاب فغاں ندارد

اف ــــ کس قدر نزاکت ہے۔ اور دل کے پوشیدہ جذبات کی کیا روانی ہے اور فطرت کے رازہائے سربستہ کی کیا پردہ برداری ہے۔ بادشاہ باوجود خشک اور زہد مزاج ہونے کے تڑپ اُٹھا اور باوجود ممانعت کے پھر شعر گوئی کی اجازت دے دی ــــ

ایک مرتبہ زیب النساء نے یہ مصرعہ ارشاد فرمایا ؎

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

دوسرے مصرعہ کے لئے اس نے اور شعراء کو دعوت دی۔ ہر ایک نے کوشش کی مگر ناصر علی سرہندی نے جو مصرعہ لگایا وہ نہایت ہی بے باکانہ تھا ؎

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم ✤ گویا رسید بر لب زیب النساء لبم

یہ سُن کر اُس نے انتہائی صبر سے کام لیا اور اس کے جواب میں صرف یہ کہکر روانہ کر دیا ؎

ناصر علی بنام علی پردہ پناہ ✤ ورنہ بہ ذو الفقار علی سر بریدہ است

اللہ اللہ کیا پُر رعب اور جلال میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں اور فطری ہمت و بہادری کا کس حسین طریقہ پر پردہ فاش کر رہے ہیں (بزم خیال ص۲۵)

عاقل خاں لاہور کا گورنر تھا۔ نہایت خوبرو اور ذہین طبع تھا اور نہایت عمدہ شاعر تھا۔ اس سے اور زیب النساء سے اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ زیب النساء نے یہ شعر لکھا ؎

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں والاست
سر بصحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست

عاقل خاں نے جب اسے سُنا تو جواب میں لکھ بھیجا ؎

عشق تا خادم ست باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پاست

یہ شعر اگرچہ کتنا عمدہ اور لطیف ہے لیکن زیب النساء جو جواب دیتی ہے۔ اُسکی عظمت اور پاکیزگی اور بلند خیالی کو کیا کہئے ؎

پاکبازاں محبت را حیا باشد مدام
چو تو مرغ بے حیا را کے حیا زنجیر پاست

صرف ایک شعر میں محبت کا جو فلسفہ اور اسکی واقعی قدر و منزلت زیب النساء نے جس انداز اور جس نزاکت اور خودداری کے ساتھ بیان کی ہے وہ خود اپنی نظیر ہے اور دل چاہتا ہے کہ بار بار پڑھا جائے ـــــ یہ تھی بھی راز دار زیب النساء کا حسن جب شہرہ آفاق عالم تاب ہوا تو ایران کے ایک عاشق مزاج شاہزادہ نے دیدار کے لئے ایران سے دلی کا عزم کیا۔ دلی پہنچکر ہر طرح سے زیارت کی کوشش کی مگر ہر طرح سے ناکام و نامراد رہا۔ آخر ایک دن کسی طرح زیب النساء کے باغ میں جا گھسا اور لباس بدل کر ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے زیب النساء کو پیش کیا۔ زیب النساء دیکھتے ہی سب واقعہ سمجھ گئی اور فوراً کہا ؎

بگو اے عاشق صادق چرا گلدستہ آوردی
دل بلبل شکستی ہمسر ما گلدستہ آوردی

لیکن شاہزادے نے بھی فوراً عرض کیا ؎

برائے زینت دستت نہ ایں گلدستہ آوردم
بخوبی لاف میزد گل بہ پیشت بستہ آوردم

شاہزادی یہ پھڑکتا ہوا شعر سن کر بے قابو ہوگئی اور فوراً نقاب الٹ دی کہ دیکھنے والا محروم دیدار نہ رہے۔

عاقل خاں جب زیب النساء پر عاشق ہوا اور دن رات کے لمحات اسی غور و فکر میں کٹنے لگے تو ایک روز بے حد پریشان ہو کر اس کے زیر تعمیر باغ میں گارے کا گوندا بیسکر گھس گیا۔ سامنے والے مکان میں زیب النساء چوسر کھیل رہی تھی اس سے ضبط نہ ہو سکا اور پکار کر کہا ؎

من طلبت گرد جہاں میگردم

زیب النساء نے آواز پہچان لی اور فوراً فرمایا ؎

گر باد شوی تا سر زلفم نرسی

اسی طرح عاقل خاں ایک بار قلعہ کی فصیل کے نیچے اس کے فراق میں ٹہل رہا تھا۔ کہ سرخ لباس زیب تن کئے زیب النساء کوٹھے پر دکھائی دی۔ آپ نے فوراً باآواز بلند پڑھا ؎

سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید

زیب النساء کی شوخی طبیعت بھلا کب اس جگہ خاموش رہنے کی اجازت دیتی فوراً مصرعے پر مصرعہ لگایا ؎

نہ بزاری نہ بزور و نہ بزر می آید (تذکرہ شعراء)

جب دشمنوں نے اس پر عاقل خاں سے ایک نہایت ہی بے جا اتہام لگایا۔ اور بحکم عالمگیری قید ہوئی۔ تو اسوقت اس نے اپنی پاکدامنی میں ان معصوم الفاظ کو پیش کیا تھا ؎

قسم بکعبہ حاجات و احمد مرسلؐ ٭ کہ پاکبازی من باعث گناہ من است

شام کے وقت پرفضا جگہ میں ایک بار زیب النساء تنہائی میں یہ اشعار کسی خاص کیفیت میں پڑھ رہی تھی ؎

چہار چیز ز غم از دل برو کدام چہار
شراب و سبزہ و آب رواں و روئے نگار

کہ اسی حالت میں بادشاہ تشریف لے آئے۔ انھیں اس قسم کے اشعار سے سخت نفرت تھی۔ مگر وہ اسقدر بے خود تھی کہ اسے آنکھ اٹھانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ مگر بادشاہ جب بالکل قریب آ گئے تو اس نے اس شعر کو اس طرح بدل کر پڑھنا شروع کر دیا ؎

چہار چیز کہ غم می برد کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

اورنگ زیب سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ مگر صرف اپنی بیٹی کی حسن لیاقت کو دیکھ کر خاموش رہا۔ (باغ و بہار)

ایک بار زیب النساء بازیگروں کا تماشہ دیکھ رہی تھی ایک عورت بانس پر چڑھ کر چکر کھا رہی تھی شعراء اس پر اشعار موزوں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے کہا ہی تھا ؎

ایں لعبت بو العجب کہ بر نے پیداست
یک تازہ گلے کہ بر سر شاخ رعناست

کہ زیب النساء نے کہا اور کیا خوب کہا ہے ؎

نے نے غلط است کافتاب محشر
بر نیزہ برآمد و قیامت برپاست

دیکھئے کیا تشبیہہ دی ہے۔ عورت کو آفتاب اور بانس کو نیزہ پھر ان دونوں کا محشر کے ساتھ ذکر کر کے کلام میں کیا خوبی پیدا کر دی ہے!

ایک دن وہ باغ میں تفریح کر رہی تھی۔ عاقل خاں بھی اُدھر سے نکلا اور دیکھتے ہی یہ پڑھا ؎

نرگس زدہ بر سرو از شوق تو نرگس
خم کردہ رُخ خویش کہ رخسار تو بیند

زیب النساء نے اُس کے جواب میں فوراً یہ چبھتا ہُوا شعر پڑھا ؎

این نہ نرگس کہ تو دیدی بہ سر افسر من
بہ تماشائے تو بیرون شدہ چشم من

ایک مرتبہ اورنگ زیب نے یہ مصرعہ موزوں کیا اور زیب النساء کو اس پر مصرعہ لگانے کو کہا ؎

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد

بادشاہ کی زبان سے فقرہ نکلا ہی تھا کہ اُس نے فوراً دوسرا مصرعہ یوں لگایا ؎

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد
کہ چرم گرگ تیغ شیر افگن را سپر باشد

بادشاہ اس حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی پر بےحد خوش ہُوا اور فرطِ مسرت سے گلے لگا لیا۔ (مقالاتِ شبلی مطبوعہ دار المصنفین)

یوں تو زیب النساء کو بدیہہ گوئی میں جو ملکہ اور کمال حاصل تھا وہ خود اپنی نظیر ہے اور گذشتہ چند مثالوں سے اچھی طرح سے جان لیا گیا ہوگا۔ کہ اس چیز میں اسے کہاں تک مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اور قدرت نے اس چیز کو اس کی سادہ اور معصوم فطرت میں کہاں تک ودیعت کر رکھا تھا۔ لیکن اوپر کا جو شعر گزرا ہے اس کے متعلق اہلِ علم اور صاحبِ فن حضرات کا بیان ہے کہ بدیہہ گوئی کی یہ ایسی زندہ مثال ہے اور ایسی بلند و پاکیزہ مثال ہے کہ جس کی نظیر مشکل سے پیش کی جاسکے گی۔

زیب النساء نہ صرف یہ کہ خود بہترین شاعرہ اور باکمال بدیہہ گو تھی۔ بلکہ اُس کی شوخیٔ طبیعت اور اُس کے فیضِ صحبت نے انھیں بھی شاعرہ کر دیا تھا جو اس کے ارد گرد رہا کرتی تھیں اور اس چیز کو اُس نے عملاً مشاہدہ کرا دیا تھا کہ آفتاب کا عکس جس چمکدار چیز پر پڑ جائے گا وہ بھی آفتاب ہی کی طرح نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک بار وہ اپنے آرامگاہ میں محوِ خواب تھی اُس کی ایک خواص آئی اور یہ دیکھکر بکمالِ ادب ولحاظ جگا نہ سکی۔ البتہ اس نے ذیل کے اشعار اسی وقت موزوں کرکے اُس کے سرہانے رکھ کر چلی گئی ؎

تو بخواب ناز بودی	و من از رقیب پنہاں
کف پات بوسہ دادم	ز حنا شنیدہ باشی

بیدار ہونے کے بعد شاہزادی کو یہ اشعار سرہانے رکھے ہوئے ملے دیکھکر بڑی شرمندہ ہوئی۔ اتفاق یہ کہ دوسرے روز جو یہ اُس کے آرامگاہ کی طرف گئی تو اسے اپنے شوہر کے ساتھ سوتا پایا اس وقت اس نے ذیل کے اشعار اسی وقت کہکر اور لکھکر چلی آئی ؎

مہ من بدور رستی	بہ سرت قسم کہ روزے
نہ تو دیدہ ام آدرے	کہ تو ہم نہ دیدہ باشی

وزیر زادی جب بیدار ہوئی اور اسے واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر شرمندہ اور پشیمان ہوئی کہ ایک مدت تک زیب النساء سے مُنہ چھپاتی رہی۔ تا آنکہ زیب النساء نے پھر اُس کے متعلق دوسرے اشعار کہے اور اس شرم کے ازالہ کی فکر کی۔

زیب النساء کے اگرچہ بےشمار واقعات، ور اشعار ایسے اب بھی موجود ہیں جو اس کی قابلیت اور فطری صلاحیت و استعداد پر چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح گواہی دے رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے عہدِ پارینہ کی حسرت بھری نگاہوں سے یاد دلا رہے ہیں۔ مگر قلتِ گنجائش کی وجہ سے ہم نے ان سب کو نظر انداز کیا اور ان میں سے خاص خاص کا ذکر کر دیا۔

اس مضمون کی تیاری میں اگرچہ اور ماخذوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ لیکن زیادہ تر بزمِ خیال سے مستعار ہے ٭

ناکام آرزو

از جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی

رو داد اپنے غم کی اب کیا کہوں کسی سے
لگتی ہے چوٹ دل پر تاروں کی روشنی سے

تیر نظر سے اپنے چھیڑو نہ میرے دل کو
ناکام آرزو ہوں محروم ہوں خوشی سے

ہوتا ہے ذکر میرا روز اُن کی انجمن میں
ہے دشمنی غنیمت اب اُن کی دوستی سے

اے کاش تُم نہ دیتے پھر دعوتِ نظّارہ
اے کاش میں نہ ہوتا ہُشیار بیخودی سے

کیا جاؤں سوئے گلشن، دلبر ہے آگ روشن
بڑھتی ہے اور وحشت پھولوں کی دلکشی سے

اے عشق پھر جگا دے جذباتِ زندگی کو
تنگ آگیا ہے انساں غم ہائے بیکسی سے

برداشت کر رہا ہے صدمات دو جہاں کے
کیا کام لے لیا ہے فطرت نے آدمی سے

صدمے ابھی ہزاروں سہنے پڑینگے دل پر
کیوں عشق میں کسی کے گھبرا گئے ابھی سے

عورت کے آنسو

ایک ایکٹ کا ڈراما

(از جناب ا۔ح۔ پرواز۔ بریلی)

افراد

نثار .. .. ایک مزدور

شاہینہ .. .. نثار کی بیوی

راحینہ .. .. نثار کی چھ سالہ لڑکی

زمانہ

بس یہی ہمارا آپ کا

منظر

(شاہینہ اپنے شکستہ مکان کے اندر نماز پڑھ رہی ہے۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سُرخی مائل زرد کرنیں ٹوٹی ہوئی چھت اور بوسیدہ در و دیوار سے مل مل کر رخصت ہو رہی ہیں۔ مٹی کی ہنڈیا چولھے پر چڑھی ہوئی ہے۔ چولھے میں خفیف سی آگ روشن ہے۔ چند چھوٹے موٹے برتن اور پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا جس کا گلا ٹوٹا ہوا ہے باورچی خانے میں رکھا ہوا ہے۔ راحینہ دنیا کی فکروں سے آزاد صحن میں بیٹھی ہوئی مٹی سے کھیل رہی ہے)

شاہینہ۔ (نماز پڑھ کر دعا مانگتے ہوئے) سنا تھا ۔۔ ازدواجی زندگی موسیقی اور شعر سے لبریز ہوتی ہے۔ مگر آہ! میرے نزدیک تو اس سے زیادہ بے کیف اور منحوس زندگی کوئی نہیں! دن رات کا رونا ۔۔ روٹی کی فکر ۔۔ برہنہ پا اور گرسنہ شکم بچوں کا خیال۔ شوہر کی نفرت اور بدمزاجی ۔۔ شادی سے پہلے میں ان فکروں سے آزاد تھی مگر زندگی اب کتنی اجیرن ہو گئی ہے ۔۔ کیا یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔۔ اس سے تو موت ہی بہتر ہے! مگر نہیں ...... صبر کا پھل میٹھا ہے ۔۔ ہر حالت میں خاموش رہنا چاہیئے ۔۔ خدا بڑا علیم اور کریم ہے ۔۔ وہ بے گناہوں پر ظلم نہیں ڈھاتا! اگر میری زندگی گناہوں سے پاک ہے تو وہ مجھ پر ضرور کرم فرمائیگا۔ پروردگار! مجھے شکوہ نہیں کہ میرا شوہر شقی القلب ہے ۔ بدمزاج ہے ۔ مجھ پر ظلم ڈھاتا ہے ۔۔ اپنی معصوم بچی راحینہ کو بھی دیکھ کر خوش نہیں ہوتا لیکن خدایا تو انھیں توفیق دے کہ وہ عورت کے جذبات و احساسات کو سمجھ سکیں ۔۔ میرے حقوق ۔۔ اپنے فرائض اور راحینہ جیسی معصوم اور بھولی بچی کو محبت اور اس کے قوی جذبات سے معمور ہو کر چپٹا چپٹا لیا کریں۔ خدایا! تو ہم غریبوں پر کرم کر ۔۔ ہمیں سرمایہ داروں کے خونخوار اور شیطانی پنجوں سے بچا ۔۔ ہمارے رزق میں برکت دے ..... اور ..... اور ہمارے دلوں کو اپنی پاک محبت کی روشنی سے چمکا دے!

(شاہینہ جانماز طے کر کے سامنے دیوار میں بنی ہوئی الماری میں رکھ کر باورچی خانے کا رُخ کرتی ہے)

راحینہ۔ دیکھو اُمّی ہم نے کیسی اچھی دکان لگائی ہے!

شاہینہ۔ (مسکراتے ہوتے) ہاں بیٹی بڑی اچھی ہے۔

(باورچی خانے میں جا کر چولھے کے پاس پڑی ہوئی ایک پکی اینٹ پر بیٹھ جاتی ہے)

شاہینہ۔ (روٹی پکاتے ہوئے) راحینہ! دیکھو تمہارے ہاتھ پیر کپڑے سب مٹی میں سَن گئے ہیں۔ اُٹھو! دھو ڈالو۔ آج تمہارے ابّا

آتے ہوں گے ۔

(راحینہ ابا کا نام سنتے ہی شاہینہ کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے)

راحینہ (کچھ سوچکر) امی ابا آتے ہیں مگر ہم سے بات بھی نہیں کرتے ۔ نازو کا ابا لڈو لاتا ہے ۔ اس سے مزے مزے کی باتیں کرتا ہے ۔ پیار کرتا ہے ۔ ہمارے ابا کچھ بھی نہیں کرتے ۔

شاہینہ (رکھکر) ہاں .... بیٹی !

راحینہ ۔ ابا کو کیا ہو گیا ہے ؟ امی ! ۔ وہ گھر میں کسی سے بات ہی نہیں کرتے ہیں۔ تم سے بھی ۔ نازو کا ابا ۔ نازو کی امی کو اچھے اچھے کپڑے لاکر دیتا ہے ۔ اس سے گھنٹوں باتیں کرتا ہے ۔ ساتھ کھانا کھاتا ہے ہمارے ابا کچھ بھی نہیں کرتے ۔ بڑے برے ہیں ابا ۔ ہم نازو کے ابا کو اپنا ابا بنائیں گے ۔

شاہینہ ۔ (حزن آمیز تبسم کے ساتھ) پگلی کہیں کی ! ۔ جا منہ ہاتھ دھو لے ۔ آج تیرے ابا بھی تجھے پیار کرینگے ۔

راحینہ ۔ تم دُھلا دو امی !

(شاہینہ اٹھتی ہے ۔ لوٹے میں پانی لیکر راحینہ کا منہ ہاتھ دُھلاتی ہے)

شاہینہ ۔ (منہ ہاتھ دُھلا کر) باہر کھیلو ۔ ابا آتے ہی ہوں گے ۔ انھیں پکڑ لینا (انگلی اٹھا کر بتاتے ہوئے) اچھا .....؟

راحینہ ۔ (انگلی ہلاتے ہوئے) اچھا

(جاتی ہے)

شاہینہ ۔ فطرت کی کرشمہ سازیاں تو دیکھو ! ایک بچہ بھی محبت اور نفرت کے جذبات کو سمجھنے کی تمیز رکھتا ہے ۔ مگر افسوس راحینہ کے ابا تم نہیں سمجھ سکتے ! سچ ہے دیو قامت مشینیں چلانے اور سخت کام کرنے سے مزدور کے لطیف جذبات اور احساسات بھی سرد پڑ جاتے ہیں ۔ مزدور ۔ کتنا خوفناک لفظ ہے انسان کو بے حس مردہ اور حیوان بنانے کا زبردست آلہ !

(نثار غصہ میں اندر داخل ہوتا ہے پیچھے پیچھے راحینہ آتی ہے)

نثار ۔ یہ کیا بدمذاقی ؟

شاہینہ ۔ کیا ؟

نثار ۔ خوب ۔ پوچھتی ہو کیا ! جیسے معلوم ہی نہیں ۔ اپنی بچی کو سکھا دیا کہ جب ابا آئیں انھیں چمٹ جانا (زور سے) مجھے یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے ۔

شاہینہ ۔ بس کرو بچی ہے ۔ بھول ہو گئی ۔

نثار ۔ بھول ہو گئی ! دل میں آتا ہے کم بخت کو دیوار سے مار دوں ۔

(سکوت)

نثار (زور سے) راحینہ جا باہر کُرسی ڈال آ ۔

(راحینہ کونے سے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی گھسیٹ کر باہر لے جاتی ہے)

نثار ۔ (جیب سے پیسے اور بوتل نکال کر دیتے ہوئے) یہ لو راحینہ سے شراب منگا دو ۔

شاہینہ ۔ (انتہائی رنج و کرب کے عالم میں) آہ ! شراب پینا شروع کر دی ؟

نثار ۔ ایں ہر شخص شراب پیتا ہے ۔

شاہینہ ۔ مگر ..... تم میری خبر گیری کیسے کر سکو گے ؟

نثار ۔ میں تمہارا چوکیدار نہیں ہوں ۔ (زور سے) ہم اپنے کمزور ہاتھ پیروں سے کام لینے کی خاطر شراب کی جھلس دینے والی چابک کا استعمال نہ کریں تو دم بھر فیکٹری کے اندر نہیں رہ سکتے ۔

(باہر جاتا ہے ۔ راحینہ آتی ہے)

شاہینہ (غصہ میں) راحینہ ! لے تھوڑی شراب لے آ ۔

(پیسے اور بوتل دیتی ہے راحینہ جاتی ہے)

شاہینہ کیا یہی مزدور کی زندگی ہے ؟ مہیب دیو ! غریبی ، مفلسی ، گرسنگی انسان سے اسکی آدمیت ۔ مذہب اور خدا کا ڈر سب کچھ چھین لیتے ہیں ۔ اُسے اچھا خاصا شیطان بنا دیتے ہیں ۔ او خدا ! انھیں ان غلیظ دیوؤں کے چنگل سے چھڑا !

(نثار آتا ہے)

نثار ۔ (معمول کے خلاف) کل سے میں اسی شہر میں کام کروں گا ۔ جھریا سے تبادلہ کر دیا گیا ہے ۔ اچھا ہوا روز روز کی ہیرا پھیری سے بچ گیا !

شاہینہ۔(خوش ہوکر) کیا سچ!
نثار۔ (بیقرار ہوکے) شراب آئے تو باہر بھیجدینا۔
(جاتا ہے۔ شاہینہ باورچی خانے سے نکل کردالان میں جاتی ہے اور جانماز بچھاکر خدا کا شکر اداکرتی ہے)
شاہینہ۔پروردگار تیرا ہزار ہزار شکر۔ تونے نثار کو بدی کی دنیا سے بچالیا۔ اب وہ دن رات میرے ساتھ رہیں گے۔ میں انھیں ٹھیک کرلوں گی۔۔۔ انھیں ٹھیک کرلوں گی، پروردگا میری مدد کر!
(دو آنسو ڈھلک کراُس کے رخساروں پر آجاتے ہیں۔ نثار آتا ہے)
نثار۔ (دیکھکر) ہائیں! یہ کیا ہوا؟ ۔۔۔ تم توکبھی نہیں روئیں آج کیا بات ہوئی؟
شاہینہ۔ (بیتاب ہوکر) مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اپنے مقدر کا رونا ہے!
نثار۔ (غصہ میں) کیسا مقدر؟
شاہینہ۔یہی کہ میں تمہاری ہوگئی، مگر تمھیں اپنا نہ بنا سکی!۔۔۔ پیارے! تمھاری نفرت، گناہ، سختی، لامذہبی، شراب خواری سب کی جڑ میں ہی ہوں۔ میں نے ہی تمھیں ایسا بنایا۔۔۔ میں نے ہی تمھیں زندگی کی یہ خراب تصویریں دیکھنے دیں۔ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں دُعا کررہی ہوں، شاید تم سنبھل جاؤ۔۔۔ اپنی معصوم بچی سے پیار کرنے لگو۔۔۔ مجھ سے التفات برتنے لگو۔ (روتے ہوئے) دنیا کی ذلیل ترین عادت، شراب خواری ترک کردو۔۔۔ (آہستہ سے) ترک کردو! خدا کے لئے ترک کردو!!
نثار۔ (متاثر ہوکر) سچ ہے عورت کے دو آنسو بعض اوقات مرد کے تمام گناہ دھوسکتے ہیں۔ شاہینہ! میں۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں اب شراب نہیں پیونگا۔ مجھ سے بھول ہوئی۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا۔۔۔ آج معلوم ہوا، تم صبر کا سرچشمہ۔۔۔ وفا کی دیوی اور نیکی کا مخزن ہو۔ تم خداوندکریم کی سچی عابدہ ہو۔ تمہاری دعائیں سچائی اور خلوص سے لبریز ہوتی ہیں۔ تمہارے آنسوؤں اثر اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آج سے میں تمہارا غلام ہوں۔ اپنی عزت کی قسم۔۔۔ مزدور کی مستعدی، جفاکشی اور محنت کی قسم! ہمیشہ تمہارا کہا کروں گا۔۔۔ اپنی زندگی بھر! مجھے اپنی عزت کی قسم!۔۔۔ خدا سے دعا کرو، میرے گناہوں کو بخش دے اور نیکی کی توفیق دے!
(راحینہ آتی ہے۔ نثار جھپٹ کر بوتل لے لیتا ہے اور زور کے ساتھ سے زمین پر دے مارتا ہے)
نثار۔ (بوتل کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے) دور ہو۔۔۔ اے گناہوں سے لبریز ہستی دُور ہو۔۔۔ دُور ہو!
(راحینہ کو گود میں اُٹھاکر پیار کرتا ہے)
نثار۔ شاہینہ! کل کا شرابی آج اپنے فرائض سمجھ گیا!۔۔۔ آج اُسے سچی خوشی اور ابدی سکون نصیب ہوا!
(شاہینہ کی آنکھیں خوشی سے ناچنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نثار کا شانہ پکڑ کر اپنا سر اُس کے دوش پر رکھدیتی ہے)
(پردہ گرتا ہے)

[illegible] شب — [illegible] میری
[illegible] شباب — زندگانی میری
[illegible] شباب
سوگواری شباب — جوانی میری
[illegible] نصیب — [illegible] جوانی میری

رعنا اکبرآبادی

فلسفی سے خطاب

از جناب آرزو سہارنپوری

ترے خیال کی طاقت، ترا پرِ پرواز
بس ایک دائرۂ ہستیِ فریبِ مجاز

وہاں سے میرے کمالِ نظر کا ہے آغاز
نہ حسن و عشق جہاں ہیں نہ غزنوی و ایاز

تری بلندیِ تخئیل مادیِ فطرت
مرے خیال کی پستی بھی آسماں کا فراز

ترا فسانہ بے لطف خشک سا منطق
مرے خیال میں ہر راز ایک محشرِ زار

ترا تدبر کامل ہے اِک ارادۂ پست
تمام حشر و ابد میری منزلِ پرواز

تو کہہ رہا ہے جسے جنبشِ پرِ جبریل
مرے ضمیر کی ہے وہ لطیف سی آواز

مرے تجسسِ معنی کا ذوق، بے پایاں
ترے کمال کا عالم ہلاکِ تیغِ مجاز

ایاغِ تنگ میں تیرے شرابِ خشک نظر
مری نظر میں محبت کی کیفیاتِ راز

تو آئینے کو حدودِ نظر سمجھتا ہے
میں خود ہی آئینہ خود ہی مذاقِ آئینہ ساز

تری خرد کی منازل ہیں چند عنوانات
مرے تصورِ معنی سے عرش کا دَر باز

رموزِ عام ہیں ذہنی تصورات ترے
جمالِ خاص کی تحقیق ہے مرا اعجاز

زمانہ میری نگاہوں میں ایک حرفِ غلط
تری نگاہ میں دنیا ہے آخری پرواز

ہر اک نگاہِ محبت مری بنائے جمال
ہر ایک سانس مری زیست کا حیات نواز

تری نگہ کے اشارے فقط ترے محرم
مذاقِ شاہدِ فطرت بھی خود مرا ہمراز

تری نگاہ میں ذراتِ بے وجودِ مذاق
مرے مذاق پہ غیب و شہود کو سو ناز

تری نگاہ میں آغاز کا ہے نام انجام
مری نگاہ میں انجام کار بھی آغاز

فضائے علم و ہنر تنگ دائرہ ہے ترا
حجابِ علم و ہنر میری وسعتوں کا راز

قدیم اقوام عالم اور موسیقی

ایک بلند پایہ تحقیقی مقالہ

(از جناب امجد علی خانصاحب یوسف زئی (عثمانیہ)

موسیقی دو لفظوں سے مرکب ہے "مو" اور "سیقی"۔ لفظ "مو" یونانی لغت میں آواز کو کہتے ہیں اور "سیقی" بمعنی گرہ۔ چونکہ اس اس علم کا موضوع لحن ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام موسیقی ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ موسیقی کی ایجاد پہلے کس نے کی۔ بعض کہتے ہیں کہ حکیموں نے قفنس کی آواز سے موسیقی اور راگ ایجاد کیا ہے قفنس قوقنوس کا مخفف ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اسکی چونچ سوراخدار ہوتی ہے۔ اس میں سے جداگانہ آوازیں نکلتی ہیں ہندیوں کے ہاں راگ کی ایک قسم دیپک ہے۔ وہ بھی اسی چونچ سے نکلنا بیان کیا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس جانور کی چونچ میں ۳۶ سوراخ ہوتے ہیں۔ فارسی زبان میں اس کا نام آتش زن ہے (فنون لطیفہ مؤلفہ سلطان احمد صفحہ ۱۳۷)

بعض حضرات کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام اس کے بانی ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اسکی ابتدا حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہوئی اور اس اہم ترین فرض کی انجام دہی حکیم فیثا غورث کے حصہ میں آئی۔ چند حضرات یہ دعوے کرتے ہیں کہ اسکی ابتدا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام میوزک کا ہنر یا موسیقی ہوا لیکن تاریخ روضۃ الصفا اور صاحب روضۃ الاحباب کا قول فیصل یہ ہے۔ کہ موسیقی ابو البشر (حضرت آدمؑ) کے زمانہ میں جاری ہوئی۔ اپنے اس دعوےکی دلیل و شہادت میں کلام ربانی کی آیت وَعَلَّمَ آدَمَ الاسماءَ کلھا (اور آدم کو تمام اسماء تعلیم کئے گئے) کو پیش کرتے ہیں۔ اور دوسری شہادت اس امر کی بھی دلاتے ہیں کہ مزامیر قابیل پسر حضرت آدم کی ایجاد ہے (عالمگیر خاص نمبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۳۷)

اوپر جس قدر روائتیں بیان کی گئی ہیں یہ سب اعتقادی روایات ہیں۔ سب لوگ اسکی تصدیق نہیں کرسکتے اور نہ سب لوگ ان کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ موسیقی کی ایجاد ایک ہی شخص نے کی ہے ایک ایسی تھیوری ہے جس پر کبھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ساری دنیا میں راگ کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ کسی خاص شخص نے رفتہ رفتہ اس میں خاص ترقی کی ہو۔ اور خاص خاص قواعد کی تدوین اسکی معرفت عمل میں آئی ہو۔ راگ اور موسیقی ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کا ایجاد کرنے والا ساری دنیا میں ایک ہی نہیں ہے مختلف لوگ ہیں مختلف رنگوں میں اس کا ایجاد ہوا ہے۔ اور مختلف رنگوں میں اسکی شہرت ہوتی گئی ہے۔ البتہ بعض قومیں مثلاً ہندوستانی۔ شامی ایرانی۔ یونانی وغیرہ کمالات راگ کے واسطے خاص طور پر شہرت رکھتی ہیں۔ (فنون لطیفہ مصنفہ سلطان احمد صفحہ ۱۳۹)

غرض موسیقی ایک قدیم فن ہے حال میں جو تحقیقاتیں ہو رہی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اس فن کی قدامت بہت زیادہ ہے چنانچہ حضرت نوحؑ کے طوفان سے چھ ہزار برس قبل کے جو حالات اسوقت تک معلوم ہوچکے ہیں اُن سے پتہ لگتا ہے۔ کہ اُس وقت کی دُنیا پوری طرح متمدّن تھی۔ اسی وقت کی ایک نسل کے آثار برطانی عجائب خانہ میں رکھے گئے ہیں۔ جو مقام اور مضافات عراق میں برآمد ہوئے تھے۔ یہی وہ شہر ہے جس میں حضرت خلیل اللہ پیدا ہوئے تھے۔ ان اشیا میں قدیم آرٹ اور شائستگی کی

تاریخ ظاہر کرنے کے لئے چوٹی کی اشیاء بھی شامل ہیں۔ غیر معمولی دلچسپی کی چیزیں بڑے بڑے ساز ایسے ہیں۔ جن پر سونے اور چاندی سے مینا کاری کی گئی تھی۔ اُن میں سے ایک صندوق الصّوت پر ایک ریش دار بیل کا طلائی سر لگایا گیا ہے۔ ایک دوسرا بربط بھی ہے جس پر نقاشی بہت عمدہ ہے۔

دانیال علیہ السلام اپنی کتاب میں چند اقسام کے ساز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بابل میں قدیم قسم کے ساز موجود تھے (مجلہ مہر طہران۔ شمارہ ۶ سال پنجم۔ ص ۵۲۶)

علاوہ ازیں زبور اور انجیل میں اس کی جانب بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ زبور کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں (یک ہزار چہار دہ قبل مسیح) میں غنا کا بڑا چرچا تھا۔ بنی اسرائیل بڑے خوش الحان لوگ تھے اور انہیں اس فن اور اس کے کمال پر ناز تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خوش الحانی بارگاہ ایزدی سے بطور معجزہ عنایت ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جب آپ زبور تلاوت فرماتے تو انسان تو کیا چرند پرند تک مسحور ہو جاتے اور آپ کے اطراف کھڑے ہو جاتے۔ آپ کے الحان سے بہتا ہوا دریا بھی ساکن ہو جاتا تھا۔

کتاب زبور کے باب ۴۰ آیت ۳ میں لکھا ہے "اس نے (یعنے خدا نے) میرے منہ میں ایک نیا گیت ڈالا جس سے ہمارے خدا کی حمد ہوئی۔ (فنون لطیفہ مصنفہ سلطان احمد ص ۱۳۸)

دیگر حوالجات بھی ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں (تعلیمات موسیقی از مکتل علی نقی خاں ص ۲)

(۱) جملہ ۳۳ فراز اول و دوم و سوم و چہارم میں ہے۔ اے مقدس لوگو خدا کی حمد و ثنا گاؤ۔ کیونکہ حمد و ثنا خدا ہی کے لئے ہے۔

(۲) خدا کا شکر چنگ میں ادا کرو اور دس تار والے ستار میں اس کی ثنا گاؤ۔

(۳) نیا گیت اس کے لئے گاؤ۔

(۴) خوشی اور شادمانی کے ساتھ ساز بجاؤ۔

جملہ ۴۳ فراز چہارم۔ قربان گاہ میں جاؤنگا۔ کیونکہ خدا میرا سرور شادمانی ہے اور بربط پر تیرا شکر یہ ادا کرونگا۔ اے میرے خدا۔ اے میرے پروردگار (جملہ اوّل فراز اوّل و دوم و سوم و چہارم دا) اقرار خداوندی اور تیرا نام گانا اے خدا اچھا ہے۔ (۲) تاکہ تیری رحمت کو صبح اور تیری وفاداری کو راتوں میں ظاہر کریں۔ (۳) دس تار والے ساز کے ساتھ نیل دھیان پر اور بربط کے ساتھ کیونکہ اے خداوند تو نے اپنی صنعت سے ہم کو شاداں کیا اور تیری دستکاری پر میں فخر کروں گا۔

جملہ ۹۸ فراز چہارم، پنجم، ششم۔ خداوند کی بربط اور نیل پرواز کے ساتھ تسبیح گاؤ۔ نفیر اور بربط و آواز کرنا کے ساتھ حضور بادشاہ اور خداوند میں شور مچاؤ۔

جملہ ۱۵۰ فراز سوم، چہارم و پنجم۔ آواز کرنا و بربط کے ساتھ اس کی حمد کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بربط، آواز کرنا وغیرہ ساز رائج تھے اور حمد و ثنا میں ان کا استعمال ہوتا تھا۔ گویا موسیقی اُن کی عبادت کا جزو تھی۔

انجیل میں اس کے متعلق بعض حوالجات ملتے ہیں۔ چنانچہ کتاب پیدائش (بائبل) کے چوتھے باب کی اکیسویں آیت میں ہے کہ سب سے پہلے یوبل نامی شخص نے بین اور بانسری بنائی۔

(۲) فلسطین کے خاندان کو تباہ کرنے سے قبل سیمسن نے بربط پر گانا سنا جس سے اس کے بدن میں طاقت آ گئی۔

اہلِ ہند نے اس فن میں وہ ترقی کی کہ باید و شاید۔ مذہبی روایات کے مطابق یہ اپنی موسیقی کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ وید مقدس اس امر کی شاہد ہیں کہ وید زمانے میں مختلف آلات موسیقی مثلاً ڈنڈبھی۔ ادامبر بھومی۔ اگاتی۔ گھنڈا۔ کرکاری۔ واتا۔ اور وینا رائج تھے۔ فلوٹ کی قسم کے ہوائی آلات تین قسم کے تھے۔ تنا وا (لکڑی کی فلوٹ) ندی (بانس کی فلوٹ) اور باکرا (انڈین میوزک)

ہندوستان کے علم ادب کی قدیم ترین یادگار جو ہم تک پہنچ سکی ہے "رگ وید" ہے جو بلا شبہ دنیا کی اوّلین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس میں ہندو دیوتاؤں کی مختلف اصنام کی ثنا خوانی اور اُن کے کارناموں، عظمت اور فیض بخشی کے ترانوں پر مشتمل ہیں۔ یا ایسی دعائیں ہیں جو مویشیوں اور دنیاوی فائدہ سے متعلق ہیں۔ حقیقت میں یہ بھی مراسم قربانی کے وقت گائے جاتے تھے۔ جس کو سوما؟ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رگ

سے چار ہزار برس قبل ہی سے ان میں غنا کا چرچا تھا۔

یجروید میں فلوٹ اور ڈرم بجانے والوں کا ذکر ہے۔ پس اس زمانہ میں موسیقی ایک فن کی حیثیت رکھتی تھی۔

شام وید رگ وید کے بعد کی تصنیف ہے (۱۸۰۰ق۔م) میں مرتب ہوئی۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ شاعری موسیقی کی عملی طور پر کامل نشوونما کے بعد عرصۂ ظہور میں آئی۔ ہندی راگ کے سات سُر اسی شام وید کے منتروں سے نکلے ہیں۔

راماین میں مذکور ہے کہ اس زمانہ میں فن موسیقی کو نہایت عروج ہو گیا تھا حتیٰ کہ راون، ہنومان تک کو اس فن میں کامل مہارت تھی سگریو کے راجہ اور راون کے درباروں میں اپسراؤں اور رامشگروں کا مستقل طور پر ملازم ہونا بھی ثابت ہے۔

غرض مذہب کی مربی گری سے یہاں رقص و سرود ہزارہا سال پیشتر سے چلا آتا ہے۔ شمالی ہند میں متھرا، اجودھیا اور بنارس اس کے بڑے بڑے مرکز تھے اور دکن کے بڑے بڑے مندروں میں بھی اس فن کی بخوبی پرورش ہوتی تھی (ہندوستانی موسیقی جس کو مولانا شرر مرحوم نے ۱۹۱۶ء کو بڑودہ میوزیکل کانفرنس میں پڑھا) جب مشہور چینی سیاح فاہیان ہندوستان میں آیا تھا تو اس نے ایک بدھ مت راجہ کے سامنے بین بجتے سنی تھی۔

(Record of Western World Vol I

(pages 25 to 95

اور آج سے ساڑھے بارہ سو برس پہلے جب عرب مسلمان سندھ میں آئے تو ملتان کے مندر میں سینکڑوں ہزاروں ناچنے گانے والی عورتیں موجود تھیں۔ اور گجرات کے بعض راجاؤں کے ساتھ عورتیں راستے میں مجری کرتی جاتی تھیں۔ (ہندوستانی موسیقی مؤلفہ شرر مرحوم) جاحظ لکھتا ہے کہ علوم و معارف کے میدان میں ہندوستانی گوروں سے بھی پیش پیش ہیں اور جہاں تک علمی و فنی کمالات کا تعلق ہے مشرق کی دیگر سیاہ اقوام ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور ان کا گانا ہوش ربا ہوتا ہے (زمانہ جنوری ۱۹۳۷ء مضمون "موسیقی" از جناب ورما صاحب بیتاب بریلوی)

ملک شام کی بابت اتنا مشہور ہے کہ وہاں غلام فروشی کی رسم بہت زیادہ تھی اور غیر ممالک کے لوگ یہاں سے غلام اور لونڈیاں خرید کر لے جاتے تھے جن میں سے اکثر لونڈیاں رقاصہ۔ سازندہ اور گویا ہوتی ہوتی تھیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ راگ کیا تھے اور ساز کیا تھے۔

Historians History of the World Vol II Page 345

عبرانیوں (Hebrews) میں نبی اور ولی الہام کے نزول کی خواہش میں موسیقی کا استعمال کرتے تھے۔ Historians

(History Vol II. page 76

قدیم عراقیوں کی بابت اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فوجوں کے ہمراہ راگ گانے اور ساز بجانے والے ہوا کرتے تھے۔ Historians

History Volume I. Page 463

پہلے خاندان شاہی سے جس کا زمانہ ۳۰۰۰ ق۔م (تین ہزار برس قبل مسیح) بتایا جاتا ہے۔ قبروں کی مصوری سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ پوری طرح متمدن تھے کھیت بوتے۔ ہل چلاتے اور فصل کاٹتے تھے۔ جانوروں میں بھیڑ، بکری، بطخ اور دیگر جانور پالتے تھے۔ لباس فاخرہ پہنتے تھے۔ تقاریب اور دعوتیں ہوتی تھیں جن میں Harp استعمال کیا جاتا تھا (History of ancient civilization by Seignobos P.31) تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں تیرہ یا چودہ مختلف ساز رائج تھے۔ ان سازوں میں سے بعض کے نمونے بین النہر کی دریافت میں نکلے ہیں اور جن میں سے ایک "ذات الاوتار" ہے۔ اس میں ۲ تار ہیں۔ اور اس کا زمانہ قریباً ڈھائی ہزار برس قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔

(مجلہ مہر طہران شمارہ ۶ سال پنجم صفحہ ۵۳۶)

Herodotus کے بیان کے مطابق مصریوں کا مرغوب گانا ایک مرثیہ "Lay of Harpes" تھا جو مصر کے تمام خاندانوں کے درمیان نہایت ہی مقبول تھا (The story of the Nation Egypt by Rawlinson p. 25.)

وہ ہر ایک کام میں بخوشی حصہ لیتے تھے۔ وہ گاتے، ناچتے اور شراب پیتے تھے محنت و مشقت کو گا گا کر ہلکا کرتے تھے چنانچہ فصل بوتے کاٹتے، شراب بناتے وقت مختلف گانے گاتے تھے اور یہ زمانہ تقریباً ۱۷۰۰ ق۔م کا تھا۔ The story of the Nation Egypt by Rawlinson. page 28.

ان میں قدیم ہی سے ایک ساز "نے فر" Nefer مستعمل تھا۔ جس سے Harp اخذ کیا گیا Encyclopaedia Britannica
Vol. XIII p. 12 ۱۰۔ XIth Edition اس کے بعد جس ساز کا ہمیں نام ملتا ہے وہ "نانگا" ہے اور یہ تقریباً ۱۵۰۰ ق۔م میں مصر میں رائج تھا چنانچہ بعض "نانگا" برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔

(Encyclopaedia Britannica Vol XIII Page 12)

یہ لوگ بربط بھی استعمال کرتے تھے چنانچہ ایک عورت کی تصویر برآمد ہوئی ہے جس میں وہ بربط بجا رہی ہے۔ یہ بہت مصر میں مبیوین خاندانِ شاہی "بن گوشین" کے مقبرہ میں برآمد ہوا۔ اس کا زمانہ اغلباً ایک ہزار قبل مسیح کا ہے۔ Encyclopaedia Britannica.

Vol XVII Page 132.

Assyria کے باشندے مصریوں کے مانند Harp استعمال کرتے تھے اور عبرانیوں میں بھی ان کا رواج تھا لیکن ان کی شکل اور بناوٹ جُدا تھی۔ عبرانیوں میں دوسرا ساز بھی مستعمل تھا جسے وہ "کنار" Kennor کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

Encyclopaedia Britannica Vol XIII Page 12.

سامریوں میں بھی Harp استعمال کئے جاتے تھے۔ تقاریب اور دیگر مواقع پر ان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

Encyclopaedia Britannica XIII. Page. 12

چین کی تہذیب بھی قدیم ہے۔ اور اس کا شمار ان قدیم مہذب ممالک میں کیا جاتا ہے جنھیں اپنی قدامت پر ناز ہے۔ اس کی تاریخ کی ابتدا سے ہوتی ہے ساسی نے سب سے پہلے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی کہتے ہیں کہ اُس وقت وہاں کے باشندے نہایت وحشی تھے حتیٰ کہ بچے صرف اپنی والدہ کو شناخت کر سکتے تھے۔ اس شہنشاہ نے بہت سی چیزیں ایجاد کیں۔ شکار کھیلنا اپنی رعایا کو سکھایا۔ حیوانات پالنا انھیں بتایا اور موسیقی کے مختلف ساز ایجاد کئے۔ اس کا عہد حکومت ۲۸۵۲ سے ۲۷۳۸ قبل مسیح ہے۔ اس کے بعد تیسرے شہنشاہ نے Huang کی بیوی نے موسیقی کی خاص سرپرستی کی اور بعض ساز بھی ایجاد کئے Yaou خاندان کے بادشاہ نے جس کا عدل نہایت مشہور رہے۔ اپنے محل کے سامنے ایک تختہ لگایا تھا جس پر ایک ڈرم رکھا گیا تھا۔ تاکہ جس کسی کو حکومت سے کوئی شکایت ہو یہ ڈرم بجائے تاکہ بادشاہ اس کی فریاد سُن سکے۔ Encyclopaedia Britannica

Vol. II. Page. 191.

چین کی تاریخ اور دیگر کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں قدیم سے ایک ساز رائج ہے جس کا نام Ku-ch'in ہے۔ اس کی لمبائی ۳۶۵ اکائیاں ہوتی ہے جو سال کے دنوں کی مطابقت سے ہے اور اس میں تیرہ مدور مرصع منڈل ہوتے ہیں جب تاروں کو ان پر کھینچا جاتا ہے تو وہ سُروں کے نشیب و فراز کو ظاہر کرتے ہیں۔ مشہور چینی مورخ Ssu Machien کے بیان کے مطابق اس کی ابتدائی شکل C.207 خاندان تک رہی۔ (رسالہ ایشیا نیویارک۔ ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۸۶۳)

کچھ عرصہ بعد اس ساز میں ترمیم ہوئی اور ایک قسم کا نیا ساز جو نسبتاً آسان تھا ایجاد کیا گیا۔ اس کو "سی" ساز کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کی مختلف قسمیں ہوئیں جن میں مختلف تار لگائے گئے۔ ان میں ۲۵ سے ۵۰ تک تار استعمال ہوتے تھے۔ (رسالہ ایشیا نیویارک۔ دسمبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۸۶۴)

غرض اس فن میں خوب ترقی ہوئی چنانچہ چین کا نبی کانفیوشس (۵۵۰-۴۷۸ ق۔م) اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور دیتا ہے چنانچہ اس کا قول ہے کہ وہ ملک مہذب کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا جس میں راگ کا پرچار وسیع نہ ہو" اور یہ سُن کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک شہنشاہ چینی ایسا گزرا ہے جو کوئی عہدہ اپنی سلطنت میں سوائے واقفانِ نغمہ کے کسی کو نہ دیتا تھا۔ Ellis Psychology of Sex

Page 124 Vol. IV

اس کے بعد مختلف ساز ایجاد کئے گئے۔ جو قدیم ہی سے چین میں رائج ہیں۔ ان میں سے ایک "تی چنگ" ہے۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی علم ریاضی کے مطابق ہوتی ہے تاکہ سُر مقررہ ٹھاٹ اور خاص راگ کے بجیں۔ اور دوسرا ساز "شینگ" ہے جو بانسری کی قسم میں سے ہے۔ Hsiao اور "تی" دو قسم کی بانسریاں بھی ان میں مروّج تھیں۔ "Handa" کو

Ma, Ma, mansar نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ایجاد کیا تھا (رسالہ ایشیا۔ نیویارک۔ دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۶۳)

چین میں موسیقی نے نہ صرف عوام کو موہ لیا بلکہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ شاہزادے اس فن لطیف کا اکتساب کرنے لگے چنانچہ منگ خاندان کے ایک شہزادے۔ chu Tsai yu نے تو اس پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام Yu mau Tsu Tzu Chu pu mansus ہے۔ دیگر کتابیں pu اور pu Tzu ching Sek قابل ذکر ہیں (ایشیا دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۶۳)

جاپانی موسیقی دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء ایماٹی راسو" سو رہ دیوی سے ہوئی جس نے کوٹو ساز ایجاد کیا۔ یہ ساز قدیم سے ہی ان میں رائج تھا۔ ایک بانسری باماٹو فیوئے کو آسےٹوآزمے" نے ایجاد کی۔ "باماٹو فیوسے" اور "باماٹو کوٹو" جاپان کے قدیم ساز ہیں۔ اور دیگر تمام ساز دوسرے ممالک سے آئے ہیں چنانچہ تیسری صدی عیسوی میں کوریا سے گویئے اور وہاں کے مختلف ساز جاپان میں لائے گئے اور کچھ دنوں کے بعد ان کا رواج عام ہو گیا۔ (ایشیا۔ نیویارک۔ دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۵۹)

اہل ایران اس صنعت کو اپنے سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے وجوہات بتاتے ہیں کہ ملک پاکیزہ و صاف ہے۔ اور وہ مقتضیات جن کو طبیعت نے ایرانیوں میں ودیعت کر رکھا۔ جیسے مرغان خوش الحان کا ہونا۔ شقائق گل وغیرہ (تعلیمات موسیقی مصنفہ کرنل علی نقی خاں وزیری) ہمیں پائے جاتے ہیں۔

دوسرے قدیم اہل یونان کا اعتراف جو انھوں نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں اپنے رقیب "ایران" کے موضوع پر کیا ہے۔ چنانچہ تمام یونانی لکھتے ہیں کہ جس وقت ایران کے بادشاہ دسترخوان پر بیٹھ کر تناول طعام میں مصروف ہوتے ہیں تو ان کی لونڈیاں اُن کے سامنے ناچتی اور گاتی تھیں (مجلہ المقتطف سال سوم صفحہ ۱۳۶)

علاوہ ازیں گاتھا" سے جو ایرانیوں اور ان کے پیشروؤں کا سرود مذہبی تھا معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں موسیقی کا وجود زمانۂ تاریخ سے ماقبل تھا (مجلہ مہر طہران۔ شمارہ ۶ سال پنجم ۵۲۷)

غرض ان میں موسیقی قدیم سے رائج ہے۔ مملکت ایران کی تاریخ کیومرث سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے سب سے پہلے تاج پہنا۔ سازوں میں اکتارہ اسی کی ایجاد ہے۔ اسے موسیقی سے خاص دلچسپی تھی، اور اہل کمال کی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اسی کے زمانے میں رمادی نامی شخص اس فن کا اُستاد تھا۔ اور یہ زمانہ ڈھائی ہزار برس قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ پیشدادیوں کے خاندان میں کیومرث کے بعد ہوشنگ، جمشید، منوچہر اور گرشاسپ اس فن کے زبردست مُربی رہے۔ جیرنک اور خور اس عہد کے اُستاد ہیں جنھوں نے اس فن کی ترتیب میں حصہ لیا۔ اشکانیوں کے عہد میں مختلف ساز نے اور تنبور استعمال کئے جاتے تھے اور مجالس وغیرہ میں ان سازوں کا عموماً ہونا تھا۔ (تاریخ ایران باستان)

روم کے ایک مورخ کا بیان ہے کہ اشکانیوں میں ایک ساز مستعمل تھا جس کا نام "سام بوکا" تھا۔ لیکن اس کی ساخت اور شکل نہیں معلوم کیسی تھی یہ بیان نہیں کرتے۔

کیانی خاندان میں کیکاؤس اور کیخسرو نے اس فن کی سرپرستی کی۔

ساسانی خاندان نے اس فن کی بہت سرپرستی کی حقیقت میں اسے اس کا مربی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اردشیر سے یزدجرد تک پانسو برس کامل یہ خاندان اس فن کی سرپرستی اور قدردانی کرتا رہا چنانچہ اس عہد میں باربد۔ نکیسا جیسے مغنی پیدا ہوئے۔ غرض ایرانیوں نے اس فن میں بہت ترقی کی۔

عربوں کی موسیقی کی تاریخ ظہور اسلام کے پچاس ساٹھ برس بعد سے شروع ہوتی ہے۔ جاہلیت عرب میں صدہا سال پیشتر جرادتان کے لقب سے دو گانے والی رنڈیاں بتائی جاتی ہیں جو قوم عاد کے زمانہ میں مکہ میں تھیں۔ مگر آنحضرت کے ظہور کے وقت تک عربوں میں ایسی عورتوں کا پتہ چلتا ہے جن کا پیشہ گانا تھا۔ اور مردوں کی صحبت شراب میں گایا بجایا کرتی تھیں۔ چنانچہ امیر حمزہ کی صحبت عیش میں ایک ایسی ہی عورت کے گانے کا واقعہ مستند روایات سے ثابت ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں راگ کا فن تھا اور تین قسم کے راگ گائے جاتے تھے (ہندوستان کی موسیقی از شرر مرحوم)

(۱) نصب۔ جو پرجوش نوجوانوں اور دشت نورد قافلوں کا پُراثر اور سیدھا سادہ گانا تھا۔

(۲) سناد یہ۔ یہ دشوار اور پیچیدہ راگ تھا جس میں گلے بازی کی زیادہ مشق ہوتی اور تانوں اور مینڈوں وغیرہ کی اس میں کثرت تھی اور اس کی بہت سی دھنیں تھیں۔

(۳) ہزج۔ اس راگ کو صرف لوگوں میں جوش پیدا کرنے سے تعلق تھا۔ اس میں دل پر اثر کرنے والی سُروں سے کام لیا جاتا تھا۔

عربوں کے علم موسیقی کا ماخذ قدیم سامی نظریہ موسیقی ہے۔ ظہور اسلام سے تھوڑا عرصہ پہلے جب حیرہ اور غسان کی عرب حکومتیں عروج پر تھیں تو عرب موسیقی ایرانی اور بازنطینی موسیقی سے بہت کچھ متاثر ہوئی۔ لیکن اس اثر سے اس کے اصلی نظریہ میں کچھ فرق نہ آیا۔ عربوں نے جو کچھ ان سے حاصل کیا اُسے اپنے انداز موسیقی میں ڈھال لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس باہمی ارتباط و اختلاط کے باوجود عرب موسیقی ایرانی اور بازنطینی موسیقی سے بالکل جداگانہ تھی۔

عہد جاہلیت میں مختلف ساز عرب میں رائج تھے مثلاً عود قدیم عود کامل وغیرہ۔ سب سے بڑے عود کو شہرود کہتے تھے۔ اسی طرح طنبور کی بھی کئی قسمیں تھیں۔ ان میں اہم ساز رباب تھا۔ کھلے تاروں والے سازوں میں سے چنگ۔ قانون خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لکڑی کے سازوں میں۔ نے خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ بڑی کو جو ایک گز کے قریب ہوتی تھی نے بم اور چھوٹی سے چھوٹی کو جو ایک فٹ بلکہ اس سے بھی کم ہوتی تھی شبابہ اور خواق کہتے تھے۔ اسی طرح دف۔ طبل نقارہ۔ زفر۔ زلامی۔ غانطہ۔ صرنابہ ہوا کرتے تھے۔

عرب ساز سے زیادہ راگ کے شائق تھے۔ اس کی وجہ زیادہ تر ان کی شعر و شاعری تھی جس کے وہ بے حد دلدادہ تھے۔ مختلف اصنام شاعری میں سے قصیدہ۔ غزل۔ قطعہ اور موزل زیادہ مقبول تھے اور یہی چیزیں عام طور پر گائی جاتی تھیں۔ راگ اور ساز اگرچہ محض تفریحی محافل تک محدود ہوتے تھے۔ مگر عربوں کی سپاہیانہ زندگی بھی اس سے خالی نہ تھی۔ میدان کارزار میں راگی دستہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ صرنابہ، نفیر، بوق طبل و نقارہ۔ ہر وقت استعمال میں آتے تھے۔

عرب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نصب۔ سناد یہ اور ہزج راگوں کا رواج تھا خصوصاً ان مقامات میں جہاں میلے ہوا کرتے چنانچہ مدینہ۔ طائف۔ خیبر۔ وادی القریٰ۔ دومۃ الجندل۔ یمامہ موسیقی کے لئے مشہور تھے جہاں شعرائے عرب مجمعوں میں گا گا کر اپنے اشعار سنایا کرتے اور مغنی اور مغنیہ عورتیں محفلوں میں گاتیں بجاتیں (ہندوستان کی موسیقی از جناب شرر مرحوم)

ظہور اسلام کے وقت عورتوں کا دف بجا بجا کر گانا کثرت سے ثابت ہے اور صحابہ کے زمانہ ہی میں نامی گرامی گویئے پیدا ہونے لگے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا مغنی اسلام بنی مخزوم کا ایک غلام طویس تھا جس کی شہرت خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں خوب ہو گئی تھی۔ اس کے شاگرد معبد۔ دلال بہت مشہور ہوئے۔ غرض عربوں نے اس فن کو خوب ترقی دی جس کی تفصیل ایک مستقل تصنیف چاہتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ یونان قدیم زمانہ میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ اس نے علوم و فنون میں وہ شہرت پائی کہ باید و شاید اور ایسے ایسے نامی گرامی اشخاص پیدا کئے کہ علمی دنیا اُن کے آگے سر جھکاتی ہے۔

یونان میں گیت اور ساز کا بہت رواج رہا ہے حتیٰ کہ لفظِ موسیقی کا مخرج میوزی سی ہے جو ایک یونانی لفظ ہے اور جس کے معنی میوزس کا ہنر ہے۔ ان میں یہ قدیم سے دستور تھا کہ وہ اپنے مذہبی جلوس میں ناچتے اور گاتے تھے اور نوجوانوں کا ایک گروہ دیوتا کے اطراف رقص کرتا ہوا گزرتا تھا۔ اس زمانے میں اسے کورس" (Chorus) کہتے تھے تمام شہروں میں کورس کے جلوس منعقد ہوتے تھے

History of ancient civilization by Sig-nobos p.115

ابتداً یونانیوں میں رزمیہ نظموں کا رواج ہوا اور ابتدا میں یہ نظمیں ماتی ہوتی تھیں۔ اسے ایک ساز کے ساتھ سرعت سے گایا جاتا تھا۔ غالباً اس طرح جس طرح کہ ہمارے ہاں مرثیہ گاتے ہیں)

Encyclopaedia Britannica page 507. Vol. II

شاید یہ زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس کے بعد

ان میں تھیٹر کا رواج بڑھا - اس میں ایکٹر گاتے تھے - چنانچہ
چند قدیم گانے جو اسٹیج سے متعلق ہیں ہم تک پہنچتے ہیں مثلاً - Ga
-nimed اور Mealpal وغیرہ - یہ گانے موسمی ہوتے تھے - جب
رزمیہ نظم کو فروغ ہوا تو اس کے دوش بدوش موسیقی نے ترقی کی چنانچہ
عوام میں یہ نظمیں نہایت مقبول ہوئیں اور عوام اسے گاگا کر پڑھنے لگے
یہ زمانہ ۷۰۰ ق - م کا بتایا جاتا ہے -

Encyclopaedia Britannica 509 Vol. XII

Homer ہومر جو یونان کا قدیم اور مستند مصنف ہے کی تصنیفات میں موسیقی
کے بہت حوالے ملتے ہیں - ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں موسیقی کا
چرچا تھا چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ ame radyas کو یہ طاقت
حاصل تھی کہ وہ موسیقی کے اثر سے انسان کے خون رواں کو منجمد کر دیتا تھا -
اور دوسری روایت ہے کہ Spartar (ڑائی) کی جنگ میں جب مرض طاعون
پھوٹ پڑا تو یہ موسیقی سے دور ہو گیا - اس قوم میں ہندوؤں کے مانند میوزک
کو الٰہی رتبہ دیا گیا چنانچہ اپالو سرود اور بربط کا موجد سمجھا گیا ہے - انہوں
نے سادہ مُرلی ایجاد کی - ایک شخص مسمی ترپینڈر (۶۶۰ ق - م) نے اس فن کو
اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچایا -

ترپینڈر نے Lyric poetry کی سنگت کے لئے ایک قسم کا
ساز (بربط) ایجاد کیا جس کے چار تار تھے - بعد ازاں اس نے تین تار
کا اور اضافہ کیا - اس طرح سات سُر کا پورا ٹھاٹھ تیار ہو گیا -

Encyclopaedia Britannica 509. Vol. XII

اس کے بعد اولمپس اور تھیالیٹس نے اس فن کو ترقی دی - اور
یہ فن Lyric poetry کے دوش بدوش ترقی کرتا گیا اور اس کا زمانہ
(۶۷۰ - ۴۰۰ ق - م) کا تھا - ایک شاعر Miletus میں پیدا ہوا
جس کا نام ٹی موتھیس تھا (وفات ۳۵۷ ق - م) اس نے موسیقی کو
اعلیٰ درجہ تک پہنچایا اور ایک بربط گیارہ تار کی ایجاد کی -

Encyclopaedia Britannica P. 510. Vol. XII

یونانیوں میں خیال کیا جاتا ہے کہ اولمپس نے بانسری کو رواج
دیا - اس کے بعد بہیں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے
کہ یونان میں سازندگان بانسری کثرت سے تھے -

Encyclopaedia Britannica page 580 Vol IX.

ان میں مختلف قسم کے بربط (Lyre) رائج تھے جو غالباً
یا مصر سے آتے تھے - مثلاً ایک بربط جس کا نام Chelys ہے دریافت
ہوا ہے - اور یہ مختلف محفلوں میں نظموں کی سنگت کے لئے استعمال ہوتے تھے

Encyclopaedia Britannica page 177 & 179. V. XIII

ملک یونان کی مختلف قوموں نے اپنے ٹھاٹھ مقرر کئے - مثلاً
آئی اونین (Ionian) لیڈین (Lydian) فریجین (Phrygian)
ڈورین (Dorian) ایولین (Aeolian) ان میں سے
بعض جذبات کی تحریک کی مناسبت رکھتے تھے - ان میں ابتدا میں چار سُر
پھر سات سُر پھر آٹھ سُر کا استعمال شروع ہوا -

بہر حال یونان میں موسیقی کا شوق اس قدر بڑھا کہ اقلیدس اور منجم
بطلیموس گراں پایہ موسیقار تھے - فیثاغورث اپنے زمانہ کا ماہر تھا (۵۸۲
تا ۵۰۰ ق - م) فیثاغورث اور اس کے پیرو اجرام فلکی میں بھی سُروں کا
نظام سُن سکنے کا دعویٰ کرتے تھے -

Historians History Vol. VI page 488

روم میں اس کو بہت ترقی ہوئی - چنانچہ رومیوں کی قدیم
تقاریب میں موسیقی کو خاص دخل تھا - مثلاً ماہ مارچ میں عوام
دیوتا کی عزت میں ندی کے کنارے جمع ہوتے تھے اور
تمام دن گاتے اور بجاتے گزارتے تھے - یہ زمانہ تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح کا
بتایا جاتا ہے -

The Grandeur That Was Rome by J. C. Stobart page 26.

رومیوں کا آرٹ نہایت مشہور ہے - اس آرٹ میں بعض بعض
جگہ Flute دکھائی دیتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں
کا رواج تھا

The Grandeur That Was Rome page 290. plate - 85.

ان میں ایک شخص میاکی نس Maecenas نامی نے ۱۵ ق م
میں لوگوں کو سکھلایا کہ کس راگ کو کس وقت گانا چاہئے اور کس محل پر
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں راگ کے اوقات اور گانے کے محل
بھی معلوم کر لئے گئے تھے - The Grandeur That

Wan Rome page 240

ایک ایشیائی قوم بوہمنیس (Bohemians) جو یورپ کے مختلف حصوں میں خانہ بدوش پھرتی رہی ہے۔ انہیں کے ذریعہ سے روس اور اسپین میں عام گیت کی طرز ایشیائی صورت میں رائج رہی ہے۔ یہ آوارہ گرد اور خانہ بدوش قوم جس کو انگلینڈ میں جپسی (Gypsies) کے نام سے پکارتے ہیں۔ راگ کی بہت شوقین تھی اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اصلی باشندے ہندوستان کے تھے چنانچہ بعض بعض نام مثلاً پنا۔ بہاری ابھی تک موجود ہیں ان کے ذریعہ سے یورپ کے سلاطین کے درباروں میں ہندوستانی طرزیں سُنی جاتی تھیں۔

(ملاحظہ ہو Harmsworth کی تاریخ دنیا جلد ۴ صفحہ ۲۱۱۰)

جل گیا

(از جناب رضا ہمدانی ۔ پشاور)

گر پڑی بجلی مرا نخلِ تمنا جل گیا
آرزو کے گلستاں کا پتا پتا جل گیا

درد سینے میں فزوں تر اور آنکھوں میں جلن
دل سے اُٹھتا ہے دُھواں شائد کلیجا جل گیا

رحمتِ یزداں کی گرمی کا تماشا دیکھ کر
دفترِ عصیاں مرا سارے کا سارا جل گیا

رات بھر آتشِ ہجراں رکھا غم واندوہ نے
شمع بالیں کی طرح میرا سراپا، جل گیا

میرے غم خانے میں دردِ آہ تک باقی نہیں
شمعِ کُشتہ کی طرح میرا نصیبا جل گیا

خرمنِ جاں پھونک ڈالا سوزِ پنہاں نے رضاؔ
آتشِ خاموش بھڑکی گھر ہمارا، جل گیا

شاہی ڈاکو

کانن ڈائل کے شرلاک ہومز کا ایک حیرت انگیز کارنامہ

(از جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب ملکہ پوری)

پچھلے سال موسم خزاں میں ایک دن مَیں اپنے دوست شرلاک ہومز کے گھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک معمّر لیکن قوی ہیکل اور سُرخ بالوں والے شخص کے ساتھ بات چیت میں معروف ہے مَیں اس خیال سے کہ مبادا میرا مداخلت ناگوار خاطر گزرے معافی کی درخواست کرتے ہوئے واپس جانا ہی چاہتا تھا۔ کہ ہومز نے مجھے کمرہ میں کھینچ لیا۔ اور دروازہ بند کرکے مشتاقانہ لہجے میں کہا " واٹسن! تم بڑے اچھے وقت پر آپہنچے" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "آپکی مصروفیت کے باعث میں کمرہ میں داخل ہونے سے پیرو پیش کر رہا تھا" اس نے کہا " واقعی میں بہت زیادہ مصروف ہوں" میں نے کہا " پھر میرے لئے یہی مناسب ہے کہ قریب کے کمرے میں آپ کا انتظار کروں "!

ہومز "نہیں۔ نہیں" (معمّر شخص سے مخاطب ہوکر) مسٹر ولسن! آپ کئی مقدمات میں میرے شریکِ کار اور مددگار رہے ہیں آپ کی شرکت سے مجھے کئی مقدمات میں کامیابی حاصل ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مقدمہ میں بھی آپ سے بہت مدد ملیگی (وہ آدمی مجھ سے متعارف ہونے پر کرسی سے اُٹھا کہ یہ انگلستان کی ایک تعظیمی رسم ہے) اور مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ہومز نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا " واٹسن! میں خوب جانتا ہوں کہ تم میرے مقدمات میں کس قدر دلچسپی لیتے ہو۔ اور ان کو بطور یادداشت نوٹ کرنے کے علاوہ اپنی فصیح و بلیغ زبان میں عوام کے سامنے پیش کرتے ہو"۔ ہومز نے ایک کرسی پر بیٹھ کر یہ جملے متشکرانہ انداز میں کہے۔

میں۔ (انکساری کے ساتھ) حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپکے مقدمات میں بیحد لطف آتا ہے ....

ہومز۔ (بات کاٹ کر) تمہیں یاد ہوگا کہ کل مس میری سدرلینڈ کے مقدمہ پر غور کرنے سے پہلے میں نے کہا تھا کہ عجیب وغریب واقعات ایک دوسرے سے کچھ ایسے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ کہ ان سے کوئی نتیجہ قائم کرنا انسانی خیالات کی پرواز سے بعید ہوتا ہے۔ میرے تجربہ کی بات ہے کہ جس قدر پیچیدہ معمولی اور چھوٹے جرم ہوتے ہیں اس قدر بڑے اور سنگین جرم نہیں ہوتے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے میں کئی گزشتہ اور مسٹر ولسن کا موجودہ مقدمہ تمثیلاً پیش کرتا ہوں [illegible] نے مسٹر ولسن کی زبانی جو کچھ سنا ہے۔ بظاہر وہ بہت سیدھا سادھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعات پر غور کیا جائے تو مقدمہ کی تہ تک پہنچنا بہت مشکل اور پیچیدہ کام ہوجاتا ہے۔

یہ سُنکر مسٹر ولسن نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پُرانا میلا اور پرشکن اخبار نکالا اور اشتہارات کا کالم دیکھنے لگا۔ میں نے اب اُسے سر سے پیر تک غور سے دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ میں اس کے لباس اور انداز سے کچھ معلوم کرسکوں۔ اس کے جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور فراک کوٹ تھا۔ کوٹ کے بٹن کھلے تھے اور اس کے نیچے ۔ ویسٹ کوٹ تھا جس میں پیتل کی ایک خوبصورت زنجیر لٹکی ہوئی تھی۔ اور اس میں ایک مربع سکّہ بھی آویزاں تھا۔ اس کے بال سُرخ تھے اور چہرہ سے مایوسی ٹپکتی تھی۔ میں ان باتوں سے بجز اس کے کہ وہ ایک

متوسط درجہ کا بیوپاری ہو۔ کسی قدر جسیم، سُست اور ظاہر دار آدمی ہے اور کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکا۔ ہومز نے مجھے اس مشاہدہ کی حالت میں دیکھ کر متبسم ہو کر کہا:-

واٹسن - اس شخص کے لباس اور قیافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی سخت مزدوری کی ہے۔ اور ناس کھینچنے کا عادی اور فری میسن کا ایک رکن ہے۔ ایک مرتبہ چین میں جا کر رہ چکا ہے۔ اور ابھی چند دن پیشتر اسے تحریری کام بہت کرنا پڑا ہے۔

ولسن - (متعجب ہو کر) آپ کو یہ باتیں کیونکر معلوم ہوئیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ درست ہے۔ مثال کے طور پر یہی بتائیے کہ میں کبھی سخت مزدوری کر چکا ہوں۔

ہومز - (نہایت ہی متانت سے) تمہارے ہاتھ اس کا پتہ دیتے ہیں کیونکہ وہ سخت ہیں۔ اور سیدھے ہاتھ پر گوشت زیادہ ہے اور بہ نسبت بائیں کے بڑا اور مضبوط ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ایسی مزدوری کی ہے جس میں سیدھے ہاتھ سے زیادہ کام لیا گیا ہو۔

ولسن - درست میں نے اپنے زمانۂ شباب میں جہاز پر نجاری کا کام کیا ہے۔ لیکن اب بتائیے کہ فری میسن اور ناس کا آپ نے کس طرح پتہ لگایا۔

ہومز - میں تمہیں یہ بتا کر تمہاری ذہانت کی تضحیک نہیں کرنا چاہتا کیونکہ قوس اور پرکار نما پن جو فری میسن کی علامت ہے تمہارے فراک کوٹ میں لگی ہوئی ہے۔ اور ناس کا پتہ اس کی بُو دے رہی ہے

ولسن - (ہومز کی نتیجہ خیز طبیعت سے متاثر ہو کر) ہاں - میں کوٹ سے بیج اتارنا بھول گیا تھا۔ خیر اب از راہ کرم یہ بتائیے کہ تحریری کام کے متعلق آپ نے کیونکر معلوم کر لیا۔

ہومز - تمہارے کوٹ کی سیدھی آستین کا نچلا حصّہ بہت فرسودہ ہونیکی وجہ سے چمک رہا ہے اور بائیں ہاتھ کی کہنی پر جس کے سہارے میز پر جُھک کر لکھا گیا۔ پیوند لگا ہوا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں تحریری کام بہت زیادہ کرنا پڑا ہے۔

ولسن - (یہ معقول جواب سُن کر) اچھا چین کے بارے میں۔

ہومز - تمہارے ہاتھ پر مچھلی کا جو نشان گُندھا ہوا ہے وہ صرف چین ہی کی کاریگری ہے۔ علاوہ ازیں تمہاری زنجیر میں چین کا سکہ آویزاں ہے جو میرے اس خیال کے درست ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

ولسن - (قہقہہ لگا کر) میں خیال کرتا تھا کہ آپ نے ان نتیجوں کے قائم کرنے میں کسی غیر معمولی طاقت سے کام لیا ہوگا۔ مگر اب وہ بالکل ایک معمولی بات معلوم ہو رہی ہے۔

ہومز - (مجھ سے مخاطب ہو کر) واٹسن - مجھے اپنی غلطی سے بڑا اندیشہ ہے کہ میں لوگوں کے سامنے معمہ حل کر کے ظاہر کر دینے میں عجلت کرتا ہوں جسکی وجہ سے میری شہرت کو صدمہ پہنچنا ممکنات سے ہے (ولسن سے) کیا تم نے اشتہار تلاش نہیں کیا۔ ولسن نے اخبار دیتے ہوئے ہاں کہا۔ اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔ جو حسب ذیل ہے

"بنام ریڈ ہیڈڈ لیگ۔

امریکن کروڑپتی ایزی کیاہ ہاپکنس مرحوم لیبے نان اضلاع متحدہ بانیٔ ریڈ ہیڈڈ لیگ نے سُرخ بال والوں کی آسائش کے لئے ایک گرانقدر عطیہ جو اُن کے ترکہ کا سود ہے لیگ کو وقف کر دیا ہے۔ اس لیگ کے وظیفہ خواروں میں سے ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ یہ وظیفہ برائے نام خدمات کے عوض چار پونڈ ہفتہ وار کے حساب سے دیا جائیگا۔ امیدوار کی عمر ۲۱ سال سے کم نہ ہو۔ اس کو لیگ کی تمام شرائط قبول کرنی ہونگی اسکے بال سُرخ اور صحت و دماغی حالت درست ہو۔ ایسے امیدوار سوموار کے دن گیارہ بجے محلّہ پولیس کورٹ کی فلیٹ اسٹریٹ میں ریڈ ہیڈڈ لیگ کے منیجر سے دفتر میں ملیں۔"

منیجر ڈنکن راس

میں اس اشتہار کی عجیب و غریب نوعیت پر بہت متعجب ہوا۔ ہومز میری ان حرکات کا مشاہدہ کر کے خوب ہنسا۔ اور مجھے کچھ اشیاء کا نام اور تاریخ روزنامچہ میں درج کرنے کو کہا۔ اور ولسن کو کہا کہ وہ اپنا قصہ شروع کرے۔

ولسن - میں سیکسو برگ اسکوائر میں رہتا ہوں۔ میرا پیشہ مہاجنی ہے

میرا کاروبار سست پڑ جانیکی وجہ سے فی الحال میرے پاس ایک ہی ملازم ہے۔ لیکن اس سے قبل دو ملازم رہتے تھے۔ موجودہ ملازم بھی صرف نصف تنخواہ پر کام سیکھنے کی غرض سے رضامند ہو گیا ہے۔ اِس لئے رکھ لیا ہے۔

ہومز۔ اس نوکر کا نام کیا ہے؟

ولسن۔ وِنسنٹ سپال ڈنگ۔ یہ نوجوان جفاکش اور چُست و چالاک آدمی ہے اور مجھے اُمید نہیں کہ اس سے بہتر آدمی اس قلیل تنخواہ پر مل سکے۔

ہومز۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ ورنہ عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن میرا گمان غالب ہے۔ کہ جس طرح یہ اشتہار عجیب و غریب ہے۔ اسی طرح تمہارے ملازم کا ایک غیر معمولی شخص ہونا بھی ممکنات میں سے ہے۔

ولسن۔ مسٹر ہومز۔ اس میں ایک عیب بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ فوٹو گرافی کا بہت دلدادہ ہے۔ اور فرصت کے وقت وہ ایک تہ خانے میں جاکر تصویروں کو رنگ دیتا ہے۔ لیکن باستثنا اس کے وہ ایک معقول آدمی ہے۔ بلکہ اس کا ثانی ملنا بھی مشکل ہے۔

ہومز۔ کیا یہ شخص اب بھی تمہارے یہاں ملازم ہے۔

ولسن۔ ہاں۔ بیوی اور بچے نہ ہونے کے باعث کھانے پکانے کے لئے اس کے علاوہ ایک چودہ سالہ لڑکی بھی ملازم ہے۔ میری آمدنی اخراجات سے زیادہ نہیں۔ آج سے دو ماہ پیشتر یہی اشتہار والا اخبار میرا ملازم ہاتھ میں لئے میرے پاس آیا اور بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "کاش اگر میرے بال سُرخ ہوتے" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا "کیا معاملہ ہے" اس پر اس نے کہا "ریڈ ہیڈیڈ لیگ میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے اور جسے یہ جگہ مل جائے ایک خاصی آمدنی کا ذریعہ اُس کے ہاتھ آجاتا ہے۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ اُس لیگ کے حالات ذرا تفصیل سے سناؤ۔ تو اس نے کہا کہ معین شخص کا لیگ کے لئے انتخاب ہو جاتا ہے۔ اُسے چار پونڈ ہفتہ وار وظیفہ ملتا ہے۔ کام بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ اور

اپنے خانگی کاموں میں بھی حرج نہیں ہوتا۔ اس لیگ کا بانی ایزی کیاہ ہاپکنس ہے سو وہ ایک امریکن کروڑپتی ہے۔ جس نے لندن میں تجارت کر کے خوب فائدہ اٹھایا۔ چونکہ اس کے بال سُرخ تھے۔ اس لئے اس نے صرف لندن کے سُرخ بالوں والے باشندوں کی امداد و آسائش کے لئے یہ لیگ قائم کی ہے۔ وہ اپنے کارکنوں کو وصیت کر گیا تھا کہ میرے سرمایہ کا تمام سُود لیگ کے وظائف پر خرچ کیا جائے۔ میرے ملازم نے مجھے اُمید دلائی کہ آپ کے بال لیگ کی شرائط کے مطابق سُرخ اور چمکدار ہیں۔ اور آپ لندن کے باشندے بھی ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ آپ کا انتخاب ہو جائے۔ مسٹر ہومز! تم جانتے ہو کہ مجھے اپنے بیوپار میں ضروریات سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ میرا جی للچایا اور میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ کل دُکان بند کر کے میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہے۔

الغرض ہم دوسرے دن پوپس کورٹ جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور لیگ کے دفتر کے قریب پہنچتے ہی فلیٹ سٹریٹ میں ایک جمِ غفیر نظر آیا۔ جو سُرخ بالوں والے آدمیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی میرا ملازم آدمیوں کو چیرتا پھاندتا مجھے دفتر میں لے گیا۔

منیجر ڈنکن راس نے میرے بالوں کو دیکھ کر اُمید دلائی کہ تمہارا انتخاب ہو جائیگا۔ منیجر ایک پست قد آدمی تھا۔ اور اُس کے بال میرے بالوں سے بھی زیادہ سُرخ اور چمکیلے تھے۔ اُس نے ہمارے دفتر میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ مسٹر ولسن! بہت سے لوگ وظیفہ حاصل کرنے کے لئے اپنے بالوں پر سُرخ رنگ کر لیتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ایک بار آپ کا معائنہ کر کے اطمینان کر لوں چنانچہ وہ کُرسی سے اُٹھا اور میرے بالوں کو خوب رگڑا یہاں تک کہ میری آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ اُس نے مجھے منتخب ہو جانے کی مبارک باد دی۔ اور کھڑکی سے جھانک کر بآوازِ بلند کہا۔ کہ جگہ پُر ہو گئی ہے۔ تمام اُمیدوار با دلِ ناخواستہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس کے بعد منیجر نے کہا کہ میں خود بھی لیگ کا وظیفہ خوار ہوں لیکن مسٹر ولسن کیا تم شادی شدہ ہو۔ اور تمہارے کچھ بال بچے بھی ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اور کہا کہ لیگ کا

مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ سُرخ بالوں والوں کی امداد کی جائے۔ بلکہ ازدیادِ نسل بھی ہے۔ لیکن خیر۔ بہ اعتراض خوشنما اور خوشرنگ بالوں کے سامنے کچھ چیز نہیں۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم ڈیوٹی پر کب حاضر ہو گے۔

میں۔ اپنے کاروبار کو ٹھکانے لگانے کے لئے مجھے فی الحال کچھ مہلت چاہیئے۔

ملازم۔ میں آپ کے کاروبار کی دیکھ بھال کر لیا کرونگا۔ آپ مطمئن رہیں

میں۔ (منیجر سے) ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟

منیجر۔ صبح دس بجے سے دو بجے تک۔

میں۔ وقت تو بہت موزوں ہے لیکن تنخواہ۔

منیجر۔ چار پونڈ ہفتہ وار۔

میں۔ کام کیا ہوگا؟

منیجر۔ برائے نام۔

میں۔ یعنی!

منیجر۔ دس بجے صبح سے دو بجے تک دفتر کے باہر ایک قدم بھی رکھنا ممنوع ہے۔ بیماری یا سخت سے سخت ضرورت کے وقت بھی باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ کام یہ ہوگا۔ کہ تمہیں اپنی دوات قلم۔ کاغذ لا کر برطانی دائرۃ المعارف کی نقل کرنی ہوگی۔ دفتر سے صرف کرسی اور میز ملے گا۔ کیا تم کل حاضر ہو سکتے ہو؟

میں نے کہا "یقیناً"۔

اس کے بعد منیجر نے مجھے دوبارہ مبارک باد دی اور خدا حافظ کہکر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں اپنے ملازم کو ساتھ لے کر واپس لوٹ آیا۔

اگرچہ میں اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ لیکن جوں جوں واقعات پر غور کرتا مجھے ایک "مذاق" یا "دھوکہ" معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ اتنا مہنگا مذاق" کون کر سکتا ہے چُپ ہو رہتا۔ غرضکہ میں ان تمام واقعات سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ اور اسی حیص بیص میں رات گزر گئی۔

صبح اُٹھکر کاغذ۔ قلم۔ دوات وغیرہ خرید کر دفتر جا پہنچا۔

مینیجر نے پہلے ہی سے وہاں میز کرسی رکھوا دی تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ مینیجر کی ہدایت کے مطابق انسائیکلو پیڈیا کی نقل کرنا شروع کی۔ مینیجر وقتاً فوقتاً میرے کمرے میں آتا رہا۔ دو بجنے پر مینیجر نے میرا کام دیکھا اور محنت کی داد دے کر رخصت کیا۔ اوّل اوّل مینیجر میری حرکات کو سختی سے معائنہ کرتا رہا۔ لیکن جب اسے اطمینان ہو گیا کہ یہ باہر آتا جاتا نہیں اور وقت کا پابند بھی ہے تو وہ اب صرف دس بجے اور دو بجے میرے کمرے میں آتا۔ اور ہر سنیچر کو میرے میز پر چار پونڈ رکھ دیتا تھا۔

اسی طرح آٹھ ہفتے گزر گئے۔ اور اس کے بعد یکایک کام ختم ہو گیا۔ کیونکہ جب میں دوسرے دن حسبِ معمول دفتر گیا تو دیکھتا ہوں کہ دروازہ بند ہے اور اُس پر ایک نوٹس آویزاں ہے جس پر یہ لکھا تھا کہ

"ریڈ ہیڈیڈ لیگ ۹ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو توڑ دی گئی"

ہم ولسن کا یہ بیان سن کر ششدر رہ گئے۔ مگر ولسن کے چہرہ کی افسردگی اور مایوسانہ حرکات کو دیکھ کر ہم بے ساختہ ہنس پڑے اس پر ولسن ناراض اور مایوس ہو کر کہنے لگا "اگر آپ مجھ پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تو میں اپنا مقدمہ کسی دوسرے کے سپرد کر دیتا ہوں۔"

ہومز۔ نہیں نہیں۔ مسٹر ولسن! دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔ مگر میں آپ کا مقدمہ نہ چھوڑوں گا لیکن درحقیقت یہ واقعہ ایسا ہے کہ اگر کوئی بھی سنے تو بے ساختہ ہنس پڑے۔ خیر اب یہ بتائیے کہ اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟

ولسن۔ میں نے اردگرد کے مکانات اور دفاتر میں جا کر دریافت کیا لیکن کسی نے پتہ نہ بتایا۔ آخر کار محلہ کے سردار یا لینڈ لارڈ سے دریافت کیا۔ کہ ریڈ ہیڈیڈ لیگ کا کیا حشر ہوا تو اس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا آپ مسٹر ڈنکن راس کو جانتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ پھر میں نے کہا کہ جو شخص نمبر ۴ کے مکان میں رہتا تھا۔ کہاں گیا۔ تو اُس نے کہا کہ کیا تم مسٹر ولیم مارس جس کے سر کے بال سُرخ تھے کی نسبت دریافت کر رہے ہو۔ یہی شخص نمبر ۴ کے مکان میں رہتا تھا۔ اس کا نام ڈنکن راس نہیں ہے بلکہ ولیم مارس ہے۔ فی الحال وہ محلہ سینٹ پال میں کنگ ایڈورڈ سٹریٹ میں رہتا ہے۔

میں اس پتہ پر وہاں پہنچا۔ تو اُس مقام پر ایک کارخانہ دیکھا جہاں گھٹنے کے لئے چمڑے کی ٹوپیاں بنائی جاتی تھیں اور وہاں ولیم مارس نام کا کوئی شخص نہ تھا۔ میں حیران تھا آخر مجبور ہو کر گھر واپس ہوا۔ اور اپنے ملازم سے ذکر کیا۔ تو وہ بھی اس معمہ کو نہ سمجھ سکا۔ مجھے سخت بے چینی تھی۔ کیونکہ ایک معقول آمدنی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ جب میں نے سنا کہ آپ اس قسم کے معاملوں میں غریبوں کی مدد کیا کرتے ہیں تو سیدھا آپ کی طرف چلا آیا۔

ہومز۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا جو میرے پاس چلے آئے۔ تمہارا مقدمہ نہایت ہی دلچسپ اور اپنی نوعیت کا انوکھا اور پیچیدہ بھی ہے۔

ولسن۔ ہاں صاحب کافی پیچیدہ اور خواہ مخواہ میری چار پونڈ ہفتہ وار آمدنی کا نقصان ہو گیا ہے۔

ہومز۔ اونہہ۔ تمہارا تو کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ یہ سمجھو کہ ۳۲ پونڈ آمدنی کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا کی نقل کرنے سے تمہاری لیاقت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔

ولسن۔ نہیں۔ نہیں جناب۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بات تھی اور اُن کا مقصد کیا تھا۔

ہومز۔ خیر میں اس کا پتہ چلانے کی کوشش کرونگا۔ میں تم سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے یہاں تمہارا ملازم کب سے رہتا ہے۔

ولسن۔ لیگ کے اشتہار سے دو ماہ پیشتر سے۔

ہومز۔ وہ تمہارے پاس کس طرح آیا؟

ولسن۔ میں نے ایک اشتہار دیا تھا۔ کہ مجھے ایک ملازم کی ضرورت ہے

ہومز۔ کیا صرف یہی ایک اُمیدوار تھا؟

ولسن - نہیں نہیں قریباً بارہ اُمیدوار تھے ۔

ہومز - پھر تم نے خاص اُسی کو کیوں منتخب کیا؟

ولسن - اِس لئے کہ میں نے اُسے سب سے بہتر پایا۔ اور اس کے علاوہ وہ نصف تنخواہ پر ملازمت کرنے کو تیار تھا۔

ہومز - اچھا - اب یہ بتاؤ کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے ۔

ولسن - پستہ قد جسیم چست اور چالاک ہے - اس کے چہرہ پر بال نہیں ہیں - حالانکہ اس کی عمر ۳۰ سال سے کم نہ ہوگی - علاوہ اِس کے اُس کی پیشانی پر ایک سفید نشان ہے ۔

ہومز یہ سُن کر کُرسی سے اُٹھ بیٹھا اور ایک گہرے خیال میں محو ہوگیا - پھر دیر کے بعد ولسن سے پوچھا "کیا اس شخص کے کان میں بالی کا کوئی سوراخ بھی ہے ؟"

ولسن - ہاں جب میں نے اس سے دریافت کیا - تو اُس نے بتایا کہ جب میں بچہ تھا تو ایک شریر عورت نے میرے ساتھ یہ حرکت کی ۔

اِس پر ہومز پھر ایک گہرے خیال میں مستغرق ہوگیا - اور تھوڑی دیر کے بعد ولسن سے پوچھنے لگا "کیا یہ تمہاری عدم موجودگی میں کام کاج برابر چلاتا رہا ؟"

ولسن - اِس کے متعلق مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ۔

ہومز - بس اسی قدر معلومات کافی ہیں مجھے اُمید ہے کہ انشاء اللہ ایک دو روز میں یہ عقدہ حل ہوجائیگا - آج سنیچر ہے - اور پیر تک یقیناً ختم ہوجائیگا -

جب ہمارا ملاقاتی چلا گیا - تو ہومز نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "واٹسن! اس قصہ کو سُن کر تم کس نتیجہ پر پہنچے ہو -"

میں - یہ معاملہ میرے لئے ایک معمہ ہے ۔

ہومز - یہ قاعدہ ہے کہ جو معاملہ شروع شروع میں بالکل سیدھا اور معمولی سا معلوم ہوتا ہے - بعد میں وہ نہایت پیچیدہ اور ناقابلِ حل ہوجاتا ہے - اس معاملہ میں بڑی دور اندیشی سے کام لینا ہوگا -

میں - اب تمہارا کیا ارادہ ہے ؟ -

ہومز - جب تک میں تین پائپ نہ پی لوں جس میں پچاس منٹ صرف ہوں گے - اُس وقت تک تم مجھ سے بات چیت نہ کرو "

اتنا کہکر وہ کرسی میں گٹھڑی ہوکر بیٹھ گیا - اور آنکھیں بند کرکے خیالات میں غرق ہوگیا - اسے دیکھ کر مجھے یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ سوگیا ہے - لیکن کچھ دیر کے بعد وہ اچانک کُرسی سے اُٹھ بیٹھا اُس کی صُورت اور آنکھیں پتہ دے رہی تھیں - کہ وہ اس معاملہ کو حل کرچکا مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ آج تھئیٹر میں ایک جرمن کا جو علمِ موسیقی میں خاص مہارت رکھتا ہے - گانا ہونے والا ہے - کیا تم میرے ساتھ چل سکو گے ؟

میں - آجکل مریض جو میرے زیرِ علاج ہیں بہت کم ہیں - اس لئے آج وقت نکال لینا کوئی مشکل امر نہیں ہے ۔

ہم دونوں کپڑے بدل کر گاڑی میں سوار ہوئے - تھوڑی دیر کے بعد سیکسو برگ اسکوئیر پہنچے - یہ ایک تنگ بے رونق اور سنسان جگہ تھی - لیکن مکانات کی ترتیب اور باقاعدگی اِسکی گزشتہ شان و شوکت کا اظہار کر رہی تھی - یہاں تمام مکانات دو منزلہ تھے اور چار قطاروں میں ایک دوسرے کے متوازی واقع تھے - ایک قطار کے آخر میں ایک مکان پر ایک تختی پر جلی حروف میں "جبین ولسن" لکھا ہُوا تھا - ہومز وہاں ٹھہر گیا - اور مکان کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی چھڑی کو دو تین مرتبہ زمین پر مارا اور پھر دروازہ پر دستک دی - اندر سے ایک نوجوان شخص جس کے چہرے پر بال نہ تھے باہر آیا - اور اندر آنے کے لئے درخواست کی - لیکن شرلاک ہومز نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تکلیف معاف ہو - میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہُوں کہ یہاں سے تھئیٹر کو کونسا راستہ جاتا ہے - نوجوان نے نہایت بے پروائی سے دو چار الفاظ میں جواب دیکر فوراً دروازہ بند کر لیا - ہومز میرے پاس آکر کہنے لگا - میرے خیال میں نوجوان لندن بھر کے لوگوں میں بلحاظ چستی و چالاکی کے چوتھے نمبر پر ہے اور بہادری میں تیسرے نمبر پر -

میں - یقیناً یہ مسٹر ولسن کا ملازم بہت چست و چالاک اور بہادر معلوم ہوتا ہے - بہت ممکن ہے کہ ریڈ ہیڈ یڈ لیگ کے معمہ میں اس کا کافی حصّہ ہو - غالباً آپ نے اس کو بغور دیکھنے

کے لئے دستک دی۔

ہومز۔ نہیں۔ میرا مقصد اسے دیکھنے کا نہیں تھا۔

میں۔ تو پھر کیا تھا؟

ہومز۔ اس کے پاجامے پر گھٹنے کے نشان دیکھنا چاہتا تھا۔

میں۔ تو پھر آپ نے کیا دیکھا؟

ہومز۔ وہی جس کی مجھے توقع تھی۔

میں۔ اور تم نے اپنی چھڑی کو کئی بار زمین پر کیوں مارا؟

ہومز۔ میرے عزیز دوست۔ یہ موقع مشاہدہ کا ہے نہ کہ مکالمہ کا اور اس وقت ہم مخالفین کی حدود میں ہیں۔ سیکسو برگ اسکوئیر کے متعلق ہم کافی معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ آؤ اب ذرا یہ معلوم کریں کہ اس کے پیچھے کون سے راستے اور مکانات واقع ہیں۔

ہم دونوں پیچھے کی طرف گئے۔ وہاں کی کشادہ اور بارونق سڑکیں اور سربفلک عمارتیں اور شاندار دکانیں دیکھنے سے یہ خیال ہوتا تھا کہ جس جگہ سے ہم ابھی واپس آئے ہیں۔ وہ تصویر کا پچھلا حصہ اور یہ سامنے کا رخ ہے۔ میرا دوست شرلاک ہومز سڑک کے کونہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے مکانات کا بغور مشاہدہ کر لوں۔ کیونکہ یہ میری عادت ہے۔ دیکھو واٹسن! یہ پہلی دکان تمباکو کی ہے۔ دوسری عمارت میں اخبار فروخت کیے جاتے ہیں۔ تیسری شاندار عمارت سوبرن بنک کی ہے اور چوتھی عمارت گاڑیوں کا ڈپو ہے۔ اتنا کہکر ہومز رک گیا۔ اور سوچ کر بولا کہ بس اب ہمارا کام ختم ہو چکا۔ اب ہمیں یہاں کے ہوٹل میں کچھ ناشتہ کر کے تھیئٹر چلے جانا چاہئے۔

میرے دوست شرلاک ہومز کی تھیئٹر میں عجیب حالت تھی اُسکی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علم موسیقی میں کافی دخل رکھتا ہے۔ اور کسی کو گمان تک نہ ہوتا تھا کہ وہی سنجیدہ مزاج شرلاک ہومز ہے۔ جسے سُراغ رسانی میں خاص شہرت حاصل ہے گانا ختم ہونے پر وہ مجھ سے کہنے لگا۔ کہ "آپ گھر واپس جاؤ گے"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

ہومز - لیکن میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ سیکسوبرگ اسکے سر جاکر اس معاملہ کے متعلق مزید تحقیقات کروں۔ کیونکہ معاملہ بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

میں - خطرناک۔ کیسا خطرناک۔

ہومز - مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ آج ایک بہت بڑا جرم ہونے والا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ میں اس پر یقین نہ کروں۔ آج سنیچر کا دن ہے جس سے معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس لئے مجھے آج تمہاری سخت ضرورت رہے گی۔

میں - کس وقت؟

ہومز - دس بجے۔

میں - اچھا میں وقت مقررہ پر حاضر ہو جاؤں گا۔

ہومز - لیکن میرے دوست ڈاکٹر گمان غالب ہے کہ آج کی مہم پر خطرہ ہے اس لئے احتیاطاً ریوالور لیتے آؤ تو بہتر ہوگا۔

اتنا کہکر ہومز سلام کرکے چلا گیا۔ اور میں یہ خیال کرتے ہوئے گھر پہنچا کہ ہومز نے اس معاملے کے متعلق دیکھا ہو سنا بعینہ وہی میں نے بھی دیکھا اور سنا۔ لیکن میرے لئے تمام معاملہ ایک پریشان کن معمہ ہے۔ بخلاف اس کے ہومز کی یہ حالت ہے کہ اس نے نہ صرف یہی معلوم کر لیا کہ کیا واقعہ ہوا بلکہ اس کا بھی پتہ چلا لیا کہ کیا واقعہ ہونے والا ہے۔ گھر میں جاکر میں نے ہر چند ولسن کے قصے، سیکسوبرگ کے مشاہدے، ہومز کے ملازم کے نمایاں طور پر حصہ لینے کے اشارے وغیرہ پر بہت غور کیا لیکن بالآخر ناامید ہو کر خیالات کو آئندہ واقعات کی طرف مرکز کرکے سوا نو بجے گھر سے باہر نکلا۔ پارک اور آکسفورڈ سٹریٹ طے کرکے بیکر سٹریٹ میں ہومز کے دروازے پر پہنچا۔ اس کے دروازے پر دو گاڑیاں کھڑی پائیں جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے دو شخصوں کے ساتھ کسی اہم معاملہ پر بات چیت کرنے میں مصروف پایا۔ ان میں سے ایک شخص تو مسٹر جونس پولیس آفیسر تھا۔ لیکن دوسرے آدمی کو میں نہیں جانتا تھا۔

جونس - ڈاکٹر واٹسن! آج ہم ایک بہت بڑی مہم پر جا رہے ہیں۔ ہمارے عجیب و غریب دوست مسٹر شرلاک ہومز آج کی مہم کے قائد ہیں

دوسرا شخص - (جس کا نام میری ویدر تھا) لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ مہم تحصیل حاصل ثابت ہو۔

جونس - نہیں نہیں۔ آپ اُن پر کافی اعتماد رکھیں۔ کیونکہ وہ اس قسم کے بیسیوں پُر پیچ اور ناقابل حل معاملات کو اپنے سادہ اور آسان طریقوں کی مدد سے سلجھا چکے ہیں۔ اور ایک سراغرساں ہونے کی قابلیت کا جوہر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مقدمات اور جرائم کے حل کرنے میں مسٹر شرلاک ہومز پولیس کے مقابلہ میں اکثر کامیاب رہے ہیں۔

ہومز - دونوں سے آج کی مہم میں مسٹر جونس کا ہاتھ ایک ایسے شخص پر پڑے گا۔ جسے پکڑنے کے لئے وہ ایک عرصہ تک سرگرداں اور ناکام رہے ہیں اور مسٹر میری ویدر کو یہ فائدہ ہوگا کہ ان کا بنک ۳۰ ہزار پونڈ کے خسارہ سے بچ جائیگا۔

جونس - مسٹر میری ویدر! آج ہمارا مقابلہ لندن کے ایک خونی قزاق اور جعلساز آدمی جان کلے کے ساتھ ہے۔ یہ شخص عجیب و غریب ذہنیت کا مالک ہے۔ اس کا دادا ایک شاہی ڈیوک تھا اور یہ خود ایٹن اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے اس کی انگلیوں کی مانند اس کا دماغ بھی بہت تیز و طرار ہے۔ کئی مرتبہ ہمیں اس کا کھوج ملا ہے۔ ہم اسکی تلاش میں وہاں پہنچے۔ لیکن ابھی تک اسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہ اس قدر چالاک ہے کہ اگر اس ہفتہ اسکاٹ لینڈ میں ہے تو اگلے ہفتہ کارنوال میں پہنچ چکا ہوگا۔

ہومز - اگر خدا نے چاہا ہو تو میں آج ہی اس شخص سے آپکا تعارف کرا دونگا۔ مجھے خود دو تین دفعہ اس شخص سے واسطہ پڑا ہے اچھا اب دس بج چکے ہیں۔ اور وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے کام پر روانہ ہو جائیں۔ آپ دونوں پہلی گاڑی پر سوار ہو جائیں میں اور واٹسن دوسری گاڑی میں آتے ہیں۔

چنانچہ ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ بہت دیر تک ہومز بیٹھا گاتا رہا۔ بلا شبہ میں جو گیت سنتے تھے گنگناتا رہا۔ ہم گیس کی روشنی میں سے ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد فیرنگڈن پہنچے۔ ہومز نے مجھے کہا

سے کہا کہ اب ہم اس مقام سے بہت ہی قریب آ گئے ہیں۔

ہم اس سڑک پر پہنچ گئے۔ جہاں ہم صبح کو آنے تھے۔ گاڑی والوں کو ہم نے پیسے دے دلا کر روانہ کیا۔ پھر میری ویدر ہمیں ایک تنگ تاریک راستہ سے لے گیا۔ اور مضبوط دروازوں سے گزر کر ہم ایک بہت بڑے آہنی دروازے کے قریب پہنچے۔ یہاں مسٹر میری ویدر نے قندیل روشن کی۔ اور دروازہ کھول کر ایک زمین دوز راستہ سے ایک تہ خانے میں جا پہنچے۔ جہاں بہت مضبوط اور بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ ہومز نے کہا کہ اُوپر سے تو ہم بالکل محفوظ ہیں۔ اس پر مسٹر میری ویدر نے فرش پر چھڑی مارتے ہوئے کہا۔ کہ نیچے سے بھی ہمیں کوئی خوف نہیں لیکن مسٹر میری ویدر کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے فرش پر چھڑی مارنے کی آواز سے محسوس کیا کہ وہاں کی زمین کھوکھلی ہے۔ وہ شرلاک ہومز سے اس بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہومز نے اسے روک دیا۔ اور کہنے لگا اس قسم کی بات چیت سے آپ آج کی مہم کو خطرہ میں ڈال دینگے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان صندوقوں میں سے کسی ایک پر چپ چاپ بیٹھے رہئے۔ مسٹر میری ویدر خاموش ایک صندوق پر بیٹھ گیا۔ ہومز قندیل اور دوربین لیکر تہ خانے کے فرش کے معائنہ میں مصروف ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ مطمئن ہو کر ہماری طرف آیا اور دوربین جیب میں رکھکر کہنے لگا۔ واقعہ سرزد ہونے میں پورا ایک گھنٹہ باقی ہے۔ کیونکہ ولسن جب تک سو نہ جائے قزاق ادہر کا رُخ نہ کرینگے۔ ڈاکٹر! تمھیں تعجب ہوگا۔ کہ قزاقوں نے اس بنک پر چھاپہ مارنے کی کیوں کوشش کی ہے۔ اس معاملہ کو مسٹر میری ویدر مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

میری ویدر۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تہ خانے میں کثیر التعداد رقوم رکھی ہوئی ہیں۔ چند ماہ پیشتر ہم نے اپنے ذرائع بڑھانے کی غرض سے فرانس کے ۳۰ ہزار نپولینی سکے منگوائے تھے۔ وہ پارسل جُوں کا تُوں یہاں رکھا ہوا ہے۔ کسی طرح ان قزاقوں کو اس کا علم ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ یہاں چھاپہ مارنے والے ہیں۔

ہومز۔ ان لوگوں کے آنے کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے قندیل پر ایک پردہ ڈال کر کمرہ کو تاریک کر دینا چاہئے اور ایسی جگہ بیٹھنا چاہئے۔ جہاں وہ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ لیکن ہم اُنکی تمام حرکات کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہ لوگ بہت بہادر اور خطرناک ہیں۔ اور اگرچہ وہ اس وقت ہمارے سامنے مغلوب ہوں گے۔ لیکن پھر بھی اندیشہ ہے کہ وہ ہمیں کچھ نقصان پہنچائیں۔ اس لئے ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ میں اس صندوق کے پیچھے بیٹھ جاتا ہوں۔ اور تم اُن صندوقوں کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اور جب میں روشنی کر دوں تو تم سب یکدم میرے قریب آ جانا۔ اگر وہ پستول کا فیر کریں تو تم بھی تامل نہ کرنا۔

میں اپنا پستول تیار کر کے سامنے کے صندوق کے پیچھے چھپ گیا۔ ہومز نے ایک سیاہ اور موٹا کپڑا قندیل پر ڈال کر تہ خانے کو تاریک کر دیا۔ الغرض ہم بالکل تاریکی میں بیٹھے رہے۔ اس قسم کی تاریکی میں رہنے کا مجھے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہومز نے مسٹر جونسن کے کان میں آہستہ سے کہا کہ قزاقوں کے بھاگنے کے لئے صرف ایک راستہ

ہے۔ جو مسٹر ولسن کے مکان کے پیچھے ہے۔ کیا تم نے وہاں اپنے آدمی
تعینات کر دیئے ہیں۔ جونس نے کہا کہ ہاں ایک انسپکٹر اور دو آفیسر
وہاں مقرر کر دیئے ہیں۔ ہومز نے کہا پھر تو ہم نے دشمنوں کے تمام
دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ حالانکہ
ہم صرف سوا گھنٹہ اس تاریکی اور خاموشی کے عالم میں رہے۔ لیکن ایسا
معلوم ہوتا تھا۔ کہ رات ختم ہو چکی ہے اور اب دن نکل رہا ہے۔ ایسا وقت
مجھ پر کبھی نہ آیا تھا کہ جہاں بیٹھا ہوں وہیں بیٹھا رہوں مجھے ذرا بھی جنبش
کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خاموشی کا یہ عالم تھا۔ کہ میں اپنے ساتھیوں
کی سانس نہ صرف سن سکتا تھا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی سانس کی
تمیز بھی کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہماری آنکھیں یکایک ایک روشنی
کی طرف اٹھ گئیں۔ جو تہ خانہ میں سے گزر کر ہمارے کمرہ میں پڑ رہی تھی
اس کے بعد ایک شخص نے فرش کے ایک پتھر کو ٹٹولا اور آہستہ سے
اٹھا کر ایک طرف کو رکھ دیا۔ اب ہمارے کمرے میں پتھر کے اٹھ
جانے سے چھت پر کافی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد
دیگرے دو شخص اوپر چڑھے جن میں سے پہلے نے کہا کہ یہاں سب
معاملہ ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تم تھیلیاں ساتھ لائے ہو۔ دوسرے
نے کہا کہ نہیں میں بھول گیا چنانچہ وہ فوراً ہی مطلوبہ شے لانے کے
لئے کودنے ہی کو تھا کہ ہومز نے جھپٹ کر جانے والے کا کوٹ پکڑ
لیا۔ لیکن وہ کود پڑا۔ دوسرا ابھی کود ہی رہا تھا۔ کہ ہومز نے اس کا
کالر پکڑ لیا۔ اس نے پستول نکال کر ہومز پر فیر کیا۔ لیکن ہومز کے
دوسرے ہاتھ میں کپڑا تھا۔ اس نے پستول کی نالی پر زور سے مارا۔
جس سے گولی فرش پر گر پڑی۔ ہومز نے جان سے مخاطب ہو کر کہا کہ
اب یہاں سے بھاگ کر جانے کی کوشش بے سود ہے۔

جان کلے۔ ہاں مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یہ
دیکھ کر کہ میرا دوست تمہارے پنجے سے بال بال بچ گیا
بہت خوشی ہوئی۔

ہومز۔ نہیں۔ وہاں دروازوں پر تین آدمی اس کا انتظار کر رہے
ہیں۔ جن سے بچ کر جانا محال ہے۔

جان کلے۔ اگر ایسا ہے تو اب کی مرتبہ تم نے خوب انتظام کیا۔
اور تم ہر طرح سے قابل داد ہو۔

ہومز۔ اور میں تمہاری اس جدت کی داد دیتا ہوں کہ تم نے ریڈ ہیڈڈ
لیگ بنائی۔

جونس۔ تم اپنے دوست کو بھی ابھی تھوڑی دیر میں دیکھ لوگے۔ ذرا
تم اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھاؤ۔ تاکہ میں ہتھکڑیاں پہنا دوں۔

جان کلے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے نازک ہاتھوں
سے مجھے نہ چھوؤ۔ شاید تم اس بات سے واقف نہیں ہو کہ
میری رگوں میں شاہی خون موجزن ہے۔ مہربانی کر کے جب
کبھی تم مجھ سے بات چیت کرو تو نہایت ادب سے کرنا۔

جونس۔ بہت بہتر (طنزاً) کیا جناب مہربانی فرما کر اوپر تشریف
لے چلیں گے۔ تاکہ میں پولیس اسٹیشن تک حضور کو لے جانے
کے لئے گاڑی کا انتظام کر سکوں۔

جان کلے۔ بہت بہتر۔

یہ کہکر اس نے ہمیں جھک کر سلام کیا اور پولیس افسر کے ساتھ
وہاں سے چلا گیا۔

میری ویدر۔ (ہومز سے) ہمارا بنک آپ کا بہت ممنون احسان ہے
اور اس کے صلے میں اگر بنک سے ایک گراں قدر رقم بھی
آپ کو پیش کی گئی۔ تو بھی وہ آپ کے بار احسان سے سبکدوش

نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ آج آپ نے لندن کے ایک بہت بڑے قزاق کو اپنی کوششوں سے مفتوح کر لیا۔

ہومز۔ مجھے خود دو تین مرتبہ اس شخص سے سابقہ پڑا تھا اور مجھے اشتیاق تھا کہ کسی طرح اسے پکڑا دوں۔ اس کام کے عوض میں بنک سے کچھ نہیں چاہتا۔ البتہ جو اخراجات اس سلسلہ میں مجھے برداشت کرنے پڑے ہیں۔ اُن کا ذمہ دار بنک ہوگا۔ صلہ میں یہی کیا کچھ کم ہے کہ مجھے ایک بہت بڑا تجربہ حاصل ہوا۔ اور ریڈ ہیڈ یڈ لیگ کا سراغ لگا لیا۔

اس گفتگو کے بعد ہم میری ویدر کو چھوڑ کر وہاں سے بیکر اسٹریٹ پہنچے۔ جہاں ہم نے ہومز کے کمرہ میں وسکی وغیرہ پی۔ ہومز نے مجھ سے کہا واٹسن! کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کیا معاملہ تھا اور ریڈ ہیڈ یڈ لیگ کے اشتہار کا مقصد کیا تھا۔

میں۔ کچھ کچھ سمجھ تو گیا ہوں۔ لیکن کیا آپ مفصل حالات بیان کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

ہومز۔ واٹسن! جان کلے بہت چالاک اور جدت واقع ہوا ہے اُس نے اپنے ساتھی کے سُرخ بال دیکھکر ریڈ ہیڈ یڈ لیگ کے قیام کا خیال کیا۔ اُس کے ساتھی نے بھی اِس تجویز کو بہت پسند کیا۔ ایک بدمعاش نے نصف تنخواہ پر ملازم ہو کر اپنے آقا کو اشتہار دکھایا اور ترغیب دی کہ وہ ریڈ ہیڈ یڈ لیگ کا اُمیدوار بنے۔ دوسرے بدمعاش نے اپنے آپ کو لیگ کا مینجر ظاہر کر کے اشتہار دیا چونکہ یہ کارروائی سوورین بنک سے ہزار دل پونڈ حاصل کرنے کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس لئے ایسے اہم کام کے لئے چار پونڈ ہفتہ وار خرچ کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس طرح دونوں بدمعاشوں نے مسٹر ولسن کو روزانہ چار گھنٹے گھر سے باہر رکھنے کا اچھا خاصہ انتظام کر لیا۔ جب مسٹر ولسن نے اپنا قصہ سُنایا مجھے اُسی وقت اُس کے ملازم پر شُبہ ہو گیا تھا۔ اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ضرور کسی نہ کسی خاص مقصد کے لئے ملازمت کر رہا ہے۔

واٹسن۔ لیکن آپ نے اُس کے خاص مقصد کا پتہ کس طرح لگایا۔

ہومز۔ اگر مسٹر ولسن مالدار ہوتا یا اُن کے گھر میں کوئی خوبصورت ہوتی تو میں یہ خیال کرتا کہ ضرور اس کے مال یا عورت کو حاصل کرنے کی غرض سے کوئی جال پھیلایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں وہاں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا فوٹو گرافی کا شائق ہونا اور تہ خانے میں جاکر تصاویر ڈیولپ کرنا اور سوبرن بنک کا قریب ہی واقع ہونا۔ اس قسم کے خیالات یکے بعد دیگرے میرے دماغ میں آنے لگے۔ اور آخرکار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سوائے اس کے کہ وہ بنک کے تہ خانے تک ایک سرنگ کھود رہا ہو اور کچھ مقصد نہیں۔ اس کے علاوہ مسٹر ولسن سے اسکے حلیہ کے متعلق تحقیقات کرنے سے یہ پتہ چلا کہ وہ لندن کا ایک بہت بڑا چالاک بدمعاش ہے۔ اس کے بعد ہم مسٹر ولسن کے مکان پر پہنچے تو میں نے چھڑی کو دو تین مرتبہ زمین پر مارا جس سے معلوم ہوا کہ زمین اندر سے کھوکھلی ہے۔ پھر دستک دینے پر ملازم آیا۔ تو میں نے اُس کی پتلون کو گھٹنوں کے قریب کے حصّہ پر مٹی کی وجہ سے میلی پایا۔ کیونکہ سرنگ گھٹنوں کے بل چل کر کھودی جاتی ہے

بس میں نے یقین کر لیا کہ سُرنگ کھود کر تیار کر لی گئی ہے اس کے بعد ہم تھیٹر پہنچے۔ جہاں میں نے مسٹر جونس اور میری ویدر سے اکیلے ملاقات کی اور انہیں نو بجے اپنے گھر پر مدعو کیا۔ ازاں بعد جو کچھ ہوا وہ تمھیں معلوم ہی ہے۔

میں۔ لیکن میرے دوست آپ نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ آج رات کو ہی یہ واقعہ ظہور پذیر ہوگا۔

ہومز۔ جب مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ انھوں نے بنک کا دفتر بند کر دیا ہے تو مجھ پر صاف واضح ہو گیا کہ مکان پر مسٹر ولسن کی موجودگی سے اُنکے کام میں کچھ حرج نہ ہوگا۔ بالفاظ دیگر یہ کہ وہ سرنگ کھودنے کا کام ختم کر چکے تھے۔ اب انھیں ضرورت اس بات کی تھی کہ جسقدر جلد ہو سکے وہ اپنا کام پورا کریں۔ ورنہ ممکن ہے کہ روپیہ کے صندوق اوپر اٹھا لئے جائیں۔ اسکے علاوہ چونکہ بنک میں سنیچر کی آدھی اور اتوار کی پوری چھٹی ہوتی ہے اسلئے سنیچر کی رات کو چھاپہ مار کر ایکدن ان کے بھاگ جانے کیلئے کافی تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر مجھے شبہ ہوا کہ یہ واقعہ آج ہی ہوگا۔

میں نے شرلاک ہومز کی ذہانت کی خوب تعریف کی اور اُسے داد دے کر گھر واپس چلا آیا ●

یادش بخیر

از جناب ابو الفضل رازؔ چاندپوری

یادش بخیر اے ہمنشیں وہ شب شبِ مہتاب تھی
نکھرا ہوا تھا آسماں پھیلی ہوئی تھی چاندنی
کیا بات تھی اُس رات کی

صحنِ چمن، ٹھنڈی ہوا دلکش سماں، روشن فضا
از فرش تا عرشِ بریں گویا تھا عالم نور کا
یا برق زارِ طور تھا

ساقی کی چشمِ مست تھی بیگانۂ سازِ این و آں
رندانِ حق آگاہ تھے مستِ شرابِ کُن فکاں
آزادِ قیدِ دو جہاں

مطرب کی ہر اک تان تھی مضرابِ سازِ زندگی
ہر نغمہ روحِ عشق تھا یا حُسنِ رازِ زندگی
صورت طرازِ زندگی

فطرت بصد ناز و ادا با حُسن و شانِ دلبری
گلشن میں تھی یوں جلوہ گر جیسے پرستاں میں پری
یا بتکدے میں "آذری"

اُف کیا کہوں اے ہمنشیں افسانۂ سوزِ جگر
تفصیل و شرحِ آرزو ہے مختصر سے مختصر
سُنتا نہیں کوئی مگر

اے کاش پھر دیکھوں کبھی وہ منظرِ راحت فزا
وہ بزمِ حُسنِ رنگ و بُو وہ دورِ جامِ حق نما
خاموش رازِ بینوا

شاعر کی محبوبہ

شبابیات میں ڈوبا ہوا افسانہ

(از جناب "ش" مظفر پوری)

"تم پوچھتے ہو کہ میرے خیالات و تصورات کی ملکہ کون ہے وہ کہاں کی رہنے والی ہے اور اس کا نام کیا ہے — عجیب سوالات!"
دیوانہ شاعر کے پژمردہ ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم مچلنے لگا اور وہ اپنی شوخ نظروں سے مخاطب کو گھورنے لگا۔ اس کے جسم میں ایک حرکت سی ہوئی اور وہ کہنے لگا۔

"تم ٹھوس اور خشک دنیا کے لوگوں کا خیال ہے کہ ہر شاعر کے تصور میں کوئی نہ کوئی دوشیزہ یا عورت ضرور بسی ہوتی ہے جس کا تصور شاعر کے ساز دل پر مضراب کا کام کرتا ہے اور شعر نغمات بنکر اس کی زبان سے نکلتے ہیں — شاید ایسا ہی ہے۔ مگر تم یہ جاننے کے لئے اس قدر کیوں بے چین ہو رہے ہو کہ میری محبوبہ کون ہے۔ اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ وہ جنس لطیف یا صنف نازک کی ایک نوخیز کلی ہے — خیر اگر تم ضد کرتے ہو تو بتاتا ہوں کہ وہ کون ہے اور کہاں کی رہنے والی ہے!"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ یکایک اس کے تنفس میں ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ پُرجوش اور والہانہ انداز میں پکار اُٹھا۔

"وہ دیکھو! میرے کانوں میں اُس کی پازیب کی جھنکار کی ترنم ریز آواز آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ہر قدم پر میرے قریب ہو رہی ہے — ہاں! وہ آ رہی ہے۔ میرے تصور میں اس کے روح کو تڑپا دینے والے جلوے رقص کر رہے ہیں۔ آہ! تمھاری موجودگی سے محجوب ہو کر واپس چلی گئی"

شاعر تخیلات میں غرق ہو گیا۔ اور ایک مذہبی پیشوا کی آواز میں گویا ہوا "وہ میری معبود ہے۔ وہ میرے جسم کی قوت اور خون کی حرارت ہے۔ وہ میری زندگی کا چراغ اور تخیلات کی روشنی ہے۔ میری دنیائے تصور و تخیل اُسکی جلوہ گاہ ہے۔ اُس کا وجود مادی عناصر کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ایک روح ہے۔ ایک زندہ سایہ ہے۔ مگر میں اسی طرح اس کو دیکھ سکتا ہوں جس طرح تم لوگ اس مادی دنیا کی چلتی پھرتی ہستیوں کو۔
جس وقت وہ مُسکراتی ہے میری روح کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ جب وہ پیار کے ساتھ میری گردن میں باہیں ڈال کر اپنی زلفوں کو میرے شانے پر بکھیر دیتی ہے تو میں جنت اور حور کو ایک فریب سمجھنے لگتا ہوں۔ اس کے ہونٹوں کے ایک لمس سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ شاید وعدۂ حور پر اترانے والے زاہدوں کو فردوس میں پہنچکر بھی نصیب نہ ہوگی۔
"وہ میری اور صرف میری ہے مجھے یقین ہے — موت اور خدا کی طرح کہ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اس کا شہزادہ ہوں، وہ میری شہزادی ہے۔ میں جب چاہوں اسے دیکھ سکتا ہوں۔ اسے اپنے آغوش میں سمیٹ سکتا ہوں۔ کیونکہ وہ ہر وقت میرے پاس ہے۔ وہ میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے — کیا کہا؟ تم اسے دیکھنا چاہتے ہو! — نہیں تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ تمھاری نگاہوں میں وہ قوت کہاں۔ اس کو صرف میں دیکھ سکتا ہوں یا کوئی شاعر۔ ہاں میرے اشعار میں اس کی جھلک ضرور ہے — مگر کیا تمہارے سینے میں دل ہے — میرا تو یہ خیال ہے تم غیر شاعروں کے سینوں میں دل

کی جگہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے —— احساس سے عاری"۔

شاعر کسی خیال میں منہمک ہو گیا اور پھر مخاطب کی طرف متوجّہ ہُوا "تم ہنس رہے ہو —— مجھ پر میری باتوں پر —— کیوں! کیا میں پاگل ہوں! دیوانہ ہُوں —— اس کا نام! —— نہیں مجھے معلوم نہیں۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ میری ہے میں اس کا ہُوں۔ اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو آج رات میں اس سے پوچھ لوں گا۔ کل صبح اسی وقت اسی جگہ ملنا!"

موسم بہار اپنے شباب پر تھا۔ دیوانہ شاعر سنسان جنگل کے وسط میں تنہا بیٹھا کسی خیال میں محو تھا۔ شام کی فرحت آگیں ہوا روح میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ طیور سارا دن آوارہ پھرنے کے بعد آشیانوں کی سمت معروف پرواز تھے۔

شاعر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"اس کا نام کیا ہو سکتا ہے۔ کیا میری تخیّلی محبوبہ میں قوت کلام نہیں" اس کے بعد وہ یہ شعر گنگنانے لگا ؎

دامن حور سے کیوں لپٹے شراب آتی ہے
زاہدوں نے کہیں جنت میں رچائی ہوگی

اس نے ایک انگڑائی لی —— اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

ایک حسین وجمیل دوشیزہ اس کے خواب کا پردہ تار تار کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ دیوانے شاعر نے پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے قرمزی ہونٹوں پر ایک رنگین مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی میگوں آنکھوں سے شباب کی مستی ٹپک رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال اس کے شانوں پر بل کھائے تھے۔ وہ سراپا حُسن ومعصومیت نظر آ رہی تھی۔ اس کے زریں لباس کی چمک شاعر کی آنکھوں خیرہ کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاعر کے سامنے جنت کی کوئی حور —— بلکہ اس سے بھی زیادہ دلکش وباصرہ نواز ہستی اتر آئی تھی۔

دوشیزہ بصد ناز مسکراتی ہوئی ہر قدم پر بل کھاتی ہوئی شاعر کے قریب آئی۔ شاعر کی آنکھیں حیرت واستعجاب کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اس کے حُسنِ بے پناہ کے جلوۂ بے حجاب کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کہیں یہی دوشیزہ تو اس کے تخیلات کی ملکہ نہ تھی۔ اس کے حُسن کو اس کا تخیّل بھی نہ پا سکا تھا۔

جب دوشیزہ شاعر کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی تو وہ اُٹھ بیٹھا اور بیساختہ اُس کی زبان سے نکلا۔

"اے تو وہ کہ اپنی شراب حُسن کے ایک قطرہ سے روح کو مست مدہوش کر سکتی ہے۔ کیا تو ہی میرے خوابوں کی ملکہ ہے ....
.... کیا تو ہی میرے اشعار کی زندگی ہے۔ بتا جلد بتا کہ تیرا شاعر تیرے جلوے کے لئے اب تک تڑپتا رہا ہے"۔

دوشیزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جنگل کی خاموش فضا میں بے شمار نقرئی گھنٹیوں کو یکلخت چھیڑ دیا۔

"نہ تڑپا! اے میری قوت وحیات! کہ میں اب تک تڑپتا ہی رہا ہُوں۔ بتا، للّٰہ بتا۔ کیا میں نے تجھے پا لیا ہے؟"

"ہاں!" دوشیزہ نے شیریں اور ترنم ریز آواز میں جواب دیا۔ حلاوت وشیرینی میں ڈوبی ہوئی ایسی کیف آفریں آواز شاعر نے کبھی نہ سُنی تھی۔ وہ دوشیزہ کے نورانی وجود کی شعریت کو دیکھ کر از خود رفتہ ہوا جا رہا تھا۔

شاعر کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اُس کے رخسار تمتما گئے۔

"تو پھر مجھے اپنے قدم چومنے کا شرف حاصل کرنے دے!" یہ کہکر فلسفی نے دوشیزہ کا قدم چوم لیا۔ مگر اس نے جھک کر شاعر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "گرمیٔ محبّت سے مجھے زیادہ نہ پگھلاؤ شاعر! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں موم بتی کی طرح پگھل کر فضا میں جذب ہو جاؤں۔ کیونکہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تمہاری قوت تخیّل کی پیداوار ہُوں"

دوشیزہ شانہ بشانہ ہو کر شاعر کے پاس بیٹھ گئی، اسکی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اور اپنے نرم ونازک ہونٹوں سے اُس کے لبوں کو چھو دیا۔ شاعر کے سراپا میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اور اس نے اسے اپنے آغوش میں بھینچتے ہوئے پوچھا۔

"تیری جلوہ گاہ میری معبود!"

"قصر محبّت" دوشیزہ نے شوخی سے جواب دیا۔ "چلو گے"؟

"ضرور —— یہ میری آرزو ہے" ——

شاعر اور دوشیزہ دونوں روانہ ہوئے۔ وہ کبھی کبھی دوشیزہ کو سرتاپا دیکھنے لگتا اور جب نگاہیں چار ہوتیں تو مرعوب ہو کر نظریں جھکا لیتا۔ دوشیزہ کی رفتار سے ایک خاص قسم کی کھنکھناہٹ پیدا ہو ہو کر اس کی خفتہ تمناؤں کو بیدار کر رہی تھی۔ اور اس کے جسم سے نکلتی ہوئی خوشبو سے شاعر کا مشام جان معطر ہو رہا تھا۔

دونوں جنگل سے نکل کر مغرب کی سمت چلے۔ آسمان پر تارے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ماہتاب تمام و لعشر بیبیاں کے ساتھ آسمان صاف پر مسکرا رہا تھا۔ دونوں ایک ریگستان کے وسط سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹا سا چشمہ ملا جس پر چاند کی روپہلی کرنوں نے رداۓ سیمیں بچھا رکھی تھی۔ دوسرے کنارے سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور اس کے بیچ میں جو راستہ تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر صنوبر کے سربفلک درخت قطار وار ایستادہ تھے۔ اس راستہ کو طے کرنے کے بعد ایک عالیشان عمارت نظر آئی۔ شاعر کا طوفان شوق اس کے دل میں ہیجان برپا کئے ہوئے تھا۔ جب دونوں اس شاندار محل کے قریب پہنچ گئے۔ تو شاعر نے محل کے صدر دروازے پر کندہ کئے ہوئے حروف کو پڑھا ـــــ "قصر محبّت"

"اور تمہارا نام دوشیزہ"

"محبّت!"

محبّت روح کی غذا ہے ـــــ

محبّت خدا ہے ـــــ

خدا محبّت ہے ـــــ (طبعزاد)

میٹھے ٹکڑے

(از حضرت فطرت واسطی)

(۱)

حُسن کا تحفہ میٹھے ٹکڑے ‖ عشق کا ہدیہ دل کے ٹکڑے
ٹکڑوں پہ ورق ہیں چاندی کے ‖ نور کی چادر اوڑھے ٹکڑے
رُوح دماغ و دل کی بسائے ‖ لعل و گہر کے سچّے ٹکڑے
پستہ کا مینا زرّیں قاشیں ‖ مہر کی ضُو میں چاند کے ٹکڑے

(۲)

ہے ان میں گُلوں کی رنگینی ‖ یا نجم رخوں کی پروینی
شہد ہے ان میں باتوں کا ‖ یا مست لبوں کی شیرینی
ان میں تمہارا نُور ہے پیاری ‖ یا میری نظر کی زرّینی
حسن اور اس میں عشق کی لذّت ‖ جیسے جوانی میں خود بینی

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، بالتصویر رسالوں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۱ — فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۳۹ء — نمبر ۲

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

بفضلہ تعالیٰ عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۹ء اس دفعہ بھی ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اور اس نے اپنے ظاہری و معنوی محاسن کی وجہ سے دنیائے ادب میں ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس کا ثبوت ان بیش بہا آرا سے جن کا اظہار اخبارات نے کیا ہے اور ان خطوط سے جو ہمیں قارئین کی طرف سے روزانہ موصول ہو رہے ہیں مل سکتا ہے۔ برعایت گنجائش ہم صرف چند آرا کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

روزنامہ احسان - لاہور ۸ رجون ۱۹۳۹ء

"رسالہ عالمگیر نے اپنے خاص نمبروں کی بدولت ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی ہے اس کا شاندار سالنامہ ہمارے سامنے ہے جو اپنی دیرینہ روایات و خصوصیات کو تازہ کر رہا ہے مضمون نگاروں میں ملک کے اکثر جلیل القدر ادبا شامل ہیں جنہوں نے اپنی فکر و حکمت کی دولت سے عالمگیر کا معنوی درجہ بہت اونچا کر دیا ہے اس میں دلچسپ افسانے حکیمانہ مقالات اور مزاحی مضامین بھی شامل ہیں حصہ نظم میں جہاں قدیم شاعری کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں وہاں اس میں ایسی ایسی دلکش غزلیات بھی ہیں جو جدید انداز سخن کے عروج و کمال پر شہادت دیتی ہیں اس لئے سالنامہ عالمگیر ہر خیال اور ہر مذاق کے لوگوں کے لئے دماغی فرحت کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔"

خریداران مظفرپور ——————

"ہم ہر ماہ ریلوے بک سٹال سے پرچہ خریدتے ہیں سالنامہ بہت قابل قدر تھا۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو... (از جناب شبلی بی کام) ہم لوگوں کو بہت پسند آیا۔ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ رسالہ عالمگیر اگر ہر ماہ کم سے کم ایک سیاسی اور ایک اسلامی مضمون پیش کیا کرے تو پرچہ کا پایہ بہت بلند ہو جائیگا"۔ (قاسم عابدی۔ نور حسن کاظمی۔ عبدالسمیع۔ باقر مہدی۔ ناصر حسن نقوی۔ عبدالمالک)

ملک سلیمان الارشد صاحب فاروقی ——————

"ادبی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سالنامہ عالمگیر ادبی جواہر پاروں کا خزانہ ہے۔ تقریباً تمام افسانے اور مضامین نہایت دلکش اور معیار کے لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔ آپ نے جس محنت و جانفشانی کے ساتھ مضامین کا انتخاب کیا ہے اور جس کو اس خوبی کے ساتھ ترتیب دے کر شایع کیا ہے میرا خیال ہے کہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ جہاں آپ نے افسانوں کے انتخاب میں اپنی خداداد قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہاں نظمی معیار کا بھی حد درجہ خیال رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ رسالہ میں جابجا بلند پایہ اور باکمال شعراء کا کلام نظر آ رہا ہے سالنامہ کی کامیابی پر میں خلوص دل سے ہدیہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

پیر محمد عبداللہ صاحب ستار منشی فاضل ——————

سالنامہ "عالمگیر" ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں اور ہر پھول کا جدا رنگ اور جدا باس ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے میں رسالہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ کلام منظوم۔ مقالات۔ افسانے اور ڈرامے۔ منظوم حصے میں عصر جدید کے خوش گفتار اور مقبول خاص و عام نوجوان شاعروں کا پاکیزہ کلام درج ہے۔ مقالات نہایت چیدہ چیدہ اور منتخب ہیں۔ "اگر جنگ چھڑ گئی تو..." (از جناب شبلی) کے تحت موجودہ سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں ہندوستان کے رویہ پر بھی مبصرانہ روشنی ڈالی گئی ہے غرضکہ مضمون مختصر لیکن نہایت جامع ہے یعنی کوزہ کو دریا میں بند کیا ہے۔ جمیل صاحب کا "اردو ادب اور حقیقت" نہایت سنجیدہ اور پر تحقیق مقالہ ہے۔ قریشی محمد عبداللہ صاحب کا طرز تحریر نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ جناب پالوی نے اپنا گرانبہا عطیہ "ایک ہی صدف کے چار موتی" اردو زبان کو دیکر ایک غیر فانی احسان کیا ہے ضرورت ہے کہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جائے۔ جناب خیر بھوروی کا مقالہ بھی بیحد جاذب توجہ ہے۔ مولانا اظہر کا مضمون "شیر شاہ سوری" مستند حالات پر روشنی ڈالتا ہے "ٹیلی وژن" سائنس سے متعلق ایک نہایت تحقیقی اور معلوماتی مقالہ ہے۔ سالنامہ میں دو مزاحی ڈراموں کا اندراج اس کے معیار کو بلند ترین پایہ پر پہنچا دیتا ہے۔ سب سے بلند معیار افسانوں کا ہے "ٹیگور کی افسانہ نگاری" پڑھکر کئی دلچسپ افسانوں کا مزا آجاتا ہے۔ مزاحیہ افسانوں میں "فاسٹ باؤلر" بے نظیر افسانہ ہے۔ "شاہ زندہ کا رومان" بھی نہایت دلچسپ ہے۔

——————

آنے والے شمارہ کی ایک جھلک

عالمگیر کی اشاعت ماہ اگست ۱۹۳۹ء میں شائع ہونے والے بعض معرکہ آرا اور ہنگامہ خیز مضامین کی فہرست درج ذیل ہے اس سے آپ اس کی معنوی خوبیوں کا کسی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں۔

افسانہ محبّت

روس کے زندہ جاوید مصنف میکسم گورکی کا ایک بیحد دلچسپ شاہکار۔ خاص عالمگیر کے لئے ترجمہ کیا گیا از جناب سید منظر کاظمی بی۔ اے (آنرز)

فریب جمہوریت اور ہندوستان

ایک معلومات افزا اور حقایق پرور سیاسی مقالہ۔ از جناب مودود احمد صاحب فاروقی پھرا یونی۔

اُس کی موت کا سبب

روسی افسانہ نویس چیخوف کا افسانہ جس میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے از جناب جمیل احمد صاحب بی۔ اے

ہنیز انیڈرسن؟

یورپ کے ایک سحر طراز افسانہ نگار کے حالات زندگی از جناب ربطہ ہاشمی صاحب

علاوہ ازیں

ہندوستان کے مایہ ناز شعرا کا پاکیزہ کلام۔ دلکش افسانے پُر مغز و معلومات آفرین مقالے

آج ھی

مستقل خریداری کے لئے اپنی فرمائش بھیج دیجئے

ٹولی گردی؟

گجرات کاٹھیاواڑ کے مشہور افسانہ نویس "دھوم کیتو" کی ایک دلگداز کہانی۔ جناب عبدالستار صاحب فاروقی نے براہ راست گجراتی زبان سے خاص عالمگیر کے لئے ترجمہ کیا۔

عربی شاعری کا درخشندہ ستارہ

عمرو بن کلثوم تغلبی کی فخمیہ اور رزمیہ شاعری پر ایک مبصرانہ تبصرہ از جناب حافظ رشید احمد صاحب ارشد مولوی فاضل منشی فاضل

امیر مینائی کا طریق اصلاح

ایک تحقیقی و ادبی مقالہ جس کو دلچسپ امثلہ سے مرصع کیا گیا ہے۔ از جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی۔

وغیرہ وغیرہ

اس صورت میں!

عالمگیر کا حسین وجمیل سالانہ نمبر ۱۹۳۹ء بھی آپ کی خدمت میں مُفت پیش کیا جائے گا!

مصر کا نظامِ تعلیم

فانوسِ عمل میں شمعِ علم کی ضوفشانی

از حضرت مولٰنا اظہر امرتسری

مصر کی تعلیمی حالت

وزارت مصر اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح آگاہ ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ساری قوم کی آنکھیں کابینہ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وہ صرف انتظامی وملکی امور ہی کی طرف متوجہ نہیں بلکہ وہ ملک کو تعلیم و تربیت کی انتہائی منزل تک بھی لے جانا چاہتی ہے تاکہ آئندہ نسل زندگی و حکومت کے ہر شعبہ میں کامیابی واطمینان سے کام کر سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے حصول میں وزارت تعلیم کو ہر ممکن کوشش کرنا پڑتی ہے۔

ایک وسیع تعلیمی سکیم عمل میں لائی گئی ہے۔ جس کے مطابق تعلیم کے مختلف درجوں کو اصلاح و تہذیب سے آراستہ کیا گیا ہے۔ نگرانی اور لائحہ عمل کو لباس حقیقت پہنانے کا کام اعلیٰ درجہ کے ماہرین تعلیمات کی قیادت میں ہو رہا ہے جو تعلیمی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے رکاوٹیں دور کرتے رہتے ہیں اور تعلیم کو عام ذہنیت کے مطابق دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام کا تفریح پسند دماغ علوم و معارف کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔

ہمہ گیر پروگرام

مصری تعلیم کا سلسلہ صرف سکولوں اور کالجوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر پروگرام کے مطابق ساری مصری قوم کو تعلیمی مشاغل میں شریک کیا گیا ہے اور تعلیم کا نصب العین دماغی نشو و نما ہی قرار نہیں دیا گیا بلکہ طلبہ کی اخلاقی جسمانی۔ روحانی اور صنعتی ترقی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

معلمین کے حصول و تقرر اور انتخاب میں انتہائی کوشش و احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ وزارت کو علم ہے کہ طلبہ کے مستقبل کی روشنی کا انحصار اساتذہ کے نور قابلیت پر ہے۔ اساتذہ کے لئے صرف قابلیت ہی شرط نہیں بلکہ ان میں ایسی صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی امداد سے وہ طلبہ میں تعلیمی عشق اور ضوابط و قواعد کی پابندی کا احساس پیدا کر سکیں اور انہیں اخلاقی و دماغی ترقی کے اس مرحلے پر لے آئیں جہاں قومی و شخصی جدو جہد کا احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم

مجلس تعلیم ابتدائی کا کام صرف امور تعلیم ہی کی نگرانی نہیں بلکہ وہ معلمین کے فرائض کی تقسیم اور ان کے اختلافات دور کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیتی ہے اور ابتدائی و درمیانہ تعلیم کیلئے لائحہ عمل مرتب کرتی ہے۔

پرائمری سکول کا مدرس نہ صرف طلبہ کو بنیادی درس و تربیت سے مستفید کرتا ہے بلکہ ان کی تجربہ کارانہ زندگی کی ابتدا کرنے کا بھی وہی ذمہ دار ہوتا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں خاص طور پر جدو جہد کا اظہار کیا جا رہا ہے اس شعبہ کی فلاح و کامیابی کے لئے ماہرین تعلیمات کی ایک مجلس مقرر ہے جو جدید و قدیم تعلیمات اور مشرقی و مغربی نصاب کے مطالعہ میں مصروف رہتی ہے

اور اس مطالعہ سے مستفید ہو کر لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کرتی رہتی ہے۔ اس طریق سے جدید و ترقی یافتہ طریق تعلیم کو طالبات کی ذہنیتوں کے نزدیک لایا جا رہا ہے۔

جبری تعلیم

ابتدائی تعلیم کے لئے جو لگاتار کوشش ہو رہی تھی وہ اب بہت حد تک کامیاب ہو گئی ہے۔ چنانچہ مجلس تعلیم ابتدائی کی طرف سے جبری و لازمی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جو اپنے کام کو اہم اور نتیجہ خیز بنانے کیلئے شب و روز سرگرم عمل ہے۔

جبری تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہر مصری اپنے فرائض و حقوق سے پوری طرح آگاہ ہو سکے تاکہ مستقبل قریب میں پیدا ہونے والی ذمہ داریوں میں تمام اہل مصر بلا تخصیص شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔

اس سال جبری تعلیم کو اعلیٰ پیمانہ پر جاری کیا گیا ہے اگرچہ یہ امر سنہ ۱۹۳۲ء کے دستور اساسی میں شامل تھا لیکن اس کا عملی پہلو آج کل ہی نمایاں ہو رہا ہے اور سکیم کو حد کمال تک پہنچانے کے لئے ہر سال مدرسوں کے اجراء کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر مصر میں جبری تعلیم کی رفتار اسی طرح رہی تو آئندہ دس سال تک کوئی مصری علم و حکمت سے محروم نہیں رہے گا۔ تعلیم کو دلچسپ اور قابل قبول بنانے کے لئے خاص طور پر کوشش ہو رہی ہے تاکہ طلبہ درس و تدریس کو دماغی و ذہنی بیگار نہ سمجھیں بلکہ اس کو دلپسند شغل سمجھ کر اس کی طرف اپنی تمام قوتیں مبذول کرنے لگیں۔

عملی تعلیم

مصر کی تعلیمی حالت ہندوستان سے بالکل مختلف ہے وہاں کی درسگاہیں صرف کلرک بنانے کی فیکٹریاں نہیں ہوتیں بلکہ عملی اور معاشی زندگی کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہیں تاکہ طلبہ سکول سے نکلتے ہی آزادانہ طور پر معاشی اطمینان حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ابتدائی تعلیم میں صنعتی تربیت بھی شامل ہے جس سے طلبہ کو لازمی طور پر مستفید ہونا پڑتا ہے۔ وزارت معارف کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے جو ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ کیلئے تجارتی تعلیم و تربیت کا نصاب بنا رہا ہے۔ جب اس مقصد میں کامیابی ہو گئی تو تجارتی درسگاہیں بھی کھول دی جائینگی۔ چونکہ مصر کی معاشی دنیا میں تجارتی تعلیم کے لئے کافی گنجائش ہے اس لئے یہ کام بوجوہ تمام پورا ہو کر رہیگا۔

درمیانہ تعلیم

درمیانہ تعلیم کو اصلاحات سے اس درجہ بدل دیا گیا ہے کہ وہ قدیم بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکی۔ نئی سکیم کے مطابق طلبہ کو مختلف زبانوں اور حقیقی معلومات سے واقف ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم کی بلندی تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکیں۔ جب طالب علم درمیانہ تعلیم سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایک کمیشن کے ذریعے اس کے ذہنی رجحان کا امتحان لیا جاتا ہے اس امتحان کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کی فطری صلاحیت کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جائے کہ اس کا دماغ علوم و فنون کے کس گوشہ کی طرف جا سکتا ہے امتحان کے بعد طالب علم کو اس کے ذہنی میلان کے مطابق کسی درسگاہ میں داخل کیا جاتا ہے۔ مصر میں درمیانہ تعلیم کی ترقی اس امر سے ظاہر ہے کہ وزارت تعلیم کو نئے سکولوں کی تعمیر کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کرنا پڑی ہے۔

تعلیم دختراں

مصر کی وزارت تعلیم سیاسی و علمی زندگی کے میدان میں عورتوں کو مردوں کا ہم رفتار بنانا چاہتی ہے اس لئے وہ تعلیم دختراں کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ جو لڑکیاں جوانی کے عالم میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی ہیں انہیں امور خانہ داری۔ بچوں کی تربیت و پرورش کے اصول اور گھریلو صنعتیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ وزارت تعلیم ایسے سکول کھولنے کی فکر میں ہے جہاں لڑکیوں کو خانگی صنعتوں کے علاوہ اقتصادی فنون، عام اور معقول چیزیں بنانے کا کام اور غیر ملکی زبانیں بھی سکھائی جائینگی۔ نقاشی، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہوگا۔ اس قسم کا مرکزی مدرسہ قاہرہ میں کھولا جائیگا اور اس درسگاہ کے ماتحت سارے ملک میں نسائی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے گا۔

وزارت تعلیم لڑکیوں کے ذریعہ سے صنعت گلدوزی کو فروغ دینے کی خاص طور پر تمنائی ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے تاکہ گلدوزی کو بوجوہ تمام فنی بلندی پر پہنچایا جا سکے۔

غیر سرکاری مدارس

جس طرح ہندوستان میں اسلامیہ سکول، ہندو سکول، خالصہ سکول اور اس قسم کے فرقہ وارانہ ناموں سے مدرسے قائم ہیں اسی طرح مصر میں بھی غیر سرکاری درسگاہیں کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن ان کا دائرہ عمل کسی خاص قوم یا فرقہ تک محدود نہیں بلکہ تمام مصری قوم ان سے بلا تخصیص مستفید ہوتی ہے یہ مدارس وزارت تعلیم کے لئے بہت زیادہ کام کرتے ہیں کیونکہ ان سے حکومت کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی باعث حکومت کی امداد و معاونت اور اشتراک عمل سے غیر سرکاری مدارس پوری طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے انسپکٹر مقرر کئے گئے ہیں جو غیر سرکاری مدارس کا معاینہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی کارکردگی سے حکومت کو مطلع کرتے ہیں۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے تجربہ کار مدرسین کی ایک جماعت بھی مقرر ہے جو بوقت ضرورت غیر سرکاری مدارس میں خدمات انجام دیتی ہے۔

صنعتی و زرعی تعلیم

صنعتی، زرعی اور تجارتی تعلیم بالکل سرکاری حیثیت رکھتی ہے اور وزارت معارف بھی عملی تعلیم کی طرف خاص طور پر متوجہ ہے حکومت چاہتی ہے کہ صنعتی تعلیم کو جدید اصول پر رواج دیا جائے تاکہ مصری منڈیوں پر دیسی اشیا کا قبضہ ہو جائے اور اس طرح وہ روپیہ ملک ہی کے کام آئے جو غیر ملکی مصنوعات کے ذریعے سے یورپی تاجر وصول کر لیتے ہیں۔ برطانیہ کے لئے مصر ایک سود مند منڈی کی حیثیت رکھتا ہے جہاں انگلستانی تاجر خام پیداوار سستے داموں خریدتے ہیں اور انہیں مصنوعات سے بدل کر دوبارہ مصری منڈیوں میں بھیج دیتے ہیں۔ مصریوں کا جوش آزادی جب سے ترقی پذیر ہوا ہے وہ صنعتی جنگ میں بھی کامیاب حریف کی طرح شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اسی احساس کے پیش نظر حکومت کی طرف سے صنعتی تعلیم کا خاص طور پر اہتمام کیا جا رہا ہے۔

صنعتی تعلیم کے بعد زرعی تعلیم جاذب توجہ ہے۔ جو طلبہ فن زراعت کے علمی و عملی پہلوؤں سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں انہیں ہر قسم کی سہولت و امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ حکومت مصر چاہتی ہے کہ جدید قواعد زراعت جاننے والے میدان عمل میں آئیں تاکہ زرعی ترقی سے ملک کی اقتصادی و معاشی مشکلات کا مقابلہ کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں تجارتی درسگاہیں بھی حسب ضرورت موجود ہیں جہاں غیر مصری زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے اس اقدام کا سبب یہ ہے کہ مصر کا تجارتی دامن یورپی ممالک سے وابستہ ہے اس لئے تجارتی مدارس میں بھی یورپی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔

فنون لطیفہ

مصر تاریخی اعتبار سے فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے آج کل یورپ اور ایشیا میں فنون لطیفہ کی جس قدر روشنی ہے اس کے منبع و مصدر میں قدیم مصر کی تجلیاں بھی شامل ہیں اس لئے وزارت معارف فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن سہولت و آسانی مہیا کرتی ہے اس مقصد کیلئے ایک جدید مدرسہ کھولا گیا ہے جہاں ترقی یافتہ اصول و قواعد کے مطابق تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری ہے ایک عالی درسگاہ بھی ہے جو قابل ترین اساتذہ کی نگرانی میں جاری ہے یہاں طلبہ کو فنون لطیفہ کی عملی اور آزمودہ تعلیم دی جاتی ہے۔ فنون لطیفہ کی تمام درسگاہیں خواہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ہوں حکومت کی امداد سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔

موسیقی کی تعلیم

موسیقی کی تعلیم بھی وزارت تعلیمات مصر کے مقاصد میں شامل ہے تعلیم کے مختلف درجوں میں موسیقی کا ایک شعبہ لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے جہاں مصری نوجوان لڑکیاں نغمہ و ترنم کے اصول و قواعد سیکھتی ہیں وزارت تعلیم ابتدائی تعلیم میں بھی موسیقی کو داخل کرنا چاہتی ہے تاکہ خورد سال بچے نغمات کے دلکش ماحول میں منزل تعلیم تک پہنچ سکیں۔ علاوہ ازیں موسیقی کو تمام ذرائع سے مقبول و محبوب بنانے کی کوشش ہو رہی ہے وزارت تعلیم کا خیال ہے کہ اس طرح وہ قدیم عربی موسیقی ترقی یافتہ صورت میں پیش کی جائے جس کی صدائے بازگشت آج بھی ریگستان کی خاموش فضا سے آ رہی ہے۔

جسمانی تربیت

جسمانی تربیت سے تمام مکاتب کے طلبہ کو مستفید ہونا پڑتا ہے وزارت کا خیال ہے کہ جسمانی نشوونما ان طاقتوں کو قابل عمل بناتی ہے جو علم و حکمت اور صنعت و حرفت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں ایک خاص جماعت مقرر کی گئی ہے جو مدرسے کے اندر اور باہر طلبہ کی جسمانی و اخلاقی حالت کی نگرانی کرتی ہے اور اسی جماعت کے اہتمام میں مختلف قسم کی بازی گاہیں اور کلب موجود ہیں جہاں جسمانی ترقی کے لئے طاقت بخش کھیلوں کا

اہتمام کیا گیا ہے یہ ہے مصر کے تعلیمی نظام کا مختصر خاکہ لیکن اس میں اعلیٰ تعلیم کی کیفیت شامل نہیں کیونکہ جامعہ مصریہ اور جامعہ ازہر ...

تجلیات!

حضرت نجم آفندی اکبرآبادی

درِ ساقی کھُلے اک سجدۂ مستانہ ہو جائے
سحر ہونے سے پہلے ختم یہ دنیا نہ ہو جائے

نگاہیں میری اُنکی لڑ گئی ہیں خیر ہو یارب
قرینہ ہے کہ دونوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

محبت جبر کرتی ہے نہ حسن اصرار کرتا ہے
جسے بیگانگی توفیق دے بیگانہ ہو جائے

ہجومِ نا اُمیدی بڑھ چلا ہی چیخ اُٹھوں گا
وہ ساعت آ گئی ہے جب دُعا افسانہ ہو جائے

اجازت ہو تو میں دُنیا میں کوثر کی بنا ڈالوں
یہاں بھی اک تمھارے نام کا میخانہ ہو جائے

کمی ہے حسن منزل میں مرے نورِ محبت کی
میں جب چاہوں مکمل جلوۂ جانانہ ہو جائے

کوئی پوچھے تمھاری بے نیازی چاہتی کیا ہے
دُعائیں کرتے کرتے آدمی دیوانہ ہو جائے

غزل ہو نجم میری اور زباں اُس نغمہ پرور کی
مرا ہر لفظ ہونٹوں تک لبِ پیمانہ ہو جائے

"وہ وحشت انگیز سڑک"

روسی افسانہ نویس چیخوف کا ایک شاہکار

از جناب جمیل احمد صاحب کندھاپوری ۔ بی ۔ اے

اسٹیشن پہنچکر مرناف کو معلوم ہوا کہ اس مقام تک پہنچنے کے لئے جہاں اسے اپنی تجارت کے سلسلے میں جانا تھا ۔ اس کو تقریباً تیس چالیس میل کی مسافت سنسان سڑک پر طے کرنا ہوگی ۔

"اگر کوئی ہوشیار کوچبان اور تیز گھوڑے مل گئے" اس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا ۔ "تو جلد پہنچ جاؤں گا ورنہ اگر مریل گھوڑے ملے تو پھر آفت ہی آجائیگی"

"کیا آپ مہربانی فرماکر مجھے یہ تبلا سکتے ہیں کہ اس جگہ سواری کہاں ملے گی؟" مرناف نے اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کیا ۔

"سواری ـــــ ؟" اسٹیشن ماسٹر نے قدرے چونک کر جواب دیا ۔ "یہاں تو آپ کو سو میل تک شاید کوئی بازاری کتا بھی نہیں مل سکتا ۔ آخر آپ کو جانا کدھر ہے ؟"

"ڈیکونا! جنرل ہوہوناف کے گھر"

"خیر ۔ !" اسٹیشن ماسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا ۔ "تو پھر اسٹیشن کے عقب میں جائیے ۔ اس طرف چند کسان رہتے ہیں جو کبھی کبھی اپنی گاڑیوں میں مسافروں کو لے جایا کرتے ہیں"

مرناف نے آہستگی کے ساتھ ایک آہ کھینچی اور اسٹیشن کی دوسری جانب روانہ ہوگیا ۔ بہت جستجو اور سخت جد و جہد کے بعد آخر اسے ایک موٹا تازہ، مضبوط و توانا کسان ملا، جو پھٹے ہوئے جوتے اور پیوند آلود کوٹ پہنے ہوئے تھا ۔

"کیسی عجیب و غریب گاڑی رکھ چھوڑی ہے تم نے" مرناف نے اس پر سوار ہوتے ہوئے کسان سے کہا ۔ "معلوم نہیں آگے اِدھر ہے یا اُدھر"

"معلوم نہیں ہوتا ؟ گھوڑے کی دُم آگے کی جانب ہے اور جدھر آپ بیٹھے ہوئے ہیں وہ عقب کا حصہ ہے"

گھوڑا نو عمر تھا اور لاغر ـــ کان اور پاؤں بیڈھنگے انداز میں پھیلے ہوئے تھے ۔ جب کوچبان نے کھڑے ہو کر اپنی رسی کے چابک سے گھوڑے کے ایک زور سے لگائی تو اس نے صرف اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی جب دوبارہ چابک رسید کی تو گاڑی اس زور سے کڑکڑائی اور اس سے ایسی وحشت انگیز آوازیں نکلنے لگیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سرسام کا مریض ہوش و حواس کھو کر بڑبڑا رہا ہو ۔ تیسری چابک پر گاڑی ذرا ہلی مگر چوتھی چابک پر آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوئی ۔

"کیا گاڑی تمام راہ اسی طرح چلے گی ؟" مرناف نے گھوڑے کی نازیبا چال سے تنگ آکر کہا ۔

"نہیں نہیں" گاڑیبان نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا ۔ "گھوڑا ذرا کمسن اور کمزور ہے ۔ ایک بار اسے زور سے چلنے دیجئے ۔ پھر معلوم ہو جائیگا کہ یہ کس تیزگامی سے چلتا ہے ۔ . . . چل اے شیطان !"

غروب آفتاب کے وقت وہ اسٹیشن سے روانہ ہوئے ۔ دائیں جانب یہاں سے وہاں تک ایک وسیع اور لامحدود چٹیل زمین تھی جس کا حد نظر تک کہیں کوئی کنارا نظر نہ آتا تھا ۔ بائیں جانب شام کی دھندلی روشنی

میں جا بجا ٹیلے نظر آتے تھے۔ مقابل کا منظر مرناف کی نظر سے پوشیدہ تھا اور اسے کوئی چیز بھی نظر نہ آتی تھی کیونکہ سامنے کوچبان کی پشت تھی۔ ہوا ساکت تھی مگر سرد اور کہر آلود۔

"کیسی وحشت انگیز ویرانی ہے یہ" مرناف نے کوٹ کے کالر سے اپنے کان چھپاتے ہوئے سوچا۔ "نہ کوئی جھونپڑی نظر آتی ہے نہ کوئی مکان اگر رہزن یہاں گھیر کر ہمیں لوٹ لیں تو کسی کو کبھی خبر تک نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ ہم اگر زور زور سے توپ چھوڑیں جب بھی کسی ذی روح کے کانوں تک آواز نہیں پہنچ سکتی ..... اور پھر یہ کوچبان ..... یہ بھی تو قابلِ اعتماد نہیں معلوم ہوتا۔ کمبخت کی پشت کیسی مکروہ اور چوڑی ہے اور ناک ..... یہ تو کسی خونخوار درندہ کی سی معلوم ہوتی ہے"

"میرے دوست ذرا ادھر تو دیکھنا" مرناف نے کوچبان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ذرا اپنا نام تو بتاؤ"

"میرا نام؟ مجھے کلیم Klim کہتے ہیں"

"اچھا ذرا یہ تو کہو کہ یہ جگہ کیسی ہے؟ خطرناک تو نہیں؟ کیا اس طرف کبھی لوٹ مار تو نہیں ہوا کرتی"

"نہیں نہیں! خدا ان چیزوں سے بچائے۔ آخر یہاں ایسی حرکتیں کون کر سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے مگر کچھ بھی ہو میں نے اپنے پاس تین پستولیں رکھ چھوڑی ہیں" مرناف نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ پستول والوں سے لگنا مذاق نہیں۔ ایک پستول سے دس ڈاکوؤں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے"

رات بہیں ہکی تھی یکایک گاڑی زور سے کرکرائی۔ لرزی اور خوفناک آوازیں فضا میں پھیلاتی ہوئی کچھ اس طرح بائیں جانب کو مڑ گئی جیسے وہ یہ کام اپنی رضامندی کے خلاف کر رہی ہو۔

"آخر یہ مجھے اس طرف سے کہاں لے جا رہا ہے؟" مرناف نے سوچا "وہ تو ایکدم سیدھی سمت چل رہا تھا مگر اب اس نے یکایک بائیں جانب کی راہ اختیار کر لی۔ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ شیطان مجھے کسی ویران جھاڑی میں نہ لے جا رہا ہو ..... اور ..... اور پھر ایسے واقعات تو اکثر سننے میں بھی آئے ہیں"

"ہاں! تو تم کہتے ہو کہ اس طرف کوئی خطرہ نہیں" مرناف نے پھر کوچبان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ تو تم نے بڑے افسوس کی بات کہی! مجھے تو ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ویسے دیکھنے میں میں دبلا پتلا اور مریل ضرور ہوں مگر طاقت ایک مضبوط سانڈ سے کم نہیں رکھتا۔ ایک مرتبہ تین ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کیا ——— اور جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ ان میں سے ایک کو تو میں نے اس زور سے بھینچا کہ اس کی روح فنا ہو گئی۔ بقیہ دو کو میں نے قید باشقت کی سزا دلوا کر سائبیریا بھجوا دیا .... مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ مقابلہ کرتے وقت آخر اتنی طاقت مجھ میں آ کہاں سے جاتی ہے۔ تمہارے جیسے ہاتھ پاؤں والوں کو تو میں آسانی کے ساتھ صرف ایک ہاتھ سے ہی اٹھا کر کھال ادھیڑ سکتا ہوں"

گاڑیبان نے مرناف کو مڑ کر ایک مرتبہ دیکھا اور زور زور سے اپنی آنکھیں مٹکا مٹکا کر گھوڑے کے ایک چابک لگائی۔

"ہاں میرے دوست!" مرناف نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "خدا ہی اس رہزن کی مدد کرے جو میرے ہاتھ آ جائے کیونکہ وہ نہ صرف میرے ہاتھوں سے اپنے بازو اور جسم کے دیگر قیمتی اعضا کو کھوئیگا۔ بلکہ عدالت کی طرف سے بھی جہاں کہ میرے خاص احباب میں تمام جج اور وکلاء ہیں اُس کو اپنے جرموں کی سخت سزائیں بھگتنا پڑینگی۔ خود میں سرکاری افسر ہوں اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ بہت بڑا۔ اس طرح جب مجھے کبھی سفر کی نوبت آ جاتی ہے تو چونکہ حکومت کو پہلے سے اس کا علم رہتا ہے اس لئے وہ اس پر خاص نظر رکھتی ہے کہ کہیں کوئی دوران سفر میں مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے۔ اس طرف تمام سڑکوں کے ہر دو جانب جھاڑیوں کے اندر محکمہ پولیس کے بڑے بڑے افسر چھپے ہوئے ہیں! ..... ارے ..... ارے ذرا ٹھہرنا ——— " مرناف نے یکایک زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ "آخر تم جا کدھر رہے ہو۔ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"آپ دیکھتے نہیں، جنگل کے اندر"

"تو یہ بات ہے!" ——— مرناف نے دل ہی دل میں سوچا۔ "میں ناحق خوفزدہ ہو گیا تھا مجھے اپنے دلی جذبات اس طرح پر آشکارا نہ کرنا چاہئیں۔ یہ بات تو اس کو معلوم ہو بھی ہو چکی کہ میں اس سے ڈر سا گیا ہوں مگر ..... آخر وہ مجھے بار بار مڑ کر دیکھتا کیوں ہے؟ ضرور کوئی خیال کا

کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا...... کہاں تو پہلے اس کا گھوڑا چلتا ہی نہ تھا اور اب یہ حال ہے کہ وہ اڑا چلا جاتا ہے۔

"ارے بھائی! اپنے گھوڑے کو تم اس طرح آخر دوڑا کیوں رہے ہو؟"

"میں نہیں دوڑا رہا جناب۔ وہ تو اپنی مرضی سے سرپٹ نکلا جا رہا ہے۔ میں نے قبل آپ سے کہا تھا کہ جب یہ دوڑنا شروع کر دیتا ہے تو پھر کوئی طاقت اس کو روک رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کو تو خود ہی اس کا غم لگا ہوگا کہ اس کے پاؤں اس قدر تیز کیوں بنائے گئے۔"

"یہ بالکل جھوٹ ہے میرے دوست... سراسر لغو اور ناقابل یقین۔ میں تمہیں صلاح دیتا ہوں کہ اتنے زور سے گاڑی نہ چلاؤ... چال ذرا آہستہ کردو... سنتے ہو۔ ذرا لگام کھینچ لو۔"

"کیوں ــــ ؟"

"کیونکہ میرے چار احباب اسٹیشن سے میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہو جائیں۔ انھوں نے اسی جنگل میں مجھ سے شامل ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ شامل ہو جائیں تو راستہ ذرا زیادہ لطف سے کٹے گا۔ کیونکہ میرے وہ احباب نہایت قوی ہیکل جوان ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک عدد پستول ہے...... اچھا یہ تو بتاؤ تم بار بار مڑ کر میری طرف کیوں دیکھتے ہو؟ میرے خیال میں تو میرے پاس کوئی خاص جاذب توجہ چیز نہیں ہے۔ البتہ پستول ضرور ہیں۔ کیا تم دیکھنا چاہتے ہو؟ اچھا تو میں انھیں تم کو دکھاتا ہوں۔ مجھے جیب سے نکال لینے دو۔"

اتنا کہہ کر مزاف نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیئے۔ کوچبان کلم پر یہ رعب جمانے کیلئے کہ وہ سچ مچ پستول نکال رہا ہے۔ مگر اسی وقت ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کا مزاف کے دماغ میں کبھی وہم و گمان بھی نہ گذرا تھا۔ کوچبان یکایک گاڑی پر سے چھلانگ مار کر نیچے اترا اور بے تحاشا جنگل کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔

"مدد کرو ــــ مدد کرو ــــ" وہ زور زور سے چیختا جا رہا تھا ــــ

"میرا گھوڑا لے لو ــــ میری گاڑی لے لو۔ مگر ــــ خدا کے لئے میری جان بخش دو ــــ مدد کرو...... مدد کرو...... مدد......"

رفتہ رفتہ اس کے قدموں کی آواز جنگل کی پرہیبت خاموشی میں غرق ہو گئی... پتے کچھ دیر تک کھڑکھڑائے اور پھر تمام سکوت حکمران

ہو گیا۔ مزاف نے اس غیر متوقع واقعہ سے دوچار ہو کر سب سے پہلے گھوڑے کی عنان کھینچ لی اور گاڑی کو روک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر اپنے حال پر غور کرنے لگا۔

"تو گویا وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ بیوقوف کہیں کا! مگر اب میں کیا کروں۔ راستہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لہذا تنہا تو میں جا نہیں سکتا اور اگر میں نے اس کی کوشش بھی کی تو لوگ یہ سمجھنے لگ جائیں گے کہ میں کسی دوسرے کی گاڑی چرا کر بھاگا جا رہا ہوں... کیا کروں؟...... کلم! کلم.... ارے کلم!!...."

"کلم!..." جنگل میں صدائے بازگشت پیدا ہوئی۔

تمام رات تاریک اور پرہیبت جنگل میں وحشی بھیڑیوں اور خونخوار درندوں سے قریب رہ کر قسم قسم کی صدائے بازگشت کی صداؤں کو سنتے ہوئے گذارنے کے خیال سے ہی مزاف کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔

"کلم!" وہ زور سے چلایا۔ "میرے پیارے کلم!... میرے اچھے کلم!... تم کہاں ہو؟...."

مسلسل دو گھنٹوں تک وہ اسی طرح پکارتا رہا مگر جب اپنی کوششوں کو رائگاں جاتے دیکھ کر وہ راضی برضا ہو کر جنگل میں رات گذارنے کے خیال پر آمادہ ہو گیا۔ تو اس کے کانوں میں ہوا کے ساتھ ساتھ ایک سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کلم! کیا تم ہو؟... میرے بوڑھے کوچبان؟... آؤ کلم! اب ہم کو روانہ ہونا چاہیئے!"

"تم مجھے مار ڈالو گے!" کوچبان دور ہی سے بڑبڑایا۔

"نہیں کلم! میں تو صرف مذاق کر رہا تھا... بوڑھے لڑکے! میری بات پر یقین تو کرو! کیا تم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ واقعی میرے پاس پستول ہیں۔ یہ سب تو میں تم سے خوفزدہ ہو جانے کے باعث جھوٹ کہہ رہا تھا۔ چلو ہم روانہ ہو جائیں۔ میں تو سردی سے ٹھٹھر گیا ہوں۔"

گاڑیبان کلم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر یہ واقعی رہزن ہوتا تو کبھی کا گاڑی کو لے کر بھاگ نکلا ہوتا۔ جنگل سے نکلا اور نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے مسافر کے قریب گیا۔

"احمق! تمہیں ڈر کس بات کا لگتا ہے؟ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔"

اور تم مجھ سے خوفزدہ ہوگئے.... آؤ!... آؤ... اندر آجاؤ۔"

محصور! "کلم گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اگر مجھکو پہلے سے اس کا علم ہوتا تو لاکھوں روپیوں کے عوض بھی کبھی آپ کو لے جانے پر راضی نہ ہوتا۔ آپ نے تو مجھے تمام راستے اس قدر ڈرایا کہ شدتِ خوف سے میرے جسم کا سارا خون قریب قریب خشک ہوگیا۔"

کلم نے اپنے گھوڑے کو ایک چابک لگائی —— گاڑی گڑگڑائی

کلم نے دوبارہ چابک رسید کی —— گاڑی کو صرف جنبش ہوئی اور جب چوتھی ضرب پڑی تو گاڑی آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوئی مزاف نے اپنے کوٹ کے کالر سے کان چھپالئے —— اور بحرِ تخیل میں غوطہ زن ہوگیا۔

اب نہ اُسے کلم سے خوف سے معلوم ہوتا تھا اور نہ اس وحشت خیز سڑک سے ——!

پیام

جناب مجید لاہوری

بہارِ زیست کے جلووں کو بے نقاب کریں
سکونِ قلب کو وقفِ صد اضطراب کریں

غمِ مآل کو غرقِ سُرورِ خواب کریں
نظر کو بے خودِ رنگینیٔ شباب کریں

بسائیں رُوح کے پہلو میں درد کی دُنیا
فسونِ عشق کو ہر طرح کامیاب کریں

بیانِ شوق کو دیں گرم آنسوؤں کی زباں
جہانِ راز کے گوشوں کو بے حجاب کریں

بساطِ یاس پہ نالوں کی برق تابی سے
ہر ایک ذرّے کو ہمدوشِ آفتاب کریں

جبینِ چرخ پہ سیمائے کہکشاں بن جائیں
نہ بھول کر بھی تمنائے انقلاب کریں

جلائیں کشورِ اُلفت میں آرزو کا چراغ
نگاہِ فکر و تخیل کو کامیاب کریں

میں ہُوں شبابِ مجسّم تو تم ہو جانِ شباب
فضائے عالمِ ہستی کو پُر شباب کریں

شبابِ نو کے ترانے کچھ اس طرح چھیڑیں
شبابِ نو کو اسیرِ طلسمِ خواب کریں

سُرور و کیف میں ان آہنی چٹانوں کو
سُنا کے نغمۂ پُرسوز آب آب کریں

مجید تم پہ فدا ہو تو تم فدائے مجید
وفا ہو حاصلِ افسانۂ وفائے مجید

میری کہانی

از محترمہ مس نواب ذکیہ سلطانہ صاحبہ ذکی مرادآبادی

میں جوانی کی مئے گلگوں کا پیمانہ نہیں
جس کے ہر قطرے سے پیدا ہو خمارِ آتشیں

میں نہیں ہوں حسن والوں کی نگاہِ سحر بار
برق بن کر پھونک دے جو خرمنِ صبر و قرار

میں ہوں اک اُجڑے ہوئے معبد کا بے روغن چراغ
جس کے جلوؤں سے دلِ مضطر پہ پڑ جاتا ہے داغ

میں وفورِ شوق کی تصویرِ دل آرا نہیں
ثبت ہو جاتا ہے دل پر جس کا ہر نقشِ حسیں

میں نہیں ہوں پھول کی دُنیا میں ہر رنگِ بہار
جس کی نکہت سے مہک جاتے ہیں سارے لالہ زار

اک کلی باغِ تمنا کی ہوں مُرجھائی ہوئی
جس کی ہر پتی پہ ہے افسردگی چھائی ہوئی

میں سمندر کی نہیں ہوں کوئی موجِ دلرُبا،
میں نہیں ہوں آفتابِ دہر کی رنگیں ضیا

میں نہ کوئل کا ترانہ ہوں نہ بلبل کی نوا،
گونجتی ہے جن کے نغموں سے گلستاں کی فضا

میرا قلبِ غم نوا ٹوٹا ہوا اک ساز ہے
جاں رُبا حسرت فزا جس کی ہر اک آواز ہے

جون آف آرک کا مقدمہ

از جناب مولانا فضل حق صاحب قریشی دھلوی

۲۸ اپریل ۱۹۳۹ء کو دہلی کے ریڈیو سٹیشن سے نشر کیا گیا - ناظرین کی دلچسپی کیلئے درج ذیل ہے

مئی ۱۴۳۱ء کی ایک صبح کو یعنی اس وقت جبکہ دنیا آج کل کے مقابلہ میں بقدر نصف ہزار سال کے زیادہ جوان تھی سرزمین فرانس کی فضا پر حسرت ویاس کے بادل چھائے ہوئے تھے کیونکہ اس روز اس اولوالعزم لیکن جان ہار ہستی کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا جس کے وجود کو صفحۂ زیست سے مٹا دینے کیلئے دوست اور دشمن یکساں طور پر متفق تھے - وہ ہموطن ساتھی جن کو فتح ونصرت کی راہ پر اُس نے چلایا اور وہ غیر ملکی غنیم جن کو اپنے مانند سیلاب حملوں سے شکست فاش دیکر میدان جنگ سے مار بھگایا - وہ شاہ فرانس جس کے محروم تاج سر کو اس نے ریم کے کلیسا میں فخر تاجپوشی بخشا اور وہ کمسن شاہ انگلستان جس کے تاج کو اس نے دریائے لوائر کے کنارے ٹھکرا دیا - سب یکزبان ہو کر اس فیصلہ کی تائید کر رہے تھے کہ اس دوشیزہ کو جسے مستقبل میں ولیوں اور بزرگان دین کی صف میں نمایاں جگہ ملنے والی تھی فاحشہ اور ساحرہ قرار دیتے ہوئے نذر آتش کر دیا جائے اس لئے اپنی کامیابی پر خوش تھے - وہ فاضل جج - وہ علمبرداران مذہب جن کے آباؤاجداد ایک طرف یونان میں وحدانیت کے قائل سقراط کو ملحد بتاتے ہوئے زہر کا پیالہ پیش کر چکے تھے اور دوسری طرف جن کی ذریات پابند مذہب قرۃ العین کو بے دین ثابت کر کے پھانسی کے تختے پر لٹکانے کی خاطر ایران میں جنم لینے کیلئے بیتاب تھی - کمسن جون پر الزام لگائے گئے تھے ان کی تعداد کم وبیش ستر تھی - جس کو بعد میں خود ہی گھٹا کر بارہ کر دیا گیا تھا۔

پہلا الزام یہ تھا کہ اس نے والدین کی حکم عدولی کی اور ان کی مرضی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا - چونکہ جون کا باپ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی فوجی سپاہیوں کے ساتھ مل جل کر اپنی عصمت کو قائم نہ رکھ سکے گی اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا وہ اقدام ننگ خاندان ثابت ہو لیکن شاید اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جب کسی کی عزت وآبرو کا خدا خود نگہبان ہو جاتا ہے تو شیطانی وسوسے بدنامی کا داغ لگانے سے عاجز آجاتے ہیں چنانچہ اس نے بطور تنبیہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ بلا اجازت فرار ہو گئی تو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ کر اُسے دریا میں ڈبو دیا جائے گا - لیکن یہ خوف اُس کے پاؤں میں بیڑی نہ لگا سکا - کیونکہ اس وقت اس کے ہر قدم کو کوئی دوسری طاقت اُٹھا رہی تھی -

دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ مردانہ لباس پہنتی اور مردوں کی طرح سر کے بال کترواتی ہے - حالانکہ اس کا جواب معقول تھا کہ اگر وہ یہ ظاہری تبدیلی نہ پیدا کرتی تو مرد کی حریص نظریں اس کی نسائیت سے لطف اندوز ہونے کیلئے اسے چین نہ لینے دیتیں اور اس طرح مقابلتہً اُسے زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا -

تیسرا الزام اس کے چال چلن کے متعلق تھا - عام طور پر وہ فاحشہ مشہور تھی - لوگ کہتے تھے کہ اس کا ناجائز تعلق سپاہیوں کے ساتھ اس وقت سے تھا جبکہ اس کے وطن ڈومریمی کے تمام لوگ انگریزی فوج کے حملے کے باعث فرار ہو کر ایک دوسرے مقام پر پناہ گزیں ہو گئے تھے اور اس مجبوری کے عالم میں وہ سپاہیوں کے پہلو بہ پہلو سوتی تھی - حالانکہ اس کے مقدمے کی کارروائی کے درمیان میں طبی معاینہ کے ذریعہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ حقیقتہً وہ عفت مآب ہے

گر ہٹ دھرم پادریوں اور عدالت کے حاکموں نے کسی عنوان اس کی دوشیزگی
کو تسلیم نہ کیا۔

چوتھا الزام یہ تھا کہ اس کے تمام دعوی کہ اُسے غیبی آوازیں سنائی
دیتی ہیں بے بنیاد اور محض باطل ہیں۔ وہ کہتی تھی کہ اس کا کوئی فعل خود اختیاری
نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ آسمانی احکام کی تعمیل کرتی ہے۔ جو کچھ وہ سنتی ہے اُس کے
مطابق عمل کرتی ہے۔ اُس نے دعوی کیا تھا کہ میں اس انگریزی فوج کو شکست
دیدونگی جس نے اورلیاں کا محاصرہ کر رکھا ہے اور یہ کہ ریمز کے کلیسا میں باقاعدہ
رسم تاجپوشی ادا کرکے چارلس ہفتم کو جو اس وقت تک برائے نام بادشاہ ہے
حقیقی معنوں میں بادشاہ بنادونگی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ دونوں دعوے
پورے ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے الہامات کو مکر و فریب
اور اس کی پیشین گوئیوں کو جھوٹ قرار دیا گیا۔

ماہرین نفسیات نے الہام کی حقیقت اس طرح واضح کی ہے کہ جب
انسان کا تخیل بہت ترقی پا جاتا ہے تو ذہن کی گہرائیوں سے بلند ہونے والی
آوازیں اپنے کانوں سے سنی جاسکتی ہیں اور اسی طرح تصورات کی دنیا میں
دکھائی دینے والی شکلیں مادی آنکھوں کو نظر آنے لگتی ہیں۔ مذہبی اصطلاح
میں اسی کو الہام و وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ بیان کہ میں سینٹ
کیتھرین اور سینٹ مارگریٹ وغیرہ کو دیکھتی اور ان سے ہمکلام ہوتی ہوں۔
وہ پانچواں الزام تھا جو اس پر بعنوان فریب کاری عاید کیا گیا۔ اپنی صفائی میں
اس نے جدید واقعات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ مگر نقار خانے میں طوطی
کی آواز کون سنتا ہے۔ وہ زبردست طاقتیں جو اس وقت حقیقی معنوں میں
سیاہ و سفید کی مالک بنی ہوئی تھیں۔ کس طرح ان صداقتوں کو ملحوظ رکھتیں
جبکہ ان کے خود ساختہ اوہام خیالی ان کو یہ یقین دلانے کیلئے کافی تھے کہ اگر
اس زمانے میں الہام کا فخر کسی کو حاصل ہو سکتا ہے تو وہ خود ان کی ذات ہے
نہ کہ وہ غریب کسان کی لڑکی جس نے زندگی کی سولہ بہاریں کھیت میں کام
کرکے گذاری ہوں۔ وہ عورت ذات جسے سماج میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل
نہ ہو سوائے اس کے کہ وہ مرد کے جذبات کو تسکین دینے کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

اس کو وعدہ خلاف۔ بے وفا اور دغاباز بھی کہا گیا اور یہ سلسلے کا
چھٹا الزام تھا۔ اس کی نوعیت اس طرح ہے کہ ایک بار اس کے ایک ہم وطن
نوجوان نے اس پر فوجداری مقدمہ قائم کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کا
عہد و پیمان کرکے مکر گئی ہے حالانکہ مقدمہ کا فیصلہ بہت عرصہ قبل جون ہی کے
حق میں ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی فرد جرم میں اس کو بطور الزام شامل کیا گیا۔ ابتدائی
عمر ہی میں جون ہمیشہ کنواری رہنے کی قسم کھا چکی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ وہ کسی
سے شادی کا وعدہ نہیں کر سکتی تھی اور اسی لئے مقدمہ بھی خارج ہوگیا تھا۔ مقدمہ
کی پیروی بغیر کسی وکیل کے خود جون نے کی تھی۔

ساتویں الزام کی تفصیل یہ ہے کہ جب دریائے رون کے قریب
شہر کومپین کا محاصرہ اہل برگنڈی نے کر رکھا تھا اور جون اپنی فوج کے ساتھ اس
کوشش میں تھی کہ کسی طرح ان پر غالب آجائے کہ اچانک وہ ایک تیر سے
زخمی ہوگئی۔ دوسرے پل کا دروازہ اچانک بند کر دیئے جانے کے باعث وہ
اعراب میں آگئی تھی۔ اس لئے اہل برگنڈی نے آسانی کے ساتھ اسے قید کرکے
دس ہزار فرانک کے عوض انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح مقدمہ کی
کارروائی شروع ہونے تک کے لئے وہ قلعہ بورداریں نظر بند کردی گئی۔ وہاں
قید ہوئے ابھی زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اس نے فرار ہو جانے کی نیت سے
آنکھ بچا کر ستر فیٹ کی بلندی سے چھلانگ ماری لیکن خفیہ پہرے کے سپاہیوں
نے دیکھ لیا اور وہ دوبارہ گرفتار کرلی گئی۔ یہ فعل ضابطہ جیل کی خلاف ورزی
اور سنگین جرم قرار پایا۔ علاوہ ازیں یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ اسے اپنی صداقت
سے زیادہ اپنی جان عزیز تھی۔ لیکن بے بنیاد اور ناقابل تسلیم۔

اگر اُسے جان عزیز ہوتی تو اسے خطرے میں ڈال کر اتنی بلندی سے
نہ کودتی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی قید کا انجام موت
کی شکل میں رونما ہوگا۔ اس ارتکاب کے دو سبب تھے اول تو محافظ کے مذموم
طرز سے مشکوک ہوگئی تھی۔ کہ مبادا وہ عزت جو اس وقت تک اُس نے برقرار
رکھی تھی خاک میں نہ مل جائے اور دوسرے اس احساس کی بنا پر کہ اس
کی فوج اگر ہمت ہار کر بیٹھ گئی تو نئے سرے سے اس کے اندر جوش عمل پیدا
کرنا محال ہو جائیگا اور اس لئے ان کے پاؤں جمانے کے لئے ان کے سر پر
پہنچ جانا ضروری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ انگریزی فوج کو انگلستان اور خود فرانس
کی طرف سے برابر تقویت پہنچائی جارہی ہے اس لئے آج جس نخل استعمار کو
بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا آسان ہے کل اس کے مضبوط تنے کو ہلانا بھی
مشکل ہو جائے گا۔

فاضل ججوں کی عقل بھی لائق ماتم ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ

چھلانگ مار کر اپنی جان بچالینا چاہتی تھی جو گویا اس کے کذب و بطل کی دلیل تھی اور دوسری طرف اسی فعل کو اقدام خودکشی سے تعبیر کیا گیا اور اس طرح یہ آٹھواں الزام تھا۔ کیونکہ مروجہ قانون کے مطابق اس زمانے میں بھی خودکشی ممنوع تھی۔ لیکن یہ تضاد کس طرح ممکن تھا۔ کہ وہ مرجانا چاہتی تھی اور زندہ رہنا بھی حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز اپنی قوم کی زندگی تھی۔

نواں الزام یہ تھا کہ وہ زبردست ساحرہ ہے۔ اپنے جادو کے زور سے لوگوں پر اثر جما لیتی ہے۔ تہذیب و تمدن سے کوسوں دور اس نے گاؤں کی بے رنگ فضا میں ان سادہ لوح ہستیوں کے ساتھ مل جل کر پرورش پائی تھی جن کے دل مکر و فریب تو کجا معمولی چالبازیوں سے بھی پاک ہوتے ہیں البتہ اس کی زبان میں ایک عجیب مقناطیسی قوت موجود تھی اور وہ صرف اس لئے کہ اس کا ہر لفظ خلوص و صداقت سے لبریز ہوتا تھا۔ جسے سنکر مخالفین بھی سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ سب سے پہلے جب وہ ڈیوک آف بودریکو کے پاس کچھ امداد حاصل کرنے کی غرض سے گئی تو اس نے جاہل ناسمجھ کہہ کر ٹال دینا چاہا۔ مگر گفتگو سے قائل ہو گیا اور جوآن کو چند سپاہی۔ زرہ۔ تلوار اور گھوڑا ہی عطا نہیں کیا بلکہ شاہ چارلس ہفتم کے نام ایک سفارشی چٹھی بھی دے دی۔ جس میں لکھا تھا کہ یہ لڑکی حکومت کے لئے یقیناً بہت مفید ثابت ہوگی۔ دربار شاہی میں بھی یہی صورت پیدا ہوئی کہ مخالفین کو انجام کار سر جھکا لینا پڑا۔ علاوہ ازیں دریائے لوائر کے کنارے جب یہ انتظار ہو رہا تھا کہ کسی طرح باد شرق میں تبدیلی ہو تاکہ دریا عبور کرنا آسان ہو جائے اور بظاہر اس نظام قدرت پر کسی انسانی تدبیر کا غالب آجانا غیر ممکن تھا کہ اچانک اس مقام پر جوآن کے آتے ہی قریب کے گرجا کی چوٹی پر لگے ہوئے قبلہ نما کا رخ بدل گیا مگر خبیث ہستیوں نے اس معجزے کو سحر سے تعبیر کیا۔ اور اس کی پیغمبری کے قائل نہ ہوئے۔

دسواں الزام بہت معمولی لیکن مخالفین کی نگاہ میں بہت سنگین تھا۔ وہ اپنی فوج کے سپاہیوں کو یہ کہکر جوش دلاتی تھی کہ مجھے غیبی آوازوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ خدا، اس کے پیغمبر اور برگزیدہ ولی انگریزوں کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اور جب آسمانی قوتیں ہی ان کی مخالف ہونگی تو ظاہر ہے کہ فتح کا جھنڈا ہمارے ہاتھ رہیگا۔ اس لئے ہمت ہارنا مناسب نہیں چنانچہ انگریزی فوج کا ہر سپاہی اس بات پر تلا ہوا تھا کہ اگر جوآن مل جائے تو اسے کچا ہی چبا ڈالے۔ اور جب عدالت کے جج ــــ باطن میں جن کے دلوں پر جوآن کی عظمت کا خوف چھایا ہوا تھا ــــ اس تجویز پر غور کر رہے تھے کہ اسے زندہ جلانے کی بجائے حبس دوام کی سزا دے دی جائے تو عوام میں برہمی اور مخالفت پیدا ہو چلی تھی۔ ایوان عدالت کے سامنے وسیع چوک میں کئی روز پہلے سے لکڑیوں کا انبار لگا دیا گیا تھا کہ آخری فیصلہ ہوتے ہی جس قدر جلد ممکن ہو آتش نمرود کا دوسرا منظر پیش کیا جا سکے۔

گیارہواں الزام یہ تھا کہ اس نے حضرت مریم کی پیدائش کے دن بھی اپنی فوج کو جنگ سے باز نہیں رکھا۔ حالانکہ اس مقدس تہوار کے موقع پر ہر قسم کی خونریزی سختی کے ساتھ ممنوع تھی۔ جوآن کا استدلال یہ تھا کہ جب ہمارے پیش نظر ایسا مقصد ہو جس کا تعلق انفرادیت کے بجائے بحیثیت مجموعی تمام قوم سے ہو سکتا ہے تو اس قسم کی سطحی چیزوں کو نظر انداز کر دینا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے۔

آخری الزام تمام پادریوں کی ذات سے متعلق تھا۔ اور اسی لئے سب سے زیادہ اہم اور ناقابل معافی۔ جوآن نے صاف الفاظ میں کہدیا تھا کہ میں گرجا کا کوئی فیصلہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میرے مقدمہ کی کارروائی صرف ملکی عدالت میں پیش کی جائے کیونکہ گرجا کے پادری صحیح فیصلہ کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ نیز بیانات کے دوران میں فرد جرم لگنے سے پہلے اس نے کہدیا تھا کہ اگر پادری غیبی آوازوں کے ضمن میں کوئی سوال کرینگے تو میں ہرگز جواب نہیں دونگی اور اگر انھوں نے زبردستی مجھ سے یہ اقبال کرانا چاہا کہ وہ آوازیں آسمانی نہیں تھیں تو شاید میں عارضی طور پر اقبال کر لوں لیکن اس کے بعد اپنا بیان پلٹ دونگی کیونکہ میں سچے دل سے ان کو الہام خداوندی سمجھتی ہوں۔

یہ تھا وہ دفتر بے معنی جس کو مئے ناب میں ڈبونے کی بجائے شاید زہر میں بجھایا گیا ہوگا تاکہ اس کی سمیت معصوم جوآن کو فوراً صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے۔

آخری فیصلے کے دن جس ذلت کے ساتھ اسے جانوروں کو بند کرنے والی گاڑی کے اندر بٹھا کر عدالت میں لایا گیا ہے وہ ناقابل برداشت تھی۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے علاوہ گردن اور کمر میں بھی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ قید کی سختیوں کے باعث جن کی نوعیت خدا جانے کیا کچھ

ہو گی۔ مقدمہ بہ مفہوم اور بہ مضمون معلوم ہو رہی تھی۔ ایک معمولی لکڑی کی تپائی بیمار کے بیٹھ جانے کے لئے کہا گیا۔ عدالت مشترکہ تھی۔ ایک طرف دارالعلوم پیرس کا اسقف اعظم کوشون تھا اور دوسری طرف عدالت عالیہ کا سب سے بڑا جج ارل آف وارک۔ ان کے علاوہ کم درجہ کے پادری اور منصف تھے جن کی مجموعی تعداد تقریباً چالیس تھی۔ مقدمہ کی گذشتہ نو پیشیوں میں کوئی خاص نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا تھا۔ ہر ممکن طریقہ سے کافی زور ڈال کر یہ کوشش کی جا چکی تھی کہ کسی طرح وہ یہ تسلیم کرے کہ جن آوازوں کو وہ ندائے غیب سے تعبیر کرتی رہی ہے محض من گھڑت ہیں۔ لہذا آخری دن انہوں نے کسی بحث و تمحیص کو ضروری نہ سمجھا اور کسی تمہید کے بغیر کوشون اس فیصلے کو پڑھ کر سنانے لگا جو باتفاق رائے پہلے سے مرتب کر کے رکھ لیا گیا تھا لیکن ابھی ایک منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ جون کی کپکپاتی ہوئی آواز قطع کلام کرنے لگی۔ لارڈ برکن ہیڈ کا خیال ہے کہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ بھیانک موت کی ہیبت ناک تاریکی اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ یا تو وہ یہ کہتی تھی کہ اگر تم میرے جسم کا ایک ایک عضو علیحدہ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تب بھی میرا ضمیر مجھ کو کسی لغزش کی اجازت نہ دے گی یا ایکدم اپنے مثالی کردار پر بدنما دھبہ لگاتے ہوئے وہ تسلیم و رضا کیلئے آمادہ ہو گئی لیکن بعد کے واقعات ثابت کر سکتے ہیں کہ لارڈ برکن ہیڈ کا یہ نظریہ ہرگز درست نہیں تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ عدالت جن الفاظ میں بھی اعتراف جرم کرانا چاہے میں بسر و چشم تیار ہوں۔ بالکل اس طرح جیسے اچانک کسی کے دل کی حرکت بند ہو جائے۔ ایوان عدالت میں گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ لوگ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اور اس فوری تغیر کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ خوش نصیب جج جو اس زریں موقع کو ہاتھ سے کھو دینا نہیں چاہتے تھے فوراً انحراف نامہ قلمبند کرنے لگے اور جب اسے جون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے بلا پس و پیش اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے اس طرح اس نے ان تمام الزامات کو جو اس پر عاید کئے گئے تھے اور جن کی تردید وہ پرزور الفاظ میں کر چکی تھی یک جنبش قلم تسلیم کر لیا۔ اب وہ اس کی رو سے وہ سب کچھ ہو گئی جو حقیقتہً نہیں تھی۔ ساحرہ، فاحشہ، بے وفا، دغاباز، کفر و الحاد کی مورت شیطان کی مرید اور خدا جانے کیا کیا۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو کوشون نے جون کو مخاطب کر کے کہا "ہر چند اب وہ شرمناک سزائے موت تم کو نہیں دی جائیگی جو ہم نے تمہارے لئے تجویز کی تھی تاہم اس خیال سے کہ کہیں شیطانی وسوسے تم کو دوبارہ غلط راستے پر نہ ڈالدیں یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ تم کو ہمیشہ نظر بند رکھا جائے اور اس لئے حبس دوام کی سزا اسی وقت سے شروع کی جاتی ہے"۔

یہ سننا تھا کہ جون کے دل میں آتش غضب بھڑک اٹھی وہ بھوکی شیرنی کی طرح کرسیٔ عدالت کی طرف جھپٹی اور اس کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے جس پر اعتراف جرم کے دستخط کئے تھے۔ نیز فاضل ججوں کے انصاف کی جس قدر تعریف کی جا سکتی تھی کر ڈالی۔ جملہ حاضرین میں ایک کھلبلی سی مچ گئی کہ ذرا سی دیر میں واقعات نے کتنے رنگ بدل لئے۔ جون نے بتایا کہ اس کا اعتراف جرم موت کے خوف سے ہرگز نہیں تھا البتہ وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہنا چاہتی تھی تاکہ اپنی قوم کی مزید خدمت کر سکے اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز وہ انگریزوں کے وجود سے سرزمین فرانس کو پاک کر دیگی مگر حبس دوام کی صورت میں چونکہ اس کے منصوبے عملی جامہ نہیں پہن سکتے تھے اس لئے دوبارہ اس نے موت کو ترجیح دی اور عدالت کی نگاہ میں از سر نو مرتد ہو گئی پھر کیا تھا۔ فوراً جلاد کو حکم دیا گیا۔ کہ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ جون کے سر پر ایک ٹوپی منڈھ دی گئی جس پر تحریر تھا۔ "ملحد۔ مرتد۔ کافرہ۔ ساحرہ۔ بت پرست۔ بازاری عورت"۔

لکڑیوں کے انبار پر ایک ستون کے ساتھ اسے کس دیا گیا۔ آگ لگائے جانے سے قبل جون نے صلیب کی فرمائش کی جس کی تعمیل ناظرین میں سے ایک شخص نے اس طرح کی کہ لکڑی کے دو ٹکڑے جوڑ کر اس کے ہاتھ میں دیدیئے انہیں اپنے سینے سے لگا کر وہ مرنے کیلئے تیار ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا انجام اس قدر دردناک تھا کہ خود جلاد کے حواس گم ہو گئے اور وہ دھوئیں کا رخ اس کی طرف کرنا بھول گیا۔ یہ تدبیر اس لئے کی جاتی تھی کہ دھوئیں سے گھٹ کر مرنے والے کا جلد کام تمام ہو جائے۔ نیز گھبراہٹ کے باعث اس سے پھانسی کا تختہ غیر معمولی طور پر کسی قدر اونچا رہ گیا جس کی بنا پر آگ کے شعلے پوری بلندی تک نہ پہنچ سکے اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ تیل چھڑکوا کر آگ کو زیادہ تیز کیا جائے۔

آگ سرد ہو جانے کے بعد دیکھا گیا کہ اس کا تمام جسم جل کر خاک ہو چکا تھا مگر بہادر دل محض جھلسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لوگ جب ان متبرکات کی اچھی طرح زیارت کر چکے تو ان کو دریائے سین میں بہا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی تعلق کی بنا پر شاید اسی سفر سے دنیا کے تمام دریا پیچ و تاب کھا کر ساحل سے ٹکرانے

رات دن

از حضرت نوح ناروی مدظلہ

نفرے نئے طرق کے ڈھلتے ہیں رات دن
وہ میرے حق میں زہر اُگلتے ہیں رات دن

بن ٹھن کے اپنے گھر سے نکلتے ہیں رات دن
شمس و قمر کی راہ وہ چلتے ہیں رات دن

اک شمع ہے کہ شام سے جلتی ہے صبح تک
اک ہم ہیں سوزِ عشق میں جلتے ہیں رات دن

میرے علاوہ سب چمنِ روزگار میں
ہو کر نہال پھولتے پھلتے ہیں رات دن

میں سرگذشتِ حضرتِ دل کیا بیاں کروں
پہلو میں بے سبب بھی مچلتے ہیں رات دن

عیش و خوشی میں وقت کی تخصیص کچھ نہیں
ارمان میرے دل سے نکلتے ہیں رات دن

کیا مجھ سے دوستی وہ نباہیں گے عمر بھر
وعدے بھی صبح و شام کے ٹلتے ہیں رات دن

دم بھر بھی ہم کو بسترِ غم پر نہیں قرار
کروٹ ادھر اُدھر کی بدلتے ہیں رات دن

کس وقت دیکھئے اُسے نزدیک و دور سے
خنجر کے ساتھ تیر بھی چلتے ہیں رات دن

کیونکر تری گلی میں ہمارا قدم جمے؟
چشمے یہاں ستم کے اُبلتے ہیں رات دن

رکھتے نہیں جو ہاتھ مرے دل کے آس پاس
کیونکر وہ حسرتوں کو مسلتے ہیں رات دن

ہر وقت سوتے جاگتے لاؤں کہاں سے دل
دن ہو کہ رات آپ مچلتے ہیں رات دن

سوزِ دل و جگر یہ بڑھا عشقِ یار میں
شعلے مرے دہن سے نکلتے ہیں رات دن

پھر بھی ہمیں اُمید نہیں ختم ہو سفر
چلنے کو راہِ شوق میں چلتے ہیں رات دن

ایسے میں امتیاز کرے کیا نگاہِ شوق
وہ سو طرح کے رُوپ بدلتے ہیں رات دن

وہ روز و شب کے ساتھ گیا میکشی کا لطف
اب بادہ خوار خون اُگلتے ہیں رات دن

پیدا ہوئیں یہ مشقِ تصور میں خوبیاں
آنکھوں کے سامنے وہ ٹہلتے ہیں رات دن

اے خوش خرام کیا ترے فتنوں کا پوچھنا
سانچے میں ظلم و جور کے ڈھلتے ہیں رات دن

کیونکر ہوں عیاں اشارے نگاہ کے
شرم و حیا کی گود میں پلتے ہیں رات دن

اے نوح بے سبب نہیں ہر دم خوشامدیں
طوفانِ اشک سے وہ دہلتے ہیں رات دن

انکشاف

شعر و شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا افسانہ

ازجناب "شق" مظفر پوری،

نکھرا ہوا حُسن اور اُبھری ہوئی جوانی کی رنگینیوں اور لطافتوں کی شعریت آفرینیوں کو بحیثیت شاعر یا افسانہ نگار ہی پورے طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ پھول کو جہان رنگ و بو کی سب سے زیادہ حسین اور نازک مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا صباحت آگیں رنگ، رنگین وجود، روح نواز خوشبو اور باصرہ نواز شگفتگی نگاہوں کو غیر ارادی طور پر اپنی طرف کھینچتی ہے اور نگاہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ بیشک پھول قدرت کی صنعت تخلیق کی لطیف ترین پیداوار ہے۔ مگر ایک شاعر فطرت کا نظریہ، جس کی نگاہیں باریکیوں اور گہرائیوں تک بہت جلد پہنچتی ہیں، اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کائنات و موجودات کا انفرادی طور پر محویت و تخیلات میں مستغرق ہو کر بنظر غائر مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں عورت ——— اُٹھتی ہوئی جوانی کے آغوش میں معصومیت کے سائے تلے نشو و نما پانے والی ایک دوشیزہ، صانع لطیف کا قابل فخر اور بے نظیر شاہکار ہے۔ اس کے ہڈی اور گوشت سے بنے ہوئے اعضا سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ لذت و حلاوت کی شراب میں غرق کر کے نکھارے گئے ہیں جو پھول کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہیں۔ اس کے اعضا کے لوچ میں وہ قوت اور معجزہ پنہاں ہے کہ دل خود بخود پہلو میں تڑپ اٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک زندہ پھول ہے جس کی خوشبو اتنی لطیف ہے کہ اس کو سونگھا بھی نہیں جا سکتا بلکہ محسوس کیا جا سکتا ہے اور بار بار نہیں بلکہ صرف ایک مرتبہ جس کے بعد مدہوشی اور از خود رفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ وہ متحرک پھول ہے جس کی رگوں میں نظام کائنات کو ایک پل میں درہم برہم کر دینے والی قوت خون بن کر دوڑ رہی ہے۔

فیروزہ بھی اسی نظریہ کی تصدیق کرنے والی ایک دوشیزہ تھی ——— حوا کی سحر طراز بیٹی۔ کسی شاعر شباب و رومان کے حسین ترین تصور سے بھی زیادہ حسین اور سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ "دختر پارسی" تھی اور تعلیم یافتہ۔ اس کے توبہ شکن شباب اور ملائک فریب حسن سے مسحور ہو کر نہ معلوم اس کے قدموں تلے کتنے دل آ چکے تھے اور نہ جانے کتنی شوق و جذبات سے معمور نگاہیں اس کی ریشمیں زلفوں میں اُلجھ کر اس میں جذب ہو چکی تھیں۔ شباب اس کے ہر عضو میں سانس لیتا تھا۔ جوانی اس کی نگاہوں میں چھلکتی تھی۔ اس کے چاہنے والے بیسیوں تھے مگر وہ صرف ایک فیروز کو پیار کرتی تھی اور اسی کو اپنا معبود و پرستار سمجھتی تھی دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے دل جوڑ چکے تھے۔ ایک دوسرے کی روح میں سما چکے تھے فیروز اور فیروزہ ——— یہ نام کی مشابہت کا اتفاق بھی کتنا خوشگوار اور رنگین تھا۔

فیروزہ ایک ایکٹرس کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں نے کافی دولت حاصل کر لی تھی۔ فیروزہ کو بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ اُسے پڑھایا لکھایا بھی تھا اس اُمید میں کہ کسی شریف لڑکے سے اُس کی زندگی کا رشتہ جوڑ سکے گی لیکن یہ اس کی اُمید موہوم تھی ——— کیوں؟ یہ ایک راز تھا جسے بہر صورت پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی مگر چھپ نہ سکا۔ فیروزہ اپنی ماں کی جوانی کی بدمستیوں کی پیداوار تھی مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ کون تھا۔

فیروز ایک کالج کے پروفیسر کا ہونہار لڑکا تھا۔ نہایت دلکش خط و خال کا مالک، بی۔ اے فائنل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ فیروزہ سے اُسے

پہلی نگاہ محبت تھی۔ اس نے فیروزہ کو اپنی شریکِ حیات بنانے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ گرچہ اس پر فیروزہ کا راز منکشف تھا تاہم اس کی محبت میں کوئی کمی نہ ہو سکی تھی۔ دونوں کی ملاقات اتفاقیہ طور پر ایک تماشہ کے دوران میں ہوئی تھی اس کے بعد ان کی محبت کا ڈرامہ شروع ہو گیا جس کے انجام کی ان کو کوئی خبر نہ تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے بےچین اور مضطرب رہنے لگے ——— شریر کیوپڈ اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔

گرمی کی دوپہر تھی۔ فیروز جھلملاتی ہوئی دھوپ میں چلتا ہوا فیروزہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس وقت فیروزہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی آرام کر رہی تھی۔ فیروز ڈرائنگ روم میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور گھنٹی بجائی ——
نوکر آیا۔ فیروز نے پوچھا۔

"مس بابا گھر میں ہے؟"

"جی حضور" نوکر یہ کہہ کر فیروزہ کو خبر دینے چلا گیا۔

فیروزہ اپنے ہوم ڈریس میں ملبوس ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئی اور فیروز کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"تم ہو فیروز؟ میں سمجھی کہ نہ معلوم یہ بے وقت کون آیا" یہ کہتی ہوئی وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور فیروز کا منہ تکنے لگی۔

"میں کسی خاص ضرورت سے نہیں بلکہ یونہیں چلا آیا ہوں طبیعت گھبرا رہی تھی تمہاری یاد نے مجبور کیا۔ سوچا چلوں ایک نظر دیکھ آؤں" فیروز نے کہا۔

"بڑی مہربانی کی۔ اُف! تم نے پنکھا کیوں نہیں چلا دیا۔ پسینے میں شرابور ہو رہے ہو" یہ کہکر اُس نے پنکھا چلا دیا اور پھر کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "میں اس وقت تمہاری کیا خاطر کر سکتی ہوں"

"تکلف کی ضرورت نہیں فیروزہ۔ تمہاری ماں کہاں ہیں؟" فیروز نے چہرے کا پسینہ رومال میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

فیروزہ مسکرانے لگی اور اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولی،
"بھلا اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟ ماں تو اسٹوڈیو گئی ہوئی ہیں شام کو واپس ہونگی۔ تھوڑی دیر ہوئی گئے ہوئے اچھا بولو۔ شربت یا چائے؟"

"نہیں نہیں، مجھے بالکل خواہش نہیں۔ معاف کرو"

"نہیں کا تو نام مت لو" یہ کہہ کر اُس نے ملازم کو گھنٹی بجا کر بلایا۔ اور مسکراتے ہوئے کہا "دیکھو صاحب کیلئے آئس کریم سوڈا، پان، سگرٹ جلدی لاؤ"

"آج بہت خوش نظر آتی ہو فیروزہ"

"کیوں نہ ہوں۔ تم جو آگئے ہو۔ اس سے بڑھکر میری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے! کاش ہم ہر وقت ایک دوسرے کے پیش نظر ہوتے"

"وہ دن بھی ہمارا انتظار ہی کر رہے ہیں"

"ڈارلنگ اماں بہت بُری ہیں۔ کہتی ہیں تم سے ملاقات کرنے میں بہت محتاط رہوں۔ بھلا ایسی بھی کوئی بات ہے۔ تم کوئی زہریلے سانپ تو نہیں جو مجھے ڈس لوگے" فیروزہ نے معصومیت سے کہا۔

"اولاد کی نگہبانی والدین کا فرض ہے اس لئے وہ ہمیشہ تاکید کرتے رہتے ہیں" فیروز کا سنجیدہ جواب تھا۔

"مگر مجھے تو بہت برا لگتا ہے۔ خیر جانے دو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ اس پڑھنے لکھنے کے جھنجھٹ کو کب ختم کروگے میرے خیال میں تو بی۔ اے پاس کر لینا ہی کافی ہے کیونکہ ایم۔ اے وغیرہ کی طرف بڑھنے سے پھر تمہیں بہت دیر لگے گی اور ڈرتی ہوں کہ اس طویل مدت میں کہیں ہماری محبت کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کر دی جائے" فیروزہ نے اپنی رائے پیش کی۔

"یہ تعلیم وغیرہ کا بکھیڑا تو ایم۔ اے پاس کر لینے کے بعد بھی باقی رہیگا مگر اس سے ہماری محبت میں کوئی فرق نہیں آئیگا ہم تو ایک جان دو قالب ہو چکے ہیں"

"فیروز" فیروزہ نے اس کے ہاتھ کو اپنی انگلیوں سے دباتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "یہ مدت بہت طویل ہوگی۔ کوئی نہ کوئی انوکھا گل ضرور کھل جائیگا مجھے ماں کی طرف سے بہت خطرہ ہے۔ تم جانتے ہو وہ ایکٹریس ہے۔ دولت و شہرت کی پجارن اور ڈائرکٹر و پروپرائٹر کو لبیک کہنے والی لونڈی"

"تو کیا تم کو ایکٹرس بنایا جائیگا۔ کیا تم کمپنی کے ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کی نگاہوں میں بھی بس چکی ہو؟" فیروز نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے تو کوئی خبر نہیں مگر کیا ٹھیک ہے کہ ایسا ہی ہو" اس اثناء میں نوکر سوڈا آئس کریم، پان اور سگریٹ لیکر حاضر ہوا۔ "لو اسے پی لو۔ پان کھاؤ۔ دھواں اڑاؤ"

"بڑی شوخ ہو فیروزہ۔ میں پورا گلاس نہ پیونگا۔ آدھا تم پی لو" فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو ہرگز نہ پیونگی۔ ابھی کھانا کھاکر لیٹنے جارہی تھی۔"

"کم از کم ہونٹوں سے چھو تو دو۔ مزا تیز ہو جائیگا۔"

فیروزہ نے اپنی شریر آنکھوں سے اپنے محبوب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر گلاس کو اٹھا کر اپنے قرمزی لبوں سے چھو دیا۔ "اب تو ہوا نا مخیر ہو۔"

"بڑی چلبلی اور دلچسپ لڑکی ہو میری جان خدا نظر بد سے بچائے۔"

فیروز نے اس کے رخساروں کو چھو دیا۔ اور سراپا اس کا جائزہ لینے لگا۔ "فیروزہ" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میرے دل میں مہینوں سے ایک جذباتی شوق پرورش پا رہا ہے جس کی خلش اور تڑپ کبھی کبھی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ کئی مرتبہ ہمت کی کہ تمھیں کہہ دوں مگر ہمت نہ پڑی اور ہر مرتبہ جب میں تمھیں دیکھتا ہوں تو وہ شوق میرے سینے کو گدگدانے لگتا ہے۔"

"کیا۔؟" فیروزہ نے پیار سے پوچھا۔

"بتا نہیں سکتا۔"

"مگر تمھیں بتانا ہی پڑیگا۔"

"اوں ہوں نہ۔"

فیروزہ نے کرسی بالکل اس کے قریب کھینچ لی اور کان کے پاس مُنہ لے جاکر آہستہ سے کہا۔ "کوئی راز کی بات۔"

فیروز نے ہونٹ پچکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اور کہا۔ "اس کا تعلق صرف ہم دونوں سے ہے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہو۔ سمجھیں میرا مطلب؟"

"میں کچھ لال بجھکڑ تھوڑی ہی ہوں جو پہیلیاں بوجھتی پھروں۔ جی چاہے تو بتا دو۔ نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے تمھارے جذباتی شوق سے۔"

"اچھا یہ بات، تو آپ مطمئن رہیں کہ اس طرح میں بتا بھی نہیں سکتا ممکن ہے یہی شوق آپ کے دل میں بھی بیدار ہوتا ہو۔"

"نہیں نہیں، فیروز بتاؤ کیا بات ہے۔"

"بتا دوں؟ —— بولو، علمی لحاظ سے یا عملی طور پر۔ کس طرح بتاؤں؟"

"پہلے علمی لحاظ سے اور پھر عملی طور پر، سمجھے پروفیسر صاحب!" فیروزہ یہ کہہ کر ایک دلربایانہ انداز سے مسکرانے لگی۔

جوانی! —— کافر جوانی! شاید تیرا ہی دوسرا نام معصیت لطیف و گناہ رنگین ہے، تیرے آغوش میں کھیلنے والی ہستیاں —— اٹھتی جوانیاں کتنی بیخبر اور عاقبت نا اندیش ہوتی ہیں۔ نہ معلوم تو کیا پلا دیتی ہے کہ وہ ہستیاں مذہب و اخلاق، احساس و خودداری اور عقل و ہوش کو ایک ٹھوکر سے پرے پھینک دیتی ہیں۔ فیروز اور فیروزہ کی اوائل گفتگو کا موضوع کتنا سنجیدہ اور اہم تھا لیکن ایک ذرا سا موقع پاکر تو نے ان کی رگوں میں بجلی کی لہریں دوڑا دیں اور وہ بہک گئے۔

"تو سنو۔!" فیروز نے کہنا شروع کیا۔

"ٹھہرو، ذرا کاغذ پنسل لے آؤں۔"

"شریر فیروزہ! تم جانتی ہو کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ اگر مغرب کی طرح ہندوستان میں بھی انتخاب حسن کا رواج ہوتا تو تم ہندوستان کی ملکہ حسن و شباب منتخب ہوتیں۔ حسن میں ایک کشش ہے جس سے احتراز غیر ممکن ہے اگر حسن پر نظر پڑتی ہے تو خود بخود نظر اس کی طرف کھنچنے لگتی ہے۔ قریب سے قریب تر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ چھو دینے کی کوشش کرتی ہے اسی طرح جب تم میرے سامنے ہوتی ہو تو تمھاری رعنائیاں اور دلفریبیاں مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ میرے جذبات شباب تڑپ اٹھتے ہیں اور دل مچلنے لگتا ہے کہ . . . . کہ . . . . کہ . . . . کچھ نہیں۔"

"واہ کچھ نہیں، کیا معنی؟ شاید کہ میرے چہرے کو لوہے کی گرم میخوں سے داغ دو کہ پھر تمھارے جذبات گدھے کی طرح نہ تڑپیں۔" یہ کہہ کر فیروزہ ہنس پڑی۔ "عجیب آدمی ہو جب کسی بات کو کہنا نہیں چاہتے تو پھر چھیڑتے کیوں ہو؟"

"اب عملی طور پر بتاؤنگا۔ یہاں آؤ۔"

یہ کہکر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فیروزہ بھی اس کے سامنے سراپا حسن و جوانی کھڑی ہو گئی۔ "میرا دل یہی چاہتا ہے کہ . . . . ." فیروز نے حوا کی شوخ و طرار بیٹی کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اور ایک جذبات میں ڈوبا ہوا بوسہ اس کے رنگین ہونٹوں پر ثبت کرنے کے بعد مست ہو کر کہا۔ "مد بھری انکھیاں رس بھرے ہونٹ۔" اور خاموش ہو گیا۔

فیروزہ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ "بس اتنی سی بات تھی جیسے افسانہ کر دیا۔ آخر اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ میرے ہونٹ چھل تو نہیں گئے۔" فیروز نے لپک کر دوسری مرتبہ اس کا مُنہ چوم لیا۔ اس پر فیروزہ نے مصنوعی خفگی بتا کر کہا۔ "بس اب رہنے بھی دو جی۔ مجھ سے نہ بڑھنا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ میں اپنی اس توہین کا دعویٰ دائر کر دونگی۔"

"مگر کس کی حالت میں؟" فیروز نے پوچھا۔

"کیوپڈ کی اور کس کی" دونوں بیساختہ ہنس پڑے۔

فیروز نے گھر پہنچکر ابھی کپڑے بھی نہ اتارے تھے کہ اس کے والد نے کہا

"بیٹا آج تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"وہ کیا ابا؟" فیروز نے پوچھا۔

"یہی کہ تمھاری شادی کے متعلق۔ میرا ارادہ ہے کہ بی۔اے پاس کر لینے کے بعد تمھاری شادی کر دوں پھر پڑھتے رہنا۔"

فیروز گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ والدین کی رائے ماموں کی لڑکی زبیدہ کو اس کے رشتہ حیات میں منسلک کرنے کی تھی۔ زبیدہ اُسے چاہتی تھی مگر وہ فیروزہ کو چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے کہا۔

"آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے ابا۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے کہ اولاد کی شادی کا بوجھ والدین کی گردن پر کس قدر ہوتا ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے بیٹا اس لئے اولاد کے اخلاق کے بگڑنے کے ذمہ دار ایک حد تک والدین بھی ہوتے ہیں۔ آخر شادی کر لینے میں تمھارا بگڑتا ہی کیا ہے ایک نہ ایک دن تو کرنی ہی ہوگی۔"

"دیکھا جائیگا۔ مگر ابھی میں اس کے لئے تیار نہیں۔"

"اطاعت والدین کا سبق تمھیں بھول نہ جانا چاہیئے۔"

اتنے میں اس کی ماں بھی وہاں پہنچ گئی اور پروفیسر صاحب کہتے رہے

"تمھاری ماں کی بھی یہی خواہش ہے۔" یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے اپنی بیوی کو تائید کرنے کیلئے آنکھ کا اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں بیٹا تمھاری شادی کا مجھے بڑا ارمان ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ارمان لیکر ہی چل بسوں۔" اس کی ماں نے اپنی تائید پیش کی۔

"یوں تو موت اور زندگی کا مسئلہ ایک لمحہ میں فیصل ہو سکتا ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آپ چند سال کے اندر ہی گذر جائینگی۔" فیروز نے جواب دیا۔

"فیروز" پروفیسر نے کہنا شروع کیا۔ "آج تک مجھے یاد نہیں کہ تم نے کبھی میری نافرمانی کی ہے مگر آج کیا میری رائے کی تردید کر کے مجھے رنجیدہ کرو گے؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ابا۔ میں نے کب کہا کہ آپ کی رائے کو رد کرونگا یا آپ کی باتیں نہیں مانتا۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں ــــ؟"

"اس لئے کہ میرا جی نہیں چاہتا۔"

"ہر بات کسی نہ کسی وجہ کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔"

"کوئی خاص وجہ نہیں۔"

"پھر۔"

"میری خوشی۔"

"مگر کس کی خوشی مقدم ہے۔ میری یا تمھاری؟"

"آپ کی اور ہم دونوں کی۔"

"تمھارا مطلب؟"

"یہ کہ شادی میری ہوگی۔"

"خاموش! تمھیں شادی کرنی ہی ہوگی۔"

"اس زبردستی کی مذہب اور اخلاق ہرگز نہیں اجازت دیتا۔"

"مگر نافرمانی کی اجازت دیتا ہے۔ اب تک تو میں تمھیں نیک اور شریف لڑکا سمجھتا تھا مگر آج مجھے تمھارے چال چلن کی طرف سے شبہ پیدا ہو گیا۔"

"ابا" فیروز یکبارگی بول اُٹھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں" فیروز کی ماں نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "ناحق لڑکے کا دل توڑتے ہیں۔ شادی کہیں اس طرح ہوتی ہے اس کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیجئے۔"

فیروز کے نازک دل کو بہت چوٹ پہنچی۔ آنسوؤں کے قطرات ٹپ ٹپ اُس کی آنکھوں سے گرنے لگے اس نے ایک بیکس اور معصوم بچے کی طرح اپنے باپ کو دیکھا۔ ناز و نعم سے پرورش کئے ہوئے حسین لڑکے کی آنکھوں کو آنسوؤں میں تیرتے دیکھکر باپ کا جی بھر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"معاف کرنا میرے لال۔ آج تک میں تم پر کبھی غصہ نہ ہوا تھا نہ معلوم غصے میں کیا کیا بک گیا ہوں۔"

فیروز "ابا" پکار کر اپنے باپ کے قدموں پر جھک گیا اور کہنے لگا "آپ میرے باپ ہیں۔ خدائے مجاز۔ اس طرح مجھے جہنم کی راہ میں نہ ڈالئے۔"

باپ نے انتہائے شفقت میں اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا اور یہ ڈرامہ یہیں ختم ہو گیا۔

والدین کا حکم اور فیروزہ اور اس کی محبت" یہی دو چیزیں تھیں جن میں سے فیروز کو کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ہر لمحہ بے سکون سا محسوس ہونے لگا۔ وہ ہر گھڑی اُداس اور افسردہ سا رہنے لگا۔ وہ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا تھا۔

ایک روز وہ تفکرات میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا کہ اس کے نام کا ایک لفافہ آیا جس پر انگریزی خط میں نہایت نمایاں طور پر "ذاتی اور نجی" لکھا ہوا تھا۔ فیروز نے خلاف معمول قسم کا خط دیکھ کر اس کو جلدی سے چاک کیا۔

"روح نواز فیروز!

آہ! یہ معلوم کر کے گویا مجھ پر بجلی گر پڑی کہ تم مجھ سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہو۔ تم نے بچپن کی دیرینہ محبت کو کتنی جلد بھلا دیا فیروز! کیا تمھیں مجھ پر ——— اپنی قوت و حیات پر ذرا ترس نہیں آتا۔ اس وقت میرے دماغ میں جذبات و خیالات کا ایک طوفان اُمنڈ اچلا آ رہا ہے اس لئے زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ بس یوں سمجھو کہ تم میرے ان پر درد ارمانوں کا نہایت بیدردی سے خون کر رہے ہو جنھیں میں اپنی محبت اور تمھاری یاد سے سینچتی رہی تھی۔ تم میرے ان جذبات کو پامال کر رہے ہو جو تمھاری ہی ترغیب و تحریک سے میرے سینے میں پیدا ہوئے تھے۔

فیروز! ——— میرے اور صرف میرے فیروز! دیکھو مجھے اس طرح مایوس و نامراد نہ کرو اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میری دنیا اجڑ جائیگی۔ میری روح مرجھا جائیگی۔ میں تمھاری بارگاہ محبت میں دامن پھیلا کر درد دامن اس کی بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے نہ ٹھکراؤ میری جان ——— میں عورت ہوں۔

وہ بھی کتنی خوش نصیب لڑکی ہوگی جس نے مجھے تمھارے دل سے نکال کر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ آہ۔

غم نصیب زبیدہ"

فیروز نے ایک لمبی سانس لیکر کہا۔ "یک نہ شد دو شد" اور خط کو لفافہ میں رکھ دیا۔ اس کی کشمکش روز بروز پریشان کن ہوتی گئی۔ فیروزہ سے وہ بدستور ملتا رہا لیکن اس پر معاملات کی پیچیدگی اور وقت کی نزاکت کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ فیروزہ اس کی روح پر چھائی جا رہی تھی۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ سکتا تھا مگر فیروزہ کو چھوڑ دینا اس کے لئے ناممکن سی بات ہو گئی تھی۔

"پیاری بہن!

تمھارا خط پڑھ کر مجھے بہت افسوس اور صدمہ ہوا۔ مگر حق تو یہ ہے کہ ہم دونوں کے درمیان محبت کا تو رشتہ ہی نہیں ہم تو بھائی بہن ہیں۔ اگر تم بچپن کی باتوں کو گرہ باندھے بیٹھی ہو تو یہ تمھاری بھول ہے۔ ایام طفلی کی باتیں بے بنیاد اور بلا وجہ ہوا کرتی ہیں تم تو کیا مجھے کسی لڑکی سے محبت نہیں یا تم جانتی ہو کہ میری عمر کا زیادہ سے زیادہ حصہ سکول اور کالج میں گھر کر تعلیم میں گذرا ہے مجھے ان باتوں کا تو موقع بھی نہ ملا ———،

اب رہا میری شادی کا معاملہ تو تم یہ کہہ سکتی ہو کہ جب کسی سے محبت نہیں تو کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے تمھیں سے کر لوں۔ لیکن فی الحال تو مجھے شادی ہی سے انکار ہے وقت آنے پر دیکھا جائیگا۔ اس سے تمھیں یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں تمھیں امید دلا رہا ہوں یا تمھارے خط سے میں متاثر ہوا ہوں بلکہ تمھارے خط کا جواب دینا میرے لئے ضروری تھا۔

امید کہ مرقومہ چند سطور سے تمھارا اطمینان ہو جائیگا۔

——— فیروز"

جس وقت زبیدہ کو فیروز کا یہ خط ملا اسے کوئی غم یا تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ فیروز اسی قسم کا جواب دیگا۔ خود اس کا خط بھی اس کے دل کی کیفیت کا آئینہ دار نہ تھا۔ مگر اپنے والدین اور فیروز کے والدین کی رائے سے اسے یہ خط لکھنا پڑا تھا کہ کسی طرح وہ شادی کرنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن وہ لوگ اپنی اس سنہری تدبیریں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس واقعہ کے بعد فیروز کے والد کو یقین ہو گیا کہ ضرور فیروز کسی لڑکی کے دام محبت میں گرفتار ہے جس کو پوشیدہ رکھنے کی وہ انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ فیروز کی غیبت میں پروفیسر نے چند مرتبہ اس کی کتابوں کا کھنگا

پلٹ کر دیکھا۔ ادھر اُدھر اس کے کمرے کی تلاشی لی . . . .
. . . مگر بالکل بیسود۔ فیروز کو خط لکھنے لکھانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

پُرجمال فیروزہ پائیں باغ میں محوِ گلگشت تھی۔ آفتاب غروب ہونے میں نصف گھنٹہ دیر تھی۔ وہ قدم قدم پر پھولوں کو چھیڑ چھیڑ کر گنگنا رہی تھی، چہرے کی صباحت وملاحت دیکھ کر اس پر حُور کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے جسم کے زیریں حصوں پر ریشمی ساڑی کی تھرکتی ہوئی شکنوں کے ساتھ دل کے جذبات لہراتے تھے۔ یکایک کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے بند کر دیا۔ پہلے تو وہ چونک پڑی مگر پھر سنبھل کر بھولے پن سے بولی۔

"جی ہاں رہنے دیجئے۔ میں سمجھ گئی۔ مگر بڑی دیر سے آئے ہو جی۔ وعدہ تو یہ تھا کہ ساڑھے چار بجے یہاں پہنچ کر میرے ساتھ چائے پیو گے اور چھ بجے پریس شو میں شریک ہو گے۔"

اس کی آنکھوں پر سے انگلیاں ہٹائی گئیں۔

"آخر کالج چھوڑ کر کیسے چلا آتا۔ امتحان بھی قریب ہے۔" فیروز نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا تو بتاؤ۔ کس کو چاہتے ہو۔ مجھے یا امتحان کو؟"

"امتحان کا مطلب شاید تم سمجھتی نہیں ہو۔ طالبعلمی ڈکشنری میں امتحان گارجین کا دوسرا نام ہے اور گارجین کے معنی گوریلا کے وجود سے بھی خطرناک۔"

دونوں کے مشترکہ قہقہوں سے فضا مترنم ہو گئی ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بے شمار نقرئی گھنٹیوں کو یکلخت چھیڑ دیا۔ فیروزہ نے اس کی گردن میں باہیں حمائل کر دیں اور کہا "ڈارلنگ تم بڑے اچھے لڑکے ہو ہر گھڑی مجھے ہنساتے اور بہلاتے رہتے ہو۔"

"تم کتنی خوبصورت اور حساس لڑکی ہو فیروزہ! تم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے محبت کی وہ دو آتشہ شراب پلا دی ہے جس کا خمار تا دمِ حیات میری روح پر چھایا رہے گا۔ کتنے مزے کی بات ہے میرا نام فیروز اور تمہارا فیروزہ! معلوم ہوتا ہے ہم ایک دوسرے کیلئے پیدا ہی ہوئے ہیں۔"

نگاہیں چار ہو گئیں۔ فیروز نے اس کو اپنی چھاتی سے لگا کر اس کے بالوں کو چوم لیا۔ فیروزہ کی رگوں میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں فیروزہ کے جمال رنگیں کی شعاعوں کو چھونا چاہتی تھیں۔ لیکن لچک کر پرے ہی لوٹی جا رہی تھیں۔

"میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی چاہے موت ہی کیوں نہ آ جائے۔" اس کی بیس انگلیاں فیروز کے کوٹ کے بٹن پر جم گئیں۔ "البتہ تم مجھے چھوڑ دو یہ ممکن ہے کیونکہ تم مسلمان ہو اور میں پارسی۔ تمہارے والد کالج کے ایک مشہور پروفیسر ہیں اور میرا کوئی باپ ہی نہیں۔ ماں ہے تو فلم ایکٹرس۔"

"روح نواز فیروزہ!" فیروز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ ایسی باتوں سے میری روح کو تکلیف ہوتی ہے ہم بلا امتیازِ شخصیت و مذہب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں —— بلکہ ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں۔"

"مگر والدین تو ہماری محبت کو پھولنے پھلنے نہیں دینگے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو فیروزہ! ہم جوان ہیں۔ بالغ ہیں۔ رکاوٹ ڈالنے میں ہمارے والدین کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ قانون میں ان سے زیادہ قوت موجود ہے۔" فیروز نے پُرجوش لہجہ میں کہا۔

"......" محبت کے دو قطرے آنسو۔

"تمہیں کیا معلوم فیروزہ کہ مجھے کن کن مشکلات سے گذرنا پڑ رہا ہے میں کیسے کیسے دشوار گذار مراحل طے کر رہا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ گھر میں ہر گھڑی موت اور زندگی کا سوال در پیش رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان باتوں کو سنا کر تمہیں صدمہ پہنچاؤں اس لئے استفسار کی ضرورت نہیں۔ بہرحال میں تمہارا ہوں۔ تمہارے ہی لئے ہوں اور تمہارا ہی ہو کر رہونگا۔"

"فی..... رو..... روز!" فیروزہ نے ایک لمبی سانس کے ساتھ کہا۔ اور اس کو اپنی نرم و گداز باہوں کے حصار میں لے لیا۔

"ذرا میری طرف دیکھو!"

فیروزہ کی مست و مخمور آنکھوں میں محبت و رومان کا بحرِ بیکراں لہریں مار رہا تھا۔

ساون کی سہانی رات تھی۔ آتش پرست دوشیزہ۔ فیروزہ اپنی ماں اور فلم کمپنی کے ڈائرکٹر کے ساتھ بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی۔ جس طرح ریگستان کے ذرات کی تابشیں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہیں اور پھیل کر یکایک سمٹ جاتی ہیں بالکل اسی طرح بجلی کی تیز روشنی کی چمک میں اس کا آویزۂ گوش

تھا۔ نور بھرا ہوا تھا اور اس کی ہر جنبش سے شعاعیں نکل کر فیروزہ کی جلوائیوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

"فیروزہ! ڈاکٹر صاحب کی خواہش ہے کہ آج تم انھیں اپنا بہترین گانا سناؤ" فیروزہ کی ماں نے استدعا کی۔

"بڑی خوشی سے" فیروزہ نے کہا۔ "پیانو پر گاؤں یا یونہی؟"

"پھر پیانو کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ مگر تم تو یوں بھی گا سکتی ہو۔ تمھاری آواز میں درد۔ لوچ اور رس ہے" ڈائرکٹر نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے شرمندہ نہ کیجیے" یہ کہہ کر فیروزہ پیانو پر بیٹھ گئی۔

فیروزہ تھی تو پارسی لیکن وضع قطع اور طرز معاشرت کے لحاظ سے بالکل ہندوستانی تھی۔ کوئی بظاہر اطوار سے اس کا امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گایا۔ نہایت درد بھری آواز میں "سکھی ری پریت کا دکھ تڑپائے"

گانا ختم ہونے کے ساتھ ہی ڈائرکٹر نے کہا "واہ واہ خوب گاتی ہو، سنہری جھیل کی روپہلی شہزادی کی طرح۔ اب تو تم بالکل اس کام کے لائق ہو گئی ہو اُف! فیروزہ پہلی ہی فلم میں تم چمک جاؤگی۔ میٹرک بھی شاید تم نے پاس کر لیا ہے"

فیروزہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی ماں نے ڈائرکٹر صاحب سے کہا۔

"یہ تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ پیتل کو سونا اور سونے کو پیتل بنا دینا تو ڈائرکٹروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"

"اوہ! تم اطمینان رکھو۔ فیروزہ خود ہی ایک ایسا دُرِ نایاب ہے جس کو چمکنے سے روکنا گویا اُس کی چمک کو بڑھانا ہے۔ کل سے ٹریننگ کیلئے فیروزہ کو ساتھ لایا کرنا" ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

"بہت خوب" فیروزہ کی ماں بولی۔ فیروزہ اپنے مستقبل کے اس اچانک فیصلہ سے چونک پڑی اور پکار اُٹھی۔

"مگر ماں ——"

"کیوں گھبرا کیوں گئیں؟" ماں نے پوچھا۔

"میں ایکٹرس نہیں بنونگی"

"ارے یہ کیا بول رہی ہے۔ آخر کیا کریگی؟"

"کچھ بھی کروں مگر ایکٹرس نہ بنوں گی"

"کیوں —— ؟"

"یونہی، میری طبیعت"

"پھر اور کیا لاٹ صاحبنی بنےگی"

"میں کوئی دفتری نوکری ڈھونڈ لونگی"

ماں اور ڈائرکٹر نے قہقہہ لگا دیا۔ اور ماں ہنستی ہوئی بولی "پہلے تو ملے گی نہیں۔ اگر ملی تو پچیس تیس روپے کی۔ اور وہ بھی فرنگنوں کی طرح ٹائپ اور کیا کہتے ہیں کس کو —— شارٹ ہینڈ جاننے پر۔ مگر اس سے تو تیرے کھانے پینے کے دام بھی نہ نکل سکے —— پگلی کہیں کی! آخر فلم میں کیا ہے۔ سیکڑوں اس کے بعد ہزاروں روپے مہینے سے کمائیگی اور ٹھاٹ سے زندگی بسر کریگی۔ شہرت اور عزت الگ ٹھہری"

"ماں ——!"

"کچھ نہیں، بالکل ٹھیک ہے۔ ہاں ڈائرکٹر صاحب فیروزہ کل سے اسٹڈیو آئیگی"

"مجھے اس فیصلہ پر غور کرکے اپنا فیصلہ کرنے کا موقع دو" فیروزہ نے عاجزی سے کہا۔

"بیوقوف نہ بنو" ماں بولی "اور پھر ڈائرکٹر سے "کافی وقت ہو چکا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں مگر دیکھیے فیروزہ کو اپنی ہی اولاد سمجھئے گا۔ اس کی ترقی کا ہمیشہ خیال رہے"

وہ رات فیروزہ کے لئے بہت خوفناک رات تھی۔ اُسے نیند نہ آئی اس کا مستقبل اس کی نگاہوں میں رقص کر رہا تھا۔ ایکٹرس بننے کا دوسرا مطلب فیروزہ کو چھوڑ دینا تھا اور یہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ سیکڑوں خیالات یکے بعد دیگرے اس کے دماغ میں آئے اور گئے۔ اس نے ہمت باندھی کہ اپنے اور فیروزہ کے متعلق تمام باتیں اپنی ماں کو سنا دے۔ چنانچہ آدھی رات کو وہ اُٹھ کر دبے پاؤں اپنی ماں کے کمرے میں گئی۔ وہ سو رہی تھی —— بےخبری کی نیند۔ فیروزہ ہچکچائی۔ وہ اپنی ماں سے بہت ڈرتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک نیک ہندوستانی دوشیزہ اپنے غصہ ور بڑے بھائی سے ڈرتی ہے۔ ایک سال قبل تک تو اس کی ماں اس کو سزا دیتی رہی تھی۔ وہ فیروزہ کی نگہداشت میں بہت سخت گیر واقع ہوئی تھی۔ اگر اس کے تیور ذرا بھی بدل جاتے تھے تو فیروزہ کانپنے لگتی تھی۔ یہ سوچ کر فیروزہ ٹھٹک کر رہ گئی مگر ہمت کرکے

اور ماں کے سرہانے جاکر بیٹھ گئی۔ چند لمحہ کے پس و پیش کے بعد اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے ماں کا ہاتھ دبایا وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور حیرت زدہ ہوکر بولی۔

"کون؟ — فیروزہ! کیا ہے؟"

"ماں! میں ایکٹریس نہیں بنونگی۔ دیکھو مجھ پر ظلم کرو۔ میرے دل کو مجبور کرو" فیروزہ نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔

"کیوں ری! پاگل تو نہیں ہوگئی ہے" ماں نے بھنویں چڑھا کر کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں ماں! میں شادی کرکے عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں"

"مگر تجھے اس آدھی رات کو کیا سوجھی۔ خیر اگر آئی ہے تو سُن۔ کوئی شریف آدمی تجھ سے شادی نہیں کرسکتا اور کیوں؟ — یہ تو جانتی ہے، البتہ کچھ دنوں کے بعد عزت کی زندگی گذارنے کیلئے فی الحال تجھے ایکٹریس بنا پڑے گا اگر اس سے انکار کریگی تو یاد رکھ کہ میں وہی تیری ماں ہوں"

"فیروز کو تم جانتی ہو ماں۔ وہ تو سوسائٹی کا لڑکا ہے مگر وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ مجھ سے شادی بھی کرلیگا" فیروزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی ماں چونک اٹھی۔

"کون! — فیروز؟ پروفیسر حمید الدین کا لڑکا۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم سے شادی بھی کرلیگا" وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "مگر ایسا نہیں ہوسکتا"

"کیوں؟ —" فیروزہ نے پوچھا۔

"اس کے والدین ایسا نہیں ہونے دینگے" ماں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر وہ میری خاطر ان سب کو چھوڑ سکتا ہے"

"یہ سب فریب ہے۔ مردوں کا فریب، جوانی کا فریب، درامیڑوں کا فریب۔ اگر اس نے ایسا ہی کیا تو تمہاری زندگی خراب کرکے تمہیں چھوڑ کر کنارہ کش ہو جائیگا۔ اس کا چال چلن بھی تو اچھا نہیں عورت پرست ہے اور شرابی"

"ماں تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ فیروز کے متعلق تمہارے ایسے گندے خیالات ہیں۔ چھی چھی"

"فیروزہ زیادہ بحث نہ کرو اگر تم بھی نت چاہتی ہو تو بھول جاؤ اسی میں مصلحت ہے"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے ماں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں — بیحد محبت!"

سب ہو جائیگا۔ جاؤ — جاؤ — سنتی نہیں۔ میں کہتی ہوں جاکر سو جاؤ تم مجھ سے زیادہ عقلمند نہیں ہوسکتیں"

فیروزہ دل برداشتہ ہوکر بھاری بھاری قدم اٹھاتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں چلی آئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دی۔

صبح سویرے ہی فیروزہ ٹیلیفون پر فیروز سے باتیں کررہی تھی اور اس کی ماں چھپ کر پردے کے باہر کھڑی تھی۔

"...... ہاں! ماں کہتی ہیں نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور مجھے ایکٹریس بنائینگی وہ کہتی ہیں تم اچھے لڑکے نہیں ہو"

"کیا ہے فیروزہ؟..." فیروزہ کانپ گئی۔

"کچھ نہیں ماں" یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھدیا۔

"فیروزہ!" ماں بارعب آواز میں بولی۔ "میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ آج سے تم ٹیلیفون کے پاس پھٹکنا بھی نہیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ اور ہاں تم بغیر اجازت تنہا باہر کا آنا جانا بند کردو کیونکہ اب تمہیں فلم ایکٹریس بنا ہے۔ منظر عام پر تمہاری جلوہ فروشیاں تمہارے مستقبل کی تباہی کا باعث ہونگی۔ یہ میرا اٹل حکم ہے آج تمہیں اسٹڈیو چلنا پڑیگا۔ تیار رہو" یہ کہکر وہ فیروزہ کی زبان سے کچھ سنے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

فیروزہ نے ناشتہ اور چائے صرف ماں کے خوف سے نوش کیا ورنہ طبیعت بالکل نہ چاہتی تھی۔ ماں نے اسٹڈیو چلنے کو کہا تو سر کے درد کا بہانہ کرکے پڑرہی۔ اس کی ماں نے نوکروں کو بھی چند خاص اور ضروری تاکیدیں کردیں شام کے وقت جب فیروز، فیروزہ سے ملاقات کرنے کیلئے اس کے مکان پر گیا تو نوکروں سے ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کیا "صاحب! آپ اندر نہیں جاسکتے مس بابا کی طبیعت خراب ہے اور وہ نہیں مل سکتیں"

فیروز کچھ اتنا بیوقوف تو تھا نہیں۔ سب کچھ سمجھ گیا اور اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ وہ بہت متفکر ہوگیا۔ "فیروزہ اسے نہیں مل سکتی"۔ اسے یہ خیال بے چین کئے ہوئے تھا کہ "فیروزہ اُسے نہیں مل سکتی" فیروزہ کا حصول اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس کے لئے ساری دنیا ایک طرف اور فیروزہ دوسری طرف۔ مگر فیروزہ کو اس سے زبردستی چھین لینے کی سازش کی جارہی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ — یہ فی الحال سب سے زیادہ اہم سوال تھا۔ محبت کے تمام جذبات پورے طور پر اس کے دل میں اُبھر آئے اور اس نے اپنے باپ کو یہ خط لکھا۔

قبلہ!

آج میں اپنے دل کی بات زبان پر لا رہا ہوں آپ لوگوں کے لئے یہ بات معمہ بنی ہوئی تھی کہ میں شادی کرنے پر کیوں رضامند نہیں۔ اس کی وجہ آج میں صاف صاف الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ لوگ فیصلہ کرسکیں۔

میں فیروزہ نامی ایک پارسی لڑکی سے محبت کرتا ہوں جو ایک فلم ایکٹریس کی لڑکی ہے میں اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لوگوں نے میری راہ میں رکاوٹ پیدا کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ لوگ مجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے وہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔ عفت مآب ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ ہم دونوں کی شادی کردیں تاکہ ہمیں کسی خطرناک انجام کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے۔

فیروز "

پروفیسر صاحب اس خط کو پڑھکر بہت ملول ہوئے اور فیروز کو بلا کر کہا۔
"یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اگر تم اسے گھر دلہن بنا کر لانا چاہتے ہو تو پہلے مجھے مرجانے دو۔ میرے بیٹے! دوسری جس لڑکی سے کہو میں ایڑی چوٹی کا زور لگاکر تمہاری شادی کردونگا مگر فیروزہ سے غیر ممکن ہے"
"ایسا کیوں ابا ــــ؟"
"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا"
"لیکن فیروزہ سے اگر میری شادی نہ ہوئی تو میں شادی کرونگا ہی نہیں۔ اور میں فیروزہ کو چھوڑ بھی نہیں سکتا" یہ فیروز کا فیصلہ کن جواب تھا۔

فیروزہ نے فلمی دنیا میں شریک ہونے سے قطعی انکار کردیا تھا۔ صبح ناشتہ کے بعد ڈائرکٹر صاحب فیروزہ کے مکان پر پہنچے۔ ڈائرکٹر ایک خوبصورت، خوش اخلاق اور دولتمند انسان تھا۔ وہ فیروزہ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے حصول کیلئے اس کی ماں کو سبز باغ دکھا کر آلہ کار بنا رہا تھا۔
"فیروزہ! میں کہتی ہوں کہ اگر تو اپنی ضد سے باز نہ آئیگی تو مجھے زبردستی اور ظلم پر اتر آنا پڑیگا۔ یاد رکھ اگر میں ماں ہوں تو ساتھ ایکٹریس بھی ہوں ــ رحم اور درد سے نا آشنا ایکٹریس۔ تم مکان سے باہر بھی نہ جاسکو گی جو قانونی چارہ جوئی کرو" یہ فیروزہ کی ماں کا کھلا ہوا اعلان مقاتلہ تھا۔
"اس طرح مجھے ڈراتی کیا ہو جو جی میں آئے کرو" فیروزہ نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔
"جانتی ہے فیروزہ ــــ بھول گئی میں وہ عورت ہوں کہ تیری کھال ادھیڑنے سے بھی دریغ نہ کرونگی"
"چپ بھی رہو جی" ڈائرکٹر نے فیروزہ کی ماں کو مخاطب کیا۔ "اس میں ڈانٹنے کی کیا بات ہے جس فیروزہ کا دل اگر نہیں چاہتا تو میں بھی رائے نہیں دیتا"
"ذرا دیکھئے نا۔ اس کا دماغ آسمان پر چڑھا جارہا ہے۔ سمجھتی ہے کہ ہم چنیں دیگرے نیست۔ وہ مزا چکھاؤں کہ لونڈی عمر بھر یاد کرے" فیروزہ کی ماں نے آنکھیں نکال کر کہا۔
"ناحق اس قدر برہم ہو رہی ہو" ڈائرکٹر بولا۔ "ذرا غریب کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع بھی تو دو" فیروزہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی ماں نے ڈائرکٹر سے کہا "بڑی ضدی اور ہٹیلی چھوکری ہے اب کھانے کے لئے خوشامدیں کرنی ہونگی"
"نرمی اور سنجیدگی سے کام لو سب کچھ ٹھیک ہوجائیگا۔ مگر خیال رہے کہ فیروز اس سے ملنے اور گفتگو کرنے نہ پائے اس کو فیروزہ سے نفرت دلانے کے لئے کوئی تیر بہدف تدبیر عمل میں لانی ہوگی اور جو بات میں نے کل پیش کی تھی۔ اگر ہو جائے تو لستانہ ہرگز خطا نہ ہوگا" ڈائرکٹر نے معنی خیز انداز سے کہا۔
"مگر جب وہ ایکٹریس بننے پر راضی نہیں ہوتی تو اس بات پر کب راضی ہوگی"
"بہرحال اسے راضی کرلو ورنہ اگر فیروز کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل گیا تو بڑا خراب ہوگا"

چند دنوں کے بعد ــــ
"فیروزہ، آج شام کو تیار رہنا" ماں نے حکم دیا۔
"کس لئے؟" فیروزہ نے دبی ہوئی زبان سے پوچھا۔
"ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے لئے جس کے متعلق تمام باتیں تم کو کل ہی بتاچکی ہوں" ماں نے جواب دیا۔
"مگر ماں ــ!" فیروزہ گھبرائی ہوئی آواز میں بول اٹھی۔ "مجھ سے یہ نہ ہوسکے گا۔ مجھ پر ظلم نہ کرو"

"بھلا اس میں ظلم کی کیا ٹھہری۔ میں بیوقوف نہیں ہوں، جو کچھ کر رہی ہوں تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہی پڑیگا" ماں تحکمانہ انداز میں بولی۔

"تم میری ماں ہو۔ کیا اس وقت تمہیں شرم و حجاب نہ آئیگا جب میں ڈاکٹر کی گود میں ہونگی وہ میرا بوسہ لے رہا ہوگا اور تم ہم دونوں کے فوٹو لے رہی ہوگی" فیروزہ نے خشمگیں لہجے میں پوچھا۔

"لیکن یہ بیسویں صدی ہے۔ ڈاکٹر تمہارا ہونے والا —— بہت جلد ہونے والا شوہر ہے۔ اس سے کیا عار ہو سکتا ہے۔ تم ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر تو دیکھو۔ اگر فیروز بُرے سے بُرا کام کرنے کو کہے تو تیار ہو جاؤ۔ اُف —— تم نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بڑی شوخ اور گستاخ ہوتی جا رہی ہو۔ میں تیری زبان سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی میں جو کہونگی تجھے وہی کرنا ہوگا۔"

"اب بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر تم چاہو تو میری جان لے لو یا مجھے اپنے گھر سے نکالدو۔ بھیک مانگ کر کھاؤنگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میری ماں نہیں ہو۔ ماں بھی کہیں اتنی بیدرد اور ظالم ہوتی ہے" فیروزہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"خاموش!" ماں کی اس گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر جم گیا۔ فیروزہ بلبلا اٹھی اور اپنی انگلیوں سے گال کو سہلانے لگی۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے بے اختیار اس کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے —— محبت مادری کا دریا جوش میں آگیا۔ اور ماں کا دل فیروزہ کے اشکوں کی حدت سے موم کی طرح پگھل گیا۔

"بیٹی! —— میری لاڈلی! دیکھو اس قدر دل چھوٹا نہ کر۔ بیشک میں تیرے ساتھ ظلم و ناانصافی کر رہی ہوں مگر تجھے کیا معلوم کہ اس ظلم و ناانصافی کی تہ میں کتنا بڑا راز ہے۔ مگر وہ راز شاید مرتے دم تک تجھے نہ بتا سکونگی" اس کی آواز دھیمی ہوگئی "اس راز کو جاننے والی صرف تین ہستیاں ہیں ایک خدا دوسری میں اور تیسری ایک اور کوئی۔ بہرحال تم دونوں کا رشتہ حیات ہرگز منسلک نہ ہونے دونگی۔ بلکہ ملنے کا موقع بھی نہ دونگی"

"کچھ بھی ہو۔ میں فیروز کو نہیں چھوڑ سکتی" فیروزہ نے فاتحانہ انداز سے کہنا شروع کیا "تمہارے اس ظلم کی تہ میں کوئی خوفناک راز واز نہیں ہے بلکہ یہ سراسر تمہاری ضد اور مردود ڈاکٹر کی عیارانہ تحریک ہے اور بس اگر مجھے جلد از جلد فیروز سے ملنے نہ دیا گیا تو میں کسی نہ کسی طرح خودکشی کر لونگی"

"بیٹی! —— یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ مگر فیروز سے شادی یا محبت کرنے سے بہتر خودکشی ہے۔ کیا میں تمہیں مرنے دونگی؟ —— فیروزہ دنیا میں میرا کون ہے؟ میں تو صرف تمہارے لئے جی رہی ہوں۔ تم میری زندگی ہو —! جس ہستی کو میں نے اپنے خون اور محبت سے سینچکر پروان چڑھایا ہے اس کو اتنی بیدردی سے ضایع ہونے دونگی"

فیروزہ کی ماں یکایک خاموش ہوگئی اسے فیروزہ کا جملہ رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میری ماں نہیں ہو ماں بھی کہیں اتنی بیدرد اور ظالم ہوتی ہے" اس کے بعد اپنے گذشتہ گناہوں کی تصویریں اس کی نگاہوں میں رقص کرنے لگیں۔ وہ اپنے ناپاک گناہوں کا اقرار اپنی بیٹی کے سامنے کیسے کر سکتی تھی۔ اس کے دماغ میں جذبات و خیالات کا ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ اور وہ بے اختیار پکار اٹھی —— "فیروزہ!" اور ساتھ ہی اس کے قدموں پر گر پڑی۔ "میں گنہگار ہوں مجھے معاف کر دے" فیروزہ حیرت زدہ ہوگئی کہ یہ سب کچھ خواب ہے یا حقیقت۔ "گو پھر بھی میں تیری ماں ہوں تجھ سے التجا کرتی ہوں۔ درخواست کرتی ہوں۔ بھیک مانگتی ہوں —— رحم اور مہربانی کی۔ فیروز کو بھول جا۔ اپنے دل سے اس کو نکالدے نہیں تو......"

فیروزہ گویا اب تک سوئی تھی اور اب یکایک چونک پڑی اس احساس نے اسے تڑپا دیا کہ ماں —— محبت و شفقت کا مجسمہ —— بیٹی کے قدموں میں پڑی رحم اور مہربانی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ فیروز اور اس کی محبت کا خیال محو ہوگیا۔ وہ اپنی ماں کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر جھک پڑی اور بولی ماں —— میری ماں مجھے اس طرح گنہگار نہ بناؤ۔ مجھے معاف کر دو مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ میں فیروز کو بھول جاؤنگی اس کا نام بھی نہ لونگی۔ فیروز میرا کوئی نہیں تم میری ماں ہو۔ میں تم کو چاہتی ہوں۔ مجھے فیروز نہیں چاہیے"

عین اسی وقت نوکر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ فیروزہ کی ماں اٹھی اپنی اور بیٹی کی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔

فیروزہ اپنے ہاتھ میں ایک فلمی رسالہ لئے خیالات میں منہمک بیٹھی تھی وہ غور کر رہی تھی کہ آخر وہ کون سا راز ہے جس کے لئے ہمیں اس قدر نشیب و فراز سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ ماں اس راز کا انکشاف کیوں کرنا نہیں چاہتی

فیروز کا کیا حال ہوگا ـــ اُف میں نے تو ماں سے وعدہ کیا ہے کہ اس کو بھول جاؤنگی پھر میں اس کو کیوں یاد کر رہی ہوں۔ مجھے ہر گھڑی پہلے کی طرح ہشاش بشاش رہنا چاہئے۔ ورنہ ماں کو صدمہ پہنچیگا اور فکر لاحق ہو جائیگی۔ میں نے اُن کا دل بہت دُکھایا ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہو فیروزہ ؟" ماں کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا اور وہ چونک پڑی۔

"کچھ نہیں ماں" وہ ماں کی طرف دیکھ کر ایک ہلکے تبسم کے ساتھ بولی۔

"اگر کچھ کہنا ہو تو دل میں نہ رکھنا بیٹی صاف صاف بتا دیا کرو۔ ہر گھڑی نہ معلوم کس سوچ میں رہتی ہو"

"کہنے کی صرف دو باتیں ہیں ماں" فیروزہ سنجیدہ ہو گئی۔

"کیا ـــ ؟"

"اگر تمہیں رنج نہ پہنچے تو کہوں"

"بے فکر رہو۔ میں خوش ہونگی"

"پہلی بات یہ ہے کہ میں ظلم کمپنی کی نوکری نہ کرونگی"

"اور دوسری بات ؟"

"یہ کہ میں ڈائرکٹر سے شادی نہ کرونگی اور کسی دوسرے کے ساتھ جب میرے جی میں آئیگا کرونگی۔ مجھے مجبور نہ کرو"

"مجھے منظور ہے مگر مجھے بھی ایک بات کہنی ہے بیٹی"

"تو کہہ دو نا ؟" فیروزہ خوش ہو کر بولی۔

"کہنا یہ ہے ۔ ۔ ۔ میرا مطلب یہ کہ ۔ ۔ ۔" وہ کسی قدر ہچکچائی۔

"رُکتی کیوں ہو۔ بیٹھکر کہہ ڈالو" فیروزہ نے ہمت بندھائی۔

"تم فیروز کو ـــ ہاں فیروز کو چند الفاظ میں یہ لکھ دو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتی ہو۔ نفرت کرتی ہو"

"ما ۔ ۔ ۔ آں" فیروزہ کی زبان سے بیساختہ نکل پڑا۔ "مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں اس کو بھول چکی ہوں"

"نہیں نہیں اس کی سخت ضرورت ہے۔ وہ بہت پریشان ہوگا مجھے اس سے بیحد ہمدردی ہے مگر معلوم نہیں کیوں ـــ ؟"

فیروزہ دنگ رہ گئی ـــ عجیب بات ۔ اس تضاد کا کیا مطلب ہو سکتا تھا ؟ "لیکن ماں ! ـــ اس طرح تو وہ اور بھی پریشان ہو جائیگا"

"مگر وقتی طور پر" ماں نے بیٹھی ہوئی آواز سے کہا۔ "رفتہ رفتہ وہ تمہیں بھلا دینے میں کامیاب ہو جائیگا۔ تمہیں حاصل کرنے کی کوششوں سے باز آجائیگا۔ اور اس کی زندگی خراب ہونے سے بچ جائیگی"

"ٹھیک ہے ماں" فیروزہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پھر خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے ممکن ہے اس طرح اس کو یقین نہ آئے۔ اگر اجازت دو تو ٹیلیفون سے کہہ دوں کیونکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس سے بہتر ہوگا کہ بالمشافہ کہہ دیا جائے" طنز آمیز انداز سے یہ کہتا ہوا فیروز بالکل غیر متوقع طور پر کمرے میں داخل ہوا۔ فیروزہ اور اس کی ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ فیروز اس کی ماں کی طرف مخاطب ہوا۔ "ہمدردی کا فریب دینے والی عیار عورت۔ آخر ایکٹرس ٹھہری نا ؟ کہیں فیروزہ کے بیٹی ہونے کے بجائے میں جو تیرا بیٹا ہوتا تو خدائے پاک کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ تیری جیسی عیار اور بے رحم ماں کا گلا گھونٹ دیتا"

فیروزہ کی ماں کے دل میں تلاطم برپا ہو گیا۔ اس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی اور وہ رو پڑی۔ فیروز کو چند لمحہ تک حسرت آگین نگاہوں سے دیکھ کر دوڑ کر اس کی چھاتی سے چمٹ گئی۔ اور والہانہ انداز سے بولی۔ "بیٹا" مگر فیروز نے نفرت سے اس کو اپنی چھاتی سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "دور ہٹ ناپاک عورت ! میں اپنی ماں کے پاک بطن سے پیدا ہونے والے اپنے پاک وجود کو تیرے آلودہ جسم سے چھوانا نہیں چاہتا"

ایک تلخ احساس کے ساتھ فیروزہ کی ماں چکرا کر کرسی پر گر پڑی اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فیروزہ کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف ماں ـــ دوسری طرف محبت ! کچھ غصہ، کچھ رنج، کچھ گھبراہٹ، کچھ الجھن مگر اس نے خود کو قابو میں رکھ کر رعب اور غصے سے گرج کر کہا۔

"فیروز ! ـــ بدتمیز کہیں کے ! تم میری ماں کی سخت توہین کر رہے ہو۔ اس کی ہمدردی سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو۔ تم بھول رہے ہو کہ یہ ہمارا گھر ہے تمہارا نہیں۔ تم کس کی اجازت سے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ تم کون ہوتے ہو میرے گھر میں گھس کر میری ماں کی توہین کرنے والے بے شرم بے حیا نکل جاؤ میرے گھر سے ورنہ میں پولیس کو فون کرتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس طرح اس کا دل نہ دکھاؤ فیروزہ !" ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ میرے دل کو چوٹ سی لگ رہی ہے" پھر فیروز کی طرف

مخاطب ہو کر: "معاف کرنا فیروز! میں تمہارے لئے دشمن ثابت ہوئی۔ مگر مصلحت اسی میں تھی۔"

فیروز سرد اور خاموش ہو گیا۔ فیروزہ دھیمے مگر تحکمانہ انداز سے بولی۔

"تم فوراً ایک شریف آدمی کی طرح میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

"فیروزہ!" فیروز کے ہونٹ حیرت سے وا ہو گئے۔

"ہاں ہاں! میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ تم ظاہر میں شریف اور باطن میں رذیل ہو۔ میری محبت ایک سنہری فریب تھی ایک خوشنما کھیل تھی۔"

فیروز کا سر جھک گیا اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس واقعہ نے فیروز کے لمحات زندگی کو تلخ اور بالکل غیر دلچسپ بنا دیا مگر رفتہ رفتہ اس کا اثر جاتا رہا۔ تین سال گذر گئے۔ فیروزہ اور اس کی محبت اب اس کے لئے ایک خیال بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ایم۔ اے پاس کر چکا تھا۔

کلکتہ میں ہیضہ کا مرض بہت زوروں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس بلائے ناگہانی نے اس کی ماں کو شکار کر لیا تھا اور اب اس کے باپ پر نشانہ درست کر رہی تھی۔ فیروز بالکل بدحواس ہو رہا تھا۔ اس کا سارا خاندان صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ والدین اور ایک وہ خود۔ وہ والدین کا پہلا اور اکلوتا چراغ تھا۔ اس کے بعد اس کے کوئی بھائی یا بہن پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اس کی دنیا اُجڑ رہی تھی۔ ماں تو مر ہی چکی تھی اور اب باپ بھی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

"فیروز ـــ! میرے لال! میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ تمہیں خدا کے بھروسے تنہا چھوڑے جا رہا ہوں۔ اپنے نیک و بد کے نگراں تم خود ہو گے میری عزت کا خیال رکھنا فیروزہ سے ہرگز شادی نہ کرنا اور نہ اس سے محبت کے تعلقات رکھنا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس کو ہمیشہ اپنی سگی بہن سمجھنا۔ یہ میری آخری اور ضروری وصیت ہے۔ بھول نہ جانا۔ یہ میری خواہش ہے میں تمہیں اور کچھ کہتا مگر موت میرے بالکل قریب آچکی ہے۔ مجھے اطمینان سے مرنے دو۔ رحم یا ارحم الراحمین۔"

اس کے چند ہی لمحہ بعد پروفیسر نے داعی اجل کو لبیک کہدیا۔ اور فیروز اس طویل و عریض دنیا میں تنہا رہ گیا۔

چند دنوں کے بعد فیروزہ کی ماں کی باری تھی۔

"بیٹی فیروزہ! ذرا فیروز کو بلواؤ۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اس کو جلدی بلاؤ۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے وہ بہت ناراض ہے آئیگا تو نہیں مگر ضرور بلواؤ ذرا جلدی کرو۔" فیروزہ کی ماں نے نحیف آواز میں کہا۔

فیروزہ نے فوراً ٹیلیفون اُٹھایا۔ "فیروز! وقت بہت نازک اور مختصر ہے۔ غصے کو تھوک دو ماں کا آخری وقت ہے۔ وہ تمہیں بلا رہی ہیں۔ وہ کچھ ـــ بہت کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ جلد ـــ بہت جلد ـــ دیر مت کرو۔ خدا کیلئے۔"

"میں نہیں آسکتا۔" یہ کہہ کر فیروز نے فون رکھدیا۔ مگر یکایک اسے فیروزہ کی ماں کا پھوٹ پھوٹ کر رونا یاد آگیا۔ اور یہ الفاظ اس کے دل کو چھونے لگے۔ "بیٹا! اس طرح اس کا دل نہ دکھاؤ فیروزہ! میرے دل کو چوٹ سی لگ رہی ہے۔"

"ضرور کوئی راز ہے۔" خود بخود اس کی زبان سے نکلا۔ "وہ بہت رحمدل عورت ہے۔ میں ضرور جاؤنگا۔" چند منٹوں کے بعد فیروز اس کے پاس تھا۔

مریضہ نے ڈاکٹر، نرس اور نوکروں کو کمرے سے باہر جانے کو کہا اور فیروز، فیروزہ کو اپنے پاس بٹھا کر کمزور اور اکھڑی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"آج میں اس راز کا انکشاف کرنے جا رہی ہوں جس نے ہم لوگوں کی زندگی میں ایک ہنگامہ مچا دیا تھا اور نتیجہ کے طور پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ میں اس راز کو افشا کرنا نہ چاہتی تھی لیکن دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں دنیا میں تن تنہا بچ رہے ہو اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ تم دونوں کو ـــ صرف تم دونوں کو حالات سے آگاہ کر دوں۔ میری موت کے بعد بھی میری یہ وصیت ہے کہ یہ راز ہمیشہ ہمیشہ کیلئے صرف تم دونوں کے سینوں میں مدفون ہونگے۔

بائیس سال قبل میں اس دنیا میں تنہا تھی۔ میرا کوئی نہیں تھا۔ اتفاق وقت نے تم دونوں کی طرح مجھے بھی تنہا و اکیلا کر دیا تھا۔ میں جوان تھی۔ فلم ہندوستان میں نئی نئی آئی تھی۔ اداکاروں کی بڑی قلت تھی۔ ذریعہ معاش کے لئے میں نے فلم کی نوکری کر لی۔ کیونکہ میرے ساتھ تم دونوں کی طرح دولت نہ چھوڑی گئی تھی۔

تین ہی سال کی قلیل مدت میں میں نے تھوڑی سی دولت جمع کر لی۔ اور دو سال کے لئے شملہ چلی گئی۔ میرے مقابل والے مکان میں ایک خوبصورت وجیہہ اور شادی شدہ نوجوان مقیم تھا۔ میں جوان تھی اور مجرد ـــ نوجوان

اپنی عیاریوں سے مجھے متوجہ کر لینے میں کامیاب ہو گیا   اس کے بعد گناہ کی رنگینیاں ـــــ نوجوان کی بیوی ایک دائم المریض عورت تھی اور اس کے اولاد بھی نہ ہوتی تھی۔ نوجوان اور میں ایمان کی روشنی کو گناہ کی تاریکیوں میں گم کرتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر شجر گناہ نے ایک پھل دیا جس کو اس نوجوان نے اپنی بیوی کی رضامندی سے اپنے پاس لے لیا۔ ہمارے ناجائز تعلقات سے اس کی بیوی بے خبر تھی۔

اس کے بعد ہم دونوں نے گناہ کے طوفان کو نہیں روکا اور جب دو سال کے بعد میں اس نوجوان اور اس کی بیوی کے ساتھ کلکتہ واپس آئی تو چند ہی مہینوں کے بعد فیروزہ پیدا ہوئی ـــــ آہ میں ندامت اور احساس سے گڑی جا رہی ہوں۔ وہ نوجوان پروفیسر حمید الدین تھے اور وہ بچہ تم ـــــ!

صرف ایک بار مجھے ماں کہو میرے لال تاکہ جو آرزو اب تک میرے دل میں پرورش پا رہی تھی وہ پوری ہو جائے" اس کے بعد ـــــ ایک ہچکی تھی۔ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کا تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا۔

فیروز اور فیروزہ نے ایک دوسرے کو کہا۔ فیروز بے اختیار ہو کر اپنی ماں سے "ماں" کہتا ہوا لپٹ گیا اور اس کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر پکارنے لگا۔ مگر "ایک لمحہ کیلئے اس کی ماں" اب ایک بیجان جسم تھی۔

"بھیا!" فیروزہ نے فیروز کو مخاطب کیا۔

"بہن!" فیروز کا جواب تھا۔

جو محبت محبوب اور محبوبہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ بھائی اور بہن کی محبت میں منتقل ہو چکی تھی۔

مشاہدات

از جناب مرزا ظفر حسین صاحب ظفرؔ ناگپوری

آتشِ غم سے جسم کو شعلہ نار دیکھ کر
کانپ رہی ہے جانِ زار حالتِ زار دیکھ کر

ابر کو ہے حجاب سا تیرے حجابِ ناز سے
ماہِ تمام شرمسار تیرا نکھار دیکھ کر

مٹ گئیں اس کی مستیاں رنگِ سرور اب کہاں
بادۂ ناب سُست ہے میرا خمار دیکھ کر

حیرتِ چشم میں کیا جلوۂ یار نے قیام
چھوڑ دیا مکانِ دل گرد و غبار دیکھ کر

ایک میں ہے سوادِ زلف ایک میں ہے بیاضِ رخ
کرتے ہیں یاد ہم تجھے لیل و نہار دیکھ کر

جذبۂ عشق مرحبا کچھ تو مجھے دکھا دیا
ان کو بھی پیار آ گیا آج تو پیار دیکھ کر

نقشِ وجود ہی نہیں قابلِ اعتماد جب
خاک جہاں میں دل لگے نقش و نگار دیکھ کر

صرصرِ راہِ غم کا زور میں بھی تو آج دیکھ لوں
مجھ کو مٹانے آئی ہے مشتِ غبار دیکھ کر

منزلِ عشق میں ہمیں آج ظفر ہوئی نصیب
رو دیئے وہ بھی اے ظفرؔ سینہ فگار دیکھ کر

سوگوارِ محبت ہے!

از جناب امید رضوی بریلوی

”وفاؤ مہر کی پُتلی مری کافر ادا“ مجسمہ
حیاؤ شرم کی دیوی مری جانِ حیا مجسمہ

سُنا ہے رات دن تو شکوۂ تقدیر کرتی ہے
ہر اک کو واقفِ ناکامیٔ تدبیر کرتی ہے

گِنا کرتی ہے تو میرے تصوّر میں ستاروں کو
سُنا یا کرتی ہے تو قصۂ غم ماہ پاروں کو

ترے تخئیل میں میرا تصوّر کارفرما ہے
حریمِ دل میں تیرے میری اُلفت جلوہ آرا ہے

تو میری یاد میں آٹھوں پہر چھپ چھپ کے روتی ہے
مری فرقت میں تو بیتاب ہو کر جان کھوتی ہے

سُہانی چاندنی راتیں تجھے دائم رُلاتی ہیں،
تجھے بیتے ہوئے لمحوں کی باتیں یاد آتی ہیں

زمانہ جب اندھیری رات میں خاموش سوتا ہے
تری معصوم نظروں میں تصوّر میرا ہوتا ہے

یہ دُنیا جب سکوں بردوش ہو جاتی ہے راتوں کو
مری فُرقت مسلسل تجھکو تڑپاتی ہے راتوں کو

صبا جب چپکے چپکے کان میں کچھ گُل کے کہتی ہے
کلیجے میں ترے اک ہُوک سی رہ رہ کے اُٹھتی ہے

کہا کرتی ہے جب پھُولوں سے بلبل اپنا افسانہ
تجھے میری محبت کردیا کرتی ہے دیوانہ

تجھے بیتاب کر دیتی ہیں جب میری تمنائیں
کہا کرتی ہے رو رو کر کہ ”اس جینے سے مر جائیں“

عنانِ صبر چھُٹ جاتی ہے جب فرقت سے تنگ آ کر
مرے طرزِ تغافل کا گِلہ ہوتا ہے پھر لب پر

تجھے ہوتا ہے شکوہ مجھسے میری سرد مہری کا
”وفا دشمن“ مجھے کہہ کر دیا کرتی ہے تو طعنہ

تجھے یہ بھی شکایت ہے میں تجھ سے مل نہیں سکتا
تری معصوم امیدِ دل کا غنچہ کھل نہیں سکتا

میں تجھکو بھول بیٹھا ہوں تجھے مجھ سے شکایت ہے

لبوں پر تیرے میری بیوفائی کی حکایت ہے

مگر اے عفتِ مریم کہاں تک یہ غلط فہمی ‖ غلط جانا جو کچھ جانا، غلط سمجھی جو کچھ سمجھی

مرے مغموم دل میں بھی محبت شعلہ افگن ہے ‖ تری اُلفت کی آتش اور یشہ وادیِ ایمن ہے

تری فرقت میں میں تیری طرح بیتاب رہتا ہوں ‖ جُدائی میں تری میں شعلہ و سیماب رہتا ہوں

مرے دل میں بھی ہیں کچھ آرزوئیں تجھ سے ملنے کی ‖ تمنا کی یہ کلیاں ہیں جنھیں ہے آس کھلنے کی

ترا انجمِ محبت میرے دل میں بھی فروزاں ہے ‖ تری تابش سے میرا اخترِ قسمت درخشاں ہے

مگر مجبور ہوں خاموش رہنے ضبط کرنے پر ‖ مقدر کے ستم سہنے پر اور گھٹ گھٹ کے مرنے پر

تجھے کیا علم ہے میں کس لئے خاموش رہتا ہوں ‖ مصائب کس لئے میں خندہ پیشانی سے سہتا ہوں

تری رُسوائیوں کا پاس ہے جانِ حیا مجھکو ‖ فقط اس بات کا احساس ہے جانِ حیا مجھکو

مجھے معلوم ہے یہ بھی کہ مجبورِ وفا تو ہے ‖ میں یہ بھی جانتا ہوں ہاں کہ پابندِ حیا تو ہے

سمجھتا ہوں میں تیرا حال بیتابی سمجھتا ہوں ‖ گذرتی ہے جو کچھ تجھ پر میں اس سے بھی شناسا ہوں

میں تجھکو بھول جاؤں یہ تو ممکن ہو نہیں سکتا ‖ خدا ناکردہ وہ دن کیوں ہو وہ دن ہو نہیں سکتا

مرا ایمان ہے تیری محبت اے مری دیوی ‖ ترا ارمان ہے میری مسرت اے مری دیوی

نہ ہو اے شاہدِ معصوم یوں میرے لئے مضطر

ابھی شاداب ہیں تیری جوانی کے حسیں منظر

یہ لمحاتِ جوانی یہ ادائے سوگ ارے توبہ ‖ گلستانِ جوانی اور فضائے سوگ ارے توبہ

خدا کے واسطے اب غم نہ کر اس غم کو جانے دے ‖ خدارا اس مسلسل کاوشِ پیہم کو جانے دے

مسرت سے ترے ناشاد دل کو شاد کر دونگا

تری معصوم رنگین خلوتیں آباد کر دوں گا

علامہ عبد القادر بغدادی

عربی کا ایک بلند مرتبت فاضل

از جناب طالوتؔ

اُردو ادب کے موجودہ دور کے متعلق یہ کہنا بیجا نہیں کہ یہ "دور تراجم" ہے اور چونکہ دور حاضر کے اساتذۂ ادب سوائے چند مستثنیات کے علوم مغربیہ کے فاضل ہیں اس لئے ان کی خوشہ چینی کی منتہا بھی مصنفین مغرب کی تالیفات و تصنیفات ہیں اور "تراجم رجال" کے سلسلے میں مصنفین مغرب کے نام اور ان کی سوانح حیات سے تو آئے دن ہمارے ادب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر مشرقی زبانوں کے پُرانے مصنفین عموماً اور عربی کے فاضل اسلاف خصوصیت کے ساتھ ابھی تک مجہول الحال ہیں اور اردو داں طبقہ ان حضرات کے متعلق بالکل ناواقف ہے۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کام کی ذمہ داری اپنے سر لے سکوں مگر اس کام کی ابتدا کرتے ہوئے اردو ادب کے اساتذہ و فاضل رجال سے متوقع ہوں کہ وہ اس فرض کو ادا کرنے میں وسعت قلب کا ثبوت دیں۔ اگر میری یہ ناچیز کوشش اردو کے فضلاء کی توجہات گرامی کو اس کام کی طرف مبذول کرا سکی تو میں سمجھونگا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔

(طالوت)

۱

ابن حاجب کا رسالہ کافیہ" علم نحو کے ابتدائی رسائل میں سے ہے اور اسے عرب و عجم میں وہ قبول عام حاصل ہے جس کی حریف دوسری بہت کم تصنیفات ہیں۔ ہر جگہ علوم عربیہ کے طالب علم اوائل حصول علم میں اسے پڑھتے ہیں۔ بلکہ اکثر فقہاء یقین تو اسے زبانی حفظ کرتے ہیں اس کی شرحیں اس کثرت سے لکھی گئی ہیں جن کا احصاء نا ممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔ اور شروح کی شروح کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ یہ دعویٰ یقیناً مبنی علی الحق ہے اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کی اور کوئی انسانی تصنیف اس معاملہ میں "کافیہ" کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ یعنی جس قدر شروح و حواشی کافیہ کے ہیں اُس قدر اور کسی انسانی تصنیف کے تا حال نہیں لکھے گئے۔ ان شروح میں سب سے زیادہ گرانقدر شرح نجم الائمہ محمد بن الحسن الرضی کی ہے اور اس شرح کو قبولیت عامہ کی وہی سند حاصل ہے جو اصل متن کو حاصل تھی۔

علامہ رضی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ گرامر کے قواعد کے لئے کلام عرب میں سے شواہد ڈھونڈ کر پیش فرماتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کی کتاب بہت سے ادبی اشعار کا مجموعہ بن گئی ہے۔ رضی کی شرح میں دیئے ہوئے شواہد کی مشہور شرح کا نام "خزانۃ الادب" ہے جو عربی ادب کی مشہور ترین کتاب ہے اور بظاہر اگرچہ وہ شواہد رضی کی شرح ہے۔ مگر واقعۃً وہ عربی ادب کے ہر قسم کے ظرائف اور لطائف و ظرائف کا نچوڑ ہے آج کی صحبت میں ہم اسی اہم کتاب خزانۃ الادب کے مصنف سے روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

۲

آپ کا اسم گرامی عبد القادر آپ کے والد کا نام عمر اور آپ کا

مولد بغداد تھا۔ سنہ ۱۰۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بغداد ہی میں حاصل کی اور اوائل عمر ہی میں فضیلت حسن وادب سے مالامال تھے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بغداد دولت صفویہ اور دولت عثمانیہ کے حروب کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف شاہ عباس صفوی کی قسوت چنگیزی اہل بغداد کی رقاب میں ربقہائے غلامی ڈال کر ان کے تشبت فی الدین وعزائم ایمانیہ کا امتحان لے رہی تھی اور دوسری طرف ان جنود عثمانی کی پامالی وخونخواری تھی جن سے عوام تو عوام خود وزرائے دولت تک خائف وخاشی تھے۔ ۱۰۴۸ھ میں جب سلطان مراد چہارم کے عساکر جنود ایران پر غتیاب ومظفر ہو کر بغداد پر مستولی ہوگئے تو عبدالقادر نے وطن چھوڑنے اور سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین پر عمل کرنے کے لئے بارگاہ خداوندی میں استخارہ کیا۔ شام جانے کا ارادہ پاکر بغداد سے عازم شام ہوا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور باوجود صغر سنی کے وہ عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے پورے پورے ماہر تھے۔

دمشق پہنچکر وہ نقیب الاشراف سید محمد ابن سید کمال الدین الحسینی کے پاس اترے جو آل حمزہ کے امرا اور شام کے فضلا میں سے تھے۔ نقیب صاحب نے ان پر اپنی توجہات گرامی کو وسعت کرم اور انصرام مواسات کے ساتھ مبذول فرمایا اور اپنے گھر کے سامنے محلہ نقاق النقیب میں انھیں ایک مکان میں آتارا۔ عبدالقادر نے وہاں نقیب صاحب سے استفادہ کیا اور اس کے بعد شیوخ شام میں سے فاضل ترین شیخ محمد بن یحییٰ الفرضی کے حلقہ کا قصد فرمایا۔ اور علوم عربیہ میں پوری پوری مہارت و وسعت حاصل فرمائی ——،

~~~~~~ ۳ ~~~~~~

دو ڈھائی سال شام میں گذارنے کے بعد ۱۰۵۰ھ میں وہ قاہرہ (مصر) کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچکر وہ شیخ شہاب الدین خفاجی اور علمائے ازہر سے ملے جن میں سے شیخ لیسین الحمصی، شیخ ابوالشبر املسی شیخ سری الدین دروری اور شیخ ابراہیم المامونی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں اور ان میں سے بھی اول الذکر دو اصحاب سے انھوں نے بہت زیادہ استفادہ فرمایا اور علامہ خفاجی سے تفسیر، حدیث اور آداب کی تعلیم حاصل کی عربی کے شعرائے متقدمین کے دیوان انھیں ازبر تھے اور عربی ادب کی سب سے زیادہ دقیق کتاب مقامات حریری بھی انھیں بر زبان تھی، علامہ خفاجی باوجود جلالت قدر اور عظمت شان اکثر مسائل مشکلہ میں اپنے شاگرد عبدالقادر کی طرف رجوع فرماتے۔ اور غریب اللغات کے نقل میں اس پر اعتماد فرماتے تھے۔ بغدادی اشیاء ونظائر کے استحضار اور نقد صحیح میں اپنے کل اقران سے فوقیت رکھتے تھے۔ اگرچہ عبدالقادر اپنے علم کو اپنے استاد کے علم کے مقابلہ میں قطرہ اور دریا کی نسبت دیتے تھے اور ہمیشہ فرمایا کرتے تھے جمیع ما حفظتہ قطرۃ من غدیر الشہاب مگر ماہرین فن کا قول ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں اپنے استاد سے بھی زیادہ قابل اور استحضار شواہد اور نقل لغات میں ان سے زیادہ ماہر تھے اور ان کے علم وفن کی شہادت میں اس سے زیادہ کیا پیش کیا جائے کہ استاد خود اپنے آپ کو شاگرد کا محتاج پاتا تھا۔ جب علامہ شہاب الدین خفاجی فوت ہوئے تو ان کے کتب خانے کے مالک یہی ہمارے علامہ بغدادی ہوئے جس میں دواوین شعرائے عرب کے نادر نسخے اور ائمہ عربیہ کے قدیم تعلیقات کا بیش بہا خزانہ موجود تھا جن سے بغدادی نے استفادہ کرکے طبیعت کو اور بھی جلا بخش دیا۔

~~~~~~ ۴ ~~~~~~

۱۸ ذیقعد ۱۰۷۷ھ کو جبکہ وہ "خزانۃ الادب" کی تصنیف میں مشغول تھے نامعلوم وجوہ کی بنا پر انھوں نے قسطنطنیہ کا سفر اختیار کیا اور پانچ ماہ وہاں رہنے کے بعد ربیع الاول ۱۰۷۸ھ میں وہ دوبارہ مصر میں تشریف لے آئے۔

اسی سنہ میں جب ابراہیم پاشا کتخدا والی مصر ہوا تو بغدادی کو انھوں نے اپنا ندیم وجلیس مقرر فرمایا اور ۱۰۸۵ھ تک بغدادی کتخدا پر اپنے علم وفضل کی وجہ سے چھائے رہے۔ جب اسی سن میں ابراہیم پاشا ... ہوا اور مصر کی ولایت حسین پاشا کے حصہ میں آئی تو بغدادی حسین پاشا کے ساتھ روم کو چلے گئے اور وہاں پہنچکر ان کی فضیلت کا تعارف احمد پاشا وزیر اعظم کے ساتھ ہوگیا جو علم وفضل کے قدردان ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اعلیٰ درجہ کے عالم وفاضل تھے۔ بغدادی کو ان کی بارگاہ میں پورا پورا تقرب حاصل ہوگیا اور انھوں نے قصیدہ بانت سعاد کی شرح وزیر ہی کے نام پر لکھی۔ انھیں دنوں میں جبکہ علامہ عبدالقادر ادرنہ میں مقیم تھے

سلطان محمد ابن سلطان ابراہیم تک بھی ان کی رسائی ہو گئی تھی اور خزانۃ الادب کو انھیں کے اسم گرامی کے ساتھ منسوب کر دیا۔

تقریباً سات آٹھ سال علامہ نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ قسطنطنیہ میں گذارے اس کے بعد اتفاقاً بیمار ہو گئے اور ایسے بیمار ہوئے کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں کے معالجات سے مایوس ہو گئے۔ وہاں سے انھوں نے پھر مصر کا ارادہ کیا اور مصر پہنچ کر تھوڑے ہی دن بعد ۱۰۹۳ھ میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور آسمان ادب کا یہ مہر عالمتاب ترسٹھ سال کی ضیا پاشی کے بعد مغرب مرگ کی آغوش میں غروب ہو گیا۔

۵

علامہ عبد القادر کی مشہور ترین تصنیفات حسب ذیل ہیں جو آج اہل ادب اور شائقین علوم عربیہ کے لئے گہر بے بہا کا درجہ رکھتی ہیں۔

۱۔ خزانۃ الادب :- آٹھ مجلدات میں ختم ہوئی ہے شعبان ۱۰۷۳ھ میں انھوں نے اسے تالیف فرمانا شروع کیا اور جمادی الآخر ۱۰۷۹ھ میں ختم کی۔ مصر کے کتبخانے میں مولف کے نسخہ سے منقول ایک نسخہ موجود تھا۔ جس کے ساتھ مقابلہ کر کے مطبع سلفیہ مصر کے مالک محب الدین خطیب نے ۱۳۴۷ھ میں اسے شایع کر دیا۔

۲۔ شرح الشواہد الشعریہ :- ابن حاجب کی ایک دوسری کتاب شافیہ کی شرح جو علامہ رضی نے لکھی اس کے شواہد کی شرح ہے۔ اس کا ایک نسخہ مصر کے کتبخانے میں محفوظ ہے۔ خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کی ایک آدھ جزو یورپ میں موجود ہے جس کے ایک صفحہ کا فوٹو انھوں نے دیوان ابن مُجمِن اور دیوان زہیر کے ساتھ شایع کیا ہے۔

۳۔ حاشیہ علی شرح بانت سعاد لابن ہشام :- یہ بغدادی کی ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتبخانہ تیموریہ میں ہے ایک رامپور کے کتب خانے میں جو ۱۰۸۱ھ کا لکھا ہوا ہے اور تیسرا قسطنطنیہ ایاصوفیہ لائبریری میں۔

۴۔ شرح شواہد المغنی لابن ہشام :- اس کا ایک نسخہ مصر کے کتبخانے میں ہے اور دوسرا ایاصوفیہ لائبریری قسطنطنیہ میں اس کی تاریخ اتمام ۱۰۹۱ھ ہے۔ مولف کی وفات سے دو سال قبل۔

۵۔ شرح شواہد شرح التحفۃ الوردیہ فی النحو لابن الوردی :- اس کا ایک نسخہ کتبخانہ تیموریہ میں ہے اور ایک کتبخانہ مصر میں۔

۶۔ شرح المقصورۃ الدریدیۃ :- یہ علامہ بغدادی کے عالم شباب کا لکھا ہوا ایک رسالہ ہے اور طبع بھی ہو چکا ہے۔

۷۔ لغت شاہنامہ :- یہ شاہنامے کے مشکل الفاظ کی ترکی میں شرح ہے ۱۰۶۷ھ میں تالیف کی گئی ۱۸۹۵ء میں یہ طبع ہو چکی ہے۔

۸۔ شرح التحفۃ الشاہدیہ باللغۃ العربیہ :- تحفہ شاہدیہ فارسی کی ایک منظوم کتاب ہے اور اس کی شرح ترکی میں ہے کتبخانہ تیموریہ میں اس کے دو نسخے ہیں۔

۹۔ رسالۃ فی معنی التلمیذ والکلام علی الفظہ :- کتبخانہ تیموریہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

(ماخوذ از عربی)

قطعات

جو تھی کبھی سرِ کیفِ محبت وہ ہے نہیں
بے کیف سازِ زندگی منصور ہے نہیں
بے کیف ساز ہی وابستگی کی
ہو کس طرح سے نغمۂ مسرور ہے نہیں

بنگاہِ عشق کی سی نغمۂ ہو تبسم
اشعار کی سی نصیب ہو تبسم
مرے جیب میں ہے چیر دل کی دھڑکن
ہے تشکیل جس میں وہ جیتی جاگتی تصویر ہو تبسم

اختر مکوانی بی۔ اے

ترانۂ رنگِ شفق

افصح الفصحا حضرت علامہ شفق رضوی عماد پوری مدظلہٗ

دل پر کچھ ایسی چوٹ پڑی آنکھوں سے لہو رونا ہی پڑا،
چہرے کا جو بدلا شفق منہ آنسوؤں سے دھونا ہی پڑا

ہم ایسے جاگنے والے تھے تا حشر نہ آتی نیند مگر
وہ آکے سُلا گئے قبر میں جب مجبور ہوئے سونا ہی پڑا

جب تک نہ مٹائی دل سے خودی وہ مل نہ سکا ہم پا نہ سکے
جب پا گئے اُس کو نامِ خدا اپنے کو ہمیں کھونا ہی پڑا

ہم ایسے رونے والوں کو بھولا نہیں تو بھی قیامت تک
ہر سال آ آکر قبروں پر اے ابر تجھے رونا ہی پڑا

پروانوں کے غسلِ میت کا سامان نہ تھا کچھ اس کے سوا
اک اک لاش پہ چار پہر اے شمع تجھے رونا ہی پڑا

مدہوشی میں بھی غفلت سی، غفلت میں ہمیں مدہوشی سے
مدہوش جنوں بننا ہی پڑا ہشیارِ خرد ہونا ہی پڑا

کیا جانے فرشتوں نے کیا کیا برسوں لکھ لکھ کے سیاہ کیا
اعمال کے سارے دفتر کو اشکوں سے ہمیں دھونا ہی پڑا

مرتے ہی لحد میں یاروں نے پھینکا مرے خاکی قالب کو
اے روح مگر اک مدت تک یہ بوجھ تجھے ڈھونا ہی پڑا

غم بھی ہے خوشی کے ساتھ شفق اک رنگ پہ کب ہے باغِ جہاں
پھولوں کی طرح ہنس ہنس کے ہمیں شبنم کی طرح رونا ہی پڑا

افسانہ

نقشِ حسرت

از جناب پروفیسر عشرت رحمانی صاحب

شکار کی تلاش میں پھرتے پھراتے شام ہو گئی۔ ایک بلند و وسیع عمارت میں میرے خادم نے بمشکل داخل ہونے کا راستہ تلاش کیا اور ہم بڑی دشواری سے اندر پہنچے۔ کیونکہ میں بہت خستہ و ماندہ ہو رہا تھا اور وہ کسی طرح مجھے باہر کھلی ہوا میں رکھنا نہ چاہتا تھا اس لئے میں کسی طرح اندر جانے کی فکر میں تھا۔

اس عمارت کے آثار سے وہی شان و شوکت مگر اداسی نظر آ رہی تھی جو ان علاقوں میں اسی قسم کے دیگر مقامات پہ پائی جاتی ہے۔ یہ عمارتیں جنگلوں اور ویرانوں میں مسافروں کی قیامگاہیں ہوتی ہیں لیکن ظاہری قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تعمیر حال ہی میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد جلد ہی ہم اس کے ایک گوشے کے کمرے میں مقیم ہو گئے۔ یہ کمرہ سب سے آخری برج میں تھا۔ اس کی زیبائش بالکل قدیم طرز کی نہایت بیش بہا اور شاندار تھی۔ دیواروں پر منقش و مشجر کپڑا منڈھا ہوا تھا اور ساتھ ہی قسم قسم کے فوجی نشانات اور اسلحہ نصب تھے۔ ان کے قریب ہی جدید فنِ مصوری کے بے شمار اعلیٰ و نفیس نمونے بیش قیمت عربی وضع کے سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے آویزاں تھے۔

ان میں سے کچھ تصویریں سامنے کی طرف لٹکی ہوئی تھیں اور کچھ خاص ترتیب کے ساتھ ادھر ادھر گوشوں میں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں سے غنودگی کی حالت میں مجھے گہری دلچسپی ہونے لگی۔ میں نے خادم کو کمرے کے بھاری کواڑ بند کرنے کی تاکید کی تاکہ رات کی تاریکی میں شمعدان کی روشنی کمرے میں صاف طور پر پھیل سکے۔ اور جھالردار سیاہ مخملی پردے جو مسہری کو چاروں طرف سے ملفوف کئے ہوئے تھے بالکل اٹھوا دیئے تاکہ اگر نیند کا غلبہ نہ ہو تو صاف روشنی میں اطمینان سے دیوار کی تصویروں کا جائزہ لے سکوں اور اس مختصر کتاب کا مطالعہ کر سکوں جو مجھے تکیہ پر پڑی ملی تھی۔ جس میں ان تصویروں کے متعلق تنقیدی تفصیلات درج تھیں۔

میں اسے بہت دیر تک نہایت غور و توجہ سے پڑھتا رہا اور تصویروں کو گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ وقت نہایت تیزی سے گذرتا جا رہا تھا کہ آدھی رات نے گہری سانس لی اور شمعدان نے میرے لطف کو منغص کرنا شروع کیا۔ میرا ہاتھ اس کو درست کرنے کیلئے طاق میں نہ پہنچ سکتا تھا خادم کو خوابِ خرگوش سے جگانا بھی کارے دارد تھا۔ خیر میں نے اٹھ کر شمعدان کو اس انداز سے رکھا کہ اس کی روشنی اچھی طرح کتاب پر پڑے مگر مجھے اس میں امید سے زیادہ کامیابی ہوئی اور بیشمار بتیوں کی روشنی (کیونکہ شمعدان میں بتیاں متعدد تھیں) کچھ اس طرح کمرے میں پھیلنے لگی کہ ہر طاق اور گوشے کی معمولی سے معمولی چیز بھی صاف نظر آنے لگی۔

اس روشنی میں میری نظر ایک تصویر پر پڑی جو اب تک چھپی ہوئی تھی۔ یہ ایک نوجوان حسینہ کی تصویر تھی۔ جس نے ابھی ابھی شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا۔ میں نے اس تصویر پر نگاہ ڈالی اور فوراً آنکھیں بند کر لیں ——، میں اپنی اس اضطراری حرکت کا سبب اس وقت خود بھی نہ سمجھ سکا لیکن جب آنکھیں بند ہوئیں تو دماغ نے اس کے وجوہ پر غور کیا لیکن وہ ایک بیخبری کے لمحے تھے جن میں خیالات کو مجتمع کرنا ممکن نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میری نگاہیں غلطی کر رہی ہیں یا یہ حقیقت تھی کیونکہ میرے سامنے زندہ چہرہ تھا۔ زیادہ غور و فکر سے تصویر کو دیکھنا اور سمجھنا دشوار ہو رہا تھا۔ چند لمحوں تک یہی حالت رہی اور پھر میں نے

اس تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر اس تصویر کو گھورنا شروع کیا۔ اب جو کچھ میں نے دیکھا اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کیونکہ روشنی کرنچ پر اس طرح صاف پڑ رہی تھی کہ میری نگاہوں سے غنودگی کا دھندلکا جو میرے ہوش وحواس پر مستولی تھا غایب ہو چکا تھا اور میں ایک نئی بیداری ایک نئی زندگی محسوس کر رہا تھا۔

یہ تصویر جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ایک نوجوان حسینہ کی تھی اور وہ بھی پورے قد کی نہیں بلکہ اس میں صرف سر اور بازو کا بالائی حصہ نمایاں تھا اور اس کے نہایت ہلکے نقوش نظر آ رہے تھے۔ فریم بیضوی تھا اور نہایت خوشنما قیمتی نقوش سے مزین۔ آرٹ کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی قابل تعریف بات نہ تھی لیکن تصویر بجائے خود بے انتہا دلکش اور جاذب توجہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو حسن صنعت کی بلندی ہے جس نے مجھے اس قدر اپنی طرف متوجہ کیا اور نہ حسن صورت کے لازوال نقش ونگار کی کشش۔ زیادہ سے زیادہ غنودگی و بیہوشی کی حالت میں اچانک اس تصویر کو زندہ انسان کا چہرہ سمجھ کر میں اُس کی جانب اس قدر متوجہ ہوا۔ لیکن ایسا بھی کیوں تھا؟ اس کا سبب؛ فوری طور پر میری سمجھ میں یہ آیا تھا کہ تصویر کا انداز اور فریم کے نقش ونگار وغیرہ نے مل جل کر میرے دل ودماغ پر یہ اثر قائم کیا۔ مگر سوچ بچار میں وقتی لطف جو حاصل ہوا تھا وہ بھی کھو بیٹھا۔

انھیں خیالات میں غرق میں کچھ کھویا کھویا سا تھوڑی دیر تک نیم دراز حالت میں تصویر پر نگاہیں جمائے رہا جیسے میرا اُس نے کچھ کھو دیا ہے آخر کار تصویر کے سحرکارانہ اور غیر فانی اثرات کا میرے دل نے اعتراف کر لیا۔ اور میں مطمئن سا ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔

اب میری سمجھ میں تصویر کا خاموش تکلم آ گیا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں زندگی کے آثار نہیں سچ مچ کی زندگی تھی اور اس کی حسرتناک خاموشی میں سحر آفریں گفتار کی سی کیفیت۔

اوّل اوّل میں نے اُس کو دیکھا۔ اُس کی نظریں میری سمت تھیں مجھے گھورتی رہیں اور آخر کار میرے ہوش وحواس پر غالب آ گئیں اور میں نے اپنے آپ کو اُن کی سحرکاریوں کے حوالے کر دیا۔ پھر ذرا سنبھلا اور خوف واضطراب کے عالم میں مَیں نے شمعدان کو اس کی اصلی جگہ رکھدیا۔ اور نہایت اشتیاق سے اس کتاب کو دیکھنے لگا جس میں تصویروں کی تفصیل درج تھی۔ تھوڑی دیر کی ورق گردانی کے بعد "بیضوی تصویر" کے ذیل میں کچھ مبہم اور عجیب عبارت درج تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اس میں لکھا تھا۔

"وہ حسن وشباب میں لاثانی تھی اور مسرت وشادمانی کی جیتی جاگتی تصویر۔ سب سے زیادہ منحوس تھی وہ گھڑی جب اس نے مصور کو دیکھا اور اُس کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس سے شادی کی۔ مصور محنتی، جفاکش اور جذباتی انسان تھا اور حسن صنعت کی دُھن کو پہلے ہی بیاہ چکا تھا۔ حسینہ جمال ودلبری کا لاثانی نمونہ تھی اور مسرت وشادمانی کا بےنظیر مجسمہ! برق وش شوخ وشنگ۔ حسینہ مجسم بہار تھی اور گل نوخیز کے مانند سراپا تبسم۔ وہ کائنات کی ہر شے کو پیار کرتی اور ہر چیز اسے پسند تھی مگر آرٹ (جس سے اس کو دلی نفرت تھی) اُس کا رقیب روسیاہ تھا۔ نگارخانہ کا تمام سامان رنگ وروغن اور موقلم اس کی نظروں میں خار تھے جو اس کے محبوب سے اُسے جدا رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ مصور کی ہر وہ گفتگو جس کا تعلق کسی

نہ کسی طرح آرٹ سے ہوتا اس حسینہ کو ناگذار گذرتی کیونکہ خواہ اس کی اپنی تصویر کے بنالے کا ہی ذکر کیوں نہ ہو۔

لیکن اس کے باوجود وہ اطاعت شعار اور فرماں بردار تھی۔ کبھی اس کی مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور کبھی اس سے انحراف نہ کرتی اور محض اس کی مرضی کے لئے آرٹ کا تختہ مشق بننے کو تیار ہو گئی۔ اور کئی ہفتے تک مسلسل اُس نے بلند و بالا برج کے تاریک کمرے میں چپ چاپ بیٹھ کر گذار دئے جہاں ہر شے زرد کر مچ کے پیچھے اس کے سر پر خفیف سی روشنی شعاع انداز ہوتی تھی۔ لیکن اس سے مصور کی کامیابی روز افزوں تھی۔ وہ جذباتی انسان تھا۔ کسی قدر وہمی غیر متین اور تنک مزاج، جو اپنی مرضی کے مقابلے میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ یہی سبب تھا کہ کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ اس تنگ و تاریک کمرہ میں جہاں روشنی و ہوا کا گذر تک نہیں۔ اس کی نازک اور حسین دلہن کی صحت و عافیت خطرے میں ہے اس روح لطیف کو اس کنج کثیف میں کس قدر اذیت ہوگی اور وہ شوخ، خوش مزاج غزال رنگیں اس تیرہ و تاریک قفس میں گھٹ کر رہ جائیگی۔

وہ مجسمہ حسن و عشق اس زندان میں جہاں سوائے اس کے حسین چہرے کے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ صابر و شاکر بت بنی بیٹھی رہتی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی بلکہ اس خیال سے شاد و مطمئن تھی کہ اس کا محبوب اپنے کام میں ذوق و شوق سے مصروف اور سرور ہے۔ مصور اس کے جذبات لطیف سے قطعاً بے خبر دن رات تصویر کشی میں مشغول رہتا اس کی پروا بھی نہ کرتا اور وہ نمونہ بنی بیٹھی رہتی تھی۔

وہ سوچتی تھی کہ ایک دن آئیگا جب یہ شبیہ مکمل ہو جائیگی میرے محبوب کی آرزو پوری ہوگی اور میری طرف ملتفت ہوگا۔ میری تصویر جو اتنی محنت اور کوششوں سے تیار ہو رہی ہے لوگ دیکھ کر عشق و وفا کا ایک غیر فانی معجزہ سمجھیں گے۔ کیسی عرق ریزیوں سے وہ ان نقوش میں رنگ بھر رہا ہے۔ فن (مصوری) کا انتہائی عروج! کوئی دیکھے تو عش عش کر اُٹھے اور میرے محبوب کے کمال فن کی داد دے۔ لیکن تکمیل کا وقت قریب آ رہا تھا اور وہاں کوئی دیکھنے والا یا داد دینے والا نہ تھا نہ اس کی وفا کی داد کون دیتا ہے۔ مصور حسب معمول بے پروا جنونی بنا اپنے کام میں مصروف تھا۔ مشکل ہی سے آنکھ اٹھاتا ہوگا۔ اتنی مہلت کہاں تھی کہ اپنی محبوبہ وفا شعار کی طرف ایک نظر بھر کر بھی دیکھ لے۔ سنگدل، جذبات سے بے بہرہ انسان! کبھی نہیں سمجھا کہ جن رنگوں سے اس نے تصویر کے نقش و نگار کرمچ پر بنائے ہیں یہ وہ سرخی ہے جو بد نصیب حسینہ کے گلابی رخساروں سے کھینچی گئی ہے جو دن رات، اندھیری کوٹھری میں بت بنی بیٹھی، اپنا خون خشک کرتی رہتی تھی۔

آخر ہفتے گذرتے گئے۔ تھوڑا سا کام باقی تھا صرف اتنا کہ ایک قلم کی جنبش سے منہ بنے اور ایک ہلکا سا رنگ آنکھوں پر پھر جائے۔ ایک لمحہ میں مصور اس آخری تکمیل کے ارادے سے رنگ لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے لمحہ میں جو اس نے پیکر ممثلہ کی طرف نظر اٹھائی تو اس کی نگاہیں وہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔ ہاتھ اوپر کا اوپر اٹھا رہ گیا۔ جسم کانپنے لگا۔ اور تمام نقوش بے رنگ نظر آنے لگے۔ دماغ معطل تھا اور لب مرتعش ـــــ آخر بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔

اُف یہ ہے اصل زندگی ـــــ اب وہ تھا اور محبوبہ کی یاد"

وہ دوسری دُنیا کو سدھار چکی تھی۔ جنونی مصور نقش حیرت بنا ہوا تھا اور اس کے سامنے اس کا مٹایا ہوا

"نقش حسرت" !!

اختیار کرتا ہے اُسے ملاحظہ فرمایئے کہتا ہے۔

"مجھے روتے دیکھ کر میری محبوبہ نے کہا کہ آنسوؤں کے موتیوں میں سے کچھ مجھے بھی دے دو تاکہ میں اپنے گلے کا ہار تیار کر لوں۔ لیکن جب وہ مسکرائی تو اس کے دانتوں کے موتی چمک اٹھے۔ اس وقت میں نے اپنے ساتھی سے کہا دیکھو جو موتی وہ مجھ سے مانگتی تھی وہ خود اس کے مُنہ کے اندر موجود ہیں"

اس مضمون کا ایک اور شعر سنئے۔

"جس وقت وہ مجھ سے ہم آغوش ہوئی تو اس کی چادر سرک گئی اور موتیوں کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا وہ گھبرائی لیکن جب مسکرائی تو کالی رات میں بھی تمام موتی ایک ایک کر کے چُن لئے گئے"

سنگریزوں کو جواہرات کہنا کتنی نئی بات ہے ایک شاعر تشبیہات کی مدد سے سنگریزوں کی قسمت کو اس طرح بلند کرتا ہے۔

"جب حسن و جمال والے اس وادی سے گذرتے ہیں اور وہاں کے سنگریزوں کو دیکھتے ہیں تو اپنے گلے کے ہار ٹٹولنے لگتے ہیں کہ کہیں ان کے جواہرات تو ٹوٹ کر نہیں گر گئے۔ درآں حالیکہ ذرات اس کے حسن و جمال کی وجہ سے چمکتے ہیں"

تشبیہات کے سلسلے میں دو شعر اور سُن لیجئے۔ پہلے پہل اپنی بیوی کو جس کے ہاتھوں پر گودنے کے نشانات تھے دیکھ کر عربی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

"جس وقت وہ عروسی شان میں جلوہ گر ہو کر آئی اور مجھے دیکھ کر اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا جس پر نقش و نگار کا جال پھیلا ہوا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ کیا اس طرح مُنہ چھپا لینے سے تم چھپ سکتی ہو کہیں جال بھی آفتاب کو ڈھک سکتا ہے"

عربی شاعری پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی جا سکتی ہے اور ہر حیثیت ایک مستقل بحث چاہتی ہے لیکن اس موقع پر عربی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت پر جو اس کی امتیازی شان ہے ایک سرسری اشارہ کرنا

چاہتا ہوں۔

عرب کا شاعر اپنی شاعری کی روشنی سے صرف گم کردہ نشان منزل مسافروں ہی کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ بلکہ فوج کے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو اور حجروں میں بیٹھے ہوئے زاہدوں اور عابدوں کو بھی کھینچ کر باہر لاتا ہے عرب کا شاعر بزدلوں کو بہادر بنا کر تاریکی زندگی بخشتا ہے اور اپنی شعری قوتوں سے حکومتوں کے دماغ درست کر دیتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن حیرت و استعجاب کے ساتھ لکھتا ہے۔

"بلاشبہ قرآن مجید عربی زبان کا معجزہ ہے۔ جس زبان کی شاعری (جس میں بیشتر حصہ جھوٹ کا ہوتا ہے) جب یہ اثر و قوت رکھتی ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس کی وہ قوت کیا ہوگی جس میں نری صداقت ہی صداقت ہے۔"

عرب کا ایک شاعر خلیفہ سفاح کے پاس آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کر کے ایک شعر پڑھتا ہے۔ خلیفہ اس شعر کو سن کر اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ امرا بنی امیہ کو جو اس کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں قتل کرا دیتا ہے۔

ایک شعر سنئے اور انصاف سے بتائیے کہ فارسی، اردو، ہندی یا کسی اور زبان کی رزمیہ شاعری میں اس کی نظیر مل سکتی ہے؟

"میدان جنگ میں سروں پر گرد و غبار اس قدر جم گیا ہے کہ تلواریں چمکتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رات کو آسمان کے تارے ٹوٹ رہے ہیں۔"

اخیر میں مشہور شاعر ابو نواس کے چند اشعار پیش کر کے رخصت چاہونگا

یہ ابو نواس وہی ہے جس نے عربی شاعری کو وہاں پہنچا دیا جہاں کسی اور زبان کی شاعری پہنچ ہی نہیں سکتی۔ معنی آفریں ابو نواس ایک پری چہرہ معشوقہ کی تعریف میں جو ننگی نہا رہی ہے کہتا ہے۔

"اس نے جب نہانے کے لئے قمیص اتار دی تو فرط شرم نے اس کے گلاب جیسے نرم گالوں کو سرخ کر دیا اس نے اپنے کپڑے اتار کر اپنے سڈول جسم کو جو ہوا سے زیادہ لطیف تھا گویا ہوا کا مقابل بنا دیا۔ اس نے اپنی ہتھیلی جو پانی سے زیادہ شفاف تھی پانی لینے کے لئے بڑھائی جو برتن میں تیار رکھا تھا۔ جب وہ نہا چکی اور جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا تو ایک ایسے شخص کو جو قریب ہی کھڑا تھا دیکھا اور فوراً تاریکی (بالوں) کو روشنی میں تبدیل کر دیا۔ یعنی اپنے سیمیں بدن کو سیاہ کپڑے سے ڈھانک لیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپ گئی ہے۔ اس کے شفاف مبسم سے موتی اس طرح گر رہے تھے جیسے پانی پر پانی۔"

یہی ابو نواس ایک جگہ چاند کو چاندی کی کشتی کہہ کر حسن ادا اور معنی آفرینی کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"چاند کو دیکھو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاندی کی کشتی ہے جو عنبر کے بوجھ سے پانی میں دبی ہوئی ہے۔"

ایک مرتبہ ابو نواس اپنی محبوبہ کی بیوفائی کی شکایت کر کے کہتا ہے۔

"تو نے اپنے دل میں بہت کم گنجائش رکھی ہے۔ یہاں تک کہ نہیں سے بھی کم۔ جس کا تجزیہ بالکل ناممکن ہے۔"

ملاقات

از جناب منظور احمد صاحب منظور بی۔ اے ایل ایل۔ بی لائلپور

سوادِ شام کا بھیگا ہوا پُرکیف منظر تھا،
ہوا خاموش، موج آسودہ تھی آغوشِ ساحل میں،
پلا دی تھی نبیذِ بے خودی پتوں کو شبنم نے،
فسوں تھا کارفرما اپنی فطرت کے محمل میں؛
تھکن سے اونگھتی جاتی تھی ہر شے مضمحل ہو کر؛
مگر اک محشرِ جذبات تھا منظور کے دل میں؛
لبِ دریا تھا میں ہاتھوں سے تھامے قلبِ مضطر کو

اُڑی جاتی تھی دیوی رات کی زُلفوں کو بکھرائے،
فلک پر چاند خنداں تھا ستارے ٹمٹماتے تھے،
مگر میرے سپہرِ عشق پر اُمید کے انجم،
نکلتے تھے جو پل بھر جھلملا کر ڈوب جاتے تھے
میں تنہائی میں اپنی کوتاہیٔ قسمت پہ روتا تھا
مری پلکوں پہ آنسو سیل بن کر اُمڈے آتے تھے،
سکھا دی تھی خوئے ابرِ باراں دیدۂ تر کو

اچانک اس فضائے منجمد میں انقلاب آیا
مجھے پازیب کی جھنکار سے چونکا دیا تو نے،
ہُوا فق رنگِ مہ تاروں کے رُخ پر مُردنی چھائی
بڑھی موجِ رواں ذرّوں کا دل گرما دیا تو نے
اثر مجھ کو دکھا کر آتشیں جذباتِ اُلفت کا
دلِ بیتاب کے ہر تار کو لرزا دیا تو نے،
تری آنکھوں میں رقصاں میں نے دیکھا اشکِ احمر کو

ملی مجھ سے مگر ملنا تھا یہ ملنا قیامت کا
گریباں میرا اپنے آنسوؤں سے دھو گئی پیاری
ابھی تک تھے جبینِ بندگی میں مضطرب سجدے
ابھی دل ہی دل کی تھی کہ مجھ سے کھو گئی پیاری
ادھر میری محبت نے اُدھر تقدیر نے کھینچا
ہوئی تقدیر غالب اور تو رخصت ہو گئی پیاری
یہ کہہ کر "لو خدا حافظ ملیں گے روزِ محشر کو"

جگنو
ٹیگور کا ایک دلکش شہ پارہ

جناب جمیل احمد صاحب بی۔اے کندھاپوری

۱

پھولوں پر پرواز کناں تتلیاں
ہمیشہ میری رہتی ہیں
میں صرف اُسے کھو دیتا ہوں
جو میری گرفت میں آجاتی ہے۔

۲

سمندر سینہ کوبی کرتا ہے
کیونکہ اس کے پاس پھول نہیں
جسے وہ چاند کو پیش کر سکے

۳

آزادی ہمیں اس وقت حاصل ہوتی ہے
جب ہم اپنی بقا کے حق کے لئے
پوری قیمت ادا کر چکتے ہیں۔

۴

بادل اپنا تمام طلا
ڈوبتے ہوئے آفتاب کو دے دیتا ہے۔
اور طلوع ہوتے ہوئے چاند کا خیر مقدم
صرف ایک زرد تبسم سے کرتا ہے۔

۵

یہ میری کاغذ کی کشتیاں
کسی خاص منزل — پر پہنچنے کے لئے نہیں
بلکہ صرف اس لئے ہیں
کہ وہ وقت کے بلبلوں پر رقص کریں

۶

صبح کاذب تاریکی کے دروازے کے سامنے
اپنی بانسری بجاتی ہے
اور جب آفتاب جلوہ گر ہوجاتا ہے
تو خاموشی کے ساتھ غایب ہوجاتی ہے

۷

آسمان آفتاب کی یاد میں تمام رات
بیشمار ستاروں پر مصروف ورد رہتا ہے

۸

جیسے ہی گلاب نے آفتاب سے کہا
"میں تجھے سراپا یاد رکھوں گا"
اس کی پنکھڑیاں زمیں بوس ہوگئیں۔

۹

تیری ننھی سی انار کی شرمیلی کلی
جو آج نقاب کے عقب میں مچل رہی ہے
کل بڑھکر پُرشباب پھول کی شکل اختیار کرلیگی۔
جب میں یہاں نہ رہونگا۔

۱۰

جب منصف اپنے چراغ کی روشنی سے
دوسرے کے چراغ کے روغن کا مقابلہ کرتا ہے
تو اس کو خیال ہوتا ہے
کہ وہ انصاف برت رہا ہے

۱۱

اے رات!
میں تیرے سامنے اپنے دن کا کاسۂ تہی لایا ہوں
تاکہ ایک نئی صبح کے تہوار کے لئے
اسے تیری سرد تاریکی سے صاف کردوں۔

۱۲

ساحل سمندر سے سرگوشیوں میں کہتا ہے
کہ تیری موجیں جو سُنانے کے لئے مضطرب ہیں لکھدے
سمندر بار بار موجوں میں لکھتا ہے
اور ہر مرتبہ ایک بے پناہ ناامیدی کے ساتھ اپنی تحریر
کو مٹا دیتا ہے۔

۱۳

زندگی کے پھول اور پھل میں
جو خوشیاں میں نے محسوس کی ہیں
اختتام دعوت پر' تو مجھے ان کو

کامل و مکمل محبت کے طور پر
اپنی خدمت میں پیش کرنے دے

۱۴ ——————

بعض عقل و فہم کے جویا ہیں اور بعض دولت کے
میں تیری صحبت کا اس لئے متلاشی ہوں
تاکہ میں گا سکوں

۱۵ ——————

میرے تخیلات جگنو ہیں
زندہ نور کے نشانات
ظلمت میں ٹمٹماتے ہوئے

۱۶ ——————

ننھی کی آرزوئیں رونما ہوتی ہیں
بچوں کی شکل میں

۱۷ ——————

گل پژمردہ آہیں بھرتا ہے
اس لئے کہ بہار ہمیشہ کے لئے فنا ہوگئی

۱۸ ——————

ضیائے آفتاب ہمارے لئے دنیا کا دروازہ کھولتی ہے
اور ضیائے محبت اس کا خزانہ

۱۹ ——————

میرے وہ خیالات جو الفاظ سے محصور نہیں ہو سکتے
میرے نغموں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں

۲۰ ——————

مدفون شہر کسی عصر نو میں بے نقاب ہونے پر
شرماتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنے تمام نغمے گم کر دیئے

۲۱ ——————

زمین چاند کو دیکھتی ہے اور تعجب کرتی ہے
کہ اس کی تمام موسیقی فقط اس کے تبسم میں مضمر ہے

۲۲ ——————

مجھے بیکار تاریکی میں ٹھوکریں نہ کھانے دو
بلکہ اس اُمید میں مبتلا رہنے دو
کہ دن جلوہ فگن ہوگا
اور حقیقت اپنی سادگی کے ساتھ
رونما ہو جائیگی۔

۲۳ ——————

اے پھول تو کیڑے پر رحم کر
یہ مدہ مکھی نہیں
اس کی محبت
بھول بھی ہے اور بار بھی

۲۴ ——————

تو آج دیر سے بیدار رہا ہے میرے مہ نو
مگر میرا طائر شب تیرے خیر مقدم کو
اب بھی بیدار ہے

۲۵ ——————

بہار سرما کے دروازے پر پیش و پیش کرنے لگتی ہے
مگر آم کے شگوفے قبل از وقت بعجلت تمام
اس تک دوڑ کر پہنچ جاتے ہیں
اور اپنی موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں

۲۶ ——————

میرے درخت کا سایا مسافروں کیلئے ہے
مگر اس کا پھل صرف ایک کے لئے
جس کے واسطے میں چشم براہ ہوں

۲۷ ——————

خدا اپنے تاروں کے مندر میں
اس کا انتظار کرتا ہے کہ
انسان اپنا چراغ لے آئے۔

۲۸ ——————

میرے محبوب! تمہاری مسکراہٹ،
کسی عجیب و غریب پھول کی بو کی مانند
سادہ ہے اور ناقابل تشریح۔

۲۹ ——————

وہ پھل جسے میں نے
ہمیشہ کے لئے حاصل کر لیا ہے
وہی ہے جس کو تم نے
شرف قبولیت بخشا۔

۳۰ ——————

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے اختتام دن پر
میرے نغموں کی کشش
مجھے ساحل کے اُس پار پہنچا دے گی
جہاں سے میں دیکھ سکونگا۔

۳۱ ——————

پھول اپنی پنکھڑیوں کو گرا کر
پھل پا لیتا ہے۔

۳۲ ——————

میرے نغمے گنگنانے کے لئے ہیں
کہ میں نے تیرے نغمے سے محبت کی ہے۔

۳۳ ——————

تارا کہتا ہے کہ
مجھے بحث و تکرار میں پڑنے کے بجائے
اپنا چراغ روشن کرنے دو۔
اگر یہ ظلمت کو دور کرنے میں
ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹیگور

شب ماہتاب میں!

محبت کا دلآویز و رنگین افسانہ

از جناب نور الحق صاحب نوگیروی بی۔ اے

وہ ایک دراز قد، دُبلا پتلا، مجذوب فرانسیسی تھا۔ وہ بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود انصاف پسند بھی تھا۔ اس کے اعتقادات محکم تھے اسے یقین کامل تھا کہ وہ مشیت ایزدی کو بدرجہ اتم سمجھ سکتا ہے۔

اکثر جب وہ اپنے کلیسا کے باغ میں ٹہلتا تو یہ سوال "خدا نے ایسا کیوں کیا؟" اس کے دماغ میں آتا اور اسے چند گھنٹوں کے لئے غور و فکر کرنی پڑتی۔ پھر خود ہی کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا۔ فطرت کی ہر شے اسے علم و حکمت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی۔

پو پھٹنے کا سہانا وقت اس لئے ہے کہ انسان نیند سے بیدار ہو کر اس سے محظوظ ہو۔ شام اس لئے ہے کہ راحت و آرام کا سامان کرے اور تاریک رات اس لئے کہ خواب غفلت میں گذاری جائے۔

لیکن اُسے عورت سے نفرت تھی۔ از حد نفرت۔ وہ خود بھی اس راز سے واقف نہ تھا کہ وہ کیوں ان سے حقارت کرتا ہے کبھی کبھی وہ مسیح کے ان الفاظ کو دہراتا۔ "اے عورت! مجھے تجھ سے کیا تعلق؟" اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بڑبڑاتا۔ شاید خدا بھی عورتوں کو بنا کر اپنے اس عمل سے ناخوش ہوتا ہوگا؟ عورت اس کی نگاہ میں اس "بارہ گنا ناپاک بچہ" کی طرح تھی جس کا ذکر شاعر نے کیا ہے۔ اسے ایک ساحرہ سمجھتا جس نے دنیا کے پہلے شخص کو جال میں پھانسا اور جو اس وقت تک اپنا دام زبوں پھیلائے ہوئے ہے۔ مکروہ۔ خوفناک اور نہایت تکلیف دہ ـــ عورت کے مضر و مہلک جسم سے زیادہ اس کی روح سے نفرت کرتا تھا۔

اس نے اکثر و بیشتر عورت کی ملائمت و شفقت کو اپنے اندر اثر کرتے پایا۔ اُسے یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی کہ عورت بھی محبت کرنے کی خواہش محسوس کرتی ہے۔ اور اپنے سینے میں ایک لرزاں اور جذبات سے بھرا ہوا دل رکھتی ہے اس کا خیال تھا کہ عورت کو خدا نے اس لئے وجود بخشا ہے کہ وہ مرد کو آمادۂ محبت کرے اور ستائے۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ مرد کو بغیر احتیاط کے اس کی قربت حاصل نہ کرنا چاہئے۔

اس کی ایک بھانجی تھی جو نزدیک ہی اپنی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے مکان میں رہتی تھی۔ پادری کی دلی تمنا تھی کہ وہ اس حسین دوشیزہ کو زاہدہ بنائے۔ جب کبھی وہ وعظ کہتا وہ ہنس پڑتی۔ جب رنج ہوتا تو اس کا گرمجوشی سے بوسہ دیتی۔ چومتی اور لپٹ لپٹ کر پیار کرتی اور وہ حتی الامکان اپنے کو اس سے چھڑانے کی سعی کرتا حالانکہ اسے ایک خاص قسم کی لذت ملتی تھی۔ اکثر اس کے دل میں وہ احساس بیدار ہوتے جو ہر والدین کے دل میں خوابیدہ رہتے ہیں۔

چہل قدمی کے موقع پر اس نازنین سے وہ خدا کا ذکر کرتا۔ وہ ان باتوں پر کوئی خاص دھیان نہ دیتی۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھاتی ہری ہری گھاس اور پھولوں کی جانب دیکھتی اس کی خوبصورت آنکھوں میں حسن پیدا ہوتا۔ کبھی کسی تتلی کو لپک کر پکڑ لیتی اور ماموں سے کہتی "کتنی حسین چیز ہے۔ مجھے تو اسے چوم لینے کو دل چاہتا ہے" تیتلیوں کو چوم لینے کی یہ خواہش اس پادری کو پریشان کرتی اسے برافروختہ کرتی۔ اس قسم کی خواہشات کی مخالفت کی آگ اس کے سینے میں جل اُٹھتی۔ وہ انہی خواہشات میں عورت کے جوش محبت کی جھلک دیکھتا اور جی ہی جی میں کُڑھتا

ایک دن کلیسا کے محافظ کی بیوی نے پادری کو خبر دی کہ اس کی بھانجی کسی نوجوان سے عشق کرتی ہے۔ یہ سنتے ہی پادری کا چہرہ فق ہوگیا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے زبان خشک ہوگئی۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا آنسوؤں کے چند قطرے اس کی آنکھوں سے گرے۔ بہت دیر تک خاموش اور متفکر بیٹھا رہا۔ جب ذرا غصہ کچھ دھیما ہوا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تم جھوٹ کہہ رہی ہو"۔ اس دہقانی عورت نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا "غارت ہو جاؤں اگر جھوٹ بولوں۔ تو سنو! میں تمہیں سب بتلائے دیتی ہوں۔ ہر شب جب تمہاری بہن سو جاتی ہے تو وہ اپنے عاشق سے ایک ندی کے کنارے ملنے جاتی ہے۔ وہاں وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اگر تم نیم شب کے وقت وہاں جاؤ تو انہیں پا سکتے ہو"۔

وہ اپنے مکان کے سائبان میں ٹہل رہا تھا افسردگی اس کے چہرہ سے ٹپکی پڑتی تھی۔ اسے اپنی توہین کا خیال آرہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اس چھوکری نے اپنی ناروا حرکت سے مجھے ذلیل کیا۔ ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ وہ سخت سے سخت سزا کی مستحق ہے۔

شام ہوگئی۔ رات اس نے کھانا بہت کم کھایا۔ کچھ مطالعہ کرنے بیٹھ گیا۔ جی نہ لگا تو غصہ اور بڑھ گیا۔

دس بجتے ہی اس نے اپنی چھڑی اٹھائی جسے وہ اکثر ہاتھ میں لیکر سیر کو جایا کرتا تھا۔ اور ایک غضبناک مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ اسے دونوں ہاتھوں سے جنبش دینے لگا۔ پھر اس نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا اور آگے بڑھا۔ بڑھتے ہی فوراً رک گیا۔ چاند کی زرفشانی نے اسے متحیر کر دیا۔ اس نے ایسی دلآویز چاندنی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اس خموش اور پرنور فضا نے اس کے دل پر فوراً اثر کیا۔ اس کے دل و دماغ کو ملائم کر دیا وہ کسی گہرے فکر میں مستغرق ہوگیا۔

چاندنی اس کے چھوٹے سے باغ میں چٹکی ہوئی تھی۔ درختوں میں ایک عجیب رعنائی پیدا ہوگئی تھی سارے باغ سے خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ اور اسے مدہوش بنا رہی تھی۔ اب اس نے بار بار اس طرح سانس لینا شروع کیا جیسے ایک شرابی جام پر جام چڑھائے جاتا ہو۔ اس پر ایک کیف

کا عالم طاری تھا۔ اس نے خراماں خراماں آگے بڑھنا شروع کیا۔ سامنے کھلے میدان میں پہنچتے ہی وہ رکا اور ہر چہار جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قدرت کی رنگینی کا نظارہ کرنے لگا۔ سفید چاندنی ہر شے پر لپٹی ہوئی تھی۔ مینڈکوں کی آواز ہوا میں گونج رہی تھی۔ بلبلیں اپنی شیریں نغمہ سرائیوں سے فضا میں موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔

پادری پھر آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا ہمت جواب دے رہی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں ذرا بھی نہ آتا۔ وہ کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کرنے لگا۔ زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بیٹھ جائے اور خدا کی کارفرمائیوں پر غور کرے اور اس کی تحسین و تعریف میں غرق ہو جائے۔ قریب ہی ندی کے کنارے سرو کے درخت قطار اندر قطار کھڑے ہوئے تھے۔ چاندنی ان میں چھن چھن کر سطح آب پر پڑ رہی تھی۔ ہوا نے ندی میں ہلکی ہلکی موجیں پیدا کر دی تھیں۔ موجیں چاندنی کو اپنی آغوش میں لئے نہایت ہی بیتاب نظر آ رہی تھیں۔

پادری کے دماغ میں جذبات نے پھر ہیجان برپا کر دیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل میں بے چینی اور بیقراری سی تھی۔ سوالوں کے ہجوم سے دل میں ایک محشر سا برپا تھا۔ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ رات جب صرف سونے کے لئے، غفلت کے لئے، راحت کیلئے۔ ہر شے کی فراموشی کے لئے وقف ہے تو پھر دن سے اس کو زیادہ حسین و دلکش کیوں بنایا گیا؟ اور یہ معصیت انگیز ستارہ جو اپنی رنگینی میں آفتاب سے بالاتر ہے جو ہر باریک اور مخفی شے کو منور کرنے سے باز نہیں آتا جسے تیرگی سے سخت دشمنی ہے اسے وجود میں کیوں لایا گیا۔ اور دن کی طرح خوش الحان مطرب اس وقت اپنے بستر راحت پر کیوں نہیں رہتا؟ پریشان کن فضاؤں میں نغمہ سرائی کا مطلب؟ دنیا کی اس نیم نقاب پوشی کا سبب؟ دل میں ان دھڑکنوں کی وجہ؟ جذبات کو روح سے تعلق؟ جسم کو پژمردگی سے نسبت؟ آخر انسان کے جذبات کو ابھارنے کا یہ ساز و سامان کیوں۔ یہ نورانی رے آسمان سے برسانے کی غرض ـــــ؟ پادری کا دماغ سمجھنے سے قاصر ہو گیا تھا وہ تخیلات کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

یکایک اسی وقت قریب ہی مرغزار پر دو پرچھائیاں باہم لپٹی ہوئی نظر آنے لگیں جو دراز قامت تھا وہ اس کا ہاتھ معشوقہ کی کمر کے گرد۔ رہ رہ کر وہ اس کی پیشانی کو چومتا۔ دونوں ایک مجسم مثال کے طور پر اس کے سوالات کا جواب خدا کی طرف سے لیکر پادری کے قریب آئے وہ ششدر رہ گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

چند لمحہ بعد اس کی زبان سے بیساختہ یہ الفاظ نکل پڑے "شاید خدا نے ایسی رات صرف محبت کرنے کیلئے بنائی ہے"۔

وہ ان دونوں کے سامنے سے جو ایک دوسرے سے لپٹے کمر میں بانہیں ڈالے گذر رہے تھے ہٹ گیا۔ اس نے اپنی بھانجی کو دیکھا اور خاموش ہو گیا اس وقت اسے یقین ہو گیا کہ خدا نے محبت کرنے کی اجازت ہر کسی کو دی ہے اور اس کا جلوہ اسی محبت ہی سے آشکار ہے۔

وہ وہاں سے شرمندہ اور بدحواس ہو کر بھاگا ٹھیک اس طرح جیسے کوئی ایسی عبادت گاہ میں جا گھسے جہاں اسے مطلقاً جانے کی اجازت نہ ہو۔ (ماخوذ از انگریزی)

ہر قسم کی خط و کتابت کیلئے نمبر خریداری کا لکھنا ضروری ہے۔

رُباعیات

از جناب عطا کلیانوی

عنقا کی طرح گم ہو تو شہرت کو نہ دیکھ
بن خاک نشیں عرش کی رفعت کو نہ دیکھ
کر غور فسانہ و حقیقت میں ذرا
معنی پہ نگاہ ڈال صورت کو نہ دیکھ

مملو ہے مئے عشق سے جام شاعر
بالا ہے فلک سے بھی مقام شاعر
شاعر کی زباں ہے جیسے جبریل کہیں
الہام ہے واللہ کلام شاعر

قسمت

ایک دہشت انگیز افسانہ

از جناب کاظمی صاحب بریلوی

رات بھیانک اور تاریک تھی......

جنگل کے درمیان آم کے باغ میں ایک جھونپڑی میں پانچ کسان طوفانی بارش سے پناہ لینے کی غرض سے ٹھہرے گئے تھے۔ ان کے دل خوف و دہشت کے گوناگوں جذبات سے لبریز تھے۔ بارش کی بڑی بڑی بوندیں زمین پر گر کر خوب آوازیں پیدا کر رہی تھیں گاہ گاہ بجلی کے چمک جانے سے ادھر اُدھر کا منظر صرف ایک لمحہ کے لئے پیش نظر ہو جاتا۔ رات اس قدر اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ جھونپڑی باد تند کا ابھی تک مقابلہ کر رہی تھی۔ مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسرے ہی لمحہ میں صرف ایک ہی جھونکا اس کو اڑا کر نہیں لے جائیگا۔ بانسوں اور کھجوروں کے پتوں کی ایسے طوفان کے سامنے حقیقت ہی کیا؟

یہ پانچوں کسان قریب ہی کے ایک گاؤں بہادر پور کی ایک بارات میں سے واپس آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ اپنی اپنی لاٹھیوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے میزبان نے انھیں رات کو واپس جانے سے روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی مگر چونکہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے دن کچہری کسی مقدمے میں گواہی دینے کے لئے جانا تھا اس لئے اُن کا وہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب و موزوں نہ تھا۔

بارش کے نے پر ان کا گاؤں صرف پانچ کوس رہ گیا تھا۔ مگر ہوا کی تیزی بارش کے زور اور بجلی کی چمک کی دہشت سے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور وہ ایک خالی جھونپڑے میں پناہ گزیں ہو گئے جو شاید باغ کے رکھوالے کی تھی اور فصل نہ ہونے سے خالی پڑی تھی۔ جھونپڑی کا فرش اگرچہ بالکل تر نہ تھا۔ مگر نم ضرور ہو چکا تھا۔ وہ لالٹین جو ان میں سے ایک اپنے ساتھ لئے تھا ہوا کے ایک تیز جھونکے سے بجھ گئی۔ دیا سلائی نکال کر اس کو جلانے کی بہتیری کوشش کی گئی۔ مگر دیا سلائی خود نمناک ہو چکی تھی۔ چند تیلیاں خراب کرنے کے بعد یہ طے ہو گیا کہ لالٹین نہیں جل سکتی۔ طوفان لمحہ بہ لمحہ تیز اور دہشت انگیز ہوتا جا رہا تھا۔

بجلی ایک مرتبہ زور سے چمکی۔ اور باغ کے منظر کو ایک لمحہ دکھانے کے بعد پھر غایب ہو گئی۔

آدھی رات گذر گئی مگر طوفان میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی ــــ بجلی کی چمک ہر لحظہ تیز اور ہولناک ہوتی جا رہی تھی۔ گاؤں والے بجلی کی ہر چمک اور بادل کی ہر گرج کے ساتھ ساتھ فلسفی ہوتے جا رہے تھے۔ "پرماتما کی مرضی ہے اس میں کسی کو کیا چارہ؟" اور "ایک نہ ایک دن سب کو مرنا ہے۔" وغیرہ فلسفیانہ مسائل ان کے پیش نظر تھے۔

جھونپڑی میں اب مکمل خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی بارش کی بوندیں جھونپڑی کی چھت میں سے ٹپک کر ان میں سے کسی کو اپنی جگہ تبدیل کرنے پر آمادہ کر دیتی تھیں۔ پانچوں آدمی نہایت صاف طبیعت کے مالک تھے ناتھو ان سب میں بڑا تھا۔ وہ لانبا ضرور تھا مگر درازی عمر کی وجہ سے اس کا قد کسی قدر خم ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کے بالکل قریب ہی بیٹھا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد "پرماتما کی مرضی ہے" بے اختیارانہ کہہ اٹھتا اسی کے برابر چھیدو بیٹھا تھا۔ بجلی کی ہر چمک پر وہ اپنی لاٹھی کو اور مضبوطی

سے پکڑ لیتا تھا۔ وہ بہادر اور شریف النفس تھا۔ اسی کے برابر بائیں ہاتھ پرمرام لال بیٹھا تھا۔ وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے ہوئے تھا۔ اس کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔ وہ نوجوان اور شیر دل ضرور تھا مگر مہاجن کے وہ دو سو روپیہ اور ان کا سود جو اس نے اپنی شادی کے موقع پر قرض لئے تھے اس کی روح کو اندر ہی اندر جلائے دیتے تھے۔ اس کے پیچھے گردھاری نہایت خاموش بیٹھا تھا اُسے اپنی موت کا کامل یقین ہو چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بارش کے ان قطروں سے جو چھت میں سے ان پر ٹپک رہے تھے قطعی بے خبر تھا۔ اسی کے برابر گنگا رام بیٹھا تھا اسے موت کا قطعی خوف نہ تھا اس کے نزدیک زندگی اور موت یکساں حالتوں کا نام تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ اپنی عمر کا بہترین زمانہ جیلخانے میں بسر کر چکا تھا جب اُس نے ایک بنئے کو اپنے قرضے کی وجہ سے زد و کوب کیا تھا۔

بحیثیت مجموعی وہ لوگ موت سے زیادہ نہیں ڈرتے تھے بلکہ ان کے دل کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر زیادہ پریشان اور پراگندہ ہو گئے تھے،

اور ان کے دماغ اپنی صحیح حالت پر قائم نہیں تھے۔ ان کے رسم و رواج نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ بھوت اور جنوں کا نام سن کر ہی مرعوب ہو جائیں۔ وہ ہر انسانی مصیبت کا سامنا کرنے کو تیار تھے مگر کسی ایسی مصیبت یا آفت کے مقابلے کا خیال بھی کرنا جوان کے نزدیک کسی دیوتا کے ناراض ہونے سے پیدا ہوئی ہو ان کے دل و دماغ کو بیکار کر دیتا تھا۔

جھونپڑی مکمل خاموشی کا نمونہ تھی ——،

یکایک نا تھو نے کہا۔ "بھائیو! پرماتما کی یہی مرضی ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو بھینٹ چڑھایا جائے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائیگا طوفان کا تھمنا ناممکن ہے اور ہم سب لوگوں کی موت یقینی۔ میری رائے میں ہم میں سے ہر کوئی آم کے اس پیڑ تک جائے جو سامنے بجلی کے چمکنے سے نظر آتا ہے —— وہی پیڑ جس کا تنا کافی موٹا اور شاخیں بہت نیچے کو جھکی ہیں۔ جس کی بھینٹ پرماتما منظور کریگا اس کے اوپر بجلی گریگی اور باقی لوگ طوفان ختم ہونے پر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائینگے"

ناتھو نے نہایت مختصر الفاظ میں ان لوگوں کو اس راز سے آگاہ کیا

اور خاموش ہوگیا۔ اس نے پھر کہا: "اگر کسی کو میری رائے سے اتفاق نہیں تو اس کو کہہ دینا چاہیے۔" مگر اس کی رائے سے سب متفق تھے۔

ناتھو نے کہا: "اچھا سب سے پہلے میں جاتا ہوں۔"

"نہیں" سب نے مل کر کہا۔ "ہماری قسمتیں ہی اس بات کا فیصلہ بھی کریں گی کہ پہلے کون اور اس کے بعد کون جائے۔"

گردھاری نے کہا: "اچھا! میرے پاس پانچ تیلیاں ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی اور چھوٹی ہیں۔ جو ان میں سے سب سے چھوٹی تیلی اٹھائے گا وہ سب سے پہلے جائیگا اور اس کے بعد اس سے بڑی اٹھانے والا۔ اور جو سب سے بڑی تیلی اٹھائے گا اس کا نمبر بھی سب سے بعد میں آئیگا۔"

اس طریقہ پر یہ طے ہوگیا کہ ناتھو سب سے پہلے جائیگا۔ اس کے بعد گردھاری۔ چھدو اور گنگا رام اور سب سے آخر میں رام لال جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔

ناتھو اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا باقی سب اسے دیکھنے دروازے پر جمع ہوگئے۔ "کیا وہ واپس آجائیگا؟" یہ سوال تھا جو اس وقت ان سب کے دلوں میں موجود تھا مگر کوئی بھی اس کا صحیح جواب نہ دے سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناتھو اس آم کے پیڑ کو چھو کر واپس آگیا۔ اس کے بعد گردھاری اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ ابھی آدھا راستہ ہی طے کرنے پایا تھا کہ بجلی زور سے چمکی اور وہ خوف و دہشت سے سراسیمہ ہوگیا اس نے دوڑنا چاہا مگر یہ سوچ کر کہ قسمت سے بچ کر کوئی نہیں جا سکتا اپنے اس ارادے سے باز رہا تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی بخیریت واپس آگیا۔ اب چھدو کی باری تھی۔ وہ بھی اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہوکر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ وہ ایک لمحہ بھی نہیں جھجکا اور چند ہی منٹ میں بخیر و خوبی واپس آگیا۔ اسی طرح گنگا رام بھی اپنے اوپر جبر کرکے اٹھا اور دوڑتا ہوا آم کے پیڑ تک جاکر [illegible] واپس ہی آگیا۔

بارش پورے زوروں پر تھی۔ بجلی برابر تڑپ رہی تھی۔ رام لال نے گنگا رام کی واپسی پر حسرت سے نگاہ کی۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس نے پیڑوں کے گرنے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے کڑاکے کی بجلی چمکی اور اس نے دیکھا کہ آم کا وہی پیڑ جہاں تک اسے جانا تھا زمین پر گرا پڑا تھا۔ وہ پیچھے مڑا اور واپس لوٹنے لگا دو تین قدم ہی چلا ہوگا کہ ایک مرتبہ بجلی چمکی اور اس نے دیکھا کہ جھونپڑی موجود نہ تھی اُسے سخت اچنبھا ہوا مگر رفتہ رفتہ اس نے معلوم کر لیا کہ جھونپڑی مع چاروں آدمیوں کی بجلی گرنے سے جل کر خاک ہوگئی ہے۔

بارش زوروں پر تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ مگر وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ ان تمام طوفانی مناظر سے بے خبر ——! (مستفاد)

ہندو شعرا و ادبا سے ضروری التماس

خاکسار الہ آباد یونیورسٹی میں جولائی ۱۹۳۸ء سے بحیثیت ریسرچ اسکالر زیر نگرانی محترمی پروفیسر جناب سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔اے صدر شعبہ اردو کام کر رہا ہے میرے ریسرچ کا عنوان "اردو ادب میں ہندوؤں کی خدمات" ہے۔ اس کے تحت نہ صرف مختلف اصناف سخن میں ہندو شعرا کی خدمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے بلکہ زبان اردو سے متعلق تمام ادبی شاخوں (مثلاً مضمون نگاری، ناول نگاری، مختصر افسانہ نگاری۔ ڈرامہ نگاری۔ تذکرہ نگاری و نیز تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، سائنس، ریاضی وغیرہم) میں دماغ سوزی کرنے والے ہندو صاحبان کے مختصر حالات زندگی مع ان کی ادبی خدمات کے لکھے جا رہے ہیں شعرا کا ذکر بلحاظ مختلف دور و مقام سکونت (دہلی۔ لکھنؤ۔ اکبرآباد۔ الہ آباد۔ پنجاب۔ بہار۔ دکن اور دیگر مقامات) کیا جا رہا ہے امید ہے کہ آپ حضرات کی عنایت سے یہ کتاب دو جلد تک کیلئے ایک نہایت جامع اور مکمل تذکرہ ثابت ہوگی اس لئے ان ہندو حضرات کی خدمت میں جن کی ادبی خدمات کا ذکر بہار گلشن کشمیر، خمخانہ جاوید کی مطبوعہ چار جلدوں، بہارستان سخن مرتبہ بابو نیام سندر لال صاحب برق سیتاپوری میں ناکافی یا بالکل نہیں کیا جا سکا ہے خاکسار با ادب ملتمس ہے کہ وہ براہ کرم اپنے و نیز دیگر اگر ممکن ہو تو اپنے زمانہ حیات کے ان گمنام ہندو شعرا کے جو انہیں معلوم ہیں لیکن وہ عوام کی نظروں سے اب تک پوشیدہ ہیں مختصر حالات زندگی مع نمونہ کلام (صرف بہترین چیدہ اشعار یا نظموں کی چند منتخب ابیات یا بند) اور اپنی و نیز ان کی خود نوشتہ کتابوں کے نام مع سن تصنیف تالیف یا ترجمہ کے خاکسار کے پاس ذیل کے پتہ سے جلد ارسال کرکے مرہون منت فرمائیں۔

سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۹ کے جواہر پاروں کی ایک مختصر فہرست

عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۹ء شائع ہو گیا ہے ذیل میں اس کے صرف بعض معرکہ آرا مضمونوں، رومانی افسانوں، اور رنگین نظموں کی ایک جھلک دکھائی جارہی ہے اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۹ء کتنا بلند پایہ اور ہنگامہ پرور ہے؟؟

دلچسپ حقائق افروز مضامین

اگر جنگ چھڑ گئی ... تو

بین الاقوامی سیاسیات پر معلومات افزا تبصرہ - از شبلی - بی کام مدیر معاون

بادشاہوں کی باتیں؟

ظریفانہ کہانیاں - از جناب قریشی محمد عبد اللہ صاحب

ٹیلی وژن

سائنس کا ایک معلومات افزا مضمون - از جناب وحشی صاحب آروی

ٹیگور کی افسانہ نویسی

ایک دلچسپ بحث - از جناب مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رامنگری

بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسہ کا حصہ

ایک بہترین نفسیاتی مطالعہ از جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے

اردو ادب اور حقیقت

ایک بلند پایہ مضمون - از جناب جمیل احمد صاحب بی - اے کندھاپوری

ایک ہی صدف کے چار موتی

اردو ادب کے چار بہترین نثر نگار (از جناب عطاء اللہ صاحب پالوی -)

اردو زبان کے دوست نما دشمن

ایک زبردست ادبی مقالہ - از جناب خیر بھوروی صاحب

راجر بیکن

یورپ کے سب سے بڑے فلسفی کے حالات از حضرت حافظ فانی بدایونی

برگد کا درخت اور مغربی شعرا

ایک تحقیقی مقالہ از جناب افسر ماہ پوری

وسط ایشیا کے سبزہ زاروں میں

ایک سیاح کے دلچسپ تجربات از جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بسمل

پنجابی شاعری کا غالب

ایک عجیب و غریب مضمون - از جناب مولانا خدا بخش صاحب اظہر امرتسری

وغیرہ وغیرہ

رنگین اور رومانی افسانے

راہبر

ایک دلکش دلدوز دیہاتی رومان - از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے

زہر کی شیشی

بیک وقت حسرت و غم کے جذبات پیدا کرنے والا افسانہ از حضرت ماہر القادری

دو نظریں

گالزوردی کا ایک دلگداز افسانہ - از جناب علی احمد صاحب علی

داغ سوزاں

ایک رومانی داستان - از جناب میرزا ادیب صاحب بی - اے

ریل گاڑی میں

ایک نوجوان کی حسرت آگیں داستان محبت - از جناب احسان علی شاہ بی - اے

ناطون

ایک تاریخی افسانہ - از حضرت سیماب اکبر آبادی

بقیہ فہرست سامنے صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ فرمائیے

شاہ زوغو کا رومان؟
شاہ البانیہ کا معاشقہ۔ از جناب رشدی صاحب بھوپال

زندہ جادو
برناڈشا کی ایک نیم مزاحیہ کامیڈی۔ از جناب طالب باغپتی،

شمع وطن کے پروانے
ایک انقلاب انگیز داستان۔ از جناب مولانا آسی رام نگری،

معمّہ
چیخوف کا ایک شاہکار از جناب شت مظفر پوری،

فاسٹ باؤلر
دلاویز داستان محبت از جناب شفیق الرحمن صاحب

بھتیجا داماد
ریڈیائی ڈراما از جناب سید بادشاہ حسین صاحب،
ان کے علاوہ بھی کئی بہار آفریں افسانے ہیں

بلند پایہ سحر طراز نظمیں!
ارشادات عالیہ۔ حضرت جمیل مظہری
حسن سر راہ۔ حضرت سیماب اکبر آبادی۔
فریب حسن۔ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی
اپنے دل کی بہار سے۔ جناب اعجاز صدیقی۔
آوارہ ہوش۔ جناب عزیز احمد صاحب عزیز
آجا۔ حضرت جلال ملیح آبادی

ان دیکھا محبوب۔ از جناب احمد ندیم قاسمی بی۔اے
حریم حسن میں۔ حضرت آثر صہبائی ایم۔اے
عشق باقی باقی۔ جناب امین حزیں سیالکوٹی۔
درس حیات۔ اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری
ستم شعار نظارے۔ حضرت الطاف مشہدی
مجاز و حقیقت۔ شاعر شباب حضرت ماہر القادری
غزل۔ حضرت فراق گورکھپوری
فطرت عشق۔ حضرت دعا ڈبائیوی۔
نکہت و یاسمین۔ جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب
تصوّر۔ جناب محمود علی خاں صاحب آہر
اعتراف خطا۔ حضرت فطرت واسطی
لمعات۔ حضرت مولانا اظہر امرتسری
دو جُرعے۔ جنب علی احمد صاحب علی
پردیسی پریتم کا انتظار محترمہ نواب زکیہ سلطانہ صاحبہ

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل شعرا کا بلند پایہ کلام ہے!
زیب عثمانیہ۔ طالوت۔ اندرجیت شرما۔ تنویر نقوی۔ دل محمد فضا۔ آثر صہبائی۔ انعام اللہ خاں ناصر۔ فارغ بخاری۔ لطیف انور گورداسپوری۔ نجم آفندی۔ حافظ غازی پوری۔ راز چاند پوری۔ لطیف فاروقی۔ احمر گورکھپوری۔ رسا ہمدانی۔ طالب باغپتی۔

وغیرہ وغیرہ

اگر آپ
عالمگیر کا یہ معرکہ آرا سالانہ نمبر جو ماہ جون ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا ہے مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کیلئے خریداری قبول فرمالیجئے۔ قیمت سالانہ صرف چار روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک

ڈاکٹر

عالمگیر کے سال بھر کے خریداروں کو دو خاص نمبر ایک دسمبر اور ایک جون میں مفت ملتے ہیں سالانہ خریداری میں بہر حال آپ کا فائدہ ہے
آج ہی سال بھر کیلئے خریداری قبول فرمائیے

5000/
پانچ ہزار روپے کا چیلنج
آجکل نقلی و جعلی عامل حکیموں اور جوتشیوں کی وہ کثرت ہے کہ توبہ ہی بھلی پبلک بھی سمجھ چکی ہے۔ کسی پر اعتبار کرے تو کیونکر۔ جب کسی منشی
یا کلرک یا کاتب یا مدرس کا اپنے پیشہ میں کام نہ چلا تو جھٹ خواہ مخواہ کے پیر عامل یا جوتشی بن بیٹھے۔ ان میں اکثر ایسے بھی
اشتہار باز ہیں جن کو اشتہار کا مضمون لکھنا بھی نہیں آتا پبلک کو ان کی نعافلی کا تب علم ہوتا ہے جب وہ ان کے مضحکہ خیز تعویذ
یا جوتش کو دیکھتی ہے۔ غرضیکہ اس علم و عمل کی اچھی طرح مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ پبلک جس قدر بے اعتباری ظاہر کرے
بجا ہے۔ دعوے سے کہا جاتا ہے کہ ہم نے عرصہ ۲۷-۲۸ سال سے اس علم و عمل کو شہرت دی جس کا ثبوت ہندوستان کے قدیم اخبارات کی فائلوں اور ہمارے پاس لاتعداد تعریفی خطوط
سے ہو سکتا ہے یہ ایسا متبرک پیشہ ہے کہ سوائے نیک نیتی اور راستی کے کبھی فروغ نہیں پا سکتا دعوی سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ جہاں کہیں میرے نام کا ذکر کرینگے انشاء اللہ تعریف کے ساتھ ہی یاد کیا
جائیگا۔ آپ ایکبار ضرور تشریف لاکر آزمائش کریں اگر لاہور آنے سے معذور ہیں تو خط و کتابت جوابی سے مشورہ لے سکتے ہیں اگر کوئی شخص میرے مقابلہ میں اپنے اشتہار کو سچا ثابت کر دے تو
پانچ ہزار روپیہ وصول کر سکتا ہے
یہ روپیہ کسی بنک یا عدالت میں جمع کر دیا جائیگا۔
پس اگر آپ صحیح معنی میں کسی مصیبت یا مشکلات میں ہیں اور مشورہ لینا چاہتے ہیں مثلاً کوئی ایسی بیماری ہے جس پر دوا اثر نہیں کر سکتی حکیم و ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مرض سمجھ میں نہیں آتا
یا کسی نے جادو ٹونہ سحر وغیرہ کر کے مرض لگا رکھا ہے یا کسی مقدمے سے پریشانی ہے یا کسی سے ناچاقی ہے یا کاروبار کمزور ہوتا جاتا ہے یا اولاد نہیں ہوتی یا ہو کر مر جاتی ہے یا امتحان میں کامیابی نظر نہیں
آتی یا ملازمت میں ترقی کے لئے رکاوٹ ہے غرض کوئی بھی دنیاوی یا روحانی تکلیف ہے تو مشورہ لیں۔ فیس مشورہ ایک روپیہ چھ آنے ۱۴
عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب کے متعلق معززین کے ارشادات
دنیا کیا کہتی ہے؟
محترم و معظم عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب۔ السلام علیکم!
میری بیوی عرصہ ایک سال سے بیمار تھی علاج ڈاکٹری و یونانی ہر قسم کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مریضہ کی دونوں ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ میں برادرم
شیر علی صاحب کو ملا اور حالات بتلائے انھوں نے پانچ پتیاں عنایت کیں اور طریقہ استعمال بتلایا۔ کیا عرض کروں پہلی ہی پتی سے
مریضہ کی ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ یہ ایک عملیات کا معجزہ ہے جس نے اس علاقہ میں ہر چہار طرف ان جادو عمل پتیوں کو شہرہ کر دیا۔ میں نے تقریباً پندرہ سو روپیہ
مریضہ پر خرچ کیا تھا اور مایوس ہو گیا تھا۔ مریضہ ہر وقت آپ کو دعائیں دیتی ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں اور میرے حالات کو اگر مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے
چوہدری منظور حسین ذیلدار چک ۳۶ جنوبی براستہ سرگودھا
جناب ہدایت اللہ صاحب گڑھی شاہو ضلع پشاور سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں اٹھ نہ سکتا تھا دوسرا آدمی سہارا دیکر اٹھاتا تھا ہاتھ اور پاؤں کو ازحد درد رہتا تھا آپ
کے علاج عملیات نے یہ صحت بخشی کہ اب دور دور تک چلتا پھرتا ہوں۔
جناب شیخ عبدالقادر صاحب سانگلہ ہل سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں عامل سے ملا دو تین سوالات کئے گئے ان کا بالکل صحیح جواب ملنے پر میں بالکل حیران رہ گیا کسی جوتشی یا عامل
پر یقین نہ رکھتا تھا حکیم صاحب کا علم دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس قدرت نے صحیح علم دیا ہے پس اگر آپ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں مثلاً بیماری پر دوا اثر نہ کرتی ہو حکیم و ڈاکٹر
سے مایوس ہو چکے ہیں یا کسی سے ناچاقی رہتی ہے خواہ مخواہ دشمنی بڑھتی جا رہی ہے یا میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار ہو رہے ہوں یا مقدمہ میں کامیابی چاہتے ہوں تو ضرور ایک
دفعہ تشریف لاکر مشورہ لیجئے۔ فیس مشورہ فی سوال ایک روپیہ بذریعہ وی پی ایک روپیہ چھ آنے ۱۴ خط و کتابت جوابی کریں۔
ملاقات کا وقت:- صبح نو بجے سے ۷ بجے شام تک
ملنے کا پتہ
عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی موہن لال روڈ گنپت روڈ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۱ — نمبر ۳ (5)

فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۹ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا؟

ملاحظات

رسائل و جرائد کے اس ابتذال کے زمانہ میں بھی "عالمگیر" کا علمی و ادبی معیار خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت بلند ہے۔ ادارہ پوری کوشش کرتا ہے کہ عامیانہ مذاق کے مضامین کو رسالہ میں کوئی جگہ نہ دی جائے اور صرف دل و دماغ کو صیقل کرنے والے مقالے۔ وجد آور نظمیں اور پاکیزہ مذاق کے افسانے شایع کئے جائیں۔ ادارہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ اس کا جواب "عالمگیر" کے ہر گزشتہ اور آئندہ شمارہ سے مل سکے گا۔ پرچہ زیر نظر میں "فریب جمہوریت" جناب مودودی کا ایک پر معارف مقالہ ہے جس کا مطالعہ اس آمریت اور جمہوریت کی منازعت کے زمانے میں بہت مفید رہے گا۔ جمیل احمد صاحب کندہاپوری نے مشہور روسی افسانہ نویس چیخوف کے ایک دلچسپ افسانے کا بہت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

ہینز اینڈرسن یورپ کا ایک سحر طراز افسانہ نگار تھا اُس کے مختصر حالات زندگی جناب ربط ہاشمی نے نہایت محنت سے مرتب کئے ہیں" افسانہ محبت" میکسم گورکی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے جس کو سید منظر صاحب کاظمی نے شگفتہ اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

عربی شعرا اور ادباء کے متعلق اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے جناب ارشد صاحب نے عمرو بن کلثوم تغلبی کے حالات لکھ کر دیگر محققین کے لئے ایک مثال قائم کی ہے۔ "طوفان حیات" جناب پروانہ کا بیحد دلچسپ ڈراما ہے۔ ہم جناب مولانا عبدالستار صاحب فاروقی کے ممنون ہیں کہ آپ نے گجراتی زبان کا ایک شاہکار اُردو میں منتقل کر کے قارئین عالمگیر کو گجراتی ادب سے روشناس کیا۔ امیر مینائی کے "طریق اصلاح" پر جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی کا مضمون اُمید ہے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

منظومات کا معیار بھی خدا کے فضل و کرم سے بے حد بلند ہے۔ ہم جناب نواب غازی۔ حضرت مولانا بیتاب شفق رضوی۔ جناب باسط بھوپالی، جناب احمد ندیم قاسمی۔ جناب شمیم۔ جناب اختر ماہ پوری۔ جناب رضوی لکھنوی جناب تیر مارہروی۔ جناب دعا صاحب ڈبائیوی اور دیگر شعرائے کرام کے بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنا کلام فصاحت التیام ہمیں بھیجکر محفل عالمگیر کی رونق کو چار چاند لگائے۔ قلت گنجائش کی وجہ سے بعض شعراء کی نظموں کا صرف انتخاب دیا جا سکا ہے چونکہ دفتر میں نظمیں بہت جمع ہو گئی ہیں اس لئے امید ہے کہ یہ سلسلہ چند ماہ تک اور جاری رہے گا۔

ادارہ

اگر آپ

عالمگیر کا وہ معرکہ آرا سالانہ نمبر جو حال ہی میں شایع ہوا ہے

اور ایک بینظیر خاص نمبر جو عنقریب شایع ہونے والا ہے بالکل

مفت

حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے

عالمگیر اپنے نام جاری کرا لیجئے سالانہ چندہ للعہ؟

"مینجر عالمگیر"

[illegible]

آئندہ شمارہ (ماہ ستمبر) کے چند خاص مضامین

اُردو قصیدہ ——— (ادب)

اُردو قصیدہ کے فروغ میں سوداؔ اور ذوقؔ کا حصہ - ایک معلومات آفریں مقالہ
از جناب ابومسلم صاحب صدیقی بدایونی بی - اے علیگ

پیاس ——— (افسانہ)

فلسفہ آمیز دلچسپ افسانہ از جناب ڈاکٹر اے ڈی فردق صاحب -

برطانی مدبّروں کے رُومان (عشق و محبّت)

مشاہیر برطانیہ کے معاشقے - از جناب آفسر صاحب ماہ پوری

وفات غیاث الدین کی تحقیق (تاریخ)

ایک بلند پایہ تحقیقی مقالہ - از جناب عبدالناصر بھاگلپور

رقابت کا کرشمہ ——— (افسانہ)

حیرت انگیز، بیحد دلچسپ افسانہ از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب
خیال مُرادآبادی -

شرابِ تبسّم ——— (مزاحی ڈراما)

ایک تفریحی لاسلکی ڈرامہ از جناب شعلہ وارثی، لکھنوی

جہانگیر کی شاعری ——— (شعر و شاعری)

شہنشاہ جہانگیر کی سخن گوئی پر ایک مختصر مضمون از جناب منظر کاظمی بی - اے آنرز

عورت کی فطرت ——— (افسانہ)

عشق و محبت میں ڈوبا ہوا افسانہ از جناب مظفر بنی صاحب

علاوہ ازیں

ہندوستان کے بلند پایہ شعرا کا کیف پرور تازہ کلام - حکیمانہ مقالے - دلچسپ افسانے وغیرہ وغیرہ

مُستقل خریداروں کو سال بھر میں دو معرکہ آرا شاندار خاص نمبر بھی مفت دیئے جاتے ہیں

آج ہی اپنی فرمائش بھیجدیجئے سالانہ قیمت للعہ مع محصول ڈاک ۴؍

مینجر عالمگیر - لاہور

فریبِ جمہوریت اور ہندوستان

دلچسپ معلومات آفریں سیاسی مقالہ؟

از جناب مودود احمد صاحب فاروقی۔ بچھرایونی

ہندوستانی اپنے علوم و فنون، طرزِ معاشرت اور روایات کو خود اپنے ہاتھوں کھو دینے کے بعد مغرب کی فتح مندیوں اور اس کے روشن اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تخیلات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم یورپ کی ہر صدا پر لبیک کہتے ہیں خواہ وہ آواز ہمارے لئے مفید ہو یا مضر۔ اس کا حقیقی سبب ہماری ذہنی غلامی ہے۔ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے ہمارے دماغ ماؤف اور ہمارے خیالات پست ہو چکے ہیں اور ہماری امنگیں بالکل ختم ہو چکی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہر شعبہ زندگی میں مغرب کی تقلید لازمی ہو گئی ہے۔ ہمارے پیش نظر یورپ کی سیاست ہے اور اسی وجہ سے ہم مغربی جمہوریت کے شیدائی ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی برطانی حکومت کا بار اپنے کاندھوں پر اُتار دینے کے بعد مغربی جمہوریت چاہتے ہیں۔ اس نظام میں ہمیں سب سے بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ عوام کی رائے سے حکومت اور نظام حکومت مرتب ہوتا ہے۔ پبلک اپنے معتمد نمائندے مجالس آئین میں بھیجتی ہے جو ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر قوانین مرتب کرتے ہیں لیکن جب اس کے نمائندے عوام سے وعدہ خلافی یا غداری کرتے ہیں تو وہ اُن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے باوجود اُن کو اس منصب سے اُتار نہیں سکتے۔

سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک مغربی جمہوریت ایک بہترین نظام حکومت ہے لیکن جو لوگ عمیق نظر سے مطالعہ کرتے ہیں وہ اس سے متفق نہیں۔ جمہوری حکومت کے معنی عوام کی حکومت کے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اوّلاً تو خدا تعالےٰ نے عوام میں ہر فرد کو سیاسی مدبر اور مفکر نہیں بنایا۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں میں بہت کم لوگوں کو مصالح حکومت کے سمجھنے کی قوت عطا کی ہے دوسرے عوام کے نمائندے جو مجلس قانون ساز میں جاتے ہیں وہ بیشتر اپنی قابلیت اور ذہانت کے باعث منتخب نہیں کئے جاتے بلکہ اسّی کیا نوّے فیصدی اپنی مقبولیت کی وجہ سے اپنے مقابل کے مقابلے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سیاسی خیالات کا حامل ہے اور قوم کا سچا درد دل میں رکھتا ہے لیکن خاموش اور سمٹی ہوئی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کا مدمقابل جو اس کی نسبت کم تعلیم یافتہ ہے اور سیاست سے اس کو کوئی خاص فطری لگاؤ بھی نہیں ہے لیکن عوام میں کسی سبب سے مقبول اور ہر دلعزیز ہے تو وہ یقیناً اس شخص کے مقابلہ میں جو زیادہ تعلیم یافتہ اور نمائندگی کا اہل ہے بڑی اکثریت سے انتخابی مقابلے میں کامیاب ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نمائندگی کا معیار قابلیت نہیں بلکہ مقبولیت ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر فرد یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کا صحیح نمائندہ کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جہاں کہیں جمہوری نظام قائم ہے وہاں گو اصولاً بادشاہی عام رائے دہندوں کو حاصل ہے لیکن حقیقت میں نظام حکومت ہر جگہ سیاسی مدبّرین کے ایک خاص طبقہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو اپنی لیاقت تحریر و تقریر اور تبلیغ و اشاعت کی بدولت پبلک میں ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیتا ہے اور عوام میں مقبولیت و ہر دلعزیزی حاصل کر کے ان کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے۔ عوام چونکہ خود سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اس لئے لامحالہ اخباروں کے ایڈیٹروں اور چھوٹے چھوٹے لیڈروں کے پیش کردہ

پروگرام اور خیالات کو اپنا نصب العین قرار دے لیتے ہیں۔ یہ ایڈیٹر اور چھوٹے لیڈر کسی بڑے لیڈر اور مفکر کے پیرو ہوتے ہیں جو خود کسی بڑی پارٹی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس طرح تمام ملک میں جال پھیلا ہوتا ہے۔ پارٹی کے بڑے لیڈر اپنے خیالات اور خواہشات ایڈیٹروں اور چھوٹے لیڈروں کے ذریعہ عوام پر مسلط کرتے ہیں اور عوام بے چون و چرا بھیڑوں کے گلے کی طرح پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ اصل بادشاہی عوام کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ پارٹی کے ہاتھ میں ہے اور پارٹی خود ایک یا دو لیڈروں کے ہوتی ہے لیکن فریب دہی اور خود فریبی کا یہ اعجاز ہے کہ دکھایا اور سمجھایا یہ جاتا ہے کہ ملک میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عوام کی رائے اور ان کے حکم سے ہوتا ہے۔ حالانکہ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو اسے سمجھا کہ آزادی کی ہے نیلم پری

وہی شخصی حکومت، وہی استبداد وہی فرمانروائی جو دنیا میں ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اب ایک دوسرے بھیس میں جلوہ گر ہے فرق صرف طریقہ اور ذریعہ کا ہے۔ بجائے اس کے کہ ایک بادشاہ یا ڈکٹیٹر ایک فرمان جاری کرے اور عوام کو اس کی اطاعت پر مجبور کرے اب ایک لیڈر ایک رائے، خیال یا پروگرام پیش کرتا ہے۔ اخباروں اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ اسے عوام میں مقبول کرا لیا جاتا ہے۔ پہلے عوام کی اطاعت، طاقت کے خوف سے تھی اب تبلیغ و اشاعت اور خوف کے ذریعہ عوام خود اسے اپنا لیتے ہیں۔ نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے یعنی ایک یا چند اشخاص جو اس کے اہل نہیں وہی حکومت کرتے ہیں عوام چونکہ سیاست اور حکومت کی اہلیت نہیں رکھتے اس لئے وہ محکوم ہوتے ہیں۔ مغربی جمہوریت کی ناکامی کی مثال لیگ آف نیشنز ہمارے سامنے موجود ہے ۱۹۳۰ء میں دنیا کی مختلف طاقتوں اور حکومتوں کے درمیان عالمگیر برادری خوشگوار تعلقات، اور امن قائم رکھنے کی غرض سے لیگ آف نیشنز کا انعقاد عمل میں آیا۔ دنیا کو توقع تھی کہ اتنے زبردست جمہوری نظام کی بدولت اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کچھ عرصہ کے لئے ضرور دنیا میں امن قائم ہو جائے گا اور یہ انجمن متنازعہ فیہ مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگی لیکن دنیا نے جلد دیکھ لیا کہ یہاں بھی طاقتور اقوام کا تسلط ہے اور کمزور بُری طرح پیسے جاتے ہیں۔ حبشہ، آسٹریا، چین، چیکوسلواکیہ کی مثالیں آپ کے پیش نظر ہیں۔

مغربی جمہوریت فرقہ پرستی اور گروہ بندی کو ترقی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان میں صرف ایک ہی مذہب اور قوم آباد ہو اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو کیا آپ کو یقین ہے کہ ملک کا ہر فرد خوش اور مطمئن نظر آئیگا۔ کبھی نہیں، جمہوری نظام کے ساتھ ہی ساتھ ملک میں مختلف جماعتیں قائم ہو جائینگی۔ سرمایہ دار مزدوروں سے اور اعتدال پسند انتہا پسندوں سے اور قدامت پسند انقلاب پسندوں سے برسرپیکار نظر آئیں گے۔ حکومت کیا ہوگی؛ اچھا خاصہ میدان کارزار ہوگا۔ جو جماعت برسر اقتدار آئیگی وہ اپنے مخالف کو کچلنے اور تباہ کر ڈالنے کی سعی میں مصروف رہے گی۔

ہندوستان میں عالمگیر جہالت کے باعث آج بھی فرقہ پرستی، توہم پرستی اور قدامت پرستی کا دَور دَورہ ہے۔ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل آریوں کے زمانہ میں ہندوستان کے باشندوں کی چار فرقوں پر تقسیم کی گئی تھی وہ تقسیم اب سیکڑوں فرقوں تک ترقی کر گئی ہے جس طرح آریوں کے زمانے میں آریہ مذہب، قوم اور نسل کے لوگ دوسروں کو ناپاک اور نجس سمجھتے تھے اسی طرح آج بھی انسان انسان کے نزدیک ناپاک اور نجس ہے۔ اس انسانی تفریق نے بغض و حسد، بدنیتی، بے ایمانی اور تنگ نظری کو برادران وطن کے اخلاق و عادات کا جزو بنا دیا ہے۔ فرقہ پرستی کا مظاہرہ انتخابی مقابلہ میں نظر آتا ہے رات دن کے مشاہدات ہیں کہ اُمیدوار کو ووٹ صرف ذات پات کی تمیز پر دیئے جاتے ہیں۔ اگر جاٹ اور برہمن کا مقابلہ ہے تو جاٹ برادری قطع نظر اس کے کہ اس کی برادری تعلیم یافتہ ہے یا نہیں یا جس ادارہ کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو رہا ہے وہ اس کا اہل بھی ہے یا نہیں چونکہ نمائندہ جاٹ ہے اس لئے اس کی برادری اُس کی ہم نوا ہوگی اسی طرح برہمنوں کے پیش نظر امیدوار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ ان کا نمایندہ ایک برہمن ہے خواہ وہ اچھی طرح واقف ہوں کہ دوسرا امیدوار جو برہمن قوم کا نہیں ہے وہ برہمن امیدوار کی نسبت ہر حیثیت سے زیادہ لائق اور قابل ہے اور خواہ وہ یہ بھی سمجھتے ہوں کہ برہمن نمایندہ اپنی کم علمی اور سیاسی ناواقفیت کی بنا پر نہ ہندو مذہب اور نہ برہمن قوم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے لیکن فرقہ پرستی اُن کو مجبور کرے گی کہ ایک لائق امیدوار کے مقابلے میں ناکارہ کا انتخاب کریں فرقہ بندی کی لعنت ابھی کئی صدی تک ختم ہونے والی نہیں کیونکہ ہمارے

ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت یعنی آل انڈیا کانگریس جس کی نسبت دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام بڑی سے بڑی انجمنوں سے زیادہ ممبر اس انجمن کے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی سیاست کے "ناخدا" اور ہندو قوم کے "دیوتا" مسٹر گاندھی آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل کی تہذیب دیکھنا چاہتے ہیں اور بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ میں رامائن اور مہابھارت کا زمانہ دوبارہ ہندوستان میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس قوم اور اس کے لیڈروں کی تنگ نظری کا یہ عالم ہو وہ جمہوریت کی کیسے دعویدار ہو سکتی ہے۔

ہماری تعلیمی پستی کا یہ عالم ہے کہ صرف ۷ فیصدی خواندہ ہیں اور باقی ۹۳ فیصدی وہ لوگ ہیں جو اپنے دستخط کرنے سے بھی عاری ہیں ان سات فیصد میں ایک فیصدی بھی ایسے نہیں جو جمہوریت کے صحیح معنوں میں واقف ہونگے۔ ایک عرصہ سے بلدیات کو آزادی اور خود مختاری حاصل ہے میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات ہر چوتھے یا پانچویں سال عمل میں آتے ہیں لیکن اس کے باوجود لوکل باڈیز (بلدیات) کے رائے دہندوں میں بڑی اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان اداروں کا کیا کام ہے؟ اور ہماری نمائندگی ہم کو کیا فائدہ پہنچاتی ہے البتہ انتخابات کے زمانہ میں یہ سن لیتے ہیں کہ فلاں روز ووٹ دیئے جائینگے۔ کیونکہ ہندوستانی ابھی تک اپنے ووٹ کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں اس وجہ سے یہ لوگ انتخابات میں رائے دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ووٹ کی خرید و فروخت کا نیا بازار مستقل طور پر قائم ہو گیا ہے۔ الیکشنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رائے دہندہ بڑی خوشی سے اپنی قیمتی رائے اور شہری حقوق جن کے حاصل کرنے کے لئے ملک نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں صرف چند پیسوں کے عوض فروخت کر ڈالتے ہیں۔

ہمیں اپنی میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ان اداروں کو عرصہ سے آزادی مل چکی ہے اور ان اداروں میں عوام کے نمائندے ہی منتخب ہو کر جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کا انتخاب رشوت، فریب، ذاتی تعلقات، شخصی عناد، اور گروہ بندی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اس لئے قدرتاً منتخب ہونے کے بعد ان کا ہر فعل اور عمل رشوت، فریب، ذاتی تعلقات، شخصی عناد اور گروہ بندی پر مبنی ہوتا ہے۔ شہر یا ضلع کے مفاد سے کسی کو بحث نہیں ہوتی اور ہو بھی کیوں؟ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج

پھر جب ہر ممبر کا ہر فعل خود غرضی اور گروہ بندی پر مبنی ہوگا تو دوسرے ممبروں سے تصادم لازمی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر بورڈ میں باہم نبرد آزمائی رہتی ہے آج ایک پارٹی نے صدر کے متعلق عدم اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا تو کل دوسری پارٹی نے اسی سلسلے میں متعدد جگہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑتی ہے کیونکہ اکثر اوقات کشت و خون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

دوسری سبق آموز بات یہ ہے کہ جب ہر ممبر لالچ یا گروہ بندی میں گرفتار رہو تو جو پارٹی یا گروہ بنیں گے انھیں استقلال نصیب نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہی ممبر جس نے آج ایک صدر کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس کر کے دوسرے کو منتخب کیا ہے چند گھنٹے کے اندر اندر زیادہ لالچ سے متاثر ہو کر دوسری پارٹی میں پہنچ جاتا ہے اس طرح ہر برسر اقتدار جماعت ہر وقت اپنے زوال کے خوف میں رہتی ہے اور مخالف شب و روز ریشہ دوانیوں میں مصروف، اس ناپاک ماحول میں ملک اور پبلک کے تمام کام انتہائی ابتری میں پڑے رہتے ہیں۔ بڑے سے بڑے کارپوریشن سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ ٹاؤن ایریا تک کوئی ادارہ اس لعنت سے پاک نہیں رہتا اب تو یہ وبا اسمبلیوں تک پھیل چکی ہے۔ بنگال اسمبلی کے چند ممبروں اور سندھ اور آسام کے کل وزراء کا ہر روز ایک طرف سے دوسری طرف آتے جاتے رہنا سب نے دیکھا ہے۔

ان سب باتوں کا اثر عوام کے اخلاق پر پڑتا ہے اور یہ گندگی اچھے اچھے لوگوں کو آلودہ کر دیتی ہے۔ یہ خانہ جنگی صرف پارٹی یا ممبران کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے اعزا دوستوں اور ہمدردوں پر بھی دیوانی اور فوجداری مقدمات چلائے جاتے ہیں اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے نقصان رسانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح جو پارٹی برسر اقتدار ہے وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے رشوت، لالچ اور جاہ و منصب کی تقسیم کو دور دور تک پھیلاتی ہے اور اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ اس وبا کے زہریلے اثرات ملک کے ہر باشندے اور قوم کے ہر فرد میں سرایت کر چکے ہیں۔ فضا مسموم ہو چکی ہے آوا کا آوا ہی بگڑ گیا ہے اگر خال خال نیک نیت اور دیانت دار لوگ کہیں موجود بھی ہیں تو وہ ان انتخابات میں حصہ لینے سے گریز کرتے ہیں اور اگر کوئی پھنس جائے تو وہ بددل، مایوس، اور متفکر ہو کر واپس آجاتا ہے۔ یا خود بھی

اس کا شکار ہو جاتا ہے۔

اگر یہی بیل ونہار رہے تو اس ملک کا خدا حافظ جو وبا بلدیات تک محدود تھی وہ اب اسمبلیوں کے ذریعہ ملک کے نظم ونسق میں پھیل رہی ہے۔ بدنظمی اور کشت وخون ہر صوبہ میں نمودار ہو چکا ہے۔ ستیہ گرہ اور اہنسا کے اصول جو ہر مرض کی دوا سمجھے جاتے ہیں ملک کے لئے بلائے جان ثابت ہو رہے ہیں۔ انجن کے آگے لیٹ جانا۔ ہوس اور عشق پرستی کے لئے بھوک ہڑتال کرنا اپنی ناجائز اغراض کی خاطر دوسروں کو مجبور کرنے کے لئے ستیہ گرہ کرنا روزمرہ کے معمول ہو گئے ہیں۔ اس سے حق وباطل کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ صحافت کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔ جب سے تبلیغ واشاعت کی قوت کا احساس ہوا ہے جو بات زیادہ حق کے خلاف ہو اس کے لئے اتنا ہی پروپگنڈا کیا جاتا ہے اس سب کا تجربہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نقصان ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتے ہوتے بالآخر غریب جاہل بے زبان عوام ہی کے حصہ میں آتا ہے جن کی بہبودی کے گیت گائے جاتے ہیں۔

اوّل تو مغربی جمہوری نظام کے مفید ہونے میں خود یورپ کے مفکّرین کو بھی کلام ہے۔ پھر مشرق میں اس کی کامیابی تو بالکل مشتبہ ہے لیکن ہندوستان کے لئے موجودہ حالات میں جن کا مختصر سا خاکہ اس وقت پیش کیا گیا ہے اس نظام کی توقع رکھنا خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے ہر خیر خواہ ملک کو لازم ہے کہ اس کا نعم البدل تلاش کرے۔

پریشان تلاش

از محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

صناع قدرت نے صفحہ کائنات پر رنگین نقش ونگار بنا دیئے تھے۔ زرد رُو شاہ خاور آہستہ آہستہ جانب افق بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دنیا تاریک ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد چادر فلک پر ستارے شکستہ ہار کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ چاند ستارے میں نے سب کی روشنی دیکھی لیکن کسی میں اضطراب نہ تھا۔ میں اپنے خیال میں غرق نہ جانے کہاں اور کس کی تلاش میں اور کدھر جا رہی تھی۔ بھٹکتی بھٹکتی صحرا کی طرف جا نکلی۔ وہاں ایک شمع جل رہی تھی جس میں تڑپ تھی۔ سوز تھا۔ شاید وہ بھی میری طرح کسی کے انتظار میں گھُل رہی تھی۔ مجھے وہاں بھی سکون حاصل نہ ہوا۔ پھر میری متلاشی نگاہیں نیلگوں آسمان کی جانب اٹھیں اور ایک روشن مقام پر پہنچکر ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ میری زندگی کے پرسوز اور عبرت انگیز فسانے نے کچھ دیر کے لئے فضائے آسمانی کے آزاد دلرباؤں کو کچھ دیر کے لئے متحیر کر دیا۔ قمر کے حسین روشن چہرے سے افسردگی اور ملال کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ستاروں کی چمک دمک بھی رفتہ رفتہ ماند پڑ گئی۔ میری پریشان نظریں بدستور آسمان کی بلندیوں میں ادھر اُدھر سرگرداں تھیں، میرا بربط غم مضراب سوز سے یہ غم انگیز نغمہ چھیڑ رہا تھا ؎

کیوں تری نظریں بڑھی جاتی ہیں سوئے آسماں ؎ عرش پر جلوہ نما ہے کیا تری تسکین جاں ؟

کائنات نے کروٹ بدلی۔ دن کے حسین دیوتا کو آتے ہوئے دیکھکر خوبصورت زہرہ شرماکر پردہ فلک میں روپوش ہو گئی جوانان چمن اس کے استقبال کو سروقد کھڑے ہو گئے عروس صبح کے حنائی لباس کی بھینی بھینی خوشبو ہواہیں ملی ہوئی ایک مدہوش محبت کو مست بنانے لگی۔ سوسن مکتب عشق میں نونہالان چمن کو محبت کا اوّلیں درس دینے میں مشغول ہو گئی۔ اب میری مایوس نظریں آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگیں اس عالم وارفتگی میں میری نظریں ایک سُرخ لالہ کے پھول پر جم گئیں جس کی ہر پتی پر مجھے یہ شعر کندہ نظر آ رہا تھا ؎ اپنی حالت کو بدل یہ بھی ہے اک شان تلاش ؎ آخرش کب تک رہیگی تو "پریشان تلاش"۔ (صدیقہ بیگم)

رنگِ شفق

حضرت علامہ شفق رضوی عماد پوری

ایک نیا خطاب دیں حسن کی ہر ادا کو ہم
پیار کہیں ستم کو ہم لطف کہیں جفا کو ہم

کہتے کچھ اپنا مدعا کرتے کچھ اُس سے التجا
نام سنا جو بے نیاز بھول گئے دعا کو ہم

اس سے زیادہ اور کیا مرنے کا حق کریں ادا
اپنی قضا سمجھتے ہیں آپ کی ہر ادا کو ہم

ملتا ہے کون کس کو اب وقت سے پہلے دیکھیے
ڈھونڈتی ہے قضا ہمیں ڈھونڈتے ہیں قضا کو ہم

لائی ہے بھینی بھینی بو اُس کے قبائے ناز کی
لیکے بلائیں بار بار پیار کریں صبا کو ہم

ذوقِ ستم تو ہے تجھے شوقِ ستم نہیں سہی
تیری جفا کے ڈر سے کیا چھوڑ دیں اب وفا کو ہم

اور قصور کچھ نہیں اتنے قصوروار ہیں!
اُس کی عطائیں دیکھکر بھول گئے خطا کو ہم

ناؤ بھنور میں آچکی دے چکا ناخدا جواب
بیٹھے ہیں کس کی آس پر یاد کریں خدا کو ہم

ساز ہیں اُس کے سوز ہے سوز میں اک گداز ہے
دینگے ترانۂ شفق مطربِ خوشنوا کو ہم

اُس کی موت کا سبب

روسی افسانہ نویس چیخوف کا افسانہ

از جناب جمیل احمد صاحب بی۔ اے کندھاپوری

ایک روز شام کے وقت "ایون چرکاف" جو ایک معمولی سرکاری ملازم تھا تھیٹر کے اندر دوسری قطار میں بیٹھا اپنی عینک کی مدد سے ڈراما دیکھ رہا تھا اور اس کی دلچسپیوں میں کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ اس وقت خود کو "فردوس مسرت" کے ساتویں طبقے میں بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ مگر اتفاقاً (کہانیوں میں قارئین اکثر اس لفظ اتفاقاً سے دوچار ہو جایا کرتے ہیں! مصنفین بجا کہتے ہیں زندگی عبارت ہے اتفاقات سے) اس کے چہرے پر شکنیں پیدا ہوئیں۔ آنکھیں چکرانے لگیں اور اس نے اپنا سانس روک لیا۔۔۔ عینک اُتار کر وہ آگے کی جانب جھکا اور۔۔۔

آ۔۔۔۔آ۔۔۔۔ آچھیں!!۔۔۔ وہ زور سے چھینکا! چھینکنا کسی جگہ ممنوع تو ہے نہیں؛ کسان چھینکتے ہیں۔۔۔۔ محکمہ پولیس کے افسر اعلیٰ چھینکتے ہیں۔۔۔۔ ہائی کورٹ کے جج چھینکتے ہیں۔۔۔ غرض کہ سبھی چھینکا کرتے ہیں۔ چرکاف اپنی چھینک سے مطلق نہ گھبرایا۔ اپنی ناک اس نے رومال سے صاف کر لی اور اس کا اطمینان کر لینے کے لئے کہ اس کے اس فعل سے کسی کو تکلیف تو نہ پہنچی، اس نے نہایت مہذب طور پر اپنے اردگرد ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا شروع کی، اور وہ سخت شرمندہ ہوا جب اس نے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص جو اگلی قطار میں بیٹھا تھا نہ صرف دستانوں کی مدد سے اپنی گردن اور اپنا چندلا سر ہی صاف کر رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ چرکاف نے یکایک پہچان لیا وہ ضعیف شخص جنرل برزلاف تھا۔ شہر کا سب سے مشہور و معروف اور باعزت فوجی افسر۔

"میں نے اس پر چھینک ماری۔" چرکاف نے دل ہی دل میں سوچا "اگرچہ وہ میرے محکمہ کا افسر نہیں پھر بھی مجھے ایسا نہیں چاہئے تھا۔ مجھے ضرور معافی مانگ لینی چاہئے۔"

اُس نے یہ سوچ کر گلو خلاصی کی اور پھر ذرا آگے بڑھ کر جنرل سے سرگوشیوں میں کہا۔ "جناب! میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ نادانستہ طور پر آپ پر چھینک دی۔"

"کوئی مضائقہ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں۔"

"خدا کے لئے مجھے معاف فرما دیجئے۔ میرا مطلب ہرگز آپ کو ۔۔۔"

"اوہو! ۔۔۔۔۔ براہ کرم بیٹھ جائیے۔ ذرا سننے تو دیجئے کہ اسٹیج پر کیا مکالمہ ہو رہا ہے۔"

چرکاف گھبرا کر بیٹھ گیا۔ اور ذرا احمقانہ طور پر مسکرا کر اسٹیج کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ مگر اب تماشا سے اس کو کسی قسم کی مسرت حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ فکر و پریشانی نے اس کو ستانا شروع کر دیا تھا۔

وقفہ (انٹرول) کے بعد جب جنرل ہال میں داخل ہوا تو چرکاف پیچھے سے لپک کر اس کے ساتھ ہو رہا اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر بڑبڑایا۔

"جناب عالی! میں نے آپ پر چھینک دی۔ مجھے معاف فرما دیں۔ آپ جانتے ہیں میں نے یہ حرکت دانستہ نہیں ۔۔۔"

"اُف! بس بھی کرو! میں تو اسے بھول بھی چکا تھا۔ مگر تم ہو کہ خواہ مخواہ کو وہی رٹ لگائے جاتے ہو ۔۔۔۔" جنرل نے بیزاری کے ساتھ اپنے نچلے لب کو دانتوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"وہ کہتے ہیں کہ میں اسے بھول بھی چکا۔ مگر ان کی آنکھوں سے تو خفگی کے آثار ضرور ہویدا ہیں۔" چرکاف نے جنرل کی طرف دیکھتے ہوئے دل

ہی دل میں غور کیا۔ "وہ مجھ سے اچھی طرح مخاطب بھی نہیں ہوئے۔ میں ضرور ایک بار پھر ان سے معافی مانگ لوں گا کہ چھینکنا فطرت انسانی میں داخل ہے — ورنہ ممکن ہے وہ یہ سمجھنے لگ جائیں کہ میں نے دانستہ طور پر ان پر چھینک دی۔ اگر یہ خیال اس وقت ان کے دل میں نہ بھی پیدا ہوا تو ممکن ہے بعد میں پیدا ہو جائے۔"

گھر پہنچ کر چرکاف نے اپنی نامہذب حرکت کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ مگر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے اس پر زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس کی بیوی پہلے تو ضرور متوحش ہوئی مگر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ جنرل برزلاف اس کے شوہر کے محکمے کا افسر نہیں تو اسے کچھ تقویت سی ہو گئی۔

"پھر بھی تمہیں ان کے پاس جا کر معافی مانگ لینی چاہئے۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "ممکن ہے وہ یہ خیال کریں کہ تمہیں مہذب سوسائٹی کے قوانین سے واقفیت نہیں۔"

"معافی تو میں نے مانگ لی تھی۔ مگر اس کا جواب انہوں نے نہایت عجیب و غریب طریقے پر دیا۔ ... ایک لفظ بھی اطمینان بخش نہ بولے۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ اس وقت گفتگو کا موقع نہ تھا۔"

دوسرے دن چرکاف نے ڈاڑھی بنائی۔ اپنے کپڑے درست کئے اور جنرل کے پاس معافی مانگنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ جونہی وہ اس کے دفتر میں داخل ہوا اس کی نظریں متعدد درخواست دہندوں پر پڑیں جو وہاں قبل سے جمع تھے۔ اور جن کے درمیان جنرل برزلاف بیٹھا اپنے سرکاری کاموں کو انجام دینے میں مصروف تھا۔ متعدد درخواست پیش کرنے والوں سے جب وہ باتیں کر چکا تو اس نے اپنی نگاہیں چرکاف پر جمائیں۔

"جناب کو یاد ہوگا 'کل تھیٹر میں میری چھینک آ گئی تھی — اور نادانستہ طور پر اس کی چھینٹیں آپ پر جا پڑی تھیں — مہربانی فرما کر معاف —!"

"کیسی واہیات باتیں!... بالکل مہمل... میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں —" جنرل نے کہا۔

"یہ مجھ سے اب ٹھیک سے باتیں بھی نہیں کرتے۔" چرکاف نے خوفزدہ ہو کر دل ہی دل میں خیال کیا۔ "یہ تو مجھ سے سخت برافروختہ ہو گئے ہیں مجھے ضرور تمام باتیں پھر ایک بار ان سے کہہ دینی چاہئیں۔"

آخری درخواست کرنے والے سے جب جنرل برزلاف باتیں ختم کر کے اندرونی کمرے میں جانے لگا۔ تو چرکاف اس کے قریب جا کر پھر بڑبڑایا۔

"جناب! اگر میں آپ کو اپنی کو اس سے تکلیف پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں تو صرف اس لئے کہ آپ کو اپنی ندامت اور شرمندگی کا یقین دلاؤں، میں قصداً آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا — جناب کو سمجھنا چاہئے کہ —"

جنرل نے اپنا چہرہ نہایت غضب آلود بنا لیا اور اپنا ہاتھ زور سے ہلا کر کہا۔ "تم صرف مذاق کر رہے ہو۔" اور دروازے کے عقب میں غائب ہو گیا۔

"وہ کہتے ہیں میں اُن سے مذاق کر رہا ہوں۔" چرکاف نے دل ہی دل میں سوچا۔ "مگر خدا جانتا ہے کہ میں ان سے مذاق نہیں کر رہا..... بہرحال وہ اتنے اعلیٰ افسر ہیں اور پھر معافی طلب کرنے کی ہمت میں نہیں کر سکتا۔ اس سے وہ خواہ مخواہ اور بھی رنجیدہ ہو جائیں گے۔ بس ایک خط لکھ کر بھیج دینا ہی مناسب ہوگا۔ مگر میں اب یہاں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو بلاشبہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاؤں گا۔"

گھر کی جانب چلتے ہوئے چرکاف نے ان تمام باتوں پر دل میں غور کیا۔ جنرل کو خط وہ نہ لکھ سکا۔ بارہا غور کرنے کے باوجود بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ اتنے بڑے افسر کو کیا لکھے، مجبوراً اس نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن خود سے ہی جا کر تمام باتوں کی پھر سے توضیح کر دے۔

"کل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جناب کو میں نے تکلیف پہنچائی تھی" اُس نے ڈرتے ڈرتے جنرل سے کہنا شروع کیا جو اس کی طرف استفسارانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ "مگر مذاق کرنے کے خیال سے نہیں جیسا کہ جناب سمجھتے ہیں۔ میں تو فقط معافی طلب کرنے آیا تھا۔ کیونکہ چھینکتے وقت مذاق کا خیال بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ آخر میں اس کی ہمت ہی کس طرح کر سکتا تھا — ؟ مذاق کرنے کے معنی تو یہ تھے کہ اس شخص کی عزت نہ کروں جن کا احترام میرا فرض —"

"جاؤ! دور ہو جاؤ سامنے سے۔ بدمعاش کہیں کے — نکل جاؤ یہاں سے۔" جنرل نے نہایت خشمگیں لہجے میں غضبناک ہو کر کہا۔ غصہ سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا اور چہرہ یکدم سرخ ہو گیا تھا۔

"حضور نے..... کیا فرمایا......؟" چرکاف نے فرط خوف سے

اپنے ہوش و حواس کھوتے ہوئے کہا۔

"بس چلے جاؤ یہاں سے!..... شیطان کے بچے!" جنرل نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

چرکاف کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کو زور زور سے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ دروازے سے لڑھکتا ہوا باہر نکلا اور سڑک پر چلنا شروع کیا۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہولناک ظلمت سی چھا گئی۔ اس وقت نہ اُسے کوئی چیز ہی نظر آتی تھی اور نہ کسی قسم کی اُسے آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ بجنگل وہ رینگتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ اپنی پوشاک تبدیل کئے بغیر صوفے پر دراز ہو گیا —— اور اس کی حرکت قلب یکایک بند ہو گئی۔

مولا مدد دے

از عالیجناب حضرت نواب غازیؔ (ن گوردوا اسپیشل سی۔ پی۔)

درد اکہ جہاں بر سرِ بیداد وستم ہے — اُمیدِ کرم تجھ سے خداوندِ کرم ہے

دنیا میں کبھی شکل مسرت کی نہ دیکھی — خوشیوں کا تصور بھی مجھے صورتِ غم ہے

نظروں سے عیاں ہیں غمِ پنہاں کے مناظر — یہ دیدۂ نمناک ہے یا ساغرِ جم ہے

رخصت ہو مُبادا مری بالیں سے مسیحا — درماں بھی مجھے درد ہے صحت بھی الم ہے

کیا جامہ دری کیجیئے کیا دشت نوردی — ہاتھوں میں سکت ہے نہ ذرا پاؤں میں دم ہے

نقشہ ہے وطن میں بھی غریب الوطنی کا — شام آج عرب میں ہوئی کل صبحِ عجم ہے

یارب کہیں پھوٹ بہیں پاؤں کے چھالے — صحرائے مغیلاں میں یہ پہلا ہی قدم ہے

ہے ہے نہ تجھے دیکھ سکی عقلِ مبصر — بیدارئی ادراک نہیں خوابِ عدم ہے

پتھر سے بنالی تری تصویرِ خیالی — دل محوِ صنم ہے گو جبیں پیشِ صنم ہے

سر تن سے جدا کر، کہ نوازا زرہِ شفقت — سر یوں بھی ندامت سے گنہگار کا خم ہے

تو زاہدِ کم بیں نہیں دانائے جبلت — کیوں جرمِ محبت تری نظروں میں اہم ہے

ہر چند کہ بدبخت ہوں مقہورِ قضا ہوں — میں بندۂ سرکار ہوں کیا ناز یہ کم ہے

اغیار میں اپنوں کی اگر لاج نہ رکھی — پھر کس کیلئے میرے خدا لطفِ اتم ہے

سجدوں سے مٹادوں تو سہی لوحِ مقدر — واللہ ترے بابِ اجابت کی قسم ہے

خونابۂ غازی سے نگارش ہے بروسند
گل کاریٔ خامہ ہے نہ اعجازِ قلم ہے

ہینز اینڈرسن

یورپ کا ایک سحر طراز افسانگار

از جناب ربط ہاشمی صاحب فاضل ادب

۱۸۰۵ء کے اوائل میں ڈنمارک کے ایک خوبصورت جزیرہ "فونن" کے چھوٹے سے شہر "اوڈنس" میں ہینز اینڈرسن پیدا ہوا۔

اس کا خاندان افلاس و نکبت اور عسرت و تنگدستی کا شکار تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں سب کے سب رہتے، بیٹھتے، کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔ ہینز بچپن ہی سے بڑا حساس کھرا اور زندہ دل واقع ہوا تھا اسے اپنے چھوٹے سے گھر سے حد درجہ الفت تھی۔ وہ لکھتا ہے "ایک چھوٹا سا خوشنما کمرہ تھا۔ اس کے ایک جانب بنچ تھی جس پر جوتوں کے اوزار اور دیگر ضروری سامان پڑا رہتا تھا۔ دوسری جانب میرا بستر تھا جو میرا واحد مسکن تھا۔ ایک گوشہ میں ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر کتابیں اور موسیقی کا سامان رکھا رہتا تھا۔ کمرہ میں ہر جانب تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرہ کے برابر ہی ایک بہت چھوٹا باورچی خانہ تھا جس میں تیل اور چینی کے برتن پھیلے رہتے تھے۔ مکان سے ملا ہوا ایک باغیچہ تھا اس میں میری ماں ترکاریاں اور سبزیاں بویا کرتی تھی۔ کمرہ کی صفائی اور پاکیزگی کا خیال میری ماں کو بہت تھا۔ وہ ہمیشہ کمرہ کی ہر چیز کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ میری کل کائنات بس یہی تھی اور میری زندگی اسی چھوٹی سی دنیا میں محصور تھی۔"

ہینز کا باپ ایک غریب موچی تھا لیکن بلا کا ذکی اور فطرت شناس اپنے ننھے بچے کی ذکاوت اور فہم دیکھ کر وہ حتی المقدور اس کی ترقی و اصلاح کا خیال رکھتا تھا۔ اتوار ہی ایک ایسا دن تھا جس روز اسے فرصت نصیب ہوتی تھی۔ اس دن وہ اپنے ننھے ہینز کو ہرے بھرے جنگلوں میں لے جاتا اور اس کو تھیٹر کے کھلونے بنا بنا کر دیتا۔ افسانوں کی کتابوں سے قصے پڑھ پڑھ کر سناتا۔ اس طرح ننھے ہینز کا دل افسانوں کی طرف مائل ہوتا تھا۔

ہینز کو کھیل کود سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس کے دو تین ہی ساتھی تھے جن کے ساتھ وہ بعض وقت کھیلا کرتا تھا۔ وہ اپنے اوقات کو اکثر اپنے والدین یا دادی کی صحبت میں گذارتا تھا۔ اس کی دادی اُسے ہمیشہ پریوں اور جنوں کے خوفناک قصے سنایا کرتی یہاں تک کہ کبھی کبھی چھوٹے ہینز پر کچھ ایسی وحشت و ہیبت طاری ہو جاتی کہ وہ شام کے بعد گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالتا تھا۔

جب وہ کچھ سیانا ہوا تو اس کا باپ اُسے ایک دو بار تھیٹر لے گیا۔ دو تین کھیل دیکھنے کے بعد اس کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ لیکن وہ بہت غریب تھا اس لئے اپنی خواہش کے مطابق تھیٹر نہیں دیکھ سکتا تھا شوق کا یہ حال تھا کہ وہ تھیٹر کے اشتہاروں کو جمع کرتا اور کھیل کے نام کی مناسبت سے گھر پر ڈراما تیار کرتا۔ پھر لکڑیوں کی مختلف گڑیوں کو طرح طرح کے کپڑے پہنا کر مختلف کریکٹر کے لئے مخصوص کر لیتا اور اس طرح وہ اپنا تھیٹر خود ہی کر کے پھولا نہ سماتا۔ اس کے شوق کے ساتھ ساتھ اس کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

باپ کی وفات

نپولین اعظم اس وقت یورپ کی جنگ میں مشغول تھا۔ اس کی صولت و سطوت اور جنگی کارناموں سے سارا یورپ تھرا رہا تھا۔ ہینز کا باپ نپولین کے کارناموں کو سن کر اس کا دل سے مداح تھا اس کی تمنا تھی

کہ وہ بھی میدان کارزار میں اپنی شجاعت و بہادری سے دشمنوں کو شکست پر شکست دے اور اس طرح اس کی دلاوری و جوانمردی کا شہرہ تمام ملک میں پھیل جائے ساغر کار وہ فرانسیسی فوج میں داخل ہوگیا اور میدان جنگ میں لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی وہ کسی لڑائی میں شریک بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بیمار ہوگیا۔ اس کی علالت روز بروز ترقی پر تھی یہاں تک کہ وہ گھر لوٹ آیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اس دنیا سے چل بسا۔

باپ کی موت کے بعد

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ہینز بالکل تنہا رہ گیا۔ ماں کپڑے دھونے باہر چلی جاتی اور یہ دن دن بھر گھر میں اکیلا بیٹھا اپنے خود ساختہ کھلونوں سے کھیلتا یا ڈراموں کے مطالعہ میں وقت صرف کرتا۔ جلد ہی اس نے شیکسپیر اور دوسرے مشہور ڈرامہ نویسوں کے پورے ڈراموں کو زبانی یاد کرلیا۔ وہ نہایت ہی خوش گلو تھا۔ اپنی خوش الحانی کے باعث وہ جلد ہی شہر بھر میں مشہور ہوگیا۔ بڑے بڑے امرا اس کے ترنم ریز الحان کے مداح ہوگئے اور اس طرح وہ امیروں کے لئے سامان تفریح بن گیا۔ گاہے گاہے شہر کے دولتمند اس کو اپنے یہاں مدعو کرتے اور اس کا گانا سن کر بہت زیادہ محظوظ ہوتے۔

بایں ہمہ اس کے پڑوسی اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور اس کے تمام افعال کو عبث و بے سود تصور کرتے اور اکثر اس کی ماں سے کہتے کہ وہ کیوں اس طرح اپنے لڑکے کی زندگی کو تباہ کررہی ہے اور اسے کسی کام پر کیوں نہیں لگا دیتی۔ ماں اگرچہ ہینز کی تمام دلچسپیوں سے قطعاً ناآشنا تھی پھر بھی چونکہ وہ اسے بہت چاہتی تھی اس لئے اپنے لخت جگر کی شادمانی میں مخل انداز ہونا پسند نہ کرتی تھی۔

ہینز زیادہ عرصہ تک سکول میں تعلیم حاصل نہ کرسکا اسکول میں سب لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ چھٹی ہوئی اور ہینز کے پیچھے لڑکوں کی ایک ٹولی چلی۔ "وہ ڈراما نویس صاحب تشریف لے جارہے ہیں۔" سب چلا چلا کے کہتے اور ہنستے تھے۔ ننھا ہینز جب تک اس مذاق و تمسخر سے تنگ آکر رونے نہ لگتا اس وقت تک لڑکے اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔

ہینز کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو اس کی ماں بار بار اس سے تقاضا کرنے لگی کہ وہ کوئی کام کرے۔ ماں اسے درزی کا کام سکھانے کی غرض سے کسی درزی کے پاس بھیجنا چاہتی تھی۔ لیکن ہینز کی طبیعت کا رجحان قطعاً ان چیزوں کی طرف نہ تھا۔ وہ کوپن ہیگن جانے کے لئے بڑا ہی مضطرب تھا کیونکہ وہ اس شہر کو دنیا کا عظیم الشان شہر خیال کرتا تھا۔ آخر اس نے اپنی ماں سے اپنا ارادہ ظاہر کر ہی دیا۔

"وہاں جاکر آخر تم کیا کروگے؟" ماں نے پوچھا۔

"میں ایک بڑا آدمی بنوں گا۔" ہینز نے جواب دیا۔ "انسان کو پہلے بڑی بڑی مہیب اور خاردار وادیوں سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے اور پھر بڑے بڑے مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے پھر ان تکالیف و آلام کے بعد وہ ایک بڑا آدمی بن جاتا ہے۔"

بیٹے کے اس تشفی بخش جواب کے باوجود ماں کو اپنے نور چشم کی جدائی شاق تھی وہ رضامند نہ ہوئی۔ لیکن ہینز کا عزم استوار اور ارادہ پختہ تھا اسے اپنی کامیابی پر پورا بھروسہ تھا کیونکہ اس کو ہزاروں ڈرامے زبانی یاد تھے۔ خوش گلو بھی تھا پھر اسے کامیابی کا کیونکر یقین نہ ہوتا وہ ایکٹر بننے کا فیصلہ کرچکا تھا اور ماں سے مصر تھا کہ وہ اس کو جانے کی اجازت دیدے۔

وطن سے روانگی

بیٹے کے پیہم اور متواتر اصرار سے ماں کو اجازت دینی پڑی۔ پردیسیوں نے لاکھ سمجھایا کہ تو دیوانی تو نہیں ہوگئی جو اتنے چھوٹے بچے کو اتنے بڑے اجنبی شہر میں بھیجتی ہے۔ جہاں پر کوئی اس کا شناسا نہیں۔" تاہم وہ اپنے ہینز کی خواہش کو رد نہ کرسکی۔ ہینز نے ایک سفارشی خط کوپن ہیگن کی ایک مشہور رقاصہ کے نام حاصل کرلیا اور وہ خط اور چند کپڑوں کی گٹھری لیکر کرایہ کی گاڑی میں گھر سے چل پڑا۔

ماں سے جدا ہوتے وقت ہینز کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ماں سے رخصت ہوا۔ لیکن یہ کیفیت اس پر زیادہ دیر تک طاری نہ رہی۔ اس کا دماغ کچھ ہی دیر بعد مستقبل کی درخشانیوں میں محو ہوگیا۔ تبسم اس کے لبوں پر کھیلنے لگا۔ اور بشاشت اس کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ وہ اس سفر کی داستان خود ہی لکھتا ہے۔

"شاہ خاور اپنی تابناک کرنیں عالم پر بکھیر رہا تھا۔ دوپہر کا سہانا

وقت تھا۔ میں اپنی روحی تمناؤں کی منزل مقصود کی طرف گامزن تھا۔ مسرت
کی ہلکی ہلکی لہریں میرے قلب میں اُٹھ رہی تھیں۔ انھیں خیالات میں محو میں
نیو برگ (Nyborg) پہنچا وہاں سے جہاز پر سوار ہوا۔ جہاز جب ساحل
سے روانہ ہوا تو اس وقت صحیح معنوں میں مجھے احساس ہوا کہ اس وسیع و عریض
عالم میں خدا کے سوا میرا کوئی معاون و مددگار نہیں۔"

"جب میں ساحل زیلینڈ (Zealand) پر اترا تو میری طبیعت
بڑی اُداس اور غمگین تھی۔ ساحل کے متصل ہی ایک بڑا تناور سایہ دار درخت
تھا۔ میں نے اس درخت کے تلے دو زانو ہو کر خدا سے بڑے خضوع و خشوع کے
ساتھ دعا مانگی کہ وہ میری ہر حال میں امداد کرے اور میرے عزم میں استقامت
بخشے۔ اس دعا سے مجھے بڑی تسلی ہوئی اور میری ہمت دوچند ہو گئی۔ میں پھر
اپنے خدا پر بھروسہ کر کے وہاں سے ایک کرایہ کی گاڑی پر چل پڑا جو مسافروں کو
دارالسلطنت کوپن ہیگن تک لے جاتی تھی۔"

متواتر ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد وہ کوپن ہیگن پہنچا
شہر کی سربفلک عمارتوں، دیدہ زیب مناظر خوشنما دو رویہ دکانوں نے ہینز کو
ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ پھر بھی یہ چیزیں ہینز کے ننھے دل کو اپنی جانب مائل
نہ کر سکیں۔

یکہ و تنہا، اجنبی و غریب الوطن ہینز نے سیدھے تھیٹر کی طرف رُخ کیا،
اس کی جیب میں اس وقت صرف دس ڈالر بچ رہے تھے اس نے تھوڑا
سا کھانا خریدا اور کھا کر سو رہا۔

پہلی ناکامی؟

دوسری صبح اس نے اپنی بہترین پوشاک زیب تن کی اور سیدھا
اس مشہور رقاصہ کے گھر کی جانب چل پڑا جس کے نام گھر سے ایک خط لایا تھا وہاں
پہنچ کر اُس نے رقاصہ کے پاس خط بھیجا لیکن اس کی حسرت و یاس اور غم و
اندوہ کی کوئی حد نہ رہی جبکہ اس رقاصہ نے ذرا بھی ہینز کے ساتھ ہمدردی
کا اظہار نہ کیا۔

یہ پہلی ناکامی تھی جو ہینز کو پیش آئی وہ اس سے دل برداشتہ نہ ہوا،
اور وہاں سے وہ تھیٹر کے منیجر کے پاس پہنچا مگر افسوس کہ اس نے بھی غریب الوطن ہینز
کی دلجوئی نہ کی بلکہ کسی قسم کی معاونت سے صاف انکار کر دیا۔

ان ناکامیوں نے اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ
کی بلکہ اس نے اپنی پوری طاقت و قوت سے سختیوں کا مقابلہ کرنے کی قسم
کھائی۔ اس کے پاس اب ایک پیسہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ گھر
واپس جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ناکامی کی صورت میں اُسے
پڑوسیوں کے طعن و ملامت کا نشانہ بننا پڑے گا۔

اُمید کی جھلک اور مشکلات کا مقابلہ

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے بعد بھی اسے یقین کامل تھا کہ ایک
روز وہ ضرور کامیاب ہو جائیگا۔ کچھ دنوں بعد اسے ایک مشہور شاعر گلڈبرگ
(Guldberg) کے متعلق معلوم ہوا اس کے دل میں اُمید کی ایک
دُھندلی سی شعاع پیدا ہوئی وہ گلڈبرگ سے ملنے گیا۔ اس مرتبہ اسے ناکامی
نہیں ہوئی۔ نیک طبیعت شاعر نے اس کو بڑی شفقت و محبت کے ساتھ بٹھلایا
فطرت شناس شاعر نے کمسن ہینز کی پیشانی میں سب کچھ پڑھ لیا۔ اُس نے
ہینز کو نصرت و امداد کا یقین دلایا اور ہینز کی مالی امداد کرنے لگا۔ بلکہ اس کے
تمام مصارف کا کفیل ہو گیا۔ شاعر نے چند سبق بھی ہینز کو دیئے کہ وہ انھیں یاد
کر لے۔ شہر کے چند عمائد سے بھی تعارف کرایا وہ لوگ ہینز سے مل کر بہت
مسرور ہوئے۔ اور اس غریب لڑکے سے دلچسپی لینے لگے۔

ان لوگوں نے ہینز کی تعلیم کا بہت معقول انتظام کر دیا۔ اور ڈینش
لاطینی، اور جرمن زبانوں کی تعلیم دلانی شروع کی۔ کبھی کبھی اسے رقص و سرود
کے اسباق بھی یاد کرنے کو ملتے تھے۔ اس طرح ہینز شب و روز تعلیمی مشاغل
میں مصروف رہتا۔ بعض اوقات اسے افلاس و تنگدستی کے ہاتھوں مصائب
کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہ خندہ جبینی سے ان آفات و مصائب کو برداشت
کر لیتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ کسی دن اُسے فاقہ کرنا پڑتا کیونکہ جو روپیہ اسے دوستوں
اور سرپرستوں سے ملتا تھا وہ مکان کے کرایہ اور ناشتہ میں خرچ ہو جاتا تھا اور
کھانے کے معاملے میں اسے بڑی دشواری پیش آتی۔ ان مصائب و تکالیف کے
باوجود وہ احباب سے مزید مالی امداد کا طلبگار نہ ہوتا بعض وقت دوستوں سے
امداد لیتے ہوئے اسے بڑی غیرت و ندامت محسوس ہوتی اور اس کا دل چاہتا تھا
کہ کاش وہ اپنے مصارف آپ پیدا کر سکتا۔ وہ اب بھی ڈراما تیار کرتا اور
اپنی گڑیوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔

یہ خیال کہ "ایک دن وہ دنیائے ادب میں ایک باکمال شاعر اور سحر طراز ادیب کی حیثیت سے رونما ہوگا اور لوگ اسے شاعر اور ادیب کے دلنواز لقب سے پکاریں گے" اس کے قلب کی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہوا کہ اس نے پختہ عزم کرلیا کہ وہ فسانہ نگار ہوکر دم لے گا۔ چنانچہ اس نے چند ڈرامے یکے بعد دیگرے مختلف تھیٹروں کے منیجروں کے پاس ارسال کئے۔ اس کی یاس و حسرت اور اندوہ و ملال کی انتہا نہ رہی جبکہ کسی نے بھی اس کی عرق ریزیوں اور کاوشوں کی داد نہ دی۔ اس ناقدری سے اس کے دل پر ایک کاری ضرب لگی جس سے وہ تلملا گیا۔ تاہم اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور وہ وقت کی سازگاری کا بےچینی کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

مالی مشکلات کے باوجود وہ اپنی ترقی کی راہ پر استقلال کے ساتھ گامزن تھا۔ سالہا سال گذر گیا۔ آخر اس کی ملاقات "کولن" سے ہوئی جو روسائے ڈنمارک سے تھا۔ کولن نے ہینز کی طرز نگارش سے اندازہ لگالیا کہ بغیر اچھی تعلیم کے ہینز کی تحریر کی خامی نہیں جائیگی اور وہ وجد انگیز خیالات کو اچھی طرح لفظوں میں سمو نہیں سکے گا۔ اس لئے اس نے ہینز کی قابلیت، ذکاوت اور استعداد کی تعریف بادشاہ کے حضور میں لکھ بھیجی اور اس کے لئے وظیفے کی پرزور سفارش کی۔

بادشاہ نے ایک قلیل رقم معین کردی اور ہینز ایک اچھے گرامر سکول میں داخل ہوگیا۔ یہاں سے ہینز کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ کولن ہینز کے ساتھ پدرانہ شفقت و محبت کا برتاؤ کرنے لگا۔ اب ہینز کی مالی مشکلات سے گلو خلاصی ہوئی۔ اور وہ آزادی سے حصول تعلیم میں منہمک ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی لیکن تعلیم ہنوز بہت مختصر ہوئی تھی اس لئے اُسے نچلے کلاس میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھنا پڑتا تھا۔ اکثر اوقات استاد اس کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے اور اس کا تمسخر اڑاتے وہ شرم سے پانی پانی ہوجاتا لیکن بالکل خاموش رہتا اس نے ان باتوں کی کبھی کولن سے شکایت نہ کی لیکن کولن کو خود ہی ان تمام واقعات کا پتہ چل گیا چنانچہ اس نے گھر ہی میں ہینز کو پرائیویٹ طور پر تعلیم دلانی شروع کی بہت ہی قلیل عرصہ میں اُس نے بڑی ترقی کرلی اور یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔

وہ اس دور کے تاثرات قلبی کا اس طرح اظہار کرتا ہے:۔

"میں اس وقت نہایت ہی مسرور تھا۔ میرے لبوں پر تبسم رقص کرتا تھا۔ جوانی کی اُمنگیں اور اس کی مدہوش کن مستیاں میرے قلب میں لہریں مار رہی تھیں۔ اس وقت، ہاں اس وقت میری روح شاعرانہ خیالات کا مرقع تھی اور میرا قلب جوانی کا آئینہ۔ میں دنیا کے رنج و ملال کو فراموش کرچکا تھا" ان کاوشوں کا ثمرہ جلد ہی مجھے مل گیا اور میں نے اعلیٰ تعلیم کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کرلی۔ میں نے پہلی بار اپنی تمام نظموں کو کتابی صورت میں مرتب کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ عام طور پر لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ مستقبل کے خوش آئند خیالات سے میرا قلب باغ باغ ہوگیا"۔

مخالفوں نے بغض و حسد کی بنا پر اس کی نظموں پر نکتہ چینیاں کی گئیں۔ لیکن ہینز اس سے دلشکستہ نہ ہوا بلکہ اب وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ۔ پاکیزہ۔ دلپذیر اور دلفریب پیرائے میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگا۔ اور مشق سخن جاری رکھی۔

کامیابی کا آغاز

۱۸۳۲ء میں شاہ وقت کی طرف سے ہینز کو ایک گرانقدر عطیہ ملا۔ جس سے اس نے سیاحت کی ٹھان لی۔ مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت سے واپس آکر ہینز نے تین ناول شائع کئے۔ ان ناولوں کو جرمنی اور دیگر ممالک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ لیکن خود اس کے شہر ڈنمارک میں اس کی کوئی توقیر نہ ہوئی۔ ہینز کو اپنے ہم وطنوں کی اس پست ذہنیت پر بڑا ہی صدمہ ہوا بات یہ تھی کہ اس کے ہم وطن کچھ اس طرح جذبہ حسد سے مغلوب تھے کہ ہینز کی اچھی اچھی چیزوں کو بھی بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس طرح اس کی ہر چیز ان کے بغض و حسد پر بھینٹ چڑھ جاتی تھی۔

ہینز ان حوصلہ شکن نکتہ چینیوں اور صبر آزما اعتراضوں کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس کی شعر گوئی، ڈرامہ نویسی اور مضمون نگاری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ کچھ مدت کے بعد چند مخلص و ہمدرد دوستوں اور رفیقوں کی سفارش پر بادشاہ نے ہینز کا سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ اب ہینز کو معاش کی طرف سے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور اُس نے آزادی کے ساتھ اپنے بہترین افکار عوام کے سامنے پیش کرنے شروع کئے۔ ہینز کی استعداد علمی اور قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھنا شروع ہوا۔ بڑے بڑے ادباء۔ فضلا اور امراء نے ہینز کا لوہا مان لیا۔ سب سے بڑی صفت جس سے لوگ ہینز کے شیفتہ بن گئے

یہ تھی کہ وہ بڑا خوش خلق، ملنسار اور زندہ دل انسان تھا۔ اس کی محبت دوستوں کے ساتھ بالکل بے لوث اور بے غرض ہوتی تھی۔ یہی باعث تھا کہ لوگ جلد ہی اس کے گرویدہ و مفتون ہو گئے۔ وہ سب کے ساتھ یکساں طور پر خندہ پیشانی سے ملتا تھا۔ غریب اور امیر میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔

چند ماہ بعد ہینز نے بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب شایع کرائی۔ بچوں کے لئے یہ کہانیاں بڑی دلچسپ اور دلفریب تھیں۔ پریوں کی کہانیاں کچھ ایسے دلکش اور دلنواز اسلوب پر لکھی گئی تھیں کہ بچے۔ جوان اور بوڑھے سب ہی ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کہانیوں کا چرچا ہر شخص کی زبان پر تھا۔ سب دیوانہ وار اس کتاب کو خریدتے تھے۔ غرض ہینز کے اس شاہکار نے دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا اور ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی صدا آنے لگی۔

ہینز کا یہ لافانی اور زندہ جاوید شاہکار کچھ ایسا تسخیر قلوب کا آلہ بنا کہ نکتہ چینوں اور حاسدوں کے شور و غوغا کے باوجود خود ڈنمارک بھی ہینز کی تعریف و توصیف میں نغمہ خواں تھا۔ ڈنمارک کے امراء اور شاہی خاندان کے لوگوں نے ہینز کی ضیافتیں کیں اور دوست و دشمن سبھی چار و ناچار اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہینز کی زندگی میں یہ پہلی شاندار کامیابی تھی جس کے بعد اس کی زندگی کے درخشاں باب کا آغاز ہوا۔

شاہی اعزاز

پچیس سال پیشتر ہینز جب کوپن ہیگن میں داخل ہوا تھا تو وہ بے سرو سامان اور شوریدہ حال تھا۔ اس کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا لیکن آج اس کا خورشید اقبال سپہر ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف سے اس کے پاس دعوتوں کے خط پر خط چلے آ رہے ہیں اور لوگ اپنے یہاں ایسے معزز مہمان کے ورود کو باعث فخر و ناز تصور کرتے ہیں۔ بادشاہ وقت کو ایسے باکمال ادیب اور مصور فطرت شاعر کی مہمان نوازی اور ہم نشینی کا اشتیاق پیدا ہوا اور اس نے ہینز کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ ہینز عزت و احترام کے ساتھ شاہی محل میں لایا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ دونوں ہی ہینز سے مل کر بہت محظوظ ہوئے اور گھنٹوں اس گوہر نایاب کی دلنواز صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

وہی لوگ جو کچھ دن قبل ہینز کو آوارہ۔ کاہل۔ احمق اور ناداں کہا کرتے تھے آج اس مایہ ناز ادیب کے شاہانہ اعزاز و اکرام پر ورطہ استعجاب میں غرق تھے اور انتہائی حیرت میں ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان لوگوں کو تعجب تھا کہ کیونکر ایک موچی کا غریب اور بیکس مسکین و یتیم لڑکا اتنے بڑے درجے پر فائز ہو سکا۔ وہ غریب کیا جانیں کہ یہ ہینز کے استقلال، استقامت اور پیہم جد و جہد کا ثمرہ تھا جس کو اس نے انتہائی پستی سے نکال کر بام رفعت تک پہنچا دیا تھا۔

انکسار اور بچوں سے محبت

اس تمام اعزاز و اکرام کے باوجود ہینز کبھی دام غرور میں گرفتار نہ ہوا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب کے ساتھ ایسی خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آتا تھا کہ خود بخود لوگوں کے قلوب اس کی طرف کھنچنے لگتے تھے اور دلوں میں شدید محبت موجیں مارنے لگتی تھی۔ اپنی کامیابی پر وہ مسرور ضرور ہوتا تھا لیکن غرور اس کے پاس بھی نہ پھٹکنے پاتا۔ اپنی خوشحالی اور اقبال مندی کے عہد میں بھی وہ دور ماضی کے آلام و مصائب کو فراموش نہ کر سکا۔ کیونکہ انہی تلخیوں اور ناکامیوں نے اسے ایک کامیاب انسان بنا دیا تھا اور اس کا قول تھا اور کس قدر سچائی کا حامل کہ "انسان بڑی بڑی مصیبتوں کے بعد ہی بڑا آدمی ہوا کرتا ہے"۔

کچھ دنوں کے بعد اس کا دل سیر و تفریح کی طرف مائل ہوا اور ایک ہی جگہ کے قیام سے اس کا جی اکتا گیا۔ لہٰذا وہ مختلف ممالک کی سیر و تفریح کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہر طرف لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی اور اس کے اشتیاق دید میں لوگ دیوانہ وار جوق در جوق آتے اور اسے نذر عقیدت پیش کرتے تھے۔

ایام سیاحت میں ایک شب کو ہینز اپنے چند رفقا کے ہمراہ اوپیرا جا رہا تھا۔ دوستوں نے راہ میں اصرار کیا کہ وہ چند منٹ توقف کرے تاکہ جو لوگ ہینز کی دید کے متمنی ہیں انہیں اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔ قلیل توقف کے بعد جیسے ہی کہ ہینز کا نام لیا گیا بچوں کی صدہا ٹولیوں نے ہینز کو گھیر لیا۔ سبھوں نے چلانا شروع کیا۔ "مجھے ایک قصہ سنائیے، مجھے ایک قصہ سنائیے"۔ ہینز کے دل میں بچوں کی محبت کا ایک بحر ناپیدا کنار لہریں مارنے لگا۔ وہ ان کو شفقت و محبت سے تھپکتا ہوا بیٹھ گیا اور ایک بے نظیر اور دلکش افسانہ سنایا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا بشاشت اور انبساط قابل دید تھا جب

بچوں نے بادل ناخواستہ اپنے محسن کو وداع کیا تو کافی تاخیر ہوچکی تھی اور یہ لوگ دوڑتے ہوئے تھیٹر پہنچے۔

ہینز کے ایک دوست کا بیان ہے۔ "بچوں کے معصوم دل میں اس افسانہ کی یاد تا ابد قائم رہیگی۔ ان ننھے ننھے بچوں کی الوداعی نگاہیں کچھ عجیب حسرت و حرمان کی مرقع تھیں۔ کیا یہ بھی ہینز کے حیرت انگیز افسانوں میں سے ایک فسانہ نہیں ہے؟ ہینز کی کہانیاں پڑھکر بچوں کے قلوب ہینز کی دید کے لئے بیتاب ہیں۔ ہینز یکایک نمودار ہوتا ہے اور ایک نایاب قصہ سنا کر چلا جاتا ہے۔ یقینی یہ افسانہ بھی اس کے اور افسانوں کی طرح باعث حیرت و استعجاب ہے"۔

ایک موقع پر جبکہ ہینز ایک جگہ مدعو تھا تو رخصت کے وقت ایک چھوٹا بچہ "ایرک" زار زار رونے لگا۔ اس ننھے بچے کے پاس دو نہایت ہی خوبصورت کھلونے تھے جن سے اُسے بڑی محبت تھی لیکن اس بچہ نے اپنی ان قیمتی چیزوں میں سے ایک ہینز کو دیدی۔ ہینز نے اسے بڑے شوق سے قبول کرلیا۔

ہینز کو جس طرح بچوں سے بے پایاں الفت تھی ٹھیک اسی طرح بچے بھی ہینز کو بہت چاہتے تھے۔ ایرک کے قلبی تاثر کا پتہ اس کھلونے سے لگتا ہے جو اس نے ہینز کو دیدیا تھا۔ ہینز جہاں کہیں بھی جاتا بڑا چھوٹا کوئی بھی اس کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ایک رحم دل انسان تھا۔ اس کا یکساں طور پر حسن سلوک، سب کے ساتھ حسن سلوک شقی القلب انسان کے لئے تازیانہ عبرت تھا۔ اسے غریبوں کے غم و اندوہ اور رنج و ملال کا پورا پورا احساس تھا۔ چونکہ وہ زمانہ کی چیرہ دستیوں اور سرد مہریوں کو خوب دیکھ چکا تھا۔ اس لئے بیکسوں اور عاجزوں کے ساتھ بڑی محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ سب کی آنکھوں کا نور اور قلبوں کی راحت بن گیا۔ اس کی دلنواز باتیں، دلنشین گفتار دلچسپ گفتگو۔ دلاویز کلام کچھ ایسے دلپذیر ثابت ہوتے تھے کہ لوگوں کے دل بیساختہ اس کی جانب کھنچنے لگتے تھے۔ بایں ہمہ صفات اس کے اطوار و خصائل کچھ ایسے دلپسند و مرغوب تھے کہ انسان اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔

ایک سال جبکہ وہ برلن کی سیاحت میں مصروف تھا تو اتنی دعوتیں آئیں کہ وہ گھبرا گیا۔ کرسمس کی متبرک شام کو وہ اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے تاثرات اس طرح قلمبند کرتا ہے۔

"وہ شام بڑی سہانی اور دلفریب تھی۔ اس متبرک و مقدس شام کو میرا مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ ہر طرف کرسمس کے درخت میرے لئے روشن کئے گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی نوع بہ نوع قندیلوں اور رنگا رنگ قمقموں کی ضیا باری بہت ہی خوشنما اور نشاط آگیں تھی۔ میں ایک کھڑکی سے لگا ان تمام درختوں کو بڑے شوق سے دیکھتا رہا"۔

دوسری شام کو پھر بے شمار درخت روشنی سے سجائے گئے۔ جینی لینڈ ——— یورپ کی مشہور مغنیہ نے بھی ایک درخت نذر عقیدت کے طور پر ہینز کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ درخت کچھ ایسے دلفریب انداز میں روشنیوں سے آراستہ کیا گیا تھا کہ بیساختہ زبان سے واہ نکل جاتی تھی ہینز نے اس خلوص و عقیدت کو بنظر تشکر و اطمینان دیکھا۔

اس طرح ہینز سیر و سیاحت کرتے ہوئے اپنے تجربات لکھتا لکھاتا کہولت کی طرف بڑھتا گیا۔ آخر یورپ کے سپہر ادب کا یہ آفتاب ۱۸۷۵ء میں دنیائے ادب سے روپوش ہوگیا اور ساری دنیا پر ظلمت و تیرگی چھا گئی۔ گو وہ اب ہم میں موجود نہیں پھر بھی اس کی یاد ہمارے قلوب سے کبھی محو نہیں ہوسکتی۔

---

(۱)

دے جام مجھے اور بنا خوش ایام
درکار ہے مجھ کو تیرا لطف و اکرام
ساقی جو تری چشم پہ سرمہ ہو جائے
آلام مستبدل ہوں بہ عیش و آرام

(۲)

سب راز نہاں مجھ پہ عیاں ہو جائے
یکسان مکان لامکاں ہو جائے
ساقی یہ ... بے نیاز جام جم میں
ہو جاؤں گا ... ہو جائے
گر مجھ کو عطا رطل گراں ہو جائے

عطا ... آبادی

از حضرت باسط بھوپالی!

آغوشِ آرزو ہے طوفانِ رنگ و بُو ہے
اک سمت بس ہی میں ہوں اک سمت تُو ہی تُو ہے

وہ بھی مری طرح کیا مجبورِ آرزو ہے
نظریں جو چار سو ہیں جلوہ بھی چار سُو ہے

اُف کیا حسین منظر آنکھوں کے رُوبرو ہے
جُرمِ نظر ہے میں ہوں عذرِ نظر ہے تُو ہے

صدقے اس آرزو کے کیا شانِ آرزو ہے
سب کی نظر میں مَیں ہوں میری نظر میں تُو ہے

اب ہر طرح مکمّل تنظیمِ آرزو ہے
آغوشِ غم میں دل ہے آغوشِ دل میں تُو ہے

یہ حاصلِ طلب ہے یہ رازِ جستجو ہے
اتنا ہی دُور ہوں میں جتنا قریب تُو ہے

ناشاد ہو کے جینا، برباد ہو کے مرنا!
وہ شانِ آرزو، یہ شایانِ آرزو ہے

بہتر تو ہے یہ منظر، آگے مرا مقدّر
وہ دل کے سامنے ہیں دل اُن کے روبرو ہے

اللہ رے فریبِ شوقِ جنوں تماشا
یا اُن کی جستجو تھی، یا اپنی جستجو ہے

تُو اور اشکِ غم کی گہرائیوں کو جانے
ناصح ابھی ترا دل پایابِ آرزو ہے

اس ترکِ آرزو پر مغرور ہو نہ اے دل
یہ ترکِ آرزو بھی اک شرطِ آرزو ہے

ساحل پہ موج ساحل منزل پہ گردِ منزل
باسطؔ نہیں تو دُنیا بیتاب جستجو ہے

افسانۂ محبّت

روس کے زندہ جاوید مصنّف میکسیم گورکی کا دلچسپ شاہکار

مترجمہ جناب سید منظر کاظمی صاحب بی۔اے (آنرز)

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اسٹیپس کے دامن میں مچلتی ہوئی موجوں کا ترنم اور ساحل کے خودرو پھولوں کی خوشبو اپنے دامن میں سمیٹ کر لے گیا۔

کبھی کبھی ہوا کے یہ شریر جھونکے اپنے دوش پر مُرجھائی ہوئی زرد پتیوں کے ڈھیر اُڑا لاتے اور کیمپ کے سامنے دہکتی ہوئی آگ کے آغوش میں ڈال دیتے اور اس طرح گرد و پیش پر چھائی ہوئی ظلمت کو کچھ دیر کے لئے روشن بنا دیتے تھے۔ موسم خزاں کی اداس رات چمک اُٹھتی اور ہم کو زمین پر آرام سے لیٹے ہوئے بوڑھے "مارکر چڈ و" کا جھری دار جسم نظر آجاتا —— وہ ایک ضعیف جپسی تھا اور ہمارے کیمپ کے گھوڑوں کی نگہداشت اس کے سپرد تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے گستاخ جھونکے اس کے جپسی لبادہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور اکثر اس کا تانبے کے رنگ کا بال دار سینہ عریاں ہو جاتا۔

لیکن وہ شاید اس سے بیخبر تھا —— یا اس کا اسے احساس نہ تھا۔

اپنے پائپ پر ایک لمبا کش کھینچکر اور ناک و مُنہ سے دھوئیں کا بادل اُڑا کر اس نے مجھے پکارا اور میں نے دیکھا کہ اس کی عقاب جیسی آنکھیں اس تاریکی پر جمی ہوئی ہیں جو اسٹیپس کے دامن پر مسلّط ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"تو تم آئے ہو! اچھا ہی ہے۔ تم نے یقیناً ایک اور صحیح راہ انتخاب کی ہے۔ لیکن۔ "فیلکن"! قضا و قدر کے معاملات میں کسی کو دخل نہیں جو جس کے مقدّر میں لکھا ہے وہی اُسے نصیب ہوتا ہے۔ جاؤ دنیا کو دیکھو اور جب خوب دیکھ لو تو آرام کرو اور مر جاؤ —— اور باقی کچھ نہیں"۔

"زندگی! اور انسان؟ لیکن تم سے انھیں غرض؟ کیا تمھیں زندگی کی تمنا نہیں ہے؟ —— ہے اور ضرور ہے اور دوسروں کو ..... ہاں انھیں بھی ہے لیکن انھیں تمھاری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر تمھارے زندہ ہیں اور زندہ رہینگے۔ سمجھے، کسی کو بھی تمھاری ضرورت نہیں۔ تم غلہ نہیں تم چھڑی نہیں۔ پھر تم ہی بتلاؤ کہ بھلا لوگوں کو کیوں تمھاری ضرورت ہونے لگی —— ؟"

"تجربہ حاصل کرنے کے لئے اسبق سیکھنے اور سکھلانے کے لئے!" وہ کہتا گیا۔ اور میں خاموش سنتا گیا۔ "لیکن ذرا یہ تو بتلاؤ۔ کبھی کچھ سیکھ بھی سکوگے؟ —— نہیں! کبھی نہیں، جب بال پک جائیں گے تو کہوگے لاؤ اب اوروں کو سکھاؤں۔ لیکن انھیں آخر سکھاؤگے کیا؟ سب کچھ تو جانتے ہیں وہ ..... انھیں کیا چاہئے آخر؟ چالاک آدمی سب کچھ اینٹھ لیتا ہے اور بیوقوف سب کچھ کھو بیٹھتا ہے —— انسان بھی قدرت کا انوکھا مذاق ہے —— ستم ظریفی —— سمجھے؟ اتنا بڑا ڈھیر لگانا اور پھر چلے جانا۔ جب دُنیا اتنی وسیع ہے۔ اس میں اس قدر جگہ موجود ہے ——" یہ کہتے ہوئے اس نے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے اسٹیپس کے وسیع میدان کی طرف اشارہ کیا "اور وہ ہمیشہ کام کرتے رہتے ہیں ہمیشہ —— ہر وقت —— آخر کیوں؟ کسی کو بھی علم نہیں —— ہل چلاتے ہوئے اُسے دیکھو! —— اور غور کرو۔ پہلے تو وہ تن بدن کا خون پسینہ کر کے اپنی تمام قوت کھیت کے جوتنے میں صرف کر دیتا ہے اور پھر اسی زمین میں اپنی غم نصیب لاش گرا دیتا ہے اور سڑ جاتا ہے اس کا کچھ بھی اس دنیا میں باقی نہیں رہ جاتا اکثر خود اپنا بویا بھی نہیں کاٹ سکتا اور

موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب تم ہی کہو کیا وہ اسی لئے عالم وجود میں آیا تھا
۔۔۔ احمق ۔۔۔!

کیا اسی لئے اُسے حیات بخشی گئی تھی ..... زمین کھودنے کے لئے تمام عمر زمین کھودنے کے لئے لیکن خود اپنی قبر نہیں کھود سکتا۔ آخر اس نے زندگی اور اس کی آزادی کو کیا سمجھا ہے ...... اسٹیپس کے اس ہریالے گھاس بھرے نرم بستر کو اس نے کیا تصور کیا ہے؟ افق کے رنگین قدموں کو چومتے ہوئے اس وسیع بحر اعظم کی بیتاب موجوں کے نغمۂ آزادی نے کیا اس کے دل پر کچھ اثر کیا ہے؟ ۔۔۔ ہاں اثر کیا ہے لیکن اس کا نتیجہ۔۔؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ عالم ظہور میں آنے کے وقت سے ہی غلام ہے اور تمام عمر غلام رہتا ہے۔ شاید یہی اس کا مقصد حیات ہے اس لئے وہ کبھی کچھ نہیں کرتا۔۔ نہیں کر سکتا میرے خیال میں تو اگر زیادہ عقلمند ہوگا تو سر پر جال لپیٹے گا۔

"میری بات پوچھتے ہو؟ مجھے دیکھو تو ۔۔۔ دیکھو! ۔۔۔ میں نے اپنی عمر کے ان پچاس برس میں دنیا کو اس قدر دیکھا ہے کہ اگر کسی کاغذ پر لکھوں تو سامنے پڑی ہوئی بوری جیسی ہزاروں بوریاں بھر جائیں۔ سمجھے؟ ۔۔۔ میں پوچھوں وہ کون سا ملک ہے جو میں نے نہیں دیکھا ہے۔ اور جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں۔ بس اسی طرح رہنا - اور گھومنا اور کچھ دیر کے لئے ہر جگہ قیام کر لینا۔ جس طرح روئے زمین پر دن اور رات ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں ۔۔۔ میں ہمیشہ تمہیں یہی نیک صلاح دونگا کہ گھومو اور زندگی و موت کے خیالات کو بھول جاؤ۔ بالکل فراموش کر دو۔ کوئی اپنی زندگی پر جس قدر زیادہ غور کرتا ہے اتنا ہی کم اسے اپنی زندگی سے محبت ہوتی ہے ۔۔۔ ہاں دنیا کا یہی اصول ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اور میرا بھی یہی گمان ہے ۔۔۔ ہاں فیلکن میرا یہی گمان ہے۔"

"میں نے ایک مدت جیل میں گذاری ہے ۔۔ گوشیا میں اور مجھے وہاں غور و خوض کا کافی موقع ملا ہے۔ میں اکثر سوچتا، آخر میں اس دنیا میں کیوں آیا ہوں؟ میں اپنی زندگی کی بے کیفی دور کرنے کے لئے خود اپنے تئیں اس قسم کے سوال کیا کرتا تھا اور ان دنوں میری زندگی درحقیقت حد درجہ بے کیف تھی جب میں جیل کی موٹی موٹی سلاخوں سے باہر فصل سے لدے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھتا تو میرا دل بھر آتا۔ ہاں فیلکن ہم اس دنیا میں رہتے ہیں بس اتنا ہی سب کچھ ہے۔ یہ کون جانتا ہے کہ کیوں رہتے ہیں۔ کسی کو بھی اس کا علم نہیں اور میرے خیال میں تو اس کی پوچھ گچھ بھی بیکار ہے۔ عیش و آرام میں دن گذارو گھومتے رہو اور دیکھتے رہو اور پھر تمہیں کبھی اس چیز کی خواہش نہ ہوگی جو تمہیں نہ مل چکی ہو ۔۔۔"

ہاں تو ایک دفعہ میری ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی۔ وہ بہت ہی لمبا تڑنگا اور وجیہ تھا ۔۔۔ شاید تم ہی لوگوں میں سے تھا ۔۔۔ روسی! اس نے مجھ سے کہا ۔ "تمہیں اس طرح زندگی برباد نہ کرنی چاہئے۔ ویسے رہو جس طرح خدا نے بتلایا ہے۔ اس کی عبادت کرو اور اس سے طلب کرو وہ سب کچھ دیگا جو بھی مانگو گے؟ ۔۔" اور فیلکن مجھے تو ہنسی اس پر آئی کہ وہ خود ایک پھٹا ہوا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا ۔ "گر پہلے خود تم تو خدا سے مانگ کر نیا کوٹ لا کر پہنو۔" اس پر وہ بہت ہی چڑھ گیا اور مجھے سخت سست کہنے لگا۔ اور آخر مجھے دھکا دیکر مجمع سے باہر نکال دیا۔ کچھ ہی دیر قبل وہ مہربانی، عفو اور محبت کا لکچر دے رہا تھا۔ اب تم ہی تبلاؤ کہ مجھے اس سے اس قسم کا برتاؤ لازم تھا؟ دیکھو! یہ ہیں تمہارے ناصح اور لیڈر۔ عالم بے عمل ۔۔۔ اگر میں نے اس کی خودداری کو ٹھیس لگائی بھی تھی تو اسے اپنے انہیں اصولوں کے مطابق جس کی وہ دوسروں کو تعلیم دیا کرتا تھا مجھے معاف کر دینا چاہئے تھا ۔۔۔ کہتے ہیں کھانا کم کھاؤ اور خود حضرت دن میں دس بار تناول فرماتے ہیں۔

ماکر خاموش ہو کر اپنا پائپ بھرنے لگا۔ ہوا اس وقت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ تاریکی سے خوف کھا کر گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور کیمپ کے اندر سے نغمۂ محبت کی سوز بھری لہریں اٹھ کر خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں گانے والی ماکر کی اکلوتی بیٹی خوبصورت آنکھوں اور ریشمی بالوں والی ناکاشکی میں نے فوراً ہی اس کی آواز پہچان لی۔ چاہے وہ گیت گائے یا محض سلام کے الفاظ دہرائے اس کی آواز بیحد دلکش اور شیریں معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسٹیپ کے ہریالے میدانوں کی شہزادی معلوم ہوتی اور اس کی آنکھیں تاروں کے مانند درخشاں تھیں۔

کچھ دیر بعد ماکر نے پائپ میری جانب بڑھا دیا۔

"پیئو! ۔۔۔ کیا لڑکی اچھا نہیں گا رہی۔ اچھا ذرا تبلاؤ تو ۔۔۔ اگر ایسی خوبصورت لڑکی تم سے محبت کرنے لگے ۔۔۔ کیا نہیں؟ ۔۔۔ پسند نہیں! چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا ۔۔۔ تم بہت اچھے ہو ۔۔۔ بہت۔ اپنی آنکھوں پر ہرگز اعتبار کرو اور ہمیشہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرو اور ان کے سایہ

سے دور بھاگو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نوخیز لڑکی کا بوسہ میرے پائپ کے پینے سے بدرجہا بہتر اور شیریں ہے۔ لیکن تم نے بھول کر بھی ایک بار کسی لڑکی کا بوسہ لیا کہ تمھارے دل کی آزادی سلب ہوئی۔ عورت، اف عورت تم کو ایسی زنجیروں سے جکڑتی ہے جسے نہ تم دیکھ سکتے ہو اور نہ توڑ سکتے ہو۔ تم کسی کی محبت میں اپنی جان تک قربان کر سکتے ہو لیکن اس کے بدلے میں تمھیں کچھ نہیں ملتا۔ میری صلاح مانو اور عورت سے ہمیشہ ہوشیار رہو۔ یہ وہ سانپ ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ وہ ہمیشہ جھوٹ بولتی ہے اور تصنع اور مکاری کے حربوں سے ہمیشہ آراستہ رہتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت ناگن ہے۔ میٹھا زہر! سمجھے!

"دنیا کی تمام چیزوں سے مجھے تم زیادہ پیارے ہو" وہ تم سے کہے گی لیکن اگر غلطی سے تم سے ایک سوئی بھی اسے چبھ جائے تو وہ تمھارا کلیجہ نکال لینے کو تیار ہو جائیگی۔ عورت! پناہ بخدا، میں اس کے خمیر سے واقف ہوں۔ سنو فیلکن میں تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں اس سے نصیحت حاصل کرنا اور ہمیشہ عورتوں سے خبردار رہنا پھر تم پرندوں کی طرح آزاد رہوگے۔

یہاں ایک نوجوان جپسی رہا کرتا تھا اور اس کا نام تھا جوار ــــ لوکیو جوار بہت ہی دلیر تھا وہ۔ ہنگری بوہیمیا اور سلیونیا کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا اور اس کے خوف سے کانپتا تھا۔ تمام ضلع میں ایک گاؤں بھی ایسا نہیں تھا جہاں کے دس بارہ آدمیوں نے اسے مار ڈالنے کا عہد نہ کیا ہو لیکن وہ زندہ رہا اور کوئی اس پر قابو نہ پاسکا۔ اگر کبھی کوئی خوبصورت گھوڑا اس کی نظروں پر چڑھ جاتا تو وہ یقیناً اسے لے بھاگتا چاہے اس کی حفاظت کے لئے پوری فوج ہی کیوں نہ بیٹھی ہو؟ نہ اسے خدا کا خوف تھا نہ انسان کا ڈر۔ اگر شیطان بھی اپنی فوج لیکر آتا تو وہ تنہا ہی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتا؛ اور کچھ دور نہیں جو شیطان کے منہ پر بھی طا فتور جوار کا ایک گھونسا پڑ جاتا۔

تمام جپسی اس سے واقف تھے۔ اسے پہچانتے تھے اسے دیکھ چکے تھے اور اس کی بہادری کے کارناموں سے ان کے کان آشنا تھے۔ وہ صرف گھوڑوں کو پیار کرتا تھا۔ وہ بھی کچھ دیر کے لئے۔ پھر اُسے فروخت کرکے جو قیمت وہ حاصل کرتا وہ کوئی بھی مانگ سکتا تھا اور وہ کبھی دینے سے انکار نہ کرتا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو وہ دوسروں کو ہنسی خوشی دینے پر تیار نہ ہوتا ــــ اگر تم اس کا دل بھی مانگتے تو یقین کرو وہ سینہ چیر کر اسے بھی دے دیتا۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا فیلکن ــــ!

ہم لوگ اس زمانے میں سکاوینا کے اطراف میں مقیم تھے۔ دس سال کی بات لیکن کل کی بات کی طرح مجھے یاد ہے ہم پڑاؤ پر ٹھہرے ہوئے تھے ــــ میں تھا اور ڈینلا۔ وہی جو "کوساتھ" کی کمان میں کئی لڑائیوں میں شریک تھا اس کے علاوہ بوڑھا نور آ تھا اور ڈینلا کی اکلوتی لڑکی رڈّی"۔

تم نینکا کو تو جانتے ہی ہو۔ اکثر دیکھ بھی چکے ہو۔ کیوں اور لڑکیوں کی رانی ہے نا وہ ــ؟ لیکن رڈّی کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ رڈی کے پیروں کا دھوون بھی نہیں ہے۔ الفاظ تو رڈی کے حسن جہاں سوز کی تعریف کرنے سے یقیناً قاصر ہیں۔ یوں تو گلاب کے پھول سے کوئی اس کے رخساروں کا مقابلہ بھلے ہی کرے مگر حق تو یہ ہے کہ وہ خود اپنا ہی منہ چڑھائیگا۔

کتنے ہی نوجوانوں کے دلوں کو اس نے پامال کر ڈالا تھا اور کتنے ہی اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے تھے ایک دفعہ ایک امیر نے کہیں اسے دیکھ پایا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ خود بھی بہت ہی خوبصورت اور وجیہ تھا وہ گھوڑے پر سوار تھا جس کی زین پر زرکاری کی ہوئی تھی اور جب گھوڑے کی ٹاپ زمین پر پڑتی تو اس کے پہلو سے لٹکتی ہوئی قیمتی تلوار چمک اٹھتی۔ تلوار کے میان پر ہیرے جڑے ہوئے تھے اس کے سر پر نیلے رنگ کی فوجی ٹوپی تھی جو بالکل آسمان کا ایک ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی۔ بہت ہی دولت والا تھا وہ۔ دیر تک رڈّی کو ایک ٹک دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔ "دیکھو مجھے ایک بوسہ دو تو تمھیں یہ روپئوں کی تھیلی دیدوں"۔

یہ سن کر رڈی نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"کیا ناراض ہو گئیں؟ اچھا غصہ نہ کرو۔ ذرا ایک بار مسکراؤ تو ــــ ہاں! ــ" یہ کہہ کر اس نے روپیوں کی تھیلی رڈّی کے سامنے پھینک دی۔ مگر رڈّی نے فوراً ٹھوکر مار کر تھیلی کو سڑک کے کنارے پھینک دیا۔

"اوہ۔ تو تم اس قسم کی لڑکی ہو ایسا خراب مزاج۔ اچھا دیکھا جائیگا"۔ یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن کی آن میں ہوا ہو گیا۔ دوسرے دن وہ پھر نازل ہو گیا۔ "اس لڑکی کا باپ کون ہے؟" اس نے گرجکر پوچھا۔ اس کی آواز ہمارے خیموں میں پہنچی۔ فوراً ہی ڈینلا باہر نکل آیا۔

"تو تم ہو اس کے باپ؟ اپنی بیٹی میرے ہاتھوں فروخت کرو گے منہ مانگی قیمت دونگا" اس نے ڈینلا سے کہا۔ لیکن ڈینلا نے فوراً ہی جواب دیا

"ایسا تو صرف تہذیب و تمدن کی روشنی میں رہنے والے کرتے ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ فروخت کر دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنے گلے سے لیکر اپنی آتما تک۔ لیکن شاید تم مجھے نہیں جانتے۔ میں کو ساتھ کی کمان میں لڑ چکا ہوں اور میں کچھ بھی نہیں بیچوں گا۔"

یہ سن کر وہ غصے سے آگ ہو گیا۔ اور اس کا ہاتھ تلوار پر گیا۔ وہ تلوار نکالنا ہی چاہتا تھا کہ ہم میں سے ایک نے اس کے گھوڑے کے کان کے پاس زور سے سیٹی بجا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ گھوڑا بے تحاشا بھاگا۔ ہم لوگوں نے اسی وقت وہاں سے کوچ کر دیا اور آگے بڑھ گئے۔ وہ دو تین روز کے بعد پھر ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ ڈینیلا کے پاس آ کر کہنے لگا۔ "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر چھوڑوں گا۔ اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اس کے عوض اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار ہوں"۔ وہ یہ سب کہے جا رہا تھا اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں وہ طوفان کے بیچ میں پڑی ہوئی پتی کی طرح زمین پر کانپ رہا تھا۔

"ڈینیلا نے رڈی سے کہا۔ "سنتی ہے یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں سنتی ہوں"۔ رڈی نے شوخی سے جواب دیا۔ "لیکن میں اس کوّے کے ساتھ جانا ہرگز پسند نہیں کرتی۔"

"اہا ہا خوب جواب دیا"۔ ہم سب ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "آپ نے سنا جناب کہ رڈی کیا کہتی ہے جائیے اور اپنے لئے کوئی اور بطخ ڈھونڈ لیجئے۔ وہ کچھ نہ بولا غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا ایک طرف چلا گیا —— ہاں وہ ایسی ہی لڑکی تھی فیلکس!

شام کے وقت ہم سب آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً ہمیں دور سے گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ بیحد دلکش گانا تھا۔ گانے والے کی آواز بہت ہی سریلی اور پرسوز تھی۔ اس دلکش نغمے کو سن کر ہماری رگوں میں خون تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اور ہم کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ نغمہ ہم کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ دھیرے دھیرے آواز قریب ہوتی گئی۔ دفعتہً تاریکی کے دامن کو چیر کر ایک گھوڑا آتا ہوا نظر پڑا۔ اس کی پشت پر بیٹھا کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ شہسوار ہمارے خیموں کے سامنے آگ کے قریب آ کر رک گیا۔

"اوہ، جوار یہ تم ہو؟" معاً ڈینیلا کے منہ سے نکلا۔

یہی تھا لوکیو جوار، اسٹیپس کا بہادر جیسی۔ چوڑا چکلا سینہ، بھرے بھرے بازو اور بڑی مونچھیں جو ہوا سے ہل ہل کر اس کی بھوری زلفوں میں الجھ رہی تھیں۔ ایک سنہرے تیتر کی طرح اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں کسی حسین سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہم سب اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

رڈی نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "لوکیو! تم بانسری تو خوب بجاتے ہو۔ دور سے بہت ہی سریلی معلوم ہو رہی تھی۔ کس نے بنائی ہے یہ بانسری؟"

لوکیو زور سے ہنسا۔ "میں نے ہی اسے بنایا ہے لیکن لکڑی سے نہیں ایک دوشیزہ کی سینے کی ہڈیوں سے۔ میں اس سے بیحد محبت کرتا تھا۔ اس بانسری میں اس کے دل کے ٹکڑوں کے تار لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی اکثر بے سری ہو جاتی ہے۔ خیر میں جانتا ہوں کہ ٹیڑھی چیز کس طرح استعمال کی جاتی ہے۔"

تم جانتی ہو فیلکن۔ ہم جیسے لوگ عورتوں پر ہمیشہ اپنا رعب غالب کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم پیشتر ہی ان کی آنکھوں کو دھندلی کر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمارے دلوں کو آگ نہ لگا سکیں۔ سمجھے! اسی لئے لوکیو نے رڈی سے ایسی

عجیب بات کہی۔ لیکن تم جانو اس نے رڈی کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اسے اس قسم کی بات رڈی سے ہرگز نہ کہنی چاہئے تھی۔ رڈی دبنے والی لڑکی نہیں۔ اس نے فوراً ہی منہ پھیر کر انگڑائی لی اور زیرلب بولی۔ "اونہہ! لوگ کہتے ہیں لوکیو بہت ہی چالاک اور عقلمند ہے۔ بالکل جھوٹ کہتے ہیں وہ۔" یہ کہہ کر وہ خیمہ میں چلی گئی۔

"او میری خوبصورت کول۔ تمہاری زبان بہت تیز ہے۔ یہ کہتے ہوئے لوکیو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ دیر تک ہم لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اس کے بعد ہم سب سونے چلے گئے اور اس رات بہت ہی گہری نیند سوتے رہے۔ صبح ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر بیحد تعجب ہوا کہ جوار کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ یہ کیا ہو گیا۔؟" ہم سب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ رات گھوڑے نے لات ماردی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

چشم زدن میں ہم لوگ حقیقت حال سے واقف ہو گئے۔ کیسا گھوڑا تھا۔ یہ ہم لوگ خوب جانتے تھے۔ اور ہم لوگ اپنی اپنی ڈاڑھیوں میں مسکرائے ہم لوگوں نے سوچا۔ کیا لوکیو رڈی کے قابل نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ لیکن کیا کیا جائے اگر کوئی لڑکی دن کی طرح بھی خوبصورت ہو لیکن اس کی روح گندی ہو تو روپے کی تھیلی بھی اس کے گلے سے لٹکا دیجئے مگر وہ ویسی کی ویسی ہی رہیگی۔ ہم لوگ اسی طرح بہت دنوں تک ساتھ رہے۔

لوکیو نہایت ہی ہوشیار آدمی تھا۔ بوڑھوں جیسا ہر کام کا اُستاد اور عقلمند۔ روسی اور ہنگری دونوں ہی زبانوں سے وہ بخوبی واقف تھا اور ان زبانوں میں نہایت صفائی سے بات چیت کر سکتا تھا۔ جب وہ بولنے لگتا تو اسے سننے کے لئے تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنی نیند کو خیرباد کہہ دیتے۔ وہ ستار بہت اچھا بجاتا تھا۔ اگر میں نے اب تک دنیا میں کسی کو اس سے اچھا ستار بجاتے دیکھا ہو تو مجھ پر بجلی گر پڑے۔ جب وہ اپنی انگلیوں کو ستار کے تشنۂ مضراب تاروں پر حرکت دیتا تو سننے والوں کے دل دھڑکنے لگتے اور کچھ ہی دیر میں یہ حالت ہو جاتی کہ اس نغمہ کو سننے کیلئے دل کی حرکت بھی ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جاتی۔ اس کے نغموں کے ساتھ ہم ہنستے اور روتے تھے۔ کبھی کبھی میٹھے میٹھے سروں میں وہ نغمۂ محبت کی درد انگیز راگنی چھیڑ دیتا جو ہمارے دلوں پر چھری پھیر دیتی۔ جب اس کے نغمے فضا میں آوارہ ہوتے تو وہ سورج کے زرد چہرے کو اور بھی زرد اور غمگین بنا دیتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ان دلکش نغموں کو سننے کے لئے ٹھہرنا چاہتا ہے مگر مجبور ہے۔ اس کے ستار سے نغموں کی بیتاب موجیں اُبل اُبل کر باہر نکلتیں اور ہم لوگوں کو تو خیر ہماری روح کو مدہوش بنا دیتیں —— ہاں ایسے ہی نغمے ہوتے تھے فیلکن! اسے مبالغہ مت سمجھو وہ اپنے سریلے نغموں سے ہم سب کو مسحور کر دیتا اور ہم ستار کے تاروں پر تھرکتی ہوئی اس کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتے۔ یقین کرو کہ اس کے گانے کے زیر اثر ہم سب اس درجہ اس کے تابع ہو جاتے کہ اگر وہ ہم میں سے کسی کی طرف اشارہ کرتا تو ہم سب ہنسی خوشی اس کے سینے میں خنجر اتار دیتے۔

لیکن رڈی پر ان نغموں نے کچھ بھی اثر نہ کیا اور اُس کی جانب ذرا بھی مخاطب نہ ہوئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ رڈی کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس نے جوار کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لیا ہے اور اب وہ اس کے جذبات سے کھیلنا چاہتی تھی۔ لوکیو خاموش رہتا کبھی کبھی غصے میں وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا اور اس کی آنکھیں ایک گہرے غار کی طرح تاریک ہو جاتی تھیں اور کبھی ایسا چمکنے لگتیں کہ ہمارے دل دہل جاتے ہیں۔ اس کا ستار روتا تھا کہ اس کی آزادی جاتی رہی۔ ہم ہر وقت اس کے انجام کے سوچ میں گھلے جا رہے تھے ہم جانتے تھے کہ جب دو چٹانیں ٹکرائیں تو ان کے درمیان آنا یقینی موت ہے ایسا ہی موقع تھا —— فیلکن!

خزاں کے اُداس دن تھے۔ ہم سب بیکار بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ کچھ تبدیلی پیدا کرنے کیلئے دنیلا نے جوار سے کہا۔ "لوکیو! کوئی اچھا سا گانا سناؤ تاکہ وقت گذرے۔"

لوکیو نے مسکرا کر ستار اٹھا لیا۔ اس نے ایک بار معنی خیز نگاہوں سے رڈی کو دیکھا جو ہمارے پاس ہی زمین پر چت لیٹی ہوئی لاپروائی سے نیلے آسمان کو دیکھ رہی تھی اور پھر ستار کے تاروں کو چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بلند آواز سے گانے لگا۔

"میرا دل آگ کے شعلوں کی طرح اسٹیپس کے میدانوں کو چیرتا ہوا آسمان کی جانب پرواز کر رہا ہے۔"

"میرا خوبصورت گھوڑا مثل تیر کے اُڑتا ہے۔ اس قدر تیز جاتا ہے

جیسے طوفان کا جھونکا یا پانی کی لہر۔"

دفعتہ رڈی نے سر اٹھایا اور کہنی کا ٹیک لیکر لوکیو کو دیکھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائی اور نمود سحر کی طرح اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

لوکیو گائے جا رہا تھا۔

"آؤ اور شب کا تاریک دامن چیرتے ہوئے چلیں —— اور صبح کے چمکتے ہوئے دروازے پر جا پہنچیں۔

"کہر اپنی دھندلی چادر پھیلائے ہوئے آرام کر رہی ہے —— شبنم اس پر اپنے موتی نچھاور کر رہی ہے۔"

"ہم لوگ دھوپ کی طرح آگے آگے بڑھیں اور اس دنیا میں پہنچ جائیں جہاں چاندنی اپنی بساط بچھائے ہوئے ہے اور سبزے کو اپنی گود میں کھلا رہی ہے۔"

اسی طرح وہ مست ہو کر گا رہا تھا۔ آج تک کسی نے بھی اس قدر دلکش گانا نہ گایا ہوگا۔ ہم سب جھومنے لگے لیکن رڈی نے کہا۔ "ایسا گاتے ہو معلوم ہوتا ہے چھلنی سے پانی گر رہا ہے۔ لوکیو! اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس قدر بلند پروازی سے کام نہ لیتی۔ کبھی گر پڑو گے اور اپنی ناک اور مونچھیں نیچی کر لو گے ذرا ہوشیاری سے قدم آگے بڑھاؤ۔"

ایک لمحہ کامل سکوت رہا۔ لوکیو رڈی کو غور سے دیکھتا رہا لیکن کچھ بھی نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد وہ سر جھکا کر پھر گانے لگا۔ ڈینیلا نے کہا۔ "یہ ہے گانا۔ اسے البتہ میں گانا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے تمام عمر ایسا دلکش گانا کبھی نہیں سنا اگر جھوٹ کہوں تو مجھے شیطان لے جائے۔" بوڑھے نورا نے اپنی مونچھوں کو اور اپنے بے ڈھنگے شانوں کو حرکت دی۔ ہم سب کے دلوں میں لوکیو کا نغمہ گونجنے لگا۔ لیکن تعجب تھا کہ رڈی پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور وہ قطعی خوش نہ ہوئی۔ مکھی نے جب گدھ کی نقل کرنی چاہی تھی تو وہ یونہی بھنبھنائی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہم لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا اس نے ہم سب پر برف پھینک دیا۔ اس کے باپ نے کہا۔ "رڈی! شاید تم نے کبھی ہنٹروں کا مزا نہیں چکھا ہے۔ اور وہ اس کی طرف لپکا۔ لیکن جوار نے اپنی ٹوپی زمین پر پھینکتے ہوئے جلتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "ٹھہرو ڈینیلا! اب اس گھوڑی کو لگام کی ضرورت ہے۔ بولو تم مجھے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی اجازت دیتے ہو؟"

"ہاں ہاں، خوشی سے۔ بشرطیکہ تم اسے حاصل کر سکو۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بہت اچھا!" لوکیو نے جواباً کہا۔ اور فوراً ہی رڈی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو رڈی! بہت زیادہ غرور اچھا نہیں ہوتا سمجھا؟ میں نے تمہاری جیسی بہت سی لڑکیوں کو دیکھا ہے اور ان کے حسن سے کھیلا ہے۔ کسی نے بھی ایسی آگ میرے تن بدن میں نہ لگائی تھی جس قدر تم نے لگا رکھی ہے تم نے میری روح، میرے دل کو قید کر رکھا ہے۔ تم شاید نہیں جانتی ہو کہ اب کوئی بھی تم کو مجھ سے نہیں چھین سکتا اور اس دنیا کے پردے پر کوئی بھی ایسا گھوڑا نہیں جو تمہیں مجھ سے دور لے جا سکے۔ میری بات مانو، خدا کو، اپنے باپ کو، میری غیرت اور آن کو اور ان تمام لوگوں کو گواہ بنا کر مجھ سے شادی کر لو۔ لیکن یہ میں کہے دیتا ہوں میں ایک آزاد منش آدمی ہوں خبردار! خبردار! میری آزادی میں دخل نہ دینا ورنہ انجام —— خیر وہ پھر دیکھا جائیگا۔"

یہ کہہ کر وہ ہونٹوں کو دبائے اس کی جانب بڑھا۔ رڈی خاموش کھڑی رہی لیکن دوسرے ہی لمحہ ہم لوگوں نے جوار کو ہوا میں ہاتھ پھینکتے اور زمین پر گرتے دیکھا۔ شریر رڈی نے اسٹیپس کے اس بہادر اور منہ زور گھوڑے کے منہ میں لگام دے دی تھی —— کچھ سمجھے نہیں لیکن کہ یہ کیسے ہوا۔ رڈی نے اس کے ہنٹر کا پھندا ڈال کر کھینچ لیا تھا اور وہ دھڑام سے گر پڑا تھا۔

پھر وہ وہیں جا کر لیٹ رہی اور مسکراتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھنے لگی۔ ہم سب دم بخود اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اب لوکیو کیا کرتا ہے۔ وہ سر تھامے ہوئے زمین پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور سر جھکا کر اسٹیپس کے میدانوں کی طرف چلنے لگا۔ نورا نے میرے کان میں کہا۔ "ماکر اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔" اور میں دبے پاؤں اس کے پیچھے چلنے لگا ——،

اس قدر بیان کرکے دفعتہ ماکر خاموش ہو گیا۔ اپنے بجھے ہوئے پائپ کی راکھ جھاڑی اور اسے بھر کر دوبارہ سلگایا۔ میں اپنے لبادے میں سکڑا جا رہا تھا لیکن اس افسانۂ محبت کا انجام سننے کے لئے بیقرار تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا ماکر کے چہرے کو تک رہا تھا جو دھوپ میں ہمیشہ چلتے رہنے کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس نے کسی گہرے سوچ میں اپنے سر کو حرکت دی اور کچھ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ جسے نہ میں سن سکا اور نہ سمجھ سکا۔ اس کی گھنی اور بھوری مونچھیں ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہی تھیں۔ دور بحر سمندر کی بیتاب موجیں ساحل سے سرگوشیاں کر رہی تھیں اور ہوا کے جھونکے اپنے دامن میں سمیٹ کر

ان کی باتوں کو اسٹیپس کے ہریلے میدانوں میں اڑا لے جاتے تھے۔ اب تاریکی نے گانا بند کر دیا تھا آسمان ابر آلود تھا اور خزاں کی رات اور بھی تاریک اور خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مکر نے پھر کہنا شروع کیا۔

"لوکیو سر جھکائے ہاتھوں کو لٹکائے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا ندی کے پاس پہنچ کر وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور سسکیاں بھرنے لگا۔ وہ کچھ اس طرح سسکیاں بھر رہا تھا کہ میرا دل اندر ہی اندر رونے لگا۔ لیکن پھر بھی میں اس کے قریب نہ گیا۔ وہ بہت دیر تک وہاں اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ رات اُجالی تھی۔ دودھ جیسی چاندنی تمام میدانوں پر چھٹکی ہوئی تھی۔ آسمان میں تارے تیر رہے تھے۔

معاً میری نظریں کیمپ کی جانب اُٹھ گئیں اور میں نے رڈی کو خیمہ سے نکل کر اسی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے تعجب کے ساتھ خوشی بھی بیحد ہوئی، لیکن پھر بھی رڈی شرابی قسم کی لڑکی نکلی۔ وہ دبے پاؤں لوکیو کے پاس پہنچ گئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لوکیو چونک پڑا منہ سے ہاتھ اُٹھایا اور سر اونچا کیا۔ دفعتہً وہ کھڑا ہو گیا اور خنجر نکال لیا۔ میں کانپ اُٹھا۔ "اب وہ یقیناً رڈی کو مار ڈالے گا۔" میں نے اپنے تئیں سوچا اور امداد کے لئے خیمہ کی جانب دوڑنے ہی والا تھا کہ میں نے رڈی کی آواز سنی۔

"لوکیو خنجر پھینک دو ورنہ بھیجا پاش پاش کر دوں گی۔" میں نے دیکھا وہ پستول کی نال لوکیو کے سینہ کی جانب کئے تن کر کھڑی ہوئی تھی۔ "جوڑ تو برابر کی ہے" میں نے دل میں کہا۔ "دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔"

"میں تمہارا خون کرنے نہیں آئی ہوں لوکیو۔" رڈی نے پستول کو ہاتھ میں اُچھالتے ہوئے کہا "میں آئی ہوں تم سے صلح کرنے۔ خنجر پھینک دو۔"

لوکیو نے خنجر زمین پر گرا دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"لوکیو! سنو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" لوکیو نے اپنے شانوں کو یوں حرکت دی گویا اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

"میں نے کتنے ہی لڑکوں کو دیکھا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم سب سے خوبصورت اور بہادر ہو۔ اگر کسی کو میں محبت بھری نظروں سے دیکھتی تو وہ میرے اس درجہ تابع ہو جاتے کہ اگر میں کہتی تو وہ اپنی مونچھیں منڈوا لیتے یا میرے قدموں پر گر پڑتے لیکن نہیں، وہ میرے کام کے نہیں۔ یوں تو دنیا میں بہت جیسی ہیں لیکن ان میں بہادر اور جوانمرد بہت تھوڑے ہیں۔ بہت تھوڑے لوکیو۔ میں نے اس سے قبل کسی سے بھی محبت نہیں کی لیکن اب تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے اپنی آزادی بہت پیاری ہے تم سے بھی زیادہ۔ لیکن میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی جس طرح تم میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس لئے میں یہ چاہتی ہوں کہ ہم تم ایک دل اور ایک جان ہو کر ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنتے ہو۔"

"ہاں! سب سُن رہا ہوں۔ تم کہتی جاؤ۔" لوکیو نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ صرف اتنا اور سن لو کہ جس طرح بھی ہو میں تمہیں اپنا بنا کر چھوڑوں گی۔ اس لئے میری صلاح مانو اور بیکار وقت مت ضایع کرو۔ میری آغوش تمہارے لئے وا ہے اور میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں میں پیوست ہو جانے کے لئے بیقرار ہیں۔ میرے گداز بازوؤں کی گرمی میں تم اپنی گذشتہ زندگی کو بھول جاؤ گے۔ تمہارے دلکش نغمے جو سننے والوں کو مدہوش بنا دیتے ہیں آئندہ کبھی بھی اسٹیپس کے ہریالے میدانوں میں نہ گونجیں گے۔ اب تم صرف مجھے، اپنی پیاری رڈی کو محبت کے کیف آفریں گیت سناؤ گے۔ اس لئے کہتی ہوں کہ بیکار باتوں میں وقت مت ضایع کرو اور جو کچھ میں کہتی ہوں اُسے غور سے سنو اور اسی پر عمل کرو۔ سنو، کل تم کیمپ کے تمام لوگوں کے سامنے میرے قدموں پر گر کر میرا دایاں ہاتھ چومو گے اور بس میں تمہاری ہو جاؤں گی۔ ہمیشہ کیلئے تمہاری ہو جاؤں گی۔"

دیکھا فیلکن! عورت کی مکاری؟ شیطان لڑکی یہ چاہتی تھی کہ وہ لوکیو کو اپنے قدموں میں گرا کر اسٹیپس کے سب سے بہادر کی تذلیل کرے ممکن ہے اگلے زمانہ میں ایسا ہوا ہو لیکن ہم جیسی لوگوں میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔

"ہاں تو یہ سنتے ہی لوکیو کھڑا ہو گیا اور وہ اس طرح چیخا گویا اُسے گولی لگ گئی ہو۔ رڈی بھی کانپ اٹھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ "اچھا! اب کل تک کے لئے رخصت۔" رڈی نے کہا۔ "دیکھو کل میری ہدایت پر عمل کرنا۔ سمجھے؟"

"ہاں سمجھ گیا۔ ایسا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر لوکیو نے رڈی کو آغوش میں کھینچنا چاہا لیکن وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ کر مڑی اور کیمپ کی سمت بھاگی۔ طوفان سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح لوکیو کانپنے لگا اور زمین پر گر کر رونے لگا۔

بڑی دقتوں سے میں نے اُسے چُپ کرایا۔

کیمپ کو واپس آکر میں نے تمام روئداد ڈینلا سے بیان کردی۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ اچھا دیکھیں کل کیا ہوتا ہے۔ اور ہوا یہ فیلکن! ۔

ہم سب لوگ آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ لوکیو آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ "میرے دوستو! سنو، میں نے اپنے دل کو ٹٹول لیا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں رڈی موجود ہے۔ میری ہستی پر وہ چھائی ہوئی ہے۔ وہ اپنی آزادی کو مجھ سے بھی زیادہ پیار کرتی ہے اور میں اپنی آزادی کو اس سے زیادہ پیار نہیں کرتا اس لئے میں نے طے کرلیا ہے کہ آج اس کے قدموں پر گر پڑوں یہی اُس کا بھی حکم ہے۔ آج تم سب دیکھو گے کہ ہوا کے مانند آزاد لوکیو کو کس طرح رڈی نے پھانس رکھا ہے۔ خیر اب وہ میری بیوی ہوجائیگی پھر نہ مجھے تمہیں گانا سنانے کی ضرورت ہوگی اور نہ اپنی آزادی کے چھن جانے کا افسوس ہوگا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا رڈی ---؟"

اس نے نگاہیں رڈی کی جانب اُٹھائیں جو پاس ہی کھڑی ہوئی تھی لیکن رڈی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ سر کو حرکت دیکر اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ہم سب خاموش بیٹھے امید و بیم کی حالت میں یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"چلو جلدی کرو" رڈی نے تحکمانہ کہا۔

لوکیو ہنسا اور اس کی ہنسی ہم لوگوں کو تلوار کی جھنکار کے مانند معلوم ہوئی "تو دوستو! یہی تھی میری کہانی جو میں آج تم سے کہنے آیا تھا"۔ لوکیو نے ہم لوگوں سے کہا۔ "اب صرف مجھے یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی رڈی کا دل اسی قدر سخت ہے جتنا کہ وہ ظاہر کرتی ہے اور وہ میں ابھی ابھی دیکھ لونگا۔ دوستو مجھے معاف کرنا ---!" اور قبل اس کے کہ ہم لوگ کچھ سمجھ سکیں کہ لوکیو کیا کرے گا ہم لوگوں نے دیکھا کہ رڈی زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے اور لوکیو کا خنجر اُس کے سینے میں پیوست ہے۔ ہم لوگوں نے ذرا بھی حرکت نہ کی گویا ہم سب کو فالج مار گیا تھا۔

رڈی نے کہنی کا سہارا لے کر خنجر سینے سے باہر کھینچ لیا اور زمین پر پھینک دیا۔ خون اُبلتے ہوئے زخم کے مُنہ پر اپنے بالوں کی ایک لٹ دبا دی اور مسکراتے ہوئے اُس نے لوکیو سے کہا۔ "اچھا رخصت پیارے لوکیو! میں جانتی تھی کہ تم ایسا ضرور کروگے۔ لیکن میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں ....."

وہ کچھ اور نہ کہہ سکی اور ہم سب کے دیکھتے دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ اب تم اندازہ لگا سکتے ہو فیلکن کہ وہ کس قماش کی لڑکی تھی۔

دفعتاً لوکیو نے چیخ ماری جو تمام اسٹیپس میں گونج گئی۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "ہاں میرے ارمانوں کی ملکہ۔ میرے دل کی رانی! اب میں تمہارے قدموں میں گرونگا۔" یہ کہہ کر وہ زمین پر لیٹ گیا اور رڈی کے پیروں پر اپنے ہونٹ رکھ کر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ ہم لوگوں نے ٹوپیاں سر سے اتار لیں اور دونوں کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

کچھ دیر بعد بوڑھے نوراؔ نے کہا۔ اس وقت یہ بیہوش ہے اسے گرفتار کرلینا چاہئے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لوکیو جوار کو گرفتار کرنے کے لئے کوئی بھی ہاتھ نہ اُٹھائیگا اور ایسا ہی ہوا۔ تمام لوگ بے حس و حرکت بت بنے کھڑے رہے۔ دفعتہً ڈینلا نے رڈی کا پھینکا ہوا خون آلود خنجر اٹھا لیا اور دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی کا گرم خون ابھی تک خنجر پر جما ہوا تھا۔ ڈینلا جوار کے قریب گیا اور آن کی آن میں وہی خنجر اس کے سینے میں بالکل دل کے قریب دستہ تک گھونپ دیا۔ کیوں نہیں آخر وہ رڈی کا باپ ہی تو تھا۔

لوکیو مڑا اور ڈینلا کو یاس بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بجھتی ہوئی آواز میں بولا۔ "شاباش ڈینلا میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں" اور وہ لڑھک کر رڈی کے پہلو میں جا لیٹا۔

ہماری آنکھوں کے سامنے رڈی پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زخم پر رکھی ہوئی بالوں کی لٹ کو دبائے ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو کھُلی ہوئی تھیں آسمان کو دیکھ رہی تھیں اور اس کے پہلو میں قدموں کے نزدیک لوکیو جوار کا بیجان جسم پڑا ہوا تھا۔ ہم خیالات میں کھوئے ہوئے کھڑے تھے بوڑھے ڈینلا کی کھُوری مونچھیں ہل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں خوفناک طور پر چمک رہی تھیں۔ دفعتہً اس نے کہا۔ "اچھا دوستو! خدا حافظ، آؤ اب کسی دوسری جگہ چلیں۔ ہمیشہ چلتے پھرتے رہو ورنہ سڑ جاؤگے۔"

اس قدر کہہ کر مارکر خاموش ہوگیا۔ اس کا پائپ بھی ختم ہوچکا تھا اُس نے زمین پر راکھ جھاڑی اور پائپ تھیلے میں رکھ لیا۔ بادل گرج رہے تھے اور رات ڈراونی ہوتی جارہی تھی۔ ایک ایک کرکے تمام گھوڑے آگ کے پاس چلے آئے تھے اور حلقہ کئے ہمیں بڑی بڑی سمجھدار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہائپ - ہائپ - اے ہیو!" مارکر نے انھیں بلایا اور جب وہ اپنے پیارے گھوڑے کی گردن تھپتھپا رہا تھا اس نے مڑکر مجھ سے کہا۔ "لیکن! رات زیادہ آگئی ہے اب سو جانا چاہئے"۔ اور لبادے کے ایک حصہ سے منہ ڈھانپ کر وہ لیٹ گیا اور جلد ہی خراٹے لینے لگا۔ لیکن میری آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ میں محبت کی اس انوکھی داستان اور اس دردناک انجام پر غور کر رہا تھا۔ میری آنکھیں تاریکی کے دامن کو چیرتی ہوئی سمندر کی شور مچاتی ہوئی موجوں کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اس تاریکی میں رڈی کا چاند جیسا خوبصورت چہرہ دکھلائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے کالے بالوں کی ایک لٹ سینے پر رکھ کر اُسے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھی۔ اس کے زخم کا خون اس کی پتلی اور نازک انگلیوں سے چھن چھن کر زمین پر ٹپک رہا تھا گویا جلتے ہوئے تارے ٹوٹ رہے ہوں اور اس کے پہلو میں اسٹیپس کا بہادر لوکیو جوار کھڑا ہوا تھا۔ اس کا وجیہ اور رعب دار چہرہ گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کے نیچے موٹے موٹے آنسو جھرنے کی طرح بہہ رہے تھے۔

اب مینہ پڑنے لگا۔ میں نے اندھیرے ہی میں دیکھا کہ لوکیو رڈی کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن دلکش راگ الاپنے والا لوکیو جوار غیور اور پھول کی طرح خوبصورت رڈی کو پکڑ نہیں سکتا۔

موجِ شمیم

(از جناب سید شمیم صاحب عسکری بی اے (آنرز) الہ آباد)

انساں کو چاہیئے نہ کسی پر گراں رہے
مثلِ نسیم رونقِ باغِ جہاں رہے

اس دارِ ابتلا میں نہ ہو خستہ دل کبھی
ثابت قدم ہمیشہ دمِ امتحاں رہے

ہر بات میں ہو صدق تو ہر فعل میں خلوص
جب تک بدن میں جاں رہے منہ میں زباں رہے

سمجھے مقدم اپنے فوائد پہ نفعِ خلق
سودا ہی ہو سودا رہے بازیاں رہے

ہرگز مٹے نہ منزلِ مقصود کی ہوس
ہو خاک بھی تو گردِ پسِ کارواں رہے

شاہانہ ہو بسر کہ گدایانہ ہو بسر
اقلیمِ دل میں سکۂ الفت رواں رہے

راحت کی آرزو ہو نہ تکلیف سے گریز
جو حال ہو اسی میں غرض شادماں رہے

زیبا نہیں ہے ظاہر و باطن میں اختلاف
دل میں اگر ہو درد تو لب پر فغاں رہے

گلشن میں تھے شمیم تو صحرا میں موجِ آب
وجہِ سرور بن کے رہے ہم جہاں رہے

تاثرات

از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی - بی - اے

(۱)

کیوں دبے پاؤں تھرکتی ہیں ہوائیں آج رات
غرق ہیں کس کے تصوّر میں فضائیں آج رات

تم بھی اے تارو اُتر آؤ فرازِ کوہ میں
عام کردوں گا صبوحی کی ادائیں آج رات

(۲)

جا رہی ہیں پانی بھرنے کیلئے پنہاریاں
گا رہے ہیں چند چرواہے ترانے دُکھ بھرے

اے مری مرحوم محبوبہ ترے کمزور ہاتھ
میں نے لہراتے ہوئے دیکھے گھٹاؤں کے پرے

(۳)

وہ ہوا چلنے لگی وہ کشتیاں اُڑنے لگیں
تن گئی ہیں رسّیاں اور بھر گئے ہیں بادباں

یوں ہی تم جب دُور کھیتوں سے بُلاتی ہو مجھے
جاگ اُٹھتی ہیں مرے قلب و جگر میں بجلیاں

(۴)

بادلوں کو چیر کر نکلی ہے اک چنچل کرن،
لوٹتی ہے ایک دوشیزہ کے سیمیں پاؤں میں

اُس کی آنکھیں بند ہیں اور اک ہراساں آرزو
مضطرب ہے لانبے لانبے گیسوؤں کی چھاؤں میں

(۵)

کل یہاں پنگھٹ پہ اک لڑکی کا ٹخنہ ڈھل گیا
سر پہ اک مٹی کی گاگر تھی شکستہ ہو گئی

اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی پھر کچھ بھی نہ تھا
جیسے اک ننھی سی مشعل آندھیوں میں کھو گئی

(۶)

گرم راتوں کا حبس، سانپوں کا ڈر، جھینگر کا شور
اک کھنڈر سے ایک لڑکی جھانکتی ہے بار بار

[illegible] سے لپک کر آگیا
وہ اُلجھ کر رہ گئے باہوں میں زُلفِ مشکبار

عمرو بن کلثوم تغلبی

عربی شاعری کا ایک درخشندہ ستارہ

از جناب حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد مولوی فاضل

عمرو بن کلثوم تغلبی عرب کے ان مایہ ناز فرزندوں میں سے تھا جو اسلام سے پیشتر کے زمانے میں اپنے کارناموں کی بنا پر آج تک صفحات تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ایام جاہلیت کی تاریخ پر اس قدر پردہ پڑا ہوا ہے کہ ہمیں صحیح واقعات بمشکل ہی معلوم ہوتے ہیں تاہم بعض دُھندلے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب اسلامی عہد سے پیشتر اگرچہ جاہل اور غیر مہذب تھے لیکن انسانی شرافت کے بہترین اوصاف سے خالی نہ تھے۔ خودداری، بیباکی جرات۔ مہمان نوازی و غیرت قومی عرب کے بچے بچے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی ایک مثال عمرو بن کلثوم تغلبی کی شخصیت ہے۔ جس نے عرب کی غیرت قومی۔ جرأت اور بیباکی کے اوصاف کا بہترین مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

عمرو بن کلثوم عرب کے شہرۂ آفاق اور تاریخی قبیلے بنو تغلب کا سردار تھا۔ اس کی والدہ لیلیٰ مہلہل کی بیٹی تھی جو عربی شاعری کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے۔ اسی مہلہل کے بھائی کلیب کی وجہ سے بکر و تغلب کی وہ مشہور و معروف طویل خانہ جنگی برپا ہوئی جس کے متعلق مولانا حالی مرحوم اپنے مسدس میں فرماتے ہیں ؎

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی!
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی!

عمرو بن کلثوم بذات خود بھی نہایت شجاع اور دلیر انسان تھا۔ وہ صاحب السیف ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب القلم بھی تھا۔ وہ ایک جادو بیان خطیب و لیکچرار تھا جو اپنی قوم میں مناسب وقت پر قومی غیرت اور شجاعت کی روح پھونک دیتا تھا۔ شعر و شاعری میں بھی جاہلیت کے شعراء میں بہت ممتاز مرتبہ رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے ایام جاہلیت کے مشہور "سبع معلقات" میں اس کا قصیدہ بھی شامل ہے۔

"سبع معلقات" ان سات نظموں کا مجموعہ ہے جو اپنی انتہائی حسن و خوبی کی بنا پر خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکائی گئی تھی اور ایام جاہلیت کی شاعری کے سات درخشاں تارے ہیں۔

شاعر موصوف کے حالات کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ عمرو بن ہند بادشاہ حیرہ کے قاتل کی حیثیت سے اس کا عبرت آموز واقعہ صفحات تاریخ کی زینت بنا رہے گا۔ یہ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں عمرو بن ہند شاہان حیرہ میں بہت بڑا بادشاہ تھا۔ اُسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ اور خیال کرتا تھا کہ اُس نے سرکش عربوں کو مطیع و محکوم بنا لیا ہے اور کوئی اس کے احکام کی روگردانی نہیں کرسکتا۔ اس نے ایک دن اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا۔ "عرب کے ملک میں کون سا ایسا شخص ہے جس کی والدہ میری والدہ کی خدمت کرنے کو عار سمجھے؟" اس نے جواب دیا۔ "بیشک آپ کا رعب و دبدبہ تمام قبائل عرب کے سرداروں پر چھایا ہوا ہے مگر اب بھی ایک ایسا شخص ہے جسے اپنی امارت و شرافت پر بڑا ناز ہے اور اس کی والدہ ہرگز آپ کی والدہ کی خدمت کرنا گوارا نہ کریگی۔ وہ شخص عمرو بن کلثوم ہے جس کا باپ معزز سرداران عرب کی نسل سے ہے۔ اور اس

والدہ بھی عرب کے مشہور ترین شخص مہلہل کی بیٹی ہے۔ یہ لوگ اپنی خاندانی شرافت و امارت پر اس قدر مغرور رہیں کہ کسی کی معمولی خدمت کو بھی مر جانے کے برابر سمجھتے ہیں۔"

عمرو بن ہند نے کہا۔" انہیں کسی حیلے سے بلانا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ ہماری خدمت سے کس طرح منہ موڑینگے۔"

چنانچہ عمرو بن کلثوم کو پیغام بھیجا گیا اور وہ اپنی والدہ کو لے کر اپنے لشکر کے ساتھ ساحل فرات پر آکر خیمہ زن ہوا۔ ان مہمانوں کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا۔ اور مہلہل کی بیٹی شاہی محلسرا میں پہنچائی گئی۔ ان کی آمد سے پیشتر ہی عمرو بن ہند نے اپنی والدہ کو سمجھا دیا تھا کہ کسی حیلے بہانے سے عمرو بن کلثوم کی والدہ کو کوئی چیز اٹھا دینے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ چنانچہ ان دونوں خواتین میں جب گفتگو کا آغاز ہوا تو باتوں باتوں میں عمرو بن ہند کی والدہ نے عمرو بن کلثوم کی والدہ سے کہا۔" ذرا یہ طباق تو اٹھا دو۔" اتنا کہنا تھا کہ مہلہل کی بیٹی آگ بگولہ ہوگئی۔ اور للکار کر بولی۔" اے لوگو بنو تغلب کی عزت کو بچاؤ۔" یہ سنتے ہی عمرو بن کلثوم اور اس کے ساتھیوں نے میان سے تلواریں نکال لیں اور عمرو بن کلثوم نے فوراً عمرو بن ہند کی گردن اڑا دی اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ دربار کا سارا ساز و سامان لوٹ لیں چنانچہ وہ سارے دربار کو لوٹ کر چلتے بنے۔ واپس آکر شاعر موصوف نے اپنی قوم کو وہ مشہور قصیدہ پڑھ کر سنایا جو سبعہ معلقات میں شامل ہے۔ عمرو بن کلثوم شراب کا بیحد عادی تھا اور افسوس ہے کہ کثرت میخواری کی وجہ سے اس کا جلد انتقال ہوگیا۔

شاعری

عمرو بن کلثوم کے اشعار کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں سے اس کا قصیدہ معلقہ زیادہ مشہور ہے۔ اس کا قصیدہ اس کی قوم کے لئے اس قدر مایہ ناز تھا کہ صدیوں تک اس کی قوم اس پر فخر کرتی رہی اس بنا پر ایک دوسرے قبیلہ کا شاعر تعریضاً کہتا ہے۔

اَلْھٰی بنی تغلب عَن کُلِّ مکرمۃٍ
قصیدۃٌ قالھا عمرو بن کلثوم

یعنی عمرو بن کلثوم کے قصیدے نے بنو تغلب کو بھلائی اور شرافت سے بے نیاز کردیا ہے اور ان کے پاس فخر نسب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ قدیم عربی شاعری کے طرز کے مطابق اس قصیدے میں جنگی کارناموں کا تذکرہ اور فخریہ اشعار ہیں۔ مگر سبعہ معلقہ کے دوسرے قصائد کے برخلاف اس کے اشعار میں سلاست و روانی زیادہ ہے۔ بشکل تشبیہ او استعارے بہت کم ہیں لیکن اشعار جوشیلے اور پراثر ہیں۔ چونکہ اس کی زندگی عام طور پر جنگوں میں گذری تھی اس بنا پر عاشقانہ اشعار (تشبیب) برائے نام ہیں۔ اور رزمیہ عنصر غالب ہے شراب کا عادی ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے خمریات ہی سے اپنے قصیدے کی ابتدا کرتا ہے اس بنا پر ہم اس کے قصیدے کو مندرجہ ذیل اصناف میں تقسیم کرتے ہیں (۱) خمریات (۲) تشبیب (عاشقانہ اشعار) (۳) رزمیہ شاعری۔ (۴) ذاتی اور نسبی فخر۔

اب ہم ہر ایک صنف میں سے شاعر موصوف کے بہترین اشعار کا سلیس ترجمہ اس کے کلام کی خوبی کو ظاہر کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں جس میں ان کے مطالب کی توضیح بھی ہوگی۔ یہ اشعار جاہلیت عرب کے صحرائی معاشرت اور معصوم جذبات کی صحیح تصویر ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ عربی شاعری ہماری ہندوستانی شاعری کے برخلاف مبالغہ۔ تصنع۔ غیر فطری تشبیہات و استعارے اور الفاظ کی آرائیوں سے کس قدر پاک و صاف ہے۔

خمریات

شاعر موصوف اپنے قصیدے کی ابتدا اس طرح سے کرتا ہے۔

(۱) اے میری محبوبہ بیدار ہو اور ایک بڑے پیالے میں مجھے صبح کی شراب اتنی پلا کہ اندرین (شام) کے علاقے کی شراب باقی نہ رہے۔

(۲) جب شراب میں گرم پانی ملایا جائے تو وہ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے اس میں زعفران ملایا گیا ہے۔

(۳) جب کوئی حاجتمند اور رنج والم کا مارا ہوا اسے منہ لگاتا ہے تو وہ تمام تفکرات کو بھول جاتا ہے۔

آگے چل کر شاعر موصوف یہ نیا اور اچھوتا خیال پیش کرتا ہے۔

(۴) جب شراب ایک تنگدل بخیل اور زر پرست طامع شخص کے سامنے لائی جائے تو یہ زر پرست اور سرمایہ دار بھی شراب کے اثر سے میخواری میں مال لٹانے سے دریغ نہ کریگا۔

(۵) اے ام عمرو! تونے جام شراب ہم سے اٹھا لیا حالانکہ جام شراب کی گردش دائیں طرف سے ہوتی ہے (یہ کیا ناانصافی ہے)

(۶) میں نے شراب کے بہت سے جام بعلبک، دمشق اور قاصرین میں نوش کئے۔

(۷) میں شراب اس لئے پیتا ہوں کہ موت جو ہماری تقدیر میں لکھی ہوئی ہے ہمیں عنقریب گھیر لیگی۔

تشبیب

شاعر موصوف اپنی محبوبہ کے سراپا کی تعریف کرنے کے بعد رقمطراز ہے

(۱) وہ اونٹنی جس کا بچہ گم ہوگیا ہو اور وہ اس کے فراق و اشتیاق میں چیخ و پکار کر رہی ہو اس قدر بےچین نہیں ہوسکتی جس قدر بےچینی مجھے محبوبہ کے فراق میں ہے۔

(۲) اور نہ اس بڑھیا کا واقعہ اتنا دردناک ہے جس کی بدنصیبی نے اس کے نو بچے نذر اجل کر دیئے ہوں۔

(۳) مجھے عشق و محبت کا وہ وقت یاد آتا ہے جب میری محبوبہ کے اونٹوں کی قطاریں شام کو گھروں کو واپس جایا کرتی تھیں اور ان کو دیکھ کر میری آتش شوق بھڑکتی تھی۔

(۴) اس وقت ہمیں یمامہ کی وہ بستیاں دکھائی دیں جو دور سے شمشیر زنوں کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں معلوم ہوتی تھیں۔

آج کل کے نازک طبع شاعروں کو اونٹنیوں سے عشق و محبت کے گہرے جذبات کی تشبیہ بری معلوم ہوگی اور اسی طرح اونٹوں کا تذکرہ بھی غیر مناسب معلوم ہوگا۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ فطری شاعر تھے شاعری کے نقال نہ تھے۔ آگے چل کر شاعر کا یمامہ کی منتشر بستیوں کا چمکتی تلواروں سے تشبیہ دینا ایک نادر اور اچھوتی تشبیہ اور صحرائی مناظر کا دلکش سین ہے۔

فخریہ اور رزمیہ شاعری

اپنے جنگی کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمرو بن ہند کے واقعہ کے متعلق شاعر کہتا ہے۔

(۱) تم لڑائی میں ہمارے مہمانوں کی طرح تھے اس لئے جلدی ہی ہم نے مہمانوں کی خاطر کر دی (یعنی انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا)۔

(۲) جب دشمن ہم سے دور ہوتے ہیں تو ہم نیزہ بازی سے کام لیتے ہیں لیکن جب وہ ہم پر آ پڑیں تو ہم تلواروں سے حملہ کرتے ہیں۔

(۳) ہم اس قدر بیباکی سے شمشیر زنی کرتے ہیں گویا ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں لکڑی کی تواریں ہیں جن سے کھیلنے والے بچے کھیلتے ہیں۔

(۴) جب ساری قوم آنے والے خطرہ سے ڈر کر پیش قدمی کرنے سے رک جائے۔

(۵) اس وقت ہم پہاڑوں کی طرح مضبوط لشکر کو لے کر اپنی عزت کو بچانے کے لئے سبقت کرتے ہیں۔

(۶) ایسے نوجوانوں کو لیکر آگے بڑھتے ہیں جو قتل ہو جانا اپنے لئے مایہ ناز سمجھتے ہیں۔ ہمارے بوڑھے بھی جنگوں کے آزمودہ سپاہی ہیں۔

شاعر موصوف آگے چل کر جنگ جوئی کا سبب بتاتے ہوئے عمرو بن ہند بادشاہ حیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں خامہ سرا ہے جن کے ہر لفظ سے حریت اور آزادی ٹپکتی ہے۔

(۷) خبردار! اقوام عالم یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم سست اور کمزور ہیں۔

(۸) دیکھو کوئی ہمارے ساتھ جہالت و حماقت کا ثبوت نہ دے (ہمارے ساتھ لڑائی مول نہ لے) ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کا ثبوت دینگے۔

(۹) اے عمرو بن ہند! ہم کس خیال سے تیرے حاکم کے مطیع ہوں؟

(۱۰) اور تو کس خیال سے ہمارے چغل خوروں کی بات مان لیتا ہے اور ہمیں حقیر سمجھتا ہے۔

(۱۱) تو ہمیں ڈراتا اور دھمکاتا ہے مگر ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہم تیری والدہ کے کب خدمتگزار تھے۔

(۱۲) تجھ سے پہلے کے دشمن بھی ہمارے نیزوں کو نرم نہیں کر سکے (ہم ان کے مطیع نہیں ہو سکے۔ تو کس شمار میں ہے)

(۱۳) کیا بنو جشم بن بکر کے پچھلے واقعات میں تمھیں ہماری کمزوری اور بزدلی کا کوئی واقعہ سننے میں آیا ہے؟

خواتین کی حمیت

اس زمانے میں عرب بہادروں کے دوش بدوش عرب کی بہادر خواتین بھی کام کرتی تھیں۔ انھیں کی حمیت اور غیرت عرب کے بہادر نوجوانوں کو سرفروشی پر مائل کرتی تھی۔ وہ جنگجو سپاہیوں کے ساتھ ساتھ گھوڑے کے پیچھے سوار ہوتی تھیں اور جنگی کاموں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتی تھیں۔ چنانچہ انھی واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے شاعر رقمطراز ہے۔

(۱) معرکہ جنگ میں ہمارے پیچھے گھوڑوں پر خوبصورت اور گوری عورتیں سوار ہوتی ہیں۔ جن کے متعلق ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا دشمنوں کی قید میں آجائیں اور وہ انھیں آپس میں بانٹ لیں یا ان کی بے عزتی کریں۔

(۲) ان خواتین نے اپنے خاوندوں سے عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ جب وہ کسی علم بردار دشمن سے مقابلہ کریں۔

(۳) تو وہ دشمنوں کی خودیں اور گھوڑے لُوٹ کر اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے قیدی ان کے پاس لائیں۔

(۴) جب وہ عورتیں چلتی ہیں تو ان کی رفتار نرم اور لچکدار ہوتی ہے جس طرح میخواروں کا بدن چلتے ہوئے تھرتھراتا ہے۔

(۵) وہ ہمارے گھوڑوں کو چارہ کھلاتی ہیں اور کہتی ہیں تم اگر ہماری حفاظت نہ کرسکوگے تو تم ہمارے شوہر بننے کے قابل نہیں ہو۔

(۶) نو حشم بن بکر کی یہ وہ معزز خواتین ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ساتھ شرافت اور دینداری سے بھی متصف ہیں۔

اخلاق و عادات کا نقشہ

شاعر اپنے قبیلہ اور خاندان کے اخلاق و عادات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

(۱) ہم اپنے سب آدمیوں پر بخشش کرتے ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں اور ہم پر قومی خدمت کا جو بوجھ وہ ڈالتے ہیں اسے بخوشی برداشت کرتے ہیں۔

(۲) ہم تمام قبائل میں سب سے زیادہ قول و قرار کے پابند اور وعدہ پورا کرنے والے ہیں۔

(۳) جب ہمارے پاس مال و دولت ہوتی ہے تو ہم مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں مگر جب ہمیں لڑائی میں آزمایا جائے تو ہم دشمن کو تباہ و برباد کرکے چھوڑتے ہیں۔

(۴) جو ہماری اطاعت کرے تو ہم ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر جو ہماری نافرمانی کرتے ہیں انھیں تباہ و برباد کرتے ہیں۔

(۵) جب کوئی بادشاہ لوگوں پر مظالم برپا کرے تو ہم اس کے ظلم کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ (نعرۂ آزادی)

عرب کے اس خوددار اور حریت پسند شاعر کے نمونہ کلام کو ہم اس کے نعرۂ آزادی پر ختم کرتے ہیں آئندہ کسی صحبت میں ہم یہ بتائیں گے کہ عربوں کی شاعری اسلامی عہد میں کہاں تک پہنچ گئی تھی۔ ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

غزل

از جناب سید اشفاق حسین صاحب رضوی لکھنوی

ناز و ادا سے ٹھوکریں منہ کے کوئی لگائے کیوں
حشر کا دن تو دُور ہے چودہ طبق ہلائے کیوں

قبر شہید ناز ہے کوئی اُسے مٹائے کیوں
زخم جگر سے چارہ گر پھاہا ابھی اُٹھائے کیوں

چہرہ کا رنگ زرد ہے دل میں جگر میں درد ہے
میں تو الم نصیب ہوں کوئی مجھے رلائے کیوں

مانا وہ پُر غرور ہے حشر کا دن تو دُور ہے
خون شہید ناز کا داغ کوئی مٹائے کیوں

رضوی نا سپاس کو اس کی ذرا نہیں خبر
جس کا قیام دل میں ہو پھر وہ اسے جلائے کیوں

خمسہ

بر غزل حضرت جگر مرادآبادی؛

از جناب وسیم احمد صاحب نیّر مارہروی

میری حالت کا انھیں کچھ اعتبار آ ہی گیا
رفتہ رفتہ قلب مضطر کو قرار آ ہی گیا
لو مبارک ہو کہ وقت انتظار آ ہی گیا
کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

میں محبت میں پھرا کرتا تھا جس کی کو بکو
ہائے وہ میری تمنا اور وہ میری آرزو
اب وہی میری نظر میں پھر رہا ہے ہو بہو
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

میری یہ حالت ہے تو وہ کس طرح مجھ سے ملیں
میں بھی ان سے خوش ہوں اور وہ بھی مجھ سے خوش نہیں
دیکھنے والے مرا دیوانہ پن بھی دیکھ لیں،
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھکو اعتبار آ ہی گیا

ابتدائے عشق میں ہم نے بہت صدمے سہے
بارہا آنکھوں سے اپنی خون کے دریا بہے
ہم بہت بیتاب پہلے دردِ فرقت میں رہے
درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے
دفعتہً پردہ ہٹا اور پردہ دار آ ہی گیا

دل ہی میں راز محبت تھا محبت کی قسم
یہ جنونِ عشق کا طرفہ ہوا مجھ پر کرم
کھل گیا دنیا پہ پھر میری محبت کا بھرم
ہاں سزا دے اے خدائے عشق اے توفیق غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکر یار آ ہی گیا

اپنے دل میں تھا اسی کی جلوہ آرائی کا شوق
قمریوں نے بھی اسی کے عشق کا پہنا ہے طوق
ہو گیا پیش نظر آخر ہمارے تحت و فوق
جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراج شوق
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ جان بہار آ ہی گیا

بڑھ رہی ہیں آج کل حد سے فزوں بیتابیاں
ہے کبھی شغل غزلخوانی کبھی آہ و فغاں
الغرض سر پر اٹھائے ہے زمین و آسماں
ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھکو پیار آ ہی گیا

یہ محبت میں پریشانی اٹھائی عمر بھر
کو بکو مارا پھرا اور سر کو پٹکا در بدر
عشق میں نیّر یہ کرنا ہی پڑا المختصر
جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا۔

ٹولی گردی:

گجراتی کے مشہور افسانہ نگار "دھوم کیتو" کی دلگداز کہانی

از جناب مولانا عبدالستار صاحب فاروقی کاٹھوی

۵۵ برس کی عمر میں نوکری سے علیحدہ ہوکر وہ اپنے دور — ہاں شہروں سے دور گاؤں میں جاکر اپنی چھوٹی، ہو پیاری بیٹی رادھا کے ساتھ اپنی زندگی کے بقیہ ایام گذارے گا — ندی کنارے والے مندر میں، صبح شام مورتی پوجا کو جایا کرے گا۔ اور شب کو مندر سے لوٹ کر روٹی کھانے کے بعد ہی میٹھی نیند کے مزے لیا کرے گا۔ اور ہر ماہ جو ساڑھے پندرہ روپیہ پنشن ملا کرے گی اس سے بیوپار ہاٹ کرکے سکھ چین کی زندگی بسر کرے گا۔

ان دل خوش کن منصوبوں میں مُنا ڈاکیہ اپنی پنشن کے دن گن رہا تھا وہ بچپن سے ہی دکھی تھا۔ ڈاک کے محکمہ میں مشغول زندگی بسر کرکے اور کم تنخواہ لے کر بھی وہ محض اپنی سادگی کی وجہ سے خوش رہتا تھا۔ اس کے دل میں بغض و حسد، کینہ اور کپٹ کے لئے جگہ نہ تھی۔ کئی برس سے بیوی کے مرنے کے بعد وہ صبح سویرے اُٹھ کر ساگ روٹی بنا لینے اور شام کو کھچڑی پکا لینے کا عادی ہوگیا تھا۔

مُنا غریب سب کی ڈاک وقت پر پہنچا دیا کرتا تھا۔ گاہے گاہے وہ کسی کو دھول پاکر ساگ بھاجی مانگ لیتا تھا اور کبھی کھیت کے کنارے سے چلتے چلتے گنے کا ایک ایسا چھوٹا سا پودا اکھاڑ لیتا جو بآسانی اکھڑ سکتا ہو۔ اتنی چھوٹی سی چوری کے سوا وہ اور کوئی پاپ نہ کرتا تھا۔ ملازمت میں سوائے خط تقسیم کر دینے کے اس کے ذمہ اور کوئی کام نہ تھا۔

بیوی کے مرجانے کے بعد اس نے کبھی دوسری شادی کا خیال نہ کیا۔ لڑکے کے بڑے ہوتے ہی اس کی شادی کر دی۔ بہو کو گہنے پہنائے اور اپنے لڑکے کی اتنی مدد کردی کہ وہ تجارت کرکے بآسانی اپنی روٹی کما سکے۔ اپنی قلیل تنخواہ میں بائیں سے اتنے کام کئے تھے اور یہ سب نتیجہ تھا اس کے پیسے جمع کرنے کی عادت کا۔

عمر بھر ایک دُھن میں لگے رہنے اور روزانہ سچائی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے رہنے سے ایک ڈھنگ پر اس کی طبیعت بن گئی تھی سادگی اس کی فطرت تھی۔ کسی سے واسطہ نہ رکھنا اس کی عادت تھی۔ اس کا مبلغ علم رامائن اور گیتا کے پڑھ لینے تک محدود تھا۔ سچ پوچھو تو اُسے گیتا پڑھ لینے میں اتنا مزا نہ ملتا تھا جتنا رامائن پڑھنے میں۔ بات یہ تھی کہ اُسے رامائن اپنی کہانی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بھی بڑی مشکل سے اپنی کشتی کو کھیتے ہوئے ساحل کے قریب لایا تھا۔ وہ برسوں سے تنہا تھا اپنے بہو بیٹے کو دیکھ کر جی رہا تھا۔ اُس کے لئے زندگی میں اور خوشی بھی کیا تھی؟ نہ کبھی محلے پڑوس میں بیٹھتا نہ کسی سے ملتا جلتا۔ پڑوسی کھیل تماشے سے لوٹتے۔ نوجوان سینما سے واپس ہوتے تو مُنا اپنے بستر پر پڑا گنگناتا رہتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سارے گاؤں میں حکومت کے خلاف تحریک اُٹھی۔ سرکاری ملازمین نوکریاں چھوڑنے کیلئے تیار ہوگئے سب کی یہی خواہش تھی کہ مُنا بھی اس میں شامل ہوجائے تو ایک مثال ہوجائے گی۔ پولیس پٹیل بھاگ گیا تھا۔ ڈاکٹر بھی بیٹھ گیا تھا بس مُنا کے استعفیٰ کی دیر تھی۔

ایک بیس پچیس سالہ نوجوان مُنا کے پاس آیا۔ وہ گاؤں کا ایک بڑا پرجوش کارکن تھا۔ اس نے بہت قربانی کی تھی۔ اس کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک خاص وزن رکھتا تھا۔

"مُنا" —!

مُنا نے اندھیرے میں دیکھا کہ ایک نوجوان سامنے کھڑا ہے۔

"کون —؟" اُس نے پوچھا۔

"میں اجیت ہوں۔"

"اوہو! تم محمد غریب کے گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"اب کوئی غریب نہ رہے گا ۔ ماسٹر نے استعفیٰ دیدیا ہے ۔ پولیس بھی الگ ہوگئی ہے ۔ اب تو ہی باقی رہ گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بول ؟"

مناّ کانپ گیا ۔ اس کے سامنے کبھی یہ سوال پیش نہ ہوا تھا ۔

"بھائی میرے پیچھے چھوٹی بڑی کئی جھنجھٹیں ہیں۔"

"کیا دوسرے کے پیچھے نہیں ہیں ؟"

"لیکن بھائی ! میں غریب آدمی ہوں ۔ دو برس کے بعد سکھ کی روٹی کا خیال دامنگیر ہے ۔ مجھ ایک شخص کے تحریک میں حصہ نہ لینے سے تمہارا کیا بن یا بگڑ جائے گا ؟"

اور بھی دو چار نوجوان آگئے ۔ ان کے بعد ہی لوگوں کی ٹولی آ گئی ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا ۔ "بول استعفیٰ دیتا ہے کہ نہیں ؟"

"مجھے بڑا پیار ہے آرام سے روٹی نہ ملیگی ۔ ساری عمر میں نے کبھی آرام نہیں کیا ۔ تم نے آرام کیا ہے کمپنیاں بنائی ہیں جشن کئے ہیں اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ "

[illegible]

"بولو ۔ ۔ ۔ ۔ "مناّ" کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"لیکن ارے بھائی میں غریب آدمی ہوں ۔ کچھ بولتا نہیں ، تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا ۔ محمد غریب کے گھر کے آدمی دانہ پانی حاصل کرسکیں اس لئے دو چار کر رہا ہوں ۔"

"بولو ! مناّ کا ۔ ۔ ۔ ۔ " ایک آواز سنائی دی ۔ "بائیکاٹ"

"بولو : اہنسک ۔ ۔ ۔ " دوسری آواز آئی "بہشکار"

"اس کے ساتھ بات کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ "

"حرام ——"

"اس کے ساتھ بولنا ۔ ۔ ۔ "

"حرام ——"

"اس کے ساتھ بیوپار ۔ ۔ ۔ ۔ "

"حرام ——"

اس دوران میں ٹولی میں کچھ اور لوگ آکر شریک ہوگئے ۔ آنکھ جھپکنے کی دیر میں کیا سے کیا ہوگیا اس کو مناّ سمجھنے سے قاصر تھا ۔ ابھی مناّ نے انجام پر غور کرکے کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ مجمع یہ شور کرتا ہوا چل نکلا کہ "مناّ کا پورن بہشکار —— جو اس سے بولے اس کا بہشکار —— اس کا بیوپار بند ۔ بولو راشٹروادکی جے —— انقلاب زندہ باد۔"

مناّ کا مکمل بائیکاٹ کرکے یہ ٹولی دوسرا گاؤں سر کرنے کے لئے روانہ ہوگئی ۔ دوسرے دن مناّ ڈاک لیکر نکلا ۔ کوئی اس سے دست بدست چٹھی نہ لیتا تھا ۔ بولنا تو الگ رہا کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتا تھا ۔ [illegible] کبھی کبھی مناّ [illegible] دو چار منٹ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے [illegible] نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے [illegible] مناّ [illegible] مناّ اب [illegible] مناّ [illegible] اس کو دیکھ کر عورتیں [illegible] اپنے گھر آکر [illegible]

[illegible]

انسان کی آواز سُنے بغیر منّا کا چہرہ بھوت زدہ آدمی کی طرح ہو گیا تھا۔

چوتھا دن ——— منّا پاگل سا معلوم ہونے لگا۔

پانچواں دن ——— دماغ اور دل بیٹھا جاتا تھا۔

چھٹا دن ——— منا بیمار پڑا ہے اس کو کہیں سے دودھ نہیں ملتا۔ چھاچھ نہیں ملتی۔ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ ساگ بھاجی نہیں ملتی۔ کھچڑی کا سامان بھی ختم ہو گیا ہے۔ کوئی دیتا نہیں۔

ساتواں دن ——— اس میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ کہیں جا کر کچھ لے آئے یا گنّے کے کھیت میں جا کر ترئی توڑ لائے۔

آٹھواں دن ——— منّا کی بیماری بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنی کوٹھری میں بند ہے۔ مالک مکان نے گھر خالی کر دینے کی تاکید ہے۔ وہ بیچارا سب کی مہربانی سے یہاں رہتا تھا۔ کل وہ کہاں جائیگا۔ اس فکر میں تھا کہ اُسے پوسٹ آفس کے برآمدے کا خیال آیا اور اُس نے گھر کا خیال چھوڑ دیا۔

نواں دن ——— منّا رات دن پوسٹ آفس کے برآمدے میں کھلی ہوا میں پڑا رہتا ہے۔ کوئی اس کا کام نہیں کرتا۔ کوئی اس سے بات نہیں کرتا اس کو جو کچھ ملتا ہے اسی پر اکتفا کرتا ہے۔ اُس نے چھٹی اور تبدیلی کی عرضی بھیجدی ہے۔ ماسٹر یہ   ٹولی کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ بغیر استعفیٰ دیئے چھٹکارا نہ ہوگا۔ بائیکاٹ ابھی اور سخت کیا جائے گا۔

دسواں دن ——— منّا بیماری کی حالت میں بستر پر پڑا کراہ رہا ہے کہ ایک نرم آواز اس کے کانوں میں آئی "منّا کاکا" کئی دن کے بعد یہ میٹھے الفاظ سُن کر منّا خوشی سے پاگل ہو گیا۔

"کون؟ ... یہ کون ... ؟ بھائی! تم کون ہو؟"

"منّا کاکا! میں رادھا ———"

"ہیں ... ہیں ... ؟" "کیا میری پتری رادھا آئی ہے؟" یہ خیال کرتا ہوا منّا اُٹھ بیٹھا۔ "بیٹی رادھا! تو کہاں سے آئی؟"

"کاکا! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں اجیت کی پتری رادھا ہوں۔"

دین بھگت اجیت کی پتری رادھا اس وقت خاموشی کے ساتھ منّا کے لئے کھچڑی لے کر آئی تھی۔ "کاکا! کھچڑی لے لو"

"نہیں بیٹی! کسی کو پتہ چل گیا تو تیرا بھی بہشکار ہو جائیگا۔ مجھے اب کتنے دن رہنا ہے آج نہیں تو کل چلنے کی تیاری ہے۔"

"کاکا! کسی کو پتہ نہیں ہے"

"بیٹی تو لڑکی ہے۔ سمجھ نہیں سکتی۔ اتنی بڑی سرکار کو ہٹانے کے لئے نکلے ہوئے لوگ کہیں نرم ہو سکتے ہیں۔ ان کے پاس تو ہر ایک کے سماچار (خبریں) جاتے ہیں۔ ارے کوئی نہیں تو یہ دھرتی ہی انہیں کہہ آئے گی"

"کاکا ... "

"نہیں بیٹی! تیری پریت پہنچ گئی" مگر رادھا نہ مانی وہ کھچڑی رکھ کر چلی گئی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ سردی میں صرف چادر اوڑھ کر منّا لیٹا رہا ——

دوسرے دن گاؤں کی حکمران ٹولی کے سامنے منّا کے پورن بہشکار کو کم کرنے کا سوال درپیش ہوا۔ اسی اثنا میں رادھا نے افسوس کے ساتھ یہ خبر سنائی کہ "منّا ٹھنڈا ہو گیا"

یہ سُنتے ہی سب کے چہرے سوکھ گئے۔ "ہیں ——؟" کسی نے کہا۔

"اس کی لڑکی۔ لڑکا اور لڑکے کی لڑکی سب اس کے گرد بیٹھے رو رہے ہیں۔ کل بڑی رات ہو گئی تھی جب یہ لوگ پہنچے اس وقت منّا آخری سانسیں لے رہا تھا"

یہ قصہ سُن کر اس بے مطلب کی جوشیلی فوج کے سردار کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بھرّائی ہوئی آواز سے اُس نے کہا۔ "بہشکار کی تلوار کو میں میان میں رکھتا ہوں۔ میں اب سمجھ گیا ہوں کہ جماعتی تنظیم اور ٹولی گردی میں کتنا باریک فرق ہے۔ اس فرق کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگر اس فرق کو نہ پہچانا گیا اور اسی طرح ٹولی گردی رہی، تو اس سے بڑھ کر تباہ کن اور بربادی لانے والی اور کوئی چیز نہ ہوگی پر امن بائیکاٹ میں بھی بے رحمی کا پہلو نکلتا ہے۔ اب مجھے اس غریب کے خاندان کے لئے پیسہ جمع کرنا ہوگا۔ تم اپنا دوسرا سردار ڈھونڈ لو"

دُور سے منّا کی پتری رادھا کے رونے کی دلفگار صدائیں آ رہی تھیں۔ حاضرین میں اکثر لوگ پژمردہ تھے اور کچھ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

داستاں میری!

از حضرت دُما ڈبائیوی

کہیں وہ داستاں اپنی سُنیں وہ داستاں میری
زہے قسمت! اگر ایسی بھلا قسمت کہاں میری

محبّت کا فسانہ اور پھر طرزِ بیاں میری
زمانے بھر کا قصہ بن گئی اک داستاں میری

پیامی کیا سُنا سکتا ہے اُن کو داستاں میری
کوئی اُس کے دہن میں کاٹ کر رکھدے زباں میری

قیامت تک یونہی جاری رہیگی داستاں میری
یہ مرگِ عشق ہے گویا حیاتِ جاوداں میری

زہے قسمت وہ خود آئے تھے سننے داستاں میری
مگر جب اُن کو دیکھا رُک گئی مُنہ میں زباں میری

یہ مجھسے کہدیا ظالم نے اظہارِ محبّت پر
ذرا میں بھی تو دیکھوں دل میں اُلفت ہے کہاں میری

ہر اک اُفتاد پر بڑھتا گیا جوشِ طلب میرا
رہِ اُلفت میں کام آئیں مرے ناکامیاں میری

ابھی تم حضرتِ دل بے خبر ہو رسمِ اُلفت سے
تمہیں تو بس یہ لازم ہے ملاؤ ہاں میں ہاں میری

زمانہ کہہ رہا ہے مجھکو دیوانہ محبّت کا
مری شہرت کا باعث بن گئیں رسوائیاں میری

یہ اعجازِ محبّت دیکھ کر ناصح بھی حیراں ہے
جہاں ہے تذکرہ اُن کا وہیں ہے داستاں میری

انھیں آنسو نہ سمجھو جو گرے ہیں یادِ جاناں میں
سُناتے ہیں زبانِ حال سے یہ داستاں میری

چھپایا لاکھ پھر بھی رازِ الفت کھُل گیا سب پر
مرے چہرے سے ظاہر ہوگئیں بیتابیاں میری

چلو یونہی سہی میں ہی جفا جو ہوں ستمگر ہوں
مجھے خاموش رہنے دو نہ کھلواؤ زباں میری

بلا میں پھنس گیا دو تنکے رکھ کر صحنِ گلشن میں
کمیں میں ہے چرخ میری تاک میں برق تپاں میری

وہ کیوں ہیں بے وفا اُن سے کوئی جا کر نہیں کہتا
مگر اندھیر دیکھو پکڑی جاتی ہے زباں میری

جو سُنتا ہے وہی پہروں کفِ افسوس ملتا ہے
کچھ ایسی درد میں ڈوبی ہوئی ہے داستاں میری

دُما میں محتسب کے ڈر سے توبہ کر نہیں سکتا
ابھی دل بھی جواں میرا تمنا بھی جواں میری

امیر مینائی کا طریق اصلاح

از جناب مولانا عبد القیوم صاحب ندوی

ارباب علم نے علم شعر کو صناعت اور کاریگری سے تعبیر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ جس طرح ایک صناع اپنی مصنوعات کی تیاری میں اپنا ظاہری اور باطنی پورا کمال صرف کر دیتا ہے اور جب اس کو ہر طریقہ سے جانچ لیتا ہے اور صوری و معنوی تمام خرابیوں کو دور کر دیتا ہے تو منظر عام پر لاتا ہے۔ بعینہ یہی چیز شعر و شاعری میں ہے اور باکمال صناع یا مصوّر کی طرح اپنے کہے ہوئے شعر کو اسی وقت پیش کرے جب ظاہری، باطنی، صوری اور معنوی اور نیز تمام قسم کی خرابیوں سے پاک و صاف کر لے۔ باطن میں اگر اس قدر رفعت ہو کہ ثریا اس کے پاؤں چومے تو ظاہر میں بھی وہ کمال ہو کہ الفاظ زمرد اور لعل کے ترشے ہوئے ٹکڑے معلوم ہوں جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔

دُنیا میں اصلاح کا طریقہ جو رائج ہے وہ صرف اس چیز کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ ظاہر و باطن میں جو نقائص ہوں وہ اصلاح سے دور ہو سکیں۔ در حقیقی طور سے شاعری فطرت سے تعلق رکھتی ہے اور اگر یہ جذبہ شاعر میں نہ ہو تو اسے بڑے سے بڑا اُستاد بھی شاعر نہیں بنا سکتا۔ البتہ اس کا عکس ممکن ہے یعنی اگر جذبہ اور صحیح ذوق موجود ہے تو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں مگر ان کے کوئی اُستاد نہیں تھے۔ چنانچہ امرا القیس، عمرو بن کلثوم۔ ربیعہ اعشیٰ۔ فرزدق۔ خنسا۔ حسان۔ متبنی۔ بحتری۔ لبید۔ عبد البکری۔ اعمیٰ اخرس۔ حبان۔ فرخی۔ فردوسی۔ سعدی۔ حافظ۔ فیروزی۔ عرفی۔ میر تقی غالب۔ مومن۔ ناسخ وغیرہم مشہور اور باکمال شعراء گزرے ہیں کہ ان کے اساتذہ سخن کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ بلکہ انھوں نے جو کچھ کمال اور شہرت حاصل کی وہ صرف ان کی فطرت اور ذوق کی رہین منت تھی۔

بہر حال اُستاد جو کچھ کر سکتا ہے وہ ٹوٹے پھوٹے کو بنا سکتا ہے۔ لیکن سرے سے جذبہ شاعری پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں گویا وہ ایک حکیم ہے جو جسم کی عارضی خرابیوں کو تو دور کر سکتا ہے مگر جسم کا پیدا کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ اصلاح کا کمال یہ ہے کہ جب اُستاد کسی شعر پر اصلاح دے تو پھر لفظاً اور معناً اس سے بہتر اور بلند درجہ اس کے بعد اس میں نظر نہ آئے اور درستی کی پھر مطلقاً کسی طرح سے گنجائش نہ رہے۔ پھر یہ بھی مد نظر رہے کہ الفاظ کی زیادہ کانٹ چھانٹ نہ ہو بلکہ صرف ایک یا دو لفظوں کے رد و بدل سے وہ بلاغت پیدا ہو جائے کہ سامع بیخود ہو جائے۔ ایسے ہی باکمال اساتذہ میں حضرت امیر مینائی بھی ہیں جن کی اصلاح میں یہ چیز ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور ان کا یہی طریق اصلاح ہے کہ جس کی بدولت ریاض و برہم۔ دل و جگر۔ اور عابد و زاہد جیسے باکمال ادیب اور شعر و سخن کے ایسے نامور اساتذہ پیدا ہوئے کہ جن سے اس خزاں رسیدہ باغ ادب میں کچھ کچھ بہار کی جھلک باقی ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم

ریاض۔ نسیم آئی ہے شمع مزار گل کرنے،
وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہوگی

اصلاح۔ نسیم اب آئی ہے شمع مزار گل کرنے،
وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہوگی

صرف ایک لفظ "اب" کے اضافہ نے شعر میں کیسی کچھ بلندی پیدا کر دی ہے اور نہ صرف معنوی حیثیت سے شعر میں بلندی اور پختگی پیدا ہو گئی ہے بلکہ لفظی اعتبار سے بھی جو خوبی اور سلاست اب پیدا ہو گئی پہلے نہ تھی۔

ریاضؔ ؎ ہنگامِ نزع گریہ بیاں بیکسی کا تھا
آئی تباہیں کون یہ موقع ہنسی کا تھا

اصلاح ؎ ہنگامِ نزع گریہ بیاں بیکسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

دیکھیئے "تم ہنس پڑے" کے اضافہ نے کیا کرشمہ دکھایا ہے اور اب شعر میں کیا بلاغت اور ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ ریاضؔ کے شعر میں ہنسنے کا کافی ثبوت نہ تھا مگر اب اضافہ کے بعد کافی ثبوت بہم پہنچ گیا ہے اور اب اس قدر عام فہم و سلیس ہوگیا ہے کہ سننے والے کو ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ پھر الفاظ کی بندش اس قدر عمدہ اور رواں ہوگئی ہے کہ زبان پھسلی جاتی ہے اصلاح کیا ہے مُردہ قالب میں جان ڈال دی ہے۔

ریاضؔ ؎ لے اُڑے گیسو پریشانی مری
آئنے لے بیٹھے حیرانی مری

اصلاح ؎ لے اُڑے گیسو پریشانی مری
آئنے لے بھاگے حیرانی مری

"لے بیٹھے" کی جگہ "لے بھاگے" بنایا کیونکہ "لے بیٹھے" میں ایک پہلو ذم کا بھی نکلتا تھا۔ پھر لفظی حیثیت سے "لے اُڑے" کے مقابل "لے بیٹھے" کچھ مناسب نہ تھا بلکہ "لے بھاگے" میں جو حُسن اور خوبی ہے وہ پہلے ہرگز نہ تھی۔

جناب زاہد صاحب رئیس سہارنپور

زاہدؔ ؎ اس طرح محفل میں کیوں آئے کہ رسوائی ہوئی
بال بکھرے سی چھوٹی آنکھ شرمائی ہوئی

اصلاح ؎ کیوں بھری محفل میں یوں آئے کہ رسوائی ہوئی
بال بکھرے سی چھوٹی آنکھ شرمائی ہوئی

"بھری" کے لفظ نے کیا خوبی اور حُسن پیدا کر دیا ہے اور پھر سلاست اور روانی جواب پیدا ہوگئی ہے تعریف نہیں کی جاسکتی۔

زاہدؔ ؎ آہ ہم سے دوستوں نے دشمنی کی اس قدر
دشمنوں کی دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا

اصلاح ؎ دوستوں نے دوست بنکر دشمنی کی اس قدر
دشمنوں کی دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا۔

دوستوں کی دشمنی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہے
مگر ان دوستوں کی دشمنی جو دوست بن کر اور دوستی کے مدعی ہو کر کریں یقیناً
نہایت اہم اور ضرر رساں ہوا کرتی ہے اس لئے اصلاح میں اس چیز کا خاص
خیال رکھا گیا اور اب جو بلاغت اور حسن پیدا ہو گیا ہے وہ پہلے نہ تھا اور
پھر الفاظ میں ایسا تناسب آگیا ہے کہ شعر موتیوں کا ہار معلوم ہو رہا ہے۔ کیا
عمدہ اصلاح دی ہے۔

زاہد ؎ عرق جبین بتِ شعلہ رنگ پر یوں ہے
عیاں ہو آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

اصلاح ؎ عرق جبین بتِ شعلہ رنگ پر یوں ہے
بھڑکتی آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

"بھڑکتی آگ" نے شعر کو کتنا زوردار بنا دیا ہے اور اس سے
معنوی خوبی میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ "شعلہ رنگ" کے تناسب سے "بھڑکتی"
کا لفظ کتنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔

زاہد ؎ حیران ہوں اللہ عجب ذات ہے تیری
پوشیدہ نگاہوں سے بھی اور نورِ نظر بھی

اصلاح ؎ حیران ہوں اللہ عجب ذات ہے تیری
پوشیدہ نگاہوں سے بھی اور پیشِ نظر بھی

"نورِ نظر" سے صرف محبت اور کشش کا اظہار تھا۔ سامنے رہنے کے
معنی بہرحال نہیں پائے جاتے تھے۔ اب "پیشِ نظر" سے اگر ایک طرف "پوشیدہ نگاہوں"
کا صحیح تقابل ہو گیا تو دوسری طرف جو مقصد تھا وہ بھی نہایت حسین طریقہ سے
ادا ہو گیا۔

زاہد ؎ دھڑکا شب تاریک لحد ہی کا نہیں ہے
سنتے ہیں کہ اس شب کی قیامت ہی سحر بھی

اصلاح ؎ دھڑکا شب تاریک لحد ہی کا نہیں ہے
سنتے ہیں کہ اس شب کی قیامت ہی سحر بھی

"ہی" کا لفظ انحصار کے لئے ہے اسے لحد کے بعد ہی ہونا چاہئے تھا
ورنہ جو مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوتا۔ اب صرف تقدم کرنے سے شعر میں کیا لطافت
اور بلندی آگئی ہے۔

زاہد ؎ تیغ ناحق کھینچتے ہو دم ہی بسمل میں نہیں،
ہاتھ رو کو کیا ستم کرتے ہو ہا ہا دیکھ کر

اصلاح ؎ تیغ کس پر تولتے ہو دم ہی بسمل میں نہیں
ہاتھ رو کو کیا ستم کرتے ہو ہا ہا دیکھ کر

اس اصلاح کے متعلق حضرت امیرؔ مرحوم کا جو خیال ہے ہم اُسے
یہاں درج کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"تولنے میں جو خوبی ہے وہ کھینچنے میں نہیں۔ ماشاء اللہ
چشم بد دور کیا قافیہ اور کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ اب تو
آپ زبان اور محاورات خوب ہی لکھتے ہیں"

امیرؔ فقیر یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء

حکیم برہمؔ مرحوم ایڈیٹر مشرق گورکھپور

برہمؔ ؎ غضب کی شوخیاں کرنے لگی ہے
نظر کس سے ارے ظالم لڑی ہے

اصلاح ؎ غضب کی شوخیاں کرنے لگی ہے!
ارے ظالم نظر کس سے لڑی ہے؟

ذرا سے الفاظ کے رد و بدل سے شعر کیسا سلیس اور رواں ہو گیا ہے
اور جو تعقید تھی وہ بھی اب دور ہو گئی ہے پھر لطف یہ کہ الفاظ نہ کم ہوئے
اور نہ زیادہ۔ اصلاح اسی کا نام ہے۔

برہمؔ ؎ درباں سے پوچھتا ہے یہ دشمن کہ سچ بتا!
کل تک یہاں پڑا تھا وہ بیمار کیا ہوا؟

اصلاح ؎ درباں سے پوچھتا ہے یہ عیسیٰ نفس بتا!
کل تک یہاں پڑا تھا جو بیمار کیا ہوا؟

بیمار کی مناسبت سے "عیسیٰ نفس" کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پھر دوسرے
مصرع میں "وہ" کی بجائے "جو" ایک خاص معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قرارؔ ؎ بیحد دبا رہے ہیں ہمیں تختۂ لحد
ہم جانتے تھے زیر زمیں آسماں نہیں

اصلاح ؎ کیا کیا دبا رہے ہیں ہمیں تختۂ لحد
ہم جانتے تھے زیر زمیں آسماں نہیں

"کیا کیا" کے اضافہ سے شعر میں جو بلاغت اور حسن پیدا ہو گیا ہے
وہ "بیحد" میں ہرگز نہ تھا۔

قرار ؎ احباب چارہ ساز بنے ہیں شبِ فراق
تبدیل ہو نہ صورتِ زخمِ جگر کہیں،

اصلاح ؎ ہمدرد چارہ ساز بنے ہیں شبِ فراق
تبدیل ہو نہ صورتِ زخمِ جگر کہیں

"زخم جگر" کی مناسبت سے ہمدرد کا اضافہ اور احباب کی ترمیم کی گئی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دوست ہو مگر کسی خاص امر میں ہمدرد نہ ہو۔ البتہ یہ ناممکن ہے کہ ہمدرد ہو اور دوستانہ ہو انتہائی باریک اور نازک اصلاح ہے اور دیکھئے کہ اب شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

کوثر ؎ چھپانا رازِ الفت تاڑنے والوں سے مشکل ہے۔
گواہ دردِ فرقت خود مری بیتابئ دل ہے

اصلاح ؎ چھپانا رازِ الفت تاڑنے والوں سے مشکل ہے
گواہِ دردِ الفت خود مری بیتابئ دل ہے!

پہلے مصرعہ میں رازِ الفت تھا اس لئے دوسرے مصرعہ میں دردِ فرقت کچھ زیادہ بلیغ نہ تھا اب الفت کے اضافہ نے کیا خوبی اور ندرت پیدا کر دی ہے۔

عروسِ خیال

(حضرت اختر - بنڈوئی (بہار))

شرابِ نور میں ڈوبی ہوئی تھی رات کی چادر
ردائے کیف بنکر مرتعش تھی روئے دنیا پر

لئے تھی کہکشاں ہاتھوں میں اپنے "چاند کا ساغر"
حسین فطرت کو دیتی تھی شرابِ کیف بھر بھر کر

حسینانِ فلک پہنے ہوئے تھے نور کے گہنے
جوانانِ چمن مسحور تھے محوِ تماشا تھے

چھلک کر نغمۂ رنگیں خمِ فطرت سے بہتا تھا
ہر اک قطرے سے بیخانہ ترنم کا ابلتا تھا

جنہیں لے کر ہوا کاندھوں پہ اپنے رقص کرتی تھی
چمن کی پتّی پتّی میں مئے گلرنگ بھرتی تھی

مناظر کے گلِ رنگیں سے بیٹھا کھیلتا تھا میں
تصوّر کی حسیں دیوی کی پوجا کر رہا تھا میں

تخیّل نے پرِ پرواز بخشا میری نظروں کو
تجسّس لے اڑی عرشِ بریں تک میری فکروں کو

جوانی کی امنگیں بادۂ گلنار بن بن کر
چھلک اٹھیں فضائے بزم میں اشعار بن بنکر

نظر آئی ہجومِ شعریت میں ایک شہزادی
کہ جس کے دم سے قائم تھی چمن کی ساری آبادی

نسائیت کے دامن میں بہارِ رنگ و بو لے کر
نشیلی انکھڑیوں میں مستئ جام و سبو لے کر

قریب اس کے رواں تھا ایک گوہر بار فوّارہ
کنول کے پھول میں ہو "جل پری" کا جیسے گہوارہ

اگلتی تھیں پھواریں سچّے موتی کے حسیں دانے
جو تاجِ حسنِ فطرت میں چمک کر ٹنکے جاتے تھے

مری آنکھوں نے پھولوں کی یہ نزہت باریاں دیکھیں
کہ دیدہ ہائے فطرت میں گلابی دھاریاں دیکھیں

پھنسا رکھے ہوں جیسے "ابلقے" رنگیں ڈوروں میں
بھری ہو جیسے پگھلی آگ کچھ اجلے کٹوروں میں

ذرا کچھ دور فوّارے سے حوضِ سنگِ مرمر تھا
کہ پانی جس کا گویا خونِ رنگین کبوتر تھا

بہایا تھا کسی نے گھول کر لعلِ رقیق اس میں
ملایا تھا کسی نے پیس کر شاید عقیق اس میں

لب جو بیٹھا اک سرخاب کا رنگین جوڑا تھا
جو عنوانِ وصال و ہجر پر تنقید کرتا تھا

انتخابِ سخن:

غزل

از جناب اسمٰعیل احمد صاحب مینائی تسنیم

سمجھ رہا تھا جسے طرز رُخ چھپانے کی
وہ اک ادا تھی نگاہوں کو آزمانے کی

بدل بدل کے وہ سُرخی مرے فسانے کی
لکھا رہے ہیں کہانی وہ کُل زمانے کی

ترے جمال کی رنگینیوں نے کھینچ لیا
ہزار سعی کی میں نے نظر بچانے کی

جلا کے بھی نہیں جاتی ہے برق کی شوخی
چمک کے شکل بناتی ہے آشیانے کی

مدارِ کار تھا گر عقل کی سفارش پر
کب احتیاج تھی پہلو میں دل بسانے کی

مری امید کی دنیا کے مالک و مختار ہو
اُجاڑنا بھی ہے کیا کوئی رہ بسانے کی

تمہاری برق نگاہی پہ حرف آتا ہے
کہ ضبطِ عشق پہ تہمت ہے دل جلانے کی

لگا کے لائی ہے جلوؤں کو تیرے میری نظر
اب احتیاج نہیں مجھ سے رُخ چھپانے کی

کلیم جس کی تجلی کی تاب لا نہ سکے
وہی ادا ہے ہنوز اس کے [illegible] کی

یہی سمجھ کے اسیرِ قفس پہ رحم کرو
کہ اس کو یاد نہ بھولیگی آشیانے کی

بیک نگاہ جو قصہ بھلا دیا تم نے
وہی تو جان تھی تسنیم کے فسانے کی

تخیلاتِ شیدا

از جناب عبدالرشید شیدا گجراتی

کب مجھ کو محبت کا گنہگار کروگے
عالم کی نگاہوں میں خطاوار کروگے

آخر کبھی رنگ اپنا دکھائینگی وفائیں
کب تک مری اُلفت سے تم انکار کروگے

وہ تاروں بھری رات کو دریا کے کنارے
پہلے کی طرح اب بھی مجھے پیار کروگے

جس راہ سے گذروگے تم اے جانِ تمنا
ہر ذرّے کو آئینۂ انوار کروگے

کیا پھر بھی سُنا کر مجھے نغمات جوانی
خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کروگے

بیمار سے رودادِ الم پوچھ کے شیدا
بیمار کو تم اور بھی بیمار کروگے

دیارِ حبیب پر

جناب عبدالحمید خاں صاحب حامد بدایونی

سراپا جنتِ نظارہ ہے تیرا حسین منظر
تری دنیا ہم آغوشِ سرور و نور ہے یکسر

بہاریں سامنے چن لی ہیں تیرے فردوسِ لطافت کی
تو اک تعبیرِ دلکش ہے مرے خوابِ محبت کی

ترے جلوہ نے کی ہے جامۂ ہستی پہ گلکاری
ترے نظارہ سے ہے روح پر اک خواب سا طاری

مرادِ دل ہے ازل سے اس تری تنظیم پر شیدا
کیا ہے خاک نے تیری مذاق زندگی پیدا

یہ کیسا جذب ہے تیری نیارت کو جب آتا ہوں
میں دنیا اور دُنیا کی بہاریں بھول جاتا ہوں

فراغت اور راحت کے ہیں تجھ میں نئے مزے پیدا
محبت اور مسرت کے ہیں تجھ میں قہقہے پیدا

کوئی گم کردے لاکر مجھکو تیرے سبزہ زاروں میں
تری دنیائے رنگ و بو کی لافانی بہاروں میں

یہ حسرت ہے کہ سب کو چھوڑ کر تیرا ہی ہو جاؤں
سرور و کیف کی اس سرمدی دنیا میں کھو جاؤں

بے سکون لمحے

از جناب فارغ بخاری

حسین لمحے، حسین لمحے میں مطلعِ زندگانی کا
حسین لمحے، حسین لمحے میں عنوانِ نوجوانی کا

حسین لمحے کہ جن میں رنج و غم مفقود ہوتا ہے
حسین لمحے کہ جن کا دائرہ محدود ہوتا ہے

حسین لمحے طلسمِ خواب کی صورت گزرتے ہیں
حسین لمحے بھرے سیلاب کی صورت گزرتے ہیں

حسین لمحے کہ جن میں آدمی مسحور رہتا ہے
حسین لمحے کہ انساں اک نشے میں چور رہتا ہے

حسین لمحوں کی لیکن یاد تک باقی نہیں رہتی
حسین لمحات کی روداد تک باقی نہیں رہتی

یہی لے دے کے سرمایہ ہے میری زندگانی کا
سکوں نا آشنا لمحات حاصل ہیں جوانی کا

صدائے شکست —— جناب شیدا اسجانی صاحب

ہنس ہنس کے کیا تھا قتل تو پھر کیوں لاش پہ آنسو بہاتے ہو
سچ سچ یہ کٹڑے پیٹتے ہو یا لوگوں کو دکھلاتے ہو

دل کھویا کھویا لگتا ہے سینے میں بہت دم گھٹتا ہے،
تم آدھی آدھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے کہاں سے آتے ہو؟

میری یہ فضیحت کرتے ہو ۔ سر چڑھ کے نصیحت کرتے ہو
سمجھانے والو یہ تو کہو اُس کو بھی کبھی سمجھاتے ہو؟

رہ رہ کے تم آہیں کرتے ہو پھر اُلفت کا دم بھرتے ہو
جو آگ دبی تھی سینے میں اس آگ کو پھر بھڑکاتے ہو!

خود ہو کے رہا پوچھا بھی کبھی کس حال میں ہیں یارانِ قفس
آرام سے بیٹھے شاخوں پر کیا گیت مزے سے گاتے ہو

ہر آہ پہ روزن کھلتے ہیں ہر گام پہ بیڑی کٹتی ہے
آزاد طبیعت والوں کو زنداں میں عبث لیجاتے ہو

دروازہ قفس کا ٹوٹے گا اک روز یہ قیدی چھوٹے گا
تصویر دکھا کر گلشن کی ہر روز جسے تڑپاتے ہو!

وہ اور بھی جل بھن جائیگا کس دل سے تماشہ دیکھیگا
تم جاؤ غیر کی محفل میں شیدا کو کہاں لے جاتے ہو

غزل —— از جناب ملک غلام عباس صاحب بی-اے نسیم

حُسن سے معمور دنیا چاہئے
یعنی اس محمل میں لیلیٰ چاہئے

میرے دل میں درد تیرا چاہئے
یعنی اس ساغر میں صہبا چاہئے

خاک میں ملنے کو ہے اُمیدِ زیست
حالِ دل اب ان سے کہنا چاہئے

دیکھنے کی چیز ہے دُنیا مگر
جو دکھائے عشق دیکھا چاہئے

ہے تقاضا گردشِ تقدیر کا
ملنے والوں کو مٹانا چاہئے

دل تو ہے لیکن نہیں ارمانِ دل
طور ہے موجود موسیٰ چاہئے

ہلکا ہلکا سا تبسم زیرِ لب
تیرے دیوانے کو اتنا چاہئے

شیخ و واعظ سے بیانِ دردِ دل
دل کے نامحرم سے پردا چاہئے

یادِ ماضی —— از جناب متین صاحب گلشن آبادی

غرق ہونے کو بالآخر آ گہی انجام تھا
موت کہتے ہیں جسے ساحل اسی کا نام تھا

بلبلِ غم آشنا کا باغ میں گھر در کہاں
چار تنکے تھے کہ جن کا آشیانا نام تھا

آرزوئے وصل کی پامالیاں آہ متین
زندگی کا سامنا بھی موت کا پیغام تھا

جذبات —— جناب محمد ثقلین احمد صاحب منوّر

میں اپنی غزل کو مئے و میخانہ بنا لوں
ہر شعر چھلکتا ہوا پیمانہ بنا لوں

تو وہ ہے کہ تو نے مجھے دیوانہ بنایا
بس میرا چلے تو تجھے دیوانہ بنا لوں

دو حرف ہیں رودادِ الم میں مری لیکن
جس حرف کو چاہوں اسے افسانہ بنا لوں

اللہ رے تری مست نگاہوں کا تصوّر
اب میں جہاں چاہوں وہاں میخانہ بنا لوں

اس خوف سے وہ مجھکو نہیں اپنا بناتے
ڈرتے ہیں کہیں میں انھیں اپنا نہ بنا لوں

حُسنِ نظر —— از جناب نصیر مالیگانوی

تھا یہ ملحوظ ادبِ عشق میں مہمانوں کا
دل کو مسکن کیا ہم نے ترے ارمانوں کا

جلوہ فرما تھا اس انداز سے ساقیٔ بہار
مجھکو پھولوں پہ بھی دھوکا ہوا پیمانوں کا

تیرے طالب جو ہوئے غیر کے طالب نہ رہے
واہ کیا ہوش ٹھکانے رہا دیوانوں کا

شربتِ دیدار —— از جناب محمد عبدالواحد صاحب واحد

جب ادا سے دیکھ کر وہ مسکرا کر چل دیئے
اک ادائے ناز سے مقتول بنا کر چل دیئے

ساغر و مینا کو توڑا ایک شوخ نشے میں
جس دم اپنی مست آنکھیں وہ دکھا کر چل دیئے

دردِ فرقت کا کیا جب حال میں ان سے بیاں
غور سے سنتے رہے پھر مسکرا کر چل دیئے

بے دماغی کا کیا شکوہ جب ان کے سامنے
وہ مجھے عنبر فشاں گیسو سنگھا کر چل دیئے

حور و جنت کی تمنا اب نہیں واحد مجھے
وہ مجھے جب اپنا دیوانہ بنا کر چل دیئے

طوفانِ حیات

ایک ایکٹ کا بہترین ڈراما

از جناب ا۔ح۔صاحب پروانہ

افراد

۱۔ پروین ... ایک تعلیمیافتہ ترقی پسند لڑکی۔ گانے کی شوقین۔
۲۔ جمال ... ایک آزاد خیال اور آسودہ حال شاعر۔
۳۔ نواز ... ایک بت تراش۔
۴۔ مطرب ... ایک گمنام شخص۔
۵۔ ناہید ... ایک تعلیمیافتہ ترقی پسند لڑکی پروین اور نواز کی دوست
۶۔ خیراتی ... پروین کا نوکر

زمانہ

بس یہی ہمارا آپ کا

منظر اوّل

[شام کے چھ بجے ہیں۔ باہر لان پر پروین اور جمال بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ شطرنج کی میز میں لگے ہوئے کڑوں میں سنگترے سے بھرے گلاس رکھے ہیں۔ میز کے برابر ایک آرام کرسی پر انگریزی اخبار کے کچھ صفحے اور عالمگیر کا خاص نمبر پڑا ہوا ہے اور قریب ہی ایک اونچے اسٹول پر بجلی کا پنکھا رکھا ہے جس کے ڈائنمو میں اُٹھنے والی چنگاریاں اس بات کی شاہد ہیں کہ پنکھا دیر سے چل رہا ہے۔

جمال ۔ (گلاس نکال کر شربت کا گھونٹ لے کر) ہاں ۔۔۔ یہ (ذرا دیر کے) چال پڑی ہے۔ اب بچ کر کدھر جایئے گا۔

پروین ۔ واللہ! آپ نے جواب تو اچھا دکھا۔

جمال ۔ (گلاس رکھ کر) تدبیر بھی سامنے آ ہی جاتی ہے۔

پروین ۔ جی، انشاء اللہ (جوش میں مُہرا آگے بڑھاتے ہوئے) لیجیئے اپنا شاہ بچایئے۔

جمال ۔ (گھبرا کر) ہُوں، ۔۔۔ (سوچ کر) یہ لیجیئے۔

پروین ۔ بچ گئے آپ۔ (مہرہ پکڑ کر سوچتی ہے) اچھا اب کہاں جایئے گا' (مُہرہ بڑھاتے ہوئے) ہار مان لیجیئے، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ آپ تو شاعر ہیں! معاف کیجیئے گا' آپ کا شہپر تخیل عالم بالا ہی میں پرواز کر سکتا ہے۔ یہ تو شطرنج ہے۔ اس دنیا کی چیز، یہاں دال گلنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

جمال ۔ (تمام مہرے گراتے ہوئے) ہار میں جیت ہے ساجن!

پروین ۔ (مسکراتے ہوئے) ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

[دونوں ہنستے ہیں ایک نوجوان ہاتھ میں بیگ لیئے داخل ہوتا ہے]

نوجوان ۔ آداب عرض!

جمال ۔ آداب عرض!

پرویں - کہیئے!
نوجوان - اگر آپ حضرات کا ارشاد ہو تو کچھ دری اور فرنیچر کے نمونے پیش کروں - ہماری فرم نیکنامی، ایمانداری اور شہرت کے لحاظ سے ضرب المثل ہو چکی ہے -
پرویں - دکھایئے!
[نوجوان آرام کرسی پر بیگ رکھ کر نمونے دکھانا شروع کرتا ہے]
نوجوان - (پرویں سے) دیکھیئے یہ دیکھیئے!
پرویں - اس کا رنگ، خصوصاً رنگوں کی آمیزش مجھے پسند نہیں،
نوجوان - دیکھیئے یہ کیا چیز ہے! آپ کو ضرور پسند آئے گی -
پرویں - کیوں جمال! پسند ہے؟
جمال - ہے تو خوب!
پرویں - اُس ریچ والے کمرے میں کیسی رہے گی؟
جمال - بہت اچھی، اور وہاں کمرے کا رنگ بھی تو یہی ہے -
پرویں - ٹھیک - مگر رقبہ کیا ہوگا؟
جمال - یہی چار .... نا نا پانچ گز، پانچ گز -
پرویں - (نوجوان سے) کیا قیمت لگے گی دری کی تیاری میں؟
نوجوان - پانچ گز پانچ گز - پچیس مربع گز، دو روپے فی گز ——— گز کے حساب سے ہوئے پچاس روپے ——— کُل پچاس روپے جناب دری انشاء اللہ تصویر ہوگی تصویر - اور آپ کا کمرہ تو جگمگا اٹھیگا -
پرویں - اچھا تو آپ اس ناپ کی ایک دری تیار کرا دیں - دو ہفتے سے زیادہ نہ لگنا چاہئیں (سوچکر) اور وہاں آپ اس پتے پر روانہ کرا دیں -
نوجوان - (لکھتے لکھتے ہاتھ روک کر) کس پتے پر؟
پرویں - (لکھاتی ہے) مس پرویں، نائین ۹ روز ویلا - نینی تال -
نوجوان - بہت اچھا - جناب یہاں دستخط کر دیں -
[پرویں دستخط کرتی ہے - نوجوان رسید کاٹ کر دیتا ہے]
پرویں - دیکھئے دری وقت پر پہنچ جانا چاہئے - ہمیں ضرورت بھی ہے -
نوجوان - آپ اطمینان رکھیئے - دری آپ کو وقت پر مل جائیگی - ہم لوگ دھوکا نہیں دیتے -
پرویں - کچھ دن ہوئے میں نے بریلی کی اس فرم کا اشتہار دیکھا تھا،

تو اس ایچ برادرس سے کیا مطلب؟
نوجوان - حسین برادرس جناب!
پرویں - بہت خوب! - (رسید دیکھ کر) پانچ روپیہ پیشگی - (خیراتی کو آواز دیتی ہے) خیراتی!
خیراتی - جی سرکار!
پرویں - آپ کو پانچ روپے لادو -
خیراتی - بہت اچھا حضور -
[خیراتی نوجوان کو پانچ روپے لاکر دیتا ہے]
نوجوان - اجازت چاہتا ہوں - آداب عرض!
پرویں - آداب عرض! [جاتا ہے]
جمال - (اخبار رکھتے ہوئے) کیا وقت ہوگا؟
پرویں - (گھڑی دیکھکر) ساڑھے سات!
جمال - مجھے جانا چاہیئے -
پرویں - یا وحشت! ——— ایسی کیا جلدی ہے؟
جمال - آٹھ بجے ریڈیو پر کچھ بکنا ہے - اچھا خدا حافظ!
پرویں - (ہنستے ہوئے) یہ تو مجھے یقین ہے - خدا حافظ! [جاتا ہے]
[پردہ گرتا ہے]

منظر دوم

[ایک غیر آباد وادی، کچھ کچھ دور پر دو چار بنگلے بنے ہوئے ہیں -
نواز اس رومان خیز وادی میں اپنے بنگلے کے بالائی حصے میں کچھ تراشیدہ اور کچھ ناتراشیدہ بتوں کے درمیان کھڑا ہے - اسٹڈیو میں خاموشی طاری ہے فضا میں غیر معمولی ہیجان برپا ہے - ابر کے آوارہ ٹکڑے فضائے بسیط پر لوٹ رہے ہیں - بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے]
نواز - (بتوں کی طرف دیکھ کر) آرٹ زندگی ہے اور ——— زندگی آرٹ ہے! ——— مگر ——— میری زندگی ابر پاروں کے درمیان ایک گمشدہ ستارے کی طرح گزری جا رہی ہے - پروردگار! میرا آرٹ حُسن کی بلندیوں سے ہم آغوش ہو جائے - میں آرٹ کا وہ نادر نمونہ وہ بیش بہا شاہکار پیش کروں کہ "مانو لیسا" کا حسن کارانہ سحر افسانہ ماضی ہو کر رہ جائے - دنیا "تاج محل" کے گن گانا چھوڑ دے،

اور میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرمریں پتھروں کے سخت اور بے کن تاروں سے وہ نغمے بلند کروں کہ دنیا ان کی نواؤں میں ڈوب جائے ـــــ جذب ہو جائے ۔

[نواز اسٹوڈیو کی بڑی کھڑکی ' جو ایک جھونپڑی کی طرف کھلتی ہے کھولتا ہے ۔ کھڑکی کھلتے ہی ہوا کے تیز جھونکے اور بارش کی ہلکی پھوار کے ساتھ وائلن کی خوش آہنگ صدا آتی ہے ،
نواز پیچھے جھک کر دیکھتا ہے کہ ایک کمزور نوجوان ' سحر نغمہ سے نیم مدہوش بیٹھا وائلن بجا رہا ہے ۔ فوراً اسٹوڈیو سے نکل کر نیچے والے کمرہ میں ہوتا ہوا اس کے پاس جاتا ہے]

نواز ۔ (پاس جا کر) وائلن تو خوب بجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ آپ ۔

مطرب ۔ (لاپروائی سے) ہاں ، زندگی کے زیر و بم کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ! (سوچ کر) تو کیا آپ کو میرا نغمہ پسند ہے ؟

نواز ۔ ہاں ـــــ بہت !

مطرب ۔ مگر ـــــ اس میں ایسی کون سی بات ہے ؟

نواز ۔ زندگی !

مطرب ۔ ضرور ، مگر بے کیف ۔

نواز ۔ کیا مطلب ؟

مطرب ۔ یہی ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نواز ۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہی نغمہ جس میں میں زندگی کی لطیف کپکپاہٹ اور تھرتھری محسوس کرتا ہوں ، وہی تمہارے لئے بے لطف ہو ۔

مطرب ۔ ہمارے انتہائی شیریں نغمات میں بھی زندگی کی تلخیاں شامل ہیں یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم محسوس نہ کر سکیں ۔

[بجلی چمکتی ہے اور ہوا تیز ہو جاتی ہے]

نواز ۔ لیکن آپ ، ایسے طوفان میں یہاں کیوں بیٹھے ہیں ؟

مطرب ۔ کیا ہوا ۔ زندگی بھی تو ایک طوفان ہے ؟

نواز ۔ زندگی طوفان نہیں ، ایک پر کیف سکون ! (سوچ کر) منظر زیادہ طوفانی ہوتا جا رہا ہے ۔ چلئے ، میرے ساتھ چلئے ۔ پھر اطمینان سے بات چیت ہوگی ۔

مطرب ۔ طوفان میں اطمینان کہاں ؟ خیر چلئے ۔

[وائلن ہاتھ میں لیکر نواز کے ساتھ ہو لیتا ہے]

نواز ۔ (اپنے پیچھے کے کمرے میں آ کر) تشریف رکھئے ۔

[مطرب سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے]

نواز ۔ ہاں تو آپ کا خیال ہے کہ زندگی ایک طوفان ہے ؟

مطرب ۔ (وائلن ایک طرف رکھ کر) ہاں ہاں ! زندگی ایک طوفان ہے جس کی اٹھتی ہوئی سرد موجیں ہماری کمزور کشتیوں میں نہ تختے ہی باقی رہنے دیتی ہیں ، نہ بادبان ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ پتوار ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کشتی ڈوب جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا نشان چھوڑے بغیر ! ہاں مگر سمندر کے سینے پر دھندلی سی یاد باقی رہ جاتی ہے ۔

نواز ۔ نہیں ، زندگی ' نور کی رقصاں لہروں پر بہنے والا ' ایک سرمدی نغمہ ہے جو ہماری چھوٹی سی حسین کشتیوں پر کیف و نشاط کے پھول برساتا ہے

مطرب ۔ ہوگا ! اکثر لوگ بغیر سوچے سمجھے نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات صبح کے دھندلکے کی طرح پریشان ہو کر بہت جلد بکھر جاتے ہیں ۔

نواز ۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں بھول جانا چاہئے ۔ کیونکہ اس طرح زندگی کا مقابلہ بھی تو ناممکن ہے ۔

مطرب ۔ ہاں ہو سکے تو !

[ناہید سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے]

ناہید ۔ چلو گے نہیں ـــــ ؟

نواز ۔ ایسے میں ـــــ ؟

ناہید ۔ کیا ہوا ـــــ ؟

نواز ۔ دیکھتی نہیں ' کیسا طوفانی منظر ہے !

ناہید ۔ زندگی بھی تو طوفان سے کم نہیں اور اس کا مقابلہ کرنے ہی میں لطف حیات ہے ۔

نواز ۔ مگر میں تو اس وقت مجبور ہوں ' میرے دوست بیٹھے ہیں ۔

ناہید ۔ مگر میرا جانا لازمی ہے ۔ میں وعدہ کر چکی ہوں ۔ میں جاتی ہوں ۔

مطرب ۔ ٹھہرو ! میں جاتا ہوں ۔ [اٹھتا ہے]

نواز ۔ بغیر میری اجازت کے ۔ [بیٹھ جاتا ہے]

نواز ۔ (نرمی سے) مجبوری بھی تو کوئی چیز ہے ناہید !

ناہید۔ میں اس کی قائل نہیں۔

نواز۔ اچھا تو تم جا سکتی ہو۔ (جاتی ہے۔)

[پردہ گرتا ہے]

منظر سوئم

[پروین کا کمرہ۔ پروین کرسی پر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی ہے۔ میز پر اون اور تیلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ کتاب بند کرکے میز پر رکھدیتی ہے اون اور تیلیاں اُٹھاکر سویٹر کا جال ڈالتی ہے۔]

پروین۔ (جال ڈالتے ہوئے) ؎ تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی،

(ہاتھ روک کر) ؎ تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی،

(ہنستے ہوئے) ؎ تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی،

[باہر کے کمرے کا پردہ ہٹتا ہے اور جمال پروین کے کمرے میں داخل ہوتا ہے]

جمال۔ (ہنستے ہوئے) ارے کون نہیں آیا؟

پروین۔ (گھبرا کر) تم ——!

جمال۔ (زور سے) میں یا......

پروین۔ بس بس رحم کیجئے۔

[جمال کمرے کی کھڑکی کھولتا ہے]

جمال۔ (کھڑکی کی طرف پیٹھ کرکے) میرا خیال ہے کہ ایسے میں تمھاری دوست نہ آسکیں گی۔

پروین۔ نہیں وہ ضرور آئیگی، اگر پہاڑ پر رہ کر اس کا خیال کیا جائے تو ملنا جلنا ہوچکا، مجھے یقین ہے وہ ضرور آئیگی۔ وہ کبھی وعدہ شکنی نہیں کرتی ہے۔

جمال۔ (مسکراتے ہوئے) کاش کہ ایسا ہی ہو۔ موسم بھی اچھا ہے۔ خاصی تفریح رہے گی۔

پروین۔ اگر آگئی تو آج تمھیں ایسا ناچ دکھلاؤں کہ یاد کرو۔

جمال۔ یا اللہ یہ قصیدہ سنتے سنتے تو میرے کان پک گئے۔

پروین۔ لو وہ آگئی۔ [جمال دیکھتا ہے]

پروین۔ ناہید! بڑی بُری ہوگئی ہو تم! ہم تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔

ناہید۔ دیکھتی نہیں، ایسے میں آئی ہوں۔ نواز تو نہ آسکے اپنے ایک دوست سے باتیں کررہے ہیں۔ میں نے لانا مناسب نہ سمجھا۔

پروین۔ یہ تو اچھا نہیں۔

ناہید۔ تم جانتی ہو، انھیں فرصت کم ملتی ہے۔ پھر آرٹسٹ بھی تو ہیں۔

پروین۔ خیر جانے دو۔ مسٹر جمال! یہی ہیں میری وہ دوست جن کا میں آپ سے ذکر کرچکی ہوں۔

جمال۔ بہت خوب!

پروین۔ مس ناہید! یہی میرے وہ شاعر دوست ہیں جن کا میں آپ سے ذکر، بلکہ اکثر نظمیں بھی سُنا چکی ہوں۔

ناہید۔ بہت خوب!

پروین۔ اچھا تو پھر ہال میں چلنا چاہئے۔

[پروین۔ جمال اور ناہید ہال میں جاتے ہیں۔ کمرے میں جنوب کی جانب ایک صوفہ سٹ پڑا ہے صوفے کے سامنے ایک چھوٹی سی آبنوسی میز پر ایک گلدان رکھا ہے۔ جس میں کچھ تازہ پھول لگے ہوئے ہیں۔ زمین پر کمرے کی ہمرنگ دری بچھی ہوئی ہے مغرب کی جانب

ایک گوشہ میں پیانو رکھا ہے اور برابر پڑی ہوئی کرسی
پر کلارنٹ رکھا ہے۔ سب صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔]

ناہید۔ پروین! کیا میں تم سے ایک گانے کی درخواست کر سکتی ہوں،
میں کیا کروں سامنے رکھے ہوئے پیانو نے مجبور کر دیا۔

پروین۔ ضرور، مگر ایک شرط پر،

ناہید۔ وہ کیا ——؟

پروین۔ تمہیں بھی ناچنا پڑے گا۔

ناہید۔ (ہنس کر) منظور، مگر ایک شرط پر۔

پروین۔ وہ کیا ——؟

ناہید۔ یہی کہ جمال صاحب ہم لوگوں کو اپنی کوئی غزل سنائیں گے۔

جمال۔ بھلا میں کب انکار کر سکتا ہوں۔

ناہید۔ اچھا تو پھر گانا سناؤ۔

پروین۔ جمال صاحب! کیا آپ پیانو بجا سکتے ہیں؟

[جمال کرسی پر سے کلارنٹ ہٹا کر زمین پر رکھ دیتا ہے
اور پیانو کھول کر بجانا شروع کرتا ہے]

پروین۔ یہ؟ ——

جمال۔ ہاں ——!

پروین۔ (گاتی ہے) آئی ساون کی بہار ——
سکھی ری ——!
بادل گرجے
بجری چمکے
مینہا برسے
جیارا ترسے
آئی ساون کی بہار ——!
سکھی ری!
آئی ساون کی بہار ——!

[جمال اور ناہید کی طرف دیکھ کر] ندیا شور مچاتی
جاتی ——
ساگر میں ملجاتی۔
مدرا رس میں
ڈوبے ہوئے ہیں ——
برکھا کے دن رات
آئی ساون کی بہار ——
سکھی ری ——!
آئی ساون کی بہار،

جمال و ناہید۔ (تالی بجاتے ہوئے) بہت خوب، بہت خوب!

[پروین ہنستی ہوئی ناہید کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے۔]

پروین۔ (ناہید سے) اب تمہاری باری ہے۔

ناہید۔ میرے پاؤں میں پہلے گھنگرو لاؤ۔

[پروین دوسرے کمرے سے گھونگھرو لاتی ہے ناہید باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے]

پروین۔ جمال تم کلارنٹ بجاؤ، میں پیانو لئے لیتی ہوں۔

جمال۔ اچھا ——!

[جمال اور پروین کلارنٹ اور پیانو بجاتے ہیں ناہید
دریا کی بیتاب موجوں کی طرح اپنا والہانہ رقص شروع کر دیتی ہے]

پروین۔ (ناچ ختم ہونے پر) جمال صاحب آپ کی ایک نظم کا مواد اس ناچ نے مہیا کر دیا ہے

جمال۔ میں اس کا کیسے منکر ہو سکتا ہوں۔

[سب ہنستے ہیں]

جمال۔ پروین کے سرمدی نغمے اور آپ کے ہوش ربا رقص کے بعد میری
غزل کس طرح سامان نشاط مہیا کر سکے گی؟ خیر پیش کرتا ہوں۔

[ترنم کے ساتھ] کسی کے دیدہ و دل میں سما گئے ہو تم
تخیلات کے عالم پہ چھا گئے ہو تم
[ناہید کی طرف دیکھ کر] نشیلی آنکھوں کی گردش سے بار بار مجھے
سرور و کیف کے ساغر پلا گئے ہو تم
کبھی پپیہے کی پُر درد پی کہاں کے ساتھ
متاع درد کو کچھ اور بڑھا گئے ہو تم!
[ناہید کی طرف دیکھ کر] بس ایک سادہ نگاہی سے دیکھ کر اکثر
فسانہ عشق کا رنگیں بنا گئے ہو تم!

ناہید۔ سبحان اللہ! کتنی پاکیزہ غزل ہے۔

جمال۔ شکریہ ——!

پروین۔ اچھا آؤ چائے پی لو،

ناہید۔ اس کی بھی ضرورت ہے؟

پروین۔ کیوں نہیں! [سب برابر کے کمرے میں جاتے ہیں]

[پردہ گرتا ہے]

منظر چہارم

[چاندنی رات میں جمال تال کے اُس پار سے کشتی کھیتا ہوا آرہا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے مطلع بالکل صاف ہے۔ جمال کیف بیخودی میں اپنی ایک نظم (اشعار منثور) گا رہا ہے۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ آمدورفت کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو چکا ہے]

جمال۔ (گاتا ہے) نکلا اُجلا اُجلا چاند

اس کی سیمیں کرنوں نے،

میرے من کی پیتم کو،

سُندر اور بنایا ہے!۔

چاند کی سیمیں کرنوں نے

میرے من کی پیتم کا

موہن روپ بڑھایا ہے!

نرم و نازک سُندرتا

روپ ہے اُس کا جادو سا

درد نے من کے مندر میں

اپنا رنگ جمایا ہے!؟

دل کا درد بڑھایا ہے!

پاگل مجھ کو بنایا ہے! [ناہید آتی ہے]

[کشتی اس پار آکر کیچڑ میں رُک جاتی ہے۔ جھٹکا کھاتے ہی جمال نظر اٹھا سامنے دیکھتا ہے ناہید اس کی پریشانی دیکھ کر ہنس پڑتی ہے ہاتھ سے پھول چھوٹ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ فوراً جھک کر اٹھاتی ہے۔]

جمال۔ کشتی کی سیر نہ کرو گی؟

ناہید۔ ایک شرط پر کر سکتی ہوں۔

جمال۔ وہ کیا ——؟

ناہید۔ آپ اپنی یہی نظم دوبارہ سُنائیں۔

جمال۔ بہ دل و جان منظور، آیئے!

[ناہید کشتی میں بیٹھتی ہے۔ جمال کشتی لہروں پر ڈال کر کھینا شروع کرتا ہے]

ناہید۔ (کچھ دور جاکر) سنایئے وہی نظم۔

جمال۔ سنئے۔ (گاتا ہے) نکلا اُجلا اُجلا چاند،

اس کی سیمیں کرنوں نے

(ناہید کو دیکھ کر) میرے من کے پیتم کو

سُندر اور بنایا ہے!

چاند کی سیمیں کرنوں نے

(پھر ناہید کو دیکھ کر) میرے من کی پیتم کا

موہن روپ بڑھایا ہے! [نواز آتا ہے]

نواز۔ (ناہید کو کشتی میں بیٹھا دیکھ کر) ناہید! —— چاندنی رات میں، ایک اجنبی کے ساتھ —— اس طرح؟ —— میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ ——

[مُنہ سے چیخ نکلنا چاہتی ہے۔ مگر وہ مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اُلٹے پیروں واپس لوٹ جاتا ہے]

جمال۔ (دُہراتا ہے) چاند کی سیمیں کرنوں نے

میرے من کے پیتم کا!

موہن روپ بڑھایا ہے!

[ناہید فرط بیخودی میں اپنے ہاتھ کا پھول جمال کے کالر میں لگا دیتی ہے مگر فوراً کچھ سوچ کر نکالنا چاہتی ہے]

جمال۔ کسی کو دی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی ناہید ....!

ناہید۔ بیشک .... مگر .....،

جمال۔ (بات کاٹ کر) ناہید، میری زندگی! کہو کہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں سننا چاہتا ہوں تمہاری زبان سے ایک بار ہاں .... صرف ایک بار۔

ناہید۔ کیا اب بھی اس کی ضرورت ہے؟ اپنے اوور کوٹ کا کالر دیکھو اس میں کیا لگا ہے۔ اب چلیں چلنا چاہیئے۔ رات کافی ہو چکی ہے

[جمال کشتی واپس پھیر کر ناہید کو اتار دیتا ہے اور خود لوٹ جاتا ہے]

ناہید۔ (چلتے چلتے رُک کر) یہ میں نے کیا کیا؟ ــــ میں نواز کو دھوکا دے رہی ہوں! ــــ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے ضرور معافی مانگوں گی، وہ ضرور معاف کر دے گا۔

[فوراً بھاگتی ہوئی نواز کے بنگلے کی طرف جاتی ہے]

نواز۔ (اپنے کمرے میں ایک صوفے پر پڑے ہوئے) میں نے غلطی کی میں نے زندگی کے نکیلے خاروں کو مسکراتے ہوئے پھول سمجھا۔

ان پر دیوانہ وار گرا۔ اب خون کا بہنا لازمی ہے۔

[کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ نواز اٹھ کر کھولتا ہے]

نواز۔ (گھبرا کر) ناہید......!

ناہید۔ نواز......!

[اس کی آنکھوں سے آنسو گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور زبان بند ہو جاتی ہے]

نواز۔ سمجھ گیا ــــ! ناہید، تمھاری آنکھوں سے آنسو جاری ہوں اور میں دیکھتا ہوں ــــ؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ ان عنابی آنسوؤں کی خاطر میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں ــــ ناہید! زندگی بھی تو طوفان سے کم نہیں اور اس کا مقابلہ کرنے ہی میں لطف حیات ہے۔

ناہید۔ (روتے ہوئے) خدا کے واسطے! مجھے کانٹوں میں مت گھسیٹو۔

[روتے ہوئے نواز کے شانے پر سر رکھ دیتی ہے]

[پردہ گرتا ہے]

منظر پنجم

[نواز اپنے اسٹوڈیو میں کھڑا ایک بت تراش رہا ہے۔ باہر فضا میں ایک شور برپا ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ سے دل دہلا جاتا ہے۔ نواز بت کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی کھولتا ہے۔ پانی کی بوچھار کے ساتھ آواز آتی ہے]

آواز۔ ابھی میرے ساز میں ہم آہنگی موجود ہے۔ تاروں میں زندگی کی کپکپاہٹ باقی ہے! ــــ میرا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔

[کھڑکی بھیڑ دیتا ہے]

نواز۔ (اسی بت کو دیکھتے ہوئے) میں نہیں کہہ سکتا کہ تمھیں دیکھ کر میرے دل کی کیا حالت ہوتی ہے؟ مگر ہاں ــــ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل میں ہزاروں چڑیاں چہک رہی ہیں ــــ کیا تم، (کھانستا ہے) میٹھی میٹھی ــــ کیا تم بھی کبھی ایسا محسوس کرتی ہو؟ ہرگز نہیں۔ اگر کرتیں تو بیاری کی خبر پانے پر ضرور مجھے دیکھنے آتیں۔ خیر، میں ہی آتا ہوں! ــــ تمھارا مجسمہ تیار کر لوں کیا تم یہ سن کر خوش ہوگی کہ میں نے تمھاری اُس رات کی حالت کو ایک مرمریں مجسمہ میں ڈھال لیا ہے؟ ــــ اور یہی میرا شاہکار! ــــ میرا بیش بہا گوہر ہوگا۔ مجھے جانا چاہیے! ــــ ناہید! میں تمھارے پاس آ رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔ میں نے مجسمہ ــــ تمھارا مجسمہ! ــــ اپنا شاہکار ــــ تمھارا اپنا شاہکار تیار کر لیا ہے ــــ

[ہوا سے کھڑکی کھلتی ہے۔ وائلن کے ساتھ گانے کی آواز آتی ہے۔ نواز باہر کی طرف بھاگتا ہے]

آواز۔ بھاگا جائے تو بھاگ رے مورکھ دور پیت سے بھاگ
اس کا کاٹا بچا نہ کوئی یہ ہے کالا ــــ ناگ
من کو پھونکے تن کو پھونکے بڑی کٹھن ہے آگ،
جس پر پھندا ڈالا اس نے لیا اسی کو جیت
پیت بری ہے پیت!

[نواز بھاگا جا رہا ہے]

پیارے پیارے روپ دکھائے اور لگائے گھات
ایک چال میں دنیا بھر کو کر دیتی ہے مات
زہر کا گھونٹ پلا دیتی ہے کر کے میٹھی بات
اُلٹے ہیں سب کرتب اس کے اُلٹی اس کی ریت،
پیت بری ہے پیت!
خالی وار گیا کب اس کا چلا جو کوئی تیر
من کو بیندھا ہئیہ کو بیندھا گیا کلیجہ چیر
زخمی کر کے یودھا چھوڑے گھائل کر کے بیر
بھول کے پیارے کبھی نہ گانا اس ڈائن کا گیت
پیت بری ہے پیت!

[نواز مطرب کی جھونپڑی کے پاس آ کر رکتا ہے]

مطرب۔ (گھبرا کر) تار ٹوٹ گیا۔

[گرج کے شور کے ساتھ بجلی گرتی ہے۔ دو چیخیں بلند ہو کر غایب ہو جاتی ہیں]

ناہید۔ (ڈر کر اندر واپس جاتے ہوئے) اوہ ——! بجلی گری ——

(اندر جا کر) جمال ابھی تک نہیں آیا ہے۔

جمال۔ (پانی میں بھیگا ہوا اندر داخل ہوتا ہے) ناہید! —— ناہید!

چلو رات تاریک ہے نکل چلیں۔ پھر نہ جانے کیا ہو۔ (سوچکر) —

زندگی بھی تو طوفان سے کم نہیں اور اس کا مقابلہ کرنے ہی میں لطف

حیات ہے —— چلو، جلدی چلو، دیر کیوں کر رہی ہو —— کیا

سوچ رہی ہو؟ کیا اپنا وعدہ بھول گئیں؟ چلو . . . . .

ناہید۔ (تیزی سے) چلو —— مجھے یہاں سے —— مجھے نواز سے

دور —— بہت دور —— لے چلو —— مجھے ایسی جگہ لے چلو۔

جہاں میں بھول کے بھی نواز کو یاد نہ کر سکوں —— چلو، جلدی

چلو جمال! ——

جمال۔ چلو . . . . . [دونوں جاتے ہیں]

[پردہ گرتا ہے]

غزل!

از خفیق اللہ خانصاحب شفق ٹونکی

دست وحشت کے ہیں یہ کار نمایاں دیکھئے
اپنا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے

عکس جلوہ ہوں کہ خود جلوہ ہوں کچھ کھلتا نہیں
چھپیتاں کب تک رہے یہ راز پنہاں دیکھئے

تاب نظارہ نہ لا سکتی تھیں جو شکلیں یہاں
ہو گئیں وہ لالہ و گل میں نمایاں دیکھئے!

منتظر ہوں میں کبھی تو آئیگا روز حساب
رہ سکیں گے آپ کب تک مجھ سے پنہاں دیکھئے

مدتیں سانچے میں رہتے ہو گئیں مجھکو شفیق
سیر کرتے کب تک ہو نمک سے زخم خنداں دیکھئے!

اردو کی جدید مطبوعات

فرہنگ عامرہ } مدت سے اردو میں ایک ایسے لغت کی ضرورت تھی جو جامع ہونے کے علاوہ اخبار نویسوں، مترجموں شاعروں اور طالب علموں کی ضروریات پورا کرسکے ہمیں مسرت ہے کہ جناب محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی نے بےانتہا محنت و کاوش سے ایک ایسا لغت مرتب کیا ہے جس میں عربی، فارسی اور ترکی کے قریباً چالیس ہزار الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس لغت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ کے سامنے قوسین میں ان کا صحیح تلفظ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً قوت (قُوْ\وَت) - طاقت ÷ ربیع الاول (رَبِی - عُل - اَو - وَل) تیسرا اسلامی قمری مہینہ۔

اس لغت کا نام فرہنگ عامرہ ہے۔ الفاظ کے معنی بیان کرنے میں جدید تحقیقات کا خیال رکھا گیا ہے۔ متروک الفاظ کی جگہ متبادل الفاظ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ فارسی مصادر کے مضارع اور سماعی و قیاسی مشتقات بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔

اسماء الرجال میں تاریخی اور افسانوی ناموں میں امتیاز کیا گیا ہے دیباچہ میں انسلاک الصدور ([illegible]) اور توابعات [illegible] [illegible] کی فہرست [illegible] امثلہ دے دی گئی ہے جس سے نئے الفاظ کے اختراع میں امداد ملتی ہے۔ الغرض مرتب نے انتہائی عرق ریزی اور شبانہ روز کاوش سے کام کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ حامیان اردو کے حلقہ میں اس لغت کا پرجوش خیر مقدم کیا جائیگا۔ کاغذ، لکھوائی، چھپوائی اوسط درجہ ظاہری شکل و شباہت دیدہ زیب قیمت صرف دو روپے ۲/

ملنے کا پتہ:- محمد عبداللہ خاں خویشگی، فیروز منزل۔ متصل جامع مسجد۔ خورجہ ضلع بلند شہر (یو۔پی)

سخنوران دکن

اس ۴۳۸ صفحات کی کتاب میں عہد عثمانی کے اردو شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ شعراء کے حالات اور فوٹو کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ تذکرہ میں ملکی و غیر ملکی تفریق کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یعنی اس وقت جتنے شاعر بھی حیدرآباد میں مقیم ہیں ان سب کو اس مجموعہ میں شمار کر لیا گیا ہے۔ ہم جناب سید تسکین عابدی صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو نہایت محنت و سنجیدگی سے مرتب کیا ہے دیباچہ حضرت علامہ نیاز فتحپوری صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ قیمت تین روپے ۳/

ملنے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ لمیٹڈ۔ حیدرآباد دکن،

زندگی کے کھیل } جناب ل۔ احمد صاحب اپنی شگفتہ بیانی اور مخصوص طرز نگارش کی وجہ سے افسانوی دنیا میں بہت ممتاز ہو چکے ہیں۔ آپ کے بارہ دلکش افسانوں کا

ناظرین عالمگیر کیلئے ضروری اطلاع

رسالہ عالمگیر عموماً انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے جو ۱۰ تاریخ تک خریداروں کو وصول ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض حضرات یکم اور دوسری تاریخ سے ہی شکایتی خط لکھنے لگ جاتے ہیں کہ پرچہ نہیں ملا۔ اس لئے خریدار صاحبان اس بات کو نوٹ کرلیں کہ دفتر سے پرچہ بہت احتیاط کے ساتھ متعدد بار چیک کر کے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک پرچہ موصول نہ ہو تو دفتر کو شکایتی خط لکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں۔ اکثر حضرات کے پرچے ڈاک کے ڈاکوؤں کی نذر ہوجاتے ہیں وہ دفتر کو خط لکھنے کے علاوہ اپنے ڈاکخانہ کو بھی ایک شکایتی خط لکھیں کہ ان کی ڈاک کیوں ضائع ہوتی ہے۔ ہر قسم کی خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا اشد ضروری ہے۔

"منیجر عالمگیر لاہور"

مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "زندگی کا کھیل"۔ مصنف نے اس مجموعہ کو اس غموش انسانیت کے نام سے منسوب کیا ہے جس کی زندگی کی جھلک ان کہانیوں میں نظر آتی ہے افسانے بہت موثر اور دلنواز پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ حجم ۱۶۰ صفحہ قیمت صرف ایک روپیہ ۸ علاوہ

ملنے کا پتہ:۔ عظیم اطہر۔ نتولہ۔ آگرہ

سازِ ہستی

یہ قریباً ۲۰۰ صفحات کا ناول جناب عبدالاحد فخروں کے بہار آفریں قلم سے نکلے ہیں۔ آپ صوبہ بہار کے ایک ہونہار اور محنتی نوجوان ہیں۔ اس تصنیف کے پایہ کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ حکومت بہار نے ازرہ قدردانی مصنف کو ساڑھے تین سو روپیہ کی گرانقدر رقم انعام میں دی۔ ناول میں واقعات زندگی کے ساتھ ساتھ انسانی مصائب و اندوہ۔ افلاس و تنگدستی کے نقشہ کشی بھی کی گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے پردے میں مصنف کی اپنی روح دردناک آواز میں بول رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ناول پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہے گا۔ قیمت صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دارالادب پنجاب، بارود خانہ سٹریٹ۔ لاہور

ہندوستان کی تجارت وصنعت (انیسویں صدی تک)

ہندوستان ایک صنعتی و تجارتی ملک ہے لیکن افسوس کہ مغربی مسابقت کی وجہ سے یہاں کی دیسی صنعتوں کو شدید صدمہ پہنچا ہے اور صناعت و تجارت پر غیر ملکی قابض ہو گئے۔ جناب منت اللہ صاحب رحمانی ایم اے ایل ایل بی نے اختصار کے ساتھ ہندوستان کی پرانی دیسی تجارتی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور ساتھ ہی مناسب اعداد و شمار بھی دے دیئے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر بہی خواہ ملک کے لئے مفید رہے گا۔ حجم ۳۱۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ۔ مونگیر۔ بہار

قطعات

از جناب قمر نعمانی سہرامی

تلاش و جستجو دل سے اگر ہو
تو پھر مشکل کوئی مشکل نہیں ہے

الٰہی ہو ہلاکِ نامرادی
وہ دل جو درد کا حامل نہیں ہے

پریشاں کیوں نہیں ہوتے یہ ہندی
مگر پہلو میں ان کے دل نہیں ہے

تڑپنا اور منزل رس نہ ہونا
ابھی ان کی تڑپ کامل نہیں ہے

رہے جو مطمئن مجبور ہو کر
وہ ہے اک سنگ پارہ دل نہیں ہے

ہزاروں مشکلیں تجھ پر پڑینگی
اگر تیرا جنوں کامل نہیں ہے

اسی سے ہے ارادوں میں تزلزل
کہ تیرا عزم خود کامل نہیں ہے

کہیں تو جاکے ٹھہرے گا سفینہ
کہ دریا کوئی بے ساحل نہیں ہے

تم اور صرف تم

از جناب سید وصی حسن صاحب نگرامی

تم اور صرف تم ——— صاف و شفاف اور بہتے ہوئے دریا میں۔ موجوں کے باہم تصادم سے۔ حباب کی شکل میں ظاہر ہوتے ہو ——— اور چند ہی لمحات میں گرداب کے اندر پہنچکر فنا و بقا کے لطیف رشتے کو آپس میں منسلک کرتے ہوئے نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جاتے ہو ———

تم اور صرف تم ——— بجلی کے اودے بھیس میں ——— اودے اور زنگاری یا کالے کالے بادلوں کا شکم چاک کر کے۔ چمکتے ہو۔ چمکاتے ہو۔ اور آنکھوں کو چکا چوند کر دیتے ہو۔ بعض اوقات عرش کو چھوڑ کر فرش پر آتے ہو ہلکی پھوار کی طرح ——— خاکساری کیلئے نہیں بلکہ ہستی و نیستی کا مرحلہ طے کرنے کے لئے آتے ہو اور ایک ہنگامہ بپا کر دیتے ہو۔ ہستی کو نیستی سے بدل دیتے ہو اور اس کے بعد انفصال و اتصال کا یقین دلاتے ہوئے چلے جاتے ہو ——— جہاں سے آئے تھے اور ——— بحر فنا میں غرق ہو جاتے ہو۔

تم اور صرف تم ——— شبنم بن کر گلشن میں آتے ہو اور اس کی تمام رعنائیاں سلب کر لیتے ہو۔ لیکن خلوص دل سے 'خیر خواہی کی غرض سے' تاکہ گلشن اور گلشن والے چند روزہ بہار پر ناز نہ کریں ——— اور یہ سمجھ جائیں کہ گلوں کی مہک، طیور کی چہک، گیاہ کی سبزی، اشجار کی مستی، بیلوں کی خود نمائی، نسیم کی خود ستائی، حوضوں کی نمائش، فواروں کی آرائش ——— نہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ اس لئے تم ان سب کو جذب کرتے ہو اور جذب کرنے کے بعد تم خود فنا میں جذب ہو جاتے ہو۔

تم اور صرف تم ——— تصور کی دنیا آباد کرنے کے لئے تصور میں آتے ہو۔ محبوب بن کر، شاید صبر و تحمل کا جائزہ لینے کے لئے۔ تمہارے ہونٹوں پر شرر کی طغیانی اور آنکھوں میں معصومیت کی فراوانی ہوتی ہے۔ پیہم تکنے کے بعد تمہاری پیشانی عرق ندامت سے عرق آلود اور آنکھیں اشک ندامت سے اشک آلود ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ خواہش ہوتی ہے کہ تم مجھ میں سما جاؤ اور میں تم میں سما جاؤں۔ سراپا شوق بن کر۔ قبل اس کے کہ میں اپنی آتش شوق بجھاؤں، تم خراماں خراماں چلے جاتے ہو اور غائب ہو جاتے ہو ——— ایک شیریں اور دلگداز خواب کی طرح۔ اس کے بعد در و دیوار کی ہر خشت سے یہ صدا آتی ہے۔ "دیکھو! ہوش میں آؤ، دنیا فانی ہے۔"

ہاں تم اور صرف تم آتے ہو ——— ہر مرتبہ نئے نئے بھیس میں۔ تکمیل فنا کے لئے۔ مجسمہ فنا پیش کرنے کے لئے۔ حقیقت فنا ظاہر کرنے کے لئے۔ اعزاز فنا قائم کرنے کے لئے۔ درس فنا دینے کے لئے۔ اس وقت صرف تم ہی تم ہوتے ہو۔ تم ہی تمام عناصر پر غالب رہتے ہو۔ تم ہر دو کر کے فنا کی جیتی جاگتی مثال چھوڑ جاتے ہو۔

انتظار

ایک دردمند محبوبہ کے جذبات

آہ! شام ہوگئی، میرا پریتم اب تک نہیں آیا۔ میری امیدوں کے مرکز، میری تاریک زندگی کے روشن ستارے، آ جا! آنکھیں تیرے انتظار میں خون کے آنسو بہا رہی ہیں۔ آسمان پر شفق پھول گئی۔ چڑیوں کے غول اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ دونوں وقت مل رہے ہیں، آہ شام ہوگئی، مگر میرا پریتم اب تک نہیں آیا۔ میرے دل کی تاریک دنیا کے روشن آفتاب! آ جا، شام ہوگئی، افق مغرب پر زردی مائل روشنی چھاگئی۔ سورج حسرت بھری نگاہ ڈال کر اپنا دامن سمیٹ چکا دریا کی موجیں ساکت ہوگئیں، شام ہوگئی۔ مگر آہ میرا پریتم اب تک نہیں آیا، میرے محبوب آ جا۔ شاید میرے خشک ہونٹوں پر ایک مرتبہ پھر مسرت کی لہر دوڑ جائے آ جا! او صرف ایک مرتبہ اپنے درشن دے جا۔ تیری دید کی حسرت میں سب کچھ نچھاور کر چکی ہوں۔ گھر بار چھوڑ دیا ہے۔ میری زندگی کے سہارے آ جا! اور میرے دل کو اپنی دید سے معمور کر دے۔ آسمان پر ستارے روشن ہوگئے، چاند اپنی ضیا پاش کرنوں سے سارے عالم کو منور کر رہا ہے۔ شام کی تاریکی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی ہے مگر آہ میرا پریتم ابتک نہیں آیا۔ شام ہوگئی دنیا کے ساز ایک دم خاموش ہوگئے لیلائے شب نے ہر طرف چادر ظلمات پھیلانا شروع کر دیا فضائے بسیط میں ایک کامل سکون ہوگیا شام کی تاریکی نے نور سحر کو اپنے آغوش میں چھپا لیا مگر آہ میرا پریتم اب تک نہیں آیا شام ہوگئی۔

سیف الرحمٰن عاصی [illegible]

پانچ ہزار روپے کا چیلنج

5000

آجکل نقلی اور جعلی عاملوں اور نجومیوں کی کثرت [illegible] ہی پبلک بھی بہت کم کسی پر اعتبار کرتی ہے کیونکہ جب کبھی اتفاق سے کوئی ایسا کام یا عمل [illegible] یا جوتشی بن بیٹھے۔ ان میں بعض ایسے بھی اشتہار باز ہیں جن کو اشتہار کا مضمون لکھنا بھی [illegible] ان کی قابلیت کا تب علم ہوتا ہے جب وہ ان کے مضحکہ خیز تعویذ یا جوتش کو دیکھتا ہے۔ غرض کہ اس [illegible] مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ پبلک میں قدر بے اعتباری ظاہر کرے بجا ہے

خاکسار کہہ سکتا ہے کہ ہم نے ۱۹۰۲ء سے ۲۰۔ سال سے اس علم ذیل کو شہرت دی جس کا ثبوت ہندوستان کے تمام اخبارات کی فائلوں اور ہمارے پاس لاتعداد تعریفی خطوط سے ہو سکتا ہے یہ ایسا تجربہ کہ پیشہ ہے کہ سوائے نیک نیتی اور راستی کے کبھی فروغ نہیں پا سکتا دعوی سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ جہاں کہیں میرے نام کا ذکر کریں گے انشاء اللہ تعریف کے ساتھ ہی یاد کیا جائیگا۔ آپ ایک مرتبہ تشریف لا کر آزمائش کریں اگر یہاں آنے سے معذور ہیں تو خط و کتابت جوابی سے مشورہ لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میرے مقابلہ میں اپنے اشتہار کو سچا ثابت کر دے تو

پانچ ہزار روپے وصول کر سکتا ہے یہ روپیہ کسی بنک یا عدالت میں جمع کر دیا جائے گا!

پس اگر آپ صحیح معنوں میں کسی مصیبت یا مشکلات میں ہیں اور مشورہ لینا چاہتے ہیں مثلاً کوئی ایسی بیماری ہے جس پر دوا اثر نہیں کرتی۔ حکیم و ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مرض سمجھ میں نہیں آتا یا کسی نے جادو وغیرہ۔ سحر وغیرہ کر کے مرض لگا رکھا ہے یا کسی مقدمہ میں پریشانی ہے یا کسی سے ناچاقی ہے یا کاروبار کمزور رہتا جاتا ہے یا اولاد نہیں ہوتی یا ہو کر مر جاتی ہے یا امتحان میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی یا ملازمت میں ترقی کے لئے رکاوٹ ہے غرض کوئی بھی دنیاوی یا روحانی تکلیف ہے تو مشورہ لیں۔ فیس مشورہ ایک روپے چھ آنے ہے

عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب کے متعلق معززین کے ارشادات

دُنیا کیا کہتی ہے؟

معظم و محترم عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب۔ السلام علیکم! میری بیوی عرصہ ایک سال سے بیمار تھی علاج ڈاکٹری و یونانی ہر قسم کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا مریضہ کی دونوں ٹانگیں ٹیڑھی تھیں میں بالآخر حکیم صاحب کو ملا اور حالات بتلائے انہوں نے پانچ بتیاں عنایت کیں اور طریقہ استعمال بتلایا۔ کیا عرض کروں پہلی ہی بتی سے مریضہ کی ٹانگیں سیدھی ہو گئیں یہ ایک عملیات کا تجربہ ہے میں نے اس علاقہ میں ہر چہار طرف ان جادو عمل بتیوں کا شہرہ کر دیا میں نے تقریباً پندرہ سو روپیہ مریضہ پر خرچ کیا تھا اور مایوس ہو گیا تھا مریضہ ہر وقت آپ کو دعائیں دیتی ہے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں اور میرے حالات اگر مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے۔ (چوہدری منظور حسین ڈیلدار چک نمبر ۱۳۶ جنوبی براستہ سرگودھا۔

جناب عبداللہ صاحب گڑھی شاہو ضلع پشاور سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں اُٹھ نہ سکتا تھا اور دوسرا آدمی سہارا دیکر اُٹھاتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کو اندھا درد رہتا تھا۔ آپکے علاج عملیات نے صحت بخشی کہ اب دور دور تک چلتا پھرتا ہوں۔

جناب شیخ عبدالقادر صاحب سیالکوٹ سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں عامل سے ملا دو تین سوالات کئے گئے ان کا بالکل صحیح جواب ملنے پر میں بالکل حیران رہ گیا۔ کسی جوتشی یا عامل پر یقین نہ رکھتا تھا حکیم صاحب کا علم دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس قدرت نے صحیح علم دیا ہے پس اگر آپ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں مثلاً بیماری پر دوا اثر نہ کرتی ہو حکیم و ڈاکٹر سے مایوس ہو چکے ہیں یا کسی سے ناچاقی رہتی ہے خواہ مخواہ دشمنی بڑھتی جا رہی ہے یا میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار ہو رہے ہوں یا مقدمہ میں کامیابی چاہتے ہوں تو ضرور ایک دفعہ تشریف لا کر مشورہ لیجئے۔ فیس مشورہ فی سوال ایک روپیہ بذریعہ وی۔ پی ایک روپیہ چھ آنے خط و کتابت جوابی کریں۔

ملاقات کا وقت۔ صبح ۹ بجے سے ۷ بجے شام تک

پتہ ملنے کا: عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی موہن لال روڈ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے (مینجر)

جلد ۳۱

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۹ء

نمبر ۳

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

مُلاحظات!

عالمگیر کے سالانہ نمبر کا خیر مقدم جس گرمجوشی سے کیا گیا اس کا معمولی اندازہ ملک کے معتدد جرائد و رسائل کی آرا سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ "سالانہ نمبر" سال رواں کا بہترین اور قابل مسرت کارنامہ ہے۔ لیکن ادارہ "عالمگیر" کی سعی و محنت اور بلند عزمی ذرا اور آگے جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ خاص نمبر کی تیاریاں شروع ہیں۔ یہ اشاعت دسمبر کے پہلے ہفتے میں منظر مُطالعہ پر جلوہ گر ہو جائیگی۔ خاص نمبر اپنی صوری و معنوی خصوصیات کے اعتبار سے تاریخ صحافت میں شاندار اضافہ کا موجب ہوگا۔

خاص نمبر کے لئے جو تصویریں مہیا کی گئی ہیں وہ اپنی ارتقائی خوبیوں کے اعتبار سے ہندوستانی مصوری کو عروج و کمال کی آخری منزل پر دکھاتی ہیں۔ اہل قلم معاونین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے نگارشات بہت جلد بھجوا دیں تاکہ مناسب جگہ پر شایع ہو سکیں۔

اشاعت زیر نظر کے مضامین "متشددانہ انتخاب" کے بعد ہدیہ قارئین کئے جا رہے ہیں اور انتخاب میں ہر قسم کے مذاق کی تفریح و ضیافت کا خیال رکھا گیا ہے لیکن بعض مقالات خصوصیات کے ساتھ جاذب توجہ ہیں۔ مثلاً۔

برطانی مدبروں کے رومان ۔ یہ مقالہ جناب افسر ماہ پوری کی دلچسپ جستجو کا نتیجہ ہے فاضل مقالہ نگار نے مشہور و معروف انگریزوں کی کتاب زندگی کے تمام رنگین اوراق ایک جگہ اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اس مضمون کے مُطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبر و حکمت کے خشک دامن میں بھی عاشقانہ رنگینیوں کیلئے گنجائش ہے۔

وفات غیاث الدین کا سبب ۔ یہ ایک تاریخی مقالہ ہے جس کے ذریعے سلطان غیاث الدین کی وفات کے اسباب و علل پر جدید تحقیق و معلومات کی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس مسئلے کے بعض اہم پہلوؤں کے چہرے سے مورخانہ تساہل کی نقاب اُلٹی گئی ہے

اُردو قصیدہ ۔ یہ مقالہ ناقدانہ نقطۂ نگاہ سے عمیق مطالعہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے لیکن فاضل مضمون نگار نے شاید طوالت کے خوف سے "قصیدے" کی فنی حیثیت پر بہت زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ قصائد سودا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اسے مضمون نگار کی علمی فضیلت پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن ذوق کی اُستادانہ شان پر بہت زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ حالانکہ ذوق کا کمال قصیدہ گوئی جس مرحلے پر جلوہ گر ہے اُسے اُردو قصیدہ کی آخری منزل کہا جا سکتا ہے تاہم مضمون مجموعی طور پر قابل تعریف ہے اور اس سے مضمون نگار کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

افسانے ۔ اگرچہ مختصر دو ہیں لیکن افسانویت کے اعتبار سے صد درجہ جاذب توجہ ہیں۔ "کرشمہ رقابت" یہ ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ ہے جس میں نسائیت کے ایک ناموزوں پہلو کو نفسیاتی ماحول میں دکھایا گیا ہے جس سے افسانہ کی دلچسپی بہت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔

عورت کی فطرت ۔ یہ افسانہ عورت کی نفسیاتی کیفیات کے ان پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے جس میں بحث و نظر کے حلقے میں کسی کی اجازت نہیں مل سکتی اس لئے افسانے کا تعلیمی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے۔

حصہ نظم میں جدید و قدیم اسالیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تغزل کے معیاری نمونے ہیں وہاں مسلسل نظمیں بھی ہیں اگرچہ تمام منظومات وجد آفریں ہیں تاہم امجد حیدر آبادی، شفق رضوی۔ ماہر القادری، ضمیر عابدی۔ امین حزیں، خورشید سہارنپوری، کیفی چریاکوٹی۔ خلیل بیگو سرائی کا کلام خصوصیت کے ساتھ داد و تحسین کا مستحق ہے۔ (ادارہ)

آئندہ شمارہ (ماہ اکتوبر) کی چند خاص مضامین

ہنری اِبسن ——— (سوانح عمری)

ناروے کے باغی ڈراما نویس کے حالات زندگی اور اس کی تمثیل نگاری کی نمایاں خصوصیات - اُردو میں پہلی مرتبہ - از جناب جمیل احمد صاحب کندھاپوری بی - اے -

سُلطان ڈاکو کی کہانی فارسٹ آفیسر کی زبانی

صوبجات متحدہ کے دلیر ڈاکو سلطان کی گرفتاری کے صحیح حالات جس نے کئی سال تک پولیس کو پریشان اور شہریوں اور دیہاتیوں کو لرزہ براندام کئے رکھا - از خیال مُراد آبادی صاحب -

ناٹنجور کے بابو ——— (افسانہ)

سر رابندرناتھ ٹیگور کے ایک دلاویز شاہکار کا ترجمہ - از جناب پیر خلیل احمد صاحب منشی فاضل -

امریکہ کی آزادی کا علمبردار ——— (مشاہیر)

جارج واشنگٹن کے دلچسپ حالات جو مُردہ دلوں میں زندگی کا خون دوڑا دینگے - از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی -

تہذیب فرنگ اقبال کی نظر میں (مقالہ)

شاعر مشرق کی تہذیب فرنگ پر سبق آموز تنقید - حریت آموز مقالہ ساز جناب شیخ عبدالرحمٰن صاحب گارڈن کالج -

پیاس ——— (افسانہ)

افسوس یہ افسانہ بوجہ قلت گنجائش اس پرچہ میں درج نہ ہو سکا اکتوبر کے شمارہ میں ملاحظہ کیجئے - از جناب ڈاکٹر ایے - ڈی - فرزدق صاحب

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل شاعروں کا کلام بلاغت نظام شریک اشاعت ہوگا -

سکندر علی وجد - نوح ناروی - اعجاز اکبرآبادی - راز چاندپوری - ماہر اکبرآبادی - ساحر دہلوی - مُفرت شاہجہانپوری - احمر گورکھپوری وغیرہ

مضامین افسانوں نظموں - تصاویر اور ظاہری شکل و شباہت کے اعتبار سے ہندوستان کا کوئی ادبی ماہنامہ "عالمگیر" کا مقابلہ نہیں کر سکتا للعہ سالانہ چندہ میں دو معرکہ آراء خاص نمبر بھی مُفت پیش کئے جاتے ہیں آج ہی مستقل خریداری کیلئے فرمائش بھیجئے

مینجر عالمگیر - لاہور

برطانی مدبّروں کے رومان

از جناب افسر صاحب ماہ پوری

اگرہم تواریخ عالم کے اوراق پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مشاہیر کی محبت کی داستانیں عوام کی دلچسپی کا مرکز بنی رہیں۔ محبت ایک ایسا فطری جذبہ ہے جس کی زرّیں شعاعیں ہر دل کی تیرہ و تار فضا میں جگمگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے مدبر و مفکر بھی دل کے اس فطری جذبے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے محبت کی بدولت ایسے ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دیئے جن کے باعث انھیں غیر فانی شہرت میسر ہوئی اور ان کے نام رہتی دنیا تک آب زر سے لکھے جائیں گے۔ ذیل میں چند برطانی مدبروں کے رومانی داستانیں قارئین "عالمگیر" کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ مندرجہ ذیل واقعات سے یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ محبت سن و سال کے تعین سے کلیتہً آزاد ہے۔

ڈیوک آف ولینگٹن اور لیڈی سالسبری

ڈیوک کے وہ رومانوی خطوط جو اُس نے لیڈی سالسبری کو لکھے تھے منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ خط ان جذبات کے آئینہ دار ہیں جو ڈیوک کے دل میں لیڈی سالسبری کی محبت کے بعد بیدار ہوئے تھے۔ ایک خط کا اقتباس ہدیہ ناظرین ہے جس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈیوک لیڈی سالسبری کو کس قدر چاہتا تھا۔

"میں وہ خطوط جو تمھیں لکھتا ہوں میرے دوسرے خطوط سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح تم انھیں پڑھتے وقت سرور و کیف کے سمندر میں ڈوب جاتی ہو اسی طرح میں لکھتے وقت ایک سرمدی نشاط و انبساط محسوس کرتا ہوں"

بڑھاپے میں عشق

جب ڈیوک کی عمر ۵۱ سال کی تھی تو وہ لیڈی سالسبری کے دام محبت میں گرفتار ہوا۔ لیڈی سالسبری کا سن ۲۶ برس کا تھا اور وہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ اس تضاد کے باوصف وفور محبت سے مجبور ہو کر اُس نے ڈیوک سے شادی کر لی۔ یہ ہیں محبت کی کرشمہ سازیاں۔ سالسبری نہایت حسین و جمیل خاتون تھی اور اس کا دل نسوانی جذبات سے معمور تھا وہ ڈیوک کی شجاعت و بسالت کی بیحد تعریف و توصیف کرتی اور اسے غیر معمولی طور پر پیار کرتی تھی۔ ڈیوک نے بھی اسے خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اسے لیڈی سالسبری پر پورا پورا اعتماد تھا حتیٰ کہ وہ کوئی سیاسی راز بھی اس سے مخفی نہیں رکھتا تھا۔

ڈیوک اور مسز آربتھ نوٹ

ڈیوک نے مسز آربتھ نوٹ سے بھی محبت کی تھی۔ اس کی محبت کی خاطر بہت سی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اگرچہ مسز آربتھ نوٹ کی محبت کی وجہ سے اس کی شہرت پر سخت ضرب لگی مگر وہ محبت سے دستکش نہ ہوا جب وہ مری تو ڈیوک کو شدید صدمہ پہنچا اور اس کی یاد عرصہ تک اس کے دل سے محو نہ ہو سکی۔

لارڈ مبلبارن اور کیرولائن

لارڈ میلبارن اور مسز کیرولائن نارٹن کی داستان عشق

بہت مشہور ہے۔ لارڈ میلبارن بیحد رنگین مزاج اور زندہ دل انسان تھا وہ کہتا تھا "میں محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہوں۔ مزید براں اس کی ازدواجی زندگی نہایت بے کیف تھی۔ اس کی منکوحہ بیوی اس کے معیار محبت پر پوری نہ اتر سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی میں متعدد عورتوں سے محبت کی مس ایملی ایڈن جو اپنے ناول کی وجہ سے بہت معروف ہوئی انہیں عورتوں میں سے ایک تھی۔ لارڈ میلبارن نے عموماً انھیں عورتوں سے محبت کی جو شادی شدہ تھیں وہ صوری حسن کو زیادہ پسند نہ کرتا تھا۔ وہ ان عورتوں کو بہت پسند کرتا تھا جن کا دماغ فہم و فراست کی روشنی سے منوّر اور جن میں جذبات محبت کے قدر کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی۔ اُسے راہ محبت میں بے شمار صبر آزما اور بہت کٹھن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

مسز نارٹن جس کا تیر نظر لارڈ میلبارن کے دل میں پیوست ہو چکا تھا ایک پولیس مجسٹریٹ کی بیوی تھی۔ جس وقت لارڈ میلبارن اس پر فریفتہ ہوا تو اس کی عمر ۵۰ برس کی اور مسز نارٹن کی اٹھائیس برس کی تھی۔ جہاں قدرت نے مسز نارٹن کو زیور حسن سے آراستہ کیا تھا وہاں غیر معمولی تدبر و تعقل بھی عطا کیا تھا۔ وہ ایک بے نظیر ادیبہ اور جلیل القدر شاعرہ تھی۔ اس کے ادبی کارنامے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جس کی نظر اس پر پڑتی دل مسوس کر رہ جاتا۔ وہ اپنے شوہر سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے شخص کی جستجو میں تھی جو اسے شراب محبت سے سرشار و بیخود کر دے۔ چنانچہ اس کی نظر انتخاب لارڈ میلبارن پر پڑی۔ آغاز محبت پر مسٹر نارٹن بظاہر بہت خوش تھے لیکن جب انھوں نے ۱۸۳۶ء میں لارڈ میلبارن کے خلاف عدالتی کارروائی کی تو ملک کے طول و عرض میں ایک اضطراب پھیل گیا۔

مقدمہ

جب مسٹر نارٹن نے عدالت میں لارڈ میلبارن پر نالش دائر کی تو ایک ہلچل مچ گئی۔ میلبارن اور مسز نارٹن بہت متردد ہوئے آخر کار لارڈ میلبارن نے اپنے وقار کی خاطر اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہا مگر بادشاہ نے اس کا استعفیٰ نامنظور کر دیا۔ ڈیوک آف ویلنگٹن نے اعلان کیا "میں اس حکومت میں ہرگز نہ رہوں گا جو لارڈ میلبارن ایسی عظیم المرتبت ہستی سے محروم ہو جائے۔ اس کا تدبر دنیائے سیاست کا روح رواں ہے۔"

اگرچہ لارڈ میلبارن کی عزت و عظمت معرض خطر میں پڑ گئی تھی مگر وہ اپنی محبت میں کوہ ہمالیہ کی طرح راسخ رہا۔

جیوری کا فیصلہ

جب مقدمہ شروع ہوا تو مسز نارٹن کی جانب سے وہ تمام خطوط عدالت میں پیش کئے گئے جو لارڈ میلبارن نے مسز نارٹن کو لکھے تھے۔ جیوری نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا۔ "لارڈ میلبارن کے خطوط کی کسی عبارت سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی کہ اس کی محبت میں بدنیتی کارفرما ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ جذبات محبت سے مجبور ہو کر۔"

لارڈ میلبارن کی وفات پر مسز نارٹن نے ضعیفی میں سر ڈبلیو اسٹرلنگ میکسول سے شادی کر لی۔

لارڈ پامرسٹن اور لیڈی کوپر

لارڈ پامرسٹن ہی ایک ایسا مدبر گذرا ہے جس کی محبت مسرت بداماں شادی پر منتج ہوئی۔ لیڈی کوپر کی پہلی شادی آنریبل ایچ لیم سے ہوئی جو عمر میں اس سے دس سال بڑا تھا۔ خیالات کے اختلاف کے باعث ان کی شادی کامیاب نہیں ہوئی۔

لیڈی کوپر لارڈ پامرسٹن کو بچپن ہی سے جانتی اور چاہتی تھی۔ مگر لارڈ پامرسٹن کی بے اعتنائی نے اسے ہمیشہ اظہار محبت سے باز رکھا۔ لارڈ پامرسٹن نے عجیب فطرت پائی تھی۔ وہ عورتوں کے باب میں بہت کمزور واقع ہوا تھا اور یہ اس کی کمزوری ہی تھی جس کی وجہ سے اس کی اور لیڈی کوپر کے متعلق خوب خوب پھبتیاں اُڑائی گئیں۔

۱۸۳۹ء میں آنریبل ایملی لیم کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں لارڈ پامرسٹن اور لیڈی کوپر رشتہ مناکحت میں منسلک ہو گئے کہا جاتا ہے کہ لارڈ پامرسٹن کو دنیائے سیاست میں جو ترقیاں نصیب ہوئیں وہ بہت حد تک لیڈی کوپر کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہیں۔ انھوں نے بڑی مسرت انگیز ازدواجی زندگی گذاری یہاں تک کہ ۱۸۶۵ء میں لارڈ پامرسٹن نے انتقال کیا۔

ڈزرائیلی اور مسز لوئیس

ڈزرائیلی کی سیاسی زندگی یقیناً ناکامی کی چٹان سے ٹکرا جاتی اگر اُسے مسٹر وائن ڈہم لوئیس کی بیوی سے محبت نہ ہوتی۔ یہ مسز لوئیس ہی تھے جنھوں نے ڈزرائیلی کو میدان سیاست میں لا کھڑا کیا۔ لوئیس کی موت کے بعد ڈزرائیلی نے ان کی بیوہ سے شادی کر لی۔ مسز لوئیس نے ہونہار ڈزرائیلی کی محبت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ ڈزرائیلی کو ایک بیوہ دن سے بھی عشق تھا اس کے مرنے کے بعد ڈزرائیلی کو بہت سی دولت ہاتھ لگی۔

لیڈی بریڈ فورڈ

اگرچہ ڈزرائیلی عورتوں سے سخت متنفر تھا مگر اس کے باوجود اس نے کئی عورتوں سے محبت کی۔ ایام پیری میں لیڈی بریڈ فورڈ اور لیڈی چسٹرفیلڈ دونوں سے پاک محبت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے لیڈی بریڈ فورڈ کے سامنے جو بیوہ تھی شادی کی تجویز پیش کی۔ وہ لیڈی بریڈ فورڈ کی محبت میں دیوانہ تھا سخت مصروفیتوں اور پیرانہ سالی کے باوجود روزانہ رومانوی خط لکھتا ڈزرائیلی کو اپنی محبت کے سلسلے میں بہت سی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔

ملاح!

(از حضرت علامہ امجد حیدر آبادی مدظلہ)

اپنے جینے سے شرما گیا میں
زندگانی سے گھبرا گیا میں
آگیا میری آنکھوں میں پانی
دیکھ کر اس کی یہ زندگانی

جب میں ہمراہ سر حیدری کے — پہنچا دریا پہ پانڈیچری کے
لہریں لیتا تھا دریا کا پانی — موج ہر اک تھی اُٹھتی جوانی
دریا ہر دم رواں اور دواں ہے — گویا امجد کی طبع رواں ہے
ہر طرف سے وہ پانی کی موجیں — ایسی تھیں، جیسے لڑتی ہوں فوجیں

— ۲ —

دیکھ کشتی چلاتے ہیں ملاح! — کیسی محنت اُٹھاتے ہیں ملاح!
موجیں کہتی ہیں جانے نہ دیں گی — ناؤ پانی میں آنے نہ دیں گی
پھر بھی ملاح رُکتا نہیں ہے — آگے دریا کے جھکتا نہیں ہے
اس کو پروا ہی کس بات کی ہے — ق جسم میں اک لنگوٹی لگی ہے
جاتی ہے جاتے رہتی ہے رہ جائے — بہتا ہے پانی پھر کیوں نہ بہ جائے
کشتیاں جا رہی آ رہی ہیں — چڑھ کے لہروں پہ لہرا رہی ہیں
کوئی کشتی اِدھر آ رہی ہے — کوئی کشتی اُدھر جا رہی ہے
خالی اک اک کو بھرتا ہے ملاح — کشتی، کشتی سے کرتا ہے ملاح
ڈوبتا اور اُبھرتا ہے ملاح — جیتا ہے اور مرتا ہے ملاح
کس قدر کام کرتا ہے ملاح — کس طرح پیٹ بھرتا ہے ملاح

— ۳ —

اے لو ملاح کی عورت آئی، — کھانا بچوں کے ہمراہ لائی
چھوڑ کر کشتی ملاح آیا، — کھانا بچوں کے ہمراہ کھایا
کھا لیا کھانا دیکھا نہ بھالا، — آنکھیں کشتی پہ منہ میں نوالا،
لال چاول میں سالن کا پانی — ایسے کھانے پہ یہ جانفشانی

فکر و عمل

ازحضرت ماہرالقادری

یہ دشت و کوہ، یہ محراب و در ہیں بے حاصل
نگاہِ شوق اُلجھتی ہے آسمانوں سے

بھنور کی زد سے نکل جائیں تو کرامت ہے
وہ کشتیاں کہ جو قائم ہیں بادبانوں سے

حدیثِ عشق ہے جذبِ کمالِ کیف تمام
کہ جو ادا نہیں ہوتی کبھی زبانوں سے

ہے اُس کے جوہرِ ذاتی میں زندگی غلطاں
وہ آبگینہ جو ٹکرا گیا چٹانوں سے

خرد پہ کس لئے حاصل جنوں کو ہے ترجیح
یہ بھید پوچھ محبت کے نکتہ دانوں سے

وہ تیر سینۂ چقماق کو بھی برما دیں
نکل گئے جو لچکتی ہوئی کمانوں سے

محبت اور ہوس میں ہے فرق ارض و سما
یہ بھید چھپ نہ سکے کاش! نوجوانوں سے

وفات غیاث الدین کا سبب اور اسکی تحقیق

اسلامی تاریخ ہند کا ایک ورق

از جناب عبدالناصر صاحب متعلم ٹی۔ ان۔ جے کالج۔ بھاگلپور

وفات غیاث الدین تغلق کی نسبت مورخین کے مختلف بیانات ہیں فرشتہ اور تمام مورخین نے اس کے متعلق تفصیلی حالات لکھے ہیں اور بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسے جوناخاں (الغ خاں) اس کے بیٹے نے ہلاک کیا۔ لیکن حالات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ جب ۷۲۴ھ میں لکھنوتی (بنگال) اور سنارگاؤں (ڈھاکہ) کی طرف سے جبر و ظلم کی شکایت موصول ہوئی تو غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جوناخاں کو ورنگل سے طلب کرکے دارالسلطنت کا انتظام سپرد کیا اور خود لشکر عظیم لے کر لکھنوتی کی طرف کوچ کیا۔ غیاث الدین کی سطوت و جبروت سے اس وقت سارا ہندوستان آگاہ تھا۔ ناصرالدین فرمانروائے لکھنوتی تحائف وغیرہ لیکر خود حاضر خدمت ہوا۔ چنانچہ غیاث الدین بنگال کی طرف سے کامیاب واپس ہوا تو الغ خاں نے افغان پور کے قریب جلدی جلدی ایک قصر تیار کرایا تاکہ غیاث الدین وہاں شب کو قیام کرے اور صبح شاہانہ جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہو۔ چونکہ بادشاہ نے وہاں قیام کرنا پسند نہ کیا اس لئے کھانے سے فارغ ہوکر الغ خاں مع تمام امراء کے جلدی سے باہر آگیا کہ سفر کی تیاری کی جائے اور اسی وقت اتفاق سے قصر کی چھت گر پڑی اور سلطان معہ پانچ آدمیوں کے جن میں اس کا چھوٹا بیٹا محمود بھی تھا دب کر مر گیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ عمارت قصداً اسی غرض سے بنائی گئی تھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے ”جب بادشاہ دارالخلافہ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے بیٹے کے نام حکم بھیجا کہ اس کے واسطے ایک نیا محل افغان پور میں تیار کرلے۔ جوناخاں نے تین دن میں محل کھڑا کر دیا۔ اس کی بنا لکڑی کے ستونوں پر زمین سے بلندی پر رکھی۔ احمد بن ایاز نے جو بعد میں خواجہ جہاں کے لقب سے مشہور ہوا ان دنوں بادشاہ کا میر عمارت تھا۔ اس کی بنیاد ایسے انداز سے رکھی کہ اگر اس کے ایک خاص موقع پر ہاتھی کھڑا کیا جائے تو تمام مکان گر پڑے بادشاہ اس محل میں آکر ٹھہرا اور لوگوں کی ضیافت کی۔ جب لوگ کھانا کھا کر چلے گئے تو جوناخاں نے بادشاہ کی اجازت طلب کی کہ میں ہاتھی پیش کرنا چاہتا ہوں چنانچہ ایک ہاتھی جو ساز و سامان سے مرصع تھا سامنے لایا گیا۔ مجھ سے شیخ رکن الدین ملتانی ذکر کرتے تھے وہ اس وقت بادشاہ کے پاس تھے۔ جوناخاں نے ان سے کہا کہ اے اخوند عالم نماز عصر کا وقت قریب ہے آؤ نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ وہ محل سے باہر نکل گئے۔ اسی وقت ہاتھی کو لائے۔ ہاتھی کا محل میں پہنچنا تھا کہ تمام مکان بادشاہ اور شہزادہ کے سر پر گر پڑا“۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم صفحہ ۹۲)

لیکن ابن بطوطہ اس وقت ہندوستان آیا نہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ واقعات اس نے بعد کو سُنے اور اپنے سفرنامہ میں درج کئے ہیں تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاء برنی اس عہد کا مورخ ہے لیکن اس نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ پچھلے سب مورخ ضیاء برنی پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ارادۃً ضیاء الدین کی خاطر سے جو اپنے چچا زاد بھائی سلطان محمد تغلق کا بڑا مداح اور شکر گذار تھا اصل کیفیت بیان نہیں کی اور اگر اس کی نسبت یہی خیال برقرار رکھا جائے تو بھی بقول فرشتہ ”یہ کسی طرح سمجھ

میں نہیں آتا کہ الغ خاں نے کس کرامت سے کام لے کر قصر سے باہر آتے ہی چھت کو گرا دیا۔"

بالغرض اگر یہ مان لیا جائے کہ الماں ارادۃً اس قسم کا بنایا گیا تھا کہ وہ ایک وقت مقررہ پر گر جائے تو ظاہر ہے کہ الغ خاں کا پروگرام یہ نہ تھا کہ بادشاہ اسی وقت روانہ ہو جائے بلکہ رات کو قیام کرے اور صبح کو روانہ ہو اور پھر اس کے لئے بہتر وقت رات کا ہو سکتا تھا جب بادشاہ اپنی خوابگاہ میں تنہا سویا ہوتا نہ کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد۔ پھر اس مکان کے انجینیر خواجہ ایاز کو وزیر اعظم بنا دیا اور اپنی تمام زندگی میں اس کی قدر افزائی کرنے کو بھی ابن بطوطہ اور اس کے راوی نے بادشاہ کے خلاف ایک حجت قائم کی ہے لیکن یہ بھی دلیل مستقل نہیں کیونکہ اس زمانہ میں بادشاہ لوگ ایسے لوگوں پہ کم اعتبار کرتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے سے آگے پیچھے ضرور مروا دیا کرتے تھے چنانچہ فرشتہ اور تمام صاحب الرائے مورخین نے اس روایت سے انکار کیا ہے۔

واقعہ اصل یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ عموماً علماء و مشائخ سے محبت و اُنس رکھتے تھے اور وہ بھی ان کے دربار میں شریک ہوتے اور دنیاوی مہمات میں ہاتھ بٹاتے تھے مگر تمام مشائخ دہلی کے سرتاج حضرت شاہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے ساتھ عجیب اتفاق تھا۔ بادشاہ آپ کی زیارت سے بہرہ اندوز ہونے کی خواہش کرتے مگر آپ انکار و کنارہ فرماتے تھے۔ آپ کا ابتدائی زمانہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں تھا۔ اس کے بعد بلبن کا پوتا کیقباد تخت نشین ہوا اس کو حضرت کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق تھا کہ آپ کی خانقاہ کے قریب موضع کھیلو کری میں اپنا قصر بنایا اور وہیں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔

یکایک حکومت کیقبادی میں انقلاب پیدا ہوا اور سمانہ کے حاکم جلال الدین فیروز خلجی نے حملہ کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ کیقباد قتل ہو کر دریائے جمنا میں ڈال دیا گیا۔ فوجی اور ملکی عمائد پر حضرت محبوب الٰہی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اگر آپ چاہتے تو جلال الدین دہلی پر ہرگز قابض نہ ہو سکتا اور آپ کا معتقد کیقباد ہمیشہ سلطان دہلی بنا رہتا مگر حضرت کو ان جھگڑوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ ایک مدت تک جلال الدین خلجی نے بیحد کوشش کی کہ آپ کی زیارت کا شرف حاصل کرے مگر آپ نے منظور نہ فرمایا اس کے بعد جب وہ اپنے برادر زادہ علاء الدین خلجی کے اشارے سے مارا گیا تو اس کے ورثا اور علاء الدین میں تاج ہند کے لئے زور آزمائیاں ہونے لگیں۔ آپ نے باوجود کافی قدرت رکھنے کے کسی کی بھی پاسداری نہ کی اور خاموشی سے اپنی بے غرض پالیسی کا ثبوت دیتے رہے۔

علاء الدین خلجی جب مستقل تاجدار بن گیا تو حضرت محبوب الٰہی کی قدر دانی کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کے اشعار کو بڑے اشتیاق سے منگاتا۔ پڑھ کر روتا اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ گو یہ بادشاہ بھی آپ کی زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ تو اپنے دونوں بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کو آپ کے مریدوں میں داخل کرا دیا۔ حضرت کو بھی علاء الدین سے خاص محبت تھی اور آپ اس کی بہبودی کے دل سے خواہاں تھے۔

علاء الدین کی وفات کے بعد کچھ ایسی پیچیدگی واقع ہوئی کہ ولیعہد خضر خاں تخت سے محروم رہ گیا اور ملک کافور (نائب) نے بظاہر اس کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو تخت پر بٹھایا اور دراصل میں خود امور سلطنت کا انتظام کرنے لگا۔ ۳۵ دن کے بعد ہی ملک کافور قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد علاء الدین کا تیسرا لڑکا قطب الدین مبارک تاجدار بن گیا۔ قطب الدین نے سب سے پہلے بڑے بھائی مدعی سلطنت کی خبر لی اور اس کو اندھا کر دیا اور پھر اس کو شادی خاں اور دوسرے بھائیوں سمیت مروا ڈالا۔ اس وقت خیال کیا جاتا تھا کہ حضرت محبوب الٰہی اپنے حقدار مظلوم مرید کا قطب الدین سے ضرور بدلہ لینگے مگر حضرت نے کچھ توجہ نہ فرمائی اور اپنی بے غرض پالیسی پر ثابت قدم رہے۔

سلطان قطب الدین مبارک نے بادشاہ ہوتے ہی آپ سے پرخاش شروع کی اور حکم دیا کہ مہینے کی پہلی تاریخ میں ہر روز دربار کیا کریں۔ آپ نے جواب میں نہایت نرمی سے اطلاع دی۔ "بادشاہ سے ملنے کا میرا دستور نہیں لہذا اب بھی اس کے خلاف نہیں کر سکتا"۔ سلطان اس جواب سے نہایت برافروختہ ہو کر بولا۔ "اگر وہ نہ آئینگے تو میں جبراً بلاؤں گا اور اپنے شاہی اختیارات سلطانی کو اچھی طرح سے استعمال کروں گا۔ مناسب ہے کہ وہ اس ماہ کے غرہ کو ملاقات کر جائیں"۔ بادشاہ کے اس خیال سے تجربہ کار امراء کو اندیشہ ہوا اور متحد ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلطان کے پاس چلنے کی التجا کی آپ نے فرمایا۔ "میں اپنی ذاتی رائے بدل سکتا ہوں، مگر بزرگوں کے قواعد ترک نہیں کر سکتا"۔ القصہ مقررہ غرہ کا دن آ گیا اور

لوگوں کی تشویش بڑھنے لگی - عام خیال تھا کہ اگر بادشاہ نے حضرت کے ساتھ کوئی گستاخی کی تو قیامت برپا ہو جائے گی - حضرت کے خدام سے عرض کی کہ تشریف لے جانے کا وقت ہو تو سواری کا سامان کیا جائے - آپ نے کچھ جواب نہ دیا - آدھی رات کے وقت حضرت محبوب الٰہی جذبہ کی شان سے صحن خانقاہ میں گشت کرنے لگے اور فارسی کا ایک شعر آپ کی زبان پر تھا جس کا مطلب تھا "لومڑی اپنی جگہ پر کیوں نہ بیٹھی رہی - شیر سے پنجہ کیا اور سزا پائی" یکایک غل ہوا کہ سلطان مارا گیا - صبح تک کسی کو صاف علم نہ تھا کہ قاتل کون تھا - مگر اس نئے اعلان نے سب کو خبردار کر دیا "ہند کے تاج کا وارث خسرو ہے"

خسرو، قطب الدین کا نمک پروردہ غلام تھا - گجرات کی مہموں سے گرفتار ہو کر مسلمان ہوا - قطب الدین نے اس کی نوخیز ملاحت پر فریفتہ ہو کر اپنے مقربوں میں شامل کر لیا - خسرو نے رفتہ رفتہ اعتبار بڑھایا اور اپنی عظیم الشان تمنا کے حصول کی دھن میں محل ہزار ستون کی چھت پر اپنے فدائی آقا کو ۷۲۰ھ میں قتل کیا اور دار السلطنت پر قبضہ کر کے ہند کا تاجدار بن گیا - اس شکر میں اس نے دہلی میں جتنے بڑے بڑے علما، و زہاد اور صوفیائے عظام تھے سب کو معقول ہدیے اور نذرانے بھیجے اور حضرت محبوب الٰہی کے حضور میں بھی پانچ لاکھ تنکہ پیش کئے - اس دربار میں شاہی نذرانے کی کیا وقعت ہوتی تھی فوراً حضور نے ساری رقم غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم فرما دی اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا - زمانے نے بساط الٹی اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ حکومت کے مزے لوٹے تھے کہ اس کو بھی وہی دن دیکھنا نصیب ہوا جو اس نے قطب الدین کو دکھایا تھا یعنی دیپالپور کے حاکم غازی تغلق کے ہاتھ سے مارا گیا - اس کا خوبصورت سر ہزار ستون کی چھت پر کاٹ کر ذلت سے نیچے پھینک دیا گیا اور ۷۲۰ھ میں غازی تغلق غیاث الدین کے نام سے بادشاہ ہوا خسرو کے فتنہ سے فارغ ہو کر غیاث الدین امور سلطنت کی طرف متوجہ ہوا - اس نے تمام مشائخ دہلی کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ جس جس شخص کو خسرو خاں نے ہدیے اور نذرانے پیش کئے تھے سب واپس لا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں کیونکہ یہ خسرو خاں کا اپنا مال نہیں تھا بلکہ شاہی خزانہ جو سلطنت کی چیز تھی بیدریغ لٹایا گیا تھا - پس جو شخص رقمیں واپس نہ کریگے غضب سلطانی کے مورد بنیں گے - چنانچہ مارے خوف کے تمام بزرگوں نے بلا توقف رقمیں شاہی قاصدوں کے حوالے کر دیں اور جنھوں نے رقمیں واپس کرنے میں ذرہ بھر بھی تامل کیا انھیں سخت تکلیفیں دی گئیں - شاہی قاصد حضرت سلطان الاولیا کے حضور میں بھی پہنچا اور فرمان سلطانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا بھئی میری طرف سے شاہ کو کہہ دینا کہ روپیہ تو خرچ کرنے اور غریبوں کی امداد کے لئے ہوتا ہے نہ کہ جوڑنے اور حفاظت سے رکھ چھوڑنے کے لئے - میں نے تو اسی وقت تمام روپیہ ضرورتمندوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا تھا اب میرے پاس روپیہ کہاں جو میں دے دوں -

غیاث الدین کو اس صاف جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر حضرت سلطان المشائخ کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ بادشاہ ان کو گرفتار کرانے یا کسی سزا کے دینے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا - مجبوراً چپ ہو رہا - چند خود غرض اور نفس پرست اور بد باطن ارکین دولت نے جب دیکھا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ سے ناراض ہے تو انھیں اور کیا چاہیئے تھا حضرت کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کا خوب موقع ہاتھ آیا - چنانچہ انھوں نے حضرت محبوب الٰہی کے خلاف بہت سے اتہامات تراشے اور انھیں خوب نمک مرچ لگا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا - منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ حضور وہاں تو ہر وقت محفل سماع منعقد رہتی ہے جو بالکل خلاف شرع اور بدعت ہے - فوراً علمائے کرام سے اس کے متعلق استفسار کیا جائے کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہیئے جو یوں علانیہ شریعت کی ہتک کرے - فرشتہ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے -

"جمعے کہ با شیخ عداوت و حسد داشتند و منکر سماع بودند فرصت یافتہ بعرض رسانیدند کہ ایں شیخ با جمیع مریداں خود غیر از سماع کارے ندارد و سرود کہ در مذہب حنفی حرام است می شنود پس بادشاہ را واجب است کہ علما را طلبیدہ محضرے سازد و اور ا ازاں فعل نامشروع نہی نماید"

چنانچہ علمائے کرام نے حسب معمول بڑے ذوق شوق سے حضرت سلطان الاولیا کے خلاف کفر اور فسق کے فتوی دیدیئے اور اپنے نزدیک بڑی خدمت اسلام انجام دی - نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے عصر اور حضرت محبوب الٰہی کے درمیان دربار سلطانی میں ایک زبردست مباحثہ ہوا جس میں علماء کو شکست ہوئی اور سخت ذلت اٹھانی پڑی اور حضرت شیخ واپس تشریف لے گئے

اور اس طرح یہ قضیہ نامرضیہ بظاہر ختم ہو گیا مگر بادشاہ کے دل میں دشمنی اور کاوش پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بادشاہ کو بنگالہ کی مہم پیش آ گئی اور وہ وہاں چلا گیا۔ مہم سر کرنے کے بعد جب وہ وہاں سے دارالسلطنت کی طرف لوٹا تو راستہ ہی میں سے حضرت سلطان الاولیا کو فرمان بھیجا کہ ہم واپس پایہ تخت کو آ رہے ہیں اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو فوراً دہلی کو خالی کر دو اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔ میرے داخلہ دہلی کے وقت اگر تم وہیں ہوئے اور وہاں سے نہ چلے گئے تو پھر تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

حضرت شیخ کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو آپ پڑھ کر ہنسے اور صرف اتنا فرمایا کہ "ہنوز دہلی دور است" یعنی بادشاہ نے جو لکھا تھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ابھی دہلی بہت دور ہے۔ حضرت محبوب الٰہی کے مُنہ سے اس فقرہ کا نکلنا تھا کہ فوراً سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔ اب سنیئے کہ شہنشاہ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام سے منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا نہایت اطمینان سے دارالسلطنت کو واپس آ رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ نظام الدین کی کیا مجال ہے جو میرے قاہرانہ حکم سے ذرا بھی سرتابی کر سکے اور یقیناً میرے داخلہ دہلی سے پہلے دہلی اس کے وجود سے پاک ہو جائے گی۔ ادھر بادشاہ کی واپسی کی خبر ملتے ہی دارالخلافہ میں اس کے شاندار استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں اور تمام شہر دُلہن کی طرح سجایا جانے لگا۔ قرار یہ پایا کہ شہر کے تمام معززین اور بادشاہ کے ارکین دربار شہر سے باہر تین کوس پر جا کر شہنشاہ کا استقبال کریں۔ ایک رفیع الشان محل اس غرض سے تعمیر کیا جائے کہ بادشاہ آ کر اس میں قیام فرمائیں اور کچھ عرصہ وہاں اپنی تکان دور فرما کر پھر دارالسلطنت میں داخل ہوں۔

غرض ولیعہد نے نہایت سرعت کے ساتھ محل تعمیر کرایا اور اُسے ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ کیا۔ جس وقت بادشاہ کے آنے کی خبر آئی ایک بڑا جم غفیر معزز لوگوں اور درباریوں کا بادشاہ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلا۔ اور اسی قصر میں سب نے اپنی اپنی نذریں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ ولیعہد نے ایک نہایت پرتکلف دعوت بادشاہ اور تمام حاضرین کو کھلائی۔ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے اور بادشاہ ابھی ہاتھ بھی نہیں دھونے پایا تھا کہ قہر الٰہی بجلی بن کر گرا اور بادشاہ کے ساتھ چند امراء کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ معاً تمام حاضرین کو "ہنوز دہلی دور است"

کا الہامی فقرہ یاد آ گیا اور سب نے نہایت صاف طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بادشاہ کے لئے دہلی صرف تین کوس کے فاصلہ پر ہونے کے باوجود کس قدر دور ہے اور ہمیشہ دور ہی رہے گی۔

عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔

"مردم چوں دانستہ بودند کہ سلطان بسرعت سواری شود دست ناشستہ از آں خانہ برآمدند و سلطان بتقریب دست شستن ازاں خانہ برنیامد تا دست از حیات سقف و قصر بر سر او افتاد ..... سلطان غیاث با سلطان المشائخ چوں سوء مزاج داشت از راہ لکھنوتی پیغام بہ شیخ فرستاد کہ بعد ازاں من بہ دہلی رسم یا شیخ آں جا باشد یا من۔ شیخ فرمود "ہنوز دہلی دور است" وایں سخن ازاں روز ضرب المثل گشتہ شہرت یافت"

(منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۲۵)

حاجی محمد قندھاری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ بجلی گری اور مکان گر پڑا۔ اس روائت کو فرشتہ نے ترجیح دی ہے۔ ضیاء برنی نے بھی یہی سبب لکھا ہے اور یہی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ خدا کو اپنے محبوب بندے کا یہ قول پورا کرنا تھا کہ ابھی دہلی دُور ہے اور ظالم بادشاہ اور اس کے مفسد امرا کو سزا دینی مقصود تھی اور اگر غیاث الدین کی وفات کا یہ سبب نہ تھا تو پھر اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عمارت صرف تین دن کے اندر تیار ہوئی تھی۔ چھت کمزور تھی۔ بادشاہ کے ساتھ بڑا لشکر موجود تھا۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے دوڑنے کی وجہ سے جو دھمک پہنچی اُس نے چھت کو گرا دیا۔ اس سے بادشاہ کی موت واقع ہوئی۔

تجاہلِ عارفانہ

حضرت علامہ شفق رضوی مدظلہٗ

کسی کو اہلِ عدم کا پتا نہیں معلوم
تجھے بھی ٹھیک نشاں اے قضا نہیں معلوم

گزر گئی ہے تری جستجو میں عمرِ دراز
جنابِ خضر کو بھی راستا نہیں معلوم

مریضِ عشق کو عیسیٰ نے یہ جواب دیا
ہمیں تو خود یہ مرض ہے دوا نہیں معلوم

کسی کی یاد میں آنکھوں سے اشک جاری ہیں
مگر جو پوچھے کوئی ماجرا نہیں معلوم

جلا بھی لیتی ہے جو اُس کے مرنے والوں کو
قضا میں کون سی ہے وہ ادا نہیں معلوم

بچایا ڈوبتے بیڑے کو کس نے طوفاں سے
قسم خدا کی مجھے ناخدا نہیں معلوم

کہاں ہے دیر حرم ہے کدھر نہیں معلوم
ہم اُس کو ڈھونڈتے ہیں جس کا گھر نہیں معلوم

یہ اُس کے رازِ محبت کی پردہ داری ہے
مرے جگر کو بھی دل کی خبر نہیں معلوم

عدم کی راہ میں حائل ہے منزلِ ہستی
سفر میں کھوئے ہیں ایسے کہ گھر نہیں معلوم

اِدھر جگر میں ہے کاوش اُدھر خلش دل میں
کدھر ہے آپ کا تیرِ نظر نہیں معلوم

شفق وہ شامِ شبِ ہجر ہے معاذاللہ
کہ جس کی ہوگی نہ ہوگی سحر نہیں معلوم

"شرابِ تبسم"

ایک تفریحی لاسلکی ڈراما

از جناب شعلہ وارثی لکھنوی

افراد :-

۱- رضیہ	...	ایک ظریف الطبع خاتون،
۲- شمیم	...	رضیہ خاتون کا شوہر
۳- کلو	...	شمیم کا مسخرہ ملازم
۴- نعیم	..	شمیم کا دوست

[رضیہ اپنے شوہر شمیم سے باتیں کر رہی ہے]

رضیہ - (غصے سے) سنتے ہیں آپ؟ اگر آج نوکر نہ آیا تو یاد رکھئے شام سے تڑاتڑ فاقے ہونگے -

شمیم - فاقے ہوں یا کھانا ملے لیکن نوکر تو اس گھر میں نہیں آسکتا -

رضیہ - کیا کہا - نہیں آسکتا ...... آخر یہ کیوں ؟

شمیم - اس لئے کہ تمھارے غصہ کا پارہ ہمیشہ ایک سو باون ڈگری رہتا ہے -

رضیہ - ہوں، تو یہ کہئے نوکر میری وجہ سے گھر میں نہیں رہتے -

شمیم - (طنز سے) نہیں میری وجہ سے ...... میں ہی تو ایک بولی میں ع ڈ کام لیا کرتا ہوں اور روزانہ اُسے نامعقول، مردود - موئی کاٹے وغیرہ خطابوں سے سرفراز کیا کرتا ہوں -

رضیہ - میں کہتی ہوں کہ آپ حجت کیوں کرتے ہیں - آخر نوکر ہوتا کا ہے کے لئے ہے - کام کرنے کے لئے ہوتا ہے یا مسہری پر ٹیسو بنا کر بٹھانے کے لئے ہوتا ہے -

شمیم - یہ کون کہتا ہے کہ وہ مسہری پر ٹیسو بنا کر بٹھانے کے لئے ہوتا ہے آخر بھئی وہ بھی تو انسان ہے - کولھو کا بیل تو ہے نہیں - ذرا شانتی سے کام لیا کرو - تم تو اُسے پورا گھن چکر بنا دیتی ہو - بھلا تم ہی بتاؤ ایسے آدمی کہاں مل سکتے ہیں -

رضیہ - (غصے سے پاؤں پٹک کر) چولھے میں، بھاڑ میں، جہاں ملیں ایسے ہی نوکر ہونے چاہئیں -

شمیم - کیا خوب! نوکر بھی کہیں چولھے اور بھاڑ میں ملتے ہیں -

رضیہ - ہائے اللہ! آپ تو بہت پریشان کرنے لگے ہیں -

شمیم - بیگم! تم تو بیکار ناراض ہوتی ہو - میں سچ کہتا ہوں کہ ایسے آدمی چھانٹ چھانٹ کر "منسٹر" بنا دیئے گئے - اب نہیں ملتے -

رضیہ - واہ ملتے کیوں نہیں - ایک مرتبہ اخبار میں اشتہار دیدیجئے اور پھر دیکھئے کہ گھر میں نوکروں کی پلٹن لگ جاتی ہے کہ نہیں -

شمیم - پلٹن؟ اچھا یہ تو بتاؤ انھیں پریڈ کون کرائے گا؟

رضیہ - اونھ، آپ تو میری ہر بات کا مضحکہ اُڑا دیا کرتے ہیں - جائیے میں اب آپ سے نہیں بولوں گی -

شمیم ۔ اے لو! خفا ہو گئیں، اچھا ناراض نہ ہو ہم آج ہی اشتہار دے دیں گے،

رضیہ ۔ لیکن دیکھئے مضمون میری مرضی کے موافق ہوگا۔

شمیم ۔ کیا خوب! تو پھر مضمون بھی لکھا دیجئے نا!

رضیہ ۔ ہاں، ہاں، لکھئے:

ضرورت ہے

ایک ایسے نوکر کی جو چوبیس گھنٹے میں ۲۶ گھنٹے کام کرے
کھانا نہ ملنے پر بھوک کی شکایت نہ کرے۔ کسی مہینے کی
تنخواہ نہ مانگے لیکن وصولیابی کی رسید ہر مہینہ لکھ کر دے
دیا کرے۔ گھر کی تمام ضروریات کی چیزیں بازار سے
خریدے لیکن پیسہ ایک نہ خرچ کرے۔ اگر کبھی میاں
بیوی کے درمیان جھگڑا ہو تو جج بن کر فیصلہ کرے لیکن
فیصلہ ہمیشہ بیوی کے موافق ہو۔

شمیم ۔ بھئی واہ تمہاری سمجھ کے قربان۔ یہ آخری شرط تو تمام شرطوں سے زیادہ خوبصورت ہے مگر سنتی ہیں آپ، میں اس شرط پر نوکر رکھنے کے لئے قطعی تیار نہیں۔

رضیہ ۔ یہ کیوں؟

شمیم ۔ اس لئے کہ فیصلہ میرے خلاف ہوگا۔

رضیہ ۔ لیکن میاں کام تو مجھے لینا ہے۔

شمیم ۔ مگر حکم تو میرا چلے گا۔

رضیہ ۔ بیشک، لیکن گھر کے باہر۔

شمیم ۔ اب میری سمجھ میں آیا، یعنی گھر کے باہر وہ میرا نوکر ہے اور گھر کے اندر آپ کا۔ کیا خوب! بہتر ہے میں آج ہی اشتہار دے دوں گا۔

رضیہ ۔ واہ میاں واہ، آپ بھی جو کام کرتے ہیں ادھورا ہی کرتے ہیں۔

شمیم ۔ کیوں؟ کیا ابھی کچھ ادھورا رہتا ہے؟

رضیہ ۔ باقی کیوں نہیں ہے۔ نہ تو درخواستیں کرنے کیلئے کسی کا نام لکھا اور نہ مکان کا پتہ۔ آخر لوگ جو درخواستیں بھیجیں گے تو کہاں بھیجیں گے اور کس کے نام سے بھیجیں گے؟

شمیم ۔ ارے ہاں، یہ تو میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اچھا پتہ وتہ بھی بتا دو۔

رضیہ ۔ لکھئے امیدواروں کو درخواستیں پتہ ذیل پر بھیجنا چاہئیں۔

"ملّا خیالی ۔ بھوپال، سرکس بنام"

[کلو اپنے مکان پر اخبار کی ورق گردانی کر رہا ہے دفعتاً اس کی نگاہ اشتہار پر پڑتی ہے۔ وہ اخبار زمین پر پٹک کر کہتا ہے]

کلو ۔ وہ مارا، ہت تیرے کی، کامل ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اب جاکر نوکری ڈگن میں پھنسی۔ مگر یارو یہ اشتہار دینے والے بھی بڑے ہی دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو میں یہ کہوں گا کہ ان شرطوں پر سوائے کلو کے کوئی دوسرا نوکری نہیں کر سکتا۔ میں ان کی نوکری کروں گا اور ضرور کروں گا اس لئے کہ بھئی لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے لہٰذا اب مجھے اپنے ہونے والے مالک کے پاس فوراً پہنچنا چاہئے۔

[شمیم اور رضیہ باتیں کر رہے ہیں]

شمیم ۔ بیگم، تم تو کہتی تھیں کہ ملازم کے لئے اخبار میں اشتہار دے دو اور پھر دیکھو کہ گھر میں نوکروں کی پلٹن لگ جاتی ہے کہ نہیں لیکن یہاں تو ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔

رضیہ ۔ آپ بھی عقل کے پیچھے بانس لئے پھرتے ہیں۔ ارے بھئی اخبار کا اشتہار کوئی جادو ٹونا تو ہے نہیں کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو جائے۔ اب اشتہار شائع ہوا ہے۔ لوگ دیکھیں گے تو آئیں گے۔

[باہر سے دروازے پر دستک دینے کی آواز آتی ہے]

شمیم ۔ (دستک کی آواز سن کر) ہائیں، کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

رضیہ ۔ ہوگا کوئی نوکری کا خواہشمند،

شمیم ۔ (وہیں سے چلا کر) کون صاحب ہیں؟

کلو ۔ (باہر کی آواز) صاحب نہیں ہندوستانی ہیں نوکری کرنے آئے ہیں۔

رضیہ ۔ دیکھئے نا میں کہتی تھی ہوگا کوئی نوکر، اچھا اسے یہیں بلا لیجئے۔

شمیم ۔ آؤ بھئی اندر ہی چلے آؤ۔

[کلو اندر داخل ہوتا ہے]

کلو ۔ السلام علیکم!

شمیم۔ وعلیکم السلام، کہو بھئی سب خیریت تو ہے۔
کلّو۔ خیریت ہوتی سرکار تو آتا ہی کیوں؟
شمیم۔ تو کیا تم نوکری کرنے آئے ہو؟
کلّو۔ جی ہاں، سرکار،
شمیم۔ لیکن تمہیں امتحان دینا پڑے گا۔
کلّو۔ مجھے کوئی عذر نہیں، آپ شوق سے امتحان لے سکتے ہیں۔
شمیم۔ اچھا بتاؤ۔ نوکر کسے کہتے ہیں۔
کلّو۔ لیکن حضور نوکر کی دو تعریفیں ہو سکتی ہیں۔
شمیم۔ یعنی ــــ؟
کلّو۔ اوّل یہ کہ نوکر اسے کہتے ہیں جو مالک کی عدم موجودگی میں گھر کو اس طرح صاف کرے کہ ایک تنکا بھی باقی نہ رہے۔
شمیم۔ بالکل ٹھیک، بھئی آدمی تو تم بہت تیز معلوم ہوتے ہو۔
کلّو۔ حضور کی عزت افزائی ہے۔
رضیہ۔ (ہنستے ہوئے) ہاں اور دوسری تعریف کیا ہے؟
کلّو۔ دوسری تعریف یہ ہے کہ مالک کی اتنی خدمت کرے اتنی خدمت کرے کہ حد تک پہنچا دے لیکن .....،
رضیہ۔ "لیکن" کیا؟
کلّو۔ حضور ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میاں نہ خفا ہو جائیں۔
رضیہ۔ نہیں تم بیان کرو میاں خفا نہیں ہونگے۔
کلّو۔ تو سنئے تو کوئی کام مالک کے خلاف کبھی نہ کرے۔
شمیم۔ ٹھیک ہے۔ نہ دین کے رہے نہ دنیا کے نوکر بھی بیوی ہی کا ہم خیال ہے
رضیہ۔ اچھا تو بتاؤ، تمہیں میری شرطیں منظور ہیں۔
کلّو۔ اگر منظور نہ ہوتیں تو آتا ہی کیوں سرکار؟
رضیہ۔ تو آج سے تم ہمارے نوکر ہو۔
شمیم۔ لیکن دیکھو کلّو، حکم میرا ماننا ہوگا۔
کلّو۔ بیشک سرکار۔ مگر گھر کے باہر۔
رضیہ۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) بالکل ٹھیک، اچھا جاؤ پہلا باہر کا کمرہ صاف کر ڈالو۔
کلّو۔ بہت اچھا۔
[کلّو جاتا ہے لیکن شمیم آواز دیتا ہے]

شمیم۔ کلّو ــــ!
کلّو۔ (دور سے) جی سرکار۔
شمیم۔ تم کچھ انگریزی بھی جانتے ہو؟
کلّو۔ نہیں حضور، میں رنگریزی و نگریزی تو جانتا نہیں لیکن رنگریز کی دکان ضرور معلوم ہے اگر کچھ کپڑے رنگنے کے لئے دینا ہو تو دے دیجئے دے آؤں۔
شمیم۔ اونہو تم بھی بڑے ناسمجھ ہو۔ اماں میں پوچھتا ہوں کچھ انگریزی بھی لکھ پڑھ سکتے ہو۔
کلّو۔ حضور پڑھ تو نہیں سکتا، لکھ لیتا ہوں۔
(رضیہ بہت زور سے قہقہہ لگاتی ہے اور کہتی ہے)
رضیہ۔ یہ کیسے؟
کلّو۔ لکھوا کر دیکھ لیجئے۔ اللہ نے چاہا تو آپ بھی نہیں پڑھ سکیں گی اور میں غریب تو پڑھا ہی نہیں ہوں۔
رضیہ۔ (ہنستے ہوئے) اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔
شمیم۔ اور دیکھو کلّو!
کلّو۔ جی حضور ــــ،
شمیم۔ اونھوں، اب جی حضور والا زمانہ نہیں ہے۔ جب تم کو کوئی پکارا کرے تو بجائے جی حضور کے "یس سر" کہا کرو۔
کلّو۔ "سر" تو میں جانتا ہوں لیکن سرکار یہ "یس" کیا چیز ہے۔
شمیم۔ "یس" انگریزی لفظ ہے اس کے معنی ہیں "ہاں" کے۔
کلّو۔ تو سرکار بجائے "یس سر" کے اگر "ہاں سر" کہا کروں تو کیا حرج ہے؟
شمیم۔ بھئی کیا اندھی کھوپڑی کے آدمی ہو۔ اماں جو کچھ میں حکم دوں گا وہ کروگے یا اپنی ہانکے جاؤ گے؟
کلّو۔ یہ قطعاً ناممکن ہے اس لئے کہ ابھی تو آپ گھر ہی میں ہیں۔
شمیم۔ لاحول ولا کس مصیبت میں جان پڑ گئی ارے بھئی میں تو ابھی تم کو سمجھا رہا ہوں۔
کلّو۔ تو یہ کیوں نہیں فرماتے کہ آپ سمجھا رہے ہیں اچھا اور بتائیے
شمیم۔ اور دیکھو بہت خوب کے بجائے "وری ول سر" کہا کرو۔
کلّو۔ ذرا ٹھہریئے سرکار یہ تو بڑا بھاری بھرکم لفظ ہے۔ اسے کہہ کہا

ہلکا کر دیجئے ورنہ یہ غریب کلّو اسی میں دب کر خدانخواستہ ہو جائے گا اور پھر دنیا ایک سمجھدار سے خالی ہو جائے گی۔

شمیم۔ ارے ..... تو تو گھبرایا جاتا ہے۔

رضیہ۔ یہ گھبرانا ہائے تو کیا کرے آپ بھی تو سب کچھ آج ہی سکھا دینا چاہتے ہیں۔ (کلّو سے) جاؤ کلّو باہر کا کمرہ صاف کرو۔

کلّو۔ بہت خوب!

شمیم۔ ہائیں! گدھے کی مار ڈھائی گھنٹے میں بھول گیا۔ وری ول سر کہہ وری ول سر۔

کلّو۔ ہاں بھول گیا تھا سرکار، وری ول سر۔

(کلّو چلا جاتا ہے اور پھر دروازے کے پاس جاکر کہتا ہے)

کلّو۔ حضور کوئی صاحب آپ سے ملنے کیلئے آئے ہیں۔

شمیم۔ ان کا نام کیا ہے؟

کلّو۔ حضور نام تو میں نے دریافت نہیں کیا۔ کہئے تو پوچھ آؤں۔

شمیم۔ ارے بیوقوف! تجھے پہلے ہی پوچھ لینا چاہئے تھا۔ اچھا جا، پوچھ آ۔

کلّو۔ بہت خوب، اے وری ول سر۔ لیکن حضور اگر ابھی ان کا نام رکھا ہی نہ گیا ہو تو ......

شمیم۔ ابے تو تو پورا گدھا ہے۔

کلّو۔ نہیں سرکار گدھا نہیں ہے۔ دو ہاتھ ہیں۔ دو پاؤں ہیں دو آنکھیں ہیں۔ ایک منہ ہے۔ ایک ناک ہے دو کان ہیں غرض کہ وہ پورے پورے انسان ہیں۔

شمیم۔ لاحول ولا، تم بھی الو کی دم فاختہ ہو، جاؤ ان کا نام پوچھ کر آؤ۔

(کلّو دروازے تک جاتا ہے اور کہتا ہے)

کلّو۔ مسٹر نعیم ہیں سرکار۔

شمیم۔ وہ اس وقت کیسے آئے۔

کلّو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے سرکار، ٹانگوں سے چل کر آئے ہیں۔

شمیم۔ لاحول ولا۔ تو بھی اپنی ٹانگ ہر جگہ اڑا دیتا ہے جا ان کو یہیں بھیج دے

کلّو۔ بہت اچھا۔ ایں نہیں نہیں۔ وری ول سر۔

(کلّو چلا جاتا ہے اور نعیم داخل ہوتا ہے)

نعیم۔ السلام علیکم!

شمیم۔ وعلیکم السلام، آئیے نعیم صاحب کیسے زحمت فرمائی!

نعیم۔ اماں زحمت کاہے کی۔ لیکن بھائی یہ تمہارا نوکر ......

شمیم۔ ہاں بھائی بڑا ہی پُرمذاق آدمی ہے (کلّو کو آواز دیتا ہے) کلّو، کلّو

کلّو۔ (دور سے) حاضر ہوا سرکار۔

(کلّو قریب آتا ہے تو شمیم کہتا ہے)

شمیم۔ دیکھو آپ کے لئے چا لاؤ۔

کلّو۔ لیکن حضور برف تو ہے نہیں۔

شمیم۔ (تعجب سے) ابے برف کیا ہو گی؟

کلّو۔ چائے میں ڈالنے کے لئے سرکار۔

شمیم۔ ارے بیوقوف، چا میں کہیں برف بھی ڈالی جاتی ہے۔

کلّو۔ واہ سرکار۔ چا گرم ہوتی ہے اور برف ٹھنڈی۔ لہٰذا معتدل بنانے کیلئے تھوڑی برف ضرور ڈال لینا چاہئے۔

نعیم۔ (ہنستے ہوئے) بھائی شمیم، تمہارا نوکر تو ہمیں حکیم معلوم ہوتا ہے۔

کلّو۔ اس میں کیا شک ہے حضور، حکمت تو ہمارے باپ دادا کا آبائی پیشہ تھا۔ ہمارے دادا کو "آباد کنندۂ قبرستان" کا خطاب ملا تھا اور ہمارے باپ کو "عزرائیل ثانی" اور ہمارے نانا کو .....

شمیم۔ شٹ اپ۔ جا چائے لا۔

کلّو۔ (نہایت مایوسی سے) وری ول سر سرکار..... (چلا جاتا ہے)

نعیم۔ بھئی شمیم، تمہارا نوکر تو بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ کہیں سیر کرنے بھی چلو گے۔

شمیم۔ ہاں یار، جی تو بہت چاہتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں چلیں؟ اس لئے کہ اب ہندوستان کا کوئی شہر کانگریسی حکومت کی برکتوں سے خالی نہیں ہے۔ اگر کوئی صوبہ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے قتل گھر (مذبح) نہیں بنا ہوا ہے تو تبرّہ اور مدح صحابہ کی وجہ سے میدان کربلا ضرور بنا ہوا ہے تو بھیا اپنے اپنے گھروں میں بیٹھو اور کہیں جانے والے کا نام نہ لو۔ ورنہ وہ لنگوٹی والے مہاراج کہیں گے کہ تم نے کچھ گڑبڑ کر کے چلے۔

اماں جاؤ۔ تم بھی کیا باتیں کرتے ہو مہاتما کی لنگوٹی تو بہت عرصہ ہوا بوسیدہ ہو چکی ہے اب رہی ان کی سیاسی کھوپڑی۔ سو وہ

غور و فکر کرتے کرتے اس قدر خشک ہو گئی ہے کہ اب یہ بھی سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیا مسلمان درحقیقت ان کے اور ان کے چیلوں
کے مٹانے اور تباہ کرنے سے مٹ سکتے ہیں اور ہندوستان چھوڑ
کر بھاگ سکتے ہیں؟ لاحول ولا۔
تم یقین کرو کہ ایک دن ان لوگوں کو اپنی ہمہ دانی کے ہتھیار
ڈالنا پڑیں گے اور مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا پڑیں گے
لیکن آخر تم اس اندیشہ سے کیوں دُبلے ہوئے جا رہے ہو؟ چلو
امریکہ چلنے کی تیاری کرو۔

شمیم ۔ واہ! امریکا تو ہم جا چکے ہیں۔ اب کیا کریں؟

نعیم ۔ اب کیا کریں؟ اماں تمھیں معلوم بھی ہے اس سال امریکا والے
آسمان کی سیر کرنے جانا چاہتے ہیں۔ لہذا ہم لوگ بھی ان کے ہمراہ
چلیں گے۔

شمیم ۔ لیکن یہ لوگ اتنا بڑا سفر کریں گے کس چیز پر؟

نعیم ۔ ہوائی جہاز پر کرینگے اور کس چیز پہ کرینگے۔

شمیم ۔ تو بھئی ہم نہیں جا سکتے۔

نعیم ۔ یہ کیوں ۔۔۔؟

شمیم اس لئے کہ میں ہوائی جہاز پر بیٹھتے ذرا ڈرتا ہوں۔ ہاں کسی اور
سواری کا انتظام کرو تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔

نعیم ۔ لیکن آسمانی سفر کے لئے ہوائی جہاز سے بہتر کوئی دوسری سواری
نہیں ہو سکتی۔

شمیم ۔ واہ، کیا بیل گاڑی نہیں جا سکتی؟

نعیم ۔ بھئی کیا بات بتائی ہے۔ چلو سواری کا بھی معاملہ طے ہو گیا۔ وہ لوگ
اگر ہوائی جہاز پر جائیں گے تو ہم لوگ بیل گاڑی ہی پر سہی۔ مگر
چلیں گے ضرور۔

شمیم ۔ ضرور چلیں گے صاحب، ضرور چلیں گے۔

نعیم ۔ اچھا تو پھر آپ بھی انتظام کیجیے اور میں بھی اب جاتا ہوں خدا حافظ۔

[کلو چائے لیکر آتا ہے اور کہتا ہے]

کلو ۔ اور سرکار چائے ۔۔۔؟

شمیم ۔ اُسے باندھ کر رکھ دو۔ سفر میں کام آئے گی۔

کلو ۔ کیا خوب! سرکار کیا چائے بھی کوئی موٹر ہے جو باندھ کر رکھ دی جائے
لیکن یہ تو بتلایئے کہ آپ لوگ جا کہاں رہے ہیں۔

شمیم ۔ آسمان کی سیر کرنے۔

کلو ۔ اور حضور جایئے گا کس سواری پر۔

شمیم ۔ لاحول ولا کس خر دماغ سے سامنا پڑا ہے۔ ابے بیل گاڑی پر جائیں
گے اور کاہے پر؟

کلو ۔ اے سبحان اللہ۔ یہ بیل گاڑی کی بھی ایک ہی رہی۔ لیکن سرکار
سُنتے ہیں آپ۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں بہت زیادہ خراب
ہو گئی ہیں لہذا اونٹ گاڑی پر جایئے تو بہتر ہے۔

شمیم ۔ چپ رہ بیوقوف، کہیں اونٹ گاڑی بھی آسمان پر جا سکتی ہے!

کلو ۔ اگر اونٹ گاڑی نہیں جا سکتی ہے سرکار تو میں شرطیہ کہتا ہوں
کہ بیل گاڑی بھی نہیں جا سکتی۔

شمیم ۔ پھر وہی بک بک کیے جاتا ہے کمبخت کہیں کا، جا اپنا کام کر۔

[کلو بھاگ جاتا ہے]

چند روز بعد

رضیہ ۔ (آپ ہی آپ) نوکروں کی ذات بھی بڑی عیبی ہوتی ہے۔ اب
دیکھئے ناکہ میز پوش غایب ہے۔ الماری میں برتن بھی کم ہو گئے
ہیں۔ ٹاپہ موجود ہے لیکن مُرغیاں سب غایب ہیں۔ کل کھانے
کے ساتھ انڈے بھی نہیں تھے۔ پیالہ میں شوربا ضرور تھا لیکن بوٹی
ایک بھی نہ تھی۔ کمبخت کلو نے تو ناک میں دَم کر دیا ہے۔ سمجھ میں
نہیں آتا کہ یہ حرکتیں اگر اس کی نہیں ہیں تو پھر کس کی ہیں۔

[شمیم آجاتا ہے اور کہتا ہے]

شمیم ۔ بیگم! یہ تم کیا بڑبڑا رہی ہو؟

رضیہ ۔ کیا بتاؤں کلو کی جان کو رو رہی ہوں۔ نوکر جب پُرانے ہو جاتے
ہیں تو کمبخت بڑی تکلیفیں پہنچانے لگتے ہیں۔

شمیم ۔ اور یہاں آج اندھیرا کیوں ہے لالٹین کیوں نہیں جلائی گئی؟

رضیہ ۔ کلو سے پوچھئے میں نہیں جانتی۔

شمیم ۔ (کلو کو آواز دیتا ہے) کلو او کلو۔ او کلو کے بچے سنتا نہیں کیا بہرا ہو گیا۔

کلو ۔ آیا سرکار!

شمیم ۔ یہاں آج لالٹین کیوں نہیں جلائی ؟

کلّو ۔ تیل نہیں تھا سرکار ۔

رضیہ ۔ لیکن تیل والا تو آج تیل دے گیا تھا ۔

شمیم ۔ تو پھر تیل کیا ہوا ؟

کلّو ۔ مجھے نہیں معلوم سرکار کہ کیا ہوا !

شمیم ۔ تو نہیں جانتا تو پھر کون جانتا ہے ؟ بتا تیل کیا ہوا ورنہ مارتے مارتے گدھا بنا دوں گا ۔

کلّو ۔ کہہ تو دیا سرکار میں نہیں جانتا ۔

رضیہ ۔ یہ یوں نہیں بتائیگا پہلے آپ اس کا مُنہ سونگھئے پھر پتہ لگ جائیگا کہ تیل کیا ہوا ؟

کلّو ۔ (گھبرا کر) واہ بیوی واہ، کیا میں نے تیل پی لیا ہے ؟

رضیہ ۔ بیشک ! جب تو نے بچے کا قارورہ شربت سمجھ کر پی لیا ہے تو تیل پی لینا کون سی بڑی بات ہے ۔

کلّو ۔ واہ سرکار، آپ بھی انھیں کی ایسی کہنے لگے اب اگر نوکر رکھنے کا دل نہیں چاہتا تو یونہی جواب دیدیجئے خواہ مخواہ الزام لگانے سے کیا فائدہ ؟

شمیم ۔ ٹھہر تو جا مردود زبان لڑاتا ہے جھوٹا بناتا ہے ۔ ہزاروں مرتبہ تو نے چوری کی لیکن میں نے ہمیشہ تجھے چھوڑ دیا مگر دیکھ آج میں تجھے ٹھیک کئے دیتا ہوں اور تیری کھال کھینچکر بھوسہ بھر دیتا ہوں ۔

[مارنا شروع کر دیتا ہے]

کلّو ۔ ارے مرا ۔۔۔ ہائے مرا ۔۔۔ خدا کے لئے اب نہ ماریئے ۔ کل پھر مار لیجئے گا ۔ اُفوہ آپ مارے ہی جاتے ہیں ۔ آہ، میں مار کھاتے کھاتے تھکا جاتا ہوں لیکن آپ مارتے مارتے نہیں تھکتے ۔۔۔ ارے میرے اللہ

[رضیہ بچا لیتی ہے اور کہتی ہے]

رضیہ ۔ اچھا چل دور ہو سامنے سے ۔ خبردار اب کبھی تیل نہ پینا کمبخت کہیں کوئی تیل پیتا ہے ۔

[کلّو بھاگ جاتا ہے اور افسردگی کے ساتھ ایک کونے میں گنگناتا ہے]

نوکری ناگوار ہوتی ہے ۔۔۔ کلّو کلّو پکار ہوتی ہے
کام جتنا بھی چاہے اچھا کرو ۔۔۔ بدلہ میں اس کے مار ہوتی ہے
شعلہ عالم ہے یہ زمانے کا ۔۔۔ نوکری بھی اُدھار ہوتی ہے

اَفکارِ ضمیر

قبضہ میں ہے فنا و بقا تُو لئے ہوئے
اعجاز لب میں آنکھ میں جادُو لئے ہوئے

نازاں ہے چرخ کیا مہِ نو تُو لئے ہوئے
ہاں ہے وہ کچھ تشابُہ ابرو لئے ہوئے

اللہ کیا جمال ہے رُخسارِ یار کا
سُورج کا نُور پھُول کی خوشبو لئے ہوئے

کانٹے پڑے ہیں حلق میں ساقی پلا مجھے
وہ پھُول ہو جو پھول کی خوشبو لئے ہوئے

اُس سحر کار شوخ کی آنکھیں ہیں نیم باز
سویا ہے دو دو جاگتے جادُو لئے ہوئے

کیا جانے لُطف باغ میں تاروں کی چھاؤں کا
کھیلا کرے جو ہاتھ میں جگنو لئے ہوئے

کس صحن میکدہ کی ہوا کو تلاش ہے
کیوں پھر رہی ہے ابر کو ہر سو لئے ہوئے

پھولوں کا ہار ہاتھ سے دیدیجئے ہمیں !
بیٹھے ہیں آپ غیر کا پہلو لئے ہوئے

کس کا ہے وزن کتنا سمجھ لو ضمیر آج
بیٹھے ہیں جو نظر کی ترازو لئے ہوئے

نکات

جناب امینؔ حزیںؔ سیالکوٹی،

(۱)

بجلیاں بھر لی ہوں جس نے شوق کی پرواز میں
رونما ہوتی ہے رفعت اُس کے ہی انداز میں

بیج کے نقطے کے اندر ہے شجر سمٹا ہوا
منعکس انجام ہے آئینۂ آغاز میں

(۲)

چکنے چکنے پات ہیں بِروا اگر ہے ہونہار
شاخ جو سوکھی نہیں ہوگی بہار اُس پر نثار

قدر کر اس کی یہی "آئینۂ تقدیر" ہے
"آج" جو تیرا ہے تیرے "کل" کا ہے آئینہ دار

(۳)

آرزوئے "تازہ کاری" سے ہے دل کی زندگی
"تازہ کاری" میں ہے ساری آب و گل کی زندگی

نونہالانِ چمن وہ اور یہ دیوارِ چمن!
زندگی کس کی ہے؟ بوٹوں کی کہ سِل کی زندگی

(۴)

"جوہرِ بیتاب" کو بیتاب رکھنا ہے زیست
"دیدۂ ادراک" کو بیخواب رکھنا ہے زیست

دل کے گلشن کی "خزاں نا آشنائی" ہے حیات
اس چمن کو اے امینؔ شاداب رکھنا ہے زیست

اردو قصیدہ

سودا اور ذوق پر ایک نظر

از جناب ابو مسلم صاحب صدیقی بدایونی بی۔ اے (علیگ)

اُردو شاعری قصیدہ کے لئے عربی شاعری کی مرہون منت ہے یعنی اُردو میں قصیدہ کی ابتدا عربی شاعری کے اثر سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں قصیدہ کی ابتدا ارقدما کے دور میں ہوچکی تھی۔ لیکن شعرائے دکن کی تمام تصنیفات دستیاب ہوچکی ہیں اور کوئی وجہ کسی قصیدے کے نہ ملنے کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قصیدہ کی ابتداء در اصل اس وقت ہوئی ہی نہ تھی۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس زمانے کے شعراء نے اپنے عہد کے بادشاہوں کے حالات اور فتح و نصرت کے بیان میں مثنویاں لکھی ہیں اگر قصیدہ کی ابتدا ہوچکی ہوتی تو وہ قصیدہ ضرور کہتے۔ ہمیں تاریخ ادب میں اس کی ابتدا کا وجود ولی دکنی کے عہد سے مل سکتا ہے۔ مگر اس کی ترقی قدما کے دوسرے دور میں ہوئی۔ ادبی حیثیت سے ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ سودا ہی قصیدہ کے موجد ہیں اگرچہ تاریخی حیثیت سے وہ نہیں۔

سودا نے اکثر قصائد ایران کے مشہور شعراء کے قصائد پر لکھے ہیں اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحیح معنی میں اُردو قصائد دیگر اصناف سخن کی طرح فارسی ہی کے مرہون منت ہیں۔ دراصل اُردو قصیدہ کا اختراع و عروج ایک ہی شاعر کے عہد میں ہوگیا اور وہ ہمارا مشہور قصیدہ گو شاعر سودا ہے۔ جس کا ذکر بعد میں ہم بالتفصیل کریں گے۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ قصیدہ ہے کیا؟ اور اس کے مقاصد کیا تھے؟ اس کے عروج و زوال کی کیا وجہ ہوئی؟ اس کے اُردو کے دو مشہور قصیدہ گو شعرا سودا اور ذوق کے کلام سے تفصیلی بحث کریں گے۔

اہل لغت قصیدے کے لفظی معنی "مغز سطبر" کے لکھتے ہیں جس کے معنی سلیس ہندوستانی میں "دلدار گودنے" کے ہوئے۔ اصطلاح شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مدح یا ذم یا وعظ و نصیحت یا حکایت و شکایت وغیرہ منظوم ہو کیونکہ اس میں عالی مضامین اور اکثر پاکیزہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اسے صنف شاعری کا مغز سمجھنا جائز ہے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں اسے "چامہ" کہتے ہیں۔ عربی میں قصائد کو آخری حرف کی نسبت سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ردیف کا آخری حرف لام ہے تو اُس کو لامیہ کہیں گے اور اگر جیم ہے تو جیمیہ وغیرہ۔

قصیدہ کی ابتدا تشبیب سے ہوتی ہے۔ تشبیب مشتق ہے شباب سے چونکہ یہ اس مجموعہ اشعار کا نام ہے جن میں گل و گلزار اور عیش و عشرت کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ اشعار بالکل آغاز قصیدہ میں ہوتے ہیں اس لئے اُسے تشبیب کہتے ہیں تشبیب کے مضامین کے اعتبار سے نام بھی ہوتے ہیں مثلاً جس تشبیب میں بہار و گل و گلزار و سبزہ و کہسار کا ذکر ہوتا ہے وہ تشبیب بہاریہ کہلاتی ہے۔ بعض دفعہ پورا قصیدہ ہی بہاریہ ہوتا ہے اس میں بہار کو زندہ شخص تصور کر کے ممدوح قرار دیتے ہیں اور اس کی مدح میں قصیدہ کہتے ہیں۔ اگر تشبیب میں اپنا حال احوال درج کیا جائے تو وہ حالیہ کہلاتی ہے اور اگر حسن و عشق کے معرکے دکھلائے جائیں تو عشقیہ کہلائے گی۔ اکثر شعراء تشبیب میں اپنے فخر و کمال کا ذکر بھی کرتے ہیں ایسی تشبیب کو فخریہ کہتے ہیں۔

تشبیب کے بعد گریز کے اشعار آتے ہیں اس میں شاعر تشبیب کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہے اور پھر ایک مطلع کہہ کر اصل مدح شروع کر دیتا ہے اس کے بعد شاعر اپنے ممدوح کو دعا دیتا ہے بعض شعراء اس میں اپنی ذاتی اغراض بھی شامل کر دیتے ہیں مگر ایسا کرنا ذرا مذموم ہے۔ دعائیہ اشعار کی تعداد اکثر زیادہ بھی ہوتی ہے اور دعا وہی تا قیامت زندہ رہنے کی ہوتی ہے مگر اچھے دعائیہ اشعار وہی ہیں جن کی تعداد تین یا چار سے زائد نہ ہو۔ دعائیہ اشعار میں ہمارے اُردو شعراء اپنے ممدوح کے دشمنوں کو کوسنے بھی دیتے ہیں۔

عربی قصائد کے مقاصد بڑے اعلیٰ تھے۔ عرب میں قصیدہ سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ مثلاً رجز پڑھ کر میدان جنگ میں ممدوح کے آباؤ اجداد کی بہادری کا ذکر کرکے اس کے جوش کو ابھارتے تھے اور اس کے علاوہ اور بھی تاریخی شہادتیں موجود ہیں لیکن یہاں ہمارا موضوع اُردو قصائد ہیں۔ اُردو میں جو قصائد بادشاہوں اور نوابوں کی مدح میں لکھے جاتے تھے ان سے صرف یہ مطلب ہوتا تھا کہ اپنے ممدوح کی تعریف کر کے اسے اگر وہ واقعی اچھا ہے تو ویسے ہی کاموں کو جاری رکھنے کی تلقین کریں اور اگر مدح جھوٹی ہے تو وہ شرمندہ ہو کر ویسے کام نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ اور لوگ بھی سن کر بھلائی کی طرف راغب ہوں، تیسرے یہ کہ اس کا ذکر اس کے بعد بھی آتا رہے اور اس طرح وہ دنیا میں زندہ رہے۔ اکثر لوگ اُردو شعراء پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ قصیدہ صرف اس لئے کہتے تھے کہ انھیں ان کا ممدوح انعام اکرام دے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جو قصیدے حضرت علیؓ کی شان میں کہے گئے ان کا انعام کس نے دیا اور جو قصائد نعتیہ ہیں انھیں لکھنے میں کیا لالچ تھا علاوہ اس کے بعض ایسے قصیدے بھی موجود ہیں جو "شکایت زمانہ" ہیں اگرچہ سوداؔ خود آسودہ حال تھے مگر انھوں نے اپنے زمانے کی جو حالت لکھی ہے وہ ان کے عہد کی اقتصادی۔ معاشرتی، تمدنی، اخلاقی حالت پر روشنی ڈالتی ہے۔ بعض قصائد بہاریہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے بھی کوئی لالچ نہ تھا۔ ہاں یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہوں اور نوابوں کی شان میں شاعر اس لئے قصیدہ کہتے تھے کہ وہ خود شہرت حاصل کر لیں۔ سو یہ کوئی برائی کی بات نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قصیدے کے جو چار حصے ہیں یعنی تشبیب گریز مدح اور خاتمہ بر اشعار دعائیہ ان کی اہمیت کیا ہے اور کیا یہ قصیدہ کے جزو ضروری ہیں یا نہیں؟ اب ہم تفصیل وار ان چاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض قصیدے بالکل بغیر تشبیب کے بھی موجود ہیں مثلاً سوداؔ کا وہ قصیدہ جس میں اُنھوں نے جنگ رہیلہ کا ذکر کیا ہے اور قصیدہ "شہر آشوب" اوّل الذکر کی ابتدا یوں کی ہے ؎

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار
دیکھا نہ جس کو ترک فلک نے بھی زینہار

آخر الذکر کو یوں شروع کیا ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

ان میں سے اول الذکر خطابیہ ہے اور آخر الذکر بیانیہ۔

تذکروں یعنی تاریخ حالات کے بیان کے قصائد کے لئے تشبیب ضروری نہیں۔ کیونکہ ان حالات میں ہر شخص دلچسپی رکھتا ہے اور ان کے لئے کسی مزید دلچسپی کی ضرورت نہیں۔ تشبیب کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کے دل پر مدح کا اثر زیادہ ہو۔ کیونکہ تشبیب کے اشعار سامعین کی سوئی ہوئی توجہ کو بیدار کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعر کو خود تو اپنے ممدوح سے دلچسپی ہے اور اس لئے وہ اس کی مدح کرنے بیٹھا ہے سامعین کو ممکن ہے کہ اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو تو اس کی دلچسپی کا سامان تشبیب کے اشعار مہیا کر دیتے ہیں۔ اور وہ بھی قصیدہ کو دلچسپی سے سن سکتے ہیں۔ اور ان کی طبیعت پر بار بھی نہ ہوگا۔ اکثر شعراء تشبیب میں غزل بھی شامل کر دیتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور تشبیب کے فرائض کو زیادہ اچھی طرح انجام دیتی ہے۔ لیکن شاعر کو خیال رکھنا چاہئے کہ وہ خالص غزل کہنے نہیں بیٹھا ہے بلکہ اس وقت اس کا مقصد قصیدہ کو شروع کرنا ہے لہٰذا اُس کے الفاظ بالکل غزل کی طرح سوز و گداز سے ہی بھرے ہوئے نہ ہوں بلکہ اس میں متانت سنجیدگی اور روانی کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ تشبیب کے اشعار کی تعداد مدح کے اشعار سے کم ہونی چاہئے کیونکہ ابن رشیق لکھتا ہے۔ "تشبیب کے اشعار زیادہ اور مدح کے کم قصیدے کے معائب میں داخل ہیں" لہٰذا اس کا خیال بھی رکھنا چاہئے کہ تشبیب کے اشعار کی تعداد مدحیہ اشعار سے بڑھ نہ جائے۔ اگر تشبیب میں

اس رنگ پر کچھ روشنی پڑ سکے جس کا ذکر قصیدہ کی اصل مدح میں آنے والا ہے تو قصیدہ کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر وہ ممدوح کے غسل صحت پر قصیدہ لکھ رہا ہے تو اس کو چاہیے کہ تشبیب میں بھی اس قسم کے اشعار لائے لیکن لطف تو جب ہے کہ تشبیب تشبیب ہی رہے۔

اصل مدح کے شروع کرنے سے پہلے وہ کڑی ضروری ہے جو تشبیب اور اصل مدح کو ملا سکے اس لئے گریز سے گریز کرنا ممکن ہے اور اسی لئے وہ قصیدہ کا سب سے چھوٹا مگر کافی اہم جزو ہے۔ مدح تو جز قصیدہ کا وہ جز ہے جس کی وجہ سے تشبیب اور گریز داخل ہوئے۔ ہاں اب مسئلہ صرف دعائیہ اشعار کا رہ جاتا ہے۔ اس کی نسبت صرف یہ عرض کروں گا کہ شعراء سوائے دعا کے اور انعام بھی کیا دے سکتے ہیں اور ختم پر خدا سے دعا کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے بہتر خاتمہ قصیدے کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ دعائیہ اشعار کی تعداد بعض شعراء نے زیادہ رکھی ہے مگر بہتر یہی ہے کہ ابدالآباد تک کی دعا صرف دو تین شعروں میں دے دی جائے کیونکہ زیادہ اشعار سنتے سنتے ممدوح اور سامعین دونوں اکتا جائیں گے۔

اردو قصائد کی ساری اہمیت مرزا رفیع سودا کی وجہ سے ہے کیونکہ قصیدہ کو اس طرح کہنا کہ قصیدہ کے کل لوازمات ادا ہو جائیں اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت پر پہنچانا انہیں کا حصہ ہے۔ وہ قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ وہ اس میدان میں فارسی شعراء کے عنان در عنان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ بعض موقعوں پر ان سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ "ان کے کلام کا زور شور انوری و خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی اور ظہوری کو شرماتا ہے۔" مولانا آزاد کا یہ کہنا بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیونکہ سودا ایک قصیدے کے آخر میں خود ان شاعروں سے اپنی ہمسری جتاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے منہ سے اپنی نسبت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎

انوری بعدی و خاقانی و مداح تیرا
رتبہ شعر و سخن میں ہیں ہم چاروں ایک

ایک ڈنکا ہے اب اقلیم سخن میں ان کا
رکھتے ہیں زیر فلک طبل و علم چاروں ایک

قصیدہ کی تعریف سے صاف ظاہر ہے کہ شخصی حکومت قصیدہ کے لئے سازگار ہوتی ہے۔ فارسی کے قصائد کا درجہ اس وجہ سے اہم ہے۔ سودا کی شاعری کو جس وقت فروغ ہوا تو تمام ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر پریشان حال تھا۔ اس کا ثبوت قصیدۂ شہر آشوب اور سودا کے مخمس سے مل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اردو قصیدہ کما حقہٗ ترقی بخوبی طے نہ کر سکا۔ پرانے تذکروں میں سودا کے قصائد کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور انہیں قصیدہ کا بادشاہ مانا گیا ہے۔ آزاد مرحوم کی رائے اوپر ظاہر ہو چکی ہے۔ مصحفی اور شیفتہ بھی آزاد کے ہم زبان ہیں اور سب نے انہیں مسلم الثبوت استاد مانا ہے۔ میر نے بھی انہیں "پورا استاد" مانا ہے سودا کے پیش نظر فارسی شعراء کے قصائد تھے اور انہوں نے انہیں کا تتبع کیا ہے سودا نے عرفی کا ذکر کئی جگہ اس انداز سے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفی کے قصائد کو انھوں نے بہت پسند کیا ہے۔ فارسی شعراء کی طرح سودا نے بھی "مشکل مگر دلاویز زمینیں" اختیار کیں۔ سودا نے انوری کی تقلید ہجویات کے سلسلہ میں کی ہے اور ان کی "ہجو اسپ" کے تتبع میں ایک قصیدہ "تضحیک روزگار" تصنیف کیا ہے۔ خاقانی کے شہرۂ آفاق قصیدہ جس کا قافیہ پیشانی اور طولانی ہے پر بھی انھوں نے ایک قصیدہ حضرت رسول کریم صلعم کی مدح میں لکھا ہے جسے یوں شروع کرتے ہیں ؎

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے تسبیح زنار سلیمانی

قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں کہ "سودا نے خاقانی و عرفی کو قصیدہ نگاری میں پس پشت ڈال دیا"۔ عرفی کے قصائد پر بھی انھوں نے قصیدے لکھے ہیں اور ایک موقع پر گریز انہیں کے مصرعہ سے کیا ہے ؎

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

سودا نے جیسا کہ ہم بتا چکے "مشکل مگر دلاویز زمینیں" اختیار کیں، مگر انہیں نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ ایک قصیدہ کی زمین یہ ہے۔
میں نے درسخن کو دیا رنگ ڈھنگ سنگ

اگرچہ قصائد میں بہاریہ تمہید ایک عام چیز ہے۔ مگر سودا نے جدید تمہیدیں لکھی ہیں اور گریز میں بھی اسی مناسبت سے جدت لطف کر دکھایا ہے سودا نے قصائد میں واقعہ نگاری بھی کی ہے اور بعض قصائد سے معاشرتی

واخلاقی، اقتصادی وسیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے کیونکہ وہ حقیقت نگاری بھی خوب کرتے ہیں اس سے ان کی زمانہ شناس طبیعت کا بھی پتہ لگتا ہے —
ہندوستانیوں کی فوجی طاقت ونظام کا اندازہ اس قصیدہ سے بخوبی ہوسکتا ہے جسے وہ یوں شروع کرتے ہیں ؎

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار
دیکھا نہ جس کو ترک فلک نے بھی زینہار

اس میں انھوں نے حافظ رحمت خاں اور نواب اودھ کی جنگ المعروف بہ جنگ رہیلہ کا حال بیان کیا ہے اور سواروں اور پیدلوں کی حالت۔ فوجیوں کی وردی غرض ہر چیز کا ذکر کیا ہے۔
باوجود جدت طرازی کے سوداؔ نے بعض بہت سادہ صاف اور نیچرل شعر نکالے ہیں مثلاً ؎

"زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں کہ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ایشیائی شاعری کے تمام معائب یعنی مبالغہ، غلو اور اغراق وغیرہ سب سوداؔ کے قصائد میں موجود ہیں۔ کہیں کہیں ابتذال، فحاشی اور بے حیائی بھی پائی جاتی ہے"
سودا نے مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر مناقب اور نعتیہ قصائد تحریر کئے اور درباداری اور مصاحبت پیشگی کی بنا پر انھوں نے امیروں، نوابوں اور اپنے سرپرستوں کی شان میں قصیدے کہے۔ اور چونکہ طبیعت میں ظرافت کا مادّہ تھا اس لئے ہجویں کہیں۔ اصلاً ہجو میں آ کر سودا کا رنگ کھلتا ہے۔ سودا کے یہاں ایک جدّت اور بھی ہے جو ما بعد کے کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ انھوں نے اپنے قصائد کے نام بھی رکھے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں

کر تو سوداؔ اب قصیدہ کو دعائیہ پر ختم
گو خطاب اس کو دیا ہے تو نے "بحرِ بیکراں"

اپنے مشہور قصیدہ "اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل" کا نام "باب الجنّت" رکھا ہے۔ اسی طرح "رزمیہ بہار"۔ "دو پیکر" اور "تضحیک روزگار" دوسرے نام ہیں۔
سوداؔ کے اکثر قصائد کے مطلع نہایت شگفتہ اور بلند ہیں کیونکہ ان میں خیال کی ندرت۔ بیان کی جدت اور زبان کی شگفتگی اور برجستگی موجود ہے۔

مثلاً ؎ اُٹھ گیا بہمن ودہ کا چمنستاں سے عمل،
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل،

اور مطلع ملاحظہ ہوں ؎

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرہ عام
حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

〰〰〰〰〰

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہر عرضِ حال
دیں سو زبانیں دہن میں ولیکن سبھی ہیں لال

〰〰〰〰〰

سوداؔ پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام
لائی گھر اس طبیب کے ہے جس کا عقل نام

سوداؔ کے یہاں بعض تشبیبوں میں حکیمانہ خیالات اور اخلاقی صداقتوں کا بھی اظہار کیا ہے۔ "سودا کی بہاریہ تشبیب" میں موسم بہار کے فطری اثرات وکیفیات تو کم ہیں لیکن خیالی تصویریں بڑی ہنرمندی سے کھینچی ہیں اور اس میں تشبیہ، استعارہ اور اغراق کا رنگ بھر دیا ہے۔" شیخ چاندکی اوپر بیان کی ہوئی رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ بعض تشابیب میں رندانہ اور عاشقانہ مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ بعض میں غزلیں بھی شامل کردی ہیں۔ بعض تشابیب میں خوشی، عقل، حرص وغیرہ کو مجسم رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔
تشبیب قصیدہ کے کمال کی کسوٹی ہے۔ سودا نے اس میں خارجی اور داخلی شاعری دونوں سے کام لیا ہے اور لفظی بیانی اور عروضی مہارت کا کمال دکھایا ہے۔ اگرچہ بعض جگہ مبالغہ کا رنگ واقعیت پر غالب آجاتا ہے لیکن پھر بھی ہم خیال ومضمون اور زبان وبیان کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تشبیب میں سودا کو خاص کمال حاصل تھا اردو کے ایک قابل پروفیسر کی رائے ہے کہ "ان کا سارا زور تشبیب ہی میں ختم ہو جاتا ہے"۔
گریز قصیدہ کا ایک مشکل ترین مقام ہے مگر سوداؔ گریز کے گُر سے خوب واقف تھے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں حرص کی ترغیبات کا ذکر کیا ہے اور پھر گریز یوں کرتے ہیں ؎

القصہ گزری تھی مجھے شب اس خیال میں

ناگاہ پیرِ عقل نے آ اس مکاں تلک

مارا ہے ایک ایسا طمانچہ کہ تا ہنوز

پہنچے ہے رنگ چہرہ گلِ ارغواں تلک

کہنے لگا وہ مجھ سے کہ سودا ہزار حیف

اغّاہ میں نے تجھکو نہ سمجھا تھا یاں تلک

قصیدہ "بابِ الجنت" کا گریز اس سے بھی زیادہ قابلِ ستائش ہے پہلے بہاریہ اشعار ہیں پھر اپنی شیریں بیانی کا ذکر کیا ہے اور اس کا سبب حضرت علی کی مدح بتایا ہے اور یہیں گریز کرتے ہیں ؎

ہے مجھے فیضِ سخن اس کے ہی مدّاحی سے

ذات پر جس کی مبرہن کُنہِ عزّ وجل

مدح میں جیسا کہ ہونا چاہئیے اصل واقعات نہیں ہیں بلکہ مبالغہ اور افتراپردازی بہت ہے۔ مگر یہ صرف امراء کے قصائد میں ہے۔ مناقب میں اس کا ذکر نہیں کیونکہ ان کی تعریف و توصیف تو ہر شخص کی قوتِ گویائی سے بلند و بالا ہے۔ لیکن ہمیں یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ اردو شاعری اور خصوصًا ہمارے اُردو قصائد کی جان مبالغہ ہے۔ وہ مدح سپاٹ اور بے نمک خیال کی جاتی ہے جس میں مبالغہ نہ ہو۔ لیکن سودا بعض جگہ بغیر کسی اصول کے بھی مبالغہ کر جاتے ہیں مثلًا حضرت علی کے عدل و انصاف کی مدح میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ہیبتِ عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر

واسطے دردِ سرِ آہو کے گھسے ہے صندل

اس قسم کی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں۔ سودا نے مدح کے بعد حسنِ طلب بھی رکھی ہے۔ اگرچہ وہ نہایت موثر اور خود دارانہ الفاظ میں ہے لیکن پھر بھی ہماری رائے میں قصیدہ میں اس کا لانا ہی غلطی ہے اور یہ سودا کے قصائد پر ایک بدنما دھبہ ہے۔

سودا نے قصیدہ کے مقطع یعنی حسن الخاتمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے کہ قصیدہ کی آغاز کے شان کے آثار باقی رہیں اور سامع مطمئن ہو جائے بعض بعض جگہ سودا نے دعائیہ اشعار کی تعداد کو کافی طولانی کر دیا ہے۔ مگر جہاں اختصار سے کام لیا ہے حق ادا کر دیا ہے ؎

سودا کرے ہے ختم دُعائیہ پر سخن ؛ اس جا نہیں ہے طولِ سخن مقتضائے داب

اس تخت پر بہ مسندِ اقبال بیٹھ کر کرتا رہے تو شادئی اندوہ لے جاب

سودا کے قصائد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قصیدہ نگاری میں غیر معمولی قدرت و مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے قصیدہ میں متنوع مضامین اور موضوعات کو داخل کیا اور داخلی و خارجی شاعری کا کمال دکھلایا ہے۔ حکیمانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کو مسائل کو بڑے موثر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ان کے قصائد میں لفظی، نحوی، بیانی اور عروضی خوبیاں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ یہ چیز ہمارے قدیم معیار پر پوری اُترتی ہے۔ شیخ چاند کی رائے ہے کہ اس کے قصائد کا جواب ہماری زبان میں موجود نہیں اور اب چونکہ زمانے کا مذاق بالکل بدل چکا ہے اور قصیدہ کی جگہ قومی نظموں نے لے لی ہے اس لئے ممکن نہیں کہ اس کا جواب آئندہ بھی پیدا ہو۔

سودا کو انگریزی کے مشہور شاعر ڈرائیڈن Dryden سے تشبیہ دے سکتے ہیں کیونکہ سودا اپنے ماحول کی عکاسی Dryden کی طرح کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سودا اور میر کی سرحد الگ الگ ہو جاتی ہے کیونکہ میر اپنے زمانے کی عکاسی بالکل نہیں کرتے۔ یہاں ہم سودا کو بہت بلند پاتے ہیں اور ہمیں پروفیسر آزاد کا قول یاد آتا ہے کہ گویا مدح اور قدح کے دو پیالے قدرت نے میر کے دسترخوان سے اُٹھا کر سودا کے یہاں رکھ دیئے ہیں۔

اردو قصائد میں سودا کے بعد ذوق کا نمبر آتا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی نے خاص طور پر قصیدہ کی طرف توجہ بھی نہیں کی متاخرین میں غالب کے یہاں جدید رنگ کی جھلک میں چند قصائد ملتے ہیں۔ مگر ذوق مستقل قصیدہ گو شاعر تھے۔ ان کا پایہ بھی اردو شعراء میں کافی بلند ہے لیکن پیشتر اس کے کہ ان کا اور سودا کا قصائد میں تقابل کیا جائے ان کے قصائد پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذوق کے قصائد پر آزاد کی رائے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی علاوہ اس کے اور کوئی مستقل کتاب ان پر موجود نہیں ہے صرف جگہ جگہ سودا کے سلسلہ میں ان کا ذکر ضمنًا آگیا ہے۔

ذوق نے سودا کی طرح مشکل زمینیں تو اختیار نہیں کیں سوائے چند ایک کے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک قصیدہ کو یوں شروع کرتے ہیں ؎

ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے تماشا گوہر
اک گہر دیکھو تو کتنے ہی ہوں پیدا گوہر

قدما، کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو جب نیند سے آنکھیں بند ہونے لگتیں تو ایک پری پیکر ممدوح کے جشن کا مژدہ سناتی، ور قصیدے کی تحریک کرتی۔ سوائے ذوق کے متاخرین میں سے کسی نے اسے نہیں نباہا۔ وہ بھی صرف ایک قصیدہ میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

ایک خورشید لقا طرفہ جوان ار شق ؛
تاب رخسار فلق سرخی رخسار فلق

ذوق نے بجائے محاکات کے تخیلی رنگ کو زیادہ اہمیت دیا ہے۔
ذوق نے سودا کے تتبع میں اکثر جگہ حکیمانہ اور اخلاقی مسائل کو قصیدے کی تشابیب میں داخل کر دیا ہے۔ مثلاً ولیعہد کے غسل صحت پر جو قصیدہ لکھا ہے اس میں تلازمہ طب و حکمت کے لائے ہیں۔ شروع اس طرح کرتے ہیں ؎

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج ہوا
پھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دار الشفا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل افتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہیں سب سے جدا

ذوق کی شخصیت اور ذہنیت سودا کی طرح ہمہ گیر نہیں ہے۔ سودا کے یہاں رئیسوں اور امیروں کی شان میں کم قصائد ہیں۔ ذوق کے قصائد زیادہ تر بادشاہوں کی مدح میں ہیں ان کے قصائد میں صرف ایک پہلو ملتا ہے۔ وہ اپنے ماحول اور عہد کی عکاسی بالکل نہیں کرتے۔ گو وہ بڑے شاعر تھے مگر صرف اپنے وقت کے شاعر تھے۔ اپنے زمانے سے آگے نہ بڑھے۔ ہاں ایک قصیدہ "زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر" البتہ اپنے رنگ میں یکتا ہے ویسے ان کے قصائد کی زبان اعلیٰ اور بیان رنگیں ہے۔ لیکن ٹھوس چیزیں ان کے یہاں قریب قریب بالکل مفقود ہیں۔
ذوق کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے قصائد میں سودا کا تتبع کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی حیثیت ایک کامیاب مقلد سے زیادہ نہیں اور وہ بھی صرف طرز میں تقلید کر سکے ہیں ورنہ خیال اور ماحول کی عکاسی میں سودا ان سے کہیں آگے ہیں اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "سودا مدح اور قدح کا بادشاہ ہے ذوق کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں" مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذوق کے قصائد ان کی قادر الکلامی۔ اعلیٰ تخیل۔ بلند پروازی اور روانی کلام کی داد لئے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان شاعری کے ایک درخشندہ ستارے خیال کئے جاتے ہیں ۔

دل میں غم عمر جانستاں آ گئی
اور دیدۂ تر نعرہ زنی پہ آ گئی
وہ جب کہ تھا لے اشتر ونی کے رہا
یعنی بچپن گیا جوانی آ گئی
اختر سہری

سحرِ حلال

از جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید سہارنپوری

عشق نے سر میں مرے وحشت کا ساماں رکھدیا
چار دیوارِ عناصر میں بیاباں رکھدیا

چشمِ تر پر غیر کی جب اُس نے داماں رکھدیا
پُرزے پُرزے کرکے ہم نے بھی گریباں رکھدیا

گو جگر کی داستاں خونیں تھی، پیکاں نے ترے
اس فسانہ میں بنا ٹکڑا مری جاں رکھدیا

بڑھ گئی دل کی کسک سے میرے پاؤں کی کسک
آبلوں میں تو نے کیا خارِ مغیلاں رکھدیا

شوخیٔ افسانۂ حُسنِ دہن کھلنے لگی
جب لبِ لعلیں نے اک رنگیں سا عنواں رکھدیا

طور کی برقِ طپاں دل سے لپٹ کر رہ گئی
نام جس کا سوزِ اُلفت نے رگِ جاں رکھدیا

محویتِ دیدار کی اُلجھا ہوا اندازِ فکر
زُلف نے آنکھوں میں اک خوابِ پریشاں رکھدیا

کس نے میرے آشیاں کے چار تنکوں کیلئے
برق کی زد میں گلستاں کا گلستاں رکھدیا

ان قفس کی تیلیوں پر رکھ کے مُنہ دم توڑ دوں
جن کا رُخ صیاد نے سوئے گلستاں رکھدیا

ہوں وہ خس پارہ سرِ موجِ طلسمِ زندگی
جس کے پہلو میں سُبکساری نے طوفاں رکھدیا

قامتِ خم گشتہ ہے وہ شکلِ آغوشِ حیات
کھینچکر جس سے الگ ہستی کا ساماں رکھدیا

مطلعِ چاکِ گریباں روشن اے خورشید ہے
اس اُفق میں آفتابِ داغِ ہجراں رکھدیا

رقابت کا کرشمہ

بیحد دلچسپ حیرت انگیز کہانی

از جناب میرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مرادآبادی

میں دہلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا۔ بشیر عربک کالج کا میرا پرانا ہم جماعت عجیب حالت میں مجھ سے ملا۔ اس نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا لیکن مجھے اس کے پہچاننے میں کافی دیر لگی۔ اس نے مجھے اپنا نام بتا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سرد مہری اور اجنبیت کے رنگ میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور کہا۔

"معاف کیجئے، میں نے آپ کو قطعی نہیں پہچانا"

"جی ہاں! کیوں پہچاننے لگے۔ چودھویں صدی کے دوست ہو نا؟" اس نے کچھ طنزاً اور کچھ بے تکلفی کے رنگ میں کہا۔

"کچھ اتا پتہ دیجئے تو پتہ لگے۔ میرے حلقۂ احباب میں بہت سے آپ کے ہم نام ہیں۔" میں نے اس کو پہچاننے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ میں اس کو پہچان نہ سکا۔

"بہت بہتر، پتہ تو یہ ہے کہ دہلی میں جب آپ "نسٹ ایر فول" تھے آپ کے حلقۂ احباب کی پہلی کڑی جو بشیر تھا وہ بندہ ہی تھا۔ عربک کالج کے طلبہ میں آپ کے حافظہ کی جو شہرت تھی کیا یہ اس کا ردعمل ہے؟ اچھا آداب عرض ہے تضیع اوقات کے لئے عفو خواہ ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر چلنے لگا۔ عربک کالج میں داخلے کا پہلا سال اور سب سے پہلے دوست بشیر زیدی کی محبت۔ سب باتیں چشم زدن میں مجھے یاد آگئیں اور میں نے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھائی بشیر! لو میں پہچان گیا۔ اس میں میرا کیا قصور، یہ تم نے اپنا حلیہ کیسا بنایا ہے؟ میں تو میں اس شکل میں تو تمہارے کراماً کاتبین بھی تم کو نہ پہچان سکیں۔ آؤ چار کا وقت ہے ہوٹل میں بیٹھکر باتیں ہونگی۔"

بشیر نے ایک خشک ہنسی کے ساتھ میری دعوت پر لبیک کہا۔ اور دونوں ایک قریب کے ہوٹل میں میز کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس وقت میں نے بشیر کو گہری نظر سے دیکھا۔ اس کا حلیہ یہ تھا کہ سارا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ڈاڑھی کو ہفتوں سے استرے کی خدمت میسر نہیں آئی تھی۔ سر ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سفید ہو گئے تھے آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ رخسارے پچک گئے تھے اور ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں میں وحشت یا نئی چمک تھی۔ اس کا لباس نہایت خراب اور نفرت انگیز حد تک میلا تھا۔ اس وقت میرے چشم تصور کے سامنے بشیر زیدی کی وہ تصویر آگئی جس میں دوہرا بدن، سفید و سرخ رنگ۔ بھرے بھرے رخسار رسیلی آنکھیں۔ ڈاڑھی اور مونچھ کا ملاحت ریز صفایا۔ دہلی کے بہترین درزی کے ہاتھ کی سلی ہوئی شیروانی۔ چست سفید پاجامہ۔ باٹا کے کارخانہ کا نازک بوٹ پہنے بشیر کالج کا زندہ دل نوجوان تھا۔ یا اس وقت دق کا مارا اور دلق پوش بھکاری میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کالج کی زندگی میں بشیر خوش پوشاک۔ مذاق اور ذہانت کے لحاظ سے غیر معمولی ذوق کا نوجوان تھا۔ اس کا کمرہ آرائش و زیبائش کے لحاظ سے اچھی خاصی "آرٹ گیلری" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے لباس کی تراش اور موزونیت اس قدر حرص انگیز ہوتی تھی کہ تمام نفاست پسند طالب علم۔ اس کے فیشن کا اتباع کیا کرتے تھے۔ کالج کی ہر سرگرمی میں وہ سب سے پیش پیش تھا۔ کھیل کے میدان۔ مباحثہ کی مجلس۔ مشاعرہ کی محفل اور جماعت کے اندر وہ قابل

رنگ اور نمایاں حیثیت میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ ذوق شعر کے متعلق اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اس میدان میں اپنی انفرادیت کی علویت کو قائم رکھنے کے قابل نہیں لیکن ایک عظیم الشان مشاعرہ میں جبکہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ فن موجود رہتے ہیں۔ اس نے طرحی زمین میں اپنی غزل کا جب یہ مطلع پڑھا ؎

جہاں تک بھی وادیٔ غم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی نقش قدم دیکھتے ہیں

تو کہنہ مشق استاد بھی اس کی بلندیٔ فکر اور فصاحت و بلاغت کا لوہا مان گئے تھے اور سارے مشاعرے میں اس کا یہ مطلع حاصل مشاعرہ رہا تھا اور تمام شہر میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

غرض بشیر کی تیزیٔ طراری، شعلہ مزاجی اور سیماب وشی ایسی چیزیں نہ تھیں جن کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ناممکن ہو کہ وہ مستقبل میں ہندوستان کا مایہ ناز فرزند بننے والا ہے لیکن اس کو قدرت کی ستم ظریفی کہا جا سکتا ہے کہ بشیر بی۔اے کے امتحان میں ناکام رہا اور کالج کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر گمنام ہو گیا۔ میں اور وہ گہرے تعلقات محبت و خلوص کی وجہ سے کالج کی زندگی میں "ایک جان اور دو قالب" کی ضرب المثل کا پورا مصداق تھے لیکن اس سنہری خوابوں کے زمانہ کے اختتام پر ایک دوسرے سے قطعی بے خبر ہو گئے۔ مجھے عمل کی دنیا میں اس قدر ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں کہ اگرچہ میری ظاہری شکل و صورت میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن ذہنیت کے لحاظ سے مجھ پر زبردست "دنیا نوسیت" طاری ہو گئی تھی۔ خواب و رومان کی زندگی کے بعد درشت حقیقت اور سنگلاخ عمل نے مجھے پکا غیر شاعر بنا دیا تھا۔ یا میری یہ حالت تھی کہ دنیا ایک تماشا تھی۔ ہر طرف رنگینیاں شعریت، رومان ہی رومان نظر آیا کرتے تھے اور میں اکثر اوقات یہ حقیقت طرازانہ شعر گنگنایا کرتا تھا ؎

وہاں سے دیکھ کہ دنیا کی کیا حقیقت ہے
جہاں سے منظر ہستی کو دیکھتا ہوں میں

یا اس زندگی کو سات سال گزرنے کے بعد یہ حالت تھی کہ جگر کا یہ شعر ورد زبان تھا ؎

نظر سے حسن دو عالم گرا دیا تو نے
نہ جانے کون سا جلوہ دکھا دیا تو نے

اور "تو نے" کا مرجع و مخاطب "دنیا اور اس کی عملی خشونت" تھی۔ غرض ہم دونوں دوست سات سال کے بعد اس طرح ایک دوسرے سے ملے۔

"بھائی زیدی! تقریباً سات سال میں ہم پھر ملے ہیں"۔ میں نے طلسم سکوت کو توڑنے کیلئے کہا۔

"سات سے کچھ زیادہ ہی سمجھو"۔ بشیر نے اندوہناک لہجہ میں کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد پھر کہنے لگا۔

"دیکھئے تو مجھے ایک ضرورت کی وجہ سے اپنے کسی پرانے دوست سے ملاقات کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے آپ نظر آگئے۔ مجھے دس روپے چاہئیں اور وہ بھی قرض حسنہ!"

میں نے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا "اور کوئی کار خدمت۔ کیا بیکاری اور مفلسی کا شکار ہو۔ بتاؤ تو آخر معاملہ کیا ہے؟"

"میں تمہیں اچھا خاصا بوڑھا اور فاقہ مست نظر آرہا ہوں نا؟" بشیر نے چائے کی پیالی کو منہ سے ذرا ہٹا کر مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں! یہ کیا بات ہے؟ تم بیمار تو نہیں رہے؟"

"بیمار؟ نہیں، کبھی نہیں"۔ بشیر نے پیالی کو پتھر کی میز پر لرزتے ہوئے ہاتھ سے رکھ کر کہا۔ "اور تم نے میرے سفید بالوں کو بھی دیکھا۔ میں تو سچ مچ بوڑھا ہو گیا ہوں اور تم یقین کرنا کہ اب سے ایک ماہ قبل میرے سر اور ڈاڑھی میں ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں افسانہ نگاری کا شوق ہے میری سرگذشت کو اگر افسانہ میں تبدیل کر سکو تو بہترین افسانہ نگاروں کی صف میں داخل ہو جاؤگے۔ اور دس روپے کا نوٹ خرچ کر کے اس قدر سستے داموں شہرت خرید لینا خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے"۔

بشیر نے اپنی سابقہ زندہ دلی اور بذلہ سنجی کا منہ چڑھاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کئے اور چائے کی پیالی پھر منہ کو لگالی۔ میں مسکراتا رہا اور دل ہی دل میں اس کی سرگزشت سننے کے لئے بیتابی سی محسوس کرتا رہا۔ آخر کار اس نے سگریٹ جلایا اور اپنی کہانی یوں شروع کیا۔

"تقریباً ڈیڑھ مہینہ ہوا کہ میں اپنی چچا زاد بہن کے گھر مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر تھا۔ مجھے اپنی اس بنت العم سے کسی قسم کی روایتی

روحانی دلچسپی نہ تھی بلکہ میں بیکاری اور فاقہ مستی سے تنگ آکر اس کے گھر چند روز کے لئے گوشۂ عافیت کی تلاش میں جا نکلا تھا۔ تم جانتے ہو مفلسی ایک انسان کے تمام جذبات شریف اور احساسات نازک کو پامال کرکے بے حیا بنا دیتی ہے اور ہندوستانی معاشرت کے اس اصول کو کہ ایک بھائی کو بہن کے گھر کتا بن کر رہنا پڑتا ہے' یکسر فراموش کر دیا کرتی ہے۔ میری بہن کی عمر مجھ سے دس سال زیادہ ہے اور میں اس لحاظ سے اس کا چھوٹا بھائی سمجھا جا سکتا ہوں۔ ایک حد تک میں وہاں آرام سے وقت گزار رہا تھا۔ دس سال کا عرصہ ہوا کہ دولت خاں نامی ایک زمیندار سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ دولت خاں ایک بڑے رقبہ آراضی کا مالک اور خوش حال زمیندار ہے اور شہر کی زندگی سے الگ تھلگ اپنی زمینداری میں رہا کرتا ہے۔ میری اس بہن کی شادی کے موقعہ پر خاندان میں جھگڑا پڑ گیا تھا اور جو لوگ مخالف تھے وہ دولت خاں کو نیچ ذات کا آدمی کہتے تھے۔ اور اس رشتے کو اپنی ذات برادری کے لئے توہین خیال کرتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ برادری میں کوئی کھاتا پیتا اور لائق لڑکا نہ تھا۔ اس لئے میرے چچا نے سب کی مخالفت سے بے پروا ہو کر دولت خاں کی دولت کو اس کی ذات پات کی نیچائی پر ترجیح دی۔ موجودہ زمانہ میں ہڈی اور خون کی شرافت کو کوئی لیکر کیا کرے؟ جہاں روٹی کپڑا اور چار پیسے ملیں وہی گھر سب سے بڑا شریف ہے۔ علاوہ ازیں رشتہ داروں کا کچھ طریقہ ہی یہ ہو گیا ہے کہ برادری کے ہر معاملے میں جھگڑا ڈالا کرتے ہیں اور کوئی شادی ایسی نہیں ہوتی جس میں چند رشتہ دار ہمیشہ کے لئے ناراض نہ ہو جائیں اس لئے اگر کوئی باپ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے ساری برادری کی رضامندی اور خوشنودی کا انتظار کرتا رہے تو غریب لڑکی کا گھر بیٹھے بیٹھے سر سفید ہو جائے اور اس جرم عظیم کو بر میسر نہ آئے۔ چچی صاحبہ پرانے خیال کی اور رسم و رواج کی سخت پابند تھیں۔ انھوں نے بھی اس موقعہ پر سخت مخالفت کی لیکن چچا نے ان کی بھی پیش نہ جانے دی اور آخر کار زہرہ میری چچا زاد بہن کی شادی دولت خاں سے ہو گئی۔

جس زمانہ میں یہ شادی ہوئی ہے۔ میں وطن سے بہت دور ایک حسین رومان کی تخلیق کے لئے منصوری پہاڑ کی نزہت پاشیوں کے پس منظر میں مصروف عمل تھا اس لئے عرصہ کے بعد جب میں وطن واپس آیا تو گھر والوں سے مجھے زہرہ اور دولت خاں کی شادی کے سارے واقعات معلوم ہوئے تھے۔

غرض جب میں زہرہ کے گھر گیا اور میری ملاقات دولت خاں سے کرائی گئی تو میں نے اس کو اعلیٰ تربیت اور شائستگی کا نمونہ پایا۔ دیہاتی زندگی میں اس کے گھر کی ستھری اور مہذب معاشرت میرے لئے حیرت انگیز تھی۔ بحیثیت مجموعی دولت خاں بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوا۔ اور میں اس سے مل کر اس کی خاندانی کمتری کو بھول گیا۔ لیکن ایک چیز تھی جو مجھے عجیب اور ایک حد تک کروہ معلوم ہوئی اور وہ دولت خاں کی صورت تھی۔ میں نے ساری زندگی میں اس چہرہ مہرہ کا آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر مجھے فوراً خیال آیا کہ زہرہ بیچاری اگرچہ خود حسین نہیں لیکن چچا نے اس کو اس انسان کے ساتھ وابستہ کرکے ظلم ہی کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ زہرہ کا مذاق حسن نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا اور بچپن میں باوجود عمر میں مجھ سے بڑی ہونے کے وہ مجھ پر محبت کی نظریں ڈالنے سے بھی اپنے کو باز نہ رکھ سکتی تھی۔ دولت خاں کا حلیہ یہ تھا۔ ٹھنگنا قد، بڑا سا پیٹ۔ لمبا چہرہ اور اس قدر لمبا کہ آدمی کے جسم پر گھوڑے کا سر لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی، اور ان کے بیچ میں نہایت موٹی ناک کا ابھرا ہوا بانسہ کروہ منظر پیش کرتا تھا۔ ناک کے نتھنے غیر معمولی طور پر بڑے اور چرے ہوئے تھے اور اس کی ناک چوپایہ کی ناک معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹ لمبے اور حبشی کے ہونٹوں کی طرح کالے تھے۔ آگے کے دانت چوڑے اور اس قدر بڑے تھے کہ ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے کان اس لمبے چہرے پر گھوڑے کی کنوتیوں کی طرح کھڑے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میرے دل میں جس قسم کے احساسات پیدا ہوئے تھے اگر میں ان کو بیان کروں تو انھیں مبالغہ سمجھا جائے گا۔ قصہ مختصر میں نے زہرہ کو چھیڑنے کے لئے دولت خاں سے پہلی ملاقات کے بعد جو کہا وہ یہ تھا۔

"زہرہ بہن! اگر میں دولت خاں کو "گھوڑے خاں" کہوں تو تم خفا تو نہ ہوگی"۔

زہرہ مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر چپ ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اس کو میری اس بات سے کچھ رنج ہوا ہو۔ اس کی خموشی بھی معنی خیز ضرور تھی

اس کے بعد میں نے دولت خاں کی صورت کے متعلق کبھی کوئی رائے زنی نہیں کی۔ یہ حقیقت ہے کہ دولت خاں کے مہذب اور شائستہ طرز عمل نے مجھے اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ مطالعہ کا بیحد شوقین تھا اردو علم و ادب پر ناقدانہ گفتگو کرتا تھا۔ مغربی سیاسیات پر اس کی رائے نہایت صائب ہوتی تھی۔ گفتگو میں وہ بحث کو ناپسند کرتا تھا۔ کسی مسئلہ پر اگر اختلاف رائے بھی کرتا تھا تو طالب علمانہ رنگ میں، جو کسی کو ناگوار نہ ہو سکتی تھی۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت بار بار شاید خوشامد یا تملق کے لئے اپنی دیہاتی زندگی کے غیر مہذب فضا پر معافی مانگتا جاتا تھا اور مجھے اعلیٰ درجہ کا شہری اور تمدن و تہذیب کا پتلا جتایا کرتا تھا۔ دولت خاں نے کم از کم میرے سامنے کبھی امیرانہ فخر و غرور کا اظہار نہیں کیا اور اس کے برخلاف میری خاطر تواضع میں لگا رہتا تھا۔ میں اس کو اس کی سادگی اور معصومیت پر محمول کر کے اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مگر وہ جب ہنستا تھا تو اس کے گھوڑے کے سے دانت مجھے خواہ مخواہ نفرت دلانے لگتے۔ اس کی باطنی خوبیوں پر، اس کی ہیئت کذائی پر مجھے بار بار افسوس ہوتا تھا۔ کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہ تھی کہ ایسے اچھے دل و دماغ کو اس قدر بدقوارہ جسم عطا کیا گیا تھا۔

دولت خاں کا گاؤں منصور پور میرے لئے چند وجوہات سے دلکش تھا۔ مناظر قدرت جن کا میں ہمیشہ سے شیدائی ہوں یہاں کافی موجود تھے۔ صبح و شام کے رنگین منظر۔ شب کا سکوت ہنگامہ پرور۔ دن کا ہنگامہ سکوت و سکون آفریں میرے تھکے دل و دماغ اور ذوق فطرت پرستی کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھے۔

دولت خاں کا دیہاتی طرز کا کچھ پکا اور کچھ کچا مکان نہایت آرام دہ اور زندگی کی ہر ضرورت کے لئے کافی تھا۔ تہذیب جدید کے مطابق اس کی آرائش و زیبائش کی گئی تھی اور زہرہ کے ذوق حسن پرستی اور گھر گرستی کے نمونے ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ مکان تک پہنچنے کے لئے شاہراہ سے ایک پیچدار پکی سڑک کٹ کر جاتی تھی جس کے دونوں طرف سایہ دار درخت اور خوبصورت پھولوں کی قدرتی خود رو بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اس مکان کے آس پاس کاشتکاروں کے سو دو سو کچے مکانات تھے۔

یہ گاؤں ایک بلند سطح زمین پر تھا اس کے چاروں طرف ڈھلان تھا اور دور دور تک سبزہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ مکان کے بالائی حصّے میں ایک کشادہ صاف کمرہ مجھے دے دیا گیا تھا اس کی کھڑکیوں میں سے لہلہاتے کھیت اور چراگاہوں کا زمرّدیں منظر ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا تھا۔ میدانی علاقہ میں رہتے ہوئے مجھے پہاڑی زندگی کا سا لطف آ رہا تھا۔ فرصت اور تنہائی کے لمحات میں میرے تخیل کا پرندہ اس کھلی فضا میں دنیا کے آخری کناروں تک چکر کاٹتا رہتا تھا۔ بعض اوقات جب نیلگوں آسمان پر بھورے اور سفید سحاب پارے آوارہ ہوتے تھے تو میں ان کے تماشے میں جذب ہو کر خواب و خیال کی دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن موسم گرما میں ایسے پرسکون اور خوبصورت دن بہت کم تھے۔ اکثر آندھیاں آتی رہتی تھیں اور سارا لطف کِرکِرا کر دیتی تھیں۔

میرے ایک ہفتہ کے دوران قیام میں دو ایک آندھیاں اس قدر سخت آئیں کہ میں گھبرا گیا اور خوفزدہ ہو گیا۔ میری اس بدمزگی کو دیکھ کر زہرہ مسکرا دیتی تھی اور نہایت فلسفیانہ رنگ میں کہتی۔

"زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے اس میں آندھیوں کے جھکڑ اور ساون کی جھڑیاں بھی ہیں۔"

میں زہرہ سے کہتا۔ "تم شادی کے بعد بڑی عقلمند ہو گئی ہو۔ لیکن میں تو تمہارے گھر پھولوں کی سیج کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"یہ سچ ہے لیکن پھولوں کے ساتھ کانٹے ہر جگہ موجود ہیں۔ میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہارے لئے جو سیج تیار کروں اس کے کانٹے چن کر پھینک دوں اور ان کو اپنی انگلیوں کا خون چکھا دوں۔"

زہرہ کی گفتگو اکثر اسی قسم کی ذومعنی ہوتی تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی خوشحال زندگی کے اندر کوئی تکدر اور خلش ضرور موجود ہے اس قلیل عرصہ قیام میں زہرہ کے طرز اور محتاط گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں اس گھٹی گھٹی سی فضا کے گھر میں زیادہ دن نہیں گزار سکوں گا۔ ان میاں بیوی میں بظاہر بڑا اخلاص اور یگانگت معلوم ہوتی تھی لیکن زہرہ کی ہر وقت کی خموشی اور اس کی آنکھوں کی وحشت سے خیال ہوتا تھا کہ دولت خاں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ ایک خوفزدہ پرندے کی طرح اس گھر کے قفس میں قید ہے۔ زہرہ اپنی عمر کے لحاظ سے اچھی خاصی شکل و صورت رکھتی تھی اس کا نکلتا ہوا قد۔ سیاہ اور لمبے بال، درمیانہ آنکھیں دلکشی سے خالی نہ تھیں۔ زہرہ کے ساتھ جس قدر وقت گزرتا تھا وہ اس گھر کی مکدر اور ایک حد تک وحشت انگیز فضا میں دلچسپی سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اس کی موجودگی سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دل کا اضمحلال اور گھر کا بھیانک پن دور ہو گیا ہے اور زہرہ کی آنکھوں کی وحشت بھی اس وقت کچھ کم معلوم ہونے لگتی تھی۔

وہ دولت خاں کی موجودگی میں گھر کے کام کاج میں مصروف رہا کرتی تھی اور جب وہ کاشتکاروں سے بات چیت کرنے یا زمینداری کے معاملات کو طے کرنے کے لئے باہر جاتا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ چند روز تک میں اس کے عزیز مہمان کی طرح اس کے گاؤں کے ہر کاشتکار سے تعارف حاصل کرتا رہا۔ لیکن روز روز کی اس کارروائی سے تنگ آ کر میں نے دولت خاں سے اس کے ساتھ ہر جگہ پھرنے کی معافی چاہی جس پر وہ کہنے لگا۔

"گھر میں پڑے پڑے تنگ آ جاؤ گے اور مجھے ڈر ہے کہ تم شہر بھاگ جاؤ گے۔ میں تم کو اس لئے اپنے ساتھ رکھتا ہوں کہ کچھ مشغلہ میں تمہارا بھی دل لگے۔ اور مجھے تمہارے ساتھ رہنے سے ایک سہارا سا رہتا ہے۔ رہیں تمہاری ہمشیرہ صاحبہ تو وہ اچھی خاصی مولانا ہیں۔ نہ ہنسی نہ مذاق۔ وہ ہیں اور گھر کا کام ہے ان کو تو گھر سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بتاؤ گھر میں پڑ کر کیا کرو گے؟"

بات معقول تھی اور میں بھی طبعاً گھر گھُسنے پن سے متنفر تھا۔ اس لئے میں ہر جگہ سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا ایک روز دولت خاں کپڑے پہن کر دوسرے گاؤں کو تحصیلدار صاحب کی کچہری میں کسی مقدمہ کی پیروی کو جانے کیلئے تیار ہوا اور حسب معمول مجھے بھی ہمراہ لے جانے کے لئے جلد تیار ہو جانے کو کہا۔ اور خود گھوڑوں پر زین کسوانے کے لئے باہر گیا۔ زہرہ نے میرے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔

"مجھے تم سے ضروری کام ہے آج بہانہ کر دو اور اس کے ساتھ نہ جاؤ۔"

میں نے دردِ سر کا بہانہ کر دیا۔ دولت خاں مجھے چھوڑ تو گیا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے دل میں ناراض ہو گیا۔ مجھے اس کی تنگ نظری

پر غصہ بھی آیا کہ احمق آدمی مجھے اپنے گھر پر تنہا چھوڑنا عیب سمجھتا ہے شاید
اس کو اپنی بیوی کے متعلق اعتماد نہ تھا۔ بہر حال جب میدان صاف ہو گیا
زہرہ میرے پاس آئی اور کہا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات پوچھنا ہے۔ وعدہ کرو کہ ٹھیک ٹھیک
جواب دو گے!"

میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ اپنے شوہر سے متنفر بیوی کا، اپنے جوان عم
زاد بھائی سے اس طرح ملاقات اور گفتگو کا موقع نکالنا خطرہ سے خالی نہ
تھا۔ میں نے مجبور ہو کر وعدہ کر لیا۔

"مجھے کوئی مشکل سوال تو پوچھنا نہیں جو تم بوکھلا سے گئے۔" زہرہ نے
میری بدحواسی پر فقرہ کسا اور پھر کہنا شروع کیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم میرے اندر
کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہو یا نہیں؟ میری گفتگو اور میرا طرزِ عمل نرالا
تو نہیں ہے؟"

میں اس کے سوال کو سن کر ڈر سا گیا۔ واقعی زہرہ کے اندر ایک
خود فراموشی اور طور طریقوں میں عجب رنگ ڈھنگ تھا۔ اس کی حالت
کسی نوگرفتار محبت کی سی تھی۔ اس کے چہرے کی زردی، آنکھوں کی وحشت
اور سب سے کھنچا کھنچا سا رہنا ہزاروں خطرات کا موجب سمجھا جا سکتا تھا۔
لیکن میں نے اپنے ہوش کو سنبھال کر مسکرا کر کہا۔

"زہرہ! میں ذرا جذباتی اور کمزور دل انسان ہوں۔ مجھے تمہارے
اندر کوئی خاص تبدیلی اور عجیب بات نظر نہیں آتی۔ البتہ تمہارا یہ سوال
عجیب و غریب ضرور ہے۔"

میرے اس جواب سے اس کی تشفی نہ ہوئی اور اس نے پھر کہا۔

"اچھا کیا اس گھر کے رنگ ڈھنگ اور فضا میں بھی تمہیں غیر معمولی معلوم
نہیں ہوتی؟"

"نہیں مجھے تو کوئی غیر معمولی بات نظر آتی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ
تمہاری شادی ناکامیاب ہے اور تم کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں ہو۔ لیکن
دنیا بقول تمہارے پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ ہر شخص کی ساری آرزوئیں
پوری نہیں ہو سکتیں۔"

"اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" زہرہ نے فوراً سوال کیا اور
غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کیا تم اپنے شوہر کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہتی ہو؟ تو مجھے
اس روز کا مذاق معاف کرنا میں نے تو دل لگی سے اس کو "گھوڑا خاں" کہہ
دیا تھا!"

زہرہ نے ذرا چڑھ کر کہا۔ "اجی مذاق کو چھوڑو۔ مجھے اس کی سیرت
کے متعلق تمہاری رائے معلوم کرنا ہے سچ سچ بتاؤ ہماری گفتگو بالکل صیغہ
راز میں ہے۔"

"زہرہ! سچ تو یہ ہے کہ دولت خاں بڑا اچھا آدمی ہے۔ لیکن پھر
بھی مجھے اس سے گھن سی آتی ہے۔ مجھے اس کا گھوڑے کا سا چہرہ ایک آنکھ
نہیں بھاتا۔ مجھے تعجب ہے کہ چچا جان نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کیا دیکھ
کر کر دی اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ تم اب تک ایسے آدمی کے ساتھ
رہ کر زندہ کس طرح ہو؟"

زہرہ نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی باپ کی وکالت کرتے ہوئے کہا
"ابا جان، دولت کی سیرت اور خوشحالی پر ریجھ گئے۔ وہ صورت کو سیرت
پر ترجیح دینے کے حامی نہیں۔ یہ تو تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ اس کا دماغ اور تخیل
غیر معمولی خوبیوں اور بلندیوں کا حامل ہے اس کا چہرہ پہلے تو اس قدر
بدنما نہ تھا۔ اس روز تم نے اس کو گھوڑا خاں کہا تھا تو مجھے اس پر بڑی
ہنسی آئی تھی تم نے اس کی صحیح الفاظ میں مصوری کی تھی۔"

اس پر میں نے اس کی شاعرانہ داد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
"کیا تمہیں اس کی صورت اور گھوڑے کے منہ میں کچھ مشابہت نظر نہیں آتی؟"

"آتی کیوں نہیں؟ میں سوچتی تھی کہ دوسروں کو بھی آتی ہے یا
نہیں؟ جب شادی ہوئی اس وقت اس کا چہرہ ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے
میں جب بیاہ کر یہاں آئی تو مجھے پتہ چلا کہ اس کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے
اور اس کے اصطبل میں طرح طرح کے گھوڑے موجود ہیں۔ میں نے اس کے
دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کے لئے گھوڑوں سے دلچسپی لینا شروع کر دی
اور ہم دونوں رات دن گھوڑوں کی غور و پرداخت میں مصروف رہنے
لگے۔ شادی کے ایک سال بعد یکایک مجھے گھوڑوں سے نفرت ہو گئی اور
اس کا قصہ یہ ہوا کہ دولت خاں نے ایک نہایت خوبصورت سفید رنگ
کا گھوڑا خریدا۔ تم نے بجلی کو تو دیکھا ہو گا۔ یہ وہی منحوس گھوڑا ہے جس
نے میری پر مسرت زندگی کو خاک میں ملا دیا۔

وہ رات دن اس کی خدمت اور دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگا۔ دولت خاں میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں اس کی سیرت کا ایک ناگوار پہلو میرے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ وہ جس کام اور جس شوق کے پیچھے پڑتا ہے دیوانہ وار اسی کا ہو رہتا ہے۔ رات دن سفید گھوڑے کا خیال اس کے دماغ پر مسلط تھا اور وہ ہر وقت اس کے دانہ گھاس نہلانے دھلانے اور غور و پرداخت کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ نوکروں اور سائیسوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس اثنا میں ایک روز وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا اور سفید گھوڑا کھلے بندوں کوٹھی کے احاطے میں چرتا پھر رہا تھا۔ میں برآمدہ کے سامنے کرسی پر بیٹھی کشیدہ کر رہی تھی کہ کمبخت گھوڑا ادھر آنکلا۔ مجھے اس سے للہی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے میرے شوہر کی تمام توجہات کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا اور گویا اس طرح وہ میرا رقیب تھا۔ میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک نوکر کو آواز دیکر کہا۔ اس کم بخت سفید دیو کو میری نظروں سے دُور کر دو۔ پچھاڑی لگا کر اسے پچھواڑے باندھ دو مجھے ہر وقت اس کا گھومنا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔ نوکر اسے پکڑنے کو آگے بڑھا وہ بھاگا اور سارے حاطے میں اُدھم مچا دیا۔ بجلی کی اس شرارت پر مجھے طیش آگیا میں نے سارے نوکروں کو جمع کر لیا اور اسے پکڑ کر باندھنے کی دل میں ٹھان لی۔ لیکن بجلی کس کے ہاتھ آنے والا تھا۔ وہ سوائے دولت خاں کے کسی سے رام نہ ہوتا تھا۔ مجھے بھی کچھ ایسی ضد پڑ گئی تھی کہ بجلی کو پکڑنے اور اسے زک دینے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی اور اس کی خرمستیاں اور بھاگ دوڑ دیکھ کر خون کھولا جا رہا تھا کہ اس گڑبڑ میں وہ نوکروں اور سائیسوں پر دولتیاں چلا کر جو بھاگا تو سیدھا میری طرف آیا۔ میں بھاگ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی اور گر پڑی۔ خوف اور سر میں چوٹ لگنے سے میں بیہوش ہو گئی۔ رات کو مجھے ہوش آیا تو دولت خاں میرے پاس بیٹھا تھا۔

تمہیں تعجب ہوگا کہ اس نے اس حادثہ پر مجھ سے اظہار ہمدردی کے بجائے اُلٹی مجھے سرزنش کی اور کہا کہ میں آئندہ اس کے گھوڑوں کے معاملہ میں دخل نہ دیا کروں۔ اس واقعہ کے بعد سے مجھے بجلی اور اس کی ساری نوع سے ہی نفرت نہیں ہوئی بلکہ اپنے شوہر کی طرف سے بھی دل میں بل پڑ گیا۔ میں اس سے دل میں خفا رہنے لگی۔ اس نے بھی مجھ سے نہایت تکلیف دہ بے نیازی کا اظہار کیا میں غم غصہ اور وہ اپنے گھوڑے کے خبط میں مبتلا رہنے لگے۔ دولت خاں نے اب زیادہ تر اپنا وقت تنہائی اور مطالعہ میں گزارنا شروع کیا۔ اس دوران میں ایک ہندو فقیر گاؤں میں آنکلا اور چند روز کے بعد دولت خاں اور فقیر میں گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتے اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی وظیفہ یا عمل خوانی کے منصوبے باندھ رہے تھے دولت خاں دو وقت کھانا کھانے گھر میں آیا کرتا تھا لیکن ان دنوں میں وہ صرف رات کو کھانا کھاتا تھا اور اس کی غذا دودھ۔ ساگ پات یا دال تھی۔ مجھے اس کی زندگی کی یہ تبدیلی اور بھی ناگوار گزری۔ اس کی بے التفاتی بے نیازی کا پہلا سبب میرے نزدیک سفید گھوڑا تھا اور میں اس سے حسد کرنے لگی تھی اب یہ سادھو فقیر میرے اور دولت خاں کے درمیان حائل ہو گیا اور میرے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ایک روز رات کو جب فقیر اور دولت خاں بیٹھک میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے میں دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی اور ان کی گفتگو سنتی رہی۔ ساری گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے شوہر صاحب نے جو چلہ کھینچا تھا اور ترک حیوانات کی ریاضت مکمل کر لی تھی اس کے بعد وہ سادھو کے نظریہ کے مطابق اپنی روح کو اپنے سب سے پیارے انسان یا حیوان کے جسم میں منتقل کر سکتے تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ دولت خاں کو کسی انسان سے ایسی محبت نہ تھی کہ اس میں اور دولت خاں میں ایک جان اور دو قالب ہونے کا رشتہ ہو سکتا۔ لامحالہ سفید گھوڑا ان کے عمل انتقال روح کا معمول بن سکتا تھا۔

چنانچہ میری آنکھوں نے اس کے بعد جو تماشے دیکھے وہ میری جانفرسائی کے لئے کافی تھے۔ سفید گھوڑا چاندنی رات میں اصطبل میں سے کھلوا کر میدان میں چھوڑ دیا گیا۔ دولت خاں کرسی پر بیٹھ کر مراقبہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر نیند طاری ہو گئی اور اس کے خراٹوں سے ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی گھوڑا سانس لینے لگا ہو۔ اور دوسری طرف سفید گھوڑے نے سارے مکان میں انسان کی سی احتیاط اور عقل و فراست کے ساتھ چکر لگانا شروع کیا۔ ملاقات کے کمرہ سے نکل کر وہ مطالعہ کے کمرہ میں گیا وہاں اُس نے لکھنے کی میز پر منہ رکھا۔ کتابوں کی الماری کو طرح

ٹٹولتا جیسے وہ کسی کتاب کا نام پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس رات کو یہ تماشا ہو رہا تھا۔ چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ سادھو اور دولت خاں بیٹھک میں بیٹھے یہ تماشا کر رہے تھے اور میں چھپ کر اس شیطانی ڈرامہ کو دیکھ رہی تھی۔ غم و غصہ اور نفرت کے جذبات، میرے خوف پر غالب تھے آخرکار جب دولت خاں نے مراقبہ سے سر اٹھایا تو سفید گھوڑا خود بخود اصطبل میں جا چکا تھا۔ اس کے بعد ایک روز دن میں دوپہر کے وقت دولت خاں گھر میں آیا اور کھانا کھا کر سونے کو لیٹ گیا۔ ایک دم اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی اور گھوڑے کی سی سانسیں سنائی دینے لگیں۔

اتنے میں باہر سے شور و غل کی آواز آئی۔ سفید گھوڑا چھوٹ گیا تھا اور سارے گاؤں میں اُدھم مچا رہا تھا جب کوئی اس کو پکڑنے کے لئے اس کے قریب جاتا تو وہ دولتیاں مارنے اور کاٹنے کے بجائے عجیب انداز سے اپنا جسم چرا کر بھاگ نکلتا تھا اور ایسی ایسی حرکتیں کر رہا تھا کہ بہت سے لوگ خوفزدہ ہو کر اس کو بھوت سمجھ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد گھوڑا خود بخود اصطبل میں آ کھڑا ہوا ادھر دولت خاں خواب شیریں سے بیدار ہوئے جب پیشکار نے ان کو ان کے چہیتے گھوڑے کی داستان شرارت سنائی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ مجھے دولت خاں سے کس قدر نفرت اور خوف آتا ہوگا لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس اثناء میں اس شیطانی کھیل اور شعبدہ بازی کی دولت خاں کو قدرت نے ایک عجیب سزا دینی شروع کی اور وہ یہ کہ اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا اور کتابی چہرہ بتدریج سفید گھوڑے کے چہرے کی طرح بننے لگا۔ یہ تبدیلی اس قدر آہستہ آہستہ عمل میں آتی رہی کہ خود مجھے اس کا پتہ بہت دنوں کے بعد لگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دولت خاں کو اب تک اس کا احساس نہیں ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کا چہرہ مجھے ہی گھوڑے کی طرح نظر آتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم بھی میرے ہم خیال ہو، ہاں! ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جس وقت وہ اپنی روح کو سفید گھوڑے کے قالب میں تبدیل کرنے کے لئے مراقبہ کرتا ہے اس وقت اس کے چہرہ اور گھوڑے کے چہرے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔"

زہرہ کی زبانی یہ کہانی سُن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے اس واقعہ کو اس کی توہم پرستی اور میاں بیوی کے ناچاقی کے جذبات نفرت پر محمول کر کے اس سے کہا۔

"زہرہ جو کچھ تم نے کہا ممکن ہے کہ یہ سچ ہو لیکن میرے خیال میں یہ تمہارا وہم اور تمہارے تخیلات کا کرشمہ ہے۔ چونکہ تم دولت خاں کی محبت سے محروم ہو اور اپنی محبت میں سفید گھوڑے کو حائل سمجھ رہی ہو اس لئے تمہارے تخیل پر منحوس گھوڑے کا بہت اثر ہے۔ رہا سادھو کا معاملہ، یہ لوگ جادو، ٹونے جنتر منتر کے طلسم میں مالداروں کو پھنسا کر اپنی جیب گرم کر لیا کرتے ہیں۔ دولت خاں بھی ایسے ہی کسی آدمی کے پھندے میں پھنس گیا ہوگا۔ علاوہ ازیں دولت خاں کا مراقبہ اور گھوڑے کی شرارتیں محض اتفاقات پر محمول کی جا سکتی ہیں۔ گھوڑے کو چونکہ کھلے بندوں چھوڑ دیا جاتا ہے اس لئے اس کا ڈرائنگ روم اور مطالعہ کے کمرہ میں گھس جانا یا گاؤں میں دوڑنا سب کچھ ممکن ہے۔"

زہرہ نے میری گفتگو پر غور کئے بغیر فوراً کہا۔

"بہت دنوں تک میں خود اپنی خیالات کو وہم سمجھتی رہی مگر واقعات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے دولت خاں اور سفید گھوڑے کو میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ تم ذرا میرے کہنے سے ایک نظر سفید گھوڑے کو دیکھ لو، اس کے بعد کوئی صحیح رائے قائم کر سکو گے۔ اس کے بعد خدارا کوئی ایسی صورت نکالو کہ مجھے اس عذاب سے نجات ملے۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں اگر چند روز یہی لیل و نہار رہا تو میری جان کی خیر نہیں معلوم ہوتی جاؤ تم گھوڑے کو دیکھ لو۔ دولت خاں کے واپس آنے سے پہلے پہلے اُسے ضرور دیکھ لو۔"

میں آخرکار زہرہ کا بھائی تھا۔ اور مجھے اس سے دلچسپی بھی تھی۔ اور جب کہ وہ روحانی کوفت اور عجیب و غریب مصیبت میں گرفتار تھی۔ میری ہمدردی کے جذبات میں حرکت پیدا ہو جانا بالکل قدرتی تھا۔ علاوہ ازیں میں جذباتی انسان اور کمزور دل بھی ہوں اس لئے اس واقعے سے مجھے خود خوف آ رہا تھا اور میں اس خوف کو اپنے دل سے دُور کرنے کے بعد زہرہ کو بھی اس وہمی خوف سے نجات دلانا چاہتا تھا اس کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ تمام واقعات کا مُطالعہ کیا جائے اور اصل حقیقت کا علم حاصل کر کے معاملہ کی تہہ کو پہنچ جایا جائے۔

غرض میں تن تنہا اصطبل کی طرف گیا اصطبل کا دروازہ بند تھا دروازے

کے داہنے طرف ایک کھڑکی تھی اور اس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں میں نے ان میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ گھوڑا چپ چاپ کھڑا ہوا تھا اس کی آنکھیں آدھی کھلی اور آدھی بند تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھڑا کھڑا سو رہا ہے، غور سے دیکھنے پر میں نے محسوس کیا کہ وہ اعلیٰ نسل کا جانور تھا۔ نہایت قدآور بے داغ، بے عیب سراسر سفید رنگ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ چند منٹ تک میں کھڑا اسے تکتا رہا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اس معمولی گھوڑے کے متعلق زہرہ نے جو کچھ خیالات قائم کئے ہیں وہ سراسر وہم ہیں۔ مجھے اس گھوڑے کو دیکھ کر ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے جسم کو جھرجھرایا اور آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھنا شروع کیا۔ چند لمحہ تک وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے نتھنے پھلانا شروع کئے اس کے بعد اس کے جبڑوں میں حرکت پیدا ہونی شروع ہوئی اور ہونٹ ہلنے لگے اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ غصہ اور نفرت سے مجھے گھور رہا ہے اور دانت پیس رہا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا لیکن دروازہ بند تھا اور میں اس کے دسترس سے باہر تھا۔ پھر بھی اس کی آنکھوں اور اُس کے خوف انگیز چہرے کے نظارے سے خوف کی ایک ہلکی سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے ہٹ آیا اور سیدھا زہرہ کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ مجھے برآمدہ میں مل گئی اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"وہ واپس آگیا ہے اور سونے کے لئے اپنے کمرہ میں گیا ہے۔ اچھا تم گھوڑے کو دیکھ آئے ہو؟"

"دیکھ آیا ہوں، اور دوبارہ اس کی منحوس شکل دیکھنا نہیں چاہتا"

لیکن یہ واقعہ تھا کہ ہونے والے ڈرامہ میں زہرہ کے بجائے اس گھوڑے سے مجھے بحیثیت ہیرو کے ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ آمنے سامنے ہونا تھا چنانچہ رات کو میں باوجود کوشش کے نہ سو سکا اور آدھی رات تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا ایک نامعلوم سا خوف مجھے سارے گھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ باہر کا منظر ۲۰ تاریخ کے چاند کی چاندنی سے نورانی غلاف میں ملفوف نظر آتا تھا۔ میں اوپر کے منزل کے کمرے کی کھڑکی میں باہر کی سیر سے اپنا مضطرب دل بہلا رہا تھا کہ دور فاصلے پر کوٹھی کے وسیع وعریض احاطہ میں سفید گھوڑا گھومتا ہوا نظر آیا میں خوف ودہشت کے مبہم جذبات سے سہم کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ گھوڑا آہستہ آہستہ ہر طرف گھوم رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرے کمرہ کی کھڑکی کے سامنے آکر وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ سفید چاندنی میں اس کا برف کی طرح سفید جسم چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور اس کی شعلہ کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں لگاتار میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ آسمان پر چاند۔ افق پر سیاہ بادل کھلے میدان کے پس منظر میں وہ کوہ پیکر گھوڑا کھڑا تھا۔ جس اضطراب اور خوف نے میری نیند حرام کر رکھی تھی شاید اسی اضطراب کا شکار وہ عجیب دغریب گھوڑا بھی تھا۔

پندرہ دن تک میں اور زہرہ ایک ناقابل بیان خوف وہراس کے گھٹے گھٹے ماحول میں رہے اس درمیان میں دولت خان کے طرز عمل میں خاص تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ جب کبھی گھر سے باہر جاتا تھا مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اگر میں خود ہی اس کے ساتھ ہو لیتا تھا تو وہ کچھ اس طرح چپ اور بے تعلق رہتا تھا کہ میری خودداری کو سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ مجھ سے بہت کم گفتگو کرتا تھا اور کبھی بات چیت پر مجبور ہوتا تو نہایت مختصر اور سلسلہ کلام کو ختم کر دینے والی بات کرکے خیالات میں گم ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ حرکت شروع کر دی تھی کہ اکثر آس پاس کے علاقوں میں جایا کرتا اور اپنی واپسی کے مقررہ کردہ وقت سے دو تین گھنٹے پیشتر واپس آجاتا اور خموشی سے گھر میں آکر میری اور زہرہ کی نقل وحرکت کو تاکا کرتا تھا۔ اس کا یہ طرز عمل میرے لئے نہایت ہی تکلیف دہ تھا۔ میں نے ان حالات کے پیش نظر زہرہ کو اپنی پوزیشن کی نزاکت سمجھائی اور اس سے کہا کہ دولت خاں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ چونکہ تمھارے اور اس کے تعلقات ناخوشگوار ہیں اس لئے خواہ مخواہ میری نسبت سے تم پر کوئی بہتان لگانے کی فکر میں ہے اور اس کے لئے وہ کسی موقع کی تلاش میں ہے۔ ایسی صورت میں میرا یہاں رہنا تمھارے لئے نقصان کا باعث ہے بہتر ہو کہ تم مجھے یہاں سے عزت کے ساتھ رخصت ہو جانے دو۔ اس کے جواب میں زہرہ نے کہا کہ میں اس کی چالوں کو خوب سمجھتی ہوں اور میں اپنی جگہ پر نہایت محتاط اور باخبر ہوں۔ میں اسے بہتان لگانے کا موقع تو دونگی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ اگر کچھ اور کارروائی کرنا چاہتا ہے تو کرلے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ کیا تم مجھے ایسے حالات میں بے یار ومددگار چھوڑ کر جانا پسند کروگے؟ زہرہ کی بات معقول تھی۔ میں

اس کو تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلنا شانِ مردانگی کے خلاف سمجھ کر کسی آنے والے خوفناک واقعے کا مقابلہ کرنے کے لئے وہیں ٹھہرا رہا۔

ایک روز رات کو میں زہرہ اور دولت خاں کھانے سے فارغ ہو کر کمرہ میں حسبِ معمول چپ چاپ بیٹھے تھے۔ قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی۔ باہر تیز ہوا کی سنسناہٹ اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز گونج رہی تھی۔ دیوار پر لگا ہوا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا اور دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ دس منٹ بعد ہم سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جانے والے تھے۔ دیوار پر دولت خاں کی شکاری بندوق لٹک رہی تھی آج اس کو صاف کیا گیا تھا اور اس میں کارتوس بھرے ہوئے تھے کیونکہ دولت خاں کا ارادہ شکار کے لئے جانے کا تھا لیکن ناگہاں اس کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے شکار ملتوی ہو گیا تھا۔ اور بندوق اسی طرح تیار اور بھری ہوئی دیوار پر لٹکا دی گئی تھی۔ میں نے بات چیت کرنے کی کئی دفعہ کوشش کی تھی لیکن دولت خاں کو متوجہ نہ دیکھ کر چپ ہو رہا تھا۔ زہرہ اپنی کرسی پر اپنے خیالات میں محو تھی اور میں اپنی جگہ پر خواب بیداری کے مزے لے رہا تھا۔ دولت خاں بھی اپنی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا میرے دل میں اس وقت جو خیالات موجزن تھے وہ کچھ اس قسم کے تھے۔

"زہرہ کی زندگی سطحی حیثیت سے بہت شاندار اور قابلِ رشک ہے لیکن اس غریب کے دل کی خدا ہی کو خبر ہے۔ میاں بیوی میں شکر رنجی بڑھتے بڑھتے نفرت کے درجے کو پہنچ چکی ہے اور دونوں توہمات کا شکار ہو چکے ہیں۔ زہرہ اس کو جادوگر بھوت اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی ہے اور دولت خاں اپنی بیوی کو بے وفا اور بد اطوار خیال کر رہا ہے اور میں ان دونوں کے درمیان خواہ مخواہ آکر پھنس گیا ہوں۔ دولت خاں کی حماقت ہے کہ وہ مجھے اپنی بیوی کی محبت کا مجرم سمجھ رہا ہے۔ میری زندگی بھی عجیب و غریب حادثات کا شکار رہی ہے۔ میں شہر کے ہنگامے سے بھاگ کر یہاں آیا تھا کہ چند روز سکون سے گزار سکونگا۔ یہاں پہلے ہی ایک "فتنہ خانہ ویرانی" میرا انتظار کر رہا تھا۔ دولت خاں میرے اور زہرہ کے تعلقاتِ محبت کا ثبوت بہم پہنچانا چاہتا ہے اور شاید آج اس نے کسی خاص نیت سے بندوق بھرا کر لٹکا رکھی ہے کیا وہ مجھے اور زہرہ کو اس قدر ذلیل خیال کرتا ہے۔ یہ اُس کی اپنی جہالت اور کمینگی ہے۔ زہرہ کو میں نے کبھی بھی بُری نیت سے نہیں دیکھا۔ مجھے اس خلفشار سے اپنے کو فوراً علیحدہ کر لینا چاہئے اگر اس نے بدگمانی سے مشتعل ہو کر مجھ پر حملہ کر دیا تو قباحت ہوگی۔

ان خیالات سے چونک کر میں نے زہرہ کی طرف ایک نظر ڈالی اور پھر دولت خاں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا منہ اس کے سینے سے جا لگا تھا۔ میں نے زہرہ کو آہستہ سے آواز دے کر اپنی طرف مخاطب کیا اور دولت خاں کو سنانے کی خاطر طنزاً کہا۔

"زہرہ! تمہارے شوہر سو رہے ہیں اور وہ ایک دم اس وقت بیدار ہونگے جب ان کو ہم دونوں پر یہ بندوق داغ دینے کا بہانہ مل جائے گا۔ لہذا صبح کو مجھے تو رخصت عنایت فرما دینی چاہئے۔"

میرے ان آتشیں فقروں کو سن کر زہرہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی اُس نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے مجھے دیکھا اور پھر اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔

"وہ سو نہیں رہے ہیں۔" زہرہ نے اپنے شوہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں کہ وہ سو نہیں رہے بلکہ اپنی جان کو سوتا بنا رہے ہیں۔" میں نے طنزاً ایک اور فقرہ چست کیا۔

زہرہ نے اپنے شوہر کو جھک کر دیکھا اور چیخ مار کر کہا۔ "ہائے میرے اللہ یہ تو مر چکے ہیں۔"

زہرہ کی اس چیخ کے ساتھ ہی باہر کی تیز ہوا اور تیز و تند ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ دنیا بھر کی خبیث روحیں مل کر آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ ہوا کے جھکڑوں سے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے جھڑجھڑانے لگے میں سر سے لیکر پاؤں تک لرزنے لگا۔ ایک لحظہ کے بعد باہر بالکل سکوت طاری ہو گیا اور اس سکوت میں مجھے قدموں کی آواز سنائی دی میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز قریب تر آ رہی ہے اور اس وقت باوجود خوف و ہراس کے یہ الفاظ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئے۔

"دولت خانہ زندہ ہے۔ جاٹ مرا جب جانیئے جب جاٹ کی تیرہویں ہو۔"

زہرہ نے میری طرف دیوانوں کی طرح دیکھا اور کرسی کی طرف

اشارہ کرکے کہا۔ "تم کیا بک رہے ہو، یہ تو مرے پڑے ہیں۔"

میں نے ایک مجنونانہ جذبے کے ماتحت اس کو جواب دیا۔ "دولت خاں کا ایک جسم تقیناً مرچکا ہے لیکن دولت خاں کا دوسرا جسم یقیناً زندہ ہے اور ادھر کو دوڑا چلا آرہا ہے تاکہ ہم دونوں کو عین اختلاط کے وقت تردامن گرفتار کرلے۔ زہرہ! تمھیں اس کی ٹاپوں کی آواز نہیں آرہی؟"

میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولدیئے۔ ہوا کا ایک جھونکا زور سے اندر آیا اور اسی کے ساتھ سفید گھوڑے کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کے نتھنے پھول رہے تھے اور دانت باہر نکل آئے تھے۔ وہ فرط غیظ و غضب سے دانت پیس رہا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس سے بھاگ کر زہرہ کے پاس جاکھڑا ہوا۔ زہرہ نے الہامی طور پر میرا منشا سمجھ کر بندوق دیوار پر سے اتار میری طرف بڑھادی اور میں نے بالکل اضطراری طور پر بندوق کندھے پر رکھ کر فائر کردیا۔

دھماکے کی آواز کے ساتھ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میرے سارے اعضا شل ہوگئے ہوں۔ میں جہاں تھا وہیں دھڑام سے گر پڑا اور زہرہ بھی غش کھاکر میری گود میں آپڑی۔ اس نیم بیہوشی کی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ دولت خاں کی روح گھوڑے کے قالب میں سے ایک قیامت خیز کرب اور بے چینی کے ساتھ نکل کر کمرہ میں گھس آئی ہے اور اس سرد اکڑے ہوئے قالب میں دوبارہ گھسنے کی کوشش کررہی ہے جو کرسی پر اسی طرح سر بگریبان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ لمحہ اس قدر طویل اور پر اضطراب تھا کہ میں فرطِ خوف سے ادھ موا ہوکر رہ گیا تھا۔ اتنے میں مُردہ قالب کے زرد اور کروہ رُخساروں میں سُرخی جھلکنے لگی اور اس نے لمبی سانس لی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ .... اس جانگسل منظر سے میرے جسم میں ایک اضطراری طاقت پیدا ہوچکی تھی۔ میں تڑپ کر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ زہرہ بھی شاید ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے خوف سے لبریز نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن میں اس ہیبت ناک منظر کو زیادہ دیر تک دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا میں وہاں سے نکل کر بھاگا .... تین گھنٹے کی دیوانہ وار دوڑ کے بعد میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جاکر گر پڑا۔ اُس نے مجھے عالم بیہوشی میں دہلی بھجوادیا۔ ایک ہفتہ کے علاج اور آرام کے بعد میں آج ہی خیراتی ہسپتال سے باہر نکلا ہوں۔"

"اور زہرہ ——؟" میں نے پوچھا۔

"اسے میں تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ تمھیں معلوم ہے کہ میرا دل بہت کمزور ہے اور اس کا ثبوت تم دیکھ رہے ہو کہ فرط خوف سے میرے بال تک سفید ہوگئے ہیں۔ میں اپنی جان لیکر بھاگا ہوں۔ جان ہے تو جہان ہے اب تم سے روپے مل گئے ہیں۔ گھر جاکر زہرہ کے نیک و بد کے متعلق لکھونگا۔ خدا کرے کہ اس حادثہ جانکاہ کے بعد بچاری زندہ ہو۔"

بشیر نے حسب وعدہ مجھے لکھا کہ ——

"زہرہ سخت بیمار ہے اور اپنے ماں باپ کے گھر ہے۔ دولت خاں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ اس نے قصداً مجھ سے اس کے گھوڑے کو گولی سے اُڑوا دیا ہے۔ وہ سخت ناراض ہے۔ زہرہ زنک کا شکار اور دولت خاں غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دونوں میں صلح کرادوں لیکن مجھ میں منصور پور جانے کی ہمت نہیں۔"

---

(۱)

ہو جاتا ہے پہلو میں مرا دل بیتاب
زحمت ہے تری قیامت حسینوں کا شباب
بجلی سی مرے ہوش پہ گر جاتی ہے
چہرے سے وہ جب اپنے اٹھاتے ہیں نقاب

عطا کاکوروی

(۲)

وہ حسن وہ مستانہ ادا اور وہ شباب
واللہ کہاں ممکن ہے نظارہ کی تاب
موسیٰ کی طرح تھی نہ مرے ہوش کی خیر
اچھا ہوا ہے یار کے چہرہ پہ نقاب

ماہر عثمانی

آرزو

از حضرت علامہ کیفی چریا کوٹی

قارئین عالمگیر کے ذوق طبع کے لئے حضرت علامہ کیفی کا وہ قطعہ فارسی اشاعت کے لئے بھیجتا ہوں جس پر فصاحت و بلاغت مدتوں ناز کریں گی۔ حضرت علامہ موصوف اسی اپریل میں فخر قوم آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ سے ملنے کیلئے دہلی تشریف لے گئے تھے اور تقریباً دو ہفتے تک موصوف کے مہمان رہے اسی سلسلہ میں حضرت علامہ ممدوح نے جناب موصوف کو یہ فی البدیہہ قطعہ فارسی لکھ کر سنایا تھا جناب موصوف نے اس پر بہت کچھ داد قدر دانی عطا فرمائی تھی

دامانِ تارتار و گلستانم آرزوست
تنگ از جنوں و وسعتِ دامانم آرزوست

عمریکہ من ببالشِ راحت نہ خفتہ ام
از بختِ خویش خوابِ خوش آنم آرزوست

دستِ کرم بسوئے من از آستیں دراز
دامن تہی واز سر و سامانم آرزوست

تارے نماندہ است بہ دامانِ اعتبار
گوید جنوں کنوں ز رگِ جانم آرزوست

نالہ دلم خراشد و افغاں جگر گداخت
چوں "نے" بہ ہجر باز نیستانم آرزوست

تعبیر در تبسمِ تقدیر خوش بود
باز یک نگاہِ خوابِ پریشانم آرزوست

ہم مورم و فتادہ ز طوفانِ روزگار
ہم آستانِ شاہِ سلیمانم آرزوست

کیفی ہزار شکر کہ ایں ہم غنیمت است
جاں بر لبم رسیدہ و درمانم آرزوست

از دستِ روزگار چہ گویم چہا رسید
عالم بہ خندہ کہ تماشا بما رسید

مرسلہ عبدالمعید عاقل عباسی

شہنشاہ جہانگیر کی شاعری

از جناب سید منظر کاظمی صاحب بی۔ اے آنرز

تمہید:۔ سلاطین تیموریہ میں جہانگیر ایک عجیب وغریب بادشاہ گزرا ہے۔ جس کی گوناگوں خصوصیات اور متضاد اطوار وخصائل ہر طبقہ کے انسانوں کی دلچسپی کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس کی دلچسپ زندگی کے سوانح خود اس کے قلم سے لکھے ہوئے یا لکھوائے ہوئے موجود ہوئے۔ یہ سوانح جہانگیر نامہ یا واقعات جہانگیری یا توزک جہانگیری کے نام سے مشہور ہیں۔

بخلاف اپنے باپ کے جہانگیر ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ چنانچہ ایام طفولیت میں اس نے شیخ عبدالنبی سے چہل حدیث کا درس لیا۔ وہ فارسی نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ توزک جہانگیری اس کی تحریری لیاقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ فارسی وہندی کے علاوہ ترکی زبان سے بھی پوری طرح واقف تھا اور بے تکلف بول سکتا تھا۔

جہانگیر جس طرح عدل وانصاف میں تمام شاہان مغلیہ سے افضل تھا اسی طرح سخن فہمی، نکتہ دانی اور شاعری کے لحاظ سے سب پر فوقیت لے گیا تھا۔ وہ خود لکھتا ہے۔

"چوں طبع من موزون است گاہے با اختیار گاہے
بے اختیار مصراعے ورباعے یا بیت درخاطر سری زند"

ایک مرتبہ امیر الامراء کی یہ بیت پڑھی گئی ؎

بگزر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے برجستہ کہا ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است

اس پر ہر شاعر نے اسی زمین میں ایک ایک بیت کہی۔ جہانگیر نے ملا علی احمد مرکن کی یہ بیت اپنے توزک میں نقل کی ہے ؎

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس
یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است

ایک روز دفعۃً ایک مضمون جہانگیر کے دل میں پیدا ہوا اور اس غزل کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہوا ؎

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد	تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ می خرامی و مستِ تو عالمے	اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل دوست مستم و در ہجر بیقرار	داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد
وقتِ نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر	امید آنکہ شعلۂ نورا ز اثر رسد

ایک دن شکار سے بخیر وعافیت گھر واپس آیا تو یکایک یہ بیت سرزد ہوئی ؎

بود بر آسماں تا مہر را نور،	مبادا عکس او از چتر شہ دور

ماوراءالنہر سے خواجہ ہاشم نام ایک درویش نے اپنے سلسلے کے ایک مرید کے ہاتھ ایک خط جہانگیر کو بھیجا جس میں اس نے بابر سے اپنے قدیمی تعلقات بیان کئے اور ایک نظم بھی نقل کی جو بابر نے خواجگی نام ایک بزرگ کی شان میں جو اسی سلسلہ میں شامل تھے لکھی تھی اس کا آخری مصرعہ یہ تھا ع

خواجگی را بندہ ایم وخواجگی را بندہ ایم

جہانگیر نے فی البدیہہ اپنے قلم خاص سے ایک رباعی لکھ کر ایک ہزار اشرفیوں کے ساتھ خواجہ مذکور کے نام بھیجی۔ وہ رباعی یہ تھی ؎

اے آنکہ زمہر تو بیش از بیش است
از دولتِ یاد بودت اے درویش است
چند آنکہ زمژدہ ات دلم شاد شود
شادیم ازاں کہ لطفت از حد بیش است

اس کے بعد حکم دیا کہ جو چاہے اس پر طبع آزمائی کرے۔ حکیم مسیح الزماں نے فوراً یہ رباعی پڑھی ؎

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش
ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش
گر شاد شود زما دل یک درویش
آں را شمریم حاصل شاہی خویش

سپہ سالار اتالیق خاں خانخاناں نے مشہور مصرع کے تتبع میں ؎

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید

ایک غزل کہی۔ مرزا رستم صفوی اور اس کے بیٹے مرزا مراد نے بھی طبع آزمائی کی۔ جہانگیر نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا ؎

ساغرے بر رُخِ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

دربار کے ہر شاعر نے اس وزن پر ایک ایک غزل کہہ کر بادشاہ کو دکھائی۔ معلوم ہوا کہ مصرع مذکور مولانا عبدالرحمٰن جامی کا ہے اس پر جہانگیر نے ان کی پوری غزل ملاحظہ کی مگر اس کے سوا کوئی بات پسند نہ کی۔

ایک دن باغ میں سیر کرتے ہوئے ایک بیت بے اختیار زبان پر جاری ہوگئی۔ سنگتراشوں کو حکم دیا کہ ایک لوح پر اس کو نقش کریں تاکہ یادگار رہے ؎

نشیمن گاہ شاہ ہفت کشور جہانگیر ابن شاہنشاہ اکبر

ایک بار رمضان میں شہر کے علماء و مشائخ کو مسلسل تین روز تک افطار کے لئے اپنے دسترخوان پر دعوت دی۔ ہر شب کو مجلس کے اختتام پر خود کھڑا ہو کر نہایت جوش کے ساتھ یہ اشعار پڑھتا تھا ؎

خداوندگارا تو نگر توئی توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشائم نہ فرماں دہم یکے از گدایان ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس وگرنہ چہ خیر آید از من بکس

اپنے جلوس کے تیرھویں سال جہانگیر مانڈو (مالوہ) کی سیر کیلئے گیا۔ وہاں ایک تالاب میں پتھر کی عمارت تھی۔ اس کے ایک ستون پر یہ رباعی پڑھ کر وجد میں آگیا ؎

یاران موافق ہمہ از دست شدند
در دست اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر
یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

جہانگیر اسی طرز کی ایک اور رباعی درج کرتا ہے ؎

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند
از خاطر ہمدماں فراموش شدند
آنانکہ بصد زباں سخن می گفتند
آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

جہانگیر نے عادل خاں کی کارگزاری کے اعتراف میں اس کے نام ایک فرمان صادر کیا اور اپنے قلم سے یہ بیت رقم کی ؎

شدی از التماس شاہ خرم بفرزندی ما مشہور عالم

اس کے بعد عادل خاں کو اس کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں دکن کا حاکم بنا کر بھیجا اور اس موقع پر خاص اپنے ہاتھ سے یہ رباعی لکھی ؎

اے سوئے تو داریم نظر رحمت ما
آسودہ نشیں بسایۂ دولت ما
سوئے تو شبیہ خویش کردیم رواں
تا معنی ما ببینی از صورت ما

عنایت خاں کثرت شراب نوشی و افیون خواری کے باعث اس قدر ضعیف و نحیف ہوگیا تھا کہ اس پر یہ مثل صادق آتی تھی ؎

کشیدہ پوستے بر استخوانے

بالآخر اس مرض میں گھل گھل کر مرگیا۔ جہانگیر نے مرنے سے پہلے اسے دیکھا اور اس کی حالت اس قدر خراب دیکھ کر حیران رہ گیا اور یہ شعر پڑھے ؎

سایہ من گیرم نہ گیرد پائے تا قیامت ندارد دم بر جائے
نالہ از بس کہ ضعف دل بیند تا بلب چند جائے بنشیند

ایک دن جمنا کے کنارے باغ گل افشاں کی سیر کے لئے گیا۔ بارش زور سے ہو رہی تھی۔ تمام پھل و پھول تروتازہ تھے۔ جس طرف نظر جاتی تھی سبزہ اور آب رواں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بادشاہ نے اس دلکش نظارہ کی مناسبت سے انوری کے یہ اشعار پڑھے ۔

روز عیش و طرب بستان ست روز بازار گل و ریحان ست
تودۂ خاک عبیر آمیز ست دامن باد گلاب افشاں ست
از ملاقات صبا روئے غدیر راست چوں آزدہ سوہان ست

جب دربار میں خان عالم کی آمد کی خبر مشہور ہوئی تو جہانگیر نے ہر روز اس کے استقبال کے لئے آدمی بھیجے اور اپنے رقعوں اور فرمانوں کو مناسب حال اشعار سے مزین کیا۔ ایک دن کچھ عطر جہانگیری ارسال کیا اور ساتھ ہی یہ بیت لکھی ؎

بسویت فرستادہ ام بوئے خویش
کہ آرم ترا زود تر سوئے خویش

نوٹ:۔ تمام واقعات و حوالے تزک جہانگیری سے ماخوذ ہیں۔

انتخابِ سخن

جلوۂ بہار

حضرت قیس بگو سرائی!

فصلِ بہار آگئی گردش میں جام لا — مینائے احمری میں مئے لالہ فام لا
قربان جاؤں کُمْ کے سرِ بزمِ عام لا — بھر بھر کے جام ساقیٔ مست خرام لا
رہنے دے ذکر بادۂ روزِ الست کو
پھر کر دے مست ساغرِ صہبائے مست کو

خوش جس سے طبع ہو وہ مئے خوشگوار لا — شیشے میں جا کے لال پری کو اُتار لا
آئی بہار تحفۂ فصلِ بہار لا — کچھ لا نہ لا وہ چیز پئے بادہ خوار لا
جو کچھ ہو فصلِ گل میں تجھے دسترس پلا
جب پھول بھی نہیں ہو تو کلیوں کا رس پلا

ساقی! میں صدقے جاؤں ترے طمطراق کے — بھولا ہوا ہے حیلۂ مالا یطاق پہ
کر رحم بھی تو میکشِ پُر اشتیاق پر — رکھتے ہوئے ہی ساغر و مینا کو طاق پر
لا نو کشید خواہ مئے کہنہ سال لا
خم نہ سہی تو شیشہ میں کچھ خم سے ڈھال لا

چپکی سی کیوں لگی ہے بتا دیکھتا ہے کیا — مُنہ میکشوں کا اُترا ہوا دیکھتا ہے کیا
ساقی! میں صدقے جاؤں پلا دیکھتا ہے کیا — جو کچھ بھی لا رہا ہے وہ لا دیکھتا ہے کیا
اب تاب میکشوں میں نہیں انتظار کی
لے، آگئی چمن میں سواری بہار کی

یہ رُت نئی، یہ فصل نئی، یہ ہوا نئی — سب میں نئی پھبن ہے تو سب میں فضا نئی
نخلِ چمن کا رنگ نیا ہے ادا نئی — رختِ کہن بدل کے چڑھائی قبا نئی
دیکھو تو آب و تاب ذرا برگ و بار میں
ہیرے ٹکے ہیں نخلِ زمرد نگار میں

چل کر پیام لطف سنانے لگی صبا — کلیوں کو گدگدا کے ہنسانے لگی صبا
خوشبو سے پھول پھل کو بسانے لگی صبا — گُل طُرفہ تر چمن میں کھلانے لگی صبا
گلشن سے پھر نکل کے چلی وادیوں کی سمت
آئی وہاں سے لوٹ کے آبادیوں کی سمت

دیکر پیام موسمِ گُل میگسار میں — آ پہنچی لڑکھڑاتی ہوئی کوئے یار میں
کیا جانے کیا اثر ہے ہوائے بہار میں — کلیاں بھی کھل رہی ہیں حسینوں کے ہار میں
دن بھی نمو کا فصلِ بہاری کا دور بھی
کونپل بھی ڈالیوں میں درختوں میں بور بھی

سر سبز دشت بھی ہے لہکتا ہے راغ بھی — جنگل بھی ہنس رہا ہے مہکتا ہے باغ بھی
بھر بھر کے پھر ابھرنے لگے دل کے داغ بھی — بالیدہ روح بھی ہے معطر دماغ بھی
کیا کیا ہیں شور کاربراری کے ہر جگہ
احسان ہیں نسیم بہاری کے ہر جگہ

نظارہ بہارِ چمن ہے بہار پر — کلیاں اُٹھان پر ہیں شگوفے نکھار پر
کچھ پھول زیرِ شاخ ہیں کچھ شاخسار پر — اک کیفِ سرمدی ہے ہر اک برگ و بار پر
غنچے جو خم بکف ہیں تو ساغر بدوش پھول
پھر کیوں نہ فصلِ گل میں پئیں بادہ نوش پھول

مستی سے جھومتی ہے ہر اک شاخسار بھی — پھولے نہیں سماتے گل و لالہ زار بھی
کچھ کم نہیں گلوں سے لطافت میں خار بھی — کیا کیا بہار پر ہے فضائے بہار بھی
آنکھیں ہیں شاخ پر تو کبھی ہیں زمین پر
دل لوٹ پوٹ ہو گیا فطرت کے سین پر

طوطی کہیں، پتنگے کہیں، ٹڈیاں کہیں — دیکھی یہی بہار نظر کی جہاں کہیں
ساکت کہیں ہیں رقص میں ہیں تتلیاں کہیں — بھونرے کہیں ہیں شہد کی [illegible] کہیں

رہ رہ کے وہ شگوفۂ نورس کا چوسنا
اُڑنا کبھی چمن میں کبھی رس کا چوسنا

کوئل کہیں، چکور کہیں قمریاں کہیں   ہیں پپیہے کہیں تو نواسنجیاں کہیں
آموں کی کچھ بہار کہیں لیچیاں کہیں   موجِ صبا سے پھولوں کی سرگوشیاں کہیں

کچھ زمزمہ سرا ہیں تو گلشن فروش کچھ
کچھ محبت نظر ہیں تو محشر بدوش کچھ

شاخیں بھی ہل رہی ہیں نسیم بہار سے   شبنم ٹپک کے گرنے لگی شاخسار سے
قطرے سوا ہیں ضو میں دُرِ آبدار سے   موتی گرے ہیں ٹوٹ کے موتی کے ہار سے

شبنم کے قطرے زہرہ جبینوں نے چن لئے
موتی سمجھ سمجھ کے حسینوں نے چن لئے

غنچے یہ گلرخوں کے وہ شیریں لبوں کے غول   وہ قد ستم، وہ حسن قیامت وہ جسم گول
کوئی شریر کوئی فسونگر، کوئی ٹھٹول   سبزے پہ ہرنیوں کی طرح جا بجا کلول

صدقے بہار خطۂ مینو اساس پر
گل بھی نثار ہوتے ہیں گر گر کے گھاس پر

کیا کیا دکھا رہے ہیں چمن میں بہار پھول   نکہت فشاں کہیں ہیں کہیں مشکبار پھول
کچھ زیرِ شاخ کچھ ہیں سر شاخسار پھول   گلشن میں ہیں ہزار طرح کے ہزار پھول

بیلا کہیں۔ چنبیلی کہیں۔ موگرا کہیں
چمپا کہیں۔ گلاب کہیں۔ موتیا کہیں

کیا کیا پھبن دکھاتی ہے گلزار کی پھبن   سبزے کی ہے کہیں تو کہیں خار کی پھبن
جنبش پہ ڈالیوں کی وہ اشجار کی پھبن   رنگینیاں گلوں کی وہ اثمار کی پھبن

کیا کیا لبھا رہی ہے دلوں کو پھبن کے ساتھ
کچھ اڑ چلا چمن بھی ہوائے چمن کے ساتھ

یہ باغ کا سماں یہ لہک شاخسار کی   گلریزیاں یہ نخل زمرد نگار کی،
پھولوں کی یہ لپٹ یہ ہوا لالہ زار کی   اترا رہی ہے موج نسیم بہار کی،

اڑ اڑ کے آ رہی ہے چمن سے حنا کی بو،
چنبا کی بو۔ گلاب کی بو۔ موتیا کی بو

پھرتے ہیں جھولیوں میں لئے گلفروش پھول   دے لیکے گوندھتے ہیں بہت سرخوش پھول
ہیں کچھ جو چوٹیوں میں تو کچھ زیب دوش پھول   کلیاں کلائیوں میں تو ہیں زیب گوش پھول

گندھ گندھ کے زینتِ گلِ رخسار بن گیا
گہنا بنا کہیں تو کہیں ہار بن گیا

پھر بن پڑی خلیل ہر اک کی بہار میں   چمن چمن کے پھول چلنے لگا میگسار میں
کچھ فکر رند میں ہے نہ پرہیزگار میں   ہے یہ بھی نیم مست تو وہ بھی خمار میں

فردا کی فکر کچھ ہے نہ تشویش دوش کچھ
آگے کی سوچتے ہیں بھلا بادہ نوش کچھ

حُسن اور مزدوری

از حکیم میر کاظم علی صاحب برق موسوی

جیملی[1] اے کشتۂ افلاس و غربت جیملی   عفت و عصمت کی دیوی غیرت صورت جیملی!
سادگی پر تیری قربان ست برن[2] کے سنگار   تیرے بھولے پن پہ صدقے شوخ و رنگین نگار
سچ بتا کیا تجھ کو اپنے حسن کا احساس ہے   تجھ کو بھی اٹھتی جوانی کا کچھ اپنی پاس ہے
تو نے آئینہ بھی دیکھا ہے کبھی آئینہ رو   کیا کبھی اس خال و خد پر اپنے اترائی ہے تو
کیا تو واقف ہے کہ ہے تو واقعی کتنی حسیں   گاؤں بھر میں بے خبر تیرا کوئی ثانی نہیں

لیکن ان معصوم نظروں سے تو چلتا ہے پتا
تو نہیں ہے اپنے یکتا حسن سے واقف ذرا

مانگ میں ہے تیری صندل کے عوض گرد و غبار   سر پہ پھولوں کے عوض یہ سنگ مبلو کا ہے بار
ہے عرق میں تر عوض چندن کے چاندی سی جبیں   دھوپ سے کمھلا رہا ہے تیرا چہرہ نازنیں
تیرے ہاتھوں میں ہیں پتھر کی خراشیں جا بجا   گورے ہاتھوں میں ہے مہندی کی جگہ خوب جچا
ہاں یونہی پتھر اٹھا گا گا کے سن اے جیملی   دیکھ حرف آنے نہ دینا آن پر اپنی کبھی
کوئی دن کر صبرِ خدمت جائیگے سر پر بار   گلشن مزدور میں بھی آئیگی اک دن بہار
اور سن اک بات برقِ موسوی کی یاد رکھ   اپنی محنت سے کما ہر حال میں دل شاد رکھ

عصمت ہندوستاں مشہور ہے دنیا میں آج
دیکھو رکھنا مرتے دم تک اپنی اس ہانی کی لاج

اے مرے مفلس وطن ہندوستاں ہندوستاں   سخت حیرت ہے تجھے کہتے ہیں کیوں جنت نشاں
چلچلاتی دھوپ میں حسن اور مزدوری کرے   سر پہ پتھر ڈھوئے دن بھر پانچ گنڈوں[3] کے لئے

---

[1] دارجلنگ کی ایک حسین مزدور پیشہ لڑکی جو پتھر کی کان میں کام کرتی ہے جس کے نام کا تلفظ "جیم لی" ہے۔

[2] ست برن یعنی سات برن، ہر ہفت رنگ۔

[3] پانچ گنڈے سکہ عثمانیہ جس کے تین آنے کلدار ہوتے ہیں۔

جس کے نازک ہاتھ ہوں مہندی رچانے کیلئے ۔۔۔ حیف وہ مجبور ہو پتھر اٹھانے کیلئے
جس کے تلوے ہوں مناسب فرش قالیں کیلئے ۔۔۔ تیغ سے ہو وہ پابرہنہ سنگریزوں پہ چلے

حسن کی اس بیکسی کو اور پامالی کو دیکھ
سود خواروں پر نظر کر اور بدحالی کو دیکھ

اے مری جنت کی چڑیا اے مرے ہندوستاں ۔۔۔ تیری دولتمندیوں کی رنگ لیں داستاں
کھا گئی تجھکو نظر اغیار کی میرے وطن ۔۔۔ پہلے تھا جنت نشاں اور اب ہے وہ دارالمحن

سود خواروں کی نظر جوں پر یہ دنیا تنگ ہے
ہند میں اہل وطن سرمایہ داری ننگ ہے

نکہت کی آمد

ازجناب سید قوم جعفری مچھلی شہری

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی ۔۔۔ شراب حسن کا اک جام چھلکاتی ہوئی آئی
عجیب انداز سے آئی وہ شرماتی ہوئی آئی ۔۔۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آئی وہ شرماتی ہوئی آئی

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی

فضا میں خود مہکتی اور مہکاتی ہوئی آئی ۔۔۔ جوانی میٹھے میٹھے ساز پر گاتی ہوئی آئی
نگاہوں کو جھکائے اور شرماتی ہوئی آئی ۔۔۔ وہ دیکھو کچھ وہ منہ ہی منہ میں فرماتی ہوئی آئی

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی

محبت کے ترانے شوق سے گاتی ہوئی آئی ۔۔۔ عجب ناز و ادا سے ہائے اتراتی ہوئی آئی
نگاہِ ناز سے اک برق چمکاتی ہوئی آئی ۔۔۔ ادا کے تیر سے دل میرا برماتی ہوئی آئی

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی

محبت کے منازل سے وہ گھبراتی ہوئی آئی ۔۔۔ رہِ الفت میں وہ کس درجہ کتراتی ہوئی آئی
وہ اپنے ننھے دل کو خود ہی بہلاتی ہوئی آئی ۔۔۔ نہ جلدی آنے پر وہ ہائے پچھتاتی ہوئی آئی

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی

جوانی کی امنگوں سے وہ گھبراتی ہوئی آئی ۔۔۔ رخِ روشن پہ اپنے زلف بکھراتی ہوئی آئی
وہ اپنے حسن و زیبائش پہ اتراتی ہوئی آئی ۔۔۔ وہ جانِ قوم آئی اور اٹھلاتی ہوئی آئی

وہ دیکھو میری نکہت پھول برساتی ہوئی آئی

وہ راتیں

ازجناب ابرار احمد صاحب فاروقی عرشی

تجھے بھولی نہ ہوں شاید مری معصوم دردانہ

وہ راتیں سحر بھری، نیلی، روپہلی چمپئی راتیں
سکوت آور ردائے نور میں لپٹی ہوئی راتیں

وہ راتیں ہاں وہی راتیں، وہی راتیں وہی راتیں
شباب کیف کی آغوش میں سوئی ہوئی راتیں

وہ راتیں کسمساتی، جھومتی انگڑائیاں لیتی
وہی لہرا کے خواب ناز سے اٹھتی ہوئی راتیں

وہ راتیں نے بلب ساغر بکف کوثر بجاں راتیں
وہی دریائے ناؤنوش میں بہتی ہوئی راتیں

وہی راتیں بساتی تھیں مئے الفت کا پیمانہ
تجھے بھولی نہ ہوں شاید مری معصوم دردانہ

وہ راتیں جو سرود عیش کے بربط بجاتی تھیں
شباب و سرخوشی کے روح پرور راگ گاتی تھیں

وہ حسن و عشق کے جو جانفزا نغمے سناتی تھیں
فرشتوں کے دلوں میں محشر ارماں اٹھاتی تھیں

ادھر ہم سے ادھر آنکھیں ستاروں سے ملاتی تھیں
وہ حوریں جو ہمیں فردوس کی سیریں کراتی تھیں

جبین آستاں کو عجز و استغنا سکھاتی تھیں
جو پھر خود ہی نیاز و ناز کے جھگڑے مٹاتی تھیں

وہی راتیں بناتی تھیں جو فرزانوں کو دیوانہ
تجھے بھولی نہ ہوں شاید مری معصوم دردانہ

عورت کی فطرت

عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ایک لگداز افسانہ

از جناب مظفر صاحب برنی

جمیل شاعر تھا اور پھر کیسا شاعر؟ دُنیائے جذبات کو تہ و بالا کر دینے والا۔ برف جیسے سرد دماغوں میں آگ لگا دینے والا۔ نوجوانوں کی رگوں میں حرکت خون تیز کر دینے والا! جس کی غزلیں، نظمیں ساز دل کو اس طرح چھیڑ دیں کہ فضائے روح میں ایک نغمہ لاہوتی گونج جائے۔ جن کا ہر شعر روح کی کسل اور تھکن کو دور کر دے! جو دل کی مدت سے سوئی ہوئی اُمیدوں کو بیدار کر دیں۔ جو پژمردہ نگاہوں کو جوان کر دیں۔ جن کے سُننے سے ایک عالم بیخودی طاری ہو جائے۔ وہ ایک ایسی تخیُلی دنیا پیش کرتا تھا جس میں دو محبت بھرے دل ایک دوسرے کے مقابل دھڑک رہے ہوں جس کی فضا سماج اور سوسائٹی کی بدترین عفونت سے پاک ہو جس میں صرف محبت کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کر رہی ہو۔ جہاں مذہب اور محبت ایک ہو جائے۔ جہاں روح دوسری روح سے ہمکنار ہو جائے۔ جہاں کا ذرہ ذرہ فلک محبت کا درخشاں آفتاب ہو۔ جہاں بلبل گل کے فراق میں آہ و زاری نہ کرتی ہو۔ جہاں پپیہا "پی کہاں" کو بھول کر "پی یہاں" کہنے لگے۔ جہاں کوئل کی کوک درد کی ٹیسوں سے آزاد ہو کر مسرت کا گیت بن جائے۔ جہاں چکور چاند کے رُخسار پر بوسہ زن ہو۔ جہاں صرف محبت ہو اور محبت ......

اس کا ہر شعر لوگوں کے دل میں گھر کر لیتا تھا۔ وہ لوگوں کے دماغوں میں چھایا ہوا تھا (شاید اس کے خیالات و جذبات پر بھی کوئی چھایا ہوا تھا) اس کی شاعری اس کے پاکیزہ جذبات کی آئینہ دار تھی۔ اس کے خیالات کسی کی دنیا میں مقید تھے۔ اس کی نظریں کسی کے حسن میں جذب ہو چکی تھیں۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی آباد تھا۔ وہ کسی کی محبت کی سُنہری زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ دل رکھتا تھا اور پھر شاعرانہ دل۔ وہ بھی دل کے پردے میں کوئی راز رکھتا تھا۔ وہی اس کا سرمایہ تھا۔ وہی اس کا منبع تھا جہاں سے اُس کی شاعری کا چشمہ پھوٹتا تھا۔ اس کا سر ہمیشہ کے لئے کسی کے آستان پر جھک گیا تھا اور وہ لذتِ سجدہ سے مخمور سا رہتا تھا۔ اس کے دل میں ایک آگ آہستہ آہستہ سُلگ رہی تھی جو بھڑک کر کبھی خاکستر نہ ہو گی جس میں وہ جلتا تھا اور اُسے "گلستان ابراہیم" خیال کرتا تھا۔ اس کے دل کی کلی محبت کی خوشگوار نسیم کے جھونکے میں جھول رہی تھی۔ نہ معلوم اس کی قسمت میں پھول بننا لکھا تھا یا مرجھا کر خاک ہو جانا۔ اگر خدا ہر شخص کی تقدیر سے اسے پہلے ہی آگاہ کر دیتا تو شاید دنیا میں ٹریجیڈی کا نام ہی نہ ہوتا۔

وہ دنیا اور مافیہا سے بے پروا ایک ایسی دُنیا بسا رہا تھا جس میں وہ تھا اور —— فیروزہ!

جمیل، سلیم کو دوست کہتا تھا اور کہہ سکتا تھا (یہ صرف وقت ہی دکھا دے گا) سلیم ایک مصور تھا۔ وہ موقلم کی ایک جنبش سے ایک ایسی دُنیا پیدا کر دیتا تھا جس میں محبت ہی محبت ہو۔ جہاں پریم کی ندیاں بہ رہی ہوں وہ مختلف رنگوں کی آمیزش سے بہار کے خوبصورت رنگ برنگ کے پھولوں میں اس حسن کی جھلک دکھاتا تھا جس کی چند کرنیں اس کے ظلمت خانہ دل کو منور کئے ہوئے تھیں۔ کسی حسین عورت کے تبسم ریز ہونٹوں سے وہ بجلی گراتا تھا

جس سے اس کا طور دل سُرما ہو چکا تھا۔ وہ کاغذ کی سطح پر محبت کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا تھا۔ وہ جب ایک خاموش بہتے ہوئے دریا کا نظارہ دکھاتا جس میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سُنہری کرنیں اس کی موجوں سے ہمکنار ہو رہی ہوں۔ جس میں ایک چھوٹی سی کشتی خراماں خراماں ساحل کی طرف آ رہی ہو اور ملاحوں کے لمبے لمبے سائے دریا کے لالہ زار پانی پر سیاہ کمبل بچھا رہے ہوں۔ ساتھ ہی ایک حسین عورت انتظار کش نگاہوں سے ایک لامعلوم خوشی کے ساتھ آنے والی کشتی پر نظریں جمائے ہوئے اپنی آرزوؤں کے مرکز اپنی تمناؤں کی جان! اپنے دل کی گہرائیوں میں بسنے والے محبوب کو آتا ہوا دیکھ رہی ہو تو معلوم ہوتا تھا کہ عورت کا چہرہ اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ لوگ اس کی تصاویر دیکھ دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ وہ اپنے تخیل کو کاغذ پر کچھ اس طرح سے ظاہر کرتا تھا کہ بڑے بڑے مصور و نقاش رنگ سے بھرے ہوئے برش ہونٹوں تلے دبائے جاتے تھے۔ اس کی تصاویر میں جان ہوتی تھی۔ اس کا تخیل بہت اعلیٰ، غلک رس، لطیف اور کامیاب تھا۔ نمائشوں میں ہمیشہ لوگوں کی نظریں اس کی تصاویر پر جم کر رہ جاتی تھیں۔

اس کی مصوری اتنی کامیاب کیوں تھی؟ اس کے جذبات اتنے صحیح و جوان کیوں تھے؟ اس کی تخیلی دنیا اصلی دنیا سے اسدرجہ مشابہ کیوں تھی؟ اس کی تصاویر کیوں ہمیشہ کے لئے دماغوں پر مرتسم ہو جاتی تھیں؟ وہ نظروں کو کیوں رنگین بنا دیتی تھیں؟ ان سے روح میں ایک چبھن دل میں ایک خلش کیوں پیدا ہوتی تھی۔

جمیل و سلیم! شاعر و مصور ——— شاعری اور مصوری دونوں جذبات کی تصویر کشی کا نام ہے۔ مصوری خاموش شاعری اور شاعری مُنہ بولتی مصوری دونوں کی تخلیق شمع حسن کے پرتو سے ہوئی ہے۔ دونوں کی جولانگاہ ایک — دونوں کی پرواز ایک ہی فضا میں ہوتی ہے۔

جمیل اور سلیم اتنے گہرے دوست تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے اتنے ناآشنا تھے جتنا کہ زاغ بلبل کے جذبات سے ——— اتنے نزدیک اور پھر اتنے دور ——— جمیل سے پہلے سلیم اور سلیم سے پہلے جمیل اپنا دل چیر کر دکھانے کو تیار تھے لیکن جمیل کی خودداری اور سلیم کی خاموش طبیعت ایک دوسرے کو رازدار بنانے سے مانع تھی اگرچہ ان کی بے تکلفی یہاں تک تھی جہاں انہیں اپنے خیالات اور "رازہائے درون پردہ" بیان کر دینے چاہئیے تھے۔ جہاں وہ اپنی فطرت کی ہر بھونڈی شکل ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہوئے بالکل نہ شرماتے تھے۔ اگر دوستی بڑھی ہوئی ہمدردی کا نام تھا تو اس ظاہری ہمدردی کے ساتھ خیالات اور جذبات کی ہمدردی بھی ضروری ہے۔

دونوں کا مرض ایک ——— دونوں کا چارہ گر ایک!

سلیم کے اس سوال کے جواب میں کہ جمیل! آج کل تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ جمیل نے سگرٹ کا کش کھینچکر کہنا شروع کیا "سلیم! تم میرے دوست ہو۔ اور پھر دوست بھی کیسے صرف ایک" سلیم نے بات کاٹ کر کہا "بس جناب میری شان میں قصیدہ گوئی تو رہنے دیجئے" جمیل نے ذرا مذاق کے پہلو کو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "میں ہر چند چاہتا تھا کہ تمہیں اپنا رازدار بناؤں مگر میری فطرت نے گوارا نہیں کیا۔ معاف کرنا میرا خیال تھا اور ہے کہ ع

بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے رازدار بنانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا غم کو غلط

کے لئے آنسو بہانا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شاید میں تمھاری نظروں میں اتنا خود دار نہیں رہوں گا جتنا پہلے تھا۔ خدانخواستہ میں تمھیں یہ الزام نہیں دے رہا ہوں کہ تم مجھے سبک سمجھنے لگو گے"۔

"خدا کی قسم" سلیم نے کچھ کہنا چاہا مگر جمیل نے ہاتھ مُنہ پر رکھ دیا اور کہا "آپ کی ایسی قسمیں ذوق کے اتنے بڑے نظریئے کو غلط ثابت نہیں کر سکتیں خیر تو میں تمہید کے طور پر چند باتیں اور کہدوں کہ محبت کوئی ظلم یا کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس پاک جذبے کا نام ہے جو کبھی بڑھی ہوئی ہمدردی اور کبھی کسی کی طرف کشش اور رغبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یہ اُس "حسن پرستی" کے مترادف نہیں ہے جسے غالب بوالہوسی بتاتے ہیں۔ محبت کی تخلیق حسن ہی سے نہیں ہوئی بلکہ کبھی ہمدردی اور کبھی کسی خاص ادا سے پیدا شدہ کشش کا نام ہے۔ اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں تو شاید تم تسلیم کرو گے کہ محبت جنسی تعلقات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں ہے"

"ہاں ہاں، آپ ذرا جلد اس لکچر کو ختم کرکے مطلب کی بات پر آیئے" سلیم نے مسکرا کر اور کرسی پر نشست بدل کر بےچین ہوتے ہوئے کہا۔

جمیل نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمارا موجودہ نظام اس قدر ناقص ہے کہ محبت کی سزا گردن زدنی سے بھی زیادہ ہے۔ کم از کم لڑکیوں کے لئے تو۔ شریف گھرانوں میں اس پاک لفظ کو لیتے ہوئے زبان پکڑی جاتی ہے اب تو یہ مغلظات کے زمرے میں شمار کر لیا گیا ہے اور اوباشوں کی لعنت کا لفظ بن گیا ہے۔ پھر لڑکیوں کے لئے سوسائٹی کی گرفت اور بھی سخت ہے۔ خدانخواستہ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں یہاں اسی مغربی تہذیب کو رائج دیکھنا چاہتا ہوں جو ہر ہفتہ سینکڑوں سول میرج کراتی ہے اور تیسرے دن عدالت میں طلاق کا مقدمہ دائر کراتی ہے۔ یہ سوسائٹی کی اس آزاد خیالی کا نتیجہ نہیں بلکہ بے اعتدالی اور زیادتی کا کھلم کھلا نمونہ ہے۔ ہندوستانی سوسائٹی دو بچے بچیوں کی پاک محبت سے بہتر طوائف بازی خیال کرتی ہے۔ یہ اُسے جی کڑا کرکے دیکھ سکتی ہے مگر یہ دیکھ کر کہ دو معصوم روحیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں اس کی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں سوسائٹی اس معصوم محبت کو ٹھکرا دیتی ہے۔ ہندوستان میں ۲۵ فیصدی ایسے بدقسمت لوگ ملیں گے جو صرف سوسائٹی کے اس نظام کی وجہ سے اپنی زندگیاں برباد کر چکے ہیں یا مجبور ہو کر اس پر کمر باندھ لیتے ہیں کہ میں اپنی عمر کو عمر گناہ کر لوں گا"۔

سلیم نے کہا۔ "بھئی! یہ باتیں تو ہم پچاسوں مرتبہ سن چکے ہیں ان کی جگالی سے کیا فائدہ کیا اپنی علمیت کا رعب ڈال رہے ہو یا آزاد خیالی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہو۔ مطلب کی بات گم اور یہ قصہ لے بیٹھے"۔

جمیل نے کہا۔ "اس تمہید کی ضرورت صرف اس وجہ سے پیش آئی تاکہ تم میرے اس راز سے پوری ہمدردی کر سکو ــــ اب سنو! مجھے تمھاری خالہ زاد بہن فیروزہ سے محبت ہے"۔

یہ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی شرمندگی اور درماندگی پیدا ہو گئی۔ دوبارہ اس کے دماغ میں خیال آیا کہ میں یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہوں سلیم سے ــــ۔ وہی سلیم جو فیروزہ کا خالہ زاد بھائی ہے۔ اس کا دل دوبارہ پکڑا گیا۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ پشیمان تھا لیکن اب کیا کیا جائے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ادھر سلیم کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ گویا کسی نے چھین لی۔ نظریں خود بخود سوکھی ہوئی گھاس پر جم کر رہ گئیں۔ محویت کے عالم میں مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کاش وہ اس حالت کو اپنی کسی تصویر میں عکس اُتار سکتا۔ تو شاید یہ اس کا شاہکار ہوتی دو منٹ تک فضا میں خاموشی رہی۔ اُدھر جمیل اپنے کہنے پر پشیمان تھا۔ ادھر سلیم سوچ رہا تھا کہ جمیل کیا کہہ رہا ہے۔ کیا وہ اس کی محبوبہ کو اس سے چھین رہا ہے۔ کیا وہ اس کے خرمن دل پر بجلی گرا رہا ہے۔ آہ، جمیل اور سلیم دوست بھی رہیں گے اور رقیب بھی۔ کیا دوستی کے حسین پودے کے ساتھ رقابت کی ستیاناسی کی بیل بھی چلتی رہے گی۔ کیا رقابت کی چٹانیں دوستی کے دھارے کو ایک ایسے رُخ پر ڈال دیں گی۔ جہاں یہ خشک ہو جائے گا؟

جمیل نے مسکرا کر کہا۔ "اب کس سوچ میں پڑ گئے"۔

سلیم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جمیل اچانک مجھے چکر آ گیا۔ ذرا آرام کروں گا۔ معاف کرنا انشاءاللہ کل پھر ملاقات ہوگی"۔

شہر کے باہر دریا کے دائیں کنارے ایک سنسان اور خاموش بنگلہ تھا۔ جس کی بیرونی ہیئت مکین کی بدمذاقی اور بے پروائی کی داد زبان حال سے دے رہی تھی۔ دو چار سوکھے ہوئے پودے۔ برآمدے کے سامنے نارنگی کا مُرجھایا ہوا مغموم درخت سوکھی ہوئی گھاس کے قطعات۔ روشوں کے دو رویہ زرد زرد پودے۔ یہ تھی ایک "ہندوستانی شاعر کی کُٹیا"۔ اُجڑا ہوا سا باغیچہ،

سویا ہوا سا بنگلہ۔ موت کی سی خاموشی۔ سورج مکھی کے پھولوں پر چھائی ہوئی مُرنی اور زردی جو ناکام محبت شاعر کے چہرے سے ملتی جلتی تھی۔

اس سے بیس قدم کے فاصلے پر دریا کے دوسرے کنارے پر ایک نہایت خوش نما بنگلہ جس کے کھلکھلاتے ہوئے پھول۔ مسکراتی ہوئی انگور کی بیلیں پسوشوں کی حسین ترتیب۔ سرو کے دراونچے اونچے درختوں کی تازگی دعوت نظر کے لئے رنگین سامان مہیا کرتی تھی اور حسن فطرت کی شائستگی کا ادنیٰ سا نمونہ تھی۔ یہ حسن فطرت کے شیدائی ایک خوش مذاق مصور سلیم کا بنگلہ تھا۔ سلیم کے ساتھ اس کی خالہ اور ان کی اکلوتی لڑکی فیروزہ بھی رہتی تھی۔ خاندان اعلیٰ اور پھر مغرب زدہ۔ ناممکن تھا کہ جمیل اور فیروزہ آزادی سے بات چیت نہ کر سکتے۔ وہ ایک ایسی فضا میں پل کر جوان ہوئی تھی جس میں آرٹ ہی آرٹ تھا۔ اگر اُسے فنون لطیفہ سے دلچسپی نہ ہوتی تو شاید وہ اس زبردست نظریئے کا قلع قمع کردیتی کہ "بچہ ماحول سے اثر قبول کرتا ہے"۔ خیالات کی یکسانیت آرٹ سے محبت۔ آزادانہ بات چیت اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

فیروزہ جمیل کے بغیر ایک ناخوشگوار سی تنہائی اور جمیل فیروزہ سے چند گھنٹے جدا ہو کر دل میں ایک سوناپن محسوس کرتا تھا۔ وہ شاعری کے دامن میں اپنے تھکے ہوئے دل اور مُرجھائی ہوئی روح کو آرام دیتا تھا۔

جمیل اپنا کلام فیروزہ کی بار بار فرمائشوں کے بعد بہت جھجک کر سناتا تھا۔ فیروزہ کی حالت اس کے ایک ایک شعر پر متغیر ہو جاتی تھی۔

چاند کی زرد اور ٹھنڈی کرنیں خزاں کے مارے درختوں پر ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے مُردے کے چہرے پر نور۔ انار کے درخت سے لگے ہوئے بنچ کے ایک سرے پر جمیل کچھ کھویا ہوا سا اور دوسرے سرے پر فیروزہ چپ چاپ خاموش سی بیٹھی تھی۔ فیروزہ نے اپنی اور جمیل کی اس حالت کا جائزہ لیتے ہوئے اس ناگوار خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔

"جمیل" فیروزہ نے کہا۔ "دیکھئے چاند کی زرد خاموش شعاعیں سورج کی تیز اور خیرہ کن کرنوں سے کتنی زیادہ حسین و لطیف اور روح پرور معلوم ہوتی ہیں"۔

"ہاں!" جمیل نے جواب دیا۔ "ہاں ہر حسین چیز اس وقت زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے جبکہ وہ مغموم اور محبت زدہ ہو شاید حسن کی تخلیق محبت اور غم کے خمیر سے ہوئی ہے"۔

فیروزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تو بڑا شاعرانہ خیال ہے۔"

"آپ کا سوال بھی تو غیر شاعرانہ نہ تھا۔" جمیل نے جواب دیا۔

جمیل نے بنچ سے ملے ہوئے گلاب کے پودے سے ایک پھول توڑا جو اس شاخ پر تنہا تھا اور عجب بے پروائی سے محویت کے عالم میں گھمانے لگا۔ اتفاقاً وہ پھول اس کی انگلیوں سے پھسل کر فیروزہ کی گود میں جا پڑا۔ فیروزہ جمیل کو شاعرانہ محویت کن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ جمیل کی نظریں دور کسی چیز پر جمی رہیں۔

حسن نے عشق کا لطیف تحفہ نظروں ہی نظروں میں قبول کر لیا تھا۔

سلیم کی منگیتر فیروزہ۔ جمیل کی محبوبہ فیروزہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے ایک کس قدر تاریک دوسرا کس قدر روشن! سلیم کی بے پناہ محبت کا جواب فیروزہ کی ادیر ہادشی مسکراہٹ۔ صرف اس کے شیشۂ دل پر بال ڈالنے بلکہ اسے چکنا چور کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس کی محبت فیروزہ کیلئے اور جذبۂ دوستی جمیل کے لئے آپس میں سرگرم ستیز تھے۔ دوستی کی شکست محبت کی پہلی فتح تھی۔ سلیم کی مینائے دل محبت کی تند و تیز شراب اور دوستی کے عرق گلاب لبریز تھی۔ اس کے یہی معنی تھے کہ دوستی کا عرق گلاب اپنی جداگانہ حیثیت یعنی رنگ و بو محبت کی تند و تیز شراب میں جذب کر دے اور صرف ایک معمولی سی خوشبو رہ جائے جیسے کفن میں کافور یا چتا میں صندل کی۔ وہ اس شیشے میں شراب بھرنا چاہتا تھا جو پہلے ہی سے لبریز تھا۔ وہ اس دل میں گوشۂ پناہ کی تلاش میں تھا جس کی گہرائیوں میں پہلے ہی کوئی آباد تھا۔ وہ عورت کے اس دل کو چھیننے کے ناقابل تعبیر خواب دیکھ رہا تھا جو کسی اور شخص کی قربانگاہ محبت پر نذر چڑھایا جا چکا تھا۔

فیروزہ کو اس کا احساس تھا۔ سلیم اس سے رحم کی درخواست کرتا تھا جو خود کسی دوسرے کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ خود بھکارن تھی کیا وہ کسی دوسرے کو بھیک دے سکتی تھی؟ پریم کے اتھاہ ساگر میں آرزوؤں سے بھرے ہوئے دلوں کی کشتی کا تصادم کس قدر تباہ کن ہوتا ہے شاید ایک تیسری کشتی ان کی زد میں آکر ہمیشہ کے لئے سینۂ سمندر کا راز بن جائے۔

کیا فیروزہ کا یہ ارادہ تھا؟ —— کیا سلیم کا یہ ارادہ تھا؟

تارے مسکرا کر کنکھیوں سے جمیل اور فیروزہ کو دیکھ رہے تھے چاند کے گرد بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے جو دم بدم چاند کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے بڑھ رہے تھے اسی طرح جدائی کے سیاہ بادل عنقریب اس کے چاند کو اس کی نظروں سے چھپا دینگے۔

فیروزہ کی نظریں گلاب کی پتیوں سے کھیل رہی تھیں۔ خاموش درختوں کے پاس وہ محبت کی رنگین بہار پر عنقریب چھانے والی خزاں کے اثرات کا شکار بنے بیٹھے تھے۔ خاموش فضا میں دو مخاطب کن لفظ "جمیل!" باریک و شیریں آواز میں اور "فیروزہ" کسی قدر کپکپائی اور گلوگیر آواز میں گونج کر رہ گئے ایک سکنڈ کے لئے دونوں کی بیقرار نگاہیں چار ہوئیں فیروزہ کی آنکھیں بس اسی کی منتظر تھیں فوراً دو موٹے موٹے گرم آنسو اگل دیئے شاید اس لئے کہ وہ دھندلی نظروں سے جمیل کے چاند سے مکھڑے کو جی بھر کر نہ دیکھ سکے ——۔

محبت کی بیچارگی —— جمیل نے مردانہ جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا "فیروزہ! تمہاری شبنمی آنکھیں کتنی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ عورت کی مدھ بھری آنکھیں جب آنسوؤں کے سیلاب میں ہوں تو کتنی حسین ہوتی ہیں لیکن مجھے تمہاری مسکراتی ہوئی آنکھیں اور ناچتی ہوئی نظریں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔" جمیل نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کسی قدر نرم اور تسلی آمیز الفاظ سے اس فقرہ کو ختم کیا اور فیروزہ کے لبوں کا ارتعاش دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"جمیل تم مرد ہو، اور میں عورت! —— عورت اور مرد میں بس یہی فرق ہوتا ہے۔"

"فیروزہ! تمہیں اس کے لئے مرد اور مجھے لئے مرد سے عورت بننا چاہیئے۔ کیوں اب تو خوش ہو؟"

"جمیل! مرد بہت جلد بھول جایا کرتے ہیں مگر عورت ایک دفعہ یاد کرتی ہے اور پھر تمام عمر یاد رکھتی ہے۔"

"فیروزہ! یہ وقت دکھا دے گا۔"

فیروزہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیشک۔"

فیروزہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "اچھا رخصت!" جمیل نے منہ پھیرتے ہوئے آنسو پونچھکر "خدا حافظ" کہا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں

اور دل کی داستان کے صفحے کے صفحے کہہ گئیں، اور پھر جھک گئیں ۔۔۔ محبت میں دل کی ترجمان آنکھیں۔

سلیم اپنی خالہ زاد بہن کو اپنے وطن پہنچانے چلا گیا۔ راستے میں اتفاقاً کار کا ایک حادثہ ہو گیا جس میں فیروزہ کی جان بچاتے ہوئے سلیم کا دایاں ہاتھ اس بری طرح زخمی ہوا کہ اس کو کٹوائے بغیر چارہ نہ رہا۔ مصور کا دایاں ہاتھ اس کے روزگار کا ذریعہ ۔۔۔ اس کی شہرت کی بنیاد ۔۔۔ اس کی جیون نیا کا چپو ۔۔۔ اس کی امیدوں کا سہارا ۔۔۔ فضائے مستقبل کو طے کرنے والا پر پرواز۔

سلیم کی تخلیقی دنیا اسی ہاتھ کی مرہون منت تھی۔ اب وہ اپنے شوق تخلیق کو کس طرح کاغذ کے پھریرے پر ظاہر کرے گا۔ لیکن اس کے ذوق تخلیق کی گھٹتی ہوئی موت محبت کی بجھی ہوئی چنگاریوں کی زندگی تھی۔ ناکامی مصوری کا سرمایہ محبت کی آگ کیلئے تیل ثابت ہوتا ہے۔ قربانگاہ محبت پر کتنی زبردست قربانی ۔۔۔ بے لوث قربانی ۔۔۔ سچی قربانی ۔۔۔ عورت کی محبت قربانی چاہتی ہے۔ اس دل میں جو سلیم کی محبت کے لئے قطعی بیخبر تھا۔ قربانی کے ابر کرم کی بدولت محبت کا بیج بار آور ہوتا ہے۔

کیا جمیل نے بھی کوئی قربانی کی؟ ۔۔۔ ظاہرا دکھاوا ۔۔۔ ظاہرا محبت جس کا انجام تاریک ہے ۔۔۔ لفظوں کے لباس میں محبت کی بے جان گڑیا، دھوکا ۔۔۔ فریب ۔۔۔ کھوکھلی امید ۔۔۔ جھوٹی تمنا ۔۔۔ اس کی آنکھوں کی دلفریب جنبش اور لبوں کا بھولے پیار سے سمویا ہوا ارتعاش اس کی محبت کی کل کائنات تھی ۔۔۔ محبت کی سرسبز کھیتی قربانی کے بغیر سوکھ جاتی ہے محبت کا بحر بے پایاں قربانی کے بغیر دم کے دم میں سراب کی شکل ۔۔۔ اختیار کر لیتا ہے ۔۔۔

سلیم کا سرسبز بنگلہ بے رونق اور بھیانک ہو چکا ہے۔ رنگ برنگ کی تیتلیوں کی جگہ چمگادڑوں نے لے لی ہے حریر و پرنیاں کے پردوں کی بجائے مکڑی کے جالے نظر آتے ہیں روشوں کے پودے بے ترتیب ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے الجھ کر آخری دم توڑ رہے ہیں۔ گلاب کے پودوں نے پتوں کو

لباس ماتار کر عریانی زیب تن کر لی ہے۔ نارنگی کا گول پھیلا ہوا درخت مرجھائے ہوئے پتوں کا ڈھیر دامن میں لئے ہوئے سوکھی ٹہنیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ نرگس کے خوشنما پھول مرجھا کر زمین بوس ہوگئے ہیں۔ شاید جمیل کے بنگلے کی طرف دیکھا دیکھی سلیم کا بنگلہ بھی اس کا ہم شکل بن رہا ہے —— فطرت کی مساوات ——!

ایک روز اس سنسان اور خاموش بنگلے میں بیداری اور زندگی کے آثار نظر آئے۔ بنگلے کے در و دیوار ایک عورت، ایک شیر خوار بچے اور ایک مفلوک الحال مصور کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ ایک تھکا دینے والے انتظار کے بعد جمیل کی منظور نظر فیروزہ نظر آئی۔ شام کے وقت جب جمیل سیر کرنے کیلئے جا رہا تھا اس نے بنگلے پر حسب معمول ایک سرسری نظر ڈالی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کو بنگلے میں سے باتیں کرنے کی آواز آئی امید کی دنیا میں زلزلہ سا ارمانوں میں الجھن۔ دل کی سرد آگ میں لپٹ اور امید و بیم میں کشمکش پیدا ہوئی۔ مرجھائی ہوئی امیدیں تر و تازہ ہوگئیں شاید یہی ترو تازگی ان کی پژمردگی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ پیاسے ارمانوں کے خشک ہونٹوں پر پانی کی بوند ٹپک گئی —— شاید اب پیاس اور بڑھ جائے گی۔

دھڑکتے ہوئے دل۔ مچلتی ہوئی آرزوؤں اور گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ جمیل نے کپکپائی ہوئی آواز میں بڑی کوشش کے بعد "سلیم" کہہ کر آواز دی وہ خود اپنی آواز پر متعجب تھا۔ وہ سلیم کہتے ہوئے اتنا ڈر رہا تھا جتنا ایک بچہ اپنی ماں کے سامنے اقرار جرم کرتے ہوئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی آواز کے فضا میں گونجتے ہی اس کی نظریں فیروزہ کے چاند سے مکھڑے کا طواف کریں گی کتنا خام خیال تھا —— تھوڑی دیر کے بعد سلیم باہر آیا اس کا چہرہ تفکرات کی وجہ سے بدل چکا تھا مگر اس کی خاموش سوئی ہوئی بیمار آنکھوں میں ایک قسم کی فاتحانہ چمک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تیز نظریں جمیل کے دل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں۔ جمیل پیچھے ہٹا اور پھر سنبھل کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سلیم نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے گرم گرم ہاتھوں میں دے دیا جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں بھئی! کیا اتنے عرصے کے بعد اتنے تبدیل ہوگئے کہ اب ہم اس قابل بھی نہ رہے کہ تمہارے دائیں ہاتھ سے ہاتھ ملا سکیں" سلیم نے قمیص کی آستین سے اپنی کہنی نکال دی اور نیچی نظروں کے ساتھ آگے بڑھا دی۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" کی کپکپاتی سی آواز ایک سیکنڈ تک فضا میں چکر لگاتی رہی سلیم نے جمیل کو سب کچھ سنا دیا اور پھر فیروزہ کو آواز دی۔
"فیروزہ! تمھیں جمیل بلا رہے ہیں" جمیل نے گھبراتے ہوئے کہا "نہیں نہیں اس وقت رہنے دو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی"
فیروزہ نے سُنی ان سُنی ایک کر دی اور ایک منٹ کے بعد جمیل یہ کہہ کر کہ "خیر پھر ملاقات ہوگی" جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔ وہی بنگلہ جو ابھی کچھ منٹ پہلے اس کے قدموں کو مقناطیسی طاقت کے ساتھ کھینچ رہا تھا اب کاٹنے کو دوڑتا تھا جمیل بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس نے بہت ضبط کیا۔ اب دل میں سکون، ارمانوں کی موت۔ حسرتوں کا خون۔ بھڑکتی ہوئی آگ کی راکھ تھی۔ طوفان اتر چکا تھا۔ تڑپتی ہوئی آرزوئیں دم توڑ چکی تھیں۔ منتظر نظریں اب پلکوں کی چلمن سے نکلنا بھی نہ چاہتی تھیں۔ دل میں صرف ایک تمنا تھی۔ کاش خود فیروزہ کے ہونٹوں سے سنوں کہ "مجھے تم سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہے۔"

جمیل کی دنیا بدل چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی جاڑے کی چاندنی اور غریب کی جوانی کی طرح بیکار سمجھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک حسین اور کیف پرور خواب سے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ماضی کے روح پرور نغمہ کی تان ٹوٹ چکی تھی۔ مستقبل تاریک اور بھیانک ہو چکا تھا ماضی کی حسین و رنگین داستان ہی اب اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ دنیا میں اس کے لئے صرف ایک کشش باقی تھی کہ اس داستان کو دہرایا جائے تصور کے بال و پر لگا کر وہ ماضی کے حسین و رنگین واقعات کی فضا میں محو پرواز رہتا تھا زندگی کی راہ چلتے چلتے وہ ایک ایسے ٹیلے پر پہنچ گیا تھا جس کے آگے ظلمت کا بحر بے پایاں لہریں لے رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی مسلط تھی۔ نظر تاریکی کے اس پردے کو چیرنے سے قاصر رہی۔ اب وہ صرف پیچھے مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔ (جہاں وہ اب کبھی واپس نہیں جا سکتا) معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام رنگینیاں اور فطرت کا تمام حسن یہیں جمع کر دیا گیا ہے۔ وہ اس پر کبھی شوق اور کبھی حسرت سے نظر ڈالتا ہے۔ اس کا سازِ دل جس کو کبھی "کسی کی مضراب" اس طرح چھیڑ رہی تھی کہ فضا محبت کے لاہوتی نغمات سے سیراب ہو رہی تھی

اب بیگانۂ مضراب ہو چکا ہے۔ اس کا تار ٹوٹ چکا ہے۔ اب فردوس گوش
نغموں کے بجائے ایک مہیب خراش آواز پیدا ہو گی۔

زندگی کا فلسفہ کتنا بدل چکا ہے۔ پہلے وہ سوچنے سے گریز کرتا تھا
اب وہ سوچتا ہے دل بھر کر اور ہر لمحہ۔ گویا اس کی زندگی ایک سنجیدہ سوچ
بن کر رہ گئی ہے۔ جب وہ ماضی کی رنگینیوں میں گم ہو کر تصورات کی دنیا میں
سانس لینے لگتا ہے تو مستقبل کا چبھتا ہوا کانٹا دل سے نکل جاتا ہے۔ حال
اور مستقبل تاریکی کے پردے میں چھپ گئے ہیں اب صرف ماضی ہے اور وہ
کبھی وہ مستقبل کی آمد کیلئے دست بدعا رہتا تھا آج دل کے کانوں اور روح
کی پوری توجہ کے ساتھ ماضی کے اس حسین نغمے کی صدائے بازگشت کا منتظر
ہے جس کی لے اس کی زندگی میں کبھی دُھن اس کی حامل زندگی تھی۔

وہ سوچتا تھا وہ کیوں زندہ ہے؟ کیا اُسے زندہ رہنا چاہئے؟ شاید
فطرت سے بھول ہوئی۔ کیا خالق دو عالم کبھی کسی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے؟
اگر نہیں تو اس نے بے مقصد مُبتلا کیوں پیدا کیا۔ کیا صرف ذوقِ تخلیق کی
لذتِ تکمیل کے لئے ـــــ اس کی زندگی اس شعر میں تبدیل ہو چکی ہے ع

ہمہ سوز و ہمہ ساز و ہمہ درد زندگی ہے کہ فغاں ہے کوئی

طربیہ کو المیہ میں تبدیل کرنا فطرت کا معصوم کھیل ہے۔

اُس نے (جمیل نے) برسوں کی محنت، عرق ریزی اور جگر سوزی کا
نتیجہ یعنی اپنا کلام آگ کی بے رحم لپیٹ کے حوالے کر دیا۔ اس نے مستقبل کی
امیدوں کی چتا میں آگ لگا دی۔ اس نے تمام ان پھولوں کو جو اس نے کسی
کی گردن میں ہار ڈالنے کے لئے گوندھے تھے نذرِ آتش کر دیا اس کے دل سے
ایک بوجھ اُتر گیا ـــ قربان گاہ محبت پر شاعر کی قربانی ـــ کیا شاعر کی
یہ قربانی مصور کی قربانی سے کسی طرح کم تھی۔

دلی صدمہ، دماغی کوفت اور روحانی کشمکش نے پورا پورا اثر کیا
اسی شام جمیل کو بخار ہوا اور بعد ازاں رات گئے ہذیان شروع ہو گیا ـــ
محبت ـــ خدا ـــ فیروزہ ـــ تینوں ـــ ایک ہی ـــ
ـــ ہیں ـــ تینوں ـــ ظالم ـــ کتنے ظالم؟ ـــ ہوں
میں ہوں فیروزہ ـــ میں ہوں خدا ـــ ہا ـــ ہا ـــ ہا
شاعری ـــ بکواس ـــ محبت ـــ بکواس ـــ یہ ہے زہریلا
ناگ محبت کا ـــ یہ آیا میری طرف ـــ وہ چیخ مار کر پلنگ
سے گر پڑا اور دروازے سے نکل کر بے تحاشا بھاگتا چلا گیا۔

سلیم دوسرے روز جمیل کے یہاں گیا اور اُسے آواز دی۔ آ
آواز ہوا کو چیرتی ہوئی بنگلے کے در و دیوار سے ٹکراتی نکل گئی۔ معلوم
کہ ہوا ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی ہے۔ سورج کی تیز کرنیں سونے بنگلے
کی نگہبانی کر رہی تھیں۔ سلیم بے تکلفی سے اندر داخل ہوا۔ بنگلہ کا کونا کونا
اور چپہ چپہ چھان مارا مگر جمیل کا پتہ نہ لگنا تھا نہ لگا۔ سونے کے کمرے میں
کے آدھے جلے ہوئے ٹکڑے فرش پر ادھر ادھر سر پٹکتے پھر رہے تھے۔ آ
آدھی جلی ہوئی کتابیں جو کسی ادھیڑ عورت کے سفید اور سیاہ ملے ہوئے
بال معلوم ہوتی تھیں۔ قمیص کے بے ڈھنگے پھٹے ہوئے ٹکڑے۔ بے ترتیب
چیزیں۔ فیروزہ کی پھٹی ہوئی تصویر جس پر دانتوں کے نشان تھے۔ دیکھ
ششدر رہ گیا۔ اس نے سب کچھ ایک نظر میں دیکھا اور مبہوت واپس
اور فیروزہ کو سب کچھ سنایا۔ وہ بچہ کا پنگوڑا جھلاتے ہوئے یکدم یک
خاموش ہو گئی ـــ اس کی زبان سُن ہو کر رہ گئی۔ دونوں خاموش
خاموشی دل کی حالت کی پردہ دار بھی تھی اور آئینہ دار بھی!

تیسرے روز سلیم اور فیروزہ ٹہلتے ٹہلتے کافی دور نکل گئے۔ سلیم
گود میں اس کا خوبصورت بچہ ہمک رہا تھا۔ فیروزہ خیالات میں کھوئی
دنیا وما فیہا سے بے خبر خاموش چلی جا رہی تھی۔ اسے سلیم کی موجودگی کا
بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی سلیم پیچھے مڑ کر اس کی حالت کا جائزہ لے لیتا تھا۔
اس کی موجودگی کو غیر موجودگی پر محمول کرنے میں حق بجانب تھا۔

سلیم کی نظریں کبھی بیتابانہ شفق کی حسین وادی میں گم ہو جاتی
اور کبھی دریا کے پانی پر جم جاتی تھیں جس کے سینے پر ڈوبتے ہوئے سورج
سنہری کرنیں اس طرح مچل رہی تھیں جیسے کسی حسین کے مرمریں شانوں
لانبی لانبی سنہری زلفیں!

کبھی اس کی مصورانہ نظریں اس شاعرانہ جال میں پھنس جا
تھیں جو سنہری کرنیں درختوں کے گھنے پتوں پر بن رہی تھیں۔ فیروزہ
کے دریا میں تصور کی لہروں کے سہارے بہتی چلی جا رہی تھی۔ شاید

اسی کنارے پہنچ جائے جہاں ۶ دل کے غنچے کھلتے تھے۔

اچانک ایک جگر خراش چیخ نے فضا کی خاموشی کو لرزہ بر اندام کردیا فیروزہ اپنے خوابوں کی دنیا سے محسوسات کی دنیا میں آگئی۔ سلیم بھی اس صوت سے چونک پڑا۔ وہ جلد جلد اس طرف بڑھے جہاں سے آواز آئی تھی۔ ایک نیم عریاں شخص جس کی شکل اس قدر مسخ ہوچکی تھی کہ شناسا نظریں بھی پہچاننے سے قاصر رہیں۔ جس کی ہیئت بھیانک اور ڈراونی بن چکی تھی۔ جس کے جسم پر کپڑوں کے چند ٹکڑے اس طرح چپک رہے تھے جیسے ننگی ننگی سفید دیوار پر دو دور اشتہار۔ وہ بے تحاشا دریا کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ نکل رہے تھے جو وہ نہ سمجھ سکتے تھے۔

پانی کی خاموش لہروں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ دریا کی سطح اس مجرم کے جسم کی طرح کانپنے لگی جو عین ارتکاب جرم کے وقت پکڑا جائے ــــ دھماکے کی آواز پھر فوراً ہی اس کے بعد ایک ہلکی سی چیخ جس نے سلیم اور فیروزہ کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے "آہ فیروزہ" کی شکل اختیار کرلی سنائی دی

فیروزہ کے دل و دماغ نے متفقہ طور پر کہا کہ "یہ جمیل تھا" سوچنے کی تمام قوتوں کو دل کے ایک سوئے ہوئے جذبۂ محبت کی انگڑائی نے شکست دے دی۔

فیروزہ اسی طرف بھاگنے لگی اور بھاگتی چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نازک جسم کی تمام قوت کمر در ٹانگوں میں مجتمع ہوگئی ہے سلیم بُت بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن سکون پذیر معلوم ہوتی تھی۔ دماغ سُن ہوگیا وہ باوجود کوشش کے کچھ نہ سمجھ سکا۔ کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے؟ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ ایک قدم نہ بڑھ سکا۔ کسی غیبی طاقت نے اس کی جسمانی و دماغی طاقت سلب کرلی تھی پیچھے نے گردن موڑ کر دیکھا، ورپھر باپ کے کندھے سے چمٹ گیا۔ پانی کی لہروں نے بازو پھیلائے۔ فیروزہ نے "جمیل" کہتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے سپرد کردیا۔

سلیم نے سب کچھ دیکھا۔ مگر کچھ نہ کرسکا ــــ وہ سوچنے لگا۔ "عورت کی فطرت کتنی عجیب ہے"

نقد و نظر

رسالہ رفیق نسواں لاہور ــــ

مندرجہ بالا نام سے ماہ اگست ۱۹۳۹ء سے انتخار النساء باجی رشیدہ لطیف صاحبہ ایم۔ ایل۔ اے نے اپنی زیر سرپرستی محترمہ حمیدہ خانم قریشی کی زیر ادارت ایک ماہوار اصلاحی نسوانی رسالہ جاری کرایا ہے۔ اس وقت چند اور زنانہ رسالے بھی جاری ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو بچیوں اور مستورات کے ہاتھوں میں دیئے جانے کے قابل نہیں کیونکہ ان میں عموماً عام مذاق کے مضامین رومانوی افسانے اور عشقیہ غزلیں درج ہوتی ہیں جن سے بچیوں اور مستورات کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زبان بھی ثقیل ہوتی ہے۔ پس باجی صاحبہ نے جو نہایت ہمدرد قوم اور معاون و خیرخواہ مستورات ہیں یہ اخلاقی و اصلاحی رسالہ جاری کرایا ہے جس کا معیار علمی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت بلند ہے۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے نہایت دلکش۔ مفید اور اعلیٰ پایہ کا ہے۔ چنانچہ اس کے مندرجہ سب کے سب مضامین نظم و نثر دلچسپ اچھوتے۔ روح پرور۔ معنی خیز اور اصلاحی ہیں اور ان کی زبان نہایت شستہ سلیس اور با محاورہ ہے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالہ کی معزز مدیرہ صاحبہ کو ادارت کے فرائض انجام دینے کا نہایت عمدہ سلیقہ ہے کتابت۔ کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ از حد دیدہ زیب ہے۔ اس کا سرورق آرٹ پیپر کا ہے جو فن مصوری کا شاہکار ہے اور رسالہ زیر تنقید میں جو تصویر "ممتا" کی دی گئی ہے وہ بھی بہت پیاری اور دلکش ہے۔ جس سے ماں کی بچے سے محبت کا پورا پورا نقش آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے۔ ضخامت کے لحاظ سے بھی قابل رشک ہے۔ الغرض یہ رسالہ ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر گھر کی بچیاں اور بیبیاں اس کا مطالعہ کرکے فائدہ اور لطف اٹھائیں لہٰذا

تاریخ ہند ——
تاریخی کہانیاں ——
تاریخ دکن ——

ناشرین:- جناب سید عبدالقادر اینڈ سنز
تاجران کتب وگورنمنٹ ایجوکیشنل پبلشرز حیدرآباد دکن

مجلس نصاب کتب شعبہ تاریخ حیدرآباد دکن نے بچوں کے لئے "تاریخی کہانیاں" شایع کی ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ تیسری جماعت اور دوسرا حصہ چوتھی جماعت کے طلبہ کے لئے ہے۔ انداز بیان اور زبان بچوں کی قابلیت کے عین مطابق ہے۔ پہلا حصہ جدید وقدیم تاریخ کے ۱۲ مشاہیر کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں ۱۰ حکایات ہیں۔ ہر کہانی تاریخی معلومات بڑھانے کی موجب ہے اور واقعہ کا تعلیمی وافادی پہلو بہت زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کیلئے تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ تاریخی کہانیاں تمام ترقی یافتہ مدارس کے نصاب میں شامل کی جائیں گی۔

قیمت حصہ اول ۸؍ حصہ دوم ۱۰؍

مجلس نصاب کتب کا دوسرا کارنامہ "تاریخ دکن" ہے اس میں دکن کا جغرافیہ ابتدائی تاریخ اور موجودہ حالات نہایت سادہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں زبان ایسی ہے جو پانچویں جماعت کے طلبہ کی سمجھ میں بخوبی آسکے۔ مناسب مقامات پر کارآمد نقشے اور شاہان دکن کی تصویریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔

مجلس مذکور نے چھٹی جماعت کے لئے "ہندوستان کی تاریخ" بھی مرتب کی ہے جس میں ہندوستان کے قدیمی لوگوں اور اسکندر کے حملہ سے لے کر شاہ جارج ششم کے زمانے تک کے حالات آسان زبان میں بیان کئے ہیں۔ اس تاریخ میں صرف جنگوں ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ کے تہذیب وتمدن کا نقشہ بھی خوش اسلوبی سے کھینچا گیا ہے اور اسی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

اس سلسلے کی آخری کڑی "تاریخ ہند" ہے جو ساتویں جماعت کے طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس تصنیف کے دو حصے ہیں جن میں سے ہمیں صرف حصہ اول موصول ہوا ہے۔ یہ تاریخ مغلوں کی آمد تک کے عہد پر مشتمل ہے اور اس میں سیاسی واقعات کے علاوہ ہر زمانے کی تہذیب وتمدن۔ فنون لطیفہ اور اشخاص کے اخلاق وعادات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ مجلس نصاب حیدرآباد دکن کی یہ تمام کتابیں غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں اور واقعات کو ایسے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ باہمی منافقت کی بجائے طلبہ میں رواداری کے جذبات اور خیالات پیدا ہوں۔

سید عبدالقادر صاحب حیدرآباد دکن کے مشہور پبلشر ہیں اور حکومت کی کتابیں نہایت اہتمام سے شایع کرنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے آپ کا اپنا پریس ہے جس میں طباعت نہایت روشن، نفیس اور اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔ ان کتابوں کی لکھائی چھپائی اور گٹ اپ اتنی دیدہ زیب باصرہ نواز اور شاندار ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کسی اور درسی کتاب کی ہو۔

ہم جناب سید صاحب کو اس معرکہ آرا تاریخی کارنامہ پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور ہندوستان کی تمام صوبائی حکومتوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کتب کو اپنی اپنی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کرکے اپنی علم نوازی کا ثبوت دیں گی۔

غزل

از جناب شیدا اسحاقی صاحب

وہ خاک ہمیں سمجھائیگا جو عقل سے خود بیگانہ ہے
ہم شیخ کی باتیں کیا سُنتے جب جان لیا دیوانہ ہے

یہ سر دُھننا جلنا مرنا بس شب بھر کے ہنگامے ہیں
پھر صبح کو شمع کُشتہ ہے یا خاک پر پروانہ ہے

صرف ایک محبت کی خاطر کیا کیا نہ ہوا کیا کیا نہ کیا
رودادِ جوانی کیا کہئے اک طُول طویل افسانہ ہے

کیوں دیر و حرم کا جھگڑا ہے جو بات یہاں سو بات وہاں
یہ دونوں جلوہ گاہیں ہیں جو کعبہ سو بتخانہ ہے

وہ عالم تھا بیہوشی کا جب تیرا جلوہ دیکھا تھا
کچھ بھول گئے کچھ یاد بھی ہے جو یاد ہے اک افسانہ ہے

وہ غیر تھے دل تو اپنا تھا کیوں اُس نے تنہا چھوڑ دیا
اپنوں سے بھروسہ جب نہ رہا بیگانہ پھر بیگانہ ہے

کعبہ میں دھرا کیا ہے خالی کعبہ ہی کعبہ ہے زاہد
بتخانے کا کیا کہنا ہے بتخانہ بھی بتخانہ ہے

رودادِ محبت کیا کہئے دلچسپ بھی ہے دلدوز بھی ہے
آغاز بھی اک افسانہ ہے انجام بھی اک افسانہ ہے

پی لی ہے مگر ہے ہوش ابھی پہچان رہے ہیں ہم سب کچھ
یہ ساقی ہے یہ ساغر ہے یہ شیشہ یہ پیمانہ ہے

تصویر بتوں کی جس میں ہے اُس گھر میں خدا بھی رہتا ہے
دل کعبے کا کعبہ ہے بتخانے کا بتخانہ ہے

ہم اُس کا کہنا کیا مانیں انجام کا جس کو ہوش نہیں
گو عقل کی باتیں کہتا ہے دیوانہ پھر دیوانہ ہے

آغاز محبت کے قصّے کچھ بھول گئے کچھ یاد بھی ہیں
جو بھول گئے سو بھول گئے جو یاد ہے اک افسانہ ہے

کیا کہہ کے پکاریں شیدا کو بدمست بھی ہے ہشیار بھی ہے
دیوانے کا دیوانہ ہے فرزانے کا فرزانہ ہے

ایک نفیس مزاج مہارانی نے

اپنے صدر اعظم سے کہا دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں تعمیل حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ شباب انگیز نسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں کی گلچینی کی گئی۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کردیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزرا سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا!

علم الصحت میں حیرت انگیز اضافہ
دل روز
رجسٹرڈ
کل جلدی امراض
پائیوریا، ہر قسم کی نزلہ اور
کھانسی کو تحلیل کرنے اور ہر ایک درد کا
اور دانتوں کا تیر بہدف نسخہ ہے
قیمت فی شیشی
طاہر الدین اینڈ سنز دل روز ویلا
لاہور

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھیے!
کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب، یوپی اور صوبہ سرحد
میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور بہترین درسگاہ
سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ
جو گورنمنٹ رجسٹرڈ بھی ہے اور ایڈڈ بھی۔ ہر مذہب و ملت کے تقریباً ایک صد طلباء اس منظور شدہ
درسگاہ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ فیس ماہوار لی جاتی ہے پراسپکٹس مفت ملتے ہیں۔
مینجر سکول فار الیکٹریشنز - لدھیانہ (پنجاب)

عالمگیر بکڈپو کی مشہور و معروف کتابیں!

آج ہی آرڈر روانہ فرمایئے!

شادی } ہماری یا آپ کی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور ظرافت نگار حضرت ملا رموزی کی شادی کے دلچسپ حالات خود ملا صاحب کے قلم ظرافت رقم سے لکھے ہوئے۔ خیال فرمایئے کتنی دلچسپ کتاب ہوگی ہمارا خیال ہے کہ اصلی شادی میں وہ رومانیت نہیں جو اس کتاب میں موجود ہے بس پڑھئے اور ہنستے جایئے حیرت انگیز کتاب ہے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے ۲/۸

صبح لطافت } ضیاء الملک ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا گرانقدر مجموعہ۔ کتاب کا ہر ورق زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے ۲/

لیلےٰ کے خطوط } ہندوستان کے مشہور فلسفی ادیب قاضی عبدالغفار کی وہ ہنگامہ پرور اور زندہ جاوید تصنیف جس کا پہلا ایڈیشن ایک قلیل عرصے میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا لیلیٰ کے خطوط کے ہر خط ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ میں ایک تڑپ موجود ہے ایسی تڑپ جس کا صحیح اندازہ آپ کو یہ کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ قیمت صرف ناظرین عالمگیر سے بجائے دو روپے چار آنے کے ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

مجبور تیمور خان } علامہ جرجی زیدان کا بلند پایہ تاریخی ناول جسے عالمگیر بکڈپو نے بصرف کثیر شائع کیا ہے قیمت ... ۱۲/

روزنامچے } ادبیات، نفسیات اور مزاحیات کا شاندار مجموعہ دور حاضر کی بہترین تصنیف۔ بیحد دلچسپ کتاب چند روزنامچوں کے عنوان ملاحظہ ہوں۔ بادشاہ کا روزنامچہ۔ تھیٹر کا روزنامچہ۔ ممبر اسمبلی کا روزنامچہ ایکٹرس کا روزنامچہ۔ حجام کا روزنامچہ۔ شاعر کا روزنامچہ۔ حکیم کا روزنامچہ۔ قوال کا روزنامچہ۔ دوشیزہ کا روزنامچہ۔ شوہر کا روزنامچہ۔ بیوی کا روزنامچہ، وغیرہ وغیرہ۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک۔

اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر } مصنفہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ اس مختصر رسالہ میں علامہ شبلی مرحوم نے ان تمام اعتراضوں کے مدلل و مسکت جواب تاریخ و حقایق کی روشنی میں دیئے ہیں جو عالمگیر پر کئے جاتے ہیں۔ قیمت چار آنے ۴/

کتاب التقدیر } علامہ ابن القیم کی شہرۂ آفاق کتاب۔ کتاب التقدیر کا عربی سے اردو میں ترجمہ۔ تقدیر کیا چیز ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ تقدیر کس طرح بنتی ہے اور کن حالات میں بگڑتی ہے؟ حجم پونے آٹھ سو صفحات سائز ۲۰×۳۰ اس کتاب کی اصلی قیمت ۱۲/ ہے مگر صرف ناظرین عالمگیر سے ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک لیئے جائینگے۔

سلامبو } از گستو فلابیر مترجمہ مسٹر عنایت اللہ دہلوی بی۔ اے مصنف ... دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ قدیم کی تصویر پیش کی ہے۔ حسین سلامبو اور شہزور ماتو کی داستان عشق۔ محلات کی جگمگاتی فضا میں حسن و عشق کی آویزش۔ وحشی سپاہ کی بغاوت۔ قتل و غارت کی دل ہلا دینے والی روئداد ضخامت ۵۰۰ صفحات کاغذ اعلیٰ دو جلد قیمت ۳/ علاوہ محصولڈاک۔

مرزا غالب } مرزا غالب کی ایک عدیم المثال سوانح عمری از مولانا مہر مدیر انقلاب۔ مولانا مہر نے مرزا غالب کی سوانح حیات کا ایسا جامع و مانع مرقع تیار کیا ہے جسے حقیقت میں غالب کی خود نوشت سوانح عمری کہنا چاہیئے۔ غالب کا خاندان ابتدائی حالات۔ غالب کی تصانیف غالب کے خصائل و شمائل۔ غرض اس جلیل القدر فرزند مشرق کا کوئی ایسا تذکرہ نہیں جس پر پوری صحت کے ساتھ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ انداز تحریر صاف سلیس، دلکش اور بیحد دلنشین ہے۔ چند نادر و نایاب تصاویر بھی اس کتاب میں شامل ہیں قیمت ۳/ مجلد ۳/۸

ملنے کا پتہ } عالمگیر بکڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

طوفانِ نوح

ناخدائے سخن، تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی مدظلہ

خیال ہیں اکث اک مزے کی نئی کہانی ہے اور ہم ہیں!
ابھی تمنا ہے اور دل ہے ابھی جوانی ہے اور ہم ہیں

غریقِ بحرِ ستم نہ کیوں ہوں یہ جانفشانی ہے اور ہم ہیں
کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں

دمِ اخیر اس کو اب نہ سوچیں یہ سوچنا چاہئے تھا پہلے
مآل کیا ہوگا زندگی کا؟ جہانِ فانی ہے اور ہم ہیں

یہ عشق پر حسن کی عنایت یہ حسن سے عشق کی ارادت
ہماری حسرت ہے اور تو ہے تری جوانی ہے اور ہم ہیں

نگاہِ الفت بھی ہو چلی کچھ کرم بھی کرنے لگا وہ ظالم
اگر یہی مہربانیاں ہیں تو کامرانی ہے اور ہم ہیں

ادا نے چھیڑا نظر نے تاکا ستم نے لوٹا غضب نے مارا
زباں جب سے کھلی ہماری یہی کہانی ہے اور ہم ہیں

بقا کا چرچا جہان بھر میں مگر بقا سے جہان خالی
خیالِ عیشِ مدام کیسا جہانِ فانی ہے اور ہم ہیں

کہاں کی مسجد کہاں کا مندر کہیں کے سجدوں کی کس کو فرصت
تمھاری چوکھٹ سے سر نہ اٹھایا یہ سرگرانی ہے اور ہم ہیں

ابھی سے توبہ ابھی سے تقویٰ ابھی سے کیا فکر دین و عقبیٰ؟
نئی امنگیں نئی ترنگیں نئی جوانی ہے اور ہم ہیں

کہاں گئے آرزوؤں کے دن کدھر گئیں حسرتوں کی راتیں
نہیں کوئی ذکر دوسرا اب یہی کہانی ہے اور ہم ہیں

پہنچ پہنچ کر فلک پہ آہیں کریں نہ تاروں میں کیوں اضافہ
کہ شام سے صبح تک شبِ غم شرر فشانی ہے اور ہم ہیں

کسے توقع تھی آئیں گے وہ کسے یقیں تھا بلائیں گے وہ
یہ خاص ان کی ہے مہربانی کہ مہربانی ہے اور ہم ہیں

اٹھا ہی دینگے نقاب اپنی دکھا ہی دینگے وہ اپنا جلوہ
نبھے گی کب تک یہ لن ترانی یہ لن ترانی ہے اور ہم ہیں

بھرے ہوئے چشمِ تر میں آنسو جگر میں بھڑکی ہوئی تپِ غم
یہ آگ ہے اور یہ ہے پانی یہ آگ پانی ہے اور ہم ہیں

فغاں تو آخر فغاں ہی ٹھہری گلہ تو آخر گلہ ہی ٹھہرا
محال ہے جس میں سانس لینی وہ ناتوانی ہے اور ہم ہیں

نئے شگوفے نہ کیوں کھلائیں جو غنچہ و گل کو دیکھ پائیں
بہار تو ہے چمن کی رانی چمن کی رانی ہے اور ہم ہیں

کبھی تو ہم یہاں وہاں کے کبھی تصور ادھر ادھر کا
سکون و راحت سے کیا تعلق کہ بدگمانی ہے اور ہم ہیں

جتا چکے دردِ دل کسی کو جواب جتائیں تو کیا جتائیں
کہی ہوئی بھی سنی ہوئی بھی وہی کہانی ہے اور ہم ہیں

بہت سے الفت میں آئے طوفاں رہا کئے نوح بھی پریشاں
مگر وہی پیہم آنسوؤں کی ابھی روانی ہے اور ہم ہیں

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی بالتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۱

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۹ء

نمبر ۵

مُلاحظات

یورپ میں خونریز جنگ ہو رہی ہے جس کا اثر ہندوستان کے اخبارات و رسائل پر بہت مہلک پڑ رہا ہے۔ کاغذ کی قیمت پہلے سے دُگنی تگنی بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ "آرٹ پیپر" کا بھاؤ تو ناقابلِ برداشت حد تک چڑھ چکا ہے۔ پریس کی سیاہی، بلاک بنانے کا کیمیائی مسالہ اور دیگر سامانِ طباعت بہت زیادہ گراں ہو چکا ہے۔ ان حالات میں معمولی پرچوں کا زندہ رہنا بالکل محال ہے چنانچہ بہت سے رسائل و جرائد زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں۔ اور باقیوں میں سے اکثر نے اپنے خاص و سالانہ نمبروں کی اشاعت بالکل روک دی ہے صفحات کم کر دیئے ہیں۔ تصویروں کی اشاعت ملتوی کر دی ہے اور کاغذ کی کوالٹی بھی گھٹا دی ہے۔ لیکن جیسا کہ قارئین کو بخوبی علم ہے۔ خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے "عالمگیر" کی مالی حالت نہایت مستحکم اور تسلی بخش ہے۔ اور ہم نہ تو اپنے رسالے کے صفحات کم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ "خاص نمبر" یا "سالانہ نمبر" کی اشاعت روک رہے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ادارہ "عالمگیر" "خدمتِ ادب" کو "جلبِ منفعت" پر ترجیح دیتا ہے اور حتی الوسع قارئین کرام پر کوئی ناجائز بوجھ ڈالنا پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ دسمبر میں ہم حسبِ معمول عالمگیر کا "معرکہ آرا خاص نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ باوجود نامساعد حالات کے ہمارے حوصلے بہت بلند ہیں اور ہم اِس اشاعتِ خصوصی پر زیادہ سے زیادہ رقم صرف کر کے اِس کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ، مفید اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں۔

عالمگیر کا خاص نمبر کیسا ہوگا؟

اِس کے متعلق سرِ دست صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ خاص نمبر کے لئے ایسی ایسی نایاب تصاویر حاصل کر لی گئی ہیں۔ جو مصوّرانہ کمالات کی پوری پوری آئینہ دار ہیں۔ مضامین اور افسانے ہندوستان کے بہترین ادیبوں سے حاصل کئے جا رہے ہیں۔

الغرض عالمگیر کا خاص نمبر حقیقی معنوں میں "خاص نمبر" ہوگا۔ اور اس کا مطالعہ انتہائی ادبی خوش قسمتی کے مُرادف ہوگا باوجودیکہ ہمارے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔ خاص نمبر کی قیمت حسبِ معمول عہ ہوگی۔ مستقل خریداروں کو یہ نمبر بالکل مفت نذر کیا جائے گا۔

اکثر مضامین، افسانے اور نظمیں موصول ہو چکی ہیں جن اہلِ قلم معاونین نے ابھی تک توجہ نہیں فرمائی وہ ۱۵ اکتوبر تک ضرور اپنے نگارشات ارسال فرما دیں۔ تاکہ مناسب جگہ پر شائع ہو سکیں۔

ماہ نومبر کے پرچہ میں خاص نمبر میں شائع ہونے والے فردوس بداماں مضامین نظم و نثر کی مکمل فہرست شائع ہوگی۔ جس سے آپ اندازہ فرما سکیں گے۔ کہ یہ نمبر کس پایہ اور معیار کا ہوگا۔

ارشاد

۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء تک

عالمگیر کا وہ خاص نمبر ۱۹۴۰ء جو دسمبر میں شائع ہوگا

بالکل مفت حاصل کر سکتے ہیں

جو ایک سال کے لیے عالمگیر کی خریداری قبول فرمائیں

اور ... علاوہ محصول ...

نیز ... منی آرڈر ...

منیجر

نوٹ:-

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ "منیجر"

آئندہ شمارہ کے مضامین کی ایک جھلک

وصلِ دوام (افسانہ)

اٹلی کا ایک سچا واقعہ۔ انگلستان کے شہرہ آفاق شاعر براؤننگ کی بہترین نظم کا ترجمہ۔ از جناب محمد انور خاں یوسف زئی۔

فرخ آباد کا غیر معروف شاعر

وحی فرخ آبادی کے دلچسپ حالات زندگی۔

از جناب پرنس جاوید قصری۔

عرب جزائر شرق الہند میں

ڈچ زبان کا ایک تحقیقی مقالہ جو ملکہ ہالینڈ کی تخت نشینی کے وقت لکھا گیا تھا اور عربی میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ از جناب حافظ سید رشید احمد صاحب ارشد مولوی فاضل و منشی فاضل۔

ماں اور بیٹی (افسانہ)

روس کے معجز نگار افسانہ نویس انطونی چیخوف کے ایک دلچسپ شاہکار کا ترجمہ۔ از جناب ذکی علیم آبادی۔

ادبیات

معلومات افزا انتقادی مضمون جس میں ادب کے ارتقا اور ماہیت پر بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ از جناب سید یوسف علی شاہ صاحب۔

روح کا انتقام (افسانہ)

پُر اسرار سنسنی پیدا کرنے والا افسانہ۔ از جناب ظفر علی خاں آبل

والد مرحوم کی یادیں!

جناب مولانا ظہر کے دلچسپ حالات زندگی جس میں ان کے سخن سنجی اور سخن گوئی پر علی الخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ از جناب انعام الحق صاحب صدیقی وجدی۔ اے۔

علاوہ ازیں

جذبات انگیز افسانے۔ لاجواب مضامین اور بلند پایہ شعرا کا کلام دلپذیر وغیرہ وغیرہ۔

اِس جنگ کے زمانہ میں بھی جب کاغذ اور سامانِ

طباعت مہنگا ہو چکا ہے "عالمگیر" نے اپنی روایات سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ بلکہ یہ پہلے سے بھی زیادہ شاندار صورت میں شائع ہو رہا ہے

ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار

سے ہندوستان بھر میں کوئی ماہوار رسالہ "عالمگیر" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج ہی مستقل خریدار بنکر دسمبر میں شائع ہونے والا خاص نمبر بھی **بالکل مفت** حاصل کیجئے

سالانہ چندہ صرف چار روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک

ہنرک اِبسن!

ناروے کے باغی ڈراما نویس کی خصوصیات

از جناب جمیل احمد صاحب بی۔اے کندھاپوری

"لاہور کے ایک ادبی پرچے میں میرا ایک مضمون "باغی ڈراما نگار ہنرک اِبسن" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا جس میں میں نے ناروے کے زندہ جاوید ڈراما نگار کے حالاتِ زندگی اور عادات و اطوار بیان کیے تھے۔ اس مختصر سے مضمون میں اسی ادیب کی نگارشات کی چند خصوصیات پر روشنی ڈال رہا ہوں" جمیل۔

"اِبسن کی تحریروں کا جو زبردست اثر انگلستان پر ہوا۔ وہ تین عظیم الشان انقلابوں، چھ خطرناک صلیبی جنگوں، دو زبردست بیرونی حملوں اور ایک قیامت خیز بھونچال سے بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا"

ناروے کے اس مایہ ناز ڈراما نگار کو یہ زبردست خراجِ تحسین جارج برنارڈ شا نے پیش کیا ہے جو نہ صرف ایک عمدہ ناقد ادب بلکہ دورِ حاضر کا سب سے جلیل القدر ڈراماٹسٹ بھی خیال کیا جاتا ہے اب اس کے قول کی صداقت کو جانچنے کیلئے لازمی ہے کہ ہم پہلے بلادِ مغرب کے تھیٹر پر سرسری نظر ڈالیں اور پھر دیکھیں کہ مصلحِ اعظم ہنرک ابسن نے دنیائے ڈراما میں کیا انقلابات پیدا کیے۔

"انیسویں صدی میں مغربی ممالک کے تھیٹر کی حالت بہت گر گئی۔ تھیٹر کے مالک کاروباری آدمی تھے جن کو صرف مالی منافع کی فکر تھی۔ وہ عوام کے پست مذاق سے واقف تھے اور انہیں کے پسند کے مطابق تماشے دکھاتے تھے پبلک زرق برق لباس، نظر فریب مناظر، دلکش گانوں، بازاری مسخرے پن، فحش نقالی، ظاہری طمطراق اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کی دلدادہ تھی یا کہانی

تھیٹر صرف انہیں چیزوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اور اُن کے نزدیک اچھے ڈراموں کی کوئی قدر نہ تھی حقیقت کی جگہ تصنع اور رسمیات نے لے لی تھی اشخاص ڈراما کو حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ ان کا ہر قول فعل اور ہنسنا بولنا رونا دھونا، چلنا پھرنا مصنوعی تھا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہیں۔ انگلستان میں باکمال ڈراما نویسوں کا کوئی سرپرست یا قدردان نہ تھا۔ اس لئے اچھے ڈراموں کی پیدائش ہی رک گئی تھی تھیٹر کے منیجر جو چیزیں امریکہ سے لاتے تھے۔ وہ ادنیٰ درجہ کے فرانسیسی کھیل کے ترجمے مبتذل مزاحیہ سنسنی پیدا کرنیوالے میلو ڈرامے یا جرائم کے متعلق تفتیشی قصے یا انگوٹھی کا راز یا پوشیدہ خزانہ کی قسم سے ہوتی تھیں"[1]

دیکھا آپ نے! یہ تھا انیسویں صدی کے یورپ کی ڈرامائی پستی کا درد انگیز نقشہ!

اب ایسے وقت ناروے جیسی غیر معروف جگہ میں اِبسن سا مصلح اور باکمال ڈراما نویس پیدا ہوا جس نے نہ صرف دنیائے ڈراما کی بنیادیں ہی متزلزل کر دیں بلکہ تمام یورپ میں انقلاب کی آگ بھی روشن کر دی۔ اس کے قلم اٹھانے سے پیشتر عروسِ ڈراما کی زلفیں بکھری پڑی تھیں۔ اپنے سحر کار قلم کی جنبشوں سے اس نے لیلائے ڈراما کا گیسو سنوار دیا۔

اب ہم یکے بعد دیگرے اُس کے ڈراموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی درخشاں خدمات کا صحیح اندازہ لگانا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن بھی ہے۔

۱۔ ابسن سے قبل جتنے ڈرامے بھی لکھے گئے وہ یا تو نظم میں تھے یا

[1] از محمد حسین ادیب مرحوم

نثرِ مرجز یعنی (Blank verse) میں اِبسن نے غالباً دنیا میں پہلی مرتبہ ڈرامے سادہ اور عام فہم نثر میں لکھنے شروع کئے۔ روزمرہ کی زندگی میں انسان نثر ہی میں باتیں کرتا ہے نظم یا نثرِ مرجز میں نہیں۔ چنانچہ موخر الذکر قسم کے ڈراموں سے ایک قسم کا تصنع، ایک اجنبیت سی مترشح ہوتی تھی مگر اِبسن نے اس کا قلع قمع کر دیا اور اب دورِ حاضر کے ڈراما نگار اسی کا تتبع کرتے ہیں۔ گالز ورردی اور شا کے ڈرامے بطورِ مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۲ - ابسن کے ڈراموں کے مکالمے حد درجہ فطری معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے کردار آپس میں اسی طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے ہم آپ روزمرہ زندگی میں ہر وقت باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ اس سے پیشتر جو ڈرامے یورپ میں لکھے گئے تھے ان کی کمزوری مکالموں سے مترشح ہو جاتی تھی۔ ڈرامے کے تمام کردار ایک ہی رنگ میں باتیں کرتے نظر آتے تھے کسی کی اپنی انفرادی شان نہ تھی۔ مگر ابسن کے کردار اس نقص سے بے نیاز ہیں اس کے کردار کے مکالموں سے ہر ایک کی علیحدہ اور انفرادی خصوصیت مترشح ہوتی ہے۔ ہر کردار خاص اپنے رنگ میں باتیں کرتا نظر آتا ہے۔

۳ - خود کلامی (Soliloquy) جیسے مہمل اور مصنوعی طریقہ گفتار کو اقلیمِ ڈراما سے خارج کرنے کا فخر بھی ابسن ہی کو ہے کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اس لغو طریقہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اپنے ڈراموں میں اس نے کبھی بھی Soliloquy یا Aside جیسے سنت دیرینہ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔

۴ - ابسن سے قبل ڈراما نگاروں میں یہ رواج عام تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح بجا یا بے جا طریقہ سے انجام کو طربیہ رنگ دے دیتے تھے خواہ اس سے ڈراما کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مگر ابسن کی نظروں میں "آرٹ" پبلک کی خوشنودی سے بدرجہا بیش قیمت تھا۔ اس لئے اس نے اس عالمگیر رواج سے بھی منہ موڑا۔ اس کے ڈراموں کے انجام بالکل فطری ہوتے ہیں اور وہ انہیں حزنیہ رنگ دینے میں بھی ہرگز تامل نہیں کرتا۔

۵ - شکسپیر کو دنیا اقلیمِ ڈراما کا تاجدار تصور کرتی ہے۔ مگر اس میں اور ابسن میں ایک عظیم فرق ہے شیکسپیر نے ہیں سٹیج پر ضرور پیش کر دیا تھا مگر ہمارے روزمرہ کے واقعات (Situations) کو نہیں۔ ابسن نے نہ صرف ہمیں ہی سٹیج پر لا کھڑا کیا بلکہ ساتھ ساتھ ہمارے (Situations) کو بھی۔ جو باتیں اس کے کرداروں کو پیش آیا کرتی ہیں۔ وہ ایسی ہی ہیں جن سے ہم خود ہر وقت اور ہر لمحہ دوچار ہوا کرتے ہیں۔

۶ - ابسن کے کردار خود تماشہ بین حضرات (Spectators) ہی ہوا کرتے ہیں اور انہیں کی زندگی کے معمولی واقعات سے اس کے کرداروں کی زندگی بھی عبارت ہوتی ہے اس نے اپنے ڈراموں کے لئے پلاٹ روزمرہ کی زندگی سے فراہم کئے ہیں۔ بے جا قتل و خون اور جنگ و جدل کے تذکروں سے اس کی دماغی کاوشیں عاری ہیں۔

۷ - ارسطو کی "وحدتِ ثلاثہ" یعنی اتحادِ عمل، اتحادِ مکان اور اتحادِ زماں کا بھی ابسن نے اپنے ڈراموں میں بطورِ خاص خیال رکھا ہے شیکسپیر نے اتحادِ عمل کی پیروی تو کی ہے مگر اتحادِ مکان و زماں کی نہیں۔

۸ - ابسن کے ڈراموں کے آغاز دوسرے ڈراما نگاروں کے انجام ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ڈراموں کو اس جگہ سے شروع کرتا ہے جہاں دوسرے ڈراما نگار ختم کرنے کے عادی ہیں۔ اسی لئے بعض حضرات نے اس کے ڈراموں کو Simplified Catastrophes, سے تعبیر کیا ہے۔ "گڑیا کا گھر" کا شمار ابسن کے بہترین ڈراموں میں ہے بلکہ بعض نقاد تو اس کو شاہکار کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر اس ڈرامے کی ابتدا بھی ابسن نے اس جگہ سے کی ہے جو دوسرے ڈراما نگاروں کے لئے عروج کا کام دیتی۔ اگر یہ ڈراما ابسن کے بجائے کسی اور کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ہوتا تو غالباً نورا (ہیروئین) کی جعلسازی کو وہ Climax قرار دیکر آخری ایکٹ میں انجام پر روشنی ڈالتا۔ مگر ابسن نے اس کو بطور (Climax) پیش نہیں کیا۔ بلکہ یہ عمل تو پردہ اٹھنے کے قبل ہی انجام پذیر ہو چکا ہے۔

۹ - آخری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں بحث و مباحثہ کا پہلو غالب رہتا ہے اور اب یہ ابسن ہی کا اثر ہے کہ دورِ حاضر میں اسی ڈرامے کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جس میں بحث کا عنصر اچھی طرح کارفرما ہو۔ برنارڈ شا اور گالزورردی جیسے باکمال ڈراما نگاروں نے بھی ابسن ہی کی پیروی کی ہے۔ اور یہ عنصر ان کے ڈراموں میں نہ صرف بدرجۂ اتم موجود ہے بلکہ دیگر عناصر پر غالب بھی ہے۔ اسی بنا پر

سے متاثر ہو کر برنارڈ شا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "شیکسپیئر کا ڈراما او تھیلو کی بقا کا سبب صرف یہ ہے کہ اسمیں فطرت انسانی کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ مگر یہ ڈراما اور بھی کامیاب اور بہتر ہوتا اگر شیکسپیئر نے اس ڈرامے میں بحث کا پہلو غالب کر کے اس چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہوتی کہ اگر ایک سیدھے سادے مُور سپاہی کی شادی کسی اطالوی خوش پسند عورت سے کر دی جائے تو ان کے درمیان تعلقات کا کیا رنگ ہے"

ایک دوسری جگہ پھر برنارڈ شا نے لکھا ہے کہ "شیکسپیئر کی بقا کا سبب وہ اوصاف نہیں جن میں وہ ویبسٹر سے مشترک ہے بلکہ وہ جن میں وہ ابسن سے مشترک ہے"۔

یورپی ممالک میں ڈراما نویسی پر ابسن کا جو اثر پڑا ہے اس کو مسٹر مارپوٹ مختصر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں "ہر جگہ تھیٹر نے قدیم روایات کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا اور مادہ اور اسلوب دونوں میں آزادی کی روش اختیار کی گئی۔ نثر نے نظم کی جگہ لے لی۔ ڈراما نویسوں نے جرأت سے کام لے کر عنصری مسائل اور روزمرہ کے معاملات پر بحث شروع کر دی حقیقت اور واقعیت نے توہم و تخیل کو اسٹیج سے بیدخل کر دیا۔ تھیٹر پہلے تماشہ عوام کی تفریح و دلبستگی کی جگہ تھا لیکن اب سمجھدار اور شائستہ لوگ بھی کھنچ کر آنے لگے۔ نئی وضع کی اداکاری شستہ مذاق اور فطرت و حقیقت کی طرف عام رجحان کے مدنظر نئے نمونے کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ پہلے اسٹیج کی حیثیت پلیٹ فارم (منبر) کی سی تھی جس پر ایکٹر خطیبانہ پیرایہ میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ انداز تکلم صریحاً تصنع و تکلف کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اب اسٹیج بمنزلہ ایک کمرے کے بن گیا جس کی چوتھی دیوار مفقود ہے اور جہاں لوگ ویسی ہی آزادی اور سادگی سے آپس میں بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے اپنے گھروں میں۔"

تاثرات

از جناب فرحت اسعدی شاہجہانپوری

وہ رنگ کہاں، وہ جوش کہاں، وہ لطفِ نگاہِ یار کہاں
اک حسرت ہی اک وحشت ہے پہلو میں وہ جانِ بہار کہاں

وہ ایک تبسم ایک نظر گلپاش فضا مخمور سماں
وہ رنگ جہاں بدلا بدلا فردوس کدھر میخوار کہاں

اب ہوش کہاں اب ہوش کسے بیباک ہے دل چالاک نظر
کچھ ہلکے ہلکے جلوے ہیں اب پردہ میں حسنِ یار کہاں

مانا کہ تصور میں ان سے میں پیار کی باتیں کرتا ہوں
تصویرِ خیالی سب کچھ ہے لیکن لطفِ گفتار کہاں

مجبوریٔ الفت کیا کہیے پیمانِ وفا کا پاس رہا
آنکھوں نے آنسو برسائے۔ اب منتِ شکوۂ یار کہاں

پہلو میں تمہارے بھی دل ہے کیوں ہنس ہنس کر تڑپاتے ہو
کچھ رحم کرو۔ کچھ غم کھاؤ۔ ہشیار ہو تم سرشار کہاں

نظریں کسی کی جادو تھا۔ بدلی جو نگہ۔ بدلی دنیا
تاریک ہے دل تاریک جہاں وہ لطف کدھر وہ پیار کہاں

پھر شکوۂ دردِ دل میں کروں۔ یہ حسرت ہے یہ ارماں ہے
ہاں کہہ بھی دو۔ ہاں کہہ بھی دو انداز سے پھر اک بار کہاں

جذبات کی دنیا میں فرحت۔ ملتے ہی نظر اک آگ لگی
تسکین و سکوں کس کو حاصل دل مائلِ صبر و قرار کہاں

دیکھ کر ــــــــ!

(از جناب اعجاز صدیقی اکبر آبادی)

راہِ حیاتِ دہر کو دشوار دیکھکر
میں چل رہا ہوں رُوح کی رفتار دیکھکر

حسرت ہے باز دید کی، اک بار دیکھکر
کیا ہو گیا یہ جلوہ گہِ یار دیکھکر

شرما گئے وہ گرمیٔ بازار دیکھکر
دونوں جہاں کو اپنا طلبگار دیکھکر

روح و نگاہ و دل کو پر انوار دیکھکر
حیران ہوں ضیائے رُخِ یار دیکھکر

خوش ہوں کہ آج حُسن کی نظریں بھی جھک گئیں
میرے مذاقِ عشق کا پندار دیکھکر

کون و مکاں سے چھپ کے اسی میں وہ آبسے
دل کو ہمارے حاملِ اسرار دیکھکر

اللہ میرے جیب و گریباں کی خیر ہو
بیچین ہوں بہار کے آثار دیکھکر

قلب و جگر میں طور ہزاروں جھلک اُٹھے
یہ کیا بنا دیا مجھے اک بار دیکھکر

اُس قیدیٔ قفس کی دل افگاریاں نہ پوچھ
رویا ہو جو بہار کے آثار دیکھکر

کیونکر کٹیں یہ سُکر کے لمحات دیکھئے
بیخود بنا گئے ہیں وہ ہشیار دیکھکر

سب کھا رہی ہیں رُوحِ چمن جانِ رنگ و بُو
اُن کو روش روش پہ نمودار دیکھکر

میں جی رہا ہوں گو نہیں جینے کی آرزو
صرف اک ترے خیال کو غم خوار دیکھکر

اعجاز جانِ زار کی کیا فکر کیجئے
ہر کس کو ہوش چشمِ فسوں کار دیکھکر

نائنجور کے بابو

ٹیگور کا ایک شاہکار

از جناب پیر خلیل احمد صاحب منشی فاضل

ایک زمانہ وہ تھا کہ نائنجور کے بابو بڑے بھاری جاگیر دار تھے اور اپنے شاہانہ اوضاع و اطوار کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے تھے وہ ڈھاکہ کی باریک ململ کے کناروں کو اس لئے کاٹ دیا کرتے تھے کہ اُن کے نازک بدنوں پر خراش پیدا نہ کریں۔ وہ اپنے بلی کے بچے کی شادی پر ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتے۔ اور خاص خاص تقاریب پر رات کو دن بنانے کے لئے ہزاروں لاکھوں لیمپ روشن کر دیتے اور چاندی کے تعبش تار بلندی سے گراتے کہ سورج کی روشنی کا پورا پورا سماں پیدا کیا جا سکے۔

یہ ایام اُن پر مفلسی کے طوفان سے قبل گزرے تھے۔ حق وراثت کا یہ تسلسل اپنے تمام شاہانہ اوضاع و اطوار سمیت جاری نہ رہ سکا۔

نائنجور کے بابو لوگوں کی مثال ایک لیمپ کی سی تھی۔ جس میں بہت سی بتیاں جل رہی ہوں۔ جب تیل ختم ہو جاتا ہے تو بتیاں بجھ جاتی ہیں۔ اسی طرح جب دولت ختم ہو گئی تو نائنجور کا خاندان بھی تباہ ہو گیا۔

ہمارا پڑوسی کیلاش بابو اسی خاندان کا آخری ٹمٹماتا چراغ ہے اُس کے پروان چڑھنے سے پہلے ہی خاندان اپنی ثروت قریباً کھو چکا تھا۔ اور روشنی بجھنے والی تھی جب اُس کا باپ فوت ہوا تو اُس کی شاندار تجہیز و تکفین کی گئی اور یہی اس روشنی کی آخری چمکار تھی۔ اس کے بعد وہ روشنی ہمیشہ کے لئے گُل ہو گئی۔ جائداد قرضوں کی ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ اور جو تھوڑی بہت باقی رہی وہ اس قدر کم تھی کہ اُس سے خاندانی وقار قائم رکھنا مشکل تھا۔

کیلاش بابو نائنجور چھوڑ کر کلکتہ چلا آیا۔ اس کا بیٹا اِس دُنیائے دُوں میں زیادہ عرصہ تک نہ جی سکا اور اپنے پیچھے ایک لڑکی چھوڑ کر مر گیا۔

کلکتہ میں ہم کیلاش بابو کے ہمسائے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ ہماری خاندانی تاریخ کیلاش بابو کی خاندانی تاریخ سے بالکل برعکس ہے۔ میرے باپ نے اپنی ذاتی محنت اور قابلیت سے روپیہ کمایا اور وہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اُس نے ضرورت سے زائد کبھی ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ اس کے کپڑے جفاکشوں والے تھے۔ اور اس کے ہاتھوں سے بھی جذبۂ محنت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس نے کبھی یہ خواہش ظاہر نہیں کی کہ روپیہ نمائشی طور پر خرچ کر کے وہ بابو کا لقب حاصل کر لے اُس نے مجھے اس قدر اعلیٰ تعلیم دی کہ میں دُنیا میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ مجھے اِس بات سے کوئی عار نہیں کہ میں نے اپنی کوشش سے ترقی کی ہے۔ کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ جو میرے صندوق میں رکھے ہوتے ہیں۔ مجھے زیادہ پسند ہیں بہ نسبت ایک عالی شجرو نسب کے جو ایک خالی صندوق میں بند ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہی سبب تھا کہ میں کیلاش بابو کے چکموں سے بہت بیزار تھا جو وہ اپنے بابو خاندان کے دیوالیہ بنک کے نام جاری کیا کرتا تھا۔

مجھے خیال تھا کہ چونکہ میرا باپ اپنے ہاتھوں سے روزی کماتا تھا۔ اس لئے کیلاش مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن درامل

صرف مجھے ہی کیلاش بابو سے نفرت تھی۔ ورنہ وہ بالکل بےضرر شخص تھا اور مجھے اُس ایسا شخص ملنا محال تھا۔ وہ غمی اور خوشی کے تمام مواقع پر اپنی ہمدردی سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اُس کی دوستانہ مسکراہٹ بوڑھے اور جوان کے لئے یکساں تھی۔ دوسروں کے خانگی معاملات کے متعلق استفسار کرنے سے وہ کبھی نہیں تھکتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے سر راہے کبھی ملتا تو اُن سے مزاج پوچھنے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کر دیتا۔ مثلاً اس طرح کہ

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا آپ بخیریت ہیں ماشی کا کیا حال ہے! اور دادا دہ کیسا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے۔ میں نے ابھی سُنا ہے کہ مادھو کے بیٹے کو بخار ہو گیا ہے۔ اب اُس کی طبیعت کیسی ہے۔ ہاں اور ہری چرن بابو کو تو میں نے بڑے عرصہ سے نہیں دیکھا۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں۔ اکھل کا کیا حال ہے۔ اور ہاں گھر کی مستورات کیسی ہیں۔"

کیلاش بابو اپنے آباؤ اجداد کی عادات کے مطابق نہایت اُجلے کپڑے پہنتا تھا۔ اس کے پاس کپڑے بہت کم تھے۔ ہر روز وہ اپنے کپڑوں کو ہوا دیتا۔ کُرتہ۔ صدری۔ کوٹ۔ پاجامہ۔ پیٹی۔ تکیہ کا غلاف حتیٰ کہ بیٹھنے کی دری بھی دھوپ میں ڈال دیتا تھا۔ ہوا دینے کے بعد وہ اُن کپڑوں کو جھاڑتا۔ اُن پر بُرش کرتا اور احتیاط سے اُنہیں تہہ کر کے رکھ دیتا تھا۔

اُس کے کمرے کا فرنیچر گو معمولی تھا مگر کمرہ میں خوب زیب دیتا تھا۔ کیلاش بابو کے پاس ملازم تو تھا کوئی نہیں۔ اس لئے اکثر اوقات وہ دروازہ بند کر کے اپنے کپڑوں پر استری کرتا اور اسی طرح دوسرے معمولی کام کرتا اور پھر دروازہ کھول دیتا اور حسبِ دستور مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اگرچہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ کیلاش بابو کے ہاتھ سے اُس آباؤ اجداد کی جاگیر جا چکی تھی مگر پھر بھی اُس کے پاس گزشتہ امارت کا کچھ سامان باقی تھا۔ چاندی کا مرتبان۔ گلاب پاش۔ عطردان چاندی کا طشت۔ قیمتی شال۔ پُرانے زمانہ کا ایک خلعت اور خاندانی پگڑی۔ گزشتہ عہدِ امارت کی یادگار تھے۔

ساہوکاروں کی دستبرد سے یہ اشیا اُس نے مشکل تمام محفوظ رکھی تھیں۔ ہر مناسب موقع پر وہ اِن اشیا کو بڑی شان سے استعمال میں لاتا تھا تاکہ نائنجور کے بابو خاندان کی عالمگیر عزت باقی رہے۔ اور ان اشیا کے مظاہرہ کا کوئی موقعہ خالی نہیں جانے دیتا تھا۔ اور اُس کے دوست بھی اِن باتوں میں مذاقیہ طور پر اُس کا دل بڑھایا کرتے تھے۔

قرب و جوار کے لوگ جلد ہی اُسے "ٹھاکر دادا" کے نام سے پکارنے لگے۔ وہ تمام اکٹھے ہو کر اُس کے پاس آجاتے اور گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھے رہتے۔ اُس کا خرچ بچانے کے لئے اس کا کوئی دوست اُس کے لئے تمباکو لاتا اور کہتا "ٹھاکر دادا آج صبح گابلا نے مجھے کچھ تمباکو بھیجا ہے۔ آپ اسے استعمال کر کے دیکھیں تو سہی کہ کیسا ہے"۔ ٹھاکر دادا حقہ کے کش لگاتا اور کہتا کہ "اچھا ہے" اور پھر وہ اپنا حال سُناتا کہ "میرے پاس ایک دفعہ ایک ایسا اعلیٰ تمباکو تھا جس کی قیمت ایک گنی فی اونس تھی۔ تھوڑا سا اب بھی میرے پاس موجود ہے اگر کوئی چکھنا چاہے تو میں ابھی لا سکتا ہوں" سب کو معلوم تھا کہ اگر اُنہوں نے تمباکو لانے کو کہا تو یا تو الماری کی چابی نہیں ملے گی اور یا پھر ٹھاکر دادا کا خاندانی نوکر گنیش اُسے کہیں رکھ کر بھول گیا ہو گا۔

"یقین مانئیے کہ ملازموں کے بغیر چیزوں کا پتہ نہیں لگتا کہ کہاں رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہمارا گنیش تو ایسا بے وقوف ہے کہ خدا کی پناہ مگر میں اسے نکالنا نہیں چاہتا"۔ اب گنیش خاندان کی آبرو باقی رکھنے کے لئے تمام الزام اپنے سر لے لیتا اور کچھ نہ بولتا۔ اس موقعہ پر لوگوں میں سے ایک کہتا "آپ اس کا خیال نہ کریں اور تمباکو نہ تلاش کریں یہ تمباکو اچھا ہے۔ دوسرا بہت تیز ہو گا"۔ اس پر ٹھاکر دادا کی خلاصی ہو جاتی۔ اور وہ آرام سے بیٹھ جاتا اور گفتگو پھر شروع ہو جاتی۔

جب اُس کے مہمان رخصت ہونے کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ اُن کی مشایعت کے لئے دروازہ تک جاتا اور سیڑھیوں کے زینہ پر اُن سے کہتا "ہاں یہ تو بتائیے کہ آپ میرے ساتھ کھانا کھانے کے لئے کب تشریف لائیں گے"۔

ان میں سے کوئی جواب دیتا "نہیں ٹھاکر دادا ابھی نہیں ابھی

جانے دو۔ پھر کوئی دن مقرر کریں گے۔
"بہت اچھا" وہ جواب دیتا۔ موسم برسات کے آنے تک انتظار کرنا چاہئے۔ ابھی تو بہت گرمی ہے اور ایسی شاندار دعوت جیسی میں آپ کو دینا چاہتا ہوں اس موسم میں دینی بہت تکلیف دہ ہوگی"۔ لیکن جب موسم برسات آجاتا تو ہم میں سے ہر ایک اس بات کی احتیاط رکھتا کہ ٹھاکر داد کو کوئی اس کا وعدہ یاد نہ دلائے۔ اور اگر کبھی اس کا ذکر ہو جاتا تو یہ کہہ دیا جاتا کہ آجکل بارشیں بہت ہیں۔ ان کے ختم ہونے پر دیکھا جائے گا۔ اور اسی طرح دن گزر جاتے۔

ٹھاکر داد کا مکان اس کے درجہ کے لحاظ سے بہت چھوٹا تھا۔ اور ہم اس بات میں اس سے ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور اس کے دوست اسے یقین دلاتے کہ اس کی تکالیف کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہ کلکتہ میں ایک عمدہ اور مناسب رہائشی مکان ملنا قریباً قریباً ناممکن ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ برسوں سے وہ ٹھاکر داد کے لئے مناسب مکان تلاش کر رہے تھے۔ مگر کوئی دوست ایسا بیوقوف نہیں تھا کہ اسے مکان مل جاتا۔ ٹھاکر داد ایک آہ سرد بھر کر پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہہ دیتا "آہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اسی معمولی مکان میں گزارہ کرنا پڑیگا" اور اس کے بعد یہ بھی کہتا کہ "آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے دوستوں سے دور نہیں رہ سکتا" اور یہ سن کر سب مطمئن ہو جاتے۔

کسی نہ کسی وجہ سے یہ تمام باتیں میرے لئے سخت تکلیف دہ تھیں میں خیال کرتا ہوں کہ اس کا سبب یہ تھا۔ کہ جب ایک شخص نوجوان ہو تو بے وقوفی اس کی نظر میں سب جرائم سے زیادہ سنگین جرم معلوم ہوتی ہے۔ کیلاش بابو بحقیقت بے وقوف نہ تھا۔ اور خانہ داری میں ہر کوئی اس سے مشورہ لینا پسند کرتا تھا۔ لیکن نانجور کے متعلق اس کی باتیں سراسر لغو اور بعید از عقل معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی پاس داری کی وجہ سے کوئی شخص اس کی انوکھی باتوں کی تردید نہیں کرتا تھا۔

جب لوگ اس کے سامنے نانجور کی بڑائی اور شاندار کارناموں کا مبالغہ آمیز تذکرہ کرتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے ان پر یقین کر لیتا اور یہ کبھی خیال بھی نہ کرتا کہ لوگوں کو دراصل اس پر اعتبار ہی نہیں ہے۔

میں جب خالی الذہن ہو کر ان تمام واقعات پر غور کرتا تو مجھے خیال آتا کہ کیلاش بابو سے نفرت کی ایک گہری وجہ میرے گوشۂ دل میں مرکوز ہے جو میں آگے چل کر بیان کرونگا۔

اگرچہ میں ایک پرادی کا لڑکا تھا اور کالج میں وقت ضائع کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کوشش کر کے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری بالکل چھوٹی عمر ہی میں حاصل کر لی میری جوانی بے داغ تھی۔ میری شکل و شباہت بہت اچھی تھی حتیٰ کہ میں اپنے آپ کو اگر خوبصورت کہوں تو یہ خود پسندی ہوگی۔ مگر حقیقت سے دور نہیں۔ کہ میرے والدین مجھے بنگال کے نوجوانوں میں سے اعلیٰ قابلیت کا گردانتے تھے۔ مجھے بھی اس کا علم تھا اور میں نے ارادہ کیا ہوا تھا کہ میں اس بنا پر کسی اعلیٰ خاندان ہی میں شادی کرونگا جو میرے درجہ اور لیاقت کے برابر ہو جب میں اپنی ہونے والی بیوی کا تصوّر کرتا تو میرے ذہن میں ایک دولتمند باپ کی اکلوتی لڑکی آتی جس کے حسن و جمال کا ثانی روئے زمین پر ڈھونڈنا مشکل ہو چنانچہ شادی کے لئے مجھے کئی جگہ سے پیغامات بھی آئے اور بھاری بھاری رقوم بھی پیش کی گئیں۔ لیکن کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جسے میں اپنے لئے مناسب خیال کرتا۔ مجھے بھوانی کے اس شعر پر یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ ——

"اس دنیا کے لامتناہی زمان اور غیر مختتم مکاں میں ممکن ہے کہ کوئی ایسی ہستی پیدا ہوئی ہو جو میری سنہری قسمت میں حصّہ دار ہو سکے"

لیکن کم از کم بنگال ایسے محدود صوبہ اور موجودہ زمانہ میں تو یہ مشکل ہی نظر آتا تھا۔ کہ کوئی ایسی لاثانی ہستی موجود ہو۔ اس عرصہ میں مختلف والدین میری تعریف کے گن گایا کرتے تھے اور خواہ مجھے ان کی لڑکی پسند آئے یا نہ آئے مگر ان کا اسے میری قربانگاہ محبت پر پیش کرنا ہی میرے لئے مسرت کا باعث تھا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ خواہ دیوتا ہم پر مہربان نہ ہوں ہمیں ان کے لئے قربانیاں کرنی چاہئیں یہی سوال میرے دل میں سمایا ہوا تھا۔ اور میں بھی اپنے آپ کو انسانی دیوتا کے مقام پر سمجھتا تھا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ ٹھاکر داد کی صرف ایک پوتی تھی میں نے اسے کئی دفعہ دیکھا تھا۔ مگر اسے کبھی خوبصورت نہیں سمجھا تھا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میرے قابل ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا۔ کہ کسی نہ کسی دن کیلاش بابو اسے

میرے سامنے شادی کے لئے اسی طرح پیش کرے گا جس طرح دیوتا کے آگے نذر پیش کی جاتی ہے۔ درحقیقت کیلاش بابو سے میری نفرت کی وجہ بھی یہی تھی۔ کہ ابتک اُس نے اپنی پوتی کا رشتہ مجھ سے کیوں نہیں کیا۔ میں نے سُنا تھا کہ ٹھاکر دادا اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ نانجور کے بابوؤں نے کبھی بخشش کے لئے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی کسی سے نہیں کہا کہ میری لڑکی سے بیاہ کرے خواہ وہ ساری عمر ہی بن بیاہی کیوں نہ بیٹھی رہے۔ میری چنگاری سُلگ اُٹھنے کو ہوتی تھی لیکن میں اپنے آپ پر قابو رکھتا اور یہ سب باتیں صبر سے برداشت کر لیتا۔ کیونکہ میں بہت ہی شریف آدمی تھا۔

جس طرح بجلی کی چمک کے بعد کڑک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح میری عادت میں یہ بات داخل تھی کہ غصّے کے بعد مجھ میں کچھ خوش مذاقی آجاتی تھی۔ بے شک میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ میں صرف اپنا غصہ نکالنے کے لئے بوڑھے آدمی کو سزا دیتا۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے تک میں خاموش رہا۔ لیکن ایک دن ایک ایسی خوش کن تجویز میرے ذہن میں آئی کہ میں اس پر عمل پیرا ہونے کی خواہش کو روک نہ سکا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ کئی دوست کیلاش بابو کو خوشامد سے بیوقوف بنایا کرتے تھے۔ گورنمنٹ کا ایک پنشن یافتہ افسر کیلاش بابو سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جب کبھی میں چھوٹے گورنر صاحب سے ملتا ہوں تو وہ مجھ سے ہمیشہ نانجور بابو کے خاندان کے تازہ حالات پوچھا کرتے ہیں اور چھوٹے لاٹ صاحب کی رائے ہے کہ کلکتہ بھر میں معزز خاندان صرف دو ہیں۔ ایک تو مہاراجہ آف کاشی پوری کا اور ایک نانجور کے بابو کا۔ جب یہ دروغگوئی کیلاش بابو کو سُنائی جاتی تو وہ پھُولا نہ سماتا۔ اور بار بار اِس کہانی کو دہراتا۔ اور جب کبھی وہ گورنمنٹ کے اِس پنشن یافتہ آدمی کو ملتا تو وہ گفتگو کے دوران میں یہ بھی پوچھتا کہ ہاں یہ تو بتائیے کہ چھوٹے لاٹ صاحب کیسے ہیں۔ واقعی یہ بات آپ نے اُن سے کہی۔ مجھے سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ ہاں اور میم صاحبہ کیسی ہیں اور اُن کے بال بچوں کا کیا حال ہے۔ کیا وہ بھی سب بخیریت ہیں۔ یہ بہت اچھی چیز ہے جب آپ ملیں تو اُنہیں میرا سلام ضرور پہنچا دیجئے۔"

کیلاش بابو کی دلی خواہش تھی کہ لاٹ صاحب سے کبھی نہ کبھی جا کر ملاقات کروں اور اس کا کئی دفعہ ہمارے روبرو اس نے اظہار بھی کیا تھا۔ آپ یقین کیجئے کہ کلکتہ میں بڑے لاٹ صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب کئی آئینگے اور چلے بھی جائیں گے۔ اور دریائے ہگلی میں سے بہت سا پانی گزر جائے گا پیشتر اس کے کہ نانجور کے بابو کی قسمت اتنی جاگے کہ وہ گورنر سے جا کر ملاقات کر سکیں۔

ایک دن میں اُسے الگ لے گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے اُس سے کہا "ٹھاکر دادا میں کل لیوی گیا تھا اور چھوٹے لاٹ صاحب نانجور کے بابو لوگوں کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ کیلاش بابو آج کل شہر ہی آئے ہوئے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اُنہیں یہ سُنکر کس قدر تکلیف ہوئی کہ آپ ابتک اُن سے نہیں ملے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں تمام آئینی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آج ہی بعد دوپہر کیلاش بابو سے ملاقات کرنے جاؤنگا۔"

کوئی اور ہوتا تو میری اس سازش پر فوراً اطلاع پا لیتا۔ اور اگر یہ کسی اور کے خلاف ہوتی تو کیلاش بابو خود بھی اُسے سمجھ لیتا۔ لیکن اِن حالات میں کہ اُس نے اپنے پنشن یافتہ دوست سے چھوٹے لاٹ صاحب کا ذکر سُنا تھا اور وہ خود بھی مبالغہ سے گفتگو کرتا تھا۔ اس لئے چھوٹے لاٹ صاحب کی ملاقات اُسے بالکل اچنبھا نہ معلوم ہوئی۔ چھوٹے لاٹ صاحب کا نانجور کے بابو لوگ کے مکان پر آنا اُس نے معمولی بات خیال کیا۔ اس خبر کو سُن کر خوشی کے مارے اُس کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ مگر ملاقات کی ہر تفصیل اُس کے لئے پریشان کُن تھی۔ بالخصوص انگریزی زبان سے ناواقفیت اُس کیلئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی تھی۔ اِس مشکل کا حل اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے۔ رؤسا کیلئے ضروری ہے کہ وہ انگریزی سے نابلد ہوں۔ چھوٹے لاٹ صاحب اپنے ساتھ ایک ترجمان لائیں گے اور اُنہوں نے کہا ہے کہ یہ ملاقات بالکل پرائیویٹ ہوگی۔

دوپہر کے وقت جب ہمارے اکثر ہمسائے اپنے کاروبار میں مشغول تھے اور باقی سو رہے تھے ایک گھوڑا گاڑی کیلاش بابو کے مکان کے سامنے آکر ٹھیری۔ دو باوردی نوکر سیڑھیوں کے اوپر چڑھ آئے اور اُنہوں نے بلند آواز سے اطلاع دی "چھوٹے لاٹ صاحب

تشریف لا رہے ہیں"۔ کیلاش بابو اُن کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے خاندانی امارت کے تمام نشان زیب بدن کئے ہوئے تھے۔ اس کا لباس اور اس کی پگڑی اُس کی قدیم خاندانی امارت ظاہر کرتی تھی۔ ایک جانب گنیش ہر کیلاش بابو کے بہترین کپڑوں میں ملبوس تھا ایستادہ تھا۔

جب چھوٹے لاٹ صاحب کے آنے کی اطلاع ملی تو کیلاش ہانپتے کانپتے دروازے کی طرف بھاگ کر گیا اور چھوٹے لاٹ صاحب کو لگاتار سلام کرتے ہوئے لے آیا۔ یہ چھوٹے لاٹ صاحب بھیس بدلے ہوئے میرا ایک دوست تھا جونہی وہ اندر داخل ہوا۔ کیلاش بابو ہر قدم پر سرنگوں ہو کر اُسے سلام کرتا اور جہاں تک ممکن تھا اس سے پیچھے رہتا۔ اُس نے اپنے خاندان کی ایک قدیم شال ایک تخت کرسی پر بچھائی ہوئی تھی اس پر اس نے چھوٹے لاٹ صاحب کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے بعد کیلاش بابو نے اُردو میں ایک مسلسل تقریر کی۔ کیونکہ اردو صاحب لوگوں کی "عدالتی زبان" ہے۔

اس کے بعد اُس نے اشرفیوں کا ایک توڑا سونے کی سینی میں رکھ کر چھوٹے لاٹ صاحب کی خدمت میں نذر گزرانا۔ یہ توڑا کیلاش بابو کے خاندان کی پھوٹی ہوئی قسمت کی یادگار تھا۔ گنیش جس کے چہرہ پر خوف کے آثار نمایاں تھے خوشبودار عطر چھوٹے لاٹ صاحب پر چھڑک رہا تھا۔ اور گلاب کے عطردان سے عطر لیکر اس کی پیٹھ پر ملتا تھا کیلاش بابو نے کئی دفعہ اس بات کا اظہار کیا کہ افسوس ہے میں اپنی خاندانی امارت اور شان و شوکت کے ساتھ استقبال نہیں کر سکا۔ اگر آپ ہماری جاگیر پر نانجور میں آتے تو پھر میں آپ کے شایانِ شان استقبال کرتا۔ کلکتہ میں تو میں ایسا ہوں جیسے مچھلی پانی سے باہر ہوتی ہے۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی رسم و رواج کے مطابق کمرے کے اندر ٹوپی اُتار دینی چاہئے تھی۔ لیکن میرے دوست نے شناخت کے ڈر سے اپنی ٹوپی سر سے نہ اُتاری تھی۔

دس منٹ کی ملاقات کے بعد میرا دوست جس نے زیادہ تر اپنے سرکی جنبشوں سے باتیں کی تھیں جانے کیلئے اُٹھا۔ دونوں باوردی نوکروں نے جیسا کہ پہلے سے تجویز کی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ اشرفیوں کا توڑا۔ سونے کا طشت خاندانی شال چاندی کا گلاب پاش اور عطردان یہ سب چیزیں اُٹھا لیں اور شاہانہ انداز سے انہیں گاڑی میں رکھ لیا۔ کیلاش بابو نے خیال کیا کہ چھوٹے لاٹ صاحب محض رسمی طور پر یہ کر رہے ہیں۔

میں یہ تمام کارروائی پاس کے کمرے سے دیکھ رہا تھا۔ میری پسلیوں میں ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے درد ہو رہا تھا جب میں اپنی ہنسی کو نہ روک سکا تو ایک دور کے کمرے میں بھاگ کر چلا گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کمرے کے ایک گوشہ میں ایک نوجوان لڑکی زار و قطار رو رہی ہے۔ یہ کیلاش بابو کی پوتی کُسم تھی۔

جب اُس نے میرے قہقہے کی آواز سُنی تو وہ جذبات میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ انگارا ہو گیا۔ اُس نے اپنی چمکدار بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالیں۔ گویا اُن سے بجلی کے شرارے نکل رہے تھے۔ اُس نے رونا ضبط کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا "مجھے بتاؤ کہ میرے دادا نے تمہیں کیا تکلیف دی ہے اور تم اُسے دھوکہ دینے کے لئے کیوں آئے تم یہاں آئے ہی کیوں؟ کیوں ......؟"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور ہچکیاں لینے لگی میری ہنسی یک لخت رُک گئی۔ یہ بات کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ تمام کارروائی میں مذاق کے سوا بھی کوئی اور پہلو تھا۔ اس تصویر کا کوئی دوسرا رُخ بھی تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس نازک دل کو سخت ٹھیس لگائی ہے۔ میرا سفّاکانہ عمل مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں کمرے سے اِس طرح کھسک گیا۔ جس طرح ایک کتّا چابک کھا کر نکلتا ہے۔

اب تک میرا خیال تھا کہ شادی کے بازار میں کیلاش بابو کی پوتی کُسم ایک ایسا مال ہے جو خاوند کی تلاش میں بے سُود پڑا ہوا ہے۔ لیکن اب مجھ پر منکشف ہوا کہ اس کمرے کے گوشہ میں ایک انسانی دل دھڑک رہا ہے۔ اُس رات کے اکثر حصّہ میں مجھے بالکل نیند نہ آئی میرے دل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ علی الصبح میں کیلاش بابو کے مکان پر گیا اور چوری کا تمام مال ساتھ لیتا گیا۔ میں نے دروازہ کے باہر انتظار کیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں سیڑھیوں کے اوپر کیلاش بابو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازے پر سے میں نے آواز سُنی "کُسم

بڑے شوق سے کہہ رہی تھی ——

"پیارے دادا جان! مجھے وہ تمام باتیں پھر سناؤ جو آپ سے کل چھوٹے لاٹ صاحب نے کہی تھیں۔ ایک حرف بھی نہ چھوڑنا۔ میں اسے دوبارہ سننے کیلئے بیتاب ہو رہی ہوں۔"

دادا کو کسی انگیخت کی ضرورت نہ تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی اور مسرت سے دمک رہا تھا۔ اُس نے نہایت فخر سے اپنی ملاقات کے کوائف بیان کیے۔ کسم ہمہ تن گوش ہو کر تمام باتیں سن رہی تھی۔ اور اُس نے بالکل کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے بوڑھے میاں کے دل میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو سکتی۔

میرا دل اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں چپ چاپ دروازہ میں کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ ٹھاکر دادا چھوٹے لاٹ صاحب سے اپنی "حیرت انگیز ملاقات" کا مبالغہ آمیز حال بیان کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے چرایا ہوا مال لیکر لڑکی کے پاؤں پر رکھدیا اور بغیر کچھ کہے سنے واپس آگیا۔

دوسرے دن میں پھر سیر کے لئے گیا۔ میرا پرانا طریق تھا کہ میں بغیر سلام کئے ہی ٹھاکر دادا کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ لیکن آج میں نے جھک کر سلام کیا۔ اس کے پاؤں چھوئے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹھاکر دادا نے خیال کیا ہوگا کہ چھوٹے لاٹ صاحب کی ملاقات کی وجہ سے میں نے یہ آداب ملحوظ رکھے ہیں۔ ٹھاکر دادا بہت خوش ہوا اور محبت اور اطمینان کے جذبات اُس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔ اس کے دوست اس کے پاس پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ انہیں لفٹنٹ گورنر کی ملاقات کا حال مزید رنگ آمیزی اور مبالغہ سے سنا رہا تھا۔ چھوٹے لاٹ صاحب کی ملاقات اپنی طوالت اور اپنی اہمیت میں ایک تاریخی یادگار بن گئی تھی۔ جب دوسرے ملاقاتی رخصت ہو گئے تو میں نے اس سے عاجزانہ درخواست کی کہ میرا نکاح اپنی پوتی کسم سے کر دے۔ اور یہ بھی کہدیا کہ اگرچہ میں آپ ایسے ذی مرتبہ اور عالیشان خاندان میں شادی کرنے کا وہم بھی نہیں کر سکتا مگر پھر بھی...... وغیرہ وغیرہ"

جب میں نے اپنی بات کھول کر بیان کی تو بوڑھے آدمی نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ اور خوشی سے بے تاب ہو کر بولا ——

"میں ایک غریب آدمی ہوں اور اس قدر خوش قسمتی کی مجھے کبھی اُمید نہ تھی"

یہ کیلاش بابو کی زندگی میں پہلا اور آخری موقع تھا۔ کہ اُس نے اپنی غربت کا اقرار کیا۔ اور یہ بھی اُس کی زندگی میں پہلا ہی موقع تھا کہ خواہ ایک لمحہ کے لئے ہی سہی وہ بالکل بھول گیا کہ وہ ٹائیگور کے ایک معزز خاندان کا بیٹا ہے —— (ترجمہ)

رازِ حقیقت

(از جناب پنڈت امرناتھ صاحب ساحرؔ دہلوی یادگار غالبؔ مرحوم)

تنگ ہے جان پہ میری قفسِ تن میرا
طائرِ قدس ہوں طوبیٰ ہے نشیمن میرا

حاصلِ کشتِ عمل سے ہے طبیعت بیزار
شررِ عشق کا محتاج ہے خرمن میرا

دلِ عشّاق ہے گنجینۂ حسنِ معنی
دل میں ہر ذرّہ کے درپردہ ہے مسکن میرا

سینہ کے داغ سے پاتا ہے نمو باغِ ارم
گُل کھلاتا ہے چراغِ تہِ دامن میرا

دل ہے آتشکدہ اور نار ہے گلزارِ خلیل
شررِ عشق سے سرسبز ہے گلشن میرا

مستیِ عشق میں کونین ہے فردوسِ نگاہ
جلوۂ حُسن سے معمور ہے گلشن میرا

ہے سو ہے میں ہوں نہ تو اور نہ میرا تیرا
کعبہ ہے دیر مرا شیخ برہمن میرا

دمبدم چشمۂ خورشید سے لیتا ہوں ضیا
نُور برسے جو نچوڑیں سرِ دامن میرا

ساحرؔ آئینہ مرا صاف ہے اور عکس پذیر
نہ کوئی دوست ہے درپردہ نہ دشمن میرا

جارج واشنگٹن

سرزمینِ امریکہ کی آزادی کا علمبردار

نہائی تھیں لہو میں جب بہاریں حُبِّ قومی کی
تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زارِ حُبِّ انسانی (جوشؔ)

(از محترمہ صدّیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی)

جارج واشنگٹن کون تھا؟ یہ دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اس کا نام زندہ جاوید ہے۔ اس کے زرّیں کارناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جن کو دُنیا ابد تک فراموش نہیں کرسکتی۔ اُس نے اپنے ملک کو جہالت اور غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد کیا امریکہ کا ذرّہ ذرّہ اس کا رہینِ منّت ہے۔ اُس نے اپنے وطن کی سرزمین کو اپنے لہو سے سینچ کر اُس عالمِ عروج پر پہنچایا جس کی مثال دنیا کم پیش کرسکتی ہے۔

وہ ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوا اور تقریباً پندرہ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شمالی امریکہ کی ریاست ورجینیا میں دریائے پوٹومیک کے کنارے آکر آباد ہوا۔ اس کا وطن انگلستان تھا۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا غربت کی وجہ سے جارج واشنگٹن کی پیدائش سے تقریباً ایک صدی قبل اس کے باپ دادا اپنا وطن انگلستان چھوڑ کر تلاشِ معاش کی غرض سے مغربی ممالک میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ قبل اس کے کہ واشنگٹن کے حالات پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے امریکن باشندوں کے طرزِ زندگی اور ذریعہ معاش کے متعلق تھوڑا بہت بتلا دیا جائے۔

یہاں بڑے بڑے گھنے جنگلات تھے۔ تمباکو اور روئی کی کاشت ہوتی تھی۔ سیاہ فام حبشی غلام گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ وہاں کے باشندے ان حبشی غلاموں پر بے انتہا مظالم کرتے تھے اور یہ مظالم کچھ اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ بعض اوقات درست کام نہ کرنے کے جرم میں اُنکا سفید پوش آقا اُنہیں فروخت کر دیتا تھا۔ جب کوئی ایسا سانحہ پیش آتا تو جہاں تک ممکن ہوسکتا حبشی غلام آپس ہی میں چندہ جمع کر کے اپنے مظلوم بھائی کو خرید لیتے تاکہ اُسے کسی دُور دراز ملک میں نہ بھیج دیا جائے۔

واشنگٹن کا مکان ماؤنٹ ورنون کی ایک نظر فریب چوٹی پر واقع تھا جسکے نیچے بہت گہرائی میں دریائے پوٹومیک بڑی شان و شوکت سے اپنے پیچدار راستوں کو طے کرتا ہوا گھنے جنگلات کی طرف بہہ رہا تھا۔ جارج نے اپنے ایّامِ طفلی کے بیشتر لمحات انھیں حسین اور رُوح فرسا وادیوں میں گُزارے۔ وہ اس کے خوشگوار چشموں اور فرحت بخش تالابوں میں مچھلی کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور بسا اوقات شکار کھیلتا ہوا دُور گھنے جنگلات کی طرف نکل جاتا۔ اس طرح سے اُس کی چند حبشی عورتوں سے بھی ملاقات ہوگئی تھی جن کو وہ اکثر اپنے سیاہ فام چھوٹے چھوٹے معصوم بچّوں کے ساتھ جھونپڑیوں کے دروازے پر بیٹھے دیکھا کرتا تھا جب جارج کو یہ پتہ لگتا کہ کوئی حبشی غلام کسی دور دراز ملک میں بھیجا جارہا ہے۔ جہاں پہنچکر تا زیست وہ اپنی بیوی اور بچّوں سے نہ مل سکے گا

تو اُسے انتہائی صدمہ ہوتا۔

جارج کے مکان سے شمال کی جانب ریاست پنسلوینیا واقع تھی جہاں ولیم پن کا خاندان آباد تھا۔ وقتاً فوقتاً دور دراز ملکوں سے لوگ اپنے گھربار کو الوداع کہکر پہاڑوں کی پرخطر وادیوں سے گزرتے ہوئے تلاش معاش کی غرض سے اس طرف آنکلتے تھے۔ اسی طرح ماؤنٹ ورنون کے راستے سے بھی اکثر فرانسیسی قافلے آتے رہتے جو دریائے مسس پی اور اوہیو کے کنارے قیام پذیر ہوتے اور وہاں انھوں نے قلعے تعمیر کئے ان کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر وہاں کے باشندوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر فرانسیسی اسی طرح اپنا قبضہ جماتے رہے تو یقیناً ایک روز فرانسیسی اور پنسلوانیا کے درمیان ایک جنگ عظیم چھڑ جائے گی اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں ہرگز نہیں سماسکتیں"۔

(۲)

ابھی جارج واشنگٹن نے عالم شباب میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ ورجینیا کے حکمران انگلستان کے بادشاہ جارج نے اُسے حکم دیا کہ وہ فرانسیسیوں کو آگاہ کردے کہ اگر وہ جلد مسس پی اور اوہیو کے کنارے کے مقامات چھوڑکر فرانس واپس نہ چلے گئے تو مجبوراً انگریزوں کو اُن کے خلاف تلوار اُٹھانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ کام بہت خطرناک تھا کیونکہ دریائے اوہیو کے کنارے تک پہنچنے کے لئے بڑے بڑے گھنے جنگلات کے درمیان سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنی تھی۔ علاوہ ازیں ان جنگلات میں مختلف مقامات پر انڈینز آباد تھے جو فرانسیسیوں کے بہت دوست تھے۔ پس اگر وہ کسی طرح واشنگٹن کو پکڑ پاتے تو یقیناً غریب نوجوان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ ان خطرات کے باوجود بہادر واشنگٹن قطعی ہراساں نہ ہوا اور ایک جوان مرد انسان کی طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالکر اپنا قومی فرض ادا کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہوگیا۔ جب فرانسیسیوں کے پاس انگریزوں کا یہ پیغام پہنچا تو انہوں نے اس کی قطعی پروا نہ کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ انگریزی فوج کے جنرل کو شکست ہوئی۔ واشنگٹن کو اس کا بہت صدمہ ہوا اور انگریزوں کو بھی بہت شرمندگی ہوئی۔ جس پر انگلستان کے وزیر اعظم ولیم پٹ اور ایک بہادر اور قدآور جوان جیمس ولف اور فرانسیسی جنرل مونٹکام درمیان شہر کیوبک میں جو دریائے سینٹ لارنس کے کنارے آباد ہے ایک عظیم جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں دونوں بہادر جنرل مارے گئے۔ اس لڑائی سے دریائے مسس پی اور اوہیو کے کنارے کا تمام علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ انگریزوں نے فرانسیسی پادریوں کو سینٹ لارنس کے قرب وجوار میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس لڑائی میں واشنگٹن نے بھی نمایاں حصہ لیا۔

(۳)

یہ جنگ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ورجینیا اور دریائے پوٹومیک سے شمال کی جانب کئی سو میل کے فاصلے پر ہوئی۔ اس کے بعد جارج اپنے گھر پر پُرامن زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا اور اب ماؤنٹ ورنون اُس کی ملکیت میں تھا۔ جارج واشنگٹن بہت حسین وجمیل قدآور انسان تھا اس کا قد چھ فٹ تین انچ تھا۔ بال لانبے چمکدار تھے۔ چہرہ چوڑا اور گلابی رُخسار تھے۔ اب اُس کا کام کاشت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر کپاس اور تمباکو کے کھیتوں کی نگہداشت کیلئے جایا کرتا جہاں حبشی غلام انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے تھے۔ واشنگٹن اُن کے ساتھ نہایت رحمدلی اور ہمدردی سے گفتگو کرتا۔ اور انتہائی خوش اسلوبی سے پیش آتا۔ اس وجہ سے وہ لوگ بھی واشنگٹن سے بےانتہا خوش تھے اور اس کا کام بہت محنت اور توجہ سے کرتے تھے۔ واشنگٹن نے وہاں کی رسم کے مطابق کبھی غلاموں کو فروخت کرکے اپنی ہوا وہوس کی جیبیں گرم نہیں کی۔ وہ بچپن ہی سے آزادی کا دلدادہ تھا اور چاہتا تھا کہ دُنیا کا ہر فرد آزاد رہے۔ لیکن کیا کرتا وہ مجبور تھا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ کپاس کے کھیتوں کا کام حبشی غلاموں کے بغیر کسی طرح بھی ہونا ممکن نہیں۔

اس زمانہ میں امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں سے بہت سی ریاستیں انگریزی حکومت کے زیرنگیں تھیں۔ ورجینیا میں ایک پارلیمنٹ بھی قائم تھی جس کا نام ہاؤس آف برگیس تھا۔ واشنگٹن کئی بار اس پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ ابتدا میں اس پارلیمنٹ نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔ لیکن تقریباً ۱۷۶۵ء میں انگریزی حکومت کے خلاف پارلیمنٹ میں کچھ سرگوشیاں

شروع ہوئیں۔ اس زمانہ میں وزیر اعظم برطانیہ اور جارج سوم نے امریکہ کے باشندوں سے یہ مطالبہ کیا کہ پچھلی جنگ جو انہوں نے فرانس سے لڑی محض تحفظ کی بنا پر تھی۔ اور اس میں حکومت کا بہت سا روپیہ خرچ ہوا۔ لہٰذا امریکہ کی متحدہ ریاستوں کو لازم ہے کہ وہ اس کے صلے میں انگریزی حکومت کو کچھ رقم دیں۔ جارج واشنگٹن اور اس کے دوستوں نے انگریزوں کے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیا۔ پنسلوانیا۔ میری لینڈ اور موساکونٹ کی اسمبلیوں کے ممبروں نے بھی واشنگٹن کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن بعد میں جب انگلستان کی پارلیمنٹ نے ادائگی رقم کی شرائط خود ہی طے کرلیں تو جارج واشنگٹن اور دیگر ممبروں کو بہت غصہ آیا۔ آخر اس نے تمام ریاستوں کی طرف سے حکومت برطانیہ کو اطلاع دی کہ "چونکہ امریکہ کے باشندوں کو انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبروں کو ووٹ دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس لئے انگلستان کی پارلیمنٹ بھی ان پر کسی قسم کا ٹیکس عاید کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر ورجینیا اور دیگر ریاستوں کی اسمبلیوں میں بہت سرگرمی سے بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ چند ریاستیں جو انگریزی حکومت سے خوفزدہ تھیں انہوں نے اپنی اسمبلیوں کا اجلاس کچھ عرصے کے لئے ملتوی کردیا لیکن جب ریاست ورجینیا کا حکمران ہاؤس آف برگیس بند کرنے کے لئے آیا تو اس کے ممبروں نے اسمبلی برخاست کرنے سے انکار کردیا۔ اور خاموشی سے اٹھکر قریب کے ایک گاؤں میں چلے گئے۔ جس کو "ریلے" کہتے تھے (مسٹر والٹر ریلے ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں پہلی بار انگریزی جہاز لیکر ریاست ورجینیا میں آیا تھا اور اسی مکان میں مقیم ہوا تھا۔ اس لئے اس مکان کو "ریلے" کہتے تھے) یہاں بیٹھکر انہوں نے اطمینان سے اس مسئلہ پر غور و خوض کیا۔

(۴)

اس مجمع میں جارج واشنگٹن بالکل خاموش تھا۔ اس لئے کہ اسے اپنے باپ دادا کے وطن انگلستان سے بہت محبت تھی۔ کافی دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد سب نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ اس جھگڑے کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے ہمیں انگلستان سے فیصلہ کن جنگ کرنی چاہیئے۔ واشنگٹن نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ابھی ہماری طاقت بہت کم ہے۔ ہم کسی طرح ابھی انگریزوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے ہمیں کوئی اور تدبیر سوچنی چاہیئے۔

اس زمانہ میں امریکہ تجارتی لحاظ سے بہت پست تھا۔ تمام ضروریات کی چیزیں انگلستان سے آتی تھیں۔ ملک کا غریب طبقہ عام طور پر ہاتھ کا کتا ہوا کپڑا استعمال کرتا تھا۔ مگر ملک کے رؤسا زیادہ تر یارک شائر، لنکاشائر اور اسپیشل فیلڈ (لندن) کے بنے ہوئے اعلیٰ ریشمی کپڑے پہنتے تھے۔

اسمبلی کے ممبروں نے عہد کیا کہ وہ آئندہ اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرینگے۔ تاکہ ان کی تجارت و صنعت و حرفت کو فروغ ہو اور ساتھ ہی ساتھ انگریزوں پر بھی ان کی ناخوشی کا اظہار ہو جائے۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ بہت سے لوگ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکے لیکن جارج واشنگٹن بدستور اپنے عہد پر قائم رہا اور اس نے پھر کبھی انگلستان کی بنی ہوئی کوئی چیز استعمال نہ کی۔

کئی سال گزر گئے۔ لیکن حکومت برطانیہ نے انہیں اپنی مرضی سے اپنے اوپر ٹیکس لگانے کی اجازت نہ دی۔ واشنگٹن کو اس سے بعد

صدمہ پہنچایا۔ اُسے اپنے وطن سے بہت محبت تھی اور ساتھ ہی ساتھ وہ آزادی کا بھی دلدادہ تھا۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ ضرور ایک دن ایسا آئیگا۔ جب امریکہ کو انگلستان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ پس واشنگٹن نے ورجینیا کے نوجوانوں کی فوجی تعلیم کا انتظام کیا۔ اُس وقت تک امریکہ کے باشندے کاشت کے علاوہ کچھ نہ جانتے تھے لیکن واشنگٹن کی محنت اور جانفشانی نے ان کو بہت جلد بہادر سپاہی بنا دیا۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ریاست میساکوزٹ کے شہر بوسٹن میں یہ خبر موصول ہوئی کہ انگلستان کے کچھ چائے کے جہاز بوسٹن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے ہیں۔ لیکن بوسٹن کے باشندوں نے چائے خریدنے سے انکار کر دیا۔ اور بعض حضرات نے یہاں تک کیا کہ اُن کے چند چائے کے بورے غرقِ آب کر دیئے۔ یہ خبر سن کر واشنگٹن کو دلی اذیت پہنچی اور اب اُسے یقین کامل ہو گیا کہ اُن کی اس نازیبا حرکت پر انگریزی حکومت یقیناً سزا دینے کی کوشش کرے گی۔ پس ایسی حالت میں انگلستان اور امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں جنگ چھڑ جانے کا احتمال تھا۔ اور ہؤا بھی ایسا ہی۔ واشنگٹن کا قیافہ صحیح نکلا۔ ابھی اس واقعہ کو چند ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ جنگ چھڑ گئی۔ تمام ریاستوں نے متحدہ ہو کر اپنے نمائندے فلیڈلفیا کے شہر کی عظیم الشان کانگریس میں بھیجے۔ جارج واشنگٹن امریکہ کی فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا وہ اپنی فوج کے سامنے ایک شاندار بہادر سپاہی کی طرح کھڑے ہو کر ایک پُرجوش تقریر کی جس کے ابتدائی فقرے[1] یہ تھے:۔

"اے جوانانِ وطن! ــــ وہ ملک کبھی بار بار نہیں ہو سکتا جس کی سرزمین اپنے ملک کے سورماؤں سے نہ سینچی جائے۔ دیکھو! اب آزمائش کا وقت ہے ہمت اور استقلال سے کام لو۔"

اور اس تقریر کے آخری فقرے یہ تھے:۔

"میں اپنے کو اس بڑے کام کی انجام دہی کے لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن پھر بھی تم لوگوں نے مجھے جس اعتماد کے ساتھ اپنا راہ نما بنایا ہے۔ اس کے لئے میں تم سب کا شکرگزار ہوں۔ خدا مجھے اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔"

اس تقریر کا ایک ایک حرف ظاہر کرتا ہے کہ واشنگٹن کی رگوں میں وطن کی محبت کا خون موجزن تھا اور وہ ملک و قوم پر اپنی جان قربان کرنے ہی میں اپنی نجات سمجھتا تھا اور یہ اُسی کی قربانی کا نتیجہ ہے کہ آج امریکہ پر آزادی کا پرچم لہرا رہا ہے۔

واشنگٹن نے اپنے فرض کی انجام دہی میں انتہائی محنت سے کام لیا۔ وہ کبھی بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی ناامید نہ ہؤا۔ اس کی فوج کے لوگ فوجی مشقت سے بالکل ناآشنا تھے۔ ابتدا میں کچھ گھبرائے اور واشنگٹن سے ناراض بھی ہوئے اور بسا اوقات اس کے احکام ماننے سے گریز بھی کیا۔ مگر اس کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ اُن کے پاس بندوق، کارتوس، فوجی پوشاکیں اور دیگر سامان کی بیحد کمی تھی۔ رفتہ رفتہ واشنگٹن نے اپنی فوجیں درست کر لیں۔ جنگ شروع ہو گئی۔ بہت سے امریکہ کے باشندے بھی چاہتے تھے کہ انگریزوں کی فتح ہو۔ جنوبی کرولینا کے لوگوں کو یہ خطرہ تھا کہ اگر انگریزوں نے اُن کی روئی اور تمباکو خریدنے سے انکار کر دیا تو اُنہیں بہت نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ آخر کار ۱۷۷۶ء میں تمام ریاستیں متفق ہو گئیں۔

(۵)

۴ جولائی ۱۷۷۶ء میں واشنگٹن نے ایک کانگریس قائم کی جس میں تمام امریکن ریاستوں کے نمائندے شامل ہوئے اور یک زبان ہو کر یہ اعلان کیا کہ تمام متحدہ ریاستوں کو مکمل آزادی اور جمہوریت ملنی چاہئیے قبل اس کے کہ انگلستان امریکہ کو آزاد ملک تسلیم کرے۔ اُنہیں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی پڑی۔ ۱۷۷۷ء میں واشنگٹن کی فوج کو شکست ہوئی۔ اب موسم سرما کی ابتدا تھی۔ بارش اور ٹھنڈک کی وجہ سے اُس سال جنگ کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے دونوں مخالفین خاموش بیٹھ گئے۔ اور اطمینان سے سالِ آئندہ کے خوشگوار موسم کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ بہادر واشنگٹن گزشتہ شکست سے ناامید نہ ہوا اور موقع کو غنیمت جان کر

---

[1] یہ تقریر کے چند فقرے یو۔ ایس۔ اے کی ایک تاریخ سے ترجمہ کرکے درج کر رہی ہوں۔ پوری تقریر کافی طویل ہے جسکے لکھنے کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہ تھی۔ (صدیقہ)

"ویلی فورج" کے قریب کے ایک گاؤں میں آئندہ جنگ کی تیاریوں میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔ یہ گاؤں بہت پُرفضا مقام پر آباد تھا۔ اس کے نیچے بہت گہری وادیاں واقع تھیں جن میں ایک چھوٹا سا دریا ویلی کریک بہتا تھا۔ اور گاؤں کی دُوسری جانب ایک بہت بڑا دریا تھا۔ واشنگٹن معہ اپنے فوجی سپاہیوں کے اس دریا کے کنارے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتا تھا۔ اُنہیں کھانے پینے کی بہت تنگی تھی۔ اور ساتھ ہی اُنہیں سردی کی زیادتی کی وجہ سے انتہائی تکلیف پہنچی۔

جنرل واشنگٹن نے فلیڈلفیا کے باشندوں کو امداد کے لئے لکھا لیکن انھوں نے اِس طرف قطعاً کوئی توجہ نہ کی۔ اب فروری کا مہینہ شروع ہوچکا تھا اور موسم اور بھی زیادہ خراب ہوگیا تھا۔ اس دوران میں اس کے تقریباً دو ہزار سپاہی شدید بیمار ہوگئے۔ اپنے سپاہیوں کو اس حالت میں دیکھکر واشنگٹن کا دل بھر آتا۔ وہ اکثر فرطِ غم سے گھبرا کر تاریک راتوں میں اپنی جھونپڑی سے باہر نکل جاتا اور دُور جنگلوں میں پاگلوں کی طرح پھرا کرتا۔ کبھی ان پریشانیوں سے عاجز آکر وہ سوچنے لگتا کہ انگریزوں سے صلح کرلے۔ لیکن پھر خیال کرتا کہ ایسا کرنے سے اس کی اس وقت تک کی تمام محنت خاک میں مل جائے گی۔ وہ پھر ایک بار مستعدی اور مستقل مزاجی سے کام کرنے لگا۔ آخر کار خوشگوار موسم آگیا۔

انگریزوں کے متعلق فرانسیسیوں کے سینے میں کینے کی آگ بھڑک رہی تھی انھوں نے واشنگٹن کو انگریزوں کے خلاف اس جنگ میں مدد پہنچائی بالآخر انگریزوں کو شکست ہوئی۔ برطانیہ نے صلحنامہ میں امریکہ کی متحدہ ریاستوں کو آزاد تسلیم کرلیا۔

موسم بہار کے ایک خوشگوار دن کو (۱۷۸۷ء) امریکہ کی تیرہ متحدہ ریاستوں کے نمائندے فلیڈلفیا میں حکومت کے نظام پر غور کرنے کے لئے ایک بار پھر جمع ہوئے اور یہ فیصلہ قرار پایا کہ آئندہ امریکہ کی ریاستیں ایک پریسیڈنٹ کے ماتحت رہینگی اور پریسیڈنٹ کا انتخاب ہر چار سال کے بعد ووٹ کے ذریعہ ہوا کریگا۔ جنرل جارج واشنگٹن پہلا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ چار سال کی مدت ختم ہونے پر وہ دوبارہ پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ اسکے بعد پریسیڈنٹ جنرل جارج واشنگٹن ماؤنٹ ورنن چلا گیا۔ جہاں اُس نے اپنی زندگی کے آخری دن انتہائی خوشی و مسرت سے گزارے۔

تلاشِ منزل

(از جناب محمد یونس اصغر کلکتہ)

(سانیٹ)

اندھیری رات میں اُلفت کے نغمے میں سناتا ہوں
مری ہر لَے بھری رہتی ہے اُلفت کے شراروں سے
کہیں آگے مری آواز جاتی ہے ستاروں سے
دھندلکے میں نوائے شوق کے جادو جگاتا ہوں
فضائیں میرا سازِ شوق سُن کر تھرتھراتی ہیں
دھڑک اُٹھتی ہے چھاتی بامِ گردوں پر ستاروں کی
لرز جاتی ہیں تیز و تند موجیں آبشاروں کی
گھٹائیں رقص کرتی ہیں ہوائیں مسکراتی ہیں
اسی نغمے سے میں بھی ہوں یہ میری زندگی بھی ہے
یہی نغمہ تو منزل کا بتائے گا نشاں مجھکو
بنائے گا یہ نغمہ رہنمائے کارواں مجھکو
اسی لَے میں تجسس بھی ہے حسنِ رہبری بھی ہے
بھٹکتا پھر رہا ہوں دور ہوں ہر چند منزل سے
فغاں بنکر نکلتی ہے نوائے جستجو دل سے

سلطان ڈاکو کی کہانی
ایک فارسٹ آفیسر کی زبانی

از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مُرادآبادی

دی وائڈ ورلڈ میگزین لندن میں ایک انگریز افسر محکمۂ جنگلات ہند نے سلطان ڈاکو کی گرفتاری کے چشم دید واقعات شائع کرائے ہیں افسر مذکور پولیس کے ساتھ اس مہم میں شریک تھا۔ اس نے اپنا اور اپنے شرکائے کار کے نام صیغۂ راز میں رکھے ہیں۔ سلطان ڈاکو صوبجات متحدہ میں عموماً اور اضلاع نجیب آباد۔ بجنور وغیرہ میں خصوصاً مشہور ہے۔ اس کی ڈکیتیوں اور قتل و غارت کی کہانیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس نے کئی سال تک پولیس کو پریشان اور جنگل کے قرب و جوار کے قصبات و دیہات کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اس خوفناک مگر دلیر ڈاکو کی گرفتاری کے صحیح واقعات معلوم ہو جائیں گے۔ اور بہت سی خلاف عقل اور غیر معتبر روایتوں کی تردید ہو سکے گی۔

سلطان ڈاکو بدمعاشوں کے ایک بہت بڑے جتھے کا سردار تھا سیکڑوں قتل اور ہزار ہا چوریوں اور ڈکیتیوں کے جرائم کا ذمہ دار تھا۔ گورنمنٹ نے اس کی بدمعاشیوں سے تنگ آ کر اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص سلطان کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے پولیس کے حوالہ کرے گا۔ اسے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے باوجود نہ تو وہ گرفتار ہوا اور نہ اس کی دست درازیوں اور قانون کی تذلیل میں کمی ہوئی۔ اس کی گرفتاری کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے اس کی مختصر سوانح عمری سنانا ضروری ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس نے رہزنی کی زندگی کیوں اختیار کی۔ سلطان اوائل عمر میں ایسٹ انڈین ریلوے کی لائن پر نجیب آباد کے قریب ایک مزدور کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔ جنگ عظیم کے آغاز میں وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اور فرانس بھیجا گیا۔ وہاں تین سال تک رہنے کے بعد ایک حادثہ میں اس کے داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں کٹ گئیں۔ فوجی قانون کے مطابق اسے ناکارہ سمجھ کر ہندوستان واپس کر دیا گیا۔ نجیب آباد کے متصل وہ اپنے گاؤں میں بے کاری کی زندگی گزارنے لگا۔

فوجی زندگی اور فرانس کی آب و ہوا نے اس کی ذہنیت میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا۔ وہ محنت مزدوری اور دیہات کی ذلیل زندگی سے نفرت کرنے لگا تھا۔ میدانِ جنگ کے تجربات نے اس کے دل میں جرأت اور سفاکی کے ولولے پیدا کر دئے تھے۔ آخرکار وہ اپنے علاقہ کے ڈاکوؤں کے گروہ میں شریک ہو گیا۔ اس وحشیانہ زندگی میں اس نے وہ کارنامے انجام دئے کہ چھ مہینے کے اندر اندر اُسے ڈاکوؤں کا سرغنہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی دلیریوں سے مرعوب ہو کر اُسے "سلطان" کا لقب دیا اور ان کی اس ہمت افزائی کو دیکھ کر سلطان نے قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ تا دم مرگ قانون کا دشمن رہے گا۔ اور نجیب آباد کے علاقہ کے لوگ اس کے نام سے کانپا کریں گے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جیسا اس نے کہا بہت جلد ویسے کر کے بھی دکھا دیا۔ جب چوریوں۔ ڈکیتیوں اور اس کی خونریزیوں سے تمام ضلع میں تہلکہ سا پڑ گیا۔ تو حکومت نے اس کی سرکوبی کے لئے پوری تیاری کی۔ ایک تجربہ کار انگریز پولیس افسر کی سرکردگی میں تین سو سپاہیوں کا ایک دستہ ترتیب دے کر سلطان اور اس کے رفقا کی گرفتاری کے لئے مقرر کر دیا

گیا نیز تمام سرکاری افسروں کو خفیہ احکام کے ذریعہ سے ہدایت کر دی گئی کہ وہ پولیس کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار رہیں۔ محکمہ جنگلات کے افسروں کو خصوصیت سے دعوتِ عمل دی گئی تھی۔ کہ وہ اس خطرناک ڈاکو کو شکار کرنے میں کافی دلچسپی دکھائیں۔

سلطان کی نقل و حرکت اور اس کی واردات کے متعلق جاسوسی میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس نے گنجان جنگل کو اپنی کمین گاہ بنا رکھا تھا گھنے جنگل میں ایسی ایسی دشوار گزار پناہ گاہیں تھیں جہاں سوائے ان جنگلی چوہوں کے کسی اور کا گزر محال تھا۔ ڈاکو موقع پا کر نکلتے تھے۔ اور آس پاس کے دیہات و قصبات پر ہاتھ صاف کر کے پھر جنگلوں میں جا چھپتے تھے۔ ہمالیہ کا یہ دامن دُور دُور تک سرسبز ہے۔ اور جنگلات سے اٹا پڑا ہے اسی میں میدانی علاقہ دیہات سے آباد اور مزروعہ ہے جس طرح میدان کے من چلے ان جنگلات میں شیر، نیل گائے، ہرن وغیرہ کا شکار کھیلا کرتے ہیں سلطان ڈاکو اور اس کے دیدہ دلیر رفیق میدان میں نکل کر مہاجنوں ساہوکاروں کی دولت اور ان کے قیمتی دستاویزات کا شکار کرتے رہتے تھے۔ اور دخل در معقولات کرنے والوں کو بندوق کی نالی سے سیدھا کر دیا کرتے تھے۔

سلطان کے ساتھیوں کی تعداد ساٹھ آزمودہ کار ڈاکوؤں تک پہنچ چکی تھی۔ ہر ایک مسلح اور نشانہ باز تھا۔ سواری کے لئے بہترین گھوڑے سامان کی باربرداری کے لئے مضبوط خچر اُن کے پاس تھے۔ ڈاکو اپنا تمام ساز و سامان لئے گھومتے رہتے تھے۔ صبح کو اگر مشرقی جنگل میں ان کے گھوڑے ہنہناتے سُنائی دیتے تو شام کو مغرب میں ان کو زین اور کاٹھی سے سبکدوش کرتے دیکھا جاتا تھا۔ پولیس کو ایک ڈکیتی کی اطلاع ملتی اور وہ مقامِ واردات پہنچنے بھی نہ پاتی کہ وہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ایک اور گاؤں کے لُٹ جانے کی خبر آجاتی۔ پولیس والے دوڑ کر وہاں پہنچتے لیکن ڈاکو مالِ غنیمت لے کر تنگ و تاریک جنگل کے آغوش میں روپوش ہو چکے ہوتے تھے محکمہ جنگلات کے افسر کا بیان ہے کہ:۔

"ایک روز سہ پہر کے وقت میں اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ میرا ڈاکیہ ہانپتا کانپتا اندر آیا۔ اس کی وردی غائب تھی اور صرف خالی جانگیا اس کی ستر پوشی کر رہا تھا۔ جب میں نے اُس سے اس ہیئت کذائی کی بابت پوچھا تو اس نے کہا کہ راستہ میں اُسے ڈاکوؤں نے پکڑ لیا تھا۔ اُس کی جامہ تلاشی لی اور جو کچھ پیسہ دھیلا اس کے پاس تھا چھین لیا۔ وردی اُتروالی۔ ڈاک کا تھیلا کھول کر دیکھا بھالا اس میں کوئی کام کی چیز نہ پا کر واپس کر دیا اور کہا:۔

"جا رے اب تو بھاگ جا! تو جنگل والے صاحب کا آدمی ہے ہمارا اس سے جھگڑا رگڑا نہیں۔"

یہ واقعہ سن کر مجھے یقین آگیا کہ یہ کارروائی سُلطان کے بدمعاش ساتھیوں کی ہے۔ چنانچہ میں نے انگریز پولیس افسر کو جو اس خاص مہم پر مقرر تھا خط لکھا۔ اپنے ڈاکیہ کا واقعہ بیان کر کے اس سے درخواست کی کہ وہ فوراً مع اپنی پارٹی کے یہاں پہنچے اور ڈاکوؤں کو گھیرے۔ میں نے یہ خط اپنے خاص آدمی کو دیا اور اس سے کہا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جائے اور پولیس کیمپ تک اس طرح پہنچے کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کوئی خاص پیغام بھیجا جا رہا ہے۔ اس آدمی کو روانہ کر کے میں نے اندازہ کیا کہ اگر میرا پیغام منزلِ مقصود پر صحیح سلامت پہنچ جائے گا تو پولیس افسر دو دن کے اندر اندر یہاں پہنچ جائے گا۔

دوسرے دن میرے کیمپ سے بیس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر بہت بڑا میلا ہو رہا تھا۔ میرا کیمپ کلرک جس کا تقرر حال ہی میں ہوا تھا ایک عرضی لئے ہوئے آیا اور میلہ میں جانے کے لئے چھٹی مانگی۔ اسے ایک گھوڑے کی ضرورت تھی اور جب تک اُس کے پاس سواری کا انتظام نہ ہو بیچارہ قانونی طور پر "سفری بھتہ" سے محروم تھا۔ اس میلے میں گھوڑے گھوڑیاں اور دوسرے مویشی بغرض فروخت آئے تھے۔ چنانچہ وہ خود جا کر کم قیمت اور اچھا گھوڑا خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً اس کی درخواست منظور کر لی۔ اور وہ خوشی خوشی روانہ ہو گیا۔

میں شام تک دفتر کا کام کرتا رہا۔ اور جب فارغ ہو کر آرام کرسی پر لیٹا تو سامنے سے وہی کلرک آتا نظر آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"ہاں بھئی سناؤ! کوئی مطلب کا جانور مل گیا؟"

"کچھ نہ پوچھیں حضور!" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہاں تو رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔"

اس کے بعد اس نے بتایا کہ جب میں میلہ میں پہنچا تو میں نے ایک گھوڑا پسند کیا۔ ابھی میں اس کے متعلق بات چیت کر رہا تھا کہ ایک چھ فٹ لمبا آدمی وہاں آنکلا۔ اور گھوڑے کو دیکھنے بھالنے کے بعد مالک سے اجازت لے کر اس پر سوار ہوا۔ اور پھیر پھر کر دیکھا قیمت پوچھی اور کہا کہ یہ جانور مجھے پسند ہے۔ اس کے بعد گھوڑے کو مالک کے قریب لا کر اپنا داہنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب کر کے دکھایا اس ہاتھ کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا:۔

"یار! یہ گھوڑا تو سلطان کے لائق ہے شکر کرو کہ تمہارا نذرانہ قبول ہوا۔ اچھا سلام!"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ ماری اور جنگل کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ مالک کا منہ حیرت اور خوف کے مارے کھلا رہ گیا۔ میلہ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ سارے آدمی ڈر کے مارے تتر بتر ہو گئے۔ چند پولیس والے جو میلہ کے انتظام کے لئے موجود تھے اس کا تعاقب نہ کر سکے انہیں ڈر تھا کہ کہیں سلطان کے ساتھی ادھر ادھر نہ چھپے ہوں اور انہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اس واقعہ سے مجھے بہت حیرت ہوئی۔ سلطان کی اس دیدہ دلیری سے میں نے نتیجہ نکالا کہ وہ مقامی پولیس کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا چنانچہ میں نے انگریز پولیس افسر کو پھر خط لکھا اس تازہ واردات کی خبر دی اور جلد از جلد اپنے پاس پہنچنے کی تجویز پیش کی۔ آخر کار خدا خدا کر کے دو دن بعد وہ آیا۔ اسی آدمی اس کے ساتھ تھے۔ بعد ازاں ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھے۔ ایک اسکیم سوچ سمجھ کر تجویز کی!

پولیس افسر کا خیال تھا کہ سلطان کے جاسوسوں کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے۔ کیونکہ پولیس کی نقل و حرکت اور ان کی ہر تجویز کی اطلاع اس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس خیال کو مدِ نظر رکھ کر ہم نے بھی اپنے جاسوسوں کے حلقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے معقول انعامات دلائے جانے کے وعدے کئے۔

دوسرے دن صبح کو طے شدہ اسکیم کے ماتحت پولیس افسر مجھ سے رخصت ہو کر بیس میل کے فاصلہ پر ایک ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی روانگی اور منزلِ مقصود کے متعلق کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی تھی۔

پانچ دن گزر جانے کے بعد ہمارے جاسوسوں میں سے ایک بنیا دکاندار میرے پاس آیا اور اس نے ڈاکوؤں کے "پڑاؤ" کے متعلق خبر دی۔ سلطان اس سے سامان رسد خریدا کرتا تھا۔ اور اسے اپنے ہمرازوں میں شمار کرتا تھا۔

سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار ہولی میں دو دن باقی تھے۔ اس تہوار پر ہندو عام طور پر بڑی خوشیاں مناتے ہیں۔ ادنیٰ طبقہ کے ہندو بکثرت سے شراب پیتے ہیں۔ گیت گاتے سوانگ بھرتے ہیں۔ ہولی کی رات کو ساری رات گانا بجانا اور کھیل ہوتا ہے

اس خیال سے کہ تمام ڈاکو ادنیٰ طبقہ کے ہندو ہیں اور ہولی کے تہوار کو پوری رسوم کے ساتھ منائیں گے میں نے مذکورہ بالا موٹے بنئے کو جو خفیہ طور پر ہمارا شریکِ راز تھا بلا کر حکم دیا کہ ہولی کی رات کو ڈاکو جس قدر بھی شراب منگائیں انہیں نہایت فیاضی سے مہیا کی جائے۔ اور اس مقصد کے لئے نہایت تیز قسم کی شراب تیار رکھنی چاہئے۔ پھر میں نے پولیس افسر کو خط لکھا اور ڈاکوؤں کے پڑاؤ سے چار میل فاصلہ پر ایک جگہ مقرر کر کے وہاں ہولی کی رات کو ملاقات کر کے مفصل ہدایات دیں۔ ہمارے مخبر بنئے نے اس رات ہمارے پاس آنے اور رہبری کرنے کا وعدہ کیا دوسرے روز صبح کو پولیس افسر کا رقعہ مجھے ملا جس میں مقررہ وقت اور مقام پر اس نے مجھ سے آملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ تاریخ مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ مارچ کی تیس تاریخ تھی۔ میں نے کیمپ کے تمام آدمیوں کو باہر جانے سے روک دیا تھا۔ ڈاک کے ہرکاروں تک کو کہیں نہیں بھیجا یہ اس لئے کہ کہیں سلطان کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے۔ مقررہ رات کو بڈھا بنیا رات کے نو بجے ہمارے پاس آگیا۔ اور اس نے کہا کہ پچھلے دو دنوں میں ڈاکوؤں نے بہت سے شراب منگائی ہے اور آج رات وہ پی پی کر مدہوش ہو چکے ہوں گے۔ رات کے ۱۲ بج گئے۔ آدھ گھنٹہ اور بھی گزر گیا لیکن پولیس پارٹی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کو دل میں جگہ دے رہا تھا۔ ایک خیال یہ آ رہا تھا کہ کہیں ہماری تجویز میں کوئی غلط فہمی تو پیدا نہیں ہو گئی لیکن اتنے میں میرا کتا نرم آواز سے بھونکا میں نے جلدی سے اٹھ کر باہر جھانکا۔ پولیس افسر اپنے خاکی وردی والے چست و چالاک سپاہیوں کی ہمراہی میں چلا آ رہا تھا۔ ان کی بندوقوں کی نالیاں لیمپ

کی روشنی میں جھلک رہی تھیں۔

میں نے خوش ہو کر کہا کہ شکر ہے آپ لوگ عین انتظار میں آ پہنچے ورنہ میں ناامید ہو چلا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پولیس والوں کو پندرہ منٹ کی چھٹی دے دی۔ تاکہ وہ اپنی ضروریات سے جلدی جلدی فارغ ہو جائیں پھر ہم سب ڈاکوؤں کے پڑاؤ کی طرف چل پڑے۔ ہم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ نہایت گنجان جنگل میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ رات غضب کی اندھیاری تھی۔ ہم نے دو برقی لیمپ ساتھ لے لئے تھے لیکن احتیاط کے پیش نظر ہم انہیں صرف سخت ضرورت کے وقت جلاتے تھے۔ نہایت خاموشی اور انتہائی رازداری کے ساتھ ہم اس جنگلی پگڈنڈی پر ٹھوکریں کھاتے بچتے بچاتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے ہمارا رازدار اور رہنما بنیا تھا۔ اور اس کے پیچھے ہم سب ایک کے پیچھے ایک قطار کی صورت میں تھے۔ خشک نالوں کو پھلانگتے سرکنڈے کی جھاڑیوں کو چیرتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد جنگل بہت گھنا ہو گیا۔ اور چھوٹے چھوٹے درختوں کے گنجان جھاڑ اس قدر نیچے تھے کہ ان کے نیچے سے ہم کو دو دو کی آگے پیچھے قطار بنا کر گزرنا پڑتا۔ اس دشوار گزار راستہ کو طے کرنے کے لئے ہماری رفتار غیر معمولی طور پر سست تھی بہرحال دو گھنٹے تک لگاتار درختوں کے نیچے سے جھک کر گزرتے جھاڑیوں کو دھکیلتے دھکیلتے ہمارا چوٹی کا پسینہ ایڑی تک جا پہنچا جنگل میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کوئی جنگلی جانور نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ ہمارے پاؤں کی چاپ سے ایک نیل گائے اور اس کا بچہ ڈر کر بھاگا اور بس۔ آخرکار ہمارا رہبر بنیا ٹھہر گیا۔ اور ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کر کے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا کہ ڈاکوؤں کا پڑاؤ چار سو گز کے فاصلہ پر رہ گیا ہے۔ واقعی جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا ہمیں بھی آگ کے الاؤ کی مدہم مدہم روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم نے چھاپہ مارنے کے انتظامات فوراً مکمل کر لئے۔ تجویز یہ ہوئی کہ ڈاکوؤں کے کیمپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ اور سب کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ساتھیوں کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ایک حصہ کی رہنمائی پولیس افسر نے۔ دوسرے کی میں نے اور بقیہ دو کی ذمہ داری جمعداروں نے اپنے ذمے لے لی۔ تمام ساتھیوں کو سمجھا دیا گیا تھا کہ ڈاکوؤں کے کیمپ سے سو گز کے فاصلہ پر پہنچ کر ٹھہر جائیں۔ اور کوئی فائر اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک پولیس افسر کی سیٹی نہ بجے۔ اس کے بعد ہم سب نہایت احتیاط سے سلطان کے کیمپ کی طرف بڑھنے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے ذرا ذرا سی آڑ کی پناہ لیتے ہوئے ہم نے تین سو گز کا فاصلہ طے کر لیا۔ یہاں پہنچ کر ڈاکوؤں کے پھٹے پرانے خیمے اور چھولداریاں نظر آنے لگی تھیں۔ اور وہ ادھر ادھر کھڑے بیٹھے یا آرام سے زمین پر پاؤں پھیلائے لیٹے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پہرے دار جہاں تہاں کھڑے تھے لیکن نیند اور نشے کے مارے اونگھ رہے تھے۔ صرف ایک آدمی جو یقیناً سلطان تھا ایک چارپائی پر دراز تھا۔ اور ایک آدمی اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ بعض ٹولیوں میں اب تک شراب کا دور چل رہا تھا۔

یہ تماشہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ اگر پولیس والے عقلمندی سے ہماری تجویز کو عملی جامہ پہنا سکیں تو یہ موقعہ بہت سنہری ہے ایک ڈاکو بھی بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک آڑ کے پیچھے ٹھہرا لیا۔ اور بیتابی سے پولیس افسر کی سیٹی کا انتظار کرنے لگا۔ اسی امید و بیم میں پانچ منٹ گزر گئے۔ اس تاخیر سے میرے دل میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ کہ ناگہاں ایک بندوق چلنے کی آواز نے جنگل دہلا دیا۔ اسی کے ساتھ سیٹی کی تیز آواز آئی۔ اور ہم سب آگے کو دوڑ پڑے۔ ڈاکوؤں کے اندر کھلبلی پڑ گئی۔ ایک نے دوسرے کو پکارنا شروع کر دیا۔ ادھر ادھر بھاگڑ پڑ گئی۔ اپنے اپنے ہتھیار ہر ایک نے سنبھالنا شروع کر دئے۔ اور چشم زدن میں جنگل کی تاریکیوں میں غائب ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے ہر ایک چیخ کر کہہ رہا تھا کہ

"بھاگو بھاگو۔ گارڈن صاحب دوڑے کر آیا ہے"

اس گڑبڑ میں میں نے اپنی پارٹی کو گولی چلانے نہ دی۔ اس لئے کہ کہیں ہماری گولیوں کا ہمارے آدمی ہی نشانہ نہ بن جائیں۔ جو سامنے سے ڈاکوؤں کے کیمپ پر حملہ کر رہے تھے جب ہم پڑاؤ پہ پہنچے تو ڈاکو بھاگ چکے تھے چھ بدمعاشوں کو ہم نے گرفتار کر لیا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ نشہ کے مارے وہ غلین پڑے تھے۔ یا لڑکھڑا کر گر پڑے تھے۔ سلطان صاف نکل چکا تھا۔ پولیس افسر مارے غصہ کے پاگل ہوا جا رہا تھا اس نے قسم کھا کر کہا

"اب ہمیں ایسا اچھا موقعہ قیامت تک مل ہی نہیں سکتا"

اس بات کی تفتیش کے بعد کہ کس گدھے نے سیٹی سے پہلے بندوق چلائی

پتہ چلا کہ ایک نئے رنگروٹ سپاہی کی حماقت تھی۔ اس نازک موقعہ کی موجودگی نے اس کے اعصاب کو کچھ ایسا برانگیختہ کیا کہ واہمہ میں اس کے کان میں متوقع سیٹی کی آواز گونجی اور اس نے بے اختیار بندوق داغ دی۔ پولیس افسر نے اسے کھڑے کھڑے معطل کر دیا۔ اور اسے لائن سپرد کئے جانے کا نادری حکم سنا دیا۔ ڈاکوؤں کے کیمپ کے قیمتی سامان کو آگ لگا دی گئی۔ جس وقت گرفتار شدہ چوروں کو لے کر ہم واپس ہونے لگے تو پتہ چلا کہ ہمارا راہ نما بڈھا بنیا غائب ہے۔ پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد کیمپ سے سو گز کے فاصلہ پر وہ بیچارہ گھاس میں اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ جب اسے سیدھا کر کے دیکھا تو غریب جان بحق تسلیم ہو چکا تھا معلوم یہ ہوا کہ مذکورہ بالا رنگروٹ سپاہی کی حماقت سے جہاں بنا بنایا کھیل بگڑا تھا اسی کی گولی سے بدقسمت بنئے کا کام بھی تمام ہو گیا تھا۔ یہ تھا ہماری اُس رات کی جدوجہد کا ناکام اور افسوسناک انجام! اگر ہمارا بدقسمت رہنما اس بُری طرح نہ مارا جاتا تو یقیناً وہ اپنی خدمات کا گرانقدر معاوضہ گورنمنٹ کی طرف سے پاتا۔ قصہ مختصر اس کی لاش کو ارتھی بنا کر سب میری قیامگاہ کو واپس ہوئے۔ اور پھر سلطان کی گرفتاری کے لئے کسی منصوبہ کی سوچ بچار شروع کی۔

اس واقعہ کے بعد کئی ہفتہ تک سلطان کی کسی واردات کی کوئی خبر نہیں آئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پولیس کے گزشتہ حملہ سے ڈر گیا تھا۔ اور پولیس والوں کی آئندہ تجاویز کی سن گن لینے کی فکر میں تھا۔ دونوں کے اپنے اپنے جاسوس سرگرم عمل تھے۔ اس اثنا میں گرفتار شدہ ڈاکوؤں کو سختی اور نرمی ہر طرح سے راہ راست پر لا کر سلطان کے آئندہ عزائم اور اس کے جائے قیام وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ وہ یا تو صاف انکار کرتے تھے یا احمقانہ خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔

ایک روز رات کو ایک پولیس چوکی کا معاینہ کر کے پولیس افسر میرے ہاں ٹھہرا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سلطان کے متعلق گفتگو شروع شروع ہوئی۔ اس نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے انگریزی علاقہ میں دال گلتی نہ دیکھ کر ریاست رام پور کے علاقہ میں کوئی جائے پناہ تلاش کر لی ہے۔"

میں نے اس کے جواب میں کہا۔——

"جو کچھ بھی ہو میرا تو خیال ہے وہ بہت جلد کوئی واردات کرے گا۔ اس کے جاسوسوں کا حلقہ آپ کے جاسوسوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسے موقع کی تلاش ہے۔ آپ نے یہ تو سنا ہوگا کہ اس کے آدمی گھوڑوں کے بیوپاریوں کا بھیس بدل کر دیہات کے بازاروں میں گھومتے ہیں۔ اور پولیس والوں کی نقل و حرکت کی خبریں مہیا کرتے ہیں۔"

پولیس افسر نے اس کی تصدیق کی اور کہا:۔

"یہ اس کے جاسوسوں کی کارستانیاں ہیں۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ بھگت سنگھ کے گھر ڈاکہ پڑا۔ اور تین ہزار نقد اور زیورات اڑا کر لے گئے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پولیس کانسٹیبل آیا اور ایک لفافہ میرے مہمان کے ہاتھ میں دے دیا۔ لفافہ پر "ضروری" کا نوٹ لال روشنائی سے لکھا تھا۔ اس نے خط پڑھا اور غمناک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھا دیا اور کہا:——

"آپ کا خیال درست تھا۔ سلطان نے کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ ذرا اسے ملاحظہ کیجئے۔"

یہ خط ایک انسپکٹر پولیس کا تھا۔ اور میرے کیمپ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر ایک پولیس اسٹیشن سے لکھا گیا تھا۔ اس میں سلطان کے ایک تازہ کارنامہ کا مختصر سا ذکر کر کے لکھا تھا کہ اس کی تفصیل کانسٹیبل سے زبانی سن لی جائے۔ پولیس افسر نے اس کی طرف رخ کر کے واردات کی داستان سنانے کا حکم دیا۔ کانسٹیبل نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ

"پہاڑی لوگ جو سردی کے موسم میں اپنا دیس چھوڑ کر معہ بال بچوں کے میدان میں اتر آتے ہیں اور سرکاری جنگلات میں محنت و مزدوری کرتے اور گرمی شروع ہوتے ہی پہاڑ کو لوٹ جاتے ہیں اور کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرتے ہیں ان کی ایک جماعت ۱۵ اپریل کو اپنے وطن کو واپس ہو رہی تھی۔ اس کا پتہ سلطان کو بھی چل گیا۔ ساتھ تین چار مالدار بنئے بھی تھے۔ جب یہ لوگ جنگل میں ایک مقررہ مقام پر پہنچ کر رات گزارنے کے لئے مقیم ہوئے تو سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے انہوں نے روٹی پانی سے فراغت پا کر رات کو چوکنے ہو کر

گزارنے کی صلاح کی۔ چونکہ بنیوں کے علاوہ سارے کے سارے گری بھر
کی کمائی اپنے گھروں کو لے کر لوٹ رہے تھے۔ اس واسطے باری باری
پہرہ دینے اور ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ یہ لوگ
ابھی کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ کہ جنگل کی سڑک پر خاکی وردی پہنے
پولیس کا ایک دستہ گزرتا نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر ایک بنئے نے کہا:۔

"بس مہاراج! اب کام بن گیا۔ جمعدار جی کو کہہ سن کر رات کی
رات یہاں ٹھہرالو۔ اور ان کی خوب سیوا کرو۔ اور رات کو آنند سے
پیر پھیلا کر سو جاؤ۔"

اسی اثنا میں جمعدار کے پیچھے پولیس کے بارہ جوان لفٹ رائٹ
کرتے آپہنچے۔ سب نے ان کو جھک کر سلام کیا۔ اور خوشی خوشی ان کے
چاروں طرف جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بنئے پولیس والوں کی صورت
دیکھ کر نہال نہال تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر
جمعدار صاحب سے کہا۔ حضور! یہاں ڈاکہ کا ڈر ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں
رات کو سرکار یہاں ٹھہر جائیں۔ ہم دال روٹی سے سب کی خدمت کو
حاضر ہیں۔ ہم سب سرکار کی ہر طرح سیوا کرنے اور آرام پہنچانے کی
کوشش کریں گے۔

جمعدار صاحب نے یہ سنکر بڑے رعب سے اپنی مونچھوں کو تاؤ
دیا اور فرمایا:۔

"ہاں! میں نے سنا تھا کہ علاقہ میں پہاڑیوں کے قافلے گزرنا شروع
ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں اپنے تھانہ سے بارہ میل کا سفر کر کے یہاں آیا
ہوں۔ ہمارے صاحب بہادر نے ہماری ڈیوٹی لگادی ہے کہ پہاڑیوں
کو اپنے تھانوں سے حفاظت کے ساتھ گزار دیا جائے۔ کیونکہ سلطان
کے آدمی آس پاس لگے ہوئے ہیں۔"

غریب پہاڑیوں نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور جمعدار
صاحب کی فرض شناسی پر ہر طرف سے تعریفوں کے پھول نچھاور
ہونے لگے۔ چنانچہ ایک بنئے نے دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"بھیا انگریزی راج دیوتاؤں کا راج ہے۔"

رات بھیگ چلی تھی۔ سب اپنے اپنے بستروں کی فکر میں تھے
جمعدار صاحب نے چھ پولیس کے جوانوں کو پہرہ پر مقرر کر دیا اور باقی
چھ کو اپنے پاس لیٹ کر سو جانے کا حکم دیا۔ اور آدھی رات کے بعد
ڈیوٹی بدلنے کی تاکید کی۔ خود بنیوں کے پاس بیٹھ کر حقے کے کش لگاتے
ہوئے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم
کر لیا کہ ہر ایک کے پاس کس قدر نقد اور قیمتی سامان ہے۔ اس کے
بعد انہوں نے نہایت خیر خواہانہ انداز میں کہا کہ

"میرا خیال ہے کہ ایسے تمام آدمی جن کے پاس روپیہ زیورات
وغیرہ ہیں وہ ان پولیس والوں کے قریب جو پچھلی رات کو ڈیوٹی دینے کے
لئے یہاں سو رہے ہیں اپنے بستر کر لیں۔ اور میری تو یہ رائے ہے کہ تمام
عورتوں کا زیور اتروا کر ایک جگہ جمع کر کے ایک معتبر آدمی اپنے پاس لے
کر یہاں سو رہے تاکہ چوری اور ڈکیتی کا خطرہ نہ رہے۔ اگر سلطان نے
چھاپہ مارا تو تم سے ان چیزوں کی حفاظت بن نہ پڑے گی۔"

بنئے جمعدار کی اس تجویز کو سن کر بہت خوش ہوئے اور فوراً
اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا گیا۔ چھ پولیس خوب کھا پی کر بستروں پر
دراز ہو گئے۔ اور باقی چھ پہرہ دینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ایک گھنٹہ
کے بعد سارے تھکے ہارے مزدور مسافر خراٹے لینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد
جمعدار صاحب اور ان کے چھ ساتھی اٹھ بیٹھے۔ پہرہ والے سپاہی بھی
دبے پاؤں آکر ان سے آملے۔

مالدار بنیوں اور ان پہاڑیوں کو جن کے پاس عورتوں کے
زیورات اور دوسرے مزدوروں کا نقد روپیہ موجود تھا ایک ایک کر کے
جگایا گیا۔ بندوق دکھا کر موت کی دھمکی دے کر سب کچھ رکھوا لیا گیا۔

ایک بنئے نے بدحواس ہو کر کہا۔

جمعدار جی! یہ کیا؟ اس کا مطلب؟ آپ کو دھوکا لگا ہے شاید!

"مطلب کا سگا! بدمعاش! جانتا نہیں۔ میں سلطان ہوں۔"

جمعدار نے ڈانٹ کر جواب دیا اور بندوق کے دستے سے اس کے سر
پر ایسا وار کیا کہ حیرت وخوف کا مارا بنیا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

فرضی پولیس والوں کی یہ کارروائی دیکھ کر سارے کانپ گئے
اور چپ چاپ سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کرنے لگے۔ لوٹ کھسوٹ
کے بعد سلطان نے اپنے ساتھیوں سمیت پولیس والوں کی وردیاں
اتار ڈالیں۔ پہاڑیوں کے دو مضبوط ٹٹو پکڑ لئے۔ اور سارا مال غنیمت

اُن پر پڑا اور چلتے بنے۔ صبح کو دو پہاڑیوں نے اس علاقہ کے تھانہ جاکر اپنی رات کی سرگزشت سنائی۔ اور رپورٹ لکھا کر روتے پیٹتے منزل مقصود کو سدھارے۔

کانسٹیبل کی زبانی یہ کہانی سن کر پولیس افسر کو بڑا غصہ آیا اور کہنے لگا "سلطان کی یہ کارروائی ناقابل برداشت ہے۔ پولیس کا بھیس بدل کر غریب مزدوروں کو لوٹ لینا انتہائی کمینہ پن ہے۔ جمعدار کے بھیس میں رہزنی کرنے کا مزہ چکھاؤں گا۔ آپ دیکھئے تو۔"

اس کے بعد اس نے اپنے نائب کو بلاکر حکم دیا۔ "آپ بہت جلد تیار ہوجائیے۔ موقعہ واردات کے معاینہ کے لئے چلنا ضروری ہے۔"

ایک گھنٹہ کے بعد یہ لوگ روانگی کے لئے تیار تھے۔ میں نے پولیس افسر کو "بسفر رفتنت مبارکباد" کہا اور وہ رخصت ہوگئے۔

پندرہ دن تک کوئی خیر خبر نہ آئی۔ ایک روز میں صبح کو جنگل کا معاینہ کرنے کے لئے جانے کو تیار تھا۔ کہ ایک ہرکارہ پولیس افسر کا خط لے کر آیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"ہم سرگرمی سے سلطان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہمارے جاسوس محنت سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے سلطان کے ایک آدمی کو گرفتار کیا ہے یہ شخص گھوڑوں کے سوداگر کے بھیس میں ایک گاؤں میں موجود تھا۔ اور مخبری کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے وہاں ڈاکہ ڈلوانا چاہتا تھا ہم نے اس شخص کو سمجھا بجھا کر اپنا رازدار بنالیا ہے۔ اس نے سلطان کے جائے قیام کا صحیح پتہ دے دیا ہے۔ میں آج ہی رات کو اس پر چھاپہ مارنا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو اس ہرکارہ کے ساتھ فوراً چلے آؤ۔ تمہاری ہمراہی میں شکار مزے دار رہے گا۔"

خط پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے اپنا دورہ ملتوی کردیا گھوڑا کسوایا۔ اور دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ میں دو دن تک کے لئے باہر جارہا ہوں۔ ہرکارہ کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ جنگلات کی پگڈنڈیوں پر چل کر دس میل کا سفر طے کرکے ۳ بجے پولیس افسر کے کیمپ میں پہنچا۔ میں نے کیمپ کا لفظ محض اصطلاحاً استعمال کیا ہے کیونکہ وہاں خیمہ۔ نوکر چاکر وغیرہ جو افسروں کی قیامگاہ کے لئے ضروری ہیں کچھ بھی نہ تھا۔ جنگل کے ایک گوشہ میں چند خستہ خراب جھونپڑیاں تھیں۔ اور تنہا پولیس والے ہی تھے۔ پولیس افسر زمین پر بیٹھا ایک جمعدار سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تھکا ماندہ اور مدتوں سے ناآشنائے راحت ہے۔ اس کی حجامت بڑھ رہی تھی۔ اور وردی میلی تھی۔ بہر حال وہ سلطان کی گرفتاری کے خیال سے بہت مسرور تھا۔

اتنے میں ایک کانسٹیبل نے گھاس پھوس کی آگ جلاکر چائے بنائی اور ہم دونوں چائے پر بیٹھ گئے۔ پولیس افسر نے اپنی تجاویز سنانا شروع کیں۔ اس نے کہا کہ سلطان اور اس کے ساتھی دریا کنارے ایک چھوٹے گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ دریا کا پاٹ یہاں بہت کم ہے۔ یہاں سے ان کی کمین گاہ کا فاصلہ چھ میل کے قریب ہے۔ ہم دریا کے راستہ سے ان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ کشتیوں کا انتظام کرلیا گیا ہے۔ آدھی رات کو روانہ ہوں گے۔ پنجاب پولیس کے تجربہ کار جوان ہمراہ لے کر جاؤں گا۔ ان میں سے ہر سپاہی قابل اعتماد اور آزمودہ ہے۔

اس کے بعد اس نے تمام سپاہیوں کو بلاکر ہدایات یاد دلائیں تین طرف سے حملہ کرنے کی پریڈ کرائی گئی۔ احتیاط۔ خاموشی کی سخت تاکید کی۔ نافرمانی۔ بے پروائی کرنے والوں کے متعلق سخت ترین سزا کی دھمکی دی۔ آخرکار شام کو سپاہیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں اور ساگ ترکاری کھاکر چائے پی کر ہم سب اپنی مہم کے لئے تیار ہوگئے۔ آدھ گھنٹہ تک جنگل میں چل کر ہم دریا کنارے پہنچے۔ چھ کشتیاں وہاں ہماری منتظر تھیں پہلے ہفتہ کا آدھا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس کی پراسرار چاندنی دریا کے پانی پر جھلک رہی تھی۔ ہماری کشتیاں دریا کے بہاؤ پر چلی جارہی تھیں۔ پانی تیز جارہا تھا۔ اس لئے ہماری رفتار تیز تھی۔ ملاح نہایت احتیاط سے کشتیوں کو اتھلے پانیوں اور ٹیلوں سے بچتے بچاتے لئے جارہے تھے۔ آخرکار جب چاند نے دور افق میں چھپنا شروع کیا ہمارے رہنما نے کشتیاں ٹھہرانے کا اشارہ کیا۔ اور ہم سب اتر پڑے۔ پولیس افسر نے آخری مرتبہ سپاہیوں کو ہدایات دیں۔ اور پھر ہم سب اپنی مہم کے آخری سین کی تکمیل کے لئے چل پڑے۔ رہنما کے قول کے مطابق ہم کو پھر جنگل میں ایک میل تک چلنا پڑا۔ ایک ایک آدمی کی قطار بناکر بیس منٹ تک چلنے کے بعد ہم ٹھہرا لئے گئے۔ اور اس نے کہا کہ ڈاکوؤں

کے پڑاؤ کا فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں ہے۔ پولیس افسر نے کہا کہ کوئی شخص اس وقت تک فائر نہ کرے جب تک میں سیٹی بجا کر اشارہ نہ کروں۔ اس کے بعد ہم ایک لائن میں کھڑے کر دیئے گئے۔ دو دو قدم کا فاصلہ چھوڑ کر دو دو آدمیوں کی جوڑی بنائی گئی۔ پھر ہلالی قسم کا دائرہ بنا کر آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ کھلے میدان میں چاروں ہاتھ پاؤں سے اور درختوں کی آڑ میں سیدھے کھڑے ہو کر ہم دبے پاؤں چل رہے تھے۔ دو سو قدم تک اسی طرح آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس موقعہ پر دو سنتری ملے جو خوش قسمتی سے سو رہے تھے۔ اور ان کے منہ دوسری طرف تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے انہیں آگے بڑھ کر دبوچ لیا۔ اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ان کی پگڑیوں سے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا اس کام سے فارغ ہو کر ہم آگے بڑھے لیکن پھنکاروں کی سی آواز آنے لگی۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جب دیکھا تو تقریباً پچاس بھینسوں کا ایک گلہ نظر آیا بھینسیں سر اٹھائے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور خوفزدہ ہو کر لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں۔ یہاں خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر وہ ڈر کر بھاگ پڑیں تو ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ ڈاکو چوکنے ہو جائینگے لیکن سپاہیوں میں سے ایک نے چند قدم آگے بڑھ کر گوالوں کی طرح بولی بولی۔ اور ان کو چمکارنا شروع کیا انہوں نے بھی شاید اپنے گوالے کا دھوکا کھا کر اطمینان کا سانس لیا اور بولنا شروع کیا اس سپاہی نے ان ڈاکوؤں کے پڑاؤ کی طرف آہستہ آہستہ ہانکنا شروع کیا۔ قدرت نے ہمارے لئے یہ نہری موقع مہیا کیا تھا۔ پولیس افسر نے ہم سب کو ایک لائن میں لا کر بھینسوں کی آڑ میں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ کھلے میدان میں ان بھینسوں کی آڑ میں ہم سو گز تک بڑی آسانی سے آگے بڑھے۔ ڈاکوؤں کے پڑاؤ سے نزدیک تر ہوتے ہوئے میرے دل کی حرکت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پولیس افسر آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے تھا۔ نزدیک پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ڈاکو ادھر ادھر زمین پر پڑے سو رہے تھے۔ ہم نے تھوڑی دیر کے بعد سلطان کو بھی تاڑ لیا کیونکہ ایک چارپائی پر کوئی سو رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف دوسرے گٹھڑیاں بنے ہوئے تھے۔ اس لئے چارپائی پر سونے والا شخص سلطان ہی ہو سکتا تھا۔ پولیس افسر نے اپنے ایک جمعدار کے کان میں کچھ کہا۔ اتنے میں بھینسوں نے جب اپنے سامنے آدمیوں کو زمین پر پڑے دیکھا تو ایک دم بجائے آگے جانے کے ادھر ادھر بھاگ پڑیں پولیس افسر نے چلا کر سپاہیوں کو گھیرا ڈالنے کا حکم دیا۔ وہ اور میں چارپائی کی طرف دوڑے۔ ابھی ہم اس سے چار پانچ گز کے فاصلہ پر تھے کہ ایک ڈاکو نے خمار آلود آواز میں کہا۔

"سلطان جی بھاگو بھاگو" یہ سن کر چارپائی پر سونے والا شخص ہڑبڑا کر اٹھا۔ میں ایک بھاگنے والے ڈاکو سے ٹکرا گیا۔ پولیس افسر دوڑ کر سلطان پر جھپٹا۔ اس نے چارپائی پر سے کود کر پستول اٹھایا اور "سلام گورڈن صاحب" کہہ کر فائر کر دیا۔ خوش قسمتی سے اس کا فائر خالی گیا پولیس افسر اس کا وار خالی دیکھنے کے لئے شاید پہلے سے تیار تھا لہذا اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سلطان کے ہاتھ پر ایک ہاتھ مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد وہ سلطان کو چمٹ گیا اور کر پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ چشم زدن میں ہم نے اسے قابو میں کر لیا اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر ایک سپاہی کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ہماری مصروفیات سرگرمی سے جاری رہیں۔ پولیس افسر نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کام سر انجام دیا ایک ڈاکو بھی جان بچا کر نہ بھاگ سکا۔ اور نہ کسی کے کسی قسم کی چوٹ وغیرہ لگی۔ پولیس افسر قدرتاً حد سے زیادہ خوش تھا۔ اور اسے ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ مہینوں کی دوڑ بھاگ اور مصیبتیں اٹھانے کے بعد آج اس کا مقصد پورا ہوا تھا۔ مدت کے بعد یہ درندہ صفت انسان قانون اور انصاف کے شکنجہ میں گرفتار ہوا تھا قصہ مختصر تمام ڈاکوؤں کو باندھ کر ہم قریب کے ایک ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے جس وقت ہم سٹیشن پر پہنچے تو مشرق کی طرف سے صبح کا نور اچھل اچھل کر جنگل اور پہاڑ کو پرنور بنا رہا تھا۔ کامیابی کی دلکش صبح نہایت سرور انگیز تھی۔ اگرچہ رات بھر کی دوڑ بھاگ سے ہمارا جسم چور تھا لیکن مسرت نے ساری تکان کو دور کر دیا تھا ہم گاڑی میں سوار ہو کر اس شہر میں پہنچے جہاں ان خونخوار لٹیروں کو جیل میں بند کر کے مقدمہ چلانا تھا سلطان کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقہ میں پھیل چکی تھی اور ہر مقام پر دیہاتیوں کا بڑا مجمع اسلئے اکٹھا ہوتا تھا کہ اس شخص کی صورت دیکھ سکیں جس کے نام کے خوف سے پرامن شہری اور دیہاتی کانپا کرتے تھے۔

سلطان کا مقدمہ ایک اسپشل مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا بیسیوں ڈکیتیوں اور متعدد قتل کے عوض اسے پھانسی کا حکم ہوا اور اس کے ساتھیوں کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

سلطان نے دو سال تک انگریزی قانون کی دھجیاں فضائے آسمانی

مثلث

"خانصاحب" جناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی

رکھدوں بنائیں عشق ووفا کے مزار کی — مجھکو تلاش ہے ترے دل کو غبار کی
تربت بنا رہا ہوں دلِ سوگوار کی

ہیں ظلمتیں محیطِ غمِ ہجرِ یار کی — تاریک کس قدر ہیں گھٹائیں بہار کی
شمعیں جلا رہا ہوں دلِ داغدار کی

اللہ کا کرم ہے کرم کی نظر تری — کیا چیز ہے نگاہِ محبت اثر تری
اب دیکھتے ہیں سب مجھے نظروں سے پیار کی

کہنے کی تاب ہو تو کہوں اپنا حالِ غم — کیا آپ سے میں عرض کروں اپنا حالِ غم
دل اختیار کا نہ زباں اختیار کی

کچھ تازگی ہو حسرتِ موہوم کی جگہ — رکھدے کوئی مرے دلِ مغموم کی جگہ
تازہ کلی کھلی ہوئی صبحِ بہار کی

مخمور ہوں وہ آتشۂ سازِ عشق سے — یوں مطمئن ہوں عشرتِ آغازِ عشق سے
گویا خبر نہیں مجھے انجامِ کار کی

تو آ کہ منتظر ہیں نگاہیں تیرے لئے — آتا نہیں تو اپنے تصوّر کو بھیجدے
کٹتی نہیں ہے رات ترے انتظار کی

اب شانہ زُلف میں ہے، نہ آئینہ روبرو — بیتاب اپنی بزم میں پھرتے ہیں چارسو
یاد آگئی ہے اُن کو کسی بیقرار کی

یہ ہی تو ہے وہ درد کہ جس کی دوا نہیں — اب تیرے سامنے بھی سکوں آشنا نہیں
بے چینیاں تو دیکھ دلِ بیقرار کی

تاریکیِ نگاہ کو اللہ کیا کروں — کیا دیکھوں چاند سیرِ شبِ ماہ کیا کروں؟
اس آئینے میں بھی نہیں تصویر یار کی

تیری ہر اک طرح کی ادا دیکھ دیکھ کر — تیری نگاہِ مست و خفا دیکھ دیکھ کر
تمئیز کر رہا ہوں سرور و خمار کی

صرفِ تجلیات ہوں اے اضطرابِ دل — محوِ تصورات ہوں اے اضطرابِ دل
اتنا ٹھہر کہ کھینچ لوں تصویر یار کی

ہے زندگی و موت کا یکساں معاملہ — جو زندگی کا میری اُڑاتے تھے مضحکہ
اب خاک اُڑانے آئے ہیں میرے مزار کی[۱]

سُنبل کی خیر لالہ و ریحاں کی خیر ہو — یارب نشاطِ صبحِ گلستاں کی خیر ہو
کچھ آج مضمحل سی ہیں نبضیں بہار کی

دنیا کے دل میں رحم و مروّت ذرا نہیں — ماہر کو بعد قتل کوئی پوچھتا نہیں
کیا دربدر ہے لاشِ غریب الدیار کی

[۱] سبحان اللہ۔ کیا لاجواب شعر ہے — اظہر امرتسری

تہذیبِ فرنگ اقبال کی نظر میں

حقیقت افروز تبصرہ

از جناب شیخ عبدالرحمٰن صاحب گارڈن کالج - راولپنڈی

اقبال کے پیام - کلام اور مقام کی پہنائیوں اور رفعتوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک قلبِ تپاں اور ایک نظرِ کلیمی کی ضرورت ہے - اقبال کے جس گوشے کی طرف نگاہ اٹھتی ہے - اُس کی وسعتیں نظر کو خیرہ کر کے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہیں - اقبال کیا ہے ؟ -

شاعر - حکیم - فلسفی - غواصِ حیات - کارازداں - کائنات کے اسرار کا عالم - انسانیت کے مقام کا عارف - قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کا مبصر - وہ جس نے عصرِ حاضر کو خودی اور بے خودی کے اسرار و حقائق سے آگاہ کر کے دنیا کو منقلب کرنے کی کوشش کی اور انسان کی نظر میں ایسی وسعتیں پیدا کر دیں جو ساری کائنات پر حاوی ہیں -

اقبال خودی کا پیامبر ہے - وہ مٹی کے اُن پتلوں سے بیزار ہے جو زمانہ کے تھپیڑوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اور ہر رنگ پاٹے جاتے ہیں - اُس نے سیر لوں میں پختگی - حوصلوں میں وسعت - عزائم میں استواری - ہمتوں میں بلندی اور مقاصد میں رفعت پیدا کرنے کی کوشش کی - اور کہا کہ خودی کی ممکناتِ مضمر کا امتحان کرنے کے لئے مشکلات کا مقابلہ کرو - پہاڑوں - دریاؤں - سمندروں اور صحراؤں سے ٹکرا جاؤ - طوفانوں سے جنگ آزما ہو جاؤ اور ماسوی اللہ کو اپنی طاقت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دو - یہی مقصدِ حیات ہے اگر اس راز کو پا لو گے تو نائبِ حق کہلاؤ گے - اور موجوداتِ عالم تمہاری حلقہ بگوش ہو جائے گی - وہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر نگاہ ڈالتا ہے - تو عصرِ حاضر کے افکار کی بے دردانہ جراحی کر کے انہیں اصلاح پر لانے کی سعی کرتا ہے - اقوامِ فرنگ کی بے راہ روی کو تنقید کے شکنجے میں کستا ہے - نوعِ انسانی کے مستقبل کو مسعود بنانے کی راہیں بتاتا ہے - امراضِ عصری کی ماہرانہ نباضی اور تشخیص کر کے فکرِ صالح اور عملِ صالح کی طرف عالمِ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے -

اقبال کی نگاہ میں تہذیبِ فرنگ کی جو وقعت ہے اُس پر ہمیں اِس وقت بحث مقصود ہے -

حضرت اقبال اپنی دُور رس نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب جو آج نوعِ انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہی ہے - دنیا کے لئے مفید نہیں - وہ روحانیت کو افسردہ کر رہی ہے - وہ مادیت کی طرف لے جا رہی ہے - اُس کا سرمایہ محض علم و دانش پر ہے - دانایانِ فرنگ کی آنکھیں روشن ہیں لیکن دل بجھے ہوئے ہیں - روحیں سو رہی ہیں - اُن کے قلب سوزِ دل سے عاری ہیں - وہ دورِ حاضرہ کے علوم و فنون کی ترقی میں روحانیت کے زوال کو دیکھتے ہیں - یہ ترقی نہیں تباہی ہے - یورپ کی آزادی کی بلند آہنگیاں حقیقت میں غلامی کی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں - سائنس کی روز افزوں ترقی نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں - بلکہ تباہ کار آلاتِ حرب کی ساخت کے لئے ہے - کمزور کا گھر تاراج کرنے کے لئے ہے - اور دنیا کو تباہی کے عمیق گڑھے میں دھکیلنے کے لئے ہے - نئی تہذیب کی یہ خوش منظر عظیم الشان عمارت نہایت سُست بنیاد ہے - اس کی تعمیر ہی میں بربادی مضمر ہے - اقبال اِن تمام غیر محسوس اثرات کو دیکھتے ہیں - اہلِ مشرق کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اِن سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں -

اقبال مغربی تہذیب کا ناقد ہے - تہذیبِ فرنگ کی ہر رگ و پے سے اچھی طرح واقف ہے - اُس نے کافی عرصہ بلادِ یورپ میں رہ کر مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی - جیسا کہ پیامِ مشرق میں

ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ

اقبال جب یورپ میں تھا تو اُس نے یورپ کی طرزِ معاشرت اور کریکٹر کی تحقیر و خواری کو عریاں دیکھ لیا۔ اور یہ مشاہدات مراجعت وطن پر اپنی مشہور غزل ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا دیدارِ یار عام ہوگا !

میں ہندوستانیوں کے سامنے پیش کئے۔

اقبال مغرب کی تہذیب و تمدن کو فسونگری خرد سے تعبیر کرتا ہے عقل و دانش کی کارفرمائیوں سے بے نیاز ہو کر وہ ایک جرعۂ عرفاں مانگتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہے۔ تقلید اقبال کے مذہب میں کفر سے کم نہیں اور خاص کر یورپ کی تقلید اُس کی نظر میں موت سے کم نہیں وہ کیا خوب کہتا ہے۔ ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

اقبال ملت اسلامی کی خرابی کا بڑا سبب اسی تقلید کو سمجھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس خار و خس سے میدان صاف ہو لے۔ تو پھر اُس کا پیام سنا جائے گا جو بھٹکے ہوئے اور گمراہ ہیں۔ وہ راہِ راست پر آجائینگے اسلئے وہ بار بار فسوں گری خرد کی عمارت پر تیشہ چلاتا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ زندگی کا سب سے بڑا جہاد "تہذیب فرنگ" کے خلاف ہے وہ پہلے اہل مشرق کے دلوں میں یہ احساس خودداری پیدا کرنا چاہتا ہے۔

؎ تجلی دگرے درخور تماشا نیست

پھر وہ راستہ بتاتا ہے کہ۔ ؎

از خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

اور طرح طرح سے۔ قدم قدم پر۔ کبھی رنج سے۔ کبھی طنز سے۔ کبھی استہزا کے لہجہ میں۔ کبھی تحقیر کے پیرایہ میں۔ وہ تہذیب فرنگ کے بتوں کو سرنگوں کر دینا چاہتا ہے اور بار بار تہذیب کے دلدادگان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ ؎

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اقبال فلسفۂ فرنگ کے بت خانہ کا بڑا عالی حوصلہ اور بلند نظر غزنوی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے، سمجھتا ہے کہ دانش فرنگ سے آنکھ روشن تو ہو سکتی ہے لیکن وہ نمناک نہیں ہو سکتی۔ اس میں معرفت نہیں۔ اسلئے وہ اہلِ مشرق کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ کہ فرنگ کا اندازہ تم چراغوں کی جگ مگ سے نہ کرو۔ یہ تہذیب تمہیں گمراہ کر دے گی کیا خوب ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

نہ کر افرنگ کا اندازہ اُس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اِس جوہر کی براقی

وہ مغرب کی ترقیوں کو دیکھتا ہے اور ایک مصرع میں ختم کر دیتا ہے۔ ؎

عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

علوم و سائنس کی تمام ترقی اُس کے خیال میں ایک مٹھی خاک ہے جو پسر مریم کی آنکھ میں جھونکی گئی ہے۔ شاعر کی نظر میں مغربی تمدن کا سرمایہ کس قدر حقیر ہے۔ ؎

جلوہ اُو بے کلیم و شعلۂ اُو بے خلیل

اسرار و رموز۔ پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ۔ بال جبریل اور ضرب کلیم میں وہ اِن نقائص کو بیان کرتا ہے۔ مختلف اشاروں سے استعاروں سے۔ تلمیحات سے وہ بار بار بیان کرتا ہے اور اقبال کا دریائے بینابی۔ تہذیب فرنگ کی چٹانوں سے ٹکراتا ہے۔ اور انہیں پیس ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پیغمبروں کی طرح پیش گوئی کرتا ہے کہ اے دیارِ مغرب کے رہنے والو ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

اس پر ہی بس نہیں "شمع و شاعر" میں شاعر کیا خوب کہتا ہے

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی

جو دیکھ سکتے ہیں وہ دیکھیں۔ جو سمجھ سکتے ہیں وہ سمجھیں۔ کہ اقبال کی پیش گوئی کس حد تک درست ثابت ہوئی۔ جنگ یورپ کی تباہ کاریاں کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور آج کل جو جنگ کے بادل فضائے مغرب پر محیط ہیں وہ بھی اسی پیشگوئی کی صداقت پہ دال ہیں۔

تہذیبِ مغرب خودکشی کر چکی ہے۔ اُس نے خوفناک آلات ایجاد کئے میدانِ جنگ کو انسانی لاشوں سے پُر کرنے کے لئے نئے نئے اسلحہ بنائے۔ بجلی کو مطیع اور ہوا کو فرمانبردار بنایا۔ لیکن سچی خوشی کا راز معلوم کرنے میں ناکام رہی۔

اس کی انگیٹھی میں آگ موجود ہے اور اس کا رنگ بھی سرخ ہے لیکن وہ آگ نہیں جو منجمد خون کو رگوں میں دوڑا دے۔ جس کے پاس بیٹھنے سے مایوسی اُمید میں تبدیل ہو جائے۔ ؎

آتشے دارد مثالِ لالہ سرد
شعلہ دارد مثالِ ژالہ سرد

اِس کا شعلہ اور انگارہ دونوں ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ نہ اس میں زندگی کی گرمی ہے اور نہ ہی ہستی کی حرارت۔ مغرب کا یہ مردہ چراغ جو اپنے سراپا کو بھی روشن نہیں کر سکتا مشرق کے ایوان کو کس طرح بقعۂ نور بنا سکتا ہے۔ اِس آتشِ سرد سے حرارت مانگنا اپنی جہالت میں اضافہ کے سوا کچھ نہیں۔ جس آگ سے دل گرم نہ ہوا اُس آگ کا کیا فائدہ۔

علاوہ ازیں دوسروں کی طرف مدد کی نظر سے دیکھنا خودداری کی شان کے خلاف ہے۔ اپنے دل میں سرگرمیٔ یقین و عمل پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ ؎

آتشے افروزہ از خاشاکِ خویش
شعلہ تعمیر کن از خاکِ خویش

اِس حدیثِ دلکش کو میں حضرت علامہ کے اُس جواب پر جو آپ نے مدراس کے مشہور روزنامہ اخبار "سوراجیہ" کے ایک نمائندہ کو دیا ختم کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

"میں اِس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہئے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی، مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ یورپ میں تعلیم کا خالصتہً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگانِ ایشیا یورپ کے خالص مادّی رویہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادّی امور کو کس طرح یکجا جمع کیا جائے۔

سب سے پہلی ایشیائی قوم جسے اِس مسئلہ کو حل کرنے سے واسطہ پڑا تھا ترک تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ترک روحانیت و مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے۔ تاہم میں ترکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تاتاری نسل اس تیزیٔ فہم و ادراک و اس عمقِ ضمیر سے محروم ہے۔ جو اس مسئلہ کے حل کے لئے ضروری تھی۔ میں فی الحال اس مسئلہ کے متعلق ایران۔ عرب و افغانستان کی آئندہ روش پر بھی اظہارِ خیال نہیں کر سکتا۔ جو اقوامِ ایشیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے

میرا عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اِس کارِ عظیم کو انجام دینے کے اہل ثابت ہوں گے۔ کیونکہ اُن کی مذہبی روایات اُن کے اور آپ کی تہذیبی اور اُن کے جذبات کی شدت اِس کام کی اہلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسان کی عام بھلائی کے لئے میں یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مفاہمت کا متمنی رہتا ہوں۔ اور اسے اشد ضروری خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگانِ ہند ہی پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لئے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہئے۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لئے پیامِ موت ثابت ہو چکی ہے۔"

نوائے راز

(ابو الفاضل جناب راز چاند پوری)

رنگِ عالم دیکھ کر بیہوش ہو جاتا ہوں میں
ہوش میں آتا ہوں تو دُنیا کو ٹھکراتا ہوں میں

شیخ کی ناحق پرستی سے جو گھبراتا ہوں میں
میکدے میں دل کو بہلانے چلا جاتا ہوں میں

خام ہی ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے
ورنہ کیوں راہِ طلب میں ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

بیخبر کیا، کم نظر کیا، کافرِ مطلق سہی
لیکن اب صحنِ حرم سے اُٹھکے کب جاتا ہوں میں

آرزوئے مرگ ہے یا آرزوئے زندگی!
ایک مبہم سی خلش پھر قلب میں پاتا ہوں میں

کیا کہا دیوانہ ہوں، لاریب میں دیوانہ ہوں
دعوتِ اہلِ خرد کو روز ٹھکراتا ہوں میں

اے خدائے دین و ایماں، خیر کچھ پروا نہیں
لے ترے کعبے سے اُٹھکر دیر کو جاتا ہوں میں

ذکر بر لب، یاد در دل، حسنِ فطرت در نظر
منزلِ مقصود سے اکثر گزر جاتا ہوں میں

اللہ اللہ، یہ فریبِ آرزوئے زندگی!
خود بخود سیلِ حوادث میں بہا جاتا ہوں میں

حُسنِ فطرت پر ابھی غالب ہے کچھ رنگِ مجاز
ڈوب کر بحرِ حقیقت میں اُبھر آتا ہوں میں

رازؔ اہلِ دل سے اب تک ہے عقیدت سی مجھے
شعر کے پردے میں حالِ دل کہے جاتا ہوں میں

پیاس

تصوف آمیز دلچسپ افسانہ

از جناب ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ فرزدق

انہی جاڑوں کا ذکر ہے۔ سہ پہر کے وقت میں اپنے مکان کے وسیع صحن یا ننھے میاں کی پھلواڑی میں ننھے میاں کو گیند بلا کھلا رہا تھا۔ جب میں گیند اُس کی طرف پھینکتا تو وہ اپنی قوت سے بڑھ کر اُسے بلا رسید کرنے کی کوشش کرتا تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ بھاگنا پڑے۔ تقاضائے پدری نے میرے سن کو کئی سال کم کر دیا تھا۔ میں بھی اُسی شوق اور دلچسپی سے کھیل میں حصہ لے رہا تھا جس سے کہ وہ ـــــ وہ مجھے گیند کے پیچھے بھگا کر خوش تھا۔ تو میں بھی اُس بھاگ دوڑ میں اُس سے کم خوشی محسوس نہ کر رہا تھا۔ ذرا فاصلے پر برآمدے کے پاس خالدہ آرام کرسی پر بیٹھی ننھے کا سویٹر بُن رہی تھیں اور گاہے گاہے سلائیوں کو روک کر وہ بھی ہمارے کھیل کو دیکھ لیتی تھیں۔ اور وفورِ محبت سے اپنے لختِ جگر کی جرأت افزائی کے طور پر کوئی نہ کوئی کلمہ بھی کہہ دیتی تھیں جس سے ننھا اور جوش و خروش سے کھیلنے لگ جاتا۔ اسی طرح کوئی آدھ گھنٹے کے قریب گزرا ہوگا کہ ایک دفعہ ننھے نے جو زور سے بلا گھمایا تو گیند کو لگنے کی بجائے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خالدہ کی کہنی پر جا لگا۔ ایک ہلکی سی چیخ اُن کے مُنہ سے نکل گئی۔ جس سے ننھا سہم کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے جلدی سے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے خالدہ سے پوچھا۔

"چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟"

"زیادہ لگی ہوگی تو آپ کی بلا سے۔ آپ کا کھیل تو ہو گیا نا! اور اس کو تو دیکھو۔ اب کیسی مسکین صورت بنائی ہے" خالدہ نے دوسرے ہاتھ سے کہنی کو دباتے ہوئے کہا۔

ننھا یہ سنکر قریب تھا کہ رو پڑتا لیکن خالدہ نے فوراً اُٹھ کر یہ کہتے ہوئے "تم کیوں سہم گئے ہو میرے لال! مجھے تو کوئی چوٹ نہیں لگی" میری گود سے لیکر سینے سے لگا لیا۔ اتنے میں باہر سے کسی نے گھنٹی بجائی تو میں دیکھنے گیا۔

"ہیلو میرے شیام! میں ابھی ابھی آپ ہی کو یاد کر رہا تھا" میں نے کہا اور ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بیٹھک میں لے آیا۔

مسٹر شیام میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ گو دنیا کی نظروں میں ہم ہم مذہب نہیں لیکن ہمارے لئے یہ اختلاف کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ ہمارا مذہب محبت، اخلاص اور سچائی ہے۔ میں دل میں اُن کے لئے ایک خاص جگہ اور ایک خاص جذبہ محسوس کرتا ہوں۔ اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے لئے بھی اُن کے دل میں جگہ ہے۔ اُن کے کہنے کے مطابق شباب کے ابتدائی ایام میں تقاضائے فطری کی بنا پر اُن سے بھی عام لوگوں کی طرح لغزشیں سرزد ہوئی ہوں گی لیکن جب سے مجھے اُن کی دوستی کا شرف حاصل ہوا ہے میں نے انہیں عام انسانوں سے کہیں بلند پایا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ انہی کی بدولت میرے دل سے بھی رفتہ رفتہ سیاہی کے پردے دُور ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اسلئے گاہے گاہے جوشِ محبت و عقیدت سے میں انہیں گرو دیو کہہ کر بھی پکارا کرتا ہوں۔ اور واقعی مسٹر شیام کی بجائے انہیں بھگت شیام کہنا کہیں موزون ہے۔ انہیں یہ صفائیٔ قلب کیسے حاصل ہوئی؟ ـــــ محبت سے! وہ ایک مجسمۂ حسن و خوبی کو ایک عرصہ سے پیار کرتے ہیں۔ بلکہ پوجتے ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے حسن میں اب وہ کس کا حسن دیکھنے لگ گئے ہیں ... حسنِ انساں یا حسنِ لایزال! ـــــ اوائل میں اُن کی بھی یہ محبت عام نوجوانوں کی طرح اقتضائے شباب تھی۔ لیکن یہ حرص و ہوا اِس محبت کے پاک جذبے میں کس طرح منتقل ہو گئی ـــــ یہ ایک راز ہے جس میں صرف مولوی صاحب

کی شخصیت کو دخل ہے۔۔۔ مولوی صاحب ظاہری صورت میں ایک دنیادار کی حیثیت
رکھتے ہیں اور ایک سرکاری محکمہ میں ایک عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہیں۔ لیکن ان
کے اصول، عادات و خصائل عام دنیاداروں سے کہیں بلند ہیں۔۔۔
دنیاوی جاہ و حشمت کے تمام لوازم، خدا نے ان کے لئے مہیا کر رکھے ہیں،
لیکن اس کے باوجود غرور و تکبر کی بو تو ان کے پاس تک نہیں پھٹکی۔ بالطبع انتہائی
حلیم اور انکسار پسند ہیں۔ اور حد درجہ کے خلیق اور مہمان نواز ہیں علاوہ
ازیں گفتگو بہت کم کرتے ہیں۔ اور جب کوئی بات کرتے بھی ہیں تو وہ کوئی نہ
کوئی ناصحانہ پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے۔ تو مسٹر شیام سے میرا تعارف انہیں کے
در دولت پر ہوا تھا۔ یعنی مسٹر شیام کو ملنے سے پہلے بھی میں انہیں جانتا تھا
لیکن ان کی نیک اور محیر العقول شخصیت کا جس قدر بھی مجھ پر انکشاف ہوا ہے
وہ مسٹر شیام ہی کی طفیل ہوا ہے۔ ان کا تو اب شغل ہی یہ ہے کہ اپنا زیادہ
سے زیادہ وقت مولوی صاحب کی خدمت میں گزارتا۔ آج بھی وہ ان ہی
کے در دولت پر حاضر ہونے کی غرض سے آئے تھے۔

مسٹر شیام کے ساتھ جانے کے لئے جب میں لباس تبدیل کر رہا
تھا تو خالدہ نے پیچھے سے دبے پاؤں آکر آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ
دیا۔ جس سے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کہیں نہیں۔ مسٹر شیام آئے ہیں۔ ان کے ساتھ جا رہا ہوں"

"سینما جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں ذرا مولوی صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ اور شاید دیر
میں ہی آئیں"

"دیر میں کیوں نہ؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ ویسے ہی جب ان کے پاس بیٹھے ہوں۔
تو اٹھنے کو دل نہیں چاہتا"

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے مسٹر شیام نے آواز دی۔
"ابھی تک آپ نے کپڑے ہی نہیں بدلے؟" اور میں نے
جلدی سے سر پر ٹوپی رکھی اور ان کے ساتھ چل دیا۔

۔۔۔ ۲ ۔۔۔

جب ہم پہنچے تو مولوی صاحب بیٹھک میں پلنگ سے ٹیک لگائے
قالین پر بیٹھے ہوئے ہاتھ میں تسبیح لئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ہم بھی علیک سلیک
کے بعد ان کے پاس ہی دو زانو بیٹھ گئے۔ پندرہ بیس منٹ کی خاموشی کے بعد
مولوی صاحب فرمانے لگے۔

"مسٹر شیام! میرا خیال ہے آج کسی طوائف کے مکان پر
چلیں۔۔۔"

"جیسے ارشاد ہو"

"کیوں مسٹر نواز! آپ کا کیا خیال ہے" مجھ سے مولوی صاحب
نے فرمایا۔

"جو آپ کا خیال ہو"

میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کی بات میں کوئی اور راز ہوگا۔
لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب واقعی اسی روز ہم ایک طوائف
کے مکان پر گئے۔

میرے اور مسٹر شیام ایسے نئی روشنی سے تعلق رکھنے والے
نوجوانوں کا وہاں جانا تو ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن ہمارے
ساتھ مولوی صاحب اور راجہ صاحب کو دیکھ کر وہ کسی قدر حیران ضرور
ہوئے۔ ممکن ہے اگر مولوی صاحب اور راجہ صاحب اکیلے ہی ہوتے۔
تو بھی شاید وہ متعجب ہوتے۔ کیونکہ آج کل کے مذہبی ٹھیکیدار اپنے زہد و تقا
کی آڑ میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن ایسے بزرگوں کے ساتھ نوجوانوں کا ایسی
محفل میں جانا یقیناً ایک نئی آمیزش تھی۔۔۔!

کم از کم دس منٹ تک کمرے میں مکمل سکوت رہا۔ آخر بڑی بی
صاحبہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"قبلہ فرمایئے کیا حکم ہے؟"

چند منٹ کی اور خاموشی کے بعد مولوی صاحب نے نگاہیں اوپر
اٹھائیں اور بولے۔

"ہاں ہم کچھ گانا سننے آئے ہیں۔۔۔!"

بی صاحبہ کا اشارہ پاکر سازندے اپنا اپنا ساز اٹھائے آموجود ہوئے
تھوڑی دیر میں ایک کافر ادا حسینہ بھی سوناز دکھاتی ہوئی ہمارے سامنے
آ بیٹھیں۔ سازندوں نے درست کرتے ہوئے اپنے ساز سنبھالے اور
ہلکے ہلکے لہرہ شروع کیا۔ اس مجسمہ زہد شکن نے بھی انگڑائی لی۔ اور نیم باز

نگاہوں سے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے، دھیمے دھیمے ایک لَے پیدا کی جو رفتہ رفتہ بتدریج ایک نغمے میں تبدیل ہو گئی ـــــ اُس نے یکے بعد دیگرے کئی چیزیں سنائیں۔ لیکن مولوی صاحب کی کچھ تسلّی نہ ہوئی۔ اور گانا بند کروا دیا۔

ایک دفعہ پھر محفل پر خاموشی چھا گئی ـــــ

بی صاحبہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

"سرکار اب کیا حکم ہے۔ کیا اور گانا نہ سنیں گے؟"

"آئے تو گھر سے گانا ہی سننے تھے۔ لیکن کچھ تسکین نہیں ہوئی..... ہاں، تمہارا کوئی بچہ نہیں جو ہمیں گانا سنا سکے؟"

یہ سنکر بی صاحبہ نے فیروزہ کہہ کر کسی کو پکارا۔ اور "جی امّی" کہتی ہوئی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ گیارہ بارہ سال کی عمر ہوگی۔ جو حدِ شباب میں داخل ہوا ہی چاہتی تھی۔ گو اُس نے ایک گناہ آلود ماحول میں پرورش پائی تھی۔ لیکن ہنوز اُس کے حسین چہرے سے جو غازہ و سرخی سے معرّا تھا ایک عجیب معصومیت ظاہر ہو رہی تھی۔

"آؤ فیروزہ۔ آگے آجاؤ۔ یہاں بیٹھو اور اِن حضرت کو کوئی اچھی سی چیز سناؤ" بی صاحبہ نے کہا۔

"امّی کونسی اچھی چیز سناؤں؟" فیروزہ نے بیٹھتے ہوئے کہا

"ہاں، سرکار آپ کونسی چیز سننا زیادہ پسند کریں گے" بی صاحبہ نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹی وہ چیز سناؤ جو تمہیں زیادہ پسند ہو۔ مجھے وہی پسند ہوگی"

فیروزہ نے تصوّف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک غزل شروع کی۔ گو پہلے تو اُس کے لہجے میں کچھ جھجک تھی لیکن رفتہ رفتہ خوب کھل کر گانے لگی۔ ایک عجیب محویت کے عالم میں وہ گا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے کو راگ کی گہرائیوں میں کھو دیا۔ جس سے کمرے کی ہر چیز وجد کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مسٹر شیام اس نغمۂ توحید پر کچھ بے اختیارانہ طور پر جھوم رہے تھے۔ راجہ صاحب کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے.... میرا دل بھی اس سحر کا اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پگھلا جا رہا ہے۔ وہ زخم جنہیں وقت کے مرہم نے رفتہ رفتہ کسی قدر مندمل کر دیا تھا۔ اِن چند ہی لمحوں میں تازہ ہو گئے۔ نکہت کی تصویر بجلی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کوند گئی۔ اور میں نے ایک ٹیس سی دل میں محسوس کی۔ جس سے نہ جانے کیوں ایک ہلکی سی چیخ میرے مُنہ سے نکل گئی!

"مسٹر نواز، چھوڑ دو اب اِن بتوں کا خیال! اُس حسنِ حقیقی کیلئے دل میں تڑپ پیدا کرو"! میری حالت ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ مولوی صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ یہ سنکر میں حیران ہی تو ہو گیا کہ انہیں میری دلی کیفیت کا کیسے پتہ چل گیا؟!..... لیکن اُس وقت میرے دل کے ہر گوشے پر نکہت کا حسین تصور مستولی تھا۔ کسی دوسرے خیال کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلئے دل نے یہی جواب دیا کہ مجھے نکہت کے حسن کے سوا اور کسی حُسن کی ضرورت نہیں! اُدھر دیکھتا ہوں کہ نکہت اپنی تمامتر سنجیدگی اور متانت لئے ہوئے سامنے کھڑی ہے..... بس پھر کیا تھا؟ میں کچھ دیوانگی کی سی حالت میں ہاتھ پھیلائے ہوئے اُسے اپنے آغوش میں لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جونہی میرے ہاتھ اُس کے قریب پہنچے اُس کا مجسّمہ میرے سر سے بالشت بھر اونچا نظر آنے لگا۔ جس سے میرے اشتیاق کی آگ اور بھڑک اٹھی اور ایک وارفتگی کے عالم میں میں اچھل اچھل کر اُسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ فیروزہ کے معصوم لبوں سے نکلی ہوئی پُرسوز راگنی اور طبلے کی تھاپ میرے زخموں پر نمک پاشی کر رہی تھی۔

میں بہت دیر تک چکور کی طرح اپنے چاند کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر بیتاب ہو کر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو گانا بند ہو چکا تھا..... اِس بیہوشی سے پہلے تو مجھے سوائے نکہت کی متحرک تصویر کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اب کمرے کی ہر چیز مجھے نظر آرہی تھی..... مولوی صاحب کچھ پڑھ پڑھ کر مجھ پر دم کر رہے تھے۔ اور مسٹر شیام اپنے رومال سے میرے نچلے لب سے نکلا ہوا خون صاف کر رہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن اعتدال سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جس سے سینے کے پھٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ سانس بھی بہت تیز تیز چل رہی تھیں۔ اور اُس سے نہ جانے کیوں جلے ہوئے گوشت کی سی بُو آرہی تھی؟!

قریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب میری حالت اچھی طرح سنبھل گئی تو ہم اُس مکان سے نکلے اور ٹانگے پر سوار ہو کر ایک ہوٹل میں پہنچے۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے ـــــ رخصت ہوتے وقت جب میں مسٹر شیام سے مصافحہ کرنے لگا تو وہ بولے۔

"واللہ! آج تو آپ سراپا عشق ہی بن رہے ہیں!" ذرا ٹھہر کر "گھبرائیں نہیں آج آپ نے بازی جیت لی ہے"!

میں گھر تک تمام راستہ مسٹر شمیم کے ان الفاظ پر غور کرتا اور انہیں دل ہی دل میں دُہراتا آیا۔ لیکن ان سے کچھ بھی مطلب اخذ نہ کر سکا۔۔۔

آدھی رات کے قریب میں گھر پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا اسلئے بیٹھک کا تالا کھول کر ہی اندر داخل ہونا پڑا۔ خالدہ کے پلنگ کے قریب تپائی پر رکھا ہوا برقی لیمپ ابھی تک جل رہا تھا۔ اور خالدہ کے سینے پر اُلٹا پڑا ہوا رسالہ ظاہر کر رہا تھا کہ بہت دیر تک میرے انتظار میں رسالہ دیکھتے دیکھتے آنکھ لگ گئی ہے۔ میں نے انہیں بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ احتیاط سے رسالہ اُٹھا کر تپائی پر رکھ دیا۔ اور آہستہ سے رضائی سرکا کر اُس کے اوپر کر دی۔

میں بستر پر لیٹا ہوا اپنے دماغی پردوں پر آج کا دلگداز فلم دیکھ رہا تھا۔ کہ میں نے پیاس محسوس کی ـــــ اس بے وقت پیاس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہوٹل میں ہم نے جو بھُنی ہوئی مچھلی اور کباب کھائے اُن میں مصالحہ بہت زیادہ تھا۔ اور میں اِس کا عادی نہیں ہوں۔ گو پیاس بہت سخت تھی لیکن نہ ہی میں خالدہ کو جگانا چاہتا تھا اور نہ ہی خود رضائی میں سے اُٹھنے کو دل چاہتا تھا۔ اسلئے کافی دیر تک اسی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد پانی پئے بغیر ہی سو گیا۔

۳

موسم گرما کی ایک دوپہر تھی۔ سورج کی تمازت سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا میرا گھوڑا بھی پسینے میں ڈوبا ہوا بار بار زبان باہر نکال رہا تھا۔ لیکن پیاس مجھے مجبور کر رہی تھی۔ کہ پھر بھی میں اُسے سرپٹ دوڑائے چلا جاؤں۔ اندیشہ تھا اگر کچھ دیر اور پانی نہ ملا تو شاید میں اِس پیاس سے جانبر نہ ہو سکوں! چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ اور سورج کی تیز شعاعوں نے ہر ریت کے ذرّے کو ایک ننھا سا آفتاب بنا دیا تھا۔ کہیں آبادی کا کوئی نشان نہ تھا کہ جہاں سے پانی ملنے کی اُمید ہو سکے ـــــ دُور گھنے درختوں کے جھنڈ میں سے دو مینار سے نظر آ رہے تھے اور ایک موہوم سی اُمید مجھے اُسی طرف کو جا رہا تھا۔

متواتر آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد جا کر کہیں منزل مقصود پر پہنچا یہ ایک قلعہ تھا جس کی بلند دیواریں سُرخ پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ قلعے کے چاروں طرف ہرے بھرے خوبصورت باغات تھے ـــــ پیاس کی انتہائی شدت سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے کو تھا۔ جب میں نے قلعے کے صدر دروازے میں کھڑے پہرہ دار سے پانی پلانے کی التجا کی

"میں دیکھتا ہوں کہ پیاس نے تمہیں نڈھال کر رکھا ہے۔ مگر افسوس میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میری چھاگل کا پانی ختم ہو چکا ہے! پانی کا چشمہ قلعہ کے درمیانی باغ میں ہے اور آج وہاں شہزادی صاحبہ اپنی سہیلیوں سمیت جشنِ نوروز منا رہی ہیں۔ اِس وقت باغ میں کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ شہزادۂ عالم بھی آج وہاں نہیں جا سکتے۔ باغ میں چاروں طرف کنیزیں برہنہ تلواریں ہاتھوں میں لئے پہرہ پر کھڑی ہیں۔" پہرہ دار نے جواب دیا۔

"بھئی! خدا کے لئے کسی طرح مجھے پانی پلاؤ ورنہ میری جان نکل رہی ہے"

"افسوس! میں تمہاری کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ میری طاقت سے باہر ہے" پہرہ دار نے انتہائی مایوسی کی حالت میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پہرہ دار کا یہ مایوس کن جواب سنکر اب زندگی کی تو کوئی اُمید باقی نہ رہی تھی۔ خیال گزرا کہ جہاں اتنی جد و جہد کی ہے، آخری کوشش بھی کر دیکھوں ۔۔۔۔ میں نے پیچھے ہٹا کر گھوڑے کو جو ایڑی لگائی تو وہ پہرہ دار کو انگشت بدنداں چھوڑ کر یہ جا وہ جا کئی دروازوں میں سے گزرتا ہوا باغ میں شہزادی کے تخت کے قریب جا پہنچا۔ تمام کنیزوں نے شور مچا دیا۔ باغ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ سہیلیوں نے گھبرا کر اپنے حسین چہروں کو نقابوں سے چھپا لیا۔ شہزادی نے فرطِ حیرت سے مُڑ کر دیکھا۔

"شہزادی! کون؟ نکہت؟ ! میرے حسین خوابوں کی شہزادی؟!" بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا اور مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی ۔۔۔۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے کو ایک نہایت ہی بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں ایک نہایت خوبصورت اور مکلف پلنگ پہ لیٹا ہوا پایا۔ روشنی کے لئے جا بجا کافوری شمعیں جل رہی تھیں۔ اور کمرہ کچھ ایسی دھیمی دھیمی خوشبو سے معطر تھا جس سے میری قوتِ شامہ

مانوس نظر آتی تھی۔ میں نے کروٹ بدلی تو ایک نوخیز اور حسین لڑکی کو اپنے پر جھکے ہوئے پنکھا کرتے دیکھا لیکن جونہی اُس نے مجھے آنکھیں کھولے ہوئے ہوش میں پایا۔ وہ پنکھا تپائی پر رکھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں شہزادی کمرے میں داخل ہوئی۔ اور میرے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اُٹھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ ابھی بہت کمزور ہیں متواتر دو دن کی بیہوشی کے بعد خدا خدا کر کے اب کہیں ہوش آیا ہے۔"

شہزادی کی زبان سے یہ سنکر کہ دو دن تک بیہوش پڑا رہا ہوں مجھے بہت تعجب ہوا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی سو یا ہوں۔ اور پھر آنکھ کھل گئی ہے! ... میں ابھی اسی حیرت میں تھا کہ وہی حسین لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور شاہی حکیم کے آنے کی اطلاع دی۔

حکیم صاحب نے میری نبض دیکھتے ہوئے کہا۔

"جہاں پناہ! شکر ہے خدا کا آپ کے مہمان کو ہوش میں دیکھ رہا ہوں۔ آج صبح تو میں ان کی زندگی سے مایوس ہی ہو چکا تھا....."

"اب تو کوئی خطرہ نہیں نا!" شہزادی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا

"نہیں جہاں پناہ! اب انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ وہ بھی چند روز تک دُور ہو جائے گی۔"

"لیکن حکیم صاحب اِس مسلسل بیہوشی کی وجہ بھی معلوم ہوئی!"

"جہاں پناہ! جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، صرف پیاس نہیں ہو سکتی....."

"اور پھر!" ؟۔

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلسل صدمے نے اِن کے دل کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اب معمولی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا!"

کچھ دیر تک شہزادی ایک عجیب انہماک اور توجہ سے میری صحت کے متعلق حکیم صاحب سے پوچھتی رہیں۔ پھر جب ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ چلے گئے۔ تو مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"آپ کوئی تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے" ؟۔

"نہیں تکلیف تو کوئی نہیں۔ پیاس ضرور محسوس کر رہا ہوں۔"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا!" کہتی ہوئی اٹھیں اور میرے سرہانے پڑی ہوئی تپائی پر سے شیشے کی صراحی میں سے سُرخ رنگ کا شربت ایک چھوٹے سے پیمانے میں ڈال کر مجھے دیا۔

شربت تھا تو یقیناً فرحت بخش لیکن میری پیاس شاید نہ بجھنا تھی، نہ بجھی! میں نے خالی پیمانہ تپائی پہ رکھ دیا۔ اور حالات پہ غور کرنے لگا ــــ یہ شہزادی کون ؟ میری نکہت! میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ میں نے تو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ لیکن یہ سب طلسم میری سمجھ میں نہیں آتا..... نکہت اور شہزادی کے بہروپ میں! یہ قلعہ، یہ باغ، یہ محل، یہ شاہانہ شان و شوکت، یہ سب کیا ہے ؟ ــــ جب میں کچھ بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکا تو میں نے اُسی معمۂ مجسم سے پوچھنا چاہا ــــ

"شہزادی صاحبہ میں آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ....."

"ہاں، ہاں، آپ جو چاہیں شوق سے دریافت کر سکتے ہیں لیکن کل ــــ ابھی آپ بہت کمزور ہیں۔ اور حکیم صاحب نے زیادہ گفتگو سے منع کیا ہے اور وقت بھی کافی گزر چکا ہے۔ شہزادۂ عالم میرا انتظار کر رہے ہوں گے!"

دوسرے روز میری طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی ــ بدن میں توانائی آچکی تھی۔ میں اچھی طرح چل پھر سکتا تھا۔ میں نے غسل بھی کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر ٹہلتا ٹہلتا باغ میں جا پہنچا ــــ باغ کیا تھا ؟ شاید یہ وہی باغِ بہشت تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے لاکھوں زاہدوں نے خلوت گاہوں میں بیٹھے عبادت میں عمریں گزار دی ہیں۔ اور پھر بھی حاصل نہیں کر سکے..... دراصل وہ بھولے ہوئے ہیں۔ انہیں عبادت کی بجائے صرف دل میں اُس معبودِ حقیقی کے لئے جذبۂ محبت پیدا کرنا چاہیئے۔ پھر بہشت اُن کے قدموں تلے ہے۔ کیونکہ جب مجھے ایک انسان کی محبت نے یہاں تک پہنچا دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ خالقِ دو جہاں کا عشق انہیں وہاں نہ لے جائے۔ یہ تو وہ جذبۂ صادق و غالب ہے جو نارِ جہنم کو بھی گلزارِ جنت میں تبدیل کر سکتا ہے ــــ میں باغ کی گوناگوں دلفریبیوں اور دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا آہستہ آہستہ بارہ دری میں پہنچ گیا اور ایک در میں کھڑا ہو کر خوش رنگ و خوبصورت پرندوں کا نظارہ کرنے لگا۔ جو پَر سے پھولوں کی کیاریوں میں اپنے

چہچہوں سے باغ کی پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ وہاں کی ہر چیز اپنے میں ایک ندرت لئے ہوئے تھی۔ جس سے اُس کے آسمانی ہونے کا یقین ہو جاتا تھا۔ ایسی چیزوں کا زمین پر ہونا قطعاً ناممکن ہے بارہ دری تمام کی تمام بلور کی بنی ہوئی تھی جتی کہ درمیانی تخت اور کرسیاں بھی بلور ہی کی بنی ہوئی تھیں۔ کھڑے کھڑے جب میں تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا تو میں ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اور بارہ دری کی چھت کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مختلف رنگ کے بلور کی ہی بنی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں تو بالکل رات ہی کا دھوکہ ہوتا تھا —— اسی طرح چھوٹے بڑے ستارے چمک رہے ہیں اور ایک طرف نئی دلہن کی طرح بادلوں کے گھونگھٹ میں سے ہلالِ نو جھانک رہا ہے ——

میں ابھی رات کے اس دلفریب منظر کو ہی دیکھنے میں محو تھا کہ پیچھے سے دبے پاؤں کسی نے آکر میری آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے جس سے میں ڈر ہی تو گیا۔ اور میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا

"ہائیں! یہ کون ؟"

شہزادی چہرے پر ہلکا سا سنجیدہ تبسم لئے سامنے آگئیں۔ اور میرے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں —— "معاف کیجئے گا۔ میں نے ناحق آپ کو پریشان کیا! لیکن ہاں، آپ یہاں کیوں چلے آئے ہ حکیم صاحب نے تو ابھی دو چار روز اور آرام کرنے کو کہا تھا ..... آپ ہی کے کمرے سے آ رہی ہوں۔ وہاں آپ کو نہ پا کر میں سخت فکرمند تھی "!

"اس بے لوث ہمدردی کے لئے شکریہ۔ آپ ہی کی بدولت میری جان بچی ہے۔ ورنہ پیاس نے تو میرا کام تمام ہی کر دیا تھا ....."

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہ میرا فرض تھا جو میں بجا لائی۔ آپ پر احسان نہیں کیا ..... خیر ان فضول باتوں کو چھوڑیئے۔ آپ رات مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے تھے ؟!"

"چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں اور صحیح جواب دینے کا وعدہ کریں تو"!

"شوق سے کہئے اور اطمینان رکھئے یہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا۔" شہزادی نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔

میں سوچ رہا تھا کس طرح مدعائے دل کی تمہید کروں۔ آخر میں نے گلا صاف کیا اور ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں۔ یا آپ نکہت ہی ہیں ؟"

"نکہت! ....." بیساختہ اُن کی زبان سے نکلا۔ اور وہ کچھ کھو سی گئیں۔ فوراً ہی اُن کے بشاش چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ "یا آپ نکہت ہی ہیں! ..... نکہت ؟ میں یقیناً نکہت ہی ہوں! —" ذرا ٹھہر کر —— "نکہت! افسوس، اب تمہارا راز تمہارا نہ رہا! ..... وہ اُسے نہ چھپا سکے! ——" پھر گویا چونک کر محویت سے نکلیں اور میری موجودگی کو محسوس کر کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کی جھلک پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی گفتگو کی طرف کچھ زیادہ دھیان نہ دے سکی ..... دراصل میری طبیعت قدرے خراب ہو رہی ہے اسلئے اب واپس محل میں جانا چاہیئے"

مجھے شہزادی کے نکہت ہونے کا یقین تو پہلے سے ہی تھا۔ لیکن اُن کی موجودہ بدحواسی نے میرے یقین کو مستحکم کر دیا۔ اُن کے اُداس چہرے کا اُتار چڑھاؤ، اُن کی دلی کشمکش کا آئینہ دار تھا۔

"نکہت گھبراؤ نہیں" میں نے کہا "تمہارا ہر راز اب بھی تمہارا ہی ہے۔ اُس شخص کے سوا جس پر تم نے بھروسہ کیا اور کوئی اس راز کا واقف نہیں۔ اُس کا سینہ اتنا مضبوط ضرور ہے کہ تمہارے ہر راز کو ہمیشہ کے لئے چھپا سکے!" میں اُن کی پریشانی زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا اور کسی اندرونی جوش کے ماتحت بولا۔

"نکہت! نکہت! میری اچھی نکہت!! ادھر دیکھو! میں ہی تمہارا نواز ہوں! ..... لیکن نکہت تم نے کس طرح مجھے اتنی جلدی بھلا دیا۔ پہچان تک نہ سکیں!"

تھوڑی دیر تو وہ تصویر حیرت بنی میرا منہ تکتی رہیں پھر آنکھیں بند کر کے پیچھے کو آرام کرسی پر لیٹ گیا —— اور میں یوں کہتا چلا گیا۔

"تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے۔ کے مصداق تمہیں بھولنا تو درکنار، میں کوئی بھی بات نہ بھول سکا۔ جس کا تم سے تعلق تھا ——

بیتے ہوئے دنوں کے تمام واقعات ایک فلم کی طرح بالترتیب میرے دماغی پردوں پر اب بھی تم دیکھ سکتی ہو۔ شروع سے لیکر اخیر تک!۔ ...... میں نے تمہیں دیکھا پہلی بار! اچانک اور اتفاقیہ!...کسی افسانے کی ہیروئن کی طرح میں تمہیں انتہائی خوبصورت نہیں سمجھتا اور نہ ہی یہ ہے کہ پہلی ہی نگاہ میں مجھے تم سے عشق ہو گیا ہو—— ہاں، تمہارے سنجیدہ چہرے کے موزون خط و خال کچھ دھندلے سے نقوش میرے دل پر ضرور چھوڑ گئے۔ جو رفتہ رفتہ واقعات کے زیر اثر گہرے اور نمایاں ہوتے گئے۔ اور کوئی زبردست طاقت مجھے تمہاری جانب مائل کرتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ انس و چاہت کی جگہ دل میں تمہارے لئے محبت کا ایک بحر بے پایاں محسوس کرنے لگا——

”تم سے پہلے بھی محبت کے نام سے آشنا تھا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ لیکن نکہت تم ہی نے صحیح معنوں میں مجھے محبت کی حقیقی لذتوں سے واقف بنایا۔ اور میں نے اپنے کو اس کی گہرائیوں میں کھو دیا میں دن رات پروانہ وار تمہارے لئے تڑپنے لگا۔ جس کو تم بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ تم بھی مجھے چاہنے لگیں۔ تمہاری حرکات و سکنات میں کچھ بے اختیاری سی نظر آنے لگی، لیکن پھر بھی تم نے اس چنگاری کو دبانے کی کوشش کی۔ انتہائی کوشش! شاید تمہیں معلوم نہ تھا۔ کہ یہی چنگاری ایک روز شعلہ بن کر بھڑک اٹھے گی اور بجھائے نہ بن پڑے گی!——

تم چاہتی تو نہ تھیں کہ تمہاری دلی کیفیت مجھے معلوم ہو۔ حیا مانع تھی۔ کچھ کچھ حجاب بھی تھا۔ لیکن تمہارے دل کی بات میرے دل تک پہنچ ہی گئی۔ اور انجام کار میری محبت نے مجبور کر دیا کہ تم اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھدو—— اور تم نے اقرار کر لیا محبت کا! جس کے نتیجے کے طور پر میں اور بیخود ہو گیا۔ میں اپنے کو تمہاری محبت میں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اور آخر فنا کر دیا۔ ...... یہ حقیقت ہے کہ پھر میں نہ رہا۔ تم ہی تم تھیں دونوں قالبوں میں! یہی وجہ تھی کہ جو خیال ایک دل میں پیدا ہوتا۔ فوراً اُسے دوسرا محسوس کر لیتا——

”نکہت کیا تم وہ دن بھی بھول گئی ہو۔ جب تم راتوں میرے لئے بیقرار رہتی تھیں؟ اور میری ذرا سی تکلیف تمہیں بے چین کر دیتی تھی——! تم حد سے زیادہ پریشان ہو جاتی تھیں۔ بلکہ میرے درد کو اپنا محسوس کرتی تھیں۔ میرا ایک دن بھی تم سے جدا رہنا تمہارے لئے قیامت برپا کر دیتا تھا۔ دنیا کی دلچسپیاں تمہارے لئے اپنے میں کوئی کشش نہ رکھتی تھیں۔ ہر طرف تمہیں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا اور پھر مجھے پا کر تم اتنا خوش ہوتی تھیں جیسے دنیا بھر کی دولت مل گئی ہو—— نکہت! تمہیں وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ تمہارے لئے صحیفۂ آسمانی سے کم نہ ہوتا تھا اور اُس پر عمل کرنا تم اپنا ایمان سمجھتی تھیں! میرے کہنے پر عمل کرنے سے تمہیں دلی راحت ہوتی تھی۔ اس سے تم ایک عجیب لطف محسوس کرتی تھیں! ...... یہ سب کیوں تھا؟ کیا چیز تھی جو تمہیں ہر بات پر مجبور کرتی تھی؟ ...... یہ سب محبت ہی تھی۔ جیسا کہ تم اکثر کہا کرتی تھیں!——

”نکہت، وہ دن بھی کیا تھے۔ جب ہم ایک دوسرے میں کھو گئے—— دو سے ایک ہو گئے ...... پھر نہ میں تھا نہ تم تھیں—— عشق ہی عشق تھا ...... آخری منزل فنا کی!“

پیاس جو کسی قدر دب گئی تھی تذکرۂ عشق سے پھر بھڑک اٹھی! حلق بالکل خشک ہو گیا۔ بات تک نہ کر سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا ”پانی!“

یہ سنکر شہزادی جو ابھی تک آنکھیں بند کئے محویت کے عالم میں ہمہ تن گوش بنی میری باتیں سن رہی تھیں۔ اٹھیں اور تخت کے ایک پائے پر لگا ہوا چھوٹا سا بٹن دبایا۔ فوراً تخت کے نیچے سے ایک بلور کی الماری نمودار ہو گئی جس میں چار خانے تھے۔ سب سے اوپر طرح طرح کی مٹھائیاں چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں پڑی تھیں۔ اس سے نچلے خانے میں چاندی کی ایک خوشنما طشتری میں تازہ بتازہ پھل رکھے تھے۔ تیسرے خانے میں قسم قسم کے شربت شیشے کی صراحیوں میں بھرے پڑے تھے۔ اور سب سے نیچے چھوٹی بڑی پلیٹیں اور خالی گلاس تھے—— شہزادی نے سبز رنگ کا شربت ایک گلاس میں ڈال کر مجھے دیا۔ اور پھر اسی آرام کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جب میں نے خالی گلاس اُن کی طرف بڑھایا تو وہ بولیں——

”اور دیجئے گا؟“

”اس وقت تو اور حاجت نہیں—— یہ کیا شربت آپ نے دیا؟ حلق سے اترتے ہی سب پیاس اور جلن غائب! اور ذائقہ اتنا لطیف

کہ آج تک کبھی دیکھا ہی نہ تھا! ..."

"شکر ہے آپ کی طبیعت سنبھل گئی۔ ورنہ میں تو آپ کی حالت دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں بیہوشی طاری نہ ہو جائے۔ اب تو طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں اِس وقت تو طبیعت بشاش ہے۔ سمجھ نہیں آتی یہ شربت کا اثر ہے یا تمہاری مسیحائی؟ ...."

"خیر چھوڑیئے اِن باتوں کو اور کہتے چلیے وہی بیتے ہوئے واقعات ایک بار پھر مجھے انہی لذتوں میں کھو جانے دیں ——"! انھوں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں!" میں نے کہنا شروع کیا۔ "فنا کے بعد ہم بقا کے درجے میں آئے —— اب وہ بیخودی و وارفتگی نہ تھی! اب وہ جلنا نہ تھا۔ وہ تڑپنا نہ تھا! اب ہوش تھا۔ سکون تھا۔ اب بُرے بھلے کی تمیز تھی! —— میں نے نشیب و فراز اور گرد و پیش کے حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ میں کسی قیمت پر بھی تم سے الگ ہونا نہ چاہتا تھا۔ اسلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمارے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو جائے جس سے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہ کر سکے! کئی روز کی مسلسل سوچ و بچار کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچا جو آخری تھا! میں نے اپنے تجویز کردہ رشتے کے متعلق تم سے رائے طلب کی ..... تمہیں میری تجویز پسند تھی! اس طرح ہم نے اپنے درمیان ایک رشتہ قائم کر لیا —— پاک، بے ضرر اور بے لوث! اس رشتے نے ہمارے دلوں سے رہا سہا بوجھ بھی دُور کر دیا اور ہم نے حقیقی راحت محسوس کی! —

"دنیا کا دستور یہی ہے —— ہر رنج کے بعد راحت اور ہر راحت کے بعد رنج کی باری آتی ہے! دنیا کے اسی دستور کے مطابق اچانک وہ دن آپہنچا۔ جس کے نام سے ہی تم لرز جایا کرتی تھیں۔ وہی دن —— جدائی کا! لیکن جیسا کہ ہم رنج و راحت کو اُس قادرِ مطلق کی طرف سے سمجھ کر بخوشی سہتے آئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح ہم نے اِس دن کا بھی بخندہ پیشانی استقبال کیا۔ گویا امتحان بہت صبر طلب تھا —!

"نکہت، میری اچھی نکہت! بولو —— کیا وہ دن بھی بھول گئی ہو۔ جب نمینوں کی جھڑی میں تم نے مجھے الوداع کہا؟ —— کتنا صبر آزما تھا وہ منظر! ایک دل کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ جن کے دوبارہ ملنے کے متعلق وہی قادرِ مطلق جانتا تھا۔ ظاہر صورت کوئی اُمید نہ تھی! اُس وقت تو میں نے اسلئے استقلال کا دامن نہ چھوڑا کہ کہیں تم اِس کٹھن امتحان میں ثابت قدم نہ رہ سکو! لیکن نکہت، خدا گواہ ہے کہ تم سے علیحدہ ہو کر میں نے کئی راتیں روتے سحر کیں۔ کسی طرح طبیعت سنبھلتی ہی نہ تھی! گو وقت ہر زخم کے لیے بہترین مرہم کا کام دیتا ہے۔ لیکن میرے زخم کے لیے وہ بھی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ وقت اور ضرورت دونوں نے مل کر اِس قابل کر دیا کہ میں اپنے پر کسی قدر قابو پا سکوں! ڈر تھا کہ میری چشمِ تر کہیں تمہارے راز کو فاش نہ کر دے!!!

"نکہت! گو تم سے جدا ہوئے عرصہ گزر گیا ہے۔ بلکہ محسوس تو یوں ہوتا ہے جیسے صدیاں ہی بیت گئی ہیں۔ لیکن اب تک تمہیں بھولنا تو درکنار میں کوئی بھی بات نہیں بھول سکا جس کا تم سے تعلق ہو —— مجھے تو آج تک کوئی ایسی رات یاد نہیں پڑتی کہ میں تمہارے لئے آنسوؤں کی مالا پروئے بغیر سو گیا ہوں!! اور جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ میں نے تو تمہیں نہ بھولنے کے لئے تمہاری مستقل یادگار قائم کر لی ہے۔ تاکہ تمہاری یاد دلاتی رہے! دعا کرنا خدا تمہاری یادگار کو ہمیشہ قائم رکھے —— !

"نکہت گھبراؤ نہیں۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے مقصد سے غافل نہیں۔ یا تو ایک روز ہمارا یہ پاک رشتہ دنیا تسلیم کرے گی یا میں اسی کوشش میں جان دے دوں گا ......"!

"میرے نواز! بس ..... بس .... میں اور نہیں سُن سکتی! اب مجھ میں تاب نہیں رہی —— میں خطاوار ہوں۔ اپنے پاک رشتے کا صدقہ میری خطائیں معاف کر دیجئے۔ گو میں آپ کی صحت میں فرق آجانے کی وجہ سے آپ کو پہچان نہ سکی۔ لیکن جب سے آپ باغ میں داخل ہوئے ہیں، کوئی اندرونی جذبہ تھا۔ جو آپ سے لپٹ جانے پر مجھے مجبور کر رہا تھا۔ میں حیران تھی ایسا کیوں ہے! —

"میرے نواز! نکہت آپ ہی کی تھی۔ آپ ہی کی رہی اور آپ ہی کی رہے گی۔ صرف اپنے نواز کی! اور نکہت اپنے نواز کو ہر سانس کے ساتھ یاد کرتی رہی ہے۔ کیونکہ نکہت عورت ہے۔ اور عورت زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کیا کرتی ہے۔ اور پھر آخری دم تک اُسے

بٹھانے کی کوشش کرتی ہے "یہ کہتی ہوئی شہزادی اٹھیں اور اپنے کو میرے پاؤں پر گرا دیا۔

میں نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور دیکھا تو وہ رو رہی تھیں ۔۔۔ !

"میری اچھی نکہت میں جانتا تھا کہ تم بھی مجھے یاد کرتی ہو۔ میرا دل گواہی دیتا تھا! لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ سب طلسم کیا ہے ؟ یہ کیا راز ہے ؟"

"میرے اپنے نواز! یہ سب آپ ہی کی دعاؤں کا اثر ہے! آپ ہی کی دعاؤں کے بدلے یہ باغ بہشت مجھے ملا ہے۔ یہ سب سلطنت میری ہی ہے۔ اور میں اس سلطنت کی شہزادی ہوں!"

"نکہت! اگر میرے اُن الفاظ کو یاد رکھو گی اور اُن پر عمل کرتی رہوگی جو وقتِ وداع میں نے تم سے کہے تھے تو ایسے کئی بہشت تمہارے پیروں تلے ہوں گے ....." میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ خالدہ کی آواز کان میں پہنچی۔

"آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔ اُٹھئے نا۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے"

آنکھ کھلی تو نہ وہاں نکہت تھیں نہ باغ بہشت! ہاں سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔۔۔ !

مزار شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

از جناب سکندر علی صاحب وجد

کس قدر دلدوز صیادِ اجل کا تیر ہے
دیر سے آسودۂ خوابِ فنا نخچیر ہے

خاک کا تودہ نہیں یہ قبرِ عالمگیر ہے
بادشہ ہو یا گدا سب کی یہی تقدیر ہے

پل میں سب کس بل نکل جاتے ہیں جب آتی ہے موت
جسم ہی کیا، شان و شوکت کو بھی کھا جاتی ہے موت

موت کی ضربت سہی کاری جس کا ادنیٰ وار تھا
جس کا غصہ فرقِ دشمن کے لئے تلوار تھا

جس کے دم سے ہند سارا عرصۂ پیکار تھا
صاحبِ سیف و قلم تھا صاحبِ کردار تھا

زندگی جس کی سراسر اک مسلسل جنگ تھی
جس کے دشمن کے لئے ساری خدائی تنگ تھی

ہاں! یہ مشتِ خاک ہی تھا مالکِ ہندوستاں
تیغ کر دیتی تھی جس کی خون کے دریا رواں

حکم سے جس کے برستی تھیں سروں پر بجلیاں
جس کی ہیبت سے لرزتے تھے زمین و آسماں

آج آغوشِ لحد میں کس قدر خاموش ہے

ہوش والا اب ہمیشہ کیلئے بیہوش ہے

جُنبشِ ابرو تھی جس کی تیز تر شمشیر سے
جس نے تقدیریں بدل دیں خوبیٔ تدبیر سے

بچ سکا خاطی نہ ہرگز جس کی دار و گیر سے
ہے عیاں شانِ سیاست جس کی ہر تحریر سے

موت نے جوہر مٹا ڈالا دمِ شمشیر کا
ایک ہی ضربت میں منکا ڈھل گیا تدبیر کا

جو لیا کرتا تھا راجوں اور مہاراجوں سے باج
فوجیوں نے جس کے چھینے سیکڑوں شاہوں کے تاج

خود سروں کے جس نے دم میں ٹھیک کر ڈالے مزاج
قبر کے نیچے میں مٹی کی طرح بے بس ہے آج

ایک ہی انجام ہے کمزور اور شہ زور کا
پیس کر دونوں کو رکھ دیتا ہے کونا گور کا

عُمر ڈھلتی دھوپ ہے اسکی حقیقت کچھ نہیں
مال و دولت عبث ہیں شان و شوکت کچھ نہیں

شادی و غم دو گھڑی کی عیش و راحت کچھ نہیں
سارے خالی ڈھول ہیں اقبال و عظمت کچھ نہیں

صاف و روشن فیصلہ ہے یہ دلِ آگاہ کا
نقش مِٹ جاتے ہیں سب، رہتا ہے نام اللہ کا

عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۴۰ء عدیم النظیر و قابلِ رشک خصوصیات کا حامل ہوگا!

شاعری اور موسیقی

مقدّم و مؤخّر کی بحث

(از جناب امجد علی خاں صاحب یوسف زئی (عثمانیہ)

شاعری اور موسیقی دونوں فنونِ لطیفہ کی شاخیں ہیں۔ اور انہیں فنونِ لطیفہ میں زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے یہ بحث خالی از دلچسپی نہیں کہ دنیا میں شاعری کا وجود پہلے ہوا یا موسیقی کا۔ چونکہ دونوں کی تاریخ اب تک تاریکی میں ہے اس واسطے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں میں سے کونسا فن مقدم ہے۔ اور کونسا موخر۔ تاہم جس قدر تحقیق ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ فن موسیقی مقدم ہے۔

موسیقی کی قدامت } زمانہ قدیم میں اہل مصر اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ اور اسے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی یہ زمانہ ۶ ہزار برس قبل کا بتایا جاتا ہے (برٹش انسائیکلوپیڈیا جلد، صفحہ ۲۷۹)

موسیقی کے مقدم ہونے کے متعلق قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا خود موسیقی سے پیدا ہوئی (اوٹ لائن آف نالج جلد ۳ صفحہ ۳۲۰)

اسی طرح چین میں آج سے تقریباً ۵ ہزار برس قبل موسیقی کا چرچا تھا چنانچہ فوہی (۲۸۵۲ - ۲۷۲۵ ق م) پہلا شخص تھا جس نے اہلِ چین کو اس فن سے روشناس کرایا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ نہایت وحشی تھے۔ اور والدین کے سوا کسی کو شناخت نہیں کر سکتے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۱۹۱)

اسی طرح ایران میں جہاں کی تاریخ کیومرث سے شروع ہوتی ہے فن موسیقی کو نہایت فروغ تھا۔ اور اس کو ساڑھے چار ہزار سال گزر چکے ہندوستان میں بھی یہ فن ہزارہا سال سے رائج ہے۔

شاعری کی تاریخ کا کوئی خاص زمانہ مقرر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ انسان نے خود ہی اپنی تاریخ لکھی ہے اس واسطے وہ اس پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ تاریخ لکھنے کا اسے اس وقت موقع ملا جب وہ اپنی پہلی حالت اور پہلی سرگزشتیں قریباً فراموش کر چکا تھا یا ان کی یادداشت ایسی مدھم اور کمزور پڑھ چکی تھی کہ ان کی صحت اور غلطی کی بابت کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ ان حالات میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری کا شروع کیوں کر ہوا۔ (فنونِ لطیفہ مولفہ سلطان احمد صفحہ ۹۲)

دُنیا کی ابتدائی کتابوں میں موسیقی کا تذکرہ!

دنیا کی اکثر زبانوں بالخصوص سنسکرت کی ابتدائی کتب نظم میں لکھی گئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ چونکہ فطری طور پر شاعری کی ابتدا موسیقی سے ہوئی لہٰذا اس کی ساری کائنات پر نغمیت کا اثر و اقتدار قائم رہنا لازمی تھا اور شاید اسی لئے سنسکرت زبان کے حروف تہجی کے ذخیرے میں کرخت و ثقیل اور غیر موزون حروف کا فقدان ہے علاوہ بریں مشہور نقاد گرننگ لیمبرن کے خیال کے مطابق حسن خوبصورتی کے ساتھ موسیقی ذہن و دماغ میں مستور رہتی ہے زبان پر اگر اس میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی اور جب یہ الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔
(زمانہ کانپور۔ جنوری ۳۷ء)

دنیا کی ابتدائی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل موسیقی کو کافی فروغ تھا۔ مثلاً سنسکرت کی شاعری کی سب سے پہلی کتاب رامائن سمجھی جاتی ہے (رسالہ اردو جنوری ۳۹ء صفحہ ۱۹) اس میں موسیقی کے متعلق بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ اس میں مذکور ہے کہ اس وقت فن موسیقی کو نہایت عروج ہوگیا تھا حتیٰ کہ راون اور ہنومان تک کو اس فن میں کامل مہارت تھی۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے آلات۔ تنبورا۔ مردنگ۔ ڈنڈبھی وغیرہ کا ذکر ہے (میوزک آف ہندوستان سٹرینگوے صفحہ ۸۵)

ہومر جو یونان کا شاعر اعظم گزرا ہے اس کی نظموں میں موسیقی کے متعلق بہت سے حوالے ملتے ہیں چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ آدمی سی کو موسیقی پر اس قدر عبور تھا کہ اس کے اثر سے انسان کا خون رواں منجمد ہو جاتا تھا (اینشنٹ سی وی لائیزیشن مصنفہ سین بوس)

چین کی قدیم ترین کتابوں مثلاً "لی کی" وغیرہ میں جا بجا موسیقی کا تذکرہ ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۵۷۰) علاوہ ازیں چین کا قدیم شاعر کانفیوشس موسیقی کا ماہر تھا اور اس کی شاعری میں جا بجا اس فن کے حوالے ملتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۱۹۱) غرض دنیا کی تمام ابتدائی کتابوں میں موسیقی کے متعلق اشارات ملتے ہیں جن سے اس فن کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اگر ہم پیچھے ہٹ کر زمانہ وحشت کی طرف جائیں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ وحشی گروہوں اور وحشی قوموں میں دونوں قسم کے جذبات شاعری اور راگ کے مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں گو وحشی قومیں نظم اور شاعری کو بہ حیثیت شاعری اور نظم تعبیر نہ کر سکتی ہوں مگر ان میں اس کا مواد ضرور پایا جاتا ہے تعبیر کرنے کے اعتبارات سے راگ سے وہ زیادہ تر آشنا ہیں۔ اگرچہ ان کے راگ میں شاعری یا نظم کا مواد بھی ملا جلا ہوتا ہے لیکن ایسے مواد کی تمیز نہیں کی جاتی اور نہ اسے کسی علیحدہ نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا پڑے گا کہ راگ شاعری سے مقدم ہے اور پہلے پہل انسانی طبیعتیں راگ سے آشنا ہوئیں (فنون لطیفہ صفحہ ۹۹)

بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی آں۔ اوں۔ آیں۔ آؤں کرنے لگتا ہے اور ایسی ایسی آوازیں نکالتا ہے جن میں ایک نظم اور ایک ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شروع شروع میں انسان صرف گانے کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا گانے کے جذبات اس کی طبیعت میں سے نکلتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ پرندے شاعر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی طبائع میں بھی شاعری کا مواد پایا جاتا ہے لیکن یہ کہا جائے گا کہ پرندوں کی طبیعت میں موسیقی کا مواد رکھا گیا ہے۔ پرندے اپنی لے اور اپنے سر میں گاتے ہیں اس سے بھی ثابت ہے کہ گانا مقدم ہے اور شاعری مؤخر ارسطو کا قول ہے کہ شاعری گانے سے نکلی ہے (فنون لطیفہ صفحہ ۱۰۰)

شاعری یا نظم کی بنیاد وزن ہے اور اسی کو ترنم یا نغمہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ خاص ترتیب کے ساتھ آواز کے بلند و پست ہونے کا نام نغمہ ہے صحیح نغمہ الفاظ سے اس وقت پیدا ہوتا ہے جب الفاظ میں ترتیب نظم یا وزن موجود ہو (رسالہ عالمگیر خاص نمبر ۳۳ء صفحہ ۲۰۴)

گوئٹے کا قول ہے کہ شاعری کو وزن کی ضرورت نہیں بلکہ موسیقی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح شاعری کے بحور اور بعض تالوں میں عجیب یکسانیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کی ابتدا موسیقی سے ہوئی (رسالہ حسن کار جلد ۱ نمبر ۱۶) مثلاً بحر رمل مثمن سالم فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن

شعر۔ خواب بندیہائے حشمت کم بود جادوگری را

تتالا پنجابی۔ دہن دہا دہا۔ دہن دہا دہا۔ دہن دہا دہا۔ دہن دہا دہا

فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن
خواب بندی	ہائے حشمت	کم بود جا	دوگری را
دہن دہا دہا	دہن دہا دہا	دہن دہا دہا	دہن دہا دہا
دار دارا	دار دارا	دار دارا	دار دارا

اسی طرح بحر المتدارک فاعلن، فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن چار رکن پشتو ٹھیکہ۔ تاک دہن۔ دہاک دہن۔ تاک دہن۔ تاک دہن چار آوردہن

اسی طرح دیگر بحور اور تالوں میں بھی یکسانیت ہے اس سے بھی موسیقی کے مقدم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

موسیقی کی ابتدا اختراع زبان سے پیشتر ہوئی!

شاعری کی ابتدا اختراع زبان کے بعد ہوئی لیکن یہ کہنا کہ سنگیت ویا علم موسیقی کی ابتدا اختراع زبان کے بعد ہوئی غلط ہے۔ اگر اس فن کے بنیادی اصولوں پر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ادھار۔ ناد۔ اور ہے زبان سے اسے بلاواسطہ کوئی علاقہ نہیں ہے۔ لے بندی کا جو طور طریق ماہرین نے مقرر کیا ہے وہ محض آواز کے زیر و بم تک محدود ہے مثلاً راگ دیش کی گت اس طرح پر مشتمل ہے (زمانہ جنوری ۲۷ء)

لے یا لہجہ کا اتار چڑھاؤ در دا در دا را را دا را

سُر سا ما رے ما ما پا نی سا سا

را	در	دا	در	دا	دارا	دارا	دارا
سا	رے رے	نی	پا دھا	ما	نی دھا	پا ما	گما رے

متذکرہ گت بنانے کے لئے جن بے معنی و مہمل آوازوں کا استعمال ہوا ہے انہیں بعد میں سروں میں مقید کر لیا گیا ہے جو سُرا اوپر لکھے گئے ہیں ان میں چڑھے۔ اترے اور قائم تینوں ہی سُر شامل ہیں۔ سُروں کی اس ترتیب و تقسیم سے آواز کے اتار چڑھاؤ کا ادراک آسانی سے ہو سکتا ہے اس میں شبہ نہیں لیکن اگر سُروں کی امداد نہ لی جاتی تو بھی لے قائم رکھنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالباً موسیقی ہی ابتدائے زبان کی غایت اور اس کا سرچشمہ ہے۔ اخذ و استنباط حروف زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا موجد لب و لہجہ کے بے شمار اختراعات سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔ اور یہ یقیناً موسیقی ہی کا فیضان ہے کہ اس نے اس تفریق کو بدرجہ اتم واضح کیا۔ غرض اس سے واضح ہے کہ موسیقی مقدم ہے اور شاعری موخر

رباعیات

خالق نے عطا [illegible] خطا کاری کیا ہے
دیکھا ہے بہشت کو گنہگاری سے کیا ہے
اے دوست نہ تصویر کر الطاف حبیب
جا پاس سے عشق کو بن خواری کیا ہے

انساں کو نہ کیوں عشق [illegible] حال ہے جب
پھر نصب ہے کیا کام [illegible] کمال ہے جب
زندہ ہے وہی [illegible] معشوق ہے نفرت ہے جب
دنیا بھی اگر ہے آرا ہے ناداں ہے جب

عطا کمالپوری

انتخابِ سخن

اعجازِ عشق

از جناب ادریس احمد صاحب خالد مینائی

عشق نے حسنِ حقیقت کیا دوبالا کردیا — رازِ تخلیقِ دو عالم آشکارا کردیا
دل پہ جب ظاہر ہوئیں اسرارِ معراجِ خودی — اس طرح خود کو مٹا ڈالا کہ تجھ سا کردیا
[illegible] ہیولی اتنی ستمگر کو ستم سوجھا تو بس — منتشر اجزائے عشق و دل کو یکجا کردیا
آپ نے تقدیر کے گلشن پہ جب ڈالی نظر — جو کلی مرجھا گئی میرا نصیب کردیا

تار کی جنبش پہ ہیں موقوف اپنی جنبشیں
شعبدہ گر نے جدھر چاہا اشارا کردیا

رعنائی گفتار

از جناب اثر چکوالی بی اے

ساقی نفس نفس ہے تیرا شراب خانہ — تیرا وجود رنگیں خوشیوں کا ہے خزانہ
پھر رقص میں زمیں ہے اور وجد میں فلک ہے — پھر سن رہا ہوں ان سے میں جاں فزا ترانہ
پھر آگیا ہے موسم گلہائے رنگ و بو کا — ہر چیز بن گئی ہے بہکا ہوا فسانہ
پھر سے غریب دل کو رکھے پامال کرنے — اے گردشِ زمانہ اے گردشِ زمانہ
کیا پوچھتے ہو مجھ سے روداد قلبِ محزوں — دکھ درد سے بھرا ہے اے دوست یہ فسانہ
آؤ پئیں پلائیں، آؤ پئیں پلائیں — ہلکی سی روشنی ہو اور محفلِ مغانہ
میں تم سے عشق کرکے برباد ہو گیا ہوں — میری تباہیاں بھی بن بن گئیں فسانہ

میری ہر اک نوا میں پیغامِ زندگی ہے
بخشا گیا ہے مجھ کو نطقِ پیمبرانہ

غزل

از جناب سید محمد البلسط قابل ٹیپوری

میری پیشانی [illegible] سنگِ در محبوب تھا — دیکھ لیتا اک نظر مجھکو جو وہ کیا خوب تھا

طور پر راز و نیازِ طالب و مطلوب تھا — حضرتِ موسیٰ کو رہتا ہوش تو کیا خوب تھا
لطفِ نظارہ کہاں جب تابِ نظارہ نہ ہو — جلوۂ جاناں تھا گو ظاہر مگر محجوب تھا
دیکھ کر مجھ کو یہ کیوں ساقی نے آنکھیں پھیر لیں — کیا مرا محفل میں آنا بھی کوئی معیوب تھا
جس کو آنکھوں سے لگایا جسکو دیں سجدے کا — وہ تمہارا گھر نہیں تھا کس کا پھر مکتوب تھا
میرے مرقد کا نشاں پامال آخر ہو گیا — اب ہوا پورا جو ارمانِ دلِ محبوب تھا
آپ ہی کی یاد میں بیمارِ غم نے جان دی — آپ آتے ایک لمحہ پیشتر تو خوب تھا

بارگاہِ ناز میں قابل میں جاتا کس طرح
در کھلا پایا مگر در پر سگِ محجوب تھا

جذباتِ عزیز

از جناب عزیز اللہ عزیز بنگلوری

فراقِ یار میں دم بھر مجھے قرار نہیں — مذاقِ سیر نہیں حسرتِ بہار نہیں
سکوت چھایا ہے رندوں پہ بزمِ ساقی میں — عجیب رنگ ہے کوئی بھی ہوشیار نہیں
جو اپنا جلوہ دکھانا ہے تو دکھا جلدی — کہ چشمِ شوق کو اب تابِ انتظار نہیں
گلہ نہ ہو مجھے کیوں تیری کم نگاہی کا — کہ تیرا تیرِ نظر کیوں دل میرے دل کو پار نہیں
دلِ حزیں تو مرا آپ کی امانت ہے — پرائی چیز ہے مجھکو کچھ اختیار نہیں
متاعِ دہر سے ہے بے نیاز دل میرا — ہوس بھی دولتِ دنیا کی زینہار نہیں

عزیز شکر ہے اسکی زباں سے ہاں نکلی
زباں پہ جسکے تھا ہر وقت بار بار نہیں

غزل

از جناب سید کرم علی نسیم سہروردی

تجھ سے دل اے مہ لقا جو لگا بیٹھا ہے — سچ تو یہ ہے کہ خدا کو بھی بھلا بیٹھا ہے
کچھ دلاسا نہ تسلی نہ تشفی ظالم — چٹکیاں لینے کو بھی مرے پہلو بیٹھا ہے

چاند پر ہوتا ہے ہر شخص کو ہالہ کا گماں   تو جو یوں کھولے ہوئے زلفِ دوتا بیٹھا ہے
شکوۂ ہجر شبِ وصل وہ سُن کر بولے   تُو تو بے سود کی سنانے کو کتھا بیٹھا ہے
یہ مٹائے نہیں مٹنے کا ستمگر ہرگز   جسطرح دل پہ ترا نقشِ جفا بیٹھا ہے
شیخ برسوں سے ندیدہ تھا مئے گلگوں کا   جام تک بھی نہ لیا اور کُک لگا بیٹھا ہے
بزمِ اغیار میں کہتا ہے وہ بُت مجھ سے بہ تبسم
یہ سیہ بخت یہاں کس لئے آ بیٹھا ہے

برسات

از جناب ماسٹر بہن بڑوی

ہے بہارِ زندگانی کا مزا برسات میں   جھوم کر اُٹھتی ہے جب کالی گھٹا برسات میں
گُل تو کیا کانٹا بھی ہوتا ہے ہرا برسات میں   روح بنکر چلتی ہے ٹھنڈی ہوا برسات میں
اُٹھئے بہن چلکے لطفِ برق و باراں دیکھئے
شہر میں دیہاتوں پہاڑوں میں سماں دیکھئے
جسطرف دیکھو فلک پہ اُٹھتے ہیں ابرِ مطیر   مینہ برس کر کھل گیا چلنے لگے سب راہگیر
بٹ گیا ہر شے پہ فیضِ رحمتِ ربِّ قدیر   ہوگئے شاداب ذراتِ زمینِ بینظیر
خشک سب تر ہوگئے رنگیں فسانہ ہوگیا
اک پلک جھپکی تو کیا سے کیا زمانہ ہوگیا
ابرِ تر چھپر کا ڈھکتے پھرتے ہیں ہر چار سُو   ہے چمک سے برق کی دُنیا منور چار سُو
پانی برساتے ہیں دَل بادل گرجکر چار سُو   زائد و کم ہوتی ہے بارش مکرر چار سُو
فصلی جھاڑں سے زمینِ خشک سب تر ہوگئی
قوتِ انساں کی نئی صورت مقدر ہوگئی
ہوگئے لبریز پانی سے خیابانِ چمن   کارفرما ہر جگہ صنعت گریِ ذوالمنن
مانسونی ابر نے بدلا ہے برساتی برن   سیر کرتے پھرتے ہیں باغوں میں اہلِ وطن
بھر گیا کھیتوں میں پانی تال لہرانے لگے
آشیاں سے طائر اُڑ اُڑ کر ہوا کھانے لگے
گھر گیا بادل تو دن کو مہرِ تاباں چھپ گیا   پردۂ تاریک میں عالم کا ساماں چھپ گیا
شام کو نکلی شفق حسنِ چراغاں چھپ گیا   چاندنی نکلی سمٹ کر ابرِ باراں چھپ گیا
جلوۂ مہ سے لباسِ دہر پُر زر ہوگیا
دُورِ ظلمت ہوگئی عالم منور ہوگیا
صبح ہوتے ہی گھر آیا ابر اک چھینٹا پڑا   دی پپیہے نے کہیں سے پی ہو پی ہو کی صدا

شاخِ گل پر نغمہ زن ہے عندلیبِ خوشنوا   سبزۂ خوابیدہ ملکی بوندیوں سے چونک اُٹھا
بھینی بھینی باغ سے بوئے سمن آنے لگی
کوک کوئل کی تہِ سروِ چمن آنے لگی
جب گری بجلی تو سنگِ طور جل کر رہ گیا   جس مسافر پر گری دو گام چلکر رہ گیا
جام چھلکا بزم میں شیشہ اُبل کر رہ گیا   خوش ہوئے میخوار زاہد ہاتھ ملکر رہ گیا
جام و ساغر صحبتِ رندانہ میں چلنے لگے
پی کے نکلے لڑکھڑاتے راستہ چلنے لگے
لطفِ باراں میکشی یہ پُر فضا جوشِ بہار   سب نظر آتے ہیں دلکش دشت و شہر و کوہسار
ہر گریباں چرخ کا ہے قوسِ قزح سے آشکار   میری آنکھوں میں کھنچا آتا ہے رنگِ لالہ زار
ساون کی پھولی ہے یہ تقسیم گلزار میں
صرف خوشبو باغ میں ہے پھول بازاروں میں ہیں
خشک جو جنگل پڑے تھے وہ ہرے ہونے لگے   شاخ و گل برگ و ثمر پانی سے منہ دھونے لگے
غلہ کھیتوں میں کساں آآکے سب بونے لگے   جا کے منزل پر مسافر شام سے سونے لگے
عیش کے گلشن میں عشرت کی کلی پھلنے لگی
برقی پنکھے کی طرح ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
جوشِ دل ہے بارشِ ابرِ کرم یا نہ رہے   بیخودی کہتی ہے میرا رنگ مستانہ رہے
ہے تقاضائے جنوں ہر شخص دیوانہ رہے   ہے دُعا میخوار کی آباد میخانہ رہے
باغ میں پھولے ہیں گُل اور ہے گھٹا چھائی ہوئی
فصلِ گُل پھرتی ہے ہر گلشن میں اِترائی ہوئی
مینہ جھما جھم خوب برسا شاد سب دُنیا ہوئی   کھیتوں میں ہریالی چھائی فصل بھی پیدا ہوئی
چھوٹے چھوٹے پودوں میں نشو و نما گویا ہوئی   فصلِ گُل سے باغ میں آفت نئی پیدا ہوئی
بُلبلیں خوش ہو کے بیٹھیں پتیاں ہلنے لگیں
جب ذرا سنکی ہوا شاخیں گلے ملنے لگیں

جوگی!

از جناب پروانہ بریلوی

میں سو رہا تھا۔ پہاڑ کی طوفانی ہواؤں اور ابر و باد کا مجھے کوئی خیال نہ تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یکایک بادل گرجے بجلی چمکی اور چمک کے ساتھ ہوا کا ایک تیز جھونکا کھڑکی سے کمرے کی خاموش فضا میں داخل ہوا۔ میز پر رکھے ہوئے اخبار کے صفحے ہوا کی موجوں پر رقص کرتے ہوئے انسانی روح کی طرح اُڑ گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یکایک پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرا کر جدا ہو گئے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کھڑکی کے پاس گیا۔ بجلی چمکی اور چمک کر غائب ہو گئی۔ میں نے دیکھا ایک بوڑھا بوسیدہ لباس پہنے بغل میں ستار دبائے التجا آمیز نگاہوں سے ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں گھبرا کر بولا "تم کون؟"

"ایک جوگی! جنگلوں کی خاک چھاننے والا انسان" اُس نے کہا۔

"ایسے میں یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"جب برسات کی دل چیرنے والی تیز ہوائیں چلتی ہیں مینہ برستا ہے۔ بادل گرجتے ہیں بجلی چمکتی ہے —— تو.... میں اپنے دل پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جاتا۔ میں بھاگا بھاگا پھرتا ہوں۔ ابر کے آوارہ ٹکڑوں کی طرح! میں ایک گھٹن سی محسوس کرتا ہوں۔ اور اس دنیا کی تمام بندشوں کو توڑ کر اُڑ جانا چاہتا ہوں.... کھو جانا چاہتا ہوں.... اپنے کو بھول جانا چاہتا ہوں! بس میں فوراً یہ ستار بجانا شروع کر دیتا ہوں اور اس کے نغمے اپنے تاروں کی لے پر اُٹھا کر مجھے ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ جہاں میں سب کچھ بھول جاتا ہوں مگر.... صرف تھوڑی دیر کے لئے!" اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم سب کچھ بھول جانا چاہتے ہو! کیوں؟"

"کیونکہ سب کچھ بھلا کر ہی کچھ یاد رکھا جا سکتا ہے!" اُس نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

"عجیب فلسفہ ہے!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہو سکتا ہے!" اُس نے نیچی آواز سے کہا۔

"اندر آ جاؤ۔ تمہیں سردی لگ رہی ہوگی!"

"سردی! ہاں...." اُس نے کہا۔

"آؤ اندر آ جاؤ!" میں نے پھر کہا۔

وہ فوراً اندر چلا آیا۔ میرے کہنے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ہلدی کی طرح زرد تھیں۔ اُن پر قبرستانوں کی سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ چہرے کا رنگ تانبے کی طرح جھلسا ہوا تھا۔ سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی اس قدر گھنی اور بڑھی ہوئی تھی کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بڑی جرأت کر کے کہا۔

"ستار پر کوئی گانا سنا سکتے ہیں آپ؟"

اُس نے بغیر کچھ جواب دیئے ستار سنبھالا اور اپنی کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے ستار کے خاموش تاروں کو جنبش دی۔ کھینچے اور ڈھیلے کر دیئے! ساز کا توازن قائم کر کے پہلے اُس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تاروں سے چھیڑ شروع کی۔ رفتار میں ذرا تیزی ہوئی۔ سرور و کیف اُس کے دماغ پر نغمہ بن کر چھا گئے۔ اُس کی لمبی لمبی پتلی انگلیوں میں برق رفتاری پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ تیزی کے ساتھ ساز کے مرتعش تاروں پر رقص کرنے لگیں۔ ساز کی آواز پر اُس نے ایک شعلہ بلند آگنی چھیڑی۔ راگ میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور نغمہ کی مستیاں تمام فضا پر چھا گئیں۔

جوگی خود سحر نغمہ سے نیم مدہوش - وہ اپنی نوائیوں میں اس درجہ جذب ہو چکا تھا کہ اسے اپنے گردوپیش کی بالکل خبر نہ تھی - وہ اپنی ہستی اپنے وجود کو بھول چکا تھا - وہ اپنے نغمے کے تموج کے ساتھ اس قدر بہہ گیا تھا - کہ کسی دوسری شے کے ہونے کا خیال وگمان بھی نہ تھا - اس کی انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں ان سے خون کی بوندیں ٹپک کر ستار کے تاروں کو رنگین بنا رہی تھیں - اس کے بوسیدہ کپڑے خون سے لالہ گوں ہو رہے تھے - مگر اسے اس کی مطلق خبر نہ تھی - وہ اپنی دھن میں کھویا ہوا تھا - اسکی آنکھیں اس کے نغمات دل افسردہ کے تاروں پر گا رہی تھیں --- وہ گیت جو ساز کے تاروں سے بھی بلند نہیں ہونے پائے تھے۔

یکایک اس کا تنفس تیز ہوا - آنسوؤں کا تار ٹوٹ گیا - آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی - ہونٹ کپکپائے اور زخمی انگلیاں اُلٹی سیدھی پڑنا شروع ہوئیں - تار ٹوٹنا شروع ہوئے - اُس نے زور سے قہقہہ لگایا اور ستار کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر دے مارا - اس کے جسم میں تھرتھری پیدا ہوئی - سر چکرایا اور وہ خود جھکر اکر دھڑام سے زمین پر گر پڑا - کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ ادھورے اور کچھ پورے الفاظ نکلے جو رات کی خاموشی میں جذب ہو کر پھیل گئے :-

"شعر و نغمہ کی ملکہ! اپنے جوگی کا نغمہ قبول کر! گو

...... ان کے تاروں میں ربط نہیں ..... مگر

...... یہ پھر بھی کسی کے ..... شکست دل کی آواز

ہیں - انھیں سن لے ...... سن لے!"

ستار ایک طرف ٹوٹا پڑا تھا - جوگی بے ہوش تھا - میں ویسے تو کمرے میں کھڑا تھا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا - کہ دو حسین پریاں مجھے اپنے پروں پر اُڑائے لئے جا رہی ہیں --- دُور --- کیف کی دنیا میں! ہوا تیزی سے چل رہی تھی - بادل گرج رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی، پانی کے قطرے درختوں کی شاخوں پر گر گر کر جوگی کا وہی نغمہ دُہرا رہے تھے شاید وہ بے ہوشی کے عالم میں اُسی کو سن رہا تھا -

---

نقد و نظر

کلیاتِ بحری

تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ۔ ۲۱۲ صفحات قیمت مجلد تین روپے مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ پی ایچ ڈی سڈی لٹ ۔ ملنے کا پتہ :- نول کشور پریس لکھنؤ ۔

قاضی محمود بحری بارھویں صدی (ہجری) کے ان شعراء میں سے ہیں جنہیں قصرِ اردو کے بانی کہا جاتا ہے ۔ بحری کا کلام اس کی داستانِ زندگی کی طرح پردہ نہاں میں پوشیدہ تھا ۔ دنیا میں ہزاروں انقلاب آئے لیکن تاریخ ادب کا وہ پہلو نمایاں نہ ہو سکا جس سے بحری کی حیات لب. از رمات والبتہ ہے اہل علم کو ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کا ممنون ہونا چاہئے جنہوں نے انتہائی تجسس و تلاش کے بعد بحری کا کلام اور ان کی داستانِ حیاتِ پریشاں اوراق مختلف علمی و ادبی حلقوں سے فراہم کر کے منظم کر دئے ہیں ۔

کتاب کے ابتدا میں ۱۲۲ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں بحری کی داستانِ حیات، ان کا ماحولِ شعری، خصوصیاتِ کلام اور مشاغلِ حیات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کے بعد ۱۰۶ صفحات پر بحری کا کلام ہے کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی شائع کیا گیا ہے اور جا بجا تشریحی نوٹ بھی درج ہیں جن سے غیر مستعمل الفاظ کے معنی سمجھ میں آ سکتے ہیں محققین ادب کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے قیمت دو روپے ہوتی تو بہتر تھا ۔

دیوانِ ثاقب

مصنفہ حضرت میرزا ثاقب قزلباش لکھنوی تقطیع ۲۷×۱۷/۸ ۴۴۴ صفحات قیمت تین روپے ۔ ملنے کا پتہ :- دار التصنیف محمود آباد ہاوس قیصر باغ لکھنؤ

لکھنؤ کے جدید تغزل کو جن اساتذہ نے بام عروج پر پہنچایا ہے ان میں میرزا ثاقب قزلباش قائدانہ حیثیت رکھتے ہیں ۔ ثاقب کا کلام ایک آئینہ ہے ۔ جس میں دل و دماغ اور روح و وجدان کی تمام کیفیتیں بے نقاب نظر آتی ہیں ۔ آپ کے دل و جدان کی وہ ناگفتنی کیفیتیں دلپذیر الفاظ کی تنظیم سے بتائی جاتی ہیں ۔ جن کے اظہار کی غرض سے آنسوؤں اور چیخوں سے کام لینا پڑتا ہے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے :-

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ۔۔۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے ۔۔۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

عقل حقیقت آشنا اور ہے قلب اور ہے ۔۔۔ عشق نہیں ہے ضعف حسن نہیں شباب ہے

چٹکنے کی صدا کے بعد یہ کیسی شمیم آئی ۔۔۔ چلو دیکھیں کسی غنچہ کا شاید دم نکلتا ہے

دیکھ رہا ہے کس قدر ثاقب جنوں کا شباب ۔۔۔ عمر بھر اپنی جوانی کی قسم کھاتے رہے

نزع میں ان سا فرو دل کا دور حسرتناک تھا ۔۔۔ جو سرہانے تھے وہ میری پتلیاں دیکھا کئے

کتاب کے ابتدا میں ۱۲۲ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں کلام ثاقب کے تمام پہلوؤں پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے ۔ اور آخر میں تقریباً سو اسو صفحے تقریظ و تبصرہ کی نذر کئے گئے ہیں ۔ جو بھی لاحاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔ کیونکہ کلام ثاقب رسمی مدح سرائی کا محتاج نہیں ہم امید کرتے ہیں کہ دیوانِ ثاقب قابلِ رشک مقبولیت حاصل کرے گا ۔

نذرانہ طرفہ

از جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

کس لئے موقوف دورِ شیشہ و پیمانہ ہے
آج کیا برہم مزاجِ نرگسِ مستانہ ہے

شکریہ اے شومیٔ تقدیر تیرا شکریہ
ہم جسے اپنا سمجھتے ہیں وہی بیگانہ ہے

کیوں نہ ہو رنگینیٔ محفل سے پیدا اضطراب
شمع کی گردن پہ خونِ ہستیٔ پروانہ ہے

چومنے کو ہے ابھی صحرا مری وحشت کے پاؤں
کیوں ابھی سے کہہ رہے ہو تم مجھے دیوانہ ہے

جھوٹ لیلیٰ کی کہانی، قیس کا قصہ غلط
ایک میری داستاں ہے، اک مرا افسانہ ہے

آ رہا ہے پھر قریب عشق وحشت کا قدم
ہاں! ذرا اکبار پھر کہہ دیجئے دیوانہ ہے

اُف یہ ساقی کا تبسم، اُف یہ بادہ کا سرور
دید کے قابل ادائے لغزشِ رندانہ ہے

عالمگیر [illegible]

پانچ ہزار روپے کا چیلنج ۵۰۰۰/

[illegible] جس کی وجہ یہ ہے کہ عامل کی کمی اور جعلسازوں کی کثرت ہے کہ تو یہ ہی جعلی پبلک بھی بچتی ہے کسی پر اعتبار آئے تو کیونکہ جب کسی سستے کلرک یا ماسٹر یا مدرس کا اپنے پیشے میں کام نہ چلا تو خواہ مخواہ کے پیر عامل یا نجومی بن بیٹھے انہیں بعض ایسے بھی اشتہار باز ہیں جنکو اشتہار کا مضمون لکھنا بھی نہیں آتا پبلک کو انکی لغات کی تب علم ہوتا ہے جب [illegible] مضحکہ خیز تعویذ یا جوتش کو دیکھتی ہے غرضکہ اس علم و عمل کی اچھی طرح مٹی پلید کی رہی ہے بلکہ جس قدر بے اعتباری ظاہر کرے بجا ہے دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ ہم نے ۲۷ - ۲۸ سال سے اس علم و عمل کو شہرت دی جس کا ثبوت ہندوستان کے قدیم اخبارات کی فائلوں اور ہمارے پاس واقعات تعریفی خطوط سے ہو سکتا ہے - یہ ایسا متبرک پیشہ ہے کہ سوائے نیک نیتی اور راستی کے کبھی فروغ نہیں پا سکتا - دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ جہاں کہیں میرے نام کا ذکر کریں گے انشاء اللہ تعریف کے ساتھ ہی یاد کیا جائیگا - آپ ایک مرتبہ تشریف لا کر آزمائش کریں - اگر لاہور آنے سے معذور ہیں تو خط و کتابت جوابی سے مشورہ لے سکتے ہیں اگر کوئی شخص میرے مقابلے میں اپنے اشتہار کو سچا ثابت کر دے تو **پانچ ہزار روپے وصول کر سکتا ہے - یہ روپیہ کسی بنک یا عدالت میں جمع کر دیا جائے گا**

پس اگر آپ صحیح معنی میں کسی مصیبت یا مشکلات میں مبتلا ہیں اور مشورہ لینا چاہتے ہیں مثلاً کوئی ایسی بیماری ہے جس پر دوا اثر نہیں کرتی حکیم ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں مرض سمجھ میں نہیں آتا یا کسی نے جادو ٹونہ سحر وغیرہ کرکے مرض لگا رکھا ہے یا کسی مقدمہ میں پریشانی ہے یا کسی سے ناچاقی یا کاروبار کمزور ہوتا جاتا ہے یا اولاد نہیں ہوتی یا ہو کر مر جاتی ہے یا امتحان میں کامیابی نظر نہیں آتی یا ملازمت میں ترقی کیلئے رکاوٹ ہے غرض کوئی بھی دنیاوی یا روحانی تکلیف ہے تو مشورہ لیں۔ فیس مشورہ ۔ ایک روپیہ چھ آنے (۱؍۶)

عالیجناب حکیم کریم الدین صاحب کے متعلق معززین کے ارشادات :-

دنیا کیا کہتی ہے؟

معظم و محترم عالیجناب عامل حکیم کریم الدین صاحب السلام علیکم۔ میری بیوی عرصہ ایک سال سے بیمار تھی۔ علاج ڈاکٹری و یونانی ہر قسم کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا مریضہ کی دونوں ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ میں برادرم شیر علی صاحب کو ملا اور حالات بتلائے انہوں نے پانچ بتیاں عنایت کیں اور طریقہ استعمال بتلایا۔ کیا عرض کروں پہلی ہی بتی سے مریضہ کی ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ یہ ایک عملیات کا معجزہ ہے جس نے اس علاقہ میں ہر جگہ آپ کے [illegible] جادو عمل بتیوں کا شہرہ کر دیا۔ میں نے تقریباً پندرہ سو روپیہ مریضہ پر خرچ کیا تھا اور مایوس ہو گیا تھا مریضہ ہر وقت آپکو دعائیں دیتی ہے میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو تحریر فرمائیں اور میرے حالات کو اگر مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے (چوہدری منظور حسین ذیلدار چک نمبر ۳۶ جنوبی براستہ سرگودہا۔

جناب عبداللہ صاحب گرمی شاہو پشاور تحریر فرماتے ہیں کہ میں اٹھ نہ سکتا تھا۔ دوسرا آدمی سہارا دیکر اٹھاتا تھا ہاتھ اور پاؤں کو ازحد درد رہتا تھا آپکے عملیات نے یہ صحت بخشی کہ اب دور دور تک چلتا پھرتا ہوں۔

جناب شیخ عبدالقادر صاحب سانگلہ ہل سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں عامل سے ملا اور تین سوالات کئے گئے۔ انکا بالکل صحیح جواب ملنے پر میں بالکل حیران رہ گیا کسی جوتشی یا عامل پر یقین نہ رکھتا تھا حکیم صاحب کا علم دیکھکر یقین ہو گیا کہ آپ کو قدرت نے صحیح علم دیا ہے۔ پس اگر آپ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں مثلاً بیماری پر دوا اثر نہ کرتی ہو حکیم و ڈاکٹر سے مایوس ہو چکے ہیں یا کسی سے ناچاقی رہتی ہے خواہ مخواہ دشمنی بڑھتی جا رہی ہے یا میاں بیوی کے تعلقات ناخوشگوار ہو رہے ہوں۔ یا مقدمہ میں کامیابی چاہتے ہوں تو ضرور ایک دفعہ تشریف لا کر مشورہ لیجئے۔ فیس مشورہ فی سوال ایک روپیہ۔ بذریعہ وی۔پی ایک روپیہ چھ آنے۔ خط و کتابت جوابی کریں۔

ملاقات کا وقت صبح نو بجے سے سات بجے شام تک

ملنے کا پتہ:- عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی موڑ گنپت روڈ۔ لاہور

آخری گزارش

عالمگیر کا یہ معرکۃ الآرا نمبر جون کے پہلے ہفتے میں شائع ہو چکا ہے!

ربیعہ
"خالدہ ادیب خانم"